# یم لکھنؤ کی آخری بہار

مرزا جعفر حسین



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

# قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

مرزا جعفر حسین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

Qadeem Lucknow Ki Akhri Bahar

By : Mirza Jafar Husain



سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1981

دوسرا اڈیشن : 1998 تعداد 1100

قیمت :-/110

سلسلۂ مطبوعات: 228



ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ I، آر۔ کے۔ پورم،
نئی دہلی۔110066
طابع : جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی۔٦

# پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

**ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ**
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

# فہرست مضامین

# مقدمہ

اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ لکھنؤ ایک انتہائی دل فریب اور گراں قدر تہذیب کا کچھ عرصہ قبل تک مرکز تھا۔ اس تہذیب کی تخلیق میں لکھنؤ کے نوابین، رؤساء و امراء، امیر اور غریب، عالم اور جاہل، ہندو اور مسلمان، شاعر اور صوفی، رشی اور سادھو، تاجر اور فقیر، سپاہی اور شہری، مرد اور زن سب ہی کا بقدرِ حیثیت و ہمت و جثہ حصہ تھا۔ اس تہذیب نے دنیا کو دو پلی ٹوپیوں، شربتی انگرکھوں، چوڑی دار پاجاموں، بڑے بڑے ریشمی رومالوں، ململ اور ریشم کے کڑھے ہوئے کرتوں، سلمے ستارے کی رضائیوں، مخمل کے لحافوں اور چاندی کے بکلس دار یا سنہری مقیشی زردوزر مخملی جوتوں سے روشناس کرایا۔ غذاؤں میں پلاؤ، خاصگی، متنجن، مزعفر، شیرمال، پراٹھے، کباب، قورمہ، ورقی بالائی اور انواع و اقسام کے لذیذ ترین کھانوں کے ذائقے فراہم کیے۔ گفتار و تکلم میں نئے نئے اسلوب نکالے، السلام علیکم کے بجائے آداب، تسلیمات، کورنش، بندگی، مجرا عرض کرنے کا چلن رائج کیا۔ زبان کو جلادی اور صحتِ زبان پر بھرپور زور دیا۔ حویلیوں کے اندر روشنی، رنگینی، لطافت و نزاکت کی چہل پہل میں لونڈیوں، باندیوں، ماماؤں، اصیلوں، مغلانیوں، اناؤں، دداؤں، کھلائیوں، استانیوں، کہانیاں کہنے والیوں اور بہت سی دوسری خدمت کرنے والی عورتوں کی سرپرستی کی۔ اور باہر محل سرا میں خدمت گاروں، رکاب داروں، فراشوں، سپاہیوں، مصاحبوں، داستان گویوں، منشیوں، ضلعداروں، کارندوں کی پرورش کی۔ سیر و تفریح کے ہنگامے، پتنگ بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی وغیرہ کے میدان گرم کیے۔ معاشرے میں مہذب، تعلیم یافتہ اور اعلا پایے کی طوائفوں کو ایک خاص منزلت عطا کی۔ مختصر یہ کہ

لکھنؤ کی تہذیب اپنی جگہ پر ایک ایسی حسین وجمیل اور پرکیف دنیا تھی جس کو شاہان اودھ کے دورِ اقتدار میں بسایا اور آباد کیا گیا تھا۔ ان حکمرانوں نے اس کی بنیاد کچھ ایسی ہنرمندی اور اتنے خلوص وانہماک سے رکھی تھی کہ انتزاعِ سلطنت کے تخمیناً اسّی برس بعد تک اس کے آثار موجود تھے۔ لیکن بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں یہ عمارت بالآخر پوری طرح نیست ونابود ہوگئی۔

دورِ حاضر کے لوگ یقیناً یہ کہنے میں بڑی حد تک حق بجانب ہوں گے کہ ہماری قدیم تہذیب میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتی اس لیے اس کا فنا ہوجانا ناگزیر تھا لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کلچر میں جو خوبیاں تھیں ان کے مٹ جانے کے بعد ہمارا سماج بہت غریب ہوگیا۔ آج ہم جب جدیدیت سے اپنی قدامت کا موازنہ کرتے ہیں تو ہم کو شرافت وانسانیت، اخوّت ومحبّت، رواداری وپاسداری، خلق ومروّت اور ایثار وہمدردی کے ایسے گراں قدر خصائل کے فقدان پر بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ دولت وثروت اور فارغ البالی وخوش حالی کے چھن جانے کے بالمقابل کہیں زیادہ قلق اس احساس پر ہوتا ہے کہ اب ہمارے پہلو میں انسانی ہمدردی سے مملو دل باقی نہیں رہا۔ ہمارے پرانے رسم ورواج اور معاشرت کی قدیم قدروں کا ختم ہوجانا یقیناً بدلے ہوئے حالات اور رفتارِ روزگار کا نتیجہ ہے لیکن ہمارے مزاج سے انسان پرستی اور راست بازی کا ذوق محو ہوجانا کسی طرح بھی پسندیدہ یا جائز قرار نہیں پاتا۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جس کو ناقابلِ تلافی نقصان کہنا ہی پڑتا ہے حالانکہ اس نقصان کا دورِ حاضر میں عوام کو احساس بھی بہت کم ہے جس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ نئی نسل مشینی اور مادّی دنیا کی پیداوار ہے۔ جس ماحول میں وہ پیدا ہوکر پروان چڑھی ہے اس میں کشمکشِ حیات کی اتنی زیادہ الجھنیں ہیں اور فراغت اتنی کم ہے کہ روحانی قدروں پر غور کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ البتّہ پرانی یادوں سے تسکین حاصل کرنے کا جذبہ برقرار ہے اور اپنے بزرگوں کا یہی ایک ورثہ اب ہماری نئی اُمّت کے پاس باقی رہ گیا ہے۔ بدقسمتی سے ایسی آسودگی حاصل کرنے کے لیے بھی بہت کم وسیلے ہمارے پاس فراہم ہیں کیونکہ ہماری پرانی تاریخ بدیسی حکومت کے سیاسی تقاضوں کے تحت اتنی زیادہ مسخ کردی گئی ہے کہ اس میں روشنی کے مقابلے میں تاریکی کے زیادہ پہلو نظر آتے ہیں۔ بالخصوص شاہان اودھ کے کردار کو ہمہ تن عیب بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس سیاسی جعل سازی کے پس منظر میں ہماری پرانی معاشرت کا حسین وجمیل چہرہ بھی بھیانک بن کر ابھرتا ہے۔ لہٰذا وقت کی اہم ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی قدیم تہذیب کو اس کے اصلی خدوخال

میں ایک بار پھر دنیا سے روشناس کرایا جائے۔

یہ بھی ہماری ہی بدقسمتی ہے کہ ہماری قدیم تہذیب اور سماج کے متعلق منضبط کتابوں میں بہت کم حالات درج ہیں۔ دلی والوں نے توجہ کی تھی لہٰذا اُن کی معاشرت کے بارے میں اچھا خاصا ذخیرہ محفوظ ہوگیا۔ لیکن لکھنؤ والوں نے اپنے روایات و طرزِ زندگی کے بارے میں کسی تدوین کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خداوند عالم جزائے خیر دے مولانا عبدالحلیم شررؔ کو جن کی مساعیٔ جمیلہ کی بدولت اُن کی گراں قدر تصنیف "گزشتہ لکھنؤ" میں ہم کو اپنے اسلاف کی معاشرت کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس تصنیف میں تمام حالات شاہی دور سے متعلق ہیں جن کا پرتو بہر حال انیسویں صدی کے اواخر تک شہر کے در و دیوار پر ضو فگن تھا۔ راقم کو وہ زمانہ دیکھنے کا موقع ملا جب ہمارے آثارِ قدیمہ ایک ایک کرکے منہدم ہو رہے تھے۔

اِن حالات کے تاثرات اب تک دماغ میں موجود ہیں۔ تخمیناً دس برس قبل کچھ ایسی کسک دل میں اٹھی تھی کہ میں نے قلم برداشتہ ایک مضمون زیرِ عنوان "پرانی یادیں" لکھ کر "نیا دور" لکھنؤ کو بغرضِ اشاعت پیش کیا تھا۔ جس کے فوراً بعد ہر چہار جانب سے یہ مطالبے ہونے لگے تھے کہ قدیم لکھنؤ کے متعلق زیادہ سے زیادہ حالات لکھوں چنانچہ اب تک متعدد مضامین "نیا دور" لکھنؤ اور "آجکل" دلی میں شائع ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی قارئین کو سیری نہیں ہوئی اور اب یہ فرمائشیں ہیں کہ پرانے واقعات و حالات پر مشتمل ایک کتاب لکھ دی جائے۔ یہ مطالبے بعض ایسے حلقوں سے ہو رہے ہیں کہ تعمیلِ ارشاد ضروری ہوگئی۔ لہٰذا یہ تالیف اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے میں نے یہ کوشش کی ہے کہ میں اُس لکھنؤ کے بارے میں حالات قلمبند کر دوں جس کو میں نے خود دیکھا تھا، جس کی ہواؤں میں میرا بچپن جوان ہوا اور جس کی رنگینیوں میں میری جوانی مسکرائی تھی۔ یہ وہی وقت تھا جب اس گلستاں کی بہار آخر تھی، شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمہلا رہی تھیں اور سارا ماحول تغیر پذیر تھا، پرانی قدریں ختم ہو رہی تھیں اور نیا مزاج اُبھر رہا تھا۔ میں نے اس شہر کی ساری ہیئت کو گزشتہ تین چوتھائی صدی میں بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ انھیں حالات کو پیش کرنا اور اسی گزرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ کرانا میرا موضوعِ سخن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے اس تذکرے میں قاری کو کچھ فروگزاشتیں

محسوس ہوں جن کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے بہر حال سماعی اور قیاسی واقعات پیش کرنے سے اجتناب کیا ہے البتہ بعض پرانے واقعات ضمناً پیش کردینا بھی ناگزیر تھا۔ اس لیے ان کو معتبر روایات سے اخذ کرلیا۔ خدا کرے میری یہ کاوش اربابِ ذوق کو آسودگی فراہم کرسکے۔ آمین!

مرزا جعفر حسین

پہلا باب

# لکھنؤ کی آبادکاری اور متفرق حالات

۱۔ محلّے
۲۔ سڑکیں
۳۔ گلیاں
۴۔ منڈیاں
۵۔ بازاریں
۶۔ چوک
۷۔ اشیاء کی قیمتیں اور ارزانی
۸۔ عمارات و باغات
۹۔ ذرائع نقل و حمل

# (۱) محلّے

شہر جب آباد ہوتے ہیں تو محلّوں کا وجود میں آنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ کی بنیاد کب پڑی یا یہ کہ اُس وقت کتنے اور کون کون محلّے آباد ہوئے تھے، ان تمام حالات کا جائزہ ہمارے موضوع سے غیر متعلّق ہے۔ البتّہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ لکھنؤ جو ترقی کر کے علم و ادب اور مکارمِ اخلاق کا گہوارہ بنا اُس کی بنیاد اکبر بادشاہ کے عہد میں پڑی تھی۔ اکبر نے ۱۵۹۰ء میں جب ملک کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تھا تو صوبہ اور صوبہ دار کا مستقر لکھنؤ ہی میں قرار دیا تھا۔ اُسی زمانے میں بجنور کے ایک بزرگ شیخ عبدالرحیم کو لکھنؤ میں جاگیر مرحمت ہوئی اور وہ یہاں آ کے مقیم ہوئے۔ انھوں نے سب سے پہلے مچھی ٹیلے پر قیام کیا تھا۔ یہ ٹیلہ شاہ پیر محمد مرحوم کے نام سے نسبت حاصل کر چکا تھا اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ صاحب مرحوم پہلے سے آ کر مقیم ہو چکے تھے۔ اسی زمانے سے متصل کسی وقت لکھنؤ میں شاہ مینا شاہ مرحوم بھی فروکش ہو گئے تھے۔ ان تینوں بزرگوں کی موجودگی سے آبادی بڑھی ہوگی اور محلّے قائم ہوئے ہوں گے۔ لیکن دونوں بزرگانِ دین کی اقامت اپنے اپنے مقام ہی پر رہی اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ اس لیے محلّوں میں جو نئی وسعتیں ہوئیں اُن کے بانی شیخ عبدالرحیم ہی تھے جو ایک بڑی جاگیر کے بھی مالک تھے۔ انھوں نے عمارتیں بھی بنوائیں اور محلّے بھی آباد کیے۔ جہاں تک اُن کی تعمیر کردہ عمارتوں کا معاملہ ہے اُن کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں، مثلاً شیخن محلا، ربیع محلا، مبارک محلا وغیرہ۔ اُن کا مقبرہ نادان محل کے نام سے موسوم ہوا اور اسی نام کی سڑک پر اب تک واقع ہے۔ اُن کا قلعہ مچھی بھون کہلاتا تھا جس کا نام زندۂ جاوید ہے۔ یہ قلعہ چھبیس محرابوں پر مشتمل تھا اور ہر محراب میں دو دو مچھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اسی لیے اس کا نام مچھی باون رکھا گیا تھا جو رفتہ رفتہ مچھی بھون میں تبدیل ہو گیا۔ یہ قلعہ فرمانروایانِ اودھ نے بڑے اہتمام سے برقرار ہی نہیں رکھا تھا بلکہ اس میں اضافے بھی کیے تھے۔ یہاں تک کہ اس کو آصف الدولہ کے نام سے نسبت ہو گئی تھی۔ غدر کی تباہ کاریوں میں یہ قلعہ انگریزوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا اتنا مسمار کر دیا گیا تھا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں اس کی صورت ایک اونچے ٹیلے کی رہ گئی تھی جہاں سے دن بھر دونوں جانب گرد و غبار اڑا کرتا تھا۔ تباہی کا یہ منظر راقم نے اپنے عنفوانِ شباب تک دیکھا تھا پھر اسی مقام پر میڈیکل کالج تعمیر ہوا اور دونوں جانب بڑی بڑی خوشنما سڑکیں تعمیر

ہو گئیں۔ ایک سڑک شاہ مینا شاہ روڈ کے نام سے موسوم ہوئی۔ شاہ صاحب مرحوم اسی مقام پر مصروفِ خواب ہیں۔ صوفی جہاں انتقال فرماتے ہیں وہیں مدفون بھی ہوتے ہیں۔

لچھمن ٹیلہ کا نام ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مقتدر برہمن بھی آباد تھے۔ اکبر بادشاہ نے ان برہمنوں کے ساتھ بڑی بڑی مراعات کی تھیں۔ ان لوگوں نے متعدد محلّے قایم کیے اور بسائے۔ ان کے نام تھے باجپئی ٹولہ، کٹاری ٹولہ، سوندھی ٹولہ، اہیری ٹولہ، بنجاری ٹولہ۔ یہ سب محلّے چوک کے قریب بسائے گئے تھے اور اب تک انھیں ناموں سے آباد ہیں۔ قریب قریب اسی زمانہ میں شہزادہ سلیم نے جو بعد میں جہانگیر بادشاہ کے نام سے مشہور ہوا، لچھمی بھون کے مغرب میں ایک منڈی تعمیر کرائی تھی جو مرزا منڈی کہلاتی تھی اب وہاں اسی نام سے محلّہ آباد ہے۔ شیخ عبدالرحیم کے سایۂ عاطفت میں شیخ زادوں نے لکھنؤ آباد کیا۔ اسی زمانے میں بلگرام کے ایک قاضی محمود نائب صوبہ دار مقرر ہوگئے تھے ان کی سرکردگی میں محمود نگر، منصور نگر، فاضل نگر اور شاہ گنج کے محلّے بسائے گئے۔ منصور نگر اور شاہ گنج علاقوں کے درمیان اکبر بادشاہ کے نام پر موسوم اکبری دروازہ بھی تعمیر ہوا۔ یہ تمام محلّے اور اکبری دروازہ بدستور قایم ہیں۔ اکبر ہی کے عہد میں اور اُسی بادشاہ کی اجازت سے گھوڑے کے ایک فرانسیسی تاجر نے لکھنؤ میں اقامت کی اور چار مکانات اپنے لیے بنوائے۔ جب وہ چلا گیا تو یہ ساری املاک بحقِ سرکار ضبط ہوئی اور بالآخر عہدِ عالمگیر میں ملّا نظام الدین کو سکونت کے لیے مرحمت ہوئی وہ اپنے خاندان سمیت آکر بس گئے۔ اور رفتہ رفتہ ملحقہ عمارات شامل ہوکر یہ علاقہ فرنگی محل کے نام سے موسوم ہوا اور اب تک علم و ادب کا مرکز ہے۔ شاہ جہاں کے دور میں ایک رسالدار اشرف علی خاں نامی نے لکھنؤ میں اقامت کی۔ ایک محلّہ آباد کیا جو اُن کے نام پر اشرف آباد کہلایا۔ یہ محلّہ بھی بدستور برقرار ہے۔ ان تمام مندرجہ بالا محلّوں کے علاوہ کچھ اور بھی محلّے بسائے گئے ہوں گے جن میں اب بھی کچھ اپنے اصلی نام پر موجود ہوں گے۔ یہ تمام تذکرہ اس لیے کیا گیا تاکہ لکھنؤ کے آباد ہونے کی ابتدائی صورت بالاجمال سامنے آجائے۔ تاریخ کا یہ مطالعہ واضح کرتا ہے کہ شہر کی پہلی آبادی چوک کے قرب و جوار میں بسی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ پٹھانوں وغیرہ کی آبادی جو سمتِ مشرق تھی اُن کے آثار بہت پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ اودھ کے حکمرانوں کا یہ بھی ایک احسان ہے کہ انھوں نے بصد ہزار اہتمام پرانے محلّوں کو اُن کے پرانے ناموں سمیت برقرار رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ بدل جانے پر بھی وہ پرانے محلّے اب تک اپنے اصلی

ناموں ہی سے مشہور ہیں۔

اودھ میں جو حکومت صحیح معنوں میں پوری طرح برسرِ اقتدار آئی تھی اُس کا سلسلہ نواب سعادت خاں برہان الملک سے شروع ہو کر واجد علی شاہ پر ختم ہوا تھا۔ یہ دورِ اقتدار ایک سو پچیس برس تک قایم رہا تھا جن میں پہلے تین حکمران یعنی برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ فیض آباد ہی کو اپنا دار الحکومت بناتے رہے تھے۔ اُس دور میں مغل سردار لکھنؤ میں فوجی پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔ انھیں میں بعض نے محلّے آباد کر لیے تھے جن کے نام سید حسین خاں کا کڑہ، ابوتراب خاں کا کڑہ، بزن بیگ کا کڑہ، محمد علی خاں کا کڑہ، فدا یار خاں کا کڑہ، اور سرائے معالی خاں تھے۔ یہ محلّے بھی برقرار رہے اور قریب قریب سب ہی اب تک آباد ہیں۔ چوتھے فرمانروا نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو اپنا دار الحکومت بنایا۔ اُن کے ساتھ بہت بڑی آبادی اسی شہر میں منتقل ہو گئی اور تیزی کے ساتھ محلّے آباد ہو گئے جن کے زیادہ تر وہی نام رکھے گئے جو فیض آباد کے محلّوں کے تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ امانی گنج، فتح گنج، رکاب گنج، نخاس، دولت گنج، نواب گنج، بیگم گنج، یحییٰ گنج، بھوانی گنج، بالک گنج، کشمیری محلہ، نواز گنج، تحسین گنج، خدا گنج، عنبر گنج، محبوب گنج اور توپ دروازہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سلطنت کے وزیرِ خارجہ جھاؤ لال نے خیال گنج اور جھاؤ لال کا پل اور محلہ بسایا، وزیرِ اعظم مہاراجہ ٹکیت رائے نے ٹکیت گنج اور ٹکیت رائے کا بازار بسایا، صورت سنگھ نے اپنے نام سے احاطہ بنوایا، نواب کے خانگی داروغہ نے خانساماں کا احاطہ آباد کیا، نواب کی والدہ بہو بیگم صاحبہ نے علی گنج کی بنیاد رکھی اور نگریا نام کا محلّہ بسایا۔ حسن رضا خاں نے محلّہ حسن گنج آباد کیا۔ خود بادشاہ نے اپنے صاحبزادے وزیر علیخاں کی رہایش کے لیے محل بنوایا تھا جس کی وجہ سے ایک پورا محلّہ وزیر گنج کے نام سے بس گیا اور قریب ہی دوسرا محلہ گولا گنج معرضِ وجود میں آ گیا۔ آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں نے جنگلی گنج، مولوی گنج، مقبول گنج، رستوگی ٹولہ، ڈالی گنج اور اپنے نام سے منسوب سعادت گنج کے محلّے آباد کیے۔ نیز گولا گنج کو ترقی دی۔ نصیر الدین حیدر نے گنیش گنج اور چاند گنج کے محلّے آباد کیے اور حضرت گنج کی بنیاد ڈالی جس کی تکمیل امجد علی شاہ نے کی۔ اس طرح وہ کام جو آصف الدولہ نے شروع کیا تھا امجد علی شاہ کے دور میں مکمل ہوا۔ واجد علی شاہ کے وقت تک پورا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا اور اُس کی بہار شباب تک پہنچ گئی تھی جو غدر کے بعد زوال پذیر ہوئی اور ہوتی ہی چلی گئی۔

متذکرہ بالا محلّوں کے علاوہ کچھ ایسے مقامات بھی تھے جو اپنے حلقوں میں رہنے والوں کے پیشوں کے نام سے موسوم ہو گئے تھے مثلاً پھول والی گلی ، بتاشے والی گلی ، ڈورو والی گلی ، بارچے والی گلی فینس والی گلی وغیرہ۔ یہ محلّے اس لیے گلی کہلاتے تھے کہ اُس زمانے میں سڑکیں نہیں تھیں اور ان گلیوں میں انھیں پیشہ وروں کی سکونت بھی تھی اور وہیں کاروبار بھی کرتے تھے۔ ہر مخصوص گلی میں اُسی گلی کے نام کے پیشہ ور رہا کرتے تھے۔ دوسرے لوگ شاذ و نادر ہی وہاں سکونت اختیار کرتے تھے۔ یہ گلیاں اور ان میں رہنے والے اپنا علیحدہ سماج بنائے ہوئے تھے۔ یہی کیفیت بیسویں صدی کے اوائل تک باقی تھی۔ اُس کے بعد نام تو رہ گیا لیکن آبادی کسی مخصوص پیشہ ور طبقے کی اُسی کے منسوب محلہ میں باقی نہیں رہی۔ دوسرے لوگ بھی آ آ کے بس گئے۔

آصف الدولہ کے دور ہی میں آبادی کی نوعیت حلقہ وار علاقوں میں مسلّم ہو گئی تھی۔ جو لوگ باہر سے آتے تھے وہ متذکرہ بالا محلّوں میں آباد ہو گئے تھے۔ پھر بھی چوک کے متصل پرانے ہندو علاقوں اور اشرف آباد کے قرب و جوار میں ہندو آبادی تھی۔ اوّل الذکر محلّوں میں زیادہ تر برہمن اور دوسرے علاقوں میں کائستھ برادری کے لوگ رہتے تھے۔ کشمیری محلّہ میں کشمیری آباد تھے۔ باقی محلّوں میں مشترک آبادی تھی۔ ان تمام محلّوں کی جغرافیائی نوعیت واضح کرتی ہے کہ پرانے زمانے میں ساری آبادی اُن محلّوں اور علاقوں میں آباد تھی جو بعد میں دولت گنج ، سعادت گنج اور وزیر گنج وارڈوں میں شامل کر لیے گئے تھے۔ ان وارڈوں کے علاوہ بعض رؤسا و عمائدین کی دورِ شاہی سے ہی دور دور علاقوں میں ڈیوڑھیاں اور محلسرائیں تعمیر ہو گئی تھیں لیکن ان مقامات پر کوئی عوام کی بستی نہیں تھی۔ اُس زمانے میں ہماری آبادی بہت زیادہ نہیں تھی اور سارے شہری پورے سکون و آرام کے ساتھ متذکرہ بالا محلّوں ہی میں ایّام گزاری کرتے تھے۔ بہت سے محلّے جہاں آج گنجان آبادی ہے تخمیناً ستر برس قبل بالکل غیر آباد تھے مثلاً نشاط گنج ، لال باغ وغیرہ جہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ بارود خانہ کا محلّہ ایک جنگل تھا جہاں دن کو گزرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہی حالات بدلنا شروع ہو گئے تھے لیکن یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ ہماری پرانی آبادی نے اپنی سکونت تبدیل کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا تھا چنانچہ آج بھی پرانے محلّوں کے پرانے کھنڈرات میں زیادہ تر وہی لوگ آباد ہیں جن کے بزرگوں نے دورِ شاہی میں ابتداءً وہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنی جائے اقامت بیشتر انھیں لوگوں نے بدلی جو معاشیات یا دوسرے ضروریاتِ زندگی کے تحت تبدیلِ اقامت پر مجبور ہو گئے تھے۔ تعمیر

مکانات میں بھی سارا نظام آج کے مقابلے میں بہت زیادہ مختلف تھا ہر محلّے میں کسی نہ کسی رئیس کی ڈیوڑھی یا محلسرا ہم سے کم ایک یا دو اور بعض ہیں متعدد ڈیوڑھیاں یا محل سرائیں تھیں۔ یہ عمارات بلند و بالا، وسیع و عریض اور بڑے شان و شکوہ کی مالک ہوتی تھیں لیکن انھیں سے متصل متوسط طبقے والوں کے چھوٹے چھوٹے مکانات اور غریبوں کی جھونپڑیاں یا چھپر کھٹ آباد رہا کرتے تھے اور اس تمام فرق کے باوجود مکینوں کی زندگی بلا کسی تکلّف و تکلیف کے بسر ہوتی تھی۔ امیروں کے محل نہایت مجلا مصفّا، مختلف رنگوں سے مزیّن اور ان کی ساری شان و شوکت دلفریب و جاذبِ نظر ہوتی تھی۔ ہر گھر پر گھڑی نصب ہونا ضروری تھا۔ علی الصباح کسی بلندی سے ایسے عمارات کا نظارہ بہت پر لطف ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پورا علاقہ جگمگا اٹھا ہے۔ لیکن پہلو ہی میں چھوٹا اور میلا سا مکان یا دُکان دیکھ کر کسی کو تکلیف نہیں ہوتی تھی اور ایسی مثالیں ہر محلّے میں ملتی تھیں۔ مثال کے طور پر لے لیجیے وزیر گنج میں نواب ضیغم الدولہ کا محل تھا جس کا پھاٹک اتنا بلند و بالا تھا کہ ہاتھی بہت آسانی سے گزر جاتا تھا لیکن اسی املاک کے قرب و جوار میں بکثرت چھوٹے چھوٹے مکان اور دُکانیں تھیں۔ اس املاک کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ پورا بلند باغ اسی میں شامل تھا۔ جہاں تک یاد آرہا ہے اس کا پھاٹک اسی مقام پر تھا جہاں آج اقبال منزل کا صدر دروازہ واقع ہے اس املاک کا وہ حصّہ جہاں ضیغم الدولہ کی سکونت تھی مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد نے ورثائے نواب مرحوم سے خرید کر اقبال منزل تعمیر کرائی تھی۔ اسی طرح جہاں آج امین آباد اور نظیر آباد واقع ہیں یہ ساری املاک امجد علی شاہ کے وزیر امین الدولہ کی ملکیت تھی۔ اُن کی آخری یادگار جن کی خدمت میں مجھے شرف نیاز حاصل تھا غنی احمد مرحوم تھے۔ ان کی محل سرا موجودہ امین الدولہ پارک کے جنوب میں تھی اور موجودہ امین آباد و نظیر آباد کے علاقے میں چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں جن کا نمونہ آج بھی امین آباد پارک سے متصل چھوٹی چھوٹی میوہ فروشوں کی دُکانوں کی شکل میں موجود ہے۔ ان دونوں علاقوں یعنی وزیر گنج و امین آباد کے سارے انہدام و تعمیر نو کا تغیر میری نظروں کے سامنے ہوا تھا۔ میں نے وہ بھی دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں۔

محلّوں میں مکانات تعمیر کرنے کا اسلوب بھی آج سے مختلف تھا۔ زمین کا مالک خواہ اس کی حقیّت ہو یا مکان بنوانے کے لیے کسی رئیس سے حاصل کردہ ہو اپنی آسائش اور سہولت ملحوظ رکھ کر اپنا مکان بنوا لیتا تھا۔ اور اسی پر اکتفا کر کے عموماً لوگ زندگی بسر کر ڈالتے تھے۔ رؤسا اور امراء

کے محل اور محلسرائیں بڑے تزک و احتشام سے بنی ہوئی تھیں لیکن اُن کا ذوق و شوق آئے دن نئی نئی تبدیلیوں اور اضافوں پر آمادہ کرتا رہتا تھا۔ بعض رؤسا کے یہاں سال میں چھ ماہ معمار اور مزدور لگے رہتے تھے۔ میرے عم محترم نواب غلام حسین خاں مرحوم ہر تیسرے چوتھے مہینے اپنی خواب گاہ کا کمرہ تبدیل کر دیا کرتے تھے اور ہر تبدیلی کے قبل مجوزہ کمرہ میں کچھ نہ کچھ نئی تعمیر و اضافہ ضروری ہوتا تھا۔ دولت کی فراوانی اور اشیائے ضروری کی ارزانی کے زمانے میں ہر چیز سستی تھی اور ہر کام بہت کم خرچ میں انجام پا جاتا تھا۔ مکان بھی سستے تھے اور اُن کی تعمیر میں بھی بہت کم مصارف ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ میرے نانا نواب حکیم شفاء الدولہ بہادر کی محلسرا وہی تھی جہاں آج چوک میں اصغر علی محمد علی کا عطر کا کارخانہ اور ساری دُکان موجود ہے یہ املاک وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ نانا صاحب مرحوم نے غدر کے بعد جب لکھنؤ سے ہجرت لی تھی تو اس محلسرا کو نواب اکبر حسین کے ہاتھ صرف سو روپیہ پر فروخت کیا تھا اور انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں طوائفوں کی چودھرائن کے ہاتھ صرف تین یا چار ہزار میں بیع کر دیا تھا۔ یہ دونوں دستاویزیں میری دیکھی ہوئی ہیں۔ یہی حال دوسرے علاقوں میں بھی مکانات کا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے قیمتوں میں اس طرح اضافہ ہوا کہ ہر چیز کے دام ہوا کی طرح بڑھنے لگے اور برابر بڑھتے جا رہے ہیں۔

حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مذاق بھی بدلنے لگے تھے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جو مکانات تعمیر ہوتے اُن کو سابقہ عمارتوں کے طرز سے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔ مغربیت چھا رہی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تعمیرات کے سلسلہ میں جو رجحان نصیر الدین حیدر کے دور میں پیدا ہوا تھا وہ ساٹھ برس کی مدت میں آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ اب مشرقی ذوق کی جگہ مغربی مذاق نے حاصل کر لی تھی۔ محل اور محلسرائیں مائل بہ انہدام تھیں اور نئی نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ سب سے بڑی خرابی یہ پیدا ہونے لگی تھی کہ امیر غریب میں جو فرق تھا وہ انسانیت سوز حد تک نمایاں ہو چلا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے نہ صرف غربا بلکہ متوسط طبقے کے لوگوں کو بھی شدید نقصانات پہنچے۔ غریبوں کے مکان کھنڈر لگے اور اُن کو کھنڈر کر کے امیروں نے کوٹھیاں تعمیر کیں۔ اس ظلم کا شکار بڑے بڑے رئیسوں کی محلسرائیں اور ڈیوڑھیاں بھی ہو گئیں۔ گزشتہ پچاس برس میں ہمارے محلّوں کا نقشہ اس طرح بدل گیا ہے کہ اگر اُس زمانے کے آدمی کو لا کر اُسی محلّے میں جہاں وہ رہتا تھا کھڑا کر دیا جائے تو یقیناً وہ اپنے سابق مقامِ سکونت کی شناخت

بھی نہ کر سکے گا۔ یہ صورتِ حال دولت گنج، سعادت گنج اور وزیر گنج کے حلقوں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

## (۲) سڑکیں

اِس صدی کے اوائل میں سارے شہر کے اندر صرف دو سڑکیں تھیں اور وہ دونوں بڑی اہمیت کی مالک تھیں نیز یہ کہ اُن کی تعمیر ہی مغربی تہذیب کے اثر انداز ہونے کا نتیجہ تھی۔ اِن میں ایک سڑک مال روڈ تھی اور دوسری وکٹوریہ اسٹریٹ۔ یہ دونوں سڑکیں انگریزی اقتدار کی ابتدائی نشانیاں تھیں۔

مال روڈ اب مہاتما گاندھی مارگ کے نام سے موسوم ہے۔ اس وقت یہ سڑک چھتر منزل سے شروع ہو کر کنٹونمنٹ پر ختم ہو جاتی تھی۔ اب بھی اس کی نوعیت وہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اُس زمانے میں اس سڑک پر از ابتدا تا انتہا انگریزوں کا تسلط تھا۔ جس مقام سے یہ شروع ہوتی تھی یعنی چھتر منزل اُس کو ایک زمانے میں اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے اقتدار کا مرکز کہنا زیادہ صحیح ہوگا لیکن انگریزی حکومت قایم ہونے کے بعد انگریزوں نے اس شاہی عمارت میں اپنا ایک کلب قایم کر لیا تھا جس کا نام یونائیٹڈ سروس کلب تھا۔ اس کلب میں ہر ہندوستانی کا خواہ وہ کتنا ہی مقتدر اور عظیم المرتبت کیوں نہ ہو، داخلہ ممنوع تھا۔ صرف "صاحب لوگ" اُس کلب کے ممبر ہوتے، اُن کو ہر وقت داخلے کی اجازت تھی اور شام کو خصوصیت کے ساتھ جشن منایا جاتا تھا۔ رنگ رلیاں ہوتیں، شراب و رقص کی صحبتیں گرم ہوا کرتی تھیں، معاشقے لڑائے جاتے تھے اور جنسی تفریحات کے لیے آزادی تھی۔ آخری تاجدارِ اودھ کو جس نے رہس کو ایک گرانقدر فن کی حیثیت بخشی تھی اُسی زمانے میں عیاش و بدچلن قرار دینے کی مسلسل کوشش کی گئی تھی لیکن اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالے رکھنے کی خاطر ہندوستانیوں کی نظروں سے بچے رہنا ضروری تھا۔ اسی کے ساتھ ہندوستانیوں کو ایک پست قوم ثابت کرنے کے لیے کلب میں اُن کا داخلہ بھی ممنوع کر دیا گیا تھا۔ بہر حال وہ سڑک اس زمانے میں انگریزوں کے آرام کے لیے مخصوص تھی۔ وہ اسی راستے سے کلب آتے اور اپنی اپنی کوٹھیوں میں جو حضرت گنج ہی کے علاقے میں واقع تھیں چلے جاتے تھے۔ مال روڈ حضرت گنج کے وسط سے ہوتی ہوئی کنٹونمنٹ چلی جاتی تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس سڑک کے دونوں جانب قریب قریب ہر کوٹھی میں انگریز فروکش

تھے۔ گنتی کی چند کوٹھیاں ہندوستانی امراء کے تحت و تصرف میں تھیں۔

حضرت گنج پہلے بھی ایک محلہ تھا اور اب بھی ہے۔ اسی محلے میں سبطین آباد واقع ہے جہاں آخری تاجدار اودھ کے والد مرحوم امجد علی شاہ مدفون ہیں۔ لیکن عرفِ عام میں حضرت گنج سے مراد وہ بازار ہے جو پہلے صرف انگریزوں کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں پہلے بھی سڑک کے دو طرفہ دکانیں تھیں جیسا کہ اب ہیں لیکن پہلے ان کی تعداد بہت کم تھیں اور ایک ایک دکان بہت لمبی چوڑی تھی۔ سب سے بڑی دکان وسط بازار میں بائیں جانب وہائٹ وے اینڈ لیڈ لا کی تھی۔ اس دکان پر اشیائے خوردنی، ادویات اور مشروبات کے علاوہ ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز مل جاتی اشیاء فروخت کرنے کے لیے بڑی تعداد میں انگریز یا اینگلوانڈین مرد اور عورتیں ملازم تھیں۔ یہ دکان اتنی وسعت میں تھی کہ آج وہاں تقریباً چار یا پانچ دکانیں قایم ہیں۔ ان دکانوں کا نقشہ بھی بالکل بدلا ہوا ہے، پہلے وسیع ہال تھے اور اب لمبے یا چوڑے کمرے ہیں۔ پرانی سادگی، صفائی اور زیبائش بہر حال مفقود ہے۔

دوسری بڑی دکان مال روڈ کے داہنی جانب قریب قریب شروع ہی میں تھی اس کا نام مرے اینڈ کمپنی تھا۔ اس دکان میں جملہ اشیائے خوردنی، ہر قسم کی ولایتی شرابیں، برتن وغیرہ، عطریات اور مختلف قسم کے متفرق اشیاء فروخت ہوتے تھے۔ تیسری بڑی دکان وہائٹ وے کی دکان سے آگے بڑھ کر بائیں جانب پیک ایلن کی تھی یہاں عطریات وادویات فروخت ہوتے تھے لیکن یہاں استعمال شدہ اشیاء کے نیلام کا بھی انتظام تھا۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر جو انگریز اپنے گھروں کو واپس جاتے وہ اپنا سارا سامان اسی کمپنی کی معرفت نیلام کراتے تھے۔ عمدہ سے عمدہ سامان سستی اور معمولی قیمت پر اس نیلام میں فراہم ہو جاتا تھا۔ ان تین بڑی دکانوں کے علاوہ چھوٹی بڑی اور بھی دکانیں تھیں۔ ہوٹل اور ریسٹورنٹ تھے جن میں ولیریو کی دکان ممتاز حیثیت کی مالک تھی لیکن معدودے چند ہندوستانیوں کی دکانیں تھیں اور خریدار بھی سب ہی انگریز ہوا کرتے تھے۔ بعض تعلقہ داران، راجگان اور رؤسا بھی ان دکانوں پر کبھی کبھی خریداری کرتے جن میں بعض مستقل طور پر اپنے حسابات بھی کھولے ہوتے تھے لیکن یہ صاحبان وہی تھے جن کے روابط انگریزوں سے پیدا ہو چکے تھے۔ خال خال ایسے نوجوان بھی نظر آجاتے تھے جو انگریزی تہذیب اور انگریزی طرز زندگی کے نئے نئے فریفتہ تھے۔ یہ ان چلے عموماً ولیریو اور دوسرے ہوٹلوں میں مستیاں لوٹتے تھے۔ عام طور سے لکھنؤ کے باشندے جن میں رؤساء و عمائدین کی اکثریت شامل تھی انگریزوں سے خواہ وہ حاکم

ہوں یا تاجر بہت زیادہ ڈرتے تھے اس لیے حضرت گنج بارونق اور پُر تکلف ہوتے ہوئے بھی ہندوستانیوں کے لیے کسی دلچسپی یا تفریح کا وسیلہ نہیں بن سکتا تھا۔ خوف و نفرت کے یہ جذبات رفتہ رفتہ گھٹتے گئے اور انگریزیت غالب آتی رہی۔

پرانے لکھنؤ میں دوسری سڑک وکٹوریہ اسٹریٹ تھی جو قلب شہر میں واقع ہے چونکہ یہ سڑک ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ جوبلی کے موقع پر تیار ہوئی تھی اس لیے انھیں کے نام سے منسوب ہوئی۔ یہ سڑک بڑی خصوصیات کی حامل تھی۔ اوّل تو یہ اب بھی غالباً شہر بھر میں سب سے زیادہ لمبی سڑک ہے جو میڈیکل کالج کے ایک نکڑ سے شروع ہو کر تال کٹورہ تک سیدھی چلی جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ لکھنؤ والوں کے لیے یہ اکیلی سڑک تھی جس پر زندگی کا زیادہ کاروبار جاری تھا۔ تخمیناً پچاس برس قبل اس کا وہ حصہ جو میڈیکل کالج کے نکڑ سے نخاس تک واقع ہے مرجع خلائق تھا۔ لکھنؤ کا نخاس بڑی شہرت کا مالک تھا۔ ہفتے میں ایک روز مخصوص بازار لگتا تھا اس کے علاوہ اشیائے ضروری میں متعدد چیزیں وہاں بکفایت مل جاتی تھیں۔ ادبار آنے کے بعد رؤسا و شرفا عسرت میں مبتلا ہوئے تو اُن کا قیمتی اثاثہ نخاس میں فروخت ہوتا تھا۔ بہتر سے بہتر قلمی نسخے یہاں مل جاتے تھے۔ بہترین اور اصلی چینی کے برتن خریداروں کو دستیاب ہو جاتے تھے۔ چڑیا خانہ بھی یہیں تھا اور پرانے شال دوشالے بھی بکنے کے لیے آ جاتے تھے۔ نخاس میں ہر روز بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ بازار کے دن راستہ چلنا دوبھر ہو جاتا تھا۔

وکٹوریہ اسٹریٹ کے اسی حصے کے وسط میں بزازہ تھا جہاں شہر بھر کے لوگ آتے اور اپنی اپنی پسند کا کپڑا خریدتے تھے۔ یہ بازار ایک مدت قبل گول دروازہ کے قریب منتقل ہو گیا۔ میڈیکل کالج کے نزدیک سبزی منڈی واقع ہے۔ ابتداءً سبزی منڈی چوک کے اندر تھی۔ آبادی بڑھنے اور خریداروں کی تعداد نیز چوک میں آنے والوں کی کثرت ہو جانے کے بعد یہ سبزی منڈی وکٹوریہ اسٹریٹ کے اس سرے پر منتقل ہو گئی۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر وکٹوریہ اسٹریٹ کی یہ خصوصیت تھی کہ ہماری پرانی آبادی کے وسط میں یہ عظیم المرتبت راستہ بنایا گیا تھا۔ اس کے ایک طرف دولت گنج اور سعادت گنج کے علاقے تھے تو دوسری طرف وزیر گنج اور ملحقہ محلّے تھے ایک سمت سے دوسرے علاقوں میں جانے کے لیے وکٹوریہ اسٹریٹ کا پار کرنا ضروری تھا۔ اس طرف پچاس برسوں میں اس سڑک پر جدید تعمیرات کی بہتات ہو گئی ہے لیکن اس سے پہلے نہ زیادہ آبادی تھی، نہ بھاری سواریاں تھیں اور نہ کشمکش حیات کے باعث غل و شور تھا اس لیے اس سڑک پر آ کے اچھی خاصی تفریح ہو جاتی تھی۔ مقتدر حکما اور شرفاء و رؤسا بھی اسی سڑک پر یا اس کے قرب و جوار میں متمکّن تھے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ اب بھی اپنی جگہ پر ہے

لیکن ساری بہاریں لٹ چکی ہیں اور ساری پرانی دلفریبی نئی تہذیب کی تعمیر میں کام آچکی ہے

## (۳) گلیاں

شہر لکھنؤ کے پرانے راستے وہی گلیاں تھیں جن کی تعمیر شاہی زمانے میں ہوئی تھی اور جو اس شکل سے بنائی گئی تھیں کہ سارے محلے ایک دوسرے انھیں گلیوں کی وساطت سے مل جاتے تھے۔ صورتحال یہ تھی کہ ایک شخص گلیوں گلیوں ہوتا ہوا آباد شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتا تھا۔ مسافت کا لحاظ رکھتے ہوئے بعض گلیاں اتنی چوڑی بنائی گئی تھیں کہ اُن میں سے گھوڑا گاڑی بآسانی نکل جائے لیکن زیادہ تعداد ایسی گلیوں کی تھی جن میں سے چوپھلا یا فینس ہی کا نکل جانا ممکن تھا اور اُن سے بھی زیادہ تعداد بالکل چھوٹی چھوٹی گلیوں کی تھی۔ ایسی گلیاں اب بھی پرانے لکھنؤ میں بکثرت موجود ہیں۔

ان گلیوں کے موجودہ طرز پر نام نہیں تھے۔ پیشہ وروں کے پیشوں سے جو گلیاں منسوب تھیں وہ حقیقتاً تنگ اور چھوٹے چھوٹے محلّے تھے۔ البتہ اپنی سہولت کے لیے لوگ گلیوں کو ملحقہ محلّوں سے منسوب کر کے نام ذکر دیا کرتے تھے مثلاً کٹرہ والی گلی، شاہ گنج کی گلی، ٹوریہ گنج کی گلی وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ گلیاں اپنے یہاں کے کسی مقتدر باشندہ کے نام سے موسوم ہو گئی تھیں لیکن لکھنؤ والے ایسی گلیوں کو لفظ "کوچہ" کے ساتھ احتراماً یاد کرتے تھے۔ یہ مقامات گلیاں نہیں کہلاتے تھے جیسے کوچہ میر انیس کوچہ مرزا دبیر، کوچہ شاہ چھڑا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جو بات اب تک بہت یاد آتی ہے وہ اُن گلیوں کی صفائی اور خوبصورتی تھی۔ ہر گلی بے حد صاف اور شفّاف رہا کرتی تھی، روشنی کا بھی معقول انتظام رہتا تھا۔ دن اور رات یکساں طور پر لوگ آسانی اور اطمینان سے راستہ چلتے تھے۔ کبھی کسی کے گلی میں گر کر زخمی ہونے کی خبر سنی نہیں گئی۔ اس حسنِ انتظام میں سرکاری بندوبست سے زیادہ محلّے والوں کی ہمدردانہ توجّہ شامل رہا کرتی تھی۔ قریب قریب ہر گھر کے دروازے پر باہر کی طرف چراغ جلتا تھا تاکہ راہ گیروں کو سہولت فراہم رہے۔ اسی طرح گلیوں میں کوڑے کا انبار لگانا انتہائی بد تہذیبی اور بدکاری سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح محلّے والے خود ایک دوسرے کا خیال رکھتے اور راستے گلی کو صاف رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ان راستوں اور گلیوں کے دونوں جانب شہریوں کے مکانات تھے اور اب بھی ہیں۔ نئی حکومت نے جب نئے نئے قانون بنائے اور ضابطے رائج کیے تو شہر کو خوشنما بنانے اور اُس کی تعمیر جدید کرنے کی بھی فکر ہوئی۔ آبادی بڑھی، بھاری سواریاں چلنے لگیں، فینس اور پالکی کی جگہ چوڑی چوڑی گاڑیوں نے

حاصل کی اور چوڑی چوڑی سڑکیں بنانے کے منصوبے بروئے کار لائے گئے تو مکانات بھی کھدنا شروع ہوئے کیونکہ بغیر اُن کے انہدام کے تعمیرِ جدید ممکن ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کارگزاری اور تعمیرِ جدید میں بکثرت چھوٹے چھوٹے مکانات مسمار ہوئے، بہت سے شریف گھرانے تباہ و برباد ہوئے، بے شمار لوگوں کو بے پناہ صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے کتنے خاندان نیست و نابود ہو گئے۔ اس سلسلے میں بہت سے دل دوز واقعات دیکھے تھے بالخصوص لاٹوش روڈ اور نادان محل روڈ پر جو کچھ دیکھا تھا اُس کی یاد اب بھی دل ہلا دیتی ہے۔ لاٹوش روڈ وہ سڑک ہے جو قیصر باغ کے چوراہے کو چار باغ سے ملحق کرتی ہے اور نادان محل روڈ نخاس سے قریب ہے جو سینٹرل روڈ سے چل کر نخاس کو امین آباد سے ملاتی ہے۔ ان دونوں مقامات پر پہلے تنگ اور ٹیڑھے راستے تھے جن پر گھوڑا گاڑی اور یکّے بآسانی نکل جاتے تھے لیکن راستے ہموار نہیں تھے اور نہ اتنے چوڑے تھے کہ بیک وقت دو سواریاں ایک ہی جانب سے اس طرح نکل جائیں کہ مقابل سے آنے والی سواریوں کو بھی راستہ مل جائے۔ حقیقتِ امر تو یہ ہے کہ شہر میں کوئی بھی لمبا راستہ سیدھا اور سپاٹ نہیں تھا اس لیے تعمیرِ جدید بہر حال ضروری تھی مگر دو طرفہ شرفاء کے چھوٹے چھوٹے مکانات کا مرحلہ سخت تھا جن کو کھودنا ہی پڑا۔ نادان محل روڈ کی تعمیر میں جن شرفاء کے مکان منہدم کیے گئے اُن میں اکثریت غرباء کی تھی۔

اس زمانے میں ہم لوگ روزانہ شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتے تو ہر روز نیا راستہ اختیار کرتے تھے۔ میرے ہمراہ ایک بار اس نئی نادان محل روڈ پر مرحوم محمد احمد تجنحو د ہوا خوری میں شریک تھے۔ سڑک زیرِ تعمیر تھی اور دونوں جانب منہدم مکانوں کا ملبہ ڈھیر تھا۔ ہم نے دیکھا کہ غروبِ آفتاب کے وقت برقعہ پوش نادار عورتیں وہاں بیٹھ کر رو رہی تھیں۔ دوسرے روز ہم لوگ پھر اُدھر سے گزرے اور یہی منظر دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں ہر روز شام کو عورتیں آکر زار و قطار روتی تھیں کیونکہ اُن کے وہیں مکانات تھے جو کھود ڈالے گئے اور اُن کے پاس رہنے کے لیے کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں رہ گیا تھا۔ تجنحود مرحوم بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ ڈالا ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاکِ نشیمن پر

ایسے ہی روح فرسا واقعات اُس زمانے میں برابر دیکھنے میں آتے تھے۔ وہ انہدام یقیناً ہمارے شہر کی تعمیرِ جدید کا پیش خیمہ تھا لیکن یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس نئی تعمیر میں ہمارے پرانے شہریوں اور ہمارے غریب عوام کی قربانیوں کا کتنا حصّہ تھا۔ یہ حصّہ بہر حال بہت عظیم تھا۔

# (۴) منڈیاں

منڈیاں عموماً اجناس یا ترکاریوں کی ہوتی ہیں۔ ترکاریوں کی منڈی کو لکھنؤ والے سبزی منڈی کہتے تھے اور اب بھی پرانے باشندے اسی نام سے پکارتے ہیں لیکن لفظ منڈی اگر بغیر کسی اضافت کے بولا جائے تو اس سے مراد غلّہ کی منڈی ہے۔ لکھنؤ میں ابتداءً دو بڑی منڈیاں قائم ہوئی تھیں۔ ایک ڈالی گنج پار میں یعنی اُس محلے میں جو دریائے گومتی کو پار کرنے کے بعد واقع ہے اور دوسری سعادت گنج میں۔ یہ منڈیاں شہر میں داخل ہونے کے بعد پورب اور پچھم علاقوں میں قایم کی گئی تھیں۔ غالباً دورِ شاہی میں تیسری منڈی محلّہ رکاب گنج میں وجود میں آگئی تھی جو نئی سڑکیں بننے کے بعد قریبی محلّہ پانڈے گنج میں منتقل کر دی گئی۔

ان منڈیوں میں عموماً تھوک فروشی ہوتی تھی جہاں سے دوسرے دکاندار ہی غلّہ خریدتے اور اپنی اپنی دکانوں پر فروخت کرتے تھے۔ شہریوں کو منڈیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بڑے بڑے زمیندار اور راجہ اپنے اپنے علاقوں سے غلّہ منگا لیتے تھے لیکن گزشتہ تیس چالیس برس سے شہر والے بھی اپنا ماہواری راشن انھیں منڈیوں سے بہ لحاظِ کفایت خریدتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ارزانی کے دور میں شرفا غلّہ اور اس کی قیمت کے بارے میں بات کرنا بھی معیوب سمجھتے تھے لیکن اب گرانی نے اخلاقی قدریں بھی بدل ڈالی ہیں۔

سبزی یا ترکاری منڈیاں بھی شہر میں زیادہ نہیں تھیں، اور نہ پچاس برس قبل تھوڑی تھوڑی ترکاری ان منڈیوں سے خریدی جاتی تھی۔ لوگ اپنے اپنے محلّوں کی دکانوں سے ترکاریاں خرید لیتے تھے لیکن زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ ترکاری والے محلّوں محلّوں گشت کر کے ترکاریاں فروخت کر جاتے تھے۔ یہ تمام دستور اب بھی رائج ہیں لیکن ہمارے کان اُن سریلی آوازوں کو سننے سے محروم ہیں جن میں پہلے ترکاری والے اپنا سودا فروخت کرتے تھے۔ اُس زمانے میں شعریت کا دور دورہ تھا۔ بازار میں سودا بیچنے والے بھی شعر و نغمہ میں آوازیں لگاتے تھے۔ ہمارا ککڑی بیچنے والا بھی یہ صدا دیتا تھا کہ:

"لیلا کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں، کیا پتلی پتلی ککڑیاں ہیں!"

یہی عالم قریب قریب ہر سودا بیچنے والے کا تھا۔

غلّے کی منڈیاں ہوں یا سبزی منڈیاں، ہمارے ان تجارتی مرکزوں کی بہت قابلِ قدر یہ خصوصیت تھی کہ کوئی کاروباری خریداروں کو دھوکا نہیں دیتا تھا۔ قیمتوں کو بڑھا چڑھا کے بتانا عام دستور تھا جس سے ہر خریدار واقف تھا اس لیے ہر سودا خریدنے والا مول تول کرنے اور چکانے کا خوگر ہوتا تھا لیکن ایک بار دام طے ہو جانے کے بعد یہ اطمینان رہتا تھا کہ بیچنے والے نے اپنے مال کی جو

تعریف کی ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہوگی۔ ترکاری منڈی میں باسی مال کو پانی چھڑک کر تازہ نہیں بتایا جاتا تھا۔ سبزی فروش تازہ ترکاری کو تازہ اور باسی کو باسی کہہ کر فروخت کرتا تھا۔ اسی طرح غلّے کی منڈی میں اچھے اور خراب کی کبھی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ جس منزلت اور قسم کا سودا بتایا جاتا تھا وہ ویسا ہی ہوتا بھی تھا۔ راست بازی اور صداقت پرستی ہمارے تمام شہریوں کا شعار تھا اور انھیں شہریوں میں تاجر اور سودا بیچنے والے بھی شامل تھے۔ یہ فضیلت برسوں ہوئے کہ ہم سے سلب ہوگئی۔

## (۵) بازاریں

بازاروں کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ چھوٹی چھوٹی بازاریں تھیں جو ہر محلے میں مستقل طور سے قایم تھیں یعنی یہ کہ کسی ایک جگہ پر متعدد دکانداروں کا اپنی اپنی دکانوں پر علیحدہ علیحدہ ہر قسم کا مال فروخت کرنا۔ ہر محلے میں ایسی دکانیں تھیں جو اب تک برقرار ہیں۔ سابق کی طرح اب بھی ہر محلے میں روزمرہ ضرورت کی چیزیں کم مقدار میں مل جاتی ہیں اور ایسی دکانوں کا ایک مقام پر موجود ہونا اُس مقام کو بازار کا لقب دیدیتا ہے۔ یہ کوئی خاص بات لائقِ تذکرہ نہیں ہے۔ دوسری قسم اُن دکانوں کی تھی جو ہر محلے میں مہینے یا ہفتے میں ایک بار لگتی تھیں۔ دوسرے محلّوں سے دکاندار آتے اور اپنے اپنے محلے کے مخصوص اشیاء جو انھیں کی صنعت و حرفت سے متعلق ہوتے فروخت کرتے تھے۔ ایسی بازار سے لوگ صرف اشتیاق میں سودا خریدتے تھے۔ بلا ضرورت بھی چیزیں خریدی جاتی تھیں اور ارزانی کے زمانے میں یہ خریداری کسی کو گراں بھی نہ گزرتی تھی۔ تیسری قسم اُن بازاروں کی تھی جو کسی مخصوص موقع پر اور کسی مخصوص مقام پر سال میں عموماً ایک بار لگائی جاتی تھیں۔ انھیں بازاروں کی سیر اور وہاں کا نظارہ ہمارے کلچر کا ایک اہم جزو تھا۔ اُن بازاروں میں خریداری کے علاوہ سیر و تفریح بھی ایک مقصد ہوتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اصل غرض سیر و تفریح ہوتی تھی اور خریداریاں ضمناً ہوجایا کرتی تھیں۔

ایسی بازاریں بکثرت لگتی تھیں۔ مثلاً عیدگاہوں میں عید الفطر اور عید الضحیٰ کے مواقع پر، عاشورۂ محرم اور چہلم کے دن کربلائے تال کٹورہ میں اور ہر میلے کے موقع پر مخصوص مقامات میں مثلاً بالے میاں کی یاد میں وکٹوریہ اسٹریٹ پر، ہولی کے دن گول دروازہ کے مقابل وکٹوریہ پارک میں، نہان کے دن دریا کے قریب والی سڑک پر جو نبی اللہ روڈ کے نام سے موسوم ہے۔ مذہبی تیوہاروں کے اجتماعات میں سنجیدگی اور متانت کا مظاہرہ ہوتا تھا لیکن میلوں کے موقع پر رنگ رلیاں ہی عین مقصد

ہوتا تھا۔ دُکان دار اپنی اپنی دُکانوں کو انتہائی حسن و جمال کے ساتھ آراستہ و پیراستہ کرتے تھے۔ عنبر و عود کی خوشبوؤں سے فضا معطّر ہوتی تھی۔ ہر سودا انتہائی تکلّف سے لگایا جاتا اور سودے کے ظروف بڑے سلیقے سے سجائے جاتے۔ مٹھائیوں پر سونے اور چاندی کے ورق جھلجھلاتے رہتے۔ ہر دُکان کو دیکھ کر اُس کی طرف بڑھنے اور کچھ خرید لینے کو دل چاہتا تھا۔ ہماری پرانی معاشرت میں سگریٹ یا سگار کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا لیکن حقّہ ہر محفل میں پھر بھی لازمی جزو ہوا کرتا تھا۔ ان بازاروں میں لوگ حقّے لیے ہوئے گھومتے اور شیدائیوں کو دو دو کش پلاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو ساقی کہا جاتا تھا یہ لوگ بے حد خوشبودار تمباکو کا حقّہ بھرے اور ان حقّوں کی رنگین اور خوشنما نیچوں پر ہار لپیٹے ادھر اُدھر تواضع کرتے اور صلہ میں معاوضہ پاتے تھے۔ ادھر ادھر اپنی سریلی آواز میں ہار والے ہار بیچتے گھوما کرتے تھے۔ خوشنمائی اور دل آویزی میں ایسی بازار ہمارے تاریخی چوک کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوا کرتی تھی۔ تماشائیوں کے ٹھٹ لگے رہتے اور اسی مجمع میں شرفا اور عوام کے ساتھ بعض مقتدر ہستیاں بھی نظر آتی تھیں۔ کسی جانب داستان گو امیر حمزہ کا قصہ سنا کر اپنے گرد مجمع اکٹھا کرتے تو دوسری جانب افیونی سے زہر عشق کی مثنوی سوز و گداز کے لہجے میں سن کر سینکڑوں آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ یہ بازاریں اور یہ میلے اب خواب و خیال ہیں۔ ایسا ہی ایک نظارہ آخری بار وکٹوریہ پارک میں ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا جب میں ایک خورد کی حیثیت سے اپنے دونوں بزرگوں پنڈت جگن نرائن مُلّا اور بابو تیج نراتھ سریواستو کے ہمراہ جن کو میں چچا کہتا تھا ہولی کے موقع پر گیا تھا۔ اُس زمانے میں بزرگوں کے ہمراہ سیر و تفریح میں جانا عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور طبیعت مچل جانے پر بزرگوں سے مہذّب مذاق کر لینا بھی جائز تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ بھی یاد آتا ہے کہ عید کے پیچھے ٹڑوالے میلے میں اپنے ایک ہم عمر دوست کے ساتھ انھیں کے والد کی معیّت میں گیا تھا۔ یہ بزرگ بہت بڑے ادیب اور شہر کے مقتدر لوگوں میں تھے۔ ہم لوگ بلا تکلّف افیونی کی باتیں سن رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ناگہاں طوائفوں کا ایک غول مقابل کی سمت سے آ گیا جن میں بعض نو عمر تھیں اور قریب قریب سب ہی بھرپور جوان تھیں ہمارے بزرگِ محترم کو تابِ ضبط نہ رہی اور انھوں نے بلا تکلّف گھورنا شروع کر دیا۔ میرے دوست یعنی اُن کے صاحبزادے سے اپنے والد کی نظارہ بازی برداشت نہ ہو سکی اور انھوں نے بہ آوازِ بلند یہ شعر پڑھ دیا ؎

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ان کے والد مسکرا کر رہ گئے اور میں اُن کی ندامت پر دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتا رہا۔ ایسے واقعات جوانی میں آئے دن پیش آیا کرتے تھے۔ اب صرف یادیں باقی ہیں۔

انھیں بازاروں کے ذیل میں اُن مقامات کا تذکرہ بھی ضروری ہے جہاں دھاتوں سے تیار کردہ برتن فروخت ہوتے تھے۔ یوں تو ڈالی گنج میں بھی لوہے کے برتنوں کا کاروبار ہوتا تھا لیکن لوہے، پیتل اور تانبے کے برتنوں کا اصل مرکز محلہ یحییٰ گنج میں تھا۔ جہاں ایک سے ایک زیادہ خوشنما اور ایک سے ایک بہتر صنعت کے برتن ہر روز فراہم رہتے تھے۔ لکھنؤ کی نفاست و نزاکت کے بہترین نمونے ہمارے پرانے صنّاع پیش کرتے تھے۔ پیتل کے ڈھلے ہوئے سڈول لوٹے، تانبے کے منقش حقّے کے پیندے بھاری بھاری لیکن جاذب نظر پتیلیاں، منقش گلدان اور ہر طرح کے چھوٹے، بڑے ظروف اپنی آپ مثال تھے۔ یہ بازار اپنی جگہ پر اب بھی قایم ہے لیکن پرانی صنعت کاریاں اور لطافت و نزاکت اب معدوم ہیں۔ صنّاع بھی نہ رہے اور صنعت گری بھی ختم ہوگئی۔

## (۶) چوک

پرانے لکھنؤ کا قدیم چوک اپنی جگہ پر ایک ایسا ادارہ تھا جہاں لکھنؤ کا سارا کلچر سمٹ کر ایک نقطے پر نمو فگن ہوگیا تھا۔ کہنے کو ایک پتلی سڑک پر دو رویہ دُکانیں اور بالاخانوں پر زنانِ بازاری رہا کرتی تھیں لیکن حقیقتِ امر یہ ہے کہ علم و ادب کے سوتے وہیں سے پھوٹتے تھے اور شعر و نغمہ کے چشمے اسی آبشار سے اُبلتے تھے۔ اُس دور کو میں نے نہیں دیکھا جب بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر اسی چوک سے گزرتے تھے لیکن اُس کی آخری بہاریں میں نے پوری طرح لوٹی تھیں۔ اس چھوٹے سے مقام کے لاکھوں ہی چکر لگانے کا اپنے عنفوانِ شباب میں مجھے شرف حاصل ہوا تھا اور میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ مقام ہمارے پرانے تہذیب و تمدن ذوق و شوق، فن گری و صنّاعی، ہنر پروری و برومندی، شعر و نغمہ، فکر و ادب غرضکہ تمام خوبیوں اور کمالات کا گہوارہ تھا۔ اُس زمانے کے شہریوں میں اقلِ قلیل تعداد ایسے لوگوں کی رہی ہوگی جو کبھی نہ کبھی وہاں سے نہ گزرے ہوں اور وہاں کی نعمتوں سے محروم رہ گئے ہوں۔ ساٹھ برس قبل تک ہمارے چوک میں اتنا تنوع تھا اور ایسی جاذبیت تھی کہ کسی مذاق کا انسان بھی وہاں جا کر جلد واپس ہونا گوارا ہی نہیں کرسکتا تھا۔ انھیں حالات کے تحت یہ تذکرہ کسی قدر تفصیل کا مستحق ہے۔

چوک کے حدود گول دروازے سے شروع ہو کر اکبری دروازے پر ختم ہوجاتے ہیں۔ ان دونوں دروازوں کے درمیان اندازاً ایک فرلانگ کا فاصلہ ہوگا لیکن اُس میں بلا کی وسعتیں تھیں۔ گول دروازے سے داخل

ہوتے ہی پہلے صرّافہ آتا ہے جہاں ایک سمت دُکانوں میں چاندی سونے کے اشیاء یعنی زیورات وغیرہ اور دوسری جانب چکن، کامدانی اور کارچوب کے بہترین شاہکار فروخت ہوتے تھے۔ ان چیزوں کی نمائش ہی دُکانوں کی زیب و زینت کے لیے کافی ہو سکتی تھی پھر بھی وہاں کے صاف ستھرے فرش، دُکانداروں کے چمکتے ہوئے کرتے، خوشنما صدریاں، اُن کی دودھ کی طرح سفید دھوتیاں اور سونے میں سہاگہ خوشبوؤں کی عطر اور مشک بیز لپٹیں، یہ تمام لوازمات ایسے تھے جو مجموعی طور پر صرافہ میں داخل ہوتے ہی دماغ و دل کو تراوٹ و نزہت بخشتے اور آگے بڑھنے میں قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ زیورات کی جگمگاہٹ اور اُن میں مرصع سازی، کپڑوں پر خوشنما رنگین پھولوں کی گلکاریاں تماشائیوں کو بلاتکلف خریداری پر مائل کر دیتی تھیں۔ صرافہ والوں کی صدائیں دلفریب اور باتیں سحر آفریں ہوتی تھیں علی الصباح اپنی اپنی دُکانیں کھولتے وقت وہ یہ فقرہ تلاوت کرتے تھے:

"جس کو نہ دے مولا اُس کو دے آصف الدولہ"

عہدِ آصفی کو گزرے ہوئے ایک صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی لیکن پھر بھی خوش عقیدتی اُس کرم گستر سے برقرار تھی۔ اسی علاقے میں کچھ آگے بڑھ کر ملمع سازی اور صنعت کاری کی کچھ اور چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں جن میں خوش نما اور دیدہ زیب ہاروں کی بھی کم سے کم ایک دُکان ضرور ایسی تھی جہاں سے پھولوں کی خوشبوئیں دماغ و مشام کو فرحت بخشتی تھیں، راہ گیر مستانہ وار راستہ طے کرتے آگے بڑھ جاتے تھے۔

صرّافہ کا علاقہ شاہی شفاخانہ موسومہ دارالشفاء تک ختم ہوتا تھا۔ اس دواخانے میں تین حکیم مریضوں کو دیکھتے تھے اور دوائیں مفت دی جاتی تھیں۔ تجربہ کار اور ہنرمند دواساز ملازم تھے اور بہتر سے بہتر دوائیں تقسیم ہوتی تھیں۔ چند بدحال مریضوں کے رہنے کے لیے اور اُن کی غذاؤں کا بھی بلاقیمت انتظام تھا۔ شفاخانہ کا بہت اچھا بندوبست تھا اور چونکہ اُس زمانہ میں لوگ ایلوپیتھک علاج سے پرہیز کرتے تھے اس لیے مریضوں کا بھی روزانہ ہجوم لگا رہتا تھا۔ انچارج طبیب اور دارالشفاء کے سپرنٹنڈنٹ حکیم نظیر حسن خاں مرحوم تھے جو شہر میں بہت ہر دلعزیز تھے اور مقتدر رئیس بھی تھے۔ اسی شفاخانے کے مقابل دوسری جانب ایک احاطہ بھی تھا جس کے بیرونی حصے میں دو دو کانیں انگوٹھیاں بنانے والوں کی تھیں جن میں ایک بزرگ اور معمر صنعت گر اپنی فن کاری کے لیے شہر بھر میں مشہور تھے۔ احاطے کے اندر ایک کنواں تھا جو "کپتان کا کنواں" کے نام سے موسوم تھا۔ اس کنویں سے متصل روزانہ شام کو رکابدار اپنے اپنے خونچوں میں برفیاں فروخت کرتے تھے۔ شہر کے تمام رکابدار ڈالی گنج میں رہا کرتے تھے۔

ان میں جو مسلمان تھے وہ رئیسوں کے گھروں پر جا کر اپنی تیار کردہ اشیا ء بیچ آتے تھے لیکن ہندو رکابدار اسی کنویں کے قریب اپنی بازار لگاتے تھے۔ یہ برفیاں بادام یا پستہ یا چلغوزہ یا ناریل کی ہوتی تھیں۔ ناریل کی برفی بڑے اہتمام سے تیار ہوتی تھی اور ہر برفی یکساں قیمت پر آٹھ آنے فی سیر بکتی تھی اس زمانے میں کوئی چیز خرید کر بازار میں کھانا بہت معیوب تھا اس لیے ہم لوگ کنویں کے پیچھے چھپ کر برفیاں کھاتے تھے اور دو آنے میں فی کس سیری حاصل کر لیتے تھے۔ یہ برفیاں خریدنے کے لیے بکثرت لوگ آتے تھے۔ بہت جلد خونچے صاف ہو جاتے اور رکابدار گھر واپس چلے جاتے تھے۔ تخمیناً پچاس برس سے وہ برفیاں اور رکابدار معدوم ہیں۔

اسی مقام سے کچھ آگے بڑھ کر چوک کا وسطی حصہ شروع ہوتا تھا۔ داہنی جانب نقاشوں، نگینہ سازوں اور انگوٹھی والوں کی دکانیں تھیں اور بائیں جانب ڈلی، تمباکو، چکنی ڈلی، الائچی، سونے اور چاندی کے ورقوں اور خشک میووں کی دکانیں تھیں۔ ان سب دوطرفہ دکانوں کے لوازمات میں صفائی، آراستگی، نزاکت اور لطافت کے علاوہ عطر اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے بسا رہنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں دونوں جانب کتب فروشوں، عینک سازوں، ٹوپی والوں اور دوسرے متفرق سامان بیچنے والوں کی دکانیں تھیں۔ کتب فروشوں میں عشرت مرحوم اور عینک سازوں میں ایوب مرحوم بڑی ہر دلعزیزی کے مالک تھے۔ اسی مقام پر وسط چوک میں بائیں جانب شیخ تاجدار مرزا مرحوم کی ایک بہت بڑی جنرل مرچنٹ کی دکان تھی جس میں ہر قسم کا ضروری سامان مل جاتا تھا۔ اس دکان کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اُس زمانے کے بہت سے ممتاز شعراء اور ادیب شام کو جمع ہو جاتے تھے اور ایک اچھی خاصی ادبی محفل روزانہ جمی رہتی تھی۔ راقم کو اسی دکان پر عزیز مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ دکان بھی عود و عنبر کی خوشبو سے بسی رہتی تھی۔ اُس زمانے میں عطر کا استعمال اور کپڑوں کا معطر رہنا ایک عام بات تھی لیکن ولایتی سینٹ ہمارے پرانے شہریوں کو بالکل قابلِ قبول نہیں تھا اور رؤساء تو اس کے نام سے کراہت کرتے تھے۔ البتہ بعض حلقوں میں فرانسیسی سینٹ ایمبر روز پسند کیا جانے لگا تھا لیکن اُس کا بھی استعمال مخصوص طریقوں سے ہوتا؛ رومال وغیرہ میں براہِ راست ناگوار تھا۔

چوک کا وسطی علاقہ مسجد تحسین علی خاں کے قریب ختم ہو کر تیسرا اور آخری حصہ شروع ہوتا تھا یہاں اشیائے خوردنی کی دکانیں تھیں جن میں سب سے پہلی دکان اناناس کے مزعفر کی حیدر حسین خاں کے پھاٹک والی گلی میں تھی۔ اس مزعفر کی شہرت شہر کے باہر بہت دور دور تک تھی۔ اس کے بعد دوطرفہ ہر قسم کے

کھانوں کی دکانیں تھیں۔ شیرمالیں، باقرخانیاں، اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، مرغ مسلّم، بٹیروں کا پلاؤ، کباب، قورمہ، مختصر یہ کہ تمام نعمتیں فراہم رہتی تھیں، اسی حصے میں چاندی کے ورق لگی ہوئی بہترین بالائی اور مٹھائی والوں کی سجی سجائی دکانیں بھی تھیں۔ مٹھائیوں پر سنہرے اور روپہلے ورق لگے رہتے اور عرق کیوڑہ وگلاب کی خوشبوؤں سے بسی ہوتی تھیں۔ ان مٹھائیوں میں ہر ایک کی الگ الگ خوشبو ہوتی پھر سب کی ملی جلی مہک عطرِ مجموعہ کا مزا دیتی تھی۔ گول دروازے سے تحسین کی مسجد تک عطر وگلاب اور مشک وعنبر کی لپٹیں اگر دل و دماغ کو نزہت و فرحت بخشتی تھیں تو اس مقام پہنچ کر معدہ اپنے مطالبے پیش کرتا اور خواہشِ طعام بے قرار کر دیتی تھی۔ شیرمالوں اور کلچوں کی لطیف و نازک مہک ایک جانب تو دوسری طرف سے کبابوں، پلاؤ، قورمہ اور دوسری لذیذ خوشبودار غذاؤں کی پرجوش کشش ہر انسان کی اشتہا کو تیز سے تیز تر کر دیتی تھی۔ بعض دکانیں ایسی بھی تھیں جہاں خریداروں کے لیے وہیں بیٹھ کر کھانے کا بھی بندوبست تھا لیکن شرفائے لکھنؤ بازار میں خواہ تخلیہ ہی کیوں نہ ہو کھانا کھانے کو گوارا ہی نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہوٹل بیرونی لوگوں یا پست طبقے کے عوام کے لیے مخصوص تھے وہ سب پرانی دکانیں اب تک موجود ہیں اور پرانے ناموں ہی سے مشہور ہیں مگر غذاؤں میں اگر میسر بھی آجائیں تو نہ وہ مہک ہے نہ وہ ذائقہ نہ وہ پہلا سا رنگ روغن ہے اور نہ وہ مال مسالہ جو پہلے استعمال ہوتا تھا۔

ان کھانوں اور مٹھائیوں کی دکانوں کے بعد اور اکبری دروازے سے پہلے لکڑی اور سینگ کی اشیا تیار ہوتے اور فروخت کیے جاتے تھے۔ اسی مقام پر چاندی اور سونے کے ورق بھی تیار ہوتے تھے۔ یہاں پہنچ کر نپی تلی کھٹ کھٹاہٹ ایک مخصوص سریلے پن کی حامل تھی لیکن راہگیر اکبری دروازہ میں کھلونوں اور برتنوں پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ آگے بڑھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس پھاٹک میں دونوں طرف لکڑی کے تختوں پر مٹی کے پھل اور حسین و نازک و سبک کھلونے خوبصورتی کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ دور سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر کھلونا بات کرنے پر آمادہ ہے۔ مٹی کے یہ مصنوعات اور ہاتھی دانت کے چھوٹے چھوٹے اشیا لکھنؤ کی مخصوص فنکاریوں میں شمار ہوتے تھے۔ باہر سے آنے والے ان چیزوں کو تحائف میں ضرور لے جاتے تھے۔ مٹی کے خوشنما اور نظر فریب سامانوں میں حقّے کے فرشی پینیدے، نقشی اور پھولدار آبخورے، پان رکھنے کی سادی اور رنگین ہانڈیاں، کاغذی صراحیاں اور طشتریاں بہت زیادہ دل پسند اور فرحت بخش اشیاء تھے۔ ان کاغذی اور روغنی صنّاعیوں پر لکھنؤ کو ناز تھا۔ اب نہ ان چیزوں کے قدردان ہیں اور نہ اُن کے صنّاع۔ بہت سے مصنوعات کے نام تک دنیا نے بھلا دیے ہیں۔ لکھنؤ کی پرانی تہذیب میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں اور جب وہ معاشرہ بدلا تو اُس کے لوازمات بھی ختم ہو گئے پھر بھی

یہ کہنا پڑتا ہے کہ کسی صنعت کا ختم ہو جانا ایک قومی المیہ ہے۔ اکبری دروازہ اب بھی موجود ہے، برتن اور کھلونے اب بھی فروخت ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں نے ساٹھ برس قبل کی بہاریں دیکھی تھیں وہ وہاں پہونچ کر خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

چوک کی سڑک جس کو موجودہ دور میں ایک لمبی اور سیدھی گلی کہنا زیادہ صحیح ہوگا بہت چوڑی نہیں ہے لیکن اُس زمانے میں گول دروازے سے اکبری دروازے تک ہر روز دوپہر کے بعد میلہ لگ جاتا تھا۔ عمائدین و خواتین کے لیے چوک میں جانا خلافِ شان تھا، شرفاء و عوام کا انبوہ سیر و تماشا کے لیے جمع ہوتا تھا ایک مختصر سی مسافت طے کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ قدم قدم پر دوستوں سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ساقی یعنی حقّہ پلانے والے نفیس و خوشبودار تمباکو کے بھرے ہوئے حقّے پیش کرتے تھے، بازار میں کھانا پینا معیوب تھا، بیشتر اہالیانِ لکھنؤ پان خرید کر کھانے سے بھی اجتناب کرتے تھے پھر بھی وسطِ چوک میں دو تین پان والوں کی دُکانیں تھیں۔ اُن کی جھلملاتی کلائیاں، دوپلّی ٹوپیاں، شربتی انگرکھے، سروں پر پٹّے اور اُن پٹّوں پر بڑے بڑے ریشمی رومال، آڑی ترچھی مانگیں اور کلّوں میں دبی ہوئی معطّر گلوریاں، من چلے نوجوانوں کو پان خرید کر کھا لینے پر راغب کر ہی لیتے تھے۔ اسی مجمع میں نوبت رائے نظرؔ اپنے بانکے ہمراہیوں کے ساتھ تفریح فرماتے تھے اور محشرؔ لکھنوی کے ایسے ثقہ اور متشرع بھی بجہ در کف نظر آتے تھے۔ دو طرفہ قریب قریب ہر بالاخانے پر طوائفیں رہتی تھیں جو اپنے کوٹھوں کے چھجوں پر اپنی تمام زیبائی و برنائی اور جمال و آرائش سمیت نیچے گزرنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتی تھیں، کبھی کبھی آنکھوں آنکھوں میں اشارے بھی ہو جاتے تھے۔ الھڑ جوان اور پُر تطریب جمائے راستہ چلتے اور کبھی کبھی سمت مخالف سے آنے والے سے ٹکرا بھی جاتے تھے۔ ایک بار ایسی ہی ایک نظارہ بازی میں ایک بھتیجے اپنے چچا سے ٹکرا گئے اور دونوں کو شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔ عموماً لوگ آہستہ خرام تھے مگر مجمع کی کثرت میں ایسے حادثات برابر پیش آجایا کرتے تھے۔ طوائفوں کے گھروں میں جانا عیب نہیں تھا لیکن عام طور سے شرفاء سر بازار اوپر چڑھ جانا پسند نہیں کرتے تھے پھر بھی یہ مشغلہ جاری ہی رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ زمانے نے کروٹ بدلی، پرانی قدروں کی جگہ لینے کے لیے نئی تہذیب آگے بڑھی، لوگوں کے مذاق بدلے اور نئے مذاق نے امین آباد مارکیٹ کی بنیاد ڈالی پھر سارا ماحول اس طرح بدلا کہ دُکانیں ویران ہوئیں اور ہوتے ہوتے ہمارا وہی چوک، بے چارگی اور کس مپرسی کا شکار ہو گیا۔ اب یہ عالم ہے کہ ہر وقت بیوگی طاری رہتی ہے۔

## (۷) اشیاء کی قیمتیں اور ارزانی

بازاروں اور منڈیوں سے اشیاء کی خریداری کے سلسلے میں غریب آدمیوں کو بھی کوئی خاص

زحمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک طرف تو عمائدین ورؤسا غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کی دستگیری میں کوتاہی نہیں کرتے تھے دوسری طرف ہر چیز سستی تھی۔ پرانے زمانے میں فارغ البالی کی اصل وجہ ارزانی تھی۔ رائج الوقت سکوں میں پیسوں کے علاوہ موٹے پیسے یعنی دھیلے، دمڑیاں اور کوڑیاں بھی شامل تھیں۔ باورچی خانہ کی چھوٹی چھوٹی ضروری چیزیں مثلاً ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادرک، پودینہ وغیرہ کوڑیوں کے بھاؤ سے اور لہسن، پیاز نیز بعض ترکاریاں جیسے لوکی اور کدو دھیلوں اور دمڑیوں میں خریدی جاتی تھیں۔ اچھی سے اچھی ترکاریاں پیسوں میں فروخت ہوتی تھیں۔ آنوں کا سوال ہی نہیں تھا۔ بازار کی تیار شدہ غذائیں بھی بہت ارزاں تھیں۔ غالباً ۱۹۰۴ء میں جب میں کم سن تھا، مجھے بہترین ناشتہ گھر بیٹھے مل جاتا تھا۔ نانا صاحب نواب حکیم شفاء الدولہ کے مکان واقع دلآلی محلہ متصل وکٹوریہ اسٹریٹ میں ہمارا قیام تھا اور ہر روز ایک سودے والا دو موٹے پیسوں میں ایک گاؤزبان اور جتنی بالائی اُس پر آجائے فروخت کر جاتا تھا۔ گاؤزبان لکھنؤ کی مخصوص ایجاد تھی جو نفاست اور نزاکت کے ساتھ نصف شیرمال کی شکل میں خالص گھی اور اصلی زعفران کے ساتھ تیار ہوتی تھی۔ گاؤزبان تو درکنار اب وہ بالائی بھی دستیاب نہیں ہوتی۔

میوہ جات بھی اسی تناسب سے ارزاں تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں عربی اسکول میں طالب علم تھا تو میری انّا اسکول جاتے وقت میری اچکن کی جیبوں میں چلغوزے بھر دیتی تھی جو میں دن بھر دوستوں کو تقسیم کر کے اسی طرح کھایا کرتا تھا جیسا کہ آجکل ہمارے اسکولوں کے بچے مونگ پھلی چبایا کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں چلغوزوں کا نرخ آج کل کی مونگ پھلی سے بھی مقابلتاً بہت کم تھا۔ غالباً دو آنے فی سیر کے حساب سے ملتے تھے۔ بادام آٹھ آنے فی سیر کے نرخ سے فروخت ہوتا تھا اور یہی قیمتیں دوسرے میوہ جات کی بھی تھیں۔ اسکول سے واپسی پر بھی میرا عصرانہ اسی طرح بہت کم خرچ تھا۔ میں ایک چپاتی پر مودی خانہ سے مسکا گھی کا ایک بڑا لوندا رکھ کر اور جاوا کی بڑے دانے والی شفاف شکر شامل کر کے اپنا خود ساختہ کریم رولس بنا کر کھا لیتا تھا۔ مسکا گھی جو اب عنقا ہے ایک روپیہ کا ڈیڑھ سیر ملتا تھا۔ یہ گھی موسم سرما میں بہت زیادہ سخت ہو جاتا تھا جس کا برتن سے نکالنا دقّت طلب ہوتا تھا۔ جاوا کی وہ شکر غالباً پچاس برس سے معدوم ہے، اُس زمانے میں چھ پیسے سیر ملتی تھی۔ اجناس وغیرہ کی ارزانی کے سلسلے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ ہمارے گھر میں ایک روپیہ کے گیہوں کا آٹا مہینہ بھر سے زیادہ چل جاتا تھا اور ایک چھوٹی کوٹھری ایک روپیہ کی لکڑی میں مملو ہو جاتی تھی۔ اُس زمانے میں ماش کی دال جانوروں کی غذا یا عمارات کی تعمیر میں استعمال ہوتی تھی۔ اگر کبھی اتفاقاً گھر والوں کے لیے ماش کی دال

کی ضرورت پڑ جاتی تو ملازم ایک چھوٹے پلنگ کی چادر میں دو موٹے پیسے باندھ کر بنیے کی دُکان پر پھینک دیتا تھا اور خود دُکان سے دور رہتا تھا تاکہ اتنی حقیر چیز خریدتے ہوئے اُس کو کوئی دیکھ نہ لے۔ بنیا سمجھ جاتا تھا اور اُسی چادر میں بغیر تولے ہوئے ماش کی دال باندھ کر گٹھری علیحدہ رکھ دیتا جس کو ملازم خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اٹھا کر چلا آتا تھا۔

ارزانی کا کم و بیش یہی حال ۱۹۱۴ء تک تھا۔ جب میں محلہ گولا گنج میں عمِ محترم نواب غلام حسین خاں مرحوم کی قربت میں رہتا تھا اور انگریزی اسکول کا طالب علم تھا۔ یہ تذکرہ اس لیے دلچسپ ہے کہ وہی پرانی بازار اب تک برائے نام تغیّر کے ساتھ برقرار ہے اور موجودہ دُکانوں کے مالک پرانے مالکان کے ورثا میں چنانچہ بزقصاب کی دُکان وہی ہے جو پہلے تھی لیکن اُس وقت یہاں بہترین گوشت چار آنے فی سیر کے حساب سے ملتا تھا جو اب دیکھنے میں بھی نہیں آتا۔ اجناس کی اسی پرانی دُکان پر موجودہ مالک کے دادا حاجی مخدوم بخش کے زمانے میں پلاؤ کا بہترین چاول چھ پیسے یا دو آنے فی سیر اور گھی ایک روپیہ میں دو سیر یا گراں ہوا تو ڈیڑھ سیر ضرور مل جاتا تھا۔ قریب ہی ایک بزرگ کی دُکان تھی جو سادے پان اور گلوریاں بھی فروخت کرتے تھے۔ پرانے طرز کے آدمی تھے، سر پر پٹے، جسم پر اچھا خاصا لمبا کرتا اور اٹنگا پائجامہ پہنتے تھے۔ خدا ترس اور خدا پرست انسان تھے۔ انھیں کی دُکان پر انڈے اور مرغ بھی مل جاتے تھے ایک اچھے اور فربہ مرغ کی قیمت آٹھ یا نو آنے ہوتی تھی اور ایک پیسہ میں ایک انڈا عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ موسم گرما میں کبھی کبھی یہ قیمت اور کم ہو جاتی تھی یعنی یہ کہ ایک پیسے میں دو انڈے مل جاتے تھے۔

اس ارزانی کے زمانے میں ہر چیز سستی تھی۔ کپڑے کا یہ حال تھا کہ شرفا و رؤسا کے سفید یا چابولا کے لیے بہترین چھالٹین چار آنے فی گز کے نرخ سے ملتی تھی۔ موسم گرما میں انگرکھوں کے لیے بہتر سے بہتر وضع اور ساخت کی جامدانی کا تھان ٹانڈہ ضلع فیض آباد کے بنکر خود آکر پانچ یا چھ روپے میں فروخت کر جاتے تھے موسم سرما میں دگلوں کے لیے نفیس سے نفیس اور خوش رنگ و خوش وضع اونی چھینٹ ایک یا ڈیڑھ روپیہ فی گز کے نرخ سے ملتی تھی۔ عوام کے پہننے کا لباس اور زیادہ سستا تھا۔ اُس زمانے میں شرفا اور عوام سب ہی زیر پائیاں پہنتے تھے جن کی جگہ آج چپل استعمال ہوتی ہے۔ زیر پائی آنوں کے بھاؤ سے فروخت ہوتی تھی۔ امرا و رؤسا مخملی جوتے پہنتے تھے جو بے پ نا ہوتے تھے۔ ایسے جوتے چمڑے کے بھی بننے لگے تھے جن کی قیمت ڈیڑھ یا دو روپیہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ میرے بچپن کے ایک دوست سیّد محمد مرتضیٰ عرف اعلا مرحوم نے حضرت گنج کی ایک انگریزی دُکان سے وارنش کا پمپ سوا چار روپیہ کو خریدا تھا۔ اعلا مرحوم کم سنی میں یتیم ہو گئے تھے اور اُن کو اُن کے

نانا نے پالا تھا اور وہی اُن کے کفیل تھے۔ اعلا مرحوم کے ایک عزیز ترین دوست عابد مرحوم تھے جن سے کبھی کبھی سخت لڑائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اتفاق سے اُسی روز لڑائی بھی ہو گئی۔ عابد مرحوم نے انتقاماً اُن کے نانا سے شکایت کر دی کہ اعلا نے سوا چار روپیہ کا جوتا خریدا ہے۔ یہ شکایت اعلا کو زد و کوب کرانے کے لیے کی تھی لیکن نانا سن کر خاموش ہو رہے اور اعلا غمگینی کے عالم میں سزا یابی کے منتظر رہے۔ نانا ریر پائی پہنتے تھے، وہ جوتے کے نرخ سے بھی ناواقف تھے۔ شام کو جب حسبِ دستور نانا کے رفقاء اور احباب جمع ہوئے تو انھوں نے اثنائے گفتگو میں فرمایا۔ "دیکھیے کیا زمانہ آگیا ہے کہ ٹانگ برابر کے لڑکے بوڑھوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ میں اعلا کو ماروں آج عابد نے یہ شکایت کی کہ اُس نے سوا چار روپیہ کا جوتا خریدا ہے۔ بتائیے صاحب! جوتا سوا چار روپیہ کا کہاں ہوتا ہے؟" یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ ارزانی کے زمانے میں لوگوں کو گرانی کا وہم بھی نہیں ہوتا تھا۔ جوتے کے لیے سوا چار روپیہ بہت زیادہ قیمت تھی جو ان بزرگِ محترم کے قیاس میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

## (۸) عمارات و باغات

لکھنؤ کو باغوں اور مرغزاروں کا شہر کہا جاتا تھا۔ فرمانروایانِ اودھ کو خوشنما باغات لگانے اور بلند و بالا، حسین و جمیل، مستحکم و استوار عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ آتے ہی اپنے عالیشان محل موسومہ "دولت خانہ" میں اقامت فرمائی تھی۔ یہ محل مچھی بھون قلعہ کے نزدیک تیار کرایا گیا تھا۔ مچھی بھون کا قلعہ مسمار ہو گیا لیکن "دولت خانہ" در و دیوارِ شکستہ کی شکل میں اب تک موجود ہے اور شیش محل کے نام سے موسوم ہے۔ اس محل کی عظمتِ پارینہ کے نشانات بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک موجود تھے جن کو دیکھنے اور نوابانِ شیش محل کے درباروں میں شرکت کرنے کا شرف صدہا مرتبہ راقم کو حاصل ہوا تھا۔ نوابانِ شیش محل کے مورثِ اعلیٰ نواب حکیم مہدی کو غازی الدین حیدر کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ اُن کا محل چار باغ میں اُس مقام پر تھا جہاں آج ریلوے اسٹیشن موجود ہے۔ اس اسٹیشن کی تعمیر کے لیے حکیم مہدی کی املاک حاصل کی گئی تھی اور بالعوض شیش محل دیا گیا تھا۔ یہ محل دولت خانۂ آصفی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے کھنڈرات اب بھی پرانی عظمتوں کی یاد دلاتے ہیں اور نوابانِ شیش محل کے ورثا اسی میں آباد ہیں۔ ذی مقدرت حضرات اپنے اپنے مقام ہائے سکونت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

آصف الدولہ کو سیر و شکار کا شوق تھا۔ اس ذوق کی آسودگی کے لیے انھوں نے بیباپور میں

ایک محل بنوایا تھا اور جنہٹ میں ایک کوٹھی موسومہ نزہت بخش تعمیر کرائی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک ان عمارتوں کے آثار موجود تھے۔ امتدادِ زمانہ سے اُن پر کیا گزری اور اب کیا حالت ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اُس جلیل القدر حکمران کی ممتازِ زمانہ یادگاریں بڑا امام باڑہ اور رومی دروازہ اب تک موجود ہیں۔ آصف الدولہ اپنے اسی امام باڑے میں مدفون ہیں اور اُن کی قبر اب تک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ پچاس ساٹھ برس قبل تک ہم لوگ برابر وکٹوریہ پارک گھومنے کے لیے جاتے تھے اور اسی دوران اس امام باڑے کی زیارت کے لیے رومی دروازے سے گزرتے ہوئے جایا کرتے تھے۔ یہ شوقِ زیارت اس لیے زیادہ تھا کہ اُس زمانے میں امام باڑے پر زبوں حالی طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ جدید اصلاحات کے بعد اب اس کی حالت سدھر گئی ہے اور یہ عدیم المثال عمارتیں اپنی فنکاری وصنعت کاری کی عظمتوں سمیت برقرار ہیں۔ آصف الدولہ کے زمانے کا ایک باغ موسومہ عیش باغ بھی تھا جس کی تعریفیں راقم نے اپنے بزرگوں سے سنی تھیں لیکن اب وہاں ایک بڑا محلہ آباد ہے اور اسی کے وسط میں چھوٹی لائن کا ریلوے اسٹیشن تعمیر ہے جو ایک زمانے میں بڑی اہمیت کا مالک تھا۔ یہ اہمیت اس ریلوے لائن کے چار باغ تک بڑھ جانے کے سبب سے بہت کم ہو گئی ہے۔

اسی زمانے کی یادگاریں لا مارٹینیر کی عمارتیں بھی ہیں جن میں مارٹن صاحب کی کوٹھی عجائبات میں شمار کی جاتی تھی۔ آصف الدولہ کو یہ عمارات اتنے پسند آئے تھے کہ انھوں نے فی الفور خریداری کا ارادہ کر لیا تھا لیکن قیمت کے سلسلے میں ہنوز گفتگو جاری تھی کہ نواب کا انتقال ہو گیا۔ مارٹن کی یادگار لا مارٹینیر کالج انگریزوں کے زمانے میں اپنے شباب پر تھا اور بڑی شہرت کا مالک تھا۔ عمارتوں کی داشت و پرداخت بھی توجہ سے ہوتی تھی لیکن پہلی سی توجہ اب نہیں ہے۔

سعادت علی خاں نے اپنے دورِ اقتدار میں غالباً تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ عمارات بنوائی تھیں خود اپنی اقامت کے لیے فرحت بخش اور حیات بخش کوٹھیاں تعمیر کرائی تھیں جو اب بھی چھوٹی چھتر منزل اور موجودہ ہائی کورٹ کی عمارت کے درمیان موجود ہیں۔ لال بارہ اپنے دربار کے لیے تعمیر کرائی تھی اور ٹیڑھی کوٹھی انگریز ریذیڈنٹ کی سکونت کے لیے بنوائی تھی۔ غدر کے بعد یہ عمارات بھی انگریزی حکومت کے قبضے میں آگئی تھیں۔ فرحت بخش اور متعلقہ عمارات میں اب محکمہ صحت کے ڈائرکٹر کا مرکز اور دیگر دفاتر ہیں۔ ٹیڑھی کوٹھی میں چیف کورٹ آف اودھ کے چیف جج رہا کرتے تھے لیکن اب وہاں ٹرانسپورٹ کے دفاتر ہیں اور پرانی ہیئت بالکل نظر نہیں آتی۔ ان عمارات کے علاوہ سعادت علی خاں نے دریا پار دل آرام کوٹھی، دل کشا کوٹھی تعمیر کرائی تھی اور موتی محل کی اصل عمارت بھی انھیں کی حیات میں مکمل

ہو چکی تھی۔ دل آرام کوٹھی اور دل کشا کوٹھی کے نمایاں آثار میرے عنفوانِ شباب تک موجود تھے۔ ممکن ہے کہ دل کشا میں اب بھی کچھ کھنڈرات نظر آجائیں لیکن اب وہاں پورا محلّہ آباد ہے اور ایک بڑی کالونی بن گئی ہے۔ موتی محل کی تکمیل غازی الدین حیدر نے کر دی تھی اور یہ مقام اب بہت اچھی حالت میں ہے۔ عمارات میں اضافے ہوئے ہیں اور باغ بھی اچھی حالت میں ہے گو کہ اس کا رقبہ بہت کم ہو گیا ہے۔

متذکرہ بالا عمارات کے علاوہ کوٹھی نور بخش اور خورشید منزل بھی سعادت علی خاں ہی کی طرف منسوب تھیں اور چار باغ بھی انھیں کا لگوایا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں ایک دوسرے سے متصل چار باغ تھے اسی لیے یہ نام دیا گیا۔ اودھ کے حکمرانوں کو اپنے گھوڑوں کے لیے بھی عالیشان عمارات بنوانے کا ذوق تھا۔ سعادت علی خاں نے جو بڑا اصطبل بنوایا تھا جو بڑی شہرت کا مالک تھا۔ واجد علی شاہ کے دور میں سلاخوں والا اصطبل مشہور تھا۔ غدر کے بعد اسی اصطبل میں دیوانی کچہری قائم ہوئی تھی جہاں مجھے برسوں وکالت کرنے کا شرف حاصل تھا۔ اب اس عمارت کا کوئی نشان باقی نہیں ہے اور نئی عمارت بن کر قریب تیار ہو چکی ہے۔

سعادت علی خاں نے اپنے مقبرہ کا کوئی انتظام اپنی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ وفات کے بعد وہ اسی علاقے میں مدفون ہوئے جہاں اُن کی بیگم کا مزار اب تک چھتر منزل کے حدود میں موجود ہے۔ یہ عمارات اُن کے جانشین غازی الدین حیدر نے بنوائی تھیں۔ یہ پہلے حکمران تھے جنھوں نے دلی کی سلطنت کا قلادۂ اطاعت دور کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اُن کی بہترین اور ممتاز زمانہ تعمیر شاہ نجف ہے جو حضرت علیؓ کے مزارِ مبارک کی اصلی شبیہ ہے۔ بادشاہ اور اُن کی بیگم اسی متبرک عمارت میں مدفون ہیں اور خود انھیں کے عطیات کی بدولت شاہ نجف اب بھی مقتدر حیثیت کا مالک ہے۔ غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے انھوں نے حضرت گنج کے علاقے کی بنیاد ڈالی تھی اور خود اپنے لیے ایک کربلا ڈالی گنج پار میں بنوائی تھی جہاں وہ مدفون ہیں۔ یہ کربلا بہت بڑے رقبے میں واقع ہے لیکن اُس کی ترقی و فلاح کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ حالات روز بروز خراب ہوتے رہے تھے۔ موجودہ صورتِ حال بہر حال بہتر ہے۔

آخری تین تاجدار محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ تھے۔ محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ امام باڑہ جو چھوٹا امام باڑہ کے نام سے موسوم ہے اور جہاں وہ خود مدفون ہیں ایک انتہائی خوبصورت اور سجی سجائی دلہن کہلانے کا مستحق ہے۔ انھوں نے اپنی حیات میں اس امام باڑے کی بقا اور فلاح کا اتنا مکمل انتظام کر دیا تھا کہ اُس کا کاروبار بڑے اور منظم پیمانے پر اب تک برقرار ہے۔ زمانے کی ستم شعاریوں نے بہت کچھ

دخل اندازی کردی ہے لیکن پھر بھی اس امام باڑہ کی عظمت بہت بڑی حد تک برقرار ہے۔ البتہ محلِ وقوع میں نظارگی کا جو حسن و جمال بادشاہ نے اس امام باڑے میں پیدا کرنا چاہا تھا وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور ان کا انتقال ہوگیا۔ اس امام باڑے کے ایک جانب عالیشان اور بہت خوبصورت جامع مسجد ہے۔ بادشاہ نے دوسری جانب ست کھنڈا تعمیر کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ سات منزل کی ایک کے اوپر دوسری منزل اور ساتویں منزل کے اوپر عالیشان قبہ بن جانے کے بعد امام باڑے کا حسن دوبالا ہو جاتا لیکن چند منزلوں سے زیادہ عمارت نہیں بن سکی۔ اُس کے منہدم کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ بعض لوگوں کو ست کھنڈے کا نام بھی یاد ہے لیکن اُس کے معرضِ وجود میں آنے کا حال دنیا بھول چکی اور غالباً آثار منہدم ہو جانے کے بعد ست کھنڈے کا نام بھی فراموش ہو جائے گا۔

امجد علی شاہ کی زیادہ تر توجہ حضرت گنج کے علاقے پر مبذول رہی۔ وہاں کی پرانی عالیشان عمارتیں انھیں کی کرم گستری کا نتیجہ تھیں اور سبطین آباد کا ایسا عظیم المرتبت علاقہ انھیں کی بدولت معرضِ وجود میں آیا تھا۔ یہاں اُن کی ابدی خواب گاہ ہے جس کا احترام کرتے ہوئے اُن کے بعد اُن کے جانشین واجد علی شاہ نے یہ تمام عمارات بنوائی تھیں جن کے داخلے کا عظیم الشان صدر دروازہ اب تک مال روڈ کے اوپر اپنی عظمتِ پارینہ کی یاد دلاتا ہے لیکن گزشتہ ساٹھ ستر برس میں پے درپے جو شرمناک و عبرتناک واقعات و حالات رونما ہوتے وہ سبطین آباد کے حالِ زار پر ہم کو خون کے آنسو رلاتے ہیں اور کہنا پڑتا ہے کہ اچھا ہوا واجد علی شاہ اس سرزمین پر دفن نہیں ہوئے۔ اس آخری تاجدار نے چھتر منزل اور قیصر باغ کی عمارات اپنی مایۂ ناز یادگاریں چھوڑی تھیں۔ ایک کو چھوٹی چھتر منزل کہا جاتا ہے کہ غفلت و جہالت کی بدولت منہدم ہوگئی۔ اصلی چھتر منزل انگریزوں کے دور میں یونائیٹڈ سروس کلب کے استعمال میں آتی تھی لیکن اب فلاحِ عامہ کا کاروبار وہاں جاری ہے اور معالجات ایجاد کرنے کا مرکزی محکمہ کامیابی کے ساتھ تجربات میں مشغول ہے۔ قیصر باغ اپنی اصلی چہار دیواری میں بہت کچھ کھو چکا ہے۔ اس کے شمالی اور جنوبی صدر دروازے ایک مدت قبل ختم ہو چکے تھے۔ اس کے چاروں طرف جو خوشنما اور دیدہ زیب راستے مشرقی انداز میں بنائے گئے تھے وہ ملیا میٹ ہو چکے ہیں۔ میری طالب علمی کے زمانے تک چھتر منزل سے قیصر باغ تک اور قیصر باغ کے مغربی پھاٹک کی سمت بھی نیز مشرق میں مینا بازار گیٹ تک دو رویہ مہندی کے درختوں کی جھاڑیاں موجود تھیں جو خوشنمائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ نئی سڑکوں کی تعمیر میں ہمارا مشرقی اندازِ خوشنمائی فنا کے گھاٹ اُتر گیا۔ قیصر باغ کی عمارتیں اودھ کے تعلقداروں کو تقسیم کر دی گئی تھیں اس لیے محفوظ اور اپنی اصلی رنگت و صورت

میں ہیں۔ وسطِ قیصر باغ میں سفید بارہ دری ہے جس کا نام بادشاہ نے "قصرِ عزار" رکھا تھا یہاں تعلقداران اودھ کی انجمن کا دفتر ہے اور بڑی حد تک اچھی حالت میں ہے۔ لیکن میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ وہ چھوٹی سنگِ مرمر کی سفید بارہ دری جو اب بنارسی باغ میں نصب ہے ابتداءً قیصر باغ ہی میں تھی اور جو چاروں پتھر والے پریوں کے مجسمے وہاں ہیں وہ بھی اسی بارہ دری کے چاروں جانب نصب تھے۔ واجد علی شاہ بیشتر راتوں کو موسمِ گرما میں اسی چھوٹی بارہ دری میں آرام فرما لیتے تھے۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد راتوں کو بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے تھے اور آنے والے زار و قطار روتے تھے لہٰذا انگریزی حکومت نے اُس بارہ دری کو بنارسی باغ منتقل کر دیا جہاں شہریوں کا پہنچنا دشوار ہو گیا تھا۔

شاہانِ اودھ سے متعلق مندرجہ بالا واقعات کا تاریخی پس منظر میں مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ آصف الدولہ کے بعد اُن کے جانشینوں نے وسط لکھنؤ کے علاقوں کو ترقی دینے کی کوشش کی تھی۔ اور آخری دور تک یہ توجہ مشرقی منزل تک پہونچ گئی تھی۔ پرانی آبادی بہر حال مغربی علاقوں ہی تک محدود رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی پرانی معاشرت کا اثر اب تک مغربی لکھنؤ میں بڑی حد تک موجود ہے۔

شہر کے باغات اور مرغزاروں کی تعداد انھیں ناموں تک ختم نہیں ہوتی جو متذکرہ بالا حالات میں پیش کیے گئے ہیں۔ میرے لڑکپن بلکہ عنفوانِ شباب تک عالم باغ، صفدر باغ، سندر باغ، بندریا باغ، ڈالی باغ، بنارسی باغ، سکندر باغ، کمپنی باغ اور دیگر چند باغات کا تفریح گاہوں میں شمار تھا اُس زمانے میں رؤسا، شرفاء، عوام اور تمام شہری علاوہ تاجروں اور دوکانداروں کے شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے۔ ہر محلّے میں یا اُس کے قریب کوئی بڑا باغ یا مرغزار تھا۔ آبادی بڑھی اور نئے محلّے تعمیر ہوئے تو ان باغات کے نام پر محلّے تعمیر ہو گئے۔ جیسے چار باغ، نظر باغ، عیش باغ عالم باغ، صفدر باغ، سندر باغ، ڈالی باغ، بندریا باغ وغیرہ۔ بنارسی باغ میں زندہ عجائب گھر کھلا اور سکندر باغ میں محکمہ نباتات قایم ہو گیا۔ بادشاہ باغ میں کیننگ کالج قایم ہوا۔ جس زمانے میں مجھے وہاں تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل تھا ایک بڑے رقبے میں امرود وغیرہ کے باغات موجود تھے۔ لیکن اب ان کی جگہ عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔ اسی باغ میں ایک بارہ دری اور ایک عالیشان کوٹھی تھی جو کبوتر والی کوٹھی کہلاتی تھی۔ بارہ دری اندر اور باہر سے بہت خوبصورت تھی۔ اسی پر اُسی زمانے میں دبلا آنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے زمانے میں یہاں علومِ مشرقیہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ بعد ازاں یہاں چارخانہ قایم

ہوگیا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وجود میں آنے کے بعد پہلے وائس چانسلر کبوتر والی کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُس کی شکل بدلی اور اب وہاں رجسٹرار کے دفتر سے متعلق کمرے تعمیر ہوگئے ہیں۔ گزشتہ پچاس برس میں دیکھتے دیکھتے پرانے طرز کے تمام باغ اور لالہ زار ختم ہوگئے اور نئے نئے پارک معرضِ وجود میں آگئے ہیں۔ اِس طرح ہماری مشرقی تہذیب کے ظاہری نمونے بھی اب شہر میں نظر نہیں آتے۔

## (۹) ذرائع نقل و حمل

پرانے شہر لکھنؤ کی آبادی متحمّل اور پُرسکون تھی، تجارتی شور و شغف کا نام نہیں تھا، کشمکشِ حیات کی جدّوجہد سے لوگ آشنا نہیں تھے، ایسے ماحول میں نہ طویل آمد و رفت تھی اور نہ رسل و رسائل میں دشواریاں درپیش ہوتی تھیں۔ صنّاع و فن کار اپنا اپنا سامان بہ آسانی ایک سے دوسری جگہ خود ہی لے جاتے تھے۔ سودے والوں، خونچہ والوں، اور دوسرے چھوٹے دُکانداروں کو بھی کسی سہارے کی محتاجگی نہیں تھی۔ منتقلیِ مکان یا سامان یا اسبابِ کاروبار کے لیے بھی دورِ حاضر کی طرح ٹرکوں اور بڑی بڑی گاڑیوں کی حاجت نہیں ہوتی تھی۔ سادہ زندگی بسر کرنے والوں کے لیے کھڑکھڑے یا زیادہ سے زیادہ ٹھیلے کافی ہوتے تھے۔ باربرداری کے یہ وسیلے بھی چوڑے راستوں میں کارآمد ہوسکتے تھے۔ گلیوں اور کوچوں میں باربردار مزدور ہی کام آتے تھے۔ جہاں تک آدمیوں کے لیے سواری کا معاملہ تھا شہر میں صرف یکّوں یا بند شکرم گاڑیوں کا رواج تھا۔ یہ سواریاں بھی دور جانے کے لیے درکار ہوتی تھیں۔ چوک سے امین آباد یا حضرت گنج یا کچھ اور فاصلے پر جانے کے لیے تین چار پیسے سواری کے حساب سے یکّہ مل جاتا تھا۔ شکرم گاڑی کا نرخ ایک روپیہ سے زیادہ نہیں تھا جس کی ضرورت بہت خاص خاص مواقع پر پڑتی تھی۔ شرفاء و عوام زیادہ تر پیدل چلنے کے عادی تھے۔ اور گلیوں گلیوں آسانی اور تیزی سے راستہ طے کرلیتے تھے۔

رؤسا و عمائدین اپنی اپنی قیمتی اور خوبصورت سواریوں پر شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے۔ اس کے علاوہ باہر نکلنے کے وہ لوگ زیادہ خوگر نہیں تھے۔ مستورات ڈولیوں چوپہلوں اور فینس پر نکلتی تھیں۔ بعض رؤسا بھی عمدہ اور زرق برق چوپہلوں اور فینسوں پر نکلتے تھے۔ اُن کے لیے ایک مجبوری یہ تھی کہ بہت سے محلّوں میں گاڑی گھوڑے کا گزر ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سواریاں صرف چوڑے راستوں میں کام آتی تھیں۔ فینس اور چوپہلے کی سواریوں کا انتظام موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں ختم ہوگیا تھا اور قریب قریب اُسی زمانے میں شکرم گاڑی بھی ختم ہوکر تانگہ رواج پاگیا تھا۔ رکشا بہت بعد کی پیداوار

ہے۔ بائیسکل پر سوار ہونے کا چلن بھی بیسویں صدی کے اوائل میں نہیں تھا۔ موٹر کاریں عنقا تھیں۔ انگریزوں کے پاس ابتدا میں دو ایک گاڑیاں تھیں۔ راجگان نے جب موٹر خریدے تھے تو پہلی دشواری ڈرائیوروں کی دستیابی میں پیش آئی تھی اور جو ڈرائیور ملتے بھی تھے وہ اپنے مالکوں کو طرح طرح سے لوٹا کرتے تھے۔ مجھے ذاتی طور سے معلوم ہے کہ مرحوم راجہ صاحب بہادر والی محمود آباد نے جب شروع شروع میں موٹر خریدی تھی تو اُن کا ڈرائیور ہر مہینے میں ایک بڑا ٹین گھی کا گاڑی کو چکنانے کے لیے وصول کیا کرتا تھا۔ ایسا دور کئی برس تک چلتا رہا تھا۔

بعض کرایہ کی گاڑیاں اور یکے بہت عمدہ اور دیدہ زیب ہوتے تھے۔ جانور بھی اچھی نسل کے ہوتے تھے اور ساز و سامان بھی زرق برق ہوتا تھا لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جن پر بیٹھنے سے نہ بیٹھنا ہی بہتر ہوتا تھا۔ یکے والے افیونی اور گھوڑے سوکھے اور مرے ہوئے ہوتے تھے۔ پھر بھی ان کو سواریاں مل جاتی تھیں۔ شہر میں ہر طبقے کے لوگ شیریں کلام اور خوش گفتار تھے۔ بیشتر کی آوازیں بھی سریلی تھیں اور قریب قریب سب ہی فقرے چست کرنے میں مشّاق تھے۔ راستے میں سواریوں سے بات کرنا بھی معیوب نہیں تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے دلچسپ ظرائف و لطائف مشہور تھے لیکن یاد ش بخیر شوکت تھانوی کی زبانی جو واقعہ سنا تھا وہ قابلِ ذکر ہے۔ حفیظ جالندھری پہلی بار لکھنؤ آئے تھے اور شوکت تھانوی کے ہمراہ کسی شاعر سے ملنے جا رہے تھے۔ راستے میں ان دونوں کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں اُن کو سن کر یقیناً یکے والا یہ سمجھ گیا ہو گا کہ دونوں بزرگ خوشحال، فارغ البال اور تعلیم یافتہ ہیں۔ حفیظ صاحب کو عجلت تھی اور گھوڑا چلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا، وہ تیز چلنے کا برابر تقاضہ فرما رہے تھے۔ بالآخر یکے والے نے عاجز آ کر گھوڑا روک لیا اور حفیظ صاحب سے مخاطب ہو کر دست بستہ ان الفاظ میں تخاطب کیا تھا: ”حضور! کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ خود مجھے ارمان نہ ہو گا کہ میرا گھوڑا تیز چلے مگر کیا عرض کروں کہ ایسا آرام طلب گھوڑا ہے کہ کسی وضعداری میں فرق نہیں آنے دیتا۔ اللہ جانے کسی رئیس کا چشم و چراغ ہے یا ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور اس کے ساتھ گستاخی کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔“ گویا کہ آرام طلبی رئیسوں یا تعلیم یافتہ لوگوں کا شعار تھی۔

## دوسرا باب

# رؤسا و اُمرا اور اُن کی معاشرت

۱۔ محل، محلسرائیں، ڈیوڑھیاں
۲۔ وضع قطع، رہن سہن
۳۔ خانگی زندگی
۴۔ ملازمین و مقربین
۵۔ دربار اور بیرونی معاشرت
۶۔ دسترخوان
۷۔ وضعداریاں

زوال آمادہ لکھنؤ میں بہت سے عمائدین، روٴسا، اور شہزادگان اس شہر کی تہذیب و معاشرت کے علمبردار تھے۔ اُن کا تمام کردار اور طور طریقے اُن خوبیوں کے آئینہ دار تھے جن کے لیے لکھنؤ ممتاز تھا۔ یہ لوگ فرمانروایانِ اودھ کے اعزا و اقارب یا وزرا اور دیگر متوسلین و مقربین کے اخلاف میں تھے۔ اس لیے پرانے دور کے کلچر اور روایات کو زندگی بھر کلیجے سے لگائے رہے۔ راقم کو بھی ایسے ہی خانوادے سے متعلق ہونے کا شرف حاصل ہے۔ میرے مورثِ اعلیٰ خان علامہ نواب تفضل حسین خاں تھے جو نہ صرف دولت و ثروت، منصب و اقتدار اور شہرت و عزت کے مالک تھے بلکہ اپنے کمالِ علم و فضل کی بدولت ہر طبقے میں اُن کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ اسی رشتے کی برکت سے مجھے قریب قریب ہر رئیس اور امیر کے دربار میں عزت حاصل تھی اور اُن سب کا عروج اور زوال میں نے دیکھا تھا۔ انھیں حالات کو پیش کر دینا میرا اصل مقصد ہے اور میرا بیان انھیں بزرگوں کے حالات تک محدود ہے جن کی معاشرت کے نمونے میں نے دیکھے تھے اور جو حقیقتاً لکھنؤ کی ثقافت و تہذیب کے پورے پورے نمائندے تھے۔

## (۱) محل، محلسرائیں، ڈیوڑھیاں

محل، محلسرا، ڈیوڑھی۔ یہ تینوں الفاظ بظاہر ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں اور عام طور سے لوگ ان میں فرق نہیں کرتے لیکن حقیقتاً یہ تینوں نام علیحدہ علیحدہ طرز کی عمارتوں کے لیے مخصوص تھے۔ محل اُس بلند و بالا اور عالیشان عمارت کو کہتے تھے جس میں کسی رئیس کی رہائش ہوتی تھی۔ یہ عمارت صرف ایک قطعہ تعمیر کی ہوتی تھی۔ برخلاف اس کے محلسرا، ایک سے زیادہ یعنی کئی قطعات پر مشتمل عمارات کا نام تھا۔ محلسراؤں میں زنانے اور مردانے حصے علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے اور ایسی املاک وسیع و عریض ہوتی تھی۔ ڈیوڑھی کا لقب صرف شہزادگان اور ورثائے شاہان کی اقامت گاہوں کے لیے مخصوص تھا جیسے چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی، سلیمان قدر بہادر کی ڈیوڑھی وغیرہ وغیرہ۔ ڈیوڑھیاں، محلسراؤں سے زیادہ وسیع ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وزیروں کی بہت وسیع و عریض محلسراؤں کو بھی ڈیوڑھی کہا جاتا تھا جیسے غازی الدین حیدر کے وزیر آغا میر کی املاک ڈیوڑھی کے نام سے اس طرح مشہور ہوئی کہ پورا محلہ ڈیوڑھی آغا میر کے نام سے منسوب ہو گیا۔ ان تینوں طرز کی جائدادوں کے علیحدہ علیحدہ نام بہرحال بیسویں صدی کے اوائل میں کسی نمایاں فرق کے حامل نہیں تھے کیونکہ بہت سے لوگوں کی محلسرائیں ڈیوڑھیاں کہلانے لگی تھیں اور متعدد محلسرائیں صرف

ایک محل باقی رہ گئی تھیں۔ رؤسا و امرا کی ایسی املاک اور جائدادیں شہر کے قریب قریب ہر محلّے میں تھیں۔ ایسے ہر محلّے میں کوئی نہ کوئی رئیس اور بعض محلّوں میں متعدد مقتدر ہستیاں تھیں۔ ان سب کے مکانات عموماً محلسرائیں کہلانے لگے تھے اور ان کے محلوں کو کوٹھی کے نام سے بھی ملقب کر دیا گیا تھا حالانکہ کوٹھی عام طور سے قامت اور وسعت میں محل کے اصل مفہوم میں چھوٹی ہوتی تھی۔

ہمارے یہ امرا و عمائدین کثیر املاک اور بڑی بڑی جائدادوں کے مالک تھے۔ انھیں میں بعض رئیسوں کی ایک سے زیادہ قیام گاہیں تھیں جہاں وہ اپنی حسبِ خواہش وقتاً فوقتاً قیام کرتے تھے۔ اور اس قیام کی مدت بھی انھیں کی مرضی پر منحصر رہتی تھی۔ ان سب قیام گاہوں میں علیحدہ علیحدہ تمام ضروریات ہمہ وقت فراہم رہتے تھے۔ اس ذیل میں نواب سید اصغر حسین مرحوم کا نامِ نامی سب سے پہلے یاد آجاتا ہے۔ موصوف خانوادۂ غفران مآب کے ایک مقتدر فرد تھے۔ آپ کی بیگم تاجدارِ اودھ نصیر الدین حیدر کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور کثیر دولت و ثروت کی مالک تھیں۔ زر و جواہر بہتات کے ساتھ اُن کے قبضے میں تھے۔ اور مختلف محلّوں میں اُن کی جائدادیں تھیں۔ نواب اصغر حسین مرحوم کا آبائی مکان جس کو محل کہنا صحیح ہوگا محلّہ پاٹا نالہ میں واقع تھا، اُن کی دوسری املاک محلّہ نرہٹی میں ایک وسیع و عریض محلسرا تھی اور تیسرا قابلِ رہائش محل اُن کے عالیشان باغ واقع محلّہ علی گنج میں تھا۔ نواب صاحب مرحوم کبھی پاٹا نالہ کبھی نرہٹی اور کبھی علی گنج میں اقامت فرماتے تھے بالآخر نواب حسن نرہٹی کے لقب سے مشہور ہوئے اور زیادہ تر وہیں قیام رہنے لگا تھا۔ اُن کی محلسرا بہت سے قطع و برید کے بعد اب بھی نرہٹی میں موجود ہے اور اُن کے باقیات الصالحات اُسی محلسرا میں مقیم ہیں۔ ایک سڑک بھی اُن کے نام سے موسوم ہے جو اُن کی رہائش گاہ سے متصل گزرتی ہے۔

اسی مشرقی حلقے میں دو اور عمائدینِ شہر کی سکونت تھی جن میں ایک کا تعلق خاندانِ شاہی سے تھا۔ اُن کا نامِ نامی نواب وزیر مرزا تھا اور اُن کی املاک وہ علاقہ تھا جو اب بھی جولکھی کے نام سے موسوم ہے۔ جولکھی ابتدا میں یکے بعد دیگرے ملحقہ چند مکانات تھے جن کا مالک ایک شاہی نائی مسمّی عظیم اللہ تھا۔ اُس نے ان مکانات کو پیچ در پیچ طرز پر بنوا کے اُن کا سلسلہ دور تک قائم کر دیا تھا۔ واجد علی شاہ کو اُن کا طرز پسند آیا اور چار لاکھ روپیہ عطا کر کے اُن مکانات کو خرید لیا تھا۔ اُسی وقت سے یہ املاک جولکھی کے نام سے موسوم ہو گئی تھی۔ اُس زمانے میں نواب خاص محل اور بعض دیگر محلات وہاں مقیم تھیں غدر کے زمانے میں حضرت محل کا بھی قیام رہا تھا۔ نواب وزیر مرزا کا تعلق دلّی کے خاندانِ مغلیہ سے تھا۔ بالآخر انھوں نے اس تمام املاک کو خرید ا اور اُن کا خاندان یہاں آباد ہو گیا۔ اس خاندان کے افراد تہذیب اور

شائستگی کے مالک تھے اور علم و ادب کے دلدادہ تھے لیکن جب زوال آیا تو بہت تیزی کے ساتھ تباہی آگئی۔ اب صرف چونکھی کا نام باقی رہ گیا ہے اور ایک نیا محلّہ آباد ہوگیا ہے۔ پرانی ساری شان و شوکت رخصت ہوگئی۔

دوسری بزرگ و محترم ہستی اس نواح میں نواب شفیع علی خاں المعروف بہ نواب بڈھن صاحب کی تھی۔ اُن کی محلسرا، محلّہ گھسیاری منڈی میں تھی۔ راقم کو متعدد بار حاضرِ خدمت ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ موصوف بے حد خوش اخلاق، متواضع اور مخیّر تھے۔ دوسرے رئیسوں کی طرح اُن کو بھی علم و ادب سے ذوق تھا۔ شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اُن کے بہترین اور بے تکلّف دوست مرزا محمد ہادی رسوا تھے۔ اپنا مکان فروخت کر کے انھیں کے یہاں مقیم ہو گئے تھے۔ اُن کے دربار میں حسبِ دستور زمین کا فرش تھا لیکن ایک سمت کرسیاں اور صوفے بھی لگے رہتے تھے۔ غالباً وہ واحد رئیس تھے جن کے مذاق میں اتنی انگریزیت داخل ہوگئی تھی کہ اپنے محل کی آرائش و زیبائش برطرزِ جدید بھی کرنے لگے تھے حالانکہ بے حد متین و شائستہ بزرگ تھے اور مشرقیت کے پرستاروں میں تھے۔ اب نہ وہ محل باقی ہے اور نہ اولادِ نرینہ میں کوئی بقیدِ حیات ہے۔ ان کی محلسرا کی نشانی تک ختم ہوگئی اور اُن کے صاحبزادے جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔

وسطی حلقہ بہر حال پرانا علاقہ تھا جو عہدِ آصفی میں آباد ہوا تھا، یہاں متعدد رؤساء و عمائدین کے محل، محلسرا اور ڈیوڑھیاں تھیں لیکن یہ سب کی سب گزشتہ ساٹھ برسوں میں اس طرح مٹ چکی ہیں کہ بعض کے نام و نشان تک اب باقی نہیں ہیں۔ امین آباد اور نظیر آباد جن کو آج بڑی شہرت حاصل ہے کل یہاں چھوٹے چھوٹے مکانات اور چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ امجد علی شاہ کے وزیر امین الدولہ نے یہ محلّہ آباد کیا تھا اور انھیں کے نام پر امین آباد نام رکھا گیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں امین آباد اور نظیر آباد کے علاقے نواب غنی بہادر مرحوم کے قبض و تصرف میں تھے اور موجودہ امین الدولہ پارک کا علاقہ اور اُس سے متصل سمتِ جنوب نواب صاحب عالم کی محلسرا اور املاک تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں رئیسوں کے اخلاف اب بھی چھوٹے چھوٹے مکانوں میں موجود ہوں لیکن یہ خاندان ۱۹۱۰ء میں بری طرح تباہ و برباد ہوگیا تھا چنانچہ اسی خاندان کا ایک فرد نواب سن دنش ہی کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ آخری دور میں اس خانوادے میں نواب سلطان بہادر مرحوم بہت اچھے آدمی تھے۔ بے انتہا خوش گفتار اور وضعدار انسان تھے۔ ڈاکٹر ٹکّو مرحوم کے یہاں اُن کی روزانہ نشستیں رہتی تھیں۔ وہاں ایک اور بزرگ نواب چھمّن صاحب بہت دلچسپ آدمی

تھے۔ یہ دونوں پرانے لوگ جمع ہو جاتے تو لکھنؤ کی شیرینیٔ زبان سننے اور آدابِ محفل کے لوازمات دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملتا تھا۔ کبھی گھنٹوں ضلع جگت میں باتیں ہوتیں اور کبھی ہم عصر شعراء کا کلام پڑھا جاتا تو کبھی ممتاز طوائفوں کے حالات پر تبصرہ ہوتا۔ لکھنؤ کی یہی وہ صحبتیں تھیں جواب کہیں دیکھنے اور سننے میں نہیں آتی ہیں۔

اسی املاک سے متصل اور موجودہ امین الدولہ پارک کے سمتِ شمال دلّی کے ایک شہزادہ کی بہت لمبی اور چوڑی محلسراء تھی جس کو صحیح معنوں میں لفظ ڈیوڑھی سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ان شہزادہ صاحب کا نامِ نامی یاد نہیں رہا حالانکہ اُن کے دو صاحبزادوں جہانگیر قدر اور عالمگیر قدر سے بہت گہرے دوستانہ تعلّقات تھے۔ عالمگیر قدر خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ اور خوش گفتار انسان تھے۔ نوجوانی کی وہ صحبتیں یاد رہیں گی جب یادش بخیر جوشؔ ملیح آبادی، رفیع احمد خاں، عالمگیر قدر اور بعض دوسرے احباب کی معیّت میں ہماری شامیں سرشار رہتی تھیں اور لکھنؤ کے پرانے چوک میں کہیں نہ کہیں گرمیٔ صحبت کے مزے حاصل ہوا کرتے تھے۔ اس خاندان کی عظمت کا صرف انھیں کی محلسراء کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس املاک کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس کی دیوار سمتِ شمال گوئن روڈ کے موجودہ چوراہے سے جہاں سے کچہری روڈ شروع ہوتی ہے امین آباد کے اُس علاقے تک جہاں اسی سڑک پر مسجد واقع ہے چلی گئی تھی اور اُس کے پیچھے والی دیوار اُسی قدر لمبائی میں اُس جگہ واقع تھی جہاں آج سنٹرل ہوٹل کا صدر دروازہ ہے۔ محلسراء کا داخلے والا دروازہ موجودہ گوئن روڈ کی طرف تھا اور اسی صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد متعدد آراستہ و پیراستہ مجلّا و مصفّا ہال اور کمرے تھے جہاں باپ اور بیٹوں کی علیحدہ علیحدہ نشست گاہیں تھیں۔ آرایش کا سامان بھی بہت دیدہ زیب اور قیمتی تھا اب نہ املاک ہے اور نہ کوئی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ۔ یہاں تک کہ اس خاندان کی کوئی فرد بھی غالباً لکھنؤ میں باقی نہیں رہی۔

امین آباد سے متصل محلہ تالاب گنگنی شکل میں ممتاز و مقتدر ڈیوڑھی پرنس نورالدین مرزا کی تھی جو غالباً شہزادہ دارا سطوت کی اولاد میں تھے۔ یہ امر بہر حال یقینی ہے کہ اُن کا سلسلہ خاندانِ شاہی سے تھا اور وہ بڑی شان و شوکت اور کرّ و فر سے اپنی زندگی بسر کر لے گئے۔ مجھے اُن کے درباروں میں حاضری کا کبھی موقع نہیں ملا البتہ اشتیاقِ زیارت ضرور تھا کیونکہ اُن کی شکل و شباہت کے بڑے شہرے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک بار اتفاقیہ طور پر اُن سے ملاقات بھی ہوئی اور کچھ دیر

بات کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ اُن کی باتوں میں بہت مزا تھا۔ خوش گفتار تھے اور بے حد حسین و جمیل تھے۔ مشہور تھا کہ شہر میں اُن کا حسن اپنی آپ مثال تھا۔ جب میں نے دیکھا تھا اُس وقت بھی وہ بہت خوبصورت تھے اور معلوم ہوا کہ آخر عمر تک اُن کے جمال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بچپن میں اُن کے والدین نے اُن کے سر پر منّت کی چوٹی رکھا دی تھی جو عنفوانِ شباب تک برقرار رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا تھا اُس وقت اُن کے سر پر بہت خوشنما پٹے تھے اور گالوں پر ٹھپکے بھی دیکھنے میں بہت اچھے نظر آتے تھے۔ داد و دہش کی خصلت بہر حال موروثی تھی۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ بڑی خوبیوں کے رئیس تھے۔

اسی محلّے سے متصل محلّہ مولوی گنج میں شہزادہ سلیمان قدر کی ڈیوڑھی تھی۔ اس ڈیوڑھی کا رقبہ بہت وسیع تھا جو ایک بڑے احاطے میں محصور تھا۔ وہ احاطہ سلیمان قدر کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ نواب سلیمان قدر کا تعلق براہِ راست شاہی خاندان سے تھا۔ وہ بڑے کرم گستر اور ادب نواز شہزادے تھے۔ شہر کے ممتاز شعرا اور بعض علماء اُن کے دامنِ دولت سے متمسک تھے۔ اُن کے صاحبزادے پرنس ثریّا قدر اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور پرنس ثریّا قدر کی بھی صرف ایک صاحبزادی تھیں جو کلکتہ کے ایک رئیس نواب زادہ ہمایوں جاہ سے منسوب ہوئی تھیں۔ نواب زادہ کا سلسلہ بنگال کے نواب مرشد آباد کے خانوادے سے تھا اور کچھ رشتہ میسور کے ٹیپو سلطان کے خاندان سے بھی تھا۔ وہ اپنے عقدِ مناکحت کے بعد لکھنؤ ہی میں بس گئے تھے بہت زیادہ میل ملت کے خوش اخلاق بزرگ تھے۔ میری اُن سے بے تکلفانہ دوستی تھی اور پرنس ثریّا قدر کی خدمت میں بھی مجھے نیاز حاصل تھا۔ یہ خاندان بُری طرح تباہ ہوگیا۔ نواب زادہ کی اہلیہ پہلے اور وہ خود بعد میں لاولد فوت ہوگئے۔ اس طرح گھر بے چراغ ہوگیا۔ اور عمارات کھنڈرات میں تبدیل ہوگئیں۔

وسطِ لکھنؤ دو ممتاز محلوں پر مشتمل تھا۔ گولا گنج اور وزیر گنج۔ گولا گنج میں ایک سمت پرنس حیدر مرزا کا محل تھا۔ اُن کا تعلق خاندانِ شاہی سے تھا۔ اسی لیے وہ حسین آباد مبارک کے ٹرسٹی بھی رہا کیے تھے۔ بڑی آن بان کے بزرگ تھے۔ اُن کے بہترین اور بے تکلف دوست سید محمد یوسف کاظمی تھے۔ جن کی مجلسرا پرنس حیدر مرزا کے محل سے قریب ہی تھی۔ کاظمی صاحب کے یہاں ہر روز شام کو محلّے کے شرفا جمع ہوتے تھے اور دلچسپ صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ انھیں میں ایک بزرگ قربان حسین مرحوم تھے جن کو ہم سب (FATHER OF ALL) یعنی سب کا باپ

کہتے تھے کیونکہ وہ ہم سب کو بہت زیادہ شفقت سے نیکی پر چلنے کی راہیں دکھاتے تھے۔ مجھ کو ماہِ صیام میں روزہ رکھنے کی ترغیب دیتے تھے اور ہر تیسرے چوتھے روز لکھنؤ کا مخصوص نرم و نازک حقّہ معطر کر کے تحفتاً دیا کرتے تھے تاکہ افطارِ صوم کے بعد اُس کو پی کر لذت حاصل کروں۔ جس بزرگانہ شفقت سے وہ پیش آتے تھے اُس کی مثال اب کہیں نہیں ملتی۔ اس مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ شہر کا یہی وہ علاقہ تھا جہاں انگریزیت سب سے پہلے قبول کر لی گئی تھی اور عمائدین کے دوستانہ روابط انگریز حکام سے قائم ہو گئے تھے۔ انھیں تعلقات کی بنا پر یوسف کاظمی صاحب اور پرنس حیدر مرزا کو آنریری مجسٹریٹی کے عہدے تفویض کر دیے گئے تھے۔ تیسرے بزرگ میرے عم محترم نواب غلام حسین خاں مرحوم تھے جو لائف مجسٹریٹی کے منصب سے سرفراز کیے گئے تھے۔

نواب غلام حسین خاں مرحوم کی محلسرا وسطِ گولا گنج میں تھی۔ وہ بہت زیادہ نفاست پسند تھے اور نازک مزاج بھی تھے۔ دولت و ثروت کے مالک تھے اور صاحبِ اقتدار بھی تھے۔ اُن کو لوگ اپنے محلّے میں بے تاج کا بادشاہ کہتے تھے۔ اُن کی صحبت اعلیٰ تعلیم یافتہ دوستوں کے ہمراہ گرم رہا کرتی تھی۔ اُن کے بہترین دوستوں میں بابو بسیشر ناتھ سریواستو جو بعد میں چیف جج اودھ چیف کورٹ ہوئے اور پنڈت جگت نرائن ملّا کے ایسے گراں قدر لوگ تھے۔ موسیقی اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ شہر کی بہترین موسیقار طوائفیں اور مقتدر شعراء برابر حاضری دیتے تھے۔ اُن میں اتنی رئیسانہ آن بان تھی کہ خود گھر سے بہت کم نکلتے تھے لیکن دن بھر آنے والوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ شب کو صرف بے تکلف دوست جمع ہوتے تھے اور نہایت مہذب اور شائستہ مگر دلچسپ صحبتیں رہتی تھیں۔ اُن کی محلسرا باوجود تباہ کاریوں کے اب بھی موجود ہے اور اُن کی صاحبزادی کے نام سے کاشانۂ ذاکیہ موسوم ہے۔

گولا گنج کی حد ختم ہو کر جہاں سے وزیر گنج کا محلّہ شروع ہوتا ہے اسی مقام پر نواب بہادر علی خاں المعروف بہ نواب آبو صاحب کی کوٹھی تھی۔ یہ بزرگ بڑے مرنجان مرنج خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھے۔ خوش گفتاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی حیثیت میر محلّہ کی تھی۔ اُن کے یہاں دن کو بھی مجمع رہتا اور رات کو انبوہ لگ جاتا تھا۔ اُن کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں جن کو لوگ غلط بیانی تسلیم کرتے ہوئے بھی بڑے شوق سے سنتے تھے کیونکہ اندازِ بیان بہت زیادہ شیریں اور دل کش ہوتا تھا۔ اُن کی اسی صفت کے پیشِ نظر سب اُن کو "بیان" کے لقب سے یاد کرتے تھے اور اُن کے قدر دانوں میں محلّے کے سبزی فروشوں سے لے کر مرزا محمد ہادی رسوا کے ایسے باکمال

ادیب بھی شامل تھے۔ رسوا صاحب بھی آتے اور بڑے شوق سے اُن کی داستان سرائی سنتے تھے۔

محلّہ وزیر گنج آصف الدولہ نے بڑے انہماک سے بسایا تھا۔ اُن کے صاحبزادے اسی محلّے میں مقیم تھے۔ انگریزوں کی زیادتی کے سبب وہ خود سریرآرائے سلطنت نہ رہ سکے لیکن اُن کے نام کی وجہ سے اس محلّے کو ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی تھی۔ جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت بھی تین جلیل القدر ڈیوڑھیاں اس محلّے میں موجود تھیں۔ پورا نظر باغ کا علاقہ نواب ممتاز الدولہ بہادر کی املاک تھا۔ اُن کے ورثا میں پرنس پیارے مرزا اور پرنس باقر مرزا کے دور تک بہت کچھ اقتدار برقرار تھا۔ اُن کے محل کا صدر دروازہ بہت بلند اور جلیل القدر تھا۔ اتنا بلند تھا کہ بہت اونچا ہاتھی بآسانی گزر جاتا تھا۔ اس محل میں اتنی وسعت تھی کہ آج اُس کے ایک حصّے پر اقبال منزل قایم ہے۔ اس علاقے کی حد موجودہ جگت نارائن روڈ تک پہنچتی ہے۔ اس خاندان کی اور اُن کی دولت کی تباہی ایک عبرتناک داستان ہے۔ میری ہی آنکھوں کے سامنے دیکھتے دیکھتے سارے جاہ وجلال اور تمام دولت و ثروت کا اس طرح خاتمہ ہوا کہ اُن کے ورثا افسوسناک حالت میں مفلوک الحال ہوکر تباہ و برباد ہوگئے۔ ممتاز الدولہ کا دسترخوان شہر بھر میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا لیکن اُن کے ورثا اپنے بزرگوں کا کوئی سرمایہ برقرار نہ رکھ سکے۔

اسی محلّے میں دوسری گراں قدر ڈیوڑھی پرنس باقر علی خاں کی تھی۔ یہ املاک ڈیوڑھی آغا میر اسٹیشن کی جانب سے گول دروازہ جاتے ہوئے ریل کے پھٹّے سے نکل کر چڑھائی کے بائیں جانب بلندی پر واقع تھی۔ اس املاک کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ آج وہاں متعدد کوٹھیاں تعمیر ہیں۔ پرنس موصوف کی جائے اقامت اپنی جگہ پر موجود ہے لیکن باقی املاک ختم ہوگئی۔ پرنس طویل القامت اور بڑی جلیل القدر شخصیت کے مالک تھے۔ صورت اور آواز میں رعب تھا اور مغلوب الغضب بھی تھے لیکن بہت زیادہ متواضع تھے۔ اُن کے یہاں جاکر خواہ کوئی وقت ہو کھانا کھائے بغیر واپسی ناممکن تھی۔ صبح سے دس بجے رات تک باورچی خانہ ہر وقت گرم رہتا تھا اور ہر شخص کو بہترین غذائیں اور گرم گرم روٹیاں کھلائی جاتی تھیں۔ اگر کوئی دوست یا آنے والا کھانا کھانے سے انکار کرتا یا کوئی عذر پیش کرتا تو پرنس موصوف آپے سے باہر ہوجاتے تھے۔ پہلی ملاقات میں یہ مصیبت مجھے بھی جھیلنا پڑی تھی لیکن بہت جلد دوستانہ تعلّقات قایم ہوگئے تھے۔ پرنس موصوف کو شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا اور خود بھی شاعر تھے۔ اس کے علاوہ گھوڑے پالنے اور اسٹیج بنا کے ڈرامہ کھلوانے کا بھی شوق تھا۔ اُن کے یہاں کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

جن میں شہر کے قریب قریب سب ہی شعراء شریک ہوتے تھے۔ یہ انھیں کی ایجاد تھی کہ مشاعرے رات کے بجائے دن کو منعقد ہونے لگے تھے۔

وزیر گنج میں تیسری قدیم اور مقتدر ڈیوڑھی آغا میر کی تھی جو غازی الدین حیدر کے وزیر تھے۔ ایک زمانے میں آغا میر بہت بڑی املاک کے مالک تھے۔ اور پورا محلہ انھیں کی ڈیوڑھی کے نام سے منسوب ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ حالات بگڑتے گئے اور املاک کم سے کم تر ہوتی گئی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک یہ گھرانا شہر میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ لیکن اب خاندان بھی قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔ البتہ موروثی مکان جو کی ڈیوڑھی آغا میر کے عقب میں موجود ہے اور جو اخلاف باقی رہ گئے ہیں اسی میں مقیم ہیں۔ اسی املاک کے قریب اور محلہ چاندی خانہ سے متصل نواب سید محمد صاحب کی محلسرا تھی۔ یہ بزرگ بے حد خلیق اور متین و شریف تھے۔ شعر و ادب کا ہر وقت مشغلہ رہتا تھا اور شعراء کا ہجوم رہا کرتا تھا۔ انجمن معراج ادب کا آخری تاریخی مشاعرہ انھیں کے یہاں منعقد ہوا تھا۔ لیکن اب وہ محلسرا ایک کھنڈر کی صورت میں مبدل ہو گئی ہے اور بظاہر وہاں جمود اور خاموشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

اسی محلسرا کے نزدیک بہت بڑی املاک نواب یوسف علی خاں مرحوم کی تھی وہ ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے لیکن راقم کے علم و یقین میں وکالت کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ بہت بڑے رئیس اور صاحبِ دولت و ثروت تھے۔ طبیعت میں جود و سخا اور خدمتِ خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ اُن کے عطایا کی تفصیل بہت طولانی ہے۔ مثال کے طور پر رفاہِ عام کلب کی وسیع و عریض عمارت اور اراضی ہیں جو انھوں نے انتہائی فراخدلی کے ساتھ انجمنِ تہذیب کو عنایت فرمادی تھی۔ اُن کی املاک بھی قریب قریب سب ہی ختم ہو چکی ہے۔

وزیر گنج یعنی لکھنؤ کے وسطی علاقہ میں بھی مغربیت کے اثرات پڑ چکے تھے لیکن بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک لکھنؤ کلچر اُن بستیوں میں جو وکٹوریہ اسٹریٹ اور اُس کے مشرق میں ہیں پوری طرح حکمران تھا۔ اس ذیل میں محلہ پاٹانالہ اور کٹرہ ابوتراب خاں کے علاقے قابل ذکر ہیں۔ پاٹانالہ میں ایک دولتسرا نواب اصغر حسین مرحوم کی تھی جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ دوسری جلیل القدر محلسرا مولوی مہدی حسین ماہر کی تھی۔ موصوف خاندانِ اجتہاد کی گراں قدر فرد تھے اور ایک باوقار رئیس تھے جنھوں نے اپنا صدر دروازہ لوہے کا بنوایا تھا۔ اُن کا شمار شہر کے باوقار رئیسوں کی صفِ اوّل میں تھا۔ اُن کو علم و ادب سے بہت شغف تھا۔ تعلیم کے اعلا مدارج پر خود بھی فائز تھے اور

عالموں فاضلوں کی قدر دانی کرتے تھے۔ طبیعت میں کوٹ کوٹ کے نفاست بھری ہوئی تھی اور مزاج میں بلا کی جدت آفرینی تھی۔ اُن کی محلسرا، کا نام باقی رہ گیا ہے اور اُس کے آگے خدا کا نام ہے

کٹرہ ابو تراب خاں میں دو جلیل القدر خانوادے آباد تھے جن میں باہم دیگر قریبی تعلقات اور رشتہ داریاں بھی تھیں۔ ایک گھرانا حکیم مسیح الدولہ بہادر کا تھا جن کو دربارِ شاہی میں تقرب حاصل تھا اور بڑی شہرت و عزت کے مالک تھے۔ میرے ہوش سنبھالنے کے بعد اس خاندان میں بہت گراں قدر ہستی حکیم نظیر حسن خاں مرحوم کی تھی۔ مرحوم شرافت و رافت، سنجیدگی و متانت، خلوص و محبت اور عزت و وقار کا مجسمہ تھے۔ شہر بھر میں ہر دلعزیز تھے اور اُن کا ہر طبقے میں احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ علم و ادب میں کمال تھا اور بلند پایہ ادیب تھے۔ دار الشفا کے سپرنٹنڈنٹ اور متعدد سماجی اداروں کے سرپرست تھے۔ سرکار انگریزی میں بھی وقار تھا لیکن بذاتِ خود مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور انگریزی و انگریزیت سے دور بھاگتے تھے۔ آخر عمر میں تمام جائداد اپنی اولاد کے حوالے کر کے اقل قلیل آمدنی پر اپنی بسر کرتے تھے اور یادِ خدا میں اوقات بسر کرنے لگے تھے۔ اُن کی محلسرا شکستہ اور بوسیدہ اپنی اصلی جگہ پر برقرار ہے۔

دوسرا پرانا اور بہت گراں قدر خاندان اس محلّے میں خان علّامہ نواب تفضل حسین خاں کا تھا۔ ایک وقت میں قریب قریب پورا محلّہ اسی خاندان والوں کے زیرِ نگیں تھا۔ خان علّامہ کی قیام گاہ موسومہ نہر والی کوٹھی اور اُن کا ملحقہ باغ موسومہ عنبر باغ اب بھی انتہائی خستہ و خراب حالت میں موجود ہیں۔ بعض مکانات اُن کے ورثاء کے پاس ہیں لیکن بیشتر املاک ختم ہو گئی۔ خان علّامہ کے صاحبزادے تجمل حسین خاں کی بارہ دری جس کی زیارت کو ایک زمانے میں لوگ آیا کرتے تھے اب بلندی پر ایک پارک کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہے۔ خان علّامہ زبردست عالم تھے۔ سات زبانوں کے ماہر تھے۔ اُن کے تصنیفات میں متعدد لاطینی سے عربی زبان میں تراجم شامل ہیں۔ اودھ کے دربار سے منسلک تھے اور مختلف مدارج طے کر کے وزارتِ عظمیٰ کے مرتبے پر فائز ہوئے تھے۔ صحیح معنوں میں اُن کے آخری جانشین برادرِ مرحوم نواب مرزا جعفر علی خاں اثر تھے۔ البتہ اُن کے اخلاف میں ننگِ اسلاف یہ حقیر ہے جس کی قسمت میں بہت سی تباہیاں دیکھنا تھیں جن میں اپنے گھر کی تباہی بھی شامل تھی۔ تسکینِ خاطر کے لیے اتنا ہی شرف باقی ہے کہ ہمارا گھر علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ عزیز لکھنوی مرحوم نے ہم کو ثقاتِ کٹرہ کا لقب مرحمت فرما دیا تھا جس میں ہماری مستورات بھی شامل تھیں۔

وکٹوریہ اسٹریٹ پر اور اُس کے قرب و جوار میں متعدد گراں قدر ہستیاں تھیں جن کا ہمارے پرانے کلچر کی تاریخ میں اہم مقام تھا۔ ان میں بہت بلند خانوادہ آغائی صاحب کا تھا جو عہدِ شاہی میں نظامت کے عہدے پر مامور تھے۔ غدر کے بعد لکھنؤ میں آباد ہوئے۔ بڑی دولت و ثروت اور اقتدار کے مالک تھے۔ اُن کا عظیم المرتبت امام باڑہ اب تک دیرینہ عظمت کی یادگار ہے۔ اُن کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر علی خاں اور مرزا محمد صادق علی خاں تھے۔ چھوٹے صاحبزادے سے راقم کے گہرے دوستانہ تعلقات بچپن ہی سے قایم تھے۔ جو اُن کی وفات تک اُسی طرح برقرار رہے۔ یہ خاندان شہر میں ہمیشہ ممتاز رہا اور شرافت و انسانیت کے جوہر دونوں بھائیوں میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ بڑے بھائی لاولد فوت ہوئے۔ مرزا محمد صادق علی خاں کے ایک ہی صاحبزادے تھے جو اپنے والد کی حیات ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آغائی صاحب کے سارے کمالات و وقار صادق علی خاں مرحوم کے ساتھ انھیں کی قبر میں مدفون ہو گئے۔ آغائی صاحب کے ایک بھائی بھی انھیں کے ہمراہ لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے اور محلّہ بنجاری ٹولہ میں اُن کی محلسرا تھی۔ اُن کے صاحبزادے مرزا صادق حسین جن کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل ہوا تھا بہت مہذّب، مخیّر اور شائستہ بزرگ تھے۔ اُن کے اکلوتے بیٹے مرزا عابد حسین صاحب بحمد اللہ بقیدِ حیات ہیں اور اپنے آبائی مکان میں متمکن ہیں، اُن سے بھی میرے روابط دوستانہ ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت سی خوبیوں میں وہ اپنے بزرگوں کے صحیح جانشین ہیں۔

اس علاقے کی دوسری ممتاز ہستیوں میں شیخ علی عباس، سید شہنشاہ حسین، حکیم سید افضل علی المعروف بہ حکیم میرن صاحب، نواب محمد علی خاں المعروف بہ نواب بنّے صاحب اور نواب یوسف علی خاں المعروف بہ نواب کلکتہ کے اسمائے گرامی یادگار اور قابلِ ذکر ہیں۔

اوّل الذکر دونوں بزرگ شہر کے نامور اور کامیاب وکیلوں میں تھے لیکن اُن کی ساری معاشرت خالص لکھنوی تہذیب کی آئینہ دار تھی۔ ظاہری شان بھی رئیسانہ تھی۔ شیخ علی عباس کبھی کبھی فینس پر کچہری جاتے، گلے میں پرانی طرز کا رومال بندھا رہتا اور ساری سج دھج نوابی ہوتی تھی۔ شہنشاہ حسین مرحوم جامدانی کا انگرکھا پہن کر عدالت میں بحث کرتے تھے۔ اِن دونوں بزرگوں کے ساتھ حقّہ اور مصاحب کچہری میں بھی رہا کرتے تھے۔ رئیسوں سے ان دونوں کے تعلّقات بہت وسیع تھے۔ شہنشاہ حسین مرحوم کا خاندانِ شاہی سے رشتہ بھی تھا اس لیے اُن کے روابط شہزادگان سے زیادہ قریبی تھے۔ دونوں بزرگ بہت اچھا کھانا کھلاتے اور خوب دعوتیں کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ بڑی آن

بان سے زندگی بسر کرے گئے لیکن وہ ساری شان و شوکت اور اُن کی وضعداریاں انھیں کے ساتھ ختم ہو گئیں۔

حکیم میرن صاحب علم و ادب کے ماہر، طب میں حاذق، شستگی و شائستگی میں بے مثل اور شرافت و انسانیت اور محبت و رافت میں عدیم المثال تھے۔ اُن کے بڑے صاحبزادے حکیم صاحب عالم سید محمد قاسم مرحوم میرے بچپن کے دوست تھے اور وہ بھی اپنے والد کے تمام اچھے خصائل میں اُن کا ہو بہو نمونہ تھے۔ یہ دونوں بزرگ انتہائی رئیسانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرے گئے۔ تواضع اور اخلاق میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ دونوں کو شعر و فن سے بہت شغف تھا۔ حکیم صاحب عالم خود بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ حکیم میرن صاحب کی قوتِ سماعت بالکل زائل ہو گئی تھی اور وہ خود بھی بہت چیخ کر بات کرنے لگے تھے۔ اُن کی یہ شان ہمیشہ یاد رہے گی کہ وہ ہر روز علی الصباح اپنے گھر سے بعد نمازِ صبح نکلتے اور کمپنی باغ یعنی وکٹوریہ پارک ٹہلنے کے لیے جاتے تھے۔ راستہ بھر بہت زور زور سے دعاؤں اور قرآن پاک کے سوروں کی تلاوت کرتے تھے تاکہ بلائیں دور رہیں۔ بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر شہری کی فلاح و بہبود کے لیے دعاگو رہتے تھے۔

نواب بنے صاحب مرحوم کا تعلق کلکتہ سے بھی تھا۔ اُن کے بزرگ واجد علی شاہ کے مقربین میں تھے۔ آخر عمر میں خرابیٔ صحت کے باعث قریب قریب ہمہ وقت گھر ہی میں رہتے تھے، شام کو ہوا خوری کے لیے اپنی شاندار ٹم ٹم پر نکلتے تھے اور بڑے انداز سے گھوڑے ہنکاتے تھے۔ شعر و نغمہ اور علم و ادب کے پرستار تھے۔ اپنی وضعداریوں اور حسن اخلاق کی بدولت اُن کے قدردانوں کی کثیر تعداد تھی جو ہمہ وقت اُن سے ملاقات کرنے اور اُن کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔ حلم و بردباری اُن کی طینت تھی اور اُن کے مزاج میں سنجیدگی کا ظرافت کے ساتھ ایک حسین امتزاج تھا۔ اُن کے گھرانے سے میرے تعلقات عزیزدارانہ تھے۔ اُن کے صاحبزادے سید شہنشاہ حسین میرے طالب علمی کے ساتھی تھے۔ برسہا برس ہم دونوں میں یکجائی رہی اور ہمارے دوستانہ روابط میں کبھی فرق نہیں آیا۔ انھیں تعلقات کی بنا پر نواب بنے صاحب مرحوم مجھے اپنی اولاد سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میری جوانی کا بیشتر حصہ انھیں کے گھر میں گزرا تھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں ہے جس کو میں اپنا کہہ سکوں۔ شہنشاہ مرحوم کا انتقال ہو گیا اور اُن کے چھوٹے بھائی جو مجھے حقیقی بھائی کی طرح عزیز ہیں اور اپنے والدِ محترم کی حقیقی نشانی ہیں کلکتہ میں رہائش اختیار کر چکے ہیں۔

نواب یوسف علی خاں خصائل کا ایک عجیب وغریب مجموعہ تھے۔ انگریزی زبان پر پوری طرح قدرت تھی لیکن مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ بے حد متشرع اور صلوٰۃ وصوم کے پابند تھے لیکن شہری زندگی میں کسی تفریقِ مذہب و ملت کے قائل نہیں تھے۔ انگریزوں سے دوستی تھی اور شہر کے علماء و فضلا نیز عوام میں سیدھے سادے مسلمان تھے۔ گھر کے اندر خالص ہندوستانی ماحول تھا لیکن باہر نکلتے تو ہمیشہ انگریزی لباس زیب تن ہوتا مگر انگریزی ٹوپی اور ٹائی کبھی استعمال نہیں کی۔ سر پر ہمیشہ قبہ دار سفید گول ٹوپی رہتی تھی۔ خیرات کا شوق جنون کی حد تک تھا کبھی کسی سائل سے انکار نہیں کیا۔ اور جس کو بظاہر صاحب حاجت سمجھا اُس کی مدد کرتے تھے جس راستے سے گزرتے اُس میں گندگی یا کسی قسم کی بے ضابطگی برداشت نہیں کرتے تھے۔ روزانہ شام کو وکٹوریہ اسٹریٹ پر ٹہلنے نکلتے تھے۔ یکّے والوں کی بے ضابطگیاں دیکھ کر چیختے، مارنے کو دوڑتے اور فوراً چالان کرا دیتے۔ وہ خود آنریری مجسٹریٹ تھے۔ یہ مقدمات دوسرے روز انھیں کے اجلاس پر پیش ہوتے، زیادہ تر ترس کھا کر معاف کر دیتے، جرمانہ کرتے تو بسا اوقات وہ رقم اپنی جیب سے ادا کر دیتے۔ جب تک وہ زندہ رہے وکٹوریہ اسٹریٹ بے انتہا صاف اور ستھری رہا کرتی تھی۔

لکھنؤ کی ثقافتی زندگی میں مغربی حلقے کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہماری پرانی آبادی کی اکثریت یہیں مقیم تھی اور اب تک یہی علاقہ پرانے لکھنؤ کے نام سے موسوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان محلّوں میں بے شمار آثارِ قدیمہ اب بھی موجود ہیں۔ زوال کے دن آجانے پر بھی یہاں عمائدین و روٴسا کی بہت سی ڈیوڑھیاں اور محلسرائیں کسی نہ کسی نہج سے آباد ہی نظر آتی تھیں۔ ان سب کے حالات پیش کرنا دقت طلب ہے۔ لہٰذا انتہائی اختصار کے ساتھ چند عمائدین کے حالات درجِ ذیل ہیں۔

چوک سے متصل جوہری محلہ ہے اس محلّے میں ایک مقتدر شہزادی صاحبہ کی ڈیوڑھی تھی جو گھنٹے والی بیگم کہلاتی تھیں۔ یہ لقب اس لیے حاصل تھا کہ اُن کے یہاں گھنٹا لگا تھا اور گھڑیال بجتا تھا۔ شاہی زمانے میں یہ ایک شرف تھا جو بادشاہ کے حکم سے مرحمت ہوتا تھا۔ شہزادی صاحبہ بڑی املاک کی مالک تھیں اور اُن کے متعدد مکانات ملحق یا یکے بعد دیگرے اُسی محلّے میں تھے۔ اُن کی شادی شہر کے ممتاز رئیس شہنشاہ دولہا کے صاحبزادے نواب بنّے صاحب سے ہوئی تھی۔ اُن سے میرے تعلقات تھے۔ نواب بنّے صاحب کو شعر و سخن کا ذوق تھا اور فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی لیکن مزاج میں بلا کی خاموشی اور متانت تھی۔ مسکرا دینے اور سنجیدگی کے ساتھ مختصر گفتگو کرنے کے علاوہ زیادہ بولتے

بھی نہیں تھے۔ مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کے یہاں اُن کی بہت نشست تھی اور میری اُن سے زیادہ تر وہیں ملاقات رہا کرتی تھی۔ اُن کے دولت کدے پر بھی منعقد دربار جانے کا موقع ملا تھا۔ سارا رہن سہن بالکل سادہ بلکہ درویشانہ تھا۔ حقّہ بہت پیتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی ذوق نہیں تھا۔ بے چارے اولادِ نرینہ سے محروم دنیا سے رخصت ہوئے۔ عین چوک سبزی منڈی میں خدائے سخن میرانیس کی محلسرا تھی۔ عارف مرحوم اور دولہا صاحب عروج اُن کے جانشین تھے اور انھیں دونوں کی بدولت مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے ہنر برقرار تھے۔ اسی محلسرا کے قریب حکیم منے آغا صاحب فاضل کی کوٹھی تھی۔ حکیم صاحب مرحوم بڑے باکمال بزرگ تھے۔ طبیبِ حاذق ہونے کے علاوہ مختلف علوم کے ماہر تھے۔ شعروسخن کے پرستار تھے، بہت عمدہ شاعر تھے اور حسنِ اخلاق اور حسنِ گفتار میں اپنی آپ مثال تھے۔ بے انتہا شریف، وضعدار، مخیر اور دلچسپ بزرگ تھے۔ شہرِ لکھنؤ میں غالباً کسی طبیب نے اُن کی طرح دولت نہیں کمائی۔ اور نہ اُن کی طرح دولت لٹائی۔ بہترین کھانا کھاتے تھے اور بہترین خوش پوشاک اور جامہ زیب رئیس تھے اپنی ساری زندگی آرام سے بسر کر لے گئے اور بہت سے رونے والے چھوڑ گئے تھے اس لیے کہ اُن کا ہر دوست اُن کا شیدائی تھا۔

چوک سے آگے بڑھ کر دوسرا تاریخی مرکز کشمیری محلّہ ہے۔ یہاں دو رئیسوں کی عالیشان ڈیوڑھیاں تھیں۔ اصل سڑک کے بائیں جانب اچھے خاصے رقبے میں نواب نقی علی خاں عرف بڈھن صاحب کی محلسرا تھی۔ اُن کو مختلف فنون کے علاوہ نایابِ روزگار اشیاء جمع کرنے کا بہت ذوق تھا۔ کم گو انسان تھے۔ اُن کی نشست گاہ بالاخانے پر تھی اور گھر سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ بہت خوشحال اور مخیر گھرانا تھا۔ نواب بڈھن صاحب کو بذاتِ خود لہو ولعب سے ذوق نہیں تھا۔ اس لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس گھر پر کیوں اور کیسے بہت جلد زوال آگیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تباہی خاندان میں اندرونی اختلافات اور باہم دیگر مقدمہ بازیوں کا نتیجہ ہو۔ اسی محلسرا سے کچھ آگے داہنی جانب بہت بڑی املاک اور محلسرا نواب سلطان علی خاں عرف باسو صاحب کی تھی۔ وہ نفیس طبیعت کے مالک اور بہت نیک نفس انسان تھے۔ شعروادب کا ذوق تھا اور احباب پرست تھے۔ لباس وطعام میں بھی بہت اچھا مذاق تھا۔ اُن کی محلسرا کا قابلِ لحاظ حصہ ابھی تک محفوظ ہے۔ اور اُن کے اخلاف میں ہونہار لوگ اپنے بزرگوں کا نام زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زمانہ بہر حال سازگار نہیں رہا۔ اسی محلّے میں ایک جلیل القدر ہستی

نواب ذکی علی خاں ہاتف کی تھی۔ بے حد خوش گفتار، خلیق اور بامروت بزرگ تھے۔ ریاست کے ساتھ علم وادب کے بھی مالک تھے۔ بلند پایہ ادیب اور خوش گو شاعر تھے۔

اسی مغربی حلقہ کے آخری کونے پر ایک محلہ ترمنی گنج ہے جو ایک زمانہ میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ نواب آغا ابو صاحب نہ صرف ترمنی گنج بلکہ شہر لکھنؤ کے ایک رُکن رکین تھے۔ دولت و ثروت کی فراوانی کے ساتھ جاہ وجلال اور وقار و اقتدار اُن کے قدم چومتا تھا۔ بڑے بڑے حاکموں یہاں تک کہ لفٹیننٹ گورنروں تک کی بڑی بڑی دعوتیں اُن کے محل میں ہوا کرتی تھیں۔ غدر کے بعد شہر میں انھیں کا نام نامی ہر ایک کی زبان پر آتا تھا۔ اُن کے دو صاحبزادے بڑے آغا اور چھوٹے آغا صاحبان اُن کے جانشین ہوئے۔ ان دونوں حضرات کو جسمانی ورزش کا شوق ہوا اور اس فن میں بڑے بڑے کمال حاصل کئے۔ دونوں بھائی بہت اچھے شہسوار تھے اور چھوٹے بھائی میں یہ فنکاری تھی کہ وہ تانبے کی بڑی سینی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر دفتی کی طرح چیر ڈالتے تھے۔ اِن بزرگ سے میرے بھی دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ بقیدِ حیات بھی ہیں لیکن ضعیفی اور علالت نے گوشہ نشین کر دیا ہے۔

اسی مغربی حلقہ کے دوسری سمت نواز گنج اور تحسین گنج دو قدیم محلے ہیں۔ نواز گنج میں نواب بیدار بخت بہادر کا عالیشان محل تھا جو خاندانِ شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ حسین آباد مبارک کے متولی تھے اور شہر کے ممتاز رئیسوں میں تھے۔ اُن کی ڈیوڑھی کی رونق دورِ شاہی کی بعض خصوصیاتِ مرتبت کی نشاندہی کرتی تھی۔ اُن کو اپنے وقار کا بہت خیال رہتا تھا۔ فنونِ لطیفہ سے ذوق تھا اور بہت احباب پرست تھے۔ اسی محلہ میں ایک بہت ہر دلعزیز اور گراں قدر ادیب و شاعر نواب مین صاحب بلیغ بھی تھے۔ وہ بہت پرانے طرز کے بزرگ تھے اور انھوں نے اپنی تاحیات دورِ شاہی کی وضعداریاں برقرار رکھی تھیں یہاں تک کہ لباس میں بھی قدیم طرز ہی مرغوب رہی اور کسی جدت طرازی کو قبول نہیں کیا۔ دوسری جانب تحسین گنج میں دو گراں قدر رئیس تھے نواب سجاد علی خاں عرف منے نواب صاحب اور نواب محمد نواب صاحب۔ ان دونوں صاحبان سے میری بے تکلفانہ ملاقات تھی۔ منے نواب صاحب بے حد سادہ دل، سادہ مزاج، انسان دوست، خوش خلق اور متشرع بزرگ تھے۔ اُن کا احترام صنفِ علماء اور رؤساء دونوں مقام پر یکساں طور سے ہوتا تھا۔ محمد نواب صاحب بہت حسین وجمیل اور مشتّق رئیس تھے۔ اُن کی ساری سج دھج خود ساختہ اور خود پرداختہ تھی۔ لباس وطعام میں نیز اپنی وضع قطع میں جدت آفرینی

اُن کا شعار تھا اور اس مشغلے میں اُن کا کافی وقت خرچ ہوتا تھا۔ اُن کے ظاہری خصوصیات میں گل مچھے تھے اور اُن کی ٹوپی تھی۔ گل مچھے اپنے مخصوص پسندیدہ طرز میں رکھے تھے۔ غالباً دوسرے تیسرے روز بالوں کو بڑی محنت سے کتروایا جاتا تھا کہ ہمیشہ ایک ہی قدو قامت پر برقرار رہیں۔ اسی طرح ٹوپی بھی بڑی محنت کے ساتھ پہنتے تھے وہ ٹوپی بے حد چھوٹی دیوار کی کشتی نما ہوتی تھی۔ اُس کا پہن لینا محال تھا اس لیے بہت سی الپیتون سے بالوں میں جکڑ لی جاتی تھی۔ شام کو ہوا خوری کے لیے گاڑی پر نکلتے تو اُس ٹوپی کو سر پر برقرار رکھنا انھیں کا کام تھا بہرحال بہت اچھے آدمی تھے اور شہر میں کافی ہردلعزیز بھی تھے۔

شہر کے بالکل کنارے شیش محل کے نوابان کی ڈیوڑھیاں تھیں۔ یہ وہی "دولت خانہ" تھا جو آصف الدولہ نے اپنی اقامت کے لیے بنوایا تھا۔ شیش محل کے اندر پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک ایسی بارگاہ تھی جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اور آگے بڑھ کر ایک اتنی بلند و بالا اور وسیع عمارت تھی جس میں ایک چھوٹا محلّہ آباد ہو سکتا تھا۔ اس عمارت کے استحکام کا یہ عالم ہے کہ سیکڑوں برساتیں اور بے شمار سیلاب آنے کے بعد بھی دیواریں مستحکم ہیں اور زمانہ کے کسی حادثہ نے ان کو متزلزل نہیں کیا۔ میں نے جب شعور سنبھالا تو اس عالیشان محل میں دو بھاری بھرکم دربار دیکھے تھے۔ ایک میں نواب باقر علی خاں رونق افروز ہوئے تھے اور دوسرے میں نواب جعفر علی خاں۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے انتقال کے بعد اُن کے ورثا جانشین ہوئے۔ نواب باقر علی خاں کے بڑے صاحبزادے نواب صادق علی خاں گولا گنج میں اپنی علیحدہ کوٹھی بنانے کے بعد منتقل ہو گئے اُن کے چھوٹے بھائی بدستور شیش محل میں تا حیات مقیم رہے۔ جعفر علی خاں مرحوم کی حیات تک اور اُن کے بعد اُن کے چاروں صاحبزادوں کی حیات تک بڑی حد تک پرانی وضعداریاں اور پرانی آن بان باقی تھی۔ پھر ایک ایک بھائی رخصت ہوتا گیا اور اسی قدر انجمن سونی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب نہ وہ شان و شوکت ہے اور نہ وہ رکھ رکھاؤ۔ عمارات پر بھی برسوں پہلے زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ ایک کے بعد دوسری چھت گر رہی تھی۔ باہر کی بارگاہ مدتیں گزریں ختم ہو چکی تھی اور اب اندرونی محل بھی خستہ و خراب ہے۔ میرے تعلقات اس خاندان سے دیرینہ اور عزیزدارانہ رہے ہیں۔ میری آنکھوں نے عروج دیکھا تھا اور اب وہ زوال دیکھ رہا ہوں کہ بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

حقیقتِ امر تو یہ ہے کہ شہر لکھنؤ کے ہر پرانے محل پر جس میں خود میرے مورث اعلیٰ کا محل بھی شامل ہے یہی شعر صادق آتا ہے۔

متذکرہ بالا عمائدین ہی کے طبقہ میں اور بھی ممتاز و مقتدر ہستیاں تھیں جن کا سلسلہ شاہی خانوادوں یا وزراء کے خاندانوں سے ملتا تھا۔ اسی طرح عام مسلمانوں اور اہل ہنود میں بھی بہت سے امراء و روساء تھے جو لکھنؤ کی ثقافت کے نمائندے تھے۔ ہماری تہذیب کو فروغ دینے میں کشمیری محلہ کے برہمن کشمیریوں، نوبستہ اور اشرف آباد کے سکسینہ کائستھوں کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ پرانے مشاعروں میں یہ حضرات بھی مسلمان شاعروں کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے۔ زبان و طرز میں یکسانیت اور ہم آہنگی رہتی تھی۔ کسی اختلاف و افتراق کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔ غیر مسلم عمائدین کا معاشرتی نظام اور اُن کا طرزِ زندگی بڑی حد تک مسلمان رئیسوں کے رہن سہن سے مماثل تھا ان حضرات میں بھی بہت سے ایسے گراں قدر بزرگ تھے جن کے حالات و واقعات درج کرنے کے قابل تھے، لیکن راقم کو اپنی کم نصیبی سے اُن کی خلوت و جلوت میں حاضر ہونے کا کبھی کوئی موقع نہیں ملا۔ اس لیے اُن کے بارے میں وثوق کے ساتھ کوئی تذکرہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں ہمارے پیشِ نظر صرف پرانی تہذیب و ثقافت اور اسلاف کے طرزِ زندگی کا نمونہ پیش کرنا ہے اور حق بات یہ ہے کہ فرمانروایان اودھ اور اُن کے مقربین ہی اس کلچر کے معمار تھے لہٰذا انھیں طبقات کے اُن نمائندوں کو جن سے ہماری عزیزداریاں اور قربت تھی مثالی نمونوں کے طور پر منتخب کر لیا ہے۔ لکھنؤ کلچر کے یہی لوگ ستون تھے اور اُنھی کے قول اور عمل معیاری سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے دوسرے عمائدین، روساء اور امراء اور بلند و بالا ہستیوں کو نظرانداز کرنے کے بعد بھی ہمارے اس تذکرے کا مقصد فوت نہیں ہوتا اور قاری کے سامنے پرانی معاشرت کی پوری پوری عکاسی ہو جاتی ہے۔

## (۲) وضع قطع، رہن سہن

روساء و عمائدین انتہائی صاف ستھرے رہتے تھے۔ وضع قطع ہر ایک کی اپنی اپنی پسند کی ہوتی تھی۔ کچھ لوگ سروں پر پٹے رکھتے اور بعض خشخشی بال کٹواتے تھے۔ ڈاڑھی رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ چند صاحبان کے علاوہ اور کوئی ڈاڑھی نہیں رکھتا تھا۔ مونچھیں بھی بہت کم لوگ کترواتے تھے۔ بعض رئیسوں کی بڑی بڑی اور مشین مونچھیں تھیں۔ کچھ رئیس گل مچھے رکھواتے اور بعض بڑی بڑی

اور چوڑی چوڑی قلمیں کترواتے تھے۔ سرمہ لگانے کا عام دستور تھا اور عطر لگانا باعثِ برکت اور کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ بعض رئیس اپنا پسندیدہ عطر خود اپنے ہی محل میں کھنچواتے تھے۔ اس سلسلہ میں ترھئی کے نواب اصغر حسین مرحوم کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ یہ بزرگ گھروں میں عموماً بہت سادہ لباس پہنتے اور بے تکلف دوستوں یا اپنے مقربین کو محل کے اندر بلا کر اسی لباس میں ملاقات کر لیتے تھے لیکن باہر نکلتے وقت خواہ وہ اپنے گھر ہی کے دربار میں کیوں نہ ہو سر تا پا ملبوس ہو کر نکلتے تھے۔

لباس کے معاملہ میں بھی اپنی اپنی پسند کو دخل تھا لیکن عام طور سے سروں پر دو پلی ٹوپی، کشتی نما ٹوپی، چوگوشیا یا قبہ دار ٹوپی رہا کرتی تھی۔ بعض لوگ انھیں ٹوپیوں میں اختراعات کرتے تھے مثلاً دو پلی ٹوپی میں رنگین کنارہ یا سنہری بھندکیاں ڈلوائی جاتی تھیں۔ کشتی نما ٹوپی میں کسی کے یہاں دیوار اونچی تو کسی کی بہت نیچی ہوتی تھی۔ قبہ دار ٹوپی میں بھی کئی کئی پہلو بنوا کے نئی نئی وضعیں اختیار کی جاتی تھیں۔ بعض لوگ اندر دفتی دے کر ریشمی گول ٹوپیاں بنوا کر پہنتے تھے۔ انھی ٹوپیوں کی بعد میں ترکی اور ایرانی ٹوپیوں نے جگہ لی تھی اور بکثرت ہندو امرا بھی بانات کی گول ٹوپیوں کے خوگر ہو گئے تھے۔ ٹوپی پہننے کے قبل بڑے اہتمام سے کنگھی کر کے بالوں کو درست کر لینا ضروری ہوتا تھا۔ جسم پر لباس میں کرتا اور چپکن یا انگرکھا جو موسم سرما میں گرم ہونے کے باعث دگلا کہلاتا تھا پہنتے تھے۔ موجودہ بنیان معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی لیکن بعض لوگ انگیا کی شکل کی اندرونی صدریاں پہنتے تھے۔ موجودہ بنیان سے بہتر خوش نما، خوش رنگ اور خوش وضع ریشمی، اونی اور سوتی کپڑوں کے بنتے تھے۔ گرمیوں میں ململ کے کرتے بہت پسند کیے جاتے تھے اور اس موسم میں بعض رئیس بالا پر کا لمبا کرتا پہن کر باہر بھی نکلتے اور ہوا خوری کے لیے جاتے تھے۔ چپکنیں بھی موسم کے لحاظ سے گرم اور ٹھنڈی بنتی تھیں۔ گرمیوں میں چکن یا جامدانی کے انگرکھے اور جاڑوں میں جامہ وار کی چپکن یا اچکن اور جہرمات کے انگرکھے شان امارت میں داخل تھے۔ شادی بیاہ یا اور تقاریب خوشی میں شرکت کے لیے قیمتی سے قیمتی لباس مثلاً اطلس و زربفت کا استعمال ہوتا تھا۔ اچکن کا وجود بیسویں صدی کے اوائل میں ہی ہو چکا تھا جو چپکن کی جگہ پر پہنی جاتی تھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ چپکن کی آستینیں گول اور تنگ بہت کسی ہوئی اور دامن چوڑے ہوتے تھے۔ دامنوں میں کافی گھیر ہوتا تھا۔ اچکن کے دامن موجودہ شیروانی کی طرح ہوتے مگر اس سے بڑے ہوتے تھے۔ اور آستینیں بھی ڈھیلی ہوتی تھیں۔ اچکن اور چپکن کی آستینوں میں بعض رئیس بٹن ٹنکواتے

تھے تاکہ کلائیوں پر چست رہے۔ بٹنوں کی تعداد بھی کلائیوں اور سینہ پر بہت ہوتی تھی۔ ہر جامہ کا جسم پر درست و چست ہونا ضروری تھا۔ اچکن یا چپکن پر بعض رئیس ڈھیلی صدری بھی پہن لیتے تھے۔ گلے میں رومال باندھنا شرافت کی علامت تھا۔ رئیسوں کے گلوں میں بڑے بڑے ریشمی رومال پڑے رہتے تھے۔ سفید پائجامہ رائج ہو چکا تھا لیکن لوگ زیادہ تر رنگین پائجامہ چھوٹی مہری کا پہنتے تھے البتہ چوڑی دار پائجامے گرمیوں میں چھالٹین کے اور جاڑوں میں فلیلن کے ہوتے تھے۔ تقاریب میں روسا عام طور سے مشروع کے ڈھیلے پائجامے پہنتے تھے۔ پیروں میں مخملی زرد رنگ کے کارچوبی یا چاندی کے بکلس دار گھیٹلے جوتے پہنے جاتے تھے۔ بعض رئیسوں نے چمڑے کے جوتے بھی پہننا شروع کر دیے تھے لیکن ایسے جوتے صرف پمپ ہوتے تھے۔ ڈوری دار جوتوں کو کوئی شرفِ قبول حاصل نہیں تھا۔ گھروں میں عام طور سے زیر پائیاں پہنی جاتی تھیں۔ ان میں بھی بعض مخمل ہی کی ہوا کرتی تھیں۔

اسی مقام پر بعض ایسے کپڑوں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو اب معدوم ہیں۔ روسا اور عمائدین موسم سرما میں جامہ وار اور مہرمات کے دلدادہ تھے۔ جامہ وار کے دوشالے اور چادریں بھی اوڑھی جاتی تھیں۔ جامہ وار اور مہرمات سوتی کپڑے ہوتے تھے۔ بہت زیادہ نرم و نازک اور کافی گرم ہوتے تھے۔ دونوں خوش نما، خوش رنگ اور پھول دار تیار ہوتے تھے۔ مختلف رنگوں کے تناسب سے کپڑے کی زمین پر پھول یا جھاڑیاں تیار ہوتی تھیں، مہرمات میں بھی رنگوں کا تناسب رہتا مگر اس کپڑے میں لمبی لمبی پٹریاں بنائی جاتی تھیں۔ مہرمات کے عموماً انگرکھے بنتے تھے جو ان پٹریوں کی وجہ سے بہت دیدہ زیب ہوتے تھے۔ جامہ وار کا کپڑا تھانوں کے حساب سے ملتا تھا۔ ایک تھان میں ایک اچکن بن جاتی تھی اور یہ تھان پچاس ساٹھ روپیہ کا مل جاتا تھا۔ جامہ وار کے دوشالے بھی بنتے تھے۔ چادروں کے لیے ایک تھان کافی ہوتا تھا۔ گرمیوں میں عام طور سے تنزیب، شربتی، ململ اور جامدانی کا رواج تھا۔ یہ سب کپڑے بہت نازک، دیدہ زیب اور نفیس ہوتے تھے بالخصوص شربتی اور جامدانی نزاکت و نفاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور ان میں سستے اور مہنگے ہر قسم کے کپڑے مل جاتے تھے۔ جامدانی کے تھان ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں بنتے تھے۔ ایک سے ایک بہتر وضع کے پھول، بوٹیاں، جھاڑیاں بنی رہتی تھیں۔ اسی صناعی میں نفاست اور نزاکت کی بنیاد پر قیمتیں کم یا زائد ہوتی تھیں۔ بعض روسا مخصوص طور پر اپنی پسند کی وضع دے کر اپنے لیے تھان تیار کراتے تھے۔ زیادہ مرغوب وضع مکھی بوٹی یا چنبیلی کی جھاڑی والی

ہوتی تھی۔ ان میں بھی وضع در وضع تھان تیار ہوتے تھے۔ یہ صناعی بہر حال کاریگر کی پسند یا خریدار کی فرمائش پر منحصر ہوتی تھی۔ ایک تھان میں ایک اچکن یا ایک انگرکھا تیار ہو جاتا تھا۔ یہی جامدانی بنانے والے ٹوپیوں کے پلڑ بھی تیار کرتے تھے جو تھانوں کے ساتھ یا علیحدہ فروخت ہو جاتی تھیں اور جامدانی کے انگرکھوں کے ساتھ استعمال ہوتی تھیں۔ جامدانی کے علاوہ چکن اور کامدانی کے کپڑے بھی رائج تھے۔ یہ اشیاء لکھنؤ ہی کی صنعت تھے اور بہت عمدہ طرز اور وضع کے تیار ہوتے تھے۔ یہ کپڑے اب بھی ملتے ہیں لیکن پہلی سی نزاکت و نفاست اب نہیں ہے اس لیے کہ اُس کے قدر دان باقی نہیں رہے۔

اپنی اپنی حسبِ مقدرت اور افتادِ مزاج کے تحت ہر رئیس کو رنگینی و نزاکت، شیرینی و لطافت اور آرائش و زیبائش کا ہر شعبۂ حیات میں ذوق تھا۔ لباس رنگینی و نزاکت کا شاہکار ہوتا طرزِ گفتگو اور طور طریقے شیرینی و لطافت میں سرشار رہتے تھے اور آرائش و زیبائش کا یہ عالم تھا کہ اُن کا بس چلتا تو اپنے گھر کے ذرہ ذرہ کو رنگ و بو میں ڈبو دیتے۔ تموّل اور رنگین مزاجی کی بدولت جواہرات، شیشہ آلات اور رنگ برنگ پچہ کاریوں کا شوق تھا۔ ہر رئیس کے ہاتھوں میں انگوٹھیاں اور بعض پیروں میں بھی چھلے پہنتے تھے۔ پیر کے دونوں انگوٹھوں میں چاندی کے چوڑے چوڑے بھاری چھلے پہنا کرتے تھے۔ ہاتھوں میں کم سے کم پانچ ورنہ سات اور بعض لوگ تو دو دو انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنتے تھے جن میں فیروزہ، عقیق، یاقوت، زمرد، زبرجد بہت پسندیدہ جواہرات تھے نیلم کو مبارک یا منحوس سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کے استعمال میں پس و پیش رہتا تھا۔ ہیرا عموماً مستورات کے لیے مخصوص تھا۔ انگوٹھیاں بہر حال چاندی کی ہوتی تھیں۔ سونا استعمال کرنے سے مردوں کو اجتناب تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بعض مرد بھی سونے کی انگوٹھی پہننے لگے تھے لیکن پھر بھی وہ خالص سونے کی نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی طرز اور کیرٹ گولڈ کی بنوائی جاتی تھی۔ ایسے حضرات بائیں ہاتھ میں صرف ایک انگوٹھی پہنتے تھے۔ پرانے لوگ داہنے ہاتھ میں پہننے کے قائل تھے۔

رنگینی کے ذوق میں یہ بھی داخل تھا کہ ہر رئیس کے یہاں نشیب کی چھوٹی بڑی کھرل رہا کرتی تھی جو کسی نہ کسی ضرورت میں ہر روز استعمال ہوتی تھی۔ خواب گاہ کی مسہری میں سرہانے کے پائے اونچا کرنے کے لیے نشیب کی گول ترشی ہوئی "اینٹیں" لگائی جاتی تھیں۔ زمین کا فرش درست رکھنے کے لیے رنگین پتھر کے "میر فرش" ترشوا کے رکھ دیے جاتے تھے۔ استخارہ دیکھنے یا دکھوانے

کے لیے مرجان کی تسبیح مہیا رہتی تھی۔ دربار کی دیواریں ہوں یا محلسرا میں رئیس کے کمرے کی نشست کی چاروں دیواریں بے شمار رنگین و خوشنما ہمی اور مطبوعہ تصویریں سنہری چوڑے چوڑے کناروں دار چوکھٹوں میں آویزاں رہتی تھیں، دروازوں یا محرابوں پر شوخ رنگین پھولدار پردے پڑے رہتے تھے۔ بستر پر بھی رنگین گردپوش رہتا تھا۔ فرش خواب اور تکیوں کے غلاف یقیناً بے انتہا صاف ستھرے اور سفید ہوتے اور گرمیوں میں اوڑھنے کی چادر اور جاڑوں میں لحاف بہت خوشنما اور رنگین ہوتے تھے۔ مخملی لحاف زیادہ پسند کیے جاتے تھے ورنہ ریشمی غلطے کے پھولدار اور سنہرے لحاف اوڑھے جاتے تھے۔ محلسرا کی اندرونی نشست گاہ میں قریب قریب ہر رئیس کے یہاں تختوں پر نشست ہوتی تھی۔ کم سے کم چار تختوں کا چوکا ضروری تھا لیکن بعض رئیسوں کے یہاں آٹھ اور سولہ تختوں کا چوکا رہتا تھا۔ یہ تخت فرشِ زمین سے زیادہ اونچے نہیں ہوتے تھے لیکن سب کا مل کر مسطح اور ہموار ہونا ضروری تھا تاکہ درمیان میں نشیب و فراز کی بدنظمی پیدا نہ ہو۔ تختوں پر دری و چاندنی کا فرش ہوتا لیکن رئیس کے بیٹھنے کی جگہ پر رنگین ریشمی یا اونی قالین ہوتا اور ایک اوٹ سے لگا ہوا بڑا گاؤ تکیہ رہتا اور دونوں جانب تکیاں لگی رہتی تھیں۔ یہی کمرہ اُس کی اصل قیام گاہ ہوتی تھی۔

اسی قیام گاہ اور اُس سے متصل یا قربت میں خواب گاہ کو ہر رئیس کی زندگی میں بڑا دخل تھا حقیقت امر تو یہ ہے کہ یہی وہ دو مقامات تھے جہاں وہ ایام گزاری کرتے تھے۔ دربار کے دن اور وقت کے علاوہ قریب قریب سارا وقت قیام گاہ میں گزرتا تھا۔ بعض رئیسوں کے لیے بستر راحت بھی اسی ہال یا بڑے کمرہ کے کسی گوشہ میں لگا رہتا تھا جہاں وہ دوپہر کو آرام فرماتے تھے۔ صبح کو خواب گاہ ہی میں منہ ہاتھ دھونے نیز دیگر ضروریات سے فراغت کرکے قیام گاہ میں آجاتے تھے۔ یہیں ناشتے کے لیے دسترخوان بچھ جاتا اور اسی وقت سے مصاحبین، مقربین اور مخصوص بے تکلف دوستوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ صحبت دوپہر تک گرم رہتی تھی جس میں فنون لطیفہ، شعر و سخن، اپنے اپنے مخصوص تفریحی مشاغل، شہر کے حالات وغیرہ پر چرچے ہوتے اور ہلکی پھلکی باتیں ہوا کرتی تھیں کبھی کبھی کتابیں بھی پڑھی جاتی تھیں لیکن صرف وہی جن کا موضوع دینیات یا شعر و ادب ہوتا تھا۔

جو رئیس فنونِ لطیفہ کے ماہر ہوتے تھے اور جن کی بہتات تھی اُن کے یہاں ارباب نشاط اس وقت بھی شریک بزم رہتی تھیں۔ ان نشستوں میں ساری سنجیدہ گفتگو اپنے اپنے ذاتی تفریحی مشاغل پر ہوتی تھی جس کا سلسلہ نہ صرف دیر تک بلکہ کبھی کبھی کئی کئی روز تک چلا کرتا تھا کیوں کر

انھی تذکروں میں ایجادات واختراعات کے پہلو نکالے جاتے تھے جن سے لکھنؤ کی فنکاری اور صنعت گری میں روزافزوں اضافے ہوتے تھے اور ان فنکاریوں میں طرح طرح سے اور ہنرمندی کے ساتھ نفاست ونزاکت کے اسلوب تراشے جاتے تھے۔ ان نشستوں کے اوقات رئیس کی مرضی پر منحصر ہوتے تھے۔ کبھی کبھی درمیان ہی میں دسترخوان بچھ جاتا اور پھر شام کی ہواخوری کے وقت تک محفل گرم رہتی۔ البتہ وہ عمائدین جو دن کو استراحت کے عادی تھے۔ دسترخوان پر سے فراغت کر کے آرام فرماتے اور شام کو ہواخوری کے لیے نکل جاتے تھے۔ واپسی کے بعد پھر قیام گاہ ہی میں آدھی رات تک محفل گرم رہتی تھی کیونکہ وہ لوگ۔ راتوں کو دیر تک جاگنے کے خوگر تھے جس میں کسی نہ کسی مخصوص مرغوب نظر کی موجودگی ضروری ہوتی تھی اور شعر ونغمہ کی سرمستیوں میں نشا میں غرق کردی جاتی تھیں۔ یہ بات بہر حال عرض کردینا ضروری ہے کہ بادہ خواری کو ان کے عادات واطوار میں کوئی جگہ حاصل نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس رؤسا کی بڑی اکثریت پابندِ صوم وصلوٰۃ تھی۔ نماز کی پابندی ہر رئیس کرتا تھا۔

خواب گاہ میں آرائش وزیبائش مقابلتاً کم ہوتی تھی۔ اس کمرہ میں ایک خوشنما طاق میں ایک قیمتی اور خوبصورت جزدان میں عموماً قلمی نسخہ کلام پاک کا رکھا رہتا اور اسی سے متصل جانماز رکھی رہتی تھی۔ دیواروں پر خوشنما چوکھٹوں میں آیۃ الکرسی، نادِ علی اور دوسری ادعیہ قلمی اور مطبوعہ آویزاں رہتے تھے۔ دو چار تصویریں بھی دوسری جانب لٹکی رہتی تھیں۔ مسہری کے قریب یا بالکل متصل ایک بڑا تخت یا دو چھوٹے تختوں کا جوڑا بچھا رہتا تھا جس پر سلیقے سے فرش رہتا اسی تخت پر نماز پڑھی جاتی اور اسی جگہ بیٹھ کر دونوں وقت رئیس منہ دھو کر کپڑے بدلتا تھا۔ کپڑے پہنانے والا ملازم اپنی پسند سے جو مالک کا مزاج داں ہوتا توشک خانے سے جوڑا لا کر دونوں وقت بدلوا دیا کرتا تھا۔ اسی تخت سے متصل زمین پر ایک طشت یا تسلہ لگا رہتا تھا جس میں دونوں وقت گھاس بدل دی جاتی تھی۔ صبح کو کپڑے بدلنے کے قبل اور منہ وغیرہ دھونے سے پہلے سارے جسم کی صفائی کی جاتی تھی لیکن اُس زمانہ میں صابن وغیرہ کا رواج نہیں تھا اور نہ اُس زمانہ کے رئیس صابن کو پسند کرسکتے تھے۔ منہ دھونے میں چنے کا بیسن اور جسم کی صفائی میں اُبٹنا ملا جاتا تھا۔ اُبٹنا ہر گھر میں علیحدہ علیحدہ اپنے طریقہ پر تیار ہوتا اور اُس کی مالش کے لیے حجام ملازم رہتا تھا۔ یہی حجام بال بھی نکالتا اور ڈاڑھی بھی بناتا تھا۔ تمام ضروری اوزار رئیس کی ملکیت کے علیحدہ رہتے تھے۔ روزانہ غسل کرنے کا دستور نہیں تھا۔ بعض رئیس ہفتہ میں ایک بار بعض مہینہ میں ایک بار نہاتے تھے۔ اور اس غسل

کے لیے طرح طرح کے انتظامات گھنٹوں کیے جاتے تھے۔ راقم کے عم محترم نواب غلام حسین خاں مرحوم سال میں ایک بار گرمیوں کے موسم میں نہاتے تھے لیکن اس نہان میں چالیس پانی سے بھری مشکیں صرف انھیں کے جسم پر پڑتی تھیں۔ دن بھر غسل میں صرف ہوتا اور اس کے بعد گھنٹوں تک حجام ہاتھ پاؤں دباتا تھا تب تھکن جاتی تھی۔ اسی مقام پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ غسل کرنے میں اتنی احتیاط کسی گندگی کا باعث نہیں ہوتی تھی۔ اول تو یہ لوگ اس طرح زندگی بسر کرتے تھے کہ گرد و غبار یا کسی آلودگی کی قربت کا کوئی موقع ہی نہیں تھا دوسرے یہ کہ ہر روز صبح کو گھنٹوں تک سارے جسم کی بٹنے وغیرہ سے صفائی ہو جاتی تھی لہٰذا اُن کا یہ اشنان پانی سے غسل کا بدل ہو جاتا تھا۔

بجلی کی روشنی کا تو کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ مٹی کے تیل کا لیمپ بھی رؤسا کو ناگوار ہوتا تھا۔ بڑے بڑے اور قیمتی خوشنما لیمپ ضرور موجود رہتے تھے اور روشن کر کے دور رکھ دیے جاتے تھے لیکن قیام گاہ اور خواب گاہ میں عام طور سے شمعوں کی روشنی ہوتی تھی۔ چھتوں میں جھاڑ فانوسیں، قمقمے وغیرہ لٹکے رہتے اور دیواروں میں شاخیں اور ڈالے لگے رہتے اور فرش پر شمعدان، مردنگ وغیرہ رکھے رہتے تھے۔ ان سب میں کافوری چھوٹی اور بڑی شمعیں نیز رنگین طوغیں لگی رہتی تھیں جن کو شام کے وقت حسبِ ضرورت روشن کر دیا جاتا تھا۔ جب یہ تمام شمعیں اور طوغیں روشن ہو جاتی تھیں تو سارا کمرہ جگمگا اُٹھتا تھا۔ رنگینی اور روشنی کا تلاطم اپنی جگہ پر خود ایک نظر فریب چراغاں ہوتا تھا۔ یہ بہار روز رہتی تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ شمعیں ہم کو اگر آج نصیب ہو جائیں تو غالباً ہم کو اپنی موجودہ برقی روشنی کی قطعاً نہ ضرورت ہوگی اور نہ کوئی خواہش۔ اِن چراغوں کے روشن کرنے اور اسی طرح گل کرنے میں کافی وقت خرچ ہوتا تھا۔ رئیس کی شام کو ہوا خوری کے لیے روانگی کے وقت ہی سے چراغ روشن کرنے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں اور رات کو محفل برخاست ہونے کے بعد دیر تک شمعیں گل کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ منہ سے پھونک کر چراغ گل کرنا نہ صرف عیب بلکہ گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک پتلے بانس کے سرے میں ایک لمبا اور چوڑا کپڑا اسمٹا ہوا بندھا رہتا تھا اُسی کے گوشہ کو شمع پر ڈھک کے روشنی بجھا دی جاتی تھی۔ میں نے خود کبھی غور نہیں کیا لیکن کہا جاتا تھا کہ کافوری شمعیں گل ہونے کے بعد دھواں نہیں دیتی تھیں۔ اُن کی روشنی بہر حال ہر دوسرے چراغ سے اس لیے بہتر تھی کہ اُس کا اثر ہماری آنکھوں پر خوشگوار پڑتا تھا۔

عمائدین ورؤسا بشرطِ صحت و عافیت نیز اگر کوئی دوسرا مشغلہ اُسی وقت کے لیے متعیّن نہ ہوا تو ہر روز شام کو ہوا خوری کے لیے گھوڑا گاڑیوں پر نکلا کرتے تھے اور آبادی کے باہر جاتے تھے۔ اس ہوا خوری میں تخمیناً ڈیڑھ دو گھنٹہ وقت صرف ہوتا تھا اور ہر حال میں چراغ جلنے تک واپس آجاتے تھے۔ اس موقع پر وہ سب بہترین کپڑے پہن کر نکلتے تھے۔ گاڑیاں اپنی اپنی پسند کی ہر رئیس خود خریدتا تھا۔ کسی کو ٹم ٹم پسند تھی تو کوئی لینڈو کا دلدادہ تھا، کوئی شکرم گاڑی پر نکلتا تو کوئی چوکڑی پر۔ غرضکہ سواریاں رئیسوں کے علیحدہ علیحدہ مذاق کے تابع ہوتی تھیں۔ اسی طرح گھوڑوں کی خریداری میں بھی ہر رئیس کو بڑا انہماک تھا۔ قیمت عطا کرنے میں مول تول کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جانور کی نوع و نسل، اصالت وصولت، رنگ و روپ، قد و قامت اور چشم و گوش کی پیدائشی ساخت پر بڑی ماہرانہ توجہ رکھی جاتی تھی۔ سائیس اور کوچوان کے ذمہ گاڑیوں کو صاف و شفّاف رکھنے کا فریضہ ہوتا تھا لیکن گھوڑوں کی صحت اور اُن کے لیے غذاؤں پر مالک خود توجہ فرماتے تھے۔ عند الضرورت بہتر سے بہتر دوا و علاج کیا جاتا اور مقوی سے مقوی غذائیں اپنی آنکھوں کے سامنے کھلوائی جاتی تھیں۔ پرنس باقر علیخاں کے یہاں متعدد گھوڑے تھے ان کو وہ بالائی کے تھال منگوا کے خود اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے۔ یہ تماشہ کئی بار میں نے خود دیکھا تھا۔ ہر رئیس کو اپنے جانور کے لیے بہترین ساز، کلغیاں اور تمام ضروری سامان فراہم کرنے کی خود فکر رہتی تھی۔ سائیسوں اور کوچوانوں کے لیے اچھے اچھے یونیفارم تیار ہوتے تھے جن پر ہر رئیس کا اپنا مونوگرام بنا ہوتا تھا۔ ان ملازمین کے لیے انتہائی صاف ستھرا و پہلا سنہرا لباس پہننا ضروری تھا۔ چمکتے ہوئے سازوں، دمکتی ہوئی کلغیوں اور دیگر سامانِ آرائش کے ساتھ جب زرق برق پوشاک میں سائیس ہوتے تو شام کو ان سواریوں کی طرف بڑے اشتیاق سے لوگوں کی نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ اُس زمانے میں راستے تھے سڑکیں نہیں تھیں اور نہ بہتات سے عام سواریاں تھیں۔ خال خال شکرم گاڑیاں اور یکے تھے اس لیے شام کو ان رئیسوں کی سواریاں بہت زیادہ جاذب نظر ہوتی تھیں اور بلا ارادہ بھی راہ گیر اُن کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔ راستوں کی تنگی کا لحاظ کرتے ہوئے یا اس تنگیٔ راہ کی مجبوریوں کے باعث بیشتر و اکثر رؤسا جو نسبتاً باہر زیادہ نکلتے تھے ٹم ٹم پر سوار ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں نواب سید محمد یوسف کاظمی، حکیم نظیر حسن خاں اور بعض دوسرے رؤسا کی سواریاں بہت دیدہ زیب تھیں۔ انھیں میں ایک ڈاکٹر نی مس مترا بھی تھی جس کی ٹم ٹم، گھوڑی اور خود اُس کے ہانکنے کا اسلوب یہ سب مل کر بہت حسین و جمیل نظارہ پیش

کرتے تھے۔ لیکن وکٹوریہ اسٹریٹ کے رؤسا میں تین صاحبان کی ٹم ٹم گاڑیاں اپنے اپنے مخصوص جانوروں کے ساتھ اپنا جواب ہی نہیں رکھتی تھیں۔ نواب محمد علی خاں المعروف بہ نواب بنّے صاحب کی کمیت گھوڑی، مرزا بہادر مرزا جعفر علی خاں کی مشکی گھوڑی اور مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کی ابلق گھوڑی اپنی آپ مثال تھیں۔ اِن صاحبان کی گاڑیاں اور گھوڑیاں بہترین تھیں۔ اس کے علاوہ یہ تینوں صاحبان اپنے اپنے طرز سے بہت عمدہ ٹم ٹم ہنکاتے تھے۔ ان ٹم ٹموں کے علاوہ جو سواریاں قابلِ ذکر ہیں اُن میں شیخ علی عباس اور شہنشاہ حسین مرحوم کی پالکی گاڑیاں تھیں جن میں بہت عمدہ اور نفیس گھوڑوں کی جوڑیاں جوتی جاتی تھیں۔ نواب باقر علی خاں چوپھیا گاڑی پر نکلتے تھے اور اُن کی گاڑی میں سرنگ جوڑی رہا کرتی تھی۔ مولوی مہدی حسین ماہر چوکڑی پر نکلتے تھے جس میں سبزا چوکڑا لگا ہوتا تھا۔ نواب اصغر حسین مرحوم کی طبیعت میں نفاست پسندی زیادہ تھی۔ وہ لینڈو پر نکلتے تھے جس میں آئینہ اور گھڑی نصب رہنا ضروری تھا۔ اُن کی سواری کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ وہ جس راستہ سے نکلتے وہ دیر تک عطر کی خوشبو سے بسا رہتا تھا۔ دوسرے رئیسوں کی طرح نواب اصغر حسین کے اصطبل میں بھی اصل نسل و نوع کے متعدد گھوڑے تھے۔

شام کی ہواخوری کے علاوہ یہ لوگ عام طور سے گاڑیوں پر نہیں نکلتے تھے۔ اوّل تو باہر نکلنا ہی کم ہوتا تھا لیکن اگر تقاریب میں شرکت یا کسی اہم ضرورت سے کہیں جانا ہوتا تو فینس پر نکلتے تھے۔ فینسوں پر کار چوبی چھتکا اور رئیس کا مونوگرام بنا رہتا تھا۔ کہار مستقل طور پر ملازم رہتے تھے۔ اور اُن کو وردیوں سے نوازا جاتا تھا۔ وردیاں رنگین اور ہر رئیس کی علیحدہ علیحدہ پسند کی سلوائی جاتی تھیں۔ اُن میں بھی مونوگرام رہتا تھا۔ اس فینس کے اندر نہایت خوشنما رنگین قالین بچھا رہتا تھا اور ایک اگالدان کا رکھا رہنا بھی ضروری تھا۔ نواب کے ہمراہ ایک بڑا رومال اور پان کا خاصدان بھی ہوتا تھا۔ دعوت یا کسی شادی کی تقریب میں جانا ہوتا تو خدمت گاروں اور عصابرداروں کو بھی فینس کے ہمراہ چلنا پڑتا تھا۔ معمولی حالات میں بھی دو ایک خدمت گار ضرور ساتھ رہتے تھے یہ بات بھی مخصوص تھی کہ یہ رؤسا اپنے مخصوص دوستوں، قریبی عزیزوں یا ہم پایہ رئیسوں کے علاوہ اور کہیں نہیں جاتے تھے لیکن اپنے ملازمین میں جو لوگ مقرب ہوتے اُن کے یہاں جانے میں تکلف نہیں کرتے تھے۔ یہ فقرہ صدہا مرتبہ گوش زد ہوا تھا کہ "بھائی اگر میں نہ جاؤں گا تو اُس (نام لے کر) کا دل ٹوٹ جائے گا۔" رئیس کو اپنے ملازم کا دل رکھنے کی فکر رہتی اور ملازم مالک کی تشریف آوری اپنے حق میں باعثِ عزت و برکت سمجھتا تھا۔

# (۳) خانگی زندگی

عرفِ عام میں خانگی زندگی کے معنی ہیں اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ وقت گزاری کرنا اُن کی خبرگیری اور کفالت کرنا نیز گھر کے معاملات میں دلچسپی لینا۔ اگر یہی خانگی زندگی کی تعریف ہو تو ہمیں یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ پرانے رئیسوں کی خانگی زندگی بمنزلہ صفر کے تھی۔ سارا رہن سہن اس طرز کا تھا کہ میاں بیوی میں ایک دوسرے کا شریکِ زندگی ہونے کا کوئی تصوّر ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نئی دُلہن زیادہ تر اپنی ساس یا دوسری عزیز عورتوں سے وابستہ رہتی تھی۔ شوہر ساتھ کھانا کھا لیتا یا کچھ مدّت تک گھر کے اندر بیوی کے ساتھ ایک ہی بستر پر سوتا۔ لیکن دو تین بچے پیدا ہو جانے کے بعد پھر میاں بیوی علیحدہ علیحدہ قیام کرتے، وقتاً فوقتاً باہم گر قربت ہو جاتی تھی۔ وہ رؤسا جو گھر میں قیام بھی کرتے زیادہ تر علیحدہ ہی رہتے تھے۔ کبھی کبھی میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ پچیسی یا چوسر کھیل کر دل خوش کر لیتے لیکن باہر کی نشست کے معمولات برقرار ہی رہتے تھے۔ اس زندگی کے بارے میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ نواب باہر کے مالک اور بیگم گھر کی ملکہ بنے رہتے تھے۔ خانگی اخراجات ہر ماہ میں مقرّرہ تاریخ پر خزانچی گھر کے اندر بیگم صاحبہ کو بھیج دیتا۔ کوئی نئی ضرورت لاحق ہوتی تو وہ بھی اسی طرح پوری ہو جاتی تھی۔ بیماری دُکھی کے موقع پر ملازم حکیم تدارک کر دیتا یا مناسب سمجھتا تو کسی دوسرے مقتدر طبیب کو اپنا شریکِ کار بنا تا۔ نواب کو رسماً اطلاع دی جاتی یا استصواب کر لیا جاتا۔ البتہ تقاریب کے مواقع پر زن و شو میں دل کھول کر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا اور ہر معاملہ متحدہ اور متّفقہ طور پر طے کر لیا جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر باہمی اختلافات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس طرزِ زندگی میں زن و شو کے درمیان اختلافات پیدا ہونے کی گنجائش ہی بہت کم تھی اور یہ گنجایش ابتدائی تعلیم کی بدولت اور کم رہتی تھی۔ محلوں میں لڑکیوں کو اپنے شوہر کا مطیع و منقاد رہنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ شوہر کی اطاعت فریضۂ ایمانی قرار دیا جاتا تھا اور اس کے مقابل میں لڑکوں کو نان و نفقہ کی ذمّہ داری ذہن نشین کرا دی جاتی تھی۔ اس مختصر تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ عورت اسی میں خوش رہتی تھی کہ محل کے اندر تمام ماحول پر اُس کا اقتدار چھایا رہتا تھا اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ مرد بہر حال برتر ہے اور آزاد، اُس کی عصمت بے چارگی کی وجہ سے برقرار رہتی لیکن مرد اپنی بیرونی قیام گاہ میں طوائفوں سے خلط ملط کے لیے آزاد رہتا

تھا۔ بہت کم ایسے مواقع آتے تھے کہ محلات میں عورتوں پر شدت کے ساتھ ایسا جذبۂ رشک طاری ہوا ہو کہ وہ اپنے شوہروں سے برسرِ اختلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ دلوں میں اگر ایسا کوئی جذبہ کبھی پیدا بھی ہوتا تو وہ غریب کلیجہ مسوس کے رہ جاتی تھیں۔ سب سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ محلوں کے اندر اور باہر کی تعلیم میں زبردست فرق تھا۔ لڑکوں کو یہ تعلیم ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ جنسی زندگی میں بھی اپنی زوجہ کے جذبات کا احترام کریں۔ اس کے برعکس لڑکیوں کو اپنے شوہر کی ہر ناروا بات پر سرِ تسلیم خم کیے رہنے کی ہدایت ملا کرتی تھی۔ اس تعلیم کی بدولت لڑکی کی ذہنیت کیسی تعمیر ہوتی تھی اُس کی ایک مثال درج ذیل ہے۔

میرے ایک بہت عزیز اور بے تکلّف دوست جن کا مقام صنفِ عمائدین کی صفِ اوّل میں تھا، ایک شادی کی تقریب میں گئے تھے، میں اُن کے ہمراہ تھا، بارگاہ سجی ہوئی تھی اور کئی طوائفوں کے مجرے تھے۔ اُن میں سے ایک ڈیرہ دار طوائف حسن و جمال کا پیکر اور تہذیب و اخلاق کا مجسمہ بھی وہاں موجود تھی یہ طوائف بہترین موسیقار بھی تھی۔ اُس زمانہ میں اُس کے تعلّقات کسی رئیس سے نہیں تھے۔ اس لیے میرے دوست کو اُس سے تخاطب کرنے کی بڑی آسانی ہوگئی۔ محفل میں طوائفوں سے اشارہ بازی یا جملے کسنا یا براہِ راست گفتگو کر لینا عیب نہیں تھا۔ چنانچہ میرے دوست دیر تک اسی کی طرف متوجہ رہے اور اُن کے مصاحبین اُن کی ہمّت افزائی بھی کرتے رہے۔ قریب ہی پردہ کے پیچھے مستورات کی نشست کا انتظام تھا۔ صفِ اوّل میں انھیں کی بیگم اور میری خوشدامن صاحبہ قریب قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں محترم عورتوں نے میرے دوست کی ساری گفتگو سن لی۔ میری خوشدامن صاحبہ کو بہت غصّہ آیا کیوں کہ اُن کو اُن کی بیگم سے بہت خلوص تھا۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتی تھیں البتہ کوئی سخت جملہ اُن کے بارے میں اُن کی بیگم سے کہہ دیا۔ دوسرے یا تیسرے روز کسی معاملہ کے سلسلہ میں اُن دونوں کے درمیان گفتگو کا موقع آیا۔ بیگم نے اپنے شوہر سے دورانِ گفتگو میں یہ کہا کہ ”مجھے آپ کے طور طریقوں سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن جب آپ کی اُن باتوں کو دیکھ کر دوسرے اعتراض کرتے ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔“ اِسی ایک جملہ سے بے بس مستورات کے جذبات کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن پردہ پوش بیگمات کے شرافتِ نفس کا پتہ بھی چلتا ہے۔

بیگمات کے اس شریفانہ طرزِ عمل یا اُن کی عصمت بی بی از بے چارگی اور ساتھ ہی

ساتھ اُن کے محلسراؤں کے اندر وقار و اقتدار سے ہرگز ہرگز یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ وہ اپنے رئیس شوہروں کی تعیش اور طوائف بازی سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوتی تھیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب اصرافِ بے جا کی بدولت آہستہ آہستہ دولت ختم ہو رہی تھی تو اُن کو بھی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کے علاوہ انسانی فطرت کا یہ تقاضہ ہے کہ عورت میں جذبۂ رشک پیدا ہو۔ ایسا جذبہ یقیناً پیدا ہوا ہوگا اور انھوں نے تمام آرام و سکون کے باوجود اپنے دل میں گھٹن محسوس کی ہوگی، اور رفتہ رفتہ اسی گھٹن کے نتیجہ میں بہت سی پاکباز اور خوش فکر بیویاں مہلک امراض میں مبتلا ہو کر اس دنیا کو خیرباد کہہ گئی ہوں گی۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ محلات کے اندر کی زندگی کے تفصیلات جاننے کا نہیں ہے۔ جو کچھ بظاہر نظر آتا تھا اُس سے محلوں کے اندر کا ماحول یقیناً مختلف رہا ہوگا جس کو بتانے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ اُس زمانے میں بیگمات میں بہت کم ایسی تھیں جنھوں نے طویل عمر پاکر اس دنیا کو خیرباد کہا ہو اور جوانی میں مرجانے والیوں کی تعداد بہرحال اچھی خاصی نظر آتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرّہ برابر بھی باک نہیں ہے کہ ہمارے خاندان کی مستورات ضبط و صبر کی خصوصیات میں بلند سے بلند تر درجوں پر فائز تھیں۔ وہ زبان سے شکایت کرنے کی خوگر بھی نہیں تھیں۔ اپنے شوہروں کا ادب ہی نہیں بلکہ دلجوئی اور اُن کی اطاعت کرنا شعار تھا لیکن پھر بھی اُن کے پہلو میں انسانی دل تھا اور وہ یقیناً جذبۂ رشک سے مغلوب بھی ہوتی ہوں گی لیکن وہ سماج ایسا تھا جب مرد کو موردِ الزام قرار دینے والا کوئی نہ تھا۔

اِن حالات میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُس دور میں ہمارے رؤسا و عمائدین کی کوئی خانگی زندگی نہیں تھی اور اس طرزِ زندگی کی جو جھلکیاں اُن کی سوانح حیات میں نظر آتی ہیں وہ نہ لائق لحاظ ہیں اور نہ تذکرہ کرنے کے قابل ہیں۔ اُن کے حق میں خانگی زندگی کا اطلاق اُسی معاشرہ پر ہو سکتا تھا جو وہ اپنے محل اور محلسراؤں کی بیرونی قیام گاہوں میں قایم کیے ہوئے تھے۔ یہاں اُن کی صحبت میں اُن کی رفیقِ حیات طوائف ہوتی تھی اور اہل و عیال کی منزلت ملازمین و لواحقین کو حاصل رہتی تھی۔ خاندان کی یہ مصنوعی تشکیل یقیناً فطری تقاضوں کے خلاف تھی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اسی غیر مناسب رجحان نے بہت سی اعلیٰ قدروں کو جنم دیا تھا، بہت سی بلند پایہ خصلتوں کو پروان چڑھایا تھا اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اخوت و انسانیت کے حلعت سے ان رئیسوں کو سرفراز کر کے ان کو

خدمتِ خلق کے جذبہ پر ہمہ وقت آمادہ کر رکھا تھا جس کے اثرات ہمہ گیر تھے۔ اُن کے تعلقات خانگی چاہے حسبِ دستور اور حسبِ مراد نہ ہوں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے اپنے اہل وعیال کی حق تلفیاں نہیں کی تھیں۔ اُن کو ستایا نہیں تھا اور اگر پدری شفقت میں ظاہر بظاہر کوئی خاص انہماک نہیں تھا تب بھی رفق ومدارات میں انھوں نے کبھی کوئی کمی نہیں کی۔ یہ طرزِ عمل اُنھی اقدار کا نتیجہ تھا جن کو وہ قبول کیے اور کلیجے سے لگائے ہوئے تھے۔

رؤسا وعمائدین کی خانگی زندگی سے قطع نظر کرنے کے بعد جب ہم اُن کی پبلک لائف کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں کا نقشہ بھی کچھ عجیب ہی نظر آتا ہے اور ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کی پبلک لائف بھی بمنزلۂ صفر کے تھی کیوں اُن کا کوئی براہِ راست رابطہ عوام سے نہیں تھا۔ اِن رئیسوں کی زندگی شعروادب، فنونِ لطیفہ اور اپنے مخصوص ذاتی مشاغل تک محدود تھی۔ دورِ جدید کے تقاضوں سے بے نیاز تھے۔ انگریزی تعلیم کی برکتوں سے محروم تھے۔ انگریزی پڑھنا گناہ اور جدید رجحانات کی طرف مائل ہونا حرام تھا۔ سیاسیات سے دور رہنا اُن کا مسلک تھا البتہ حکومتِ وقت کی خواستہ یا ناخواستہ اطاعت و فرمانبرداری اُن کے لیے ضروری تھی اور یہ طرزِ عمل حکومت سے خوف وہراس کی بنا پر تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب نواب جعفر علی خاں مرحوم کے دربار میں تحریکِ خلافت کے سلسلے میں جو اُس زمانہ میں شروع ہوئی تھی کسی نے تذکرتاً کوئی کلمہ کہہ دیا تھا تو نواب صاحب گھبرا گئے تھے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فرمایا تھا کہ "چپ رہیے، دیوار ہم گوش دارد"۔ اس خوف وہراس کا یہ عالم تھا کہ سرکاری محکموں کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اہل کار آجاتا تو اُن کے دل ہل جاتے تھے۔ یہ کیفیت غالباً غدر کے بعد کے حالات کا نتیجہ تھی جو شعوری یا غیر شعوری طور پر کئی نسلوں تک جاری رہی تھی۔ لیکن اِن تمام کمزوریوں اور نقائص کے باوجود اُن کی شرافت وانسانیت، ذہانت وذکاوت، عالی ہمتی واولوالعزمی اور ایسے ہی بہت سے دوسرے گراں قدر خصائل میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اُن تمام چیزوں، معاملات، اور مشاغل میں جن سے اُن کو شغف تھا انھوں نے نفاست، اختراع اور برتری پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ اُن کے اسی مذاقِ سلیم کے اثرات اُن کے ملازمین، مصاحبین، لواحقین اور درباروں میں آنے والوں کے توسط سے عوام تک پہنچتے تھے اور اِس طرح سلسلہ بہ سلسلہ ذہنی وارتقائی منازل طے کر کے

ہمارا وہ سماج برقرار تھا جس کی بنیاد تہذیب و اخلاق، علم و ادب، سنجیدگی و شائستگی اور شرافت و انسانیت پر قائم ہوئی تھی۔

## (۴) ملازمین و مقربین

ملازموں کی کثرت شانِ ریاست میں داخل تھی لیکن اس بہتات میں رئیسوں کے جذبۂ حسنِ سلوک اور غربا پروری کو بھی دخل تھا متعلقین و مقربین کی سفارش پر برابر آدمی رکھ لیے جاتے تھے اور کسی کو برطرف کرنے کا عام دستور نہیں تھا۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے علیحدہ ملازم رکھا جاتا اور کبھی کبھی ایک ہی جگہ پر کئی کئی آدمی تعینات رہتے تھے جو آدمی جتنا زیادہ پرانا ہوتا اتنی ہی اُس کی زیادہ قدر ہوتی اور خاطرداری کی جاتی۔ ان تمام ملازمین اور متعلقین میں اُن کے علیحدہ علیحدہ مناصب اور پیشوں میں افضلیت کے اعتبار سے اونچے اور نیچے کی تفریق ہوتی تھی۔ ہر رئیس کے دربار میں کم سے کم ایک اور بعض کے یہاں دو دو اور تین تین تک شعرا ملازم رہتے تھے، کم سے کم ایک طبیب رہتا تھا جو ہر روز خاندان والوں کی خیریت دریافت کرتا اور عند الضرورت علاج کرتا۔ کم سے کم ایک مولوی ہوتا جو بچّوں کو تعلیم دیتا اور رئیس کے دربار میں بھی حاضر ہوتا۔ لیکن یہ حاضری بہت قلیل مدّت کے لیے ہوتی تھی کیونکہ مولوی کی موجودگی میں رئیس کو سنجیدہ اور حاضرین کو خاموش رہنا پڑتا تھا۔ مولوی صاحب کا دربار میں صرف یہ کام ہوتا تھا کہ وہ رئیس کی فرمائش پر استخارہ دیکھ دیا کرتے تھے اور ایسے استخارے ایک وقت میں کئی کئی بار اور کئی کئی امور کے متعلق دیکھنا پڑتے تھے۔ مولوی، اطباء، اور شعراء مدارج اعلیٰ پر فائز تھے اور اُن میں شعرا کو سب سے زیادہ قربت حاصل رہتی تھی۔ وہ رئیس کے خلوت و جلوت میں شریک رہا کرتے تھے۔

ریاست کے معتمد ملازمین، خزانچی، محاسب، میر منشی اور پیشکار ہوتے تھے جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے خزانچی ساری دولت کا نگہبان ہوتا تھا۔ بعض پرانے طرز کے رئیس بنک میں روپیہ رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ اُن کی دولت گھر ہی میں ایک بڑے لوہے کے بکس میں مقفّل رہا کرتی تھی جس کا کلید بردار خزانچی ہوتا تھا۔ میرے نانا نواب حکیم شفاء الدولہ بہادر مرحوم نہ اپنی آنکھوں سے روپیہ دیکھتے اور نہ اپنے ہاتھوں سے چھوتے

تھے۔ علاقوں سے جو وصولیابی آتی وہ خزانچی حاصل کر کے مقفل کر دیا کرتا تھا۔ نواب صاحب صرف آمدنی و خرچ اپنے ہاتھ سے لکھ لیتے تھے۔ یہ رجسٹر انھیں کے پاس رہتا تھا اور اُسی کو دیکھ کر آمدنی و خرچ اور تحویل کا پتہ چلا لیتے تھے۔ خزانچی ہر روز مقررہ وقت پر آتا اور عندالضرورت روپیہ نکالتا یا داخلِ خزانہ کر لیتا تھا۔ اُس زمانہ میں سکّہ رائج تھا۔ کبھی کبھی ایسا موقع بھی آتا تھا کہ روپیہ گننا آسان نہ ہوتا یا قلّتِ وقت کے باعث تعداد کا تعین گن کر نہ ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں خزانے سے تول کر روپیہ نکالا جاتا تھا اور کبھی کبھی اسی طرح داخل بھی کیا جاتا تھا۔ اس آمدنی و خرچ کا مجمل حساب خزانچی لکھتا اور اُسی کے پاس محفوظ رہتا تھا۔ لیکن اِن مدّات کی تفصیل محاسب کے کاغذات میں درج رہتی تھی۔ میرمنشی متعلقہ کاغذات کا امین ہوتا تھا۔ جو درخواستیں مالیات سے متعلق موصول ہوتی تھیں ان کے متعلق زبانی یا تحریری رپورٹ پیش کر کے احکام حاصل کرنے اور اُن کی تعمیل میر منشی کے ذمّہ رہتی تھی۔ پیشکار براہِ راست جملہ انتظامی اور انصرامی امور سے متعلق براہ راست رئیس سے منسلک رہتا تھا۔ تمام انتظامی معاملات اُسی کی معرفت طے ہوتے تھے۔ اس عملہ میں سب سے زیادہ بلکہ ہر روز اور کبھی کبھی ایک ہی دن میں کئی بار پیشکار کو رئیس کی خدمت میں حاضر ہونے کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی۔ ان چاروں افسرانِ اعلا کے پاس کم سے کم ایک اور بعض کے پاس دو دو چپراسی رہتے تھے۔ خزانچی کے ماتحت محصل بھی ہوتے تھے جو املاک کا کرایہ وغیرہ وصول کر کے جمع کر دیا کرتے تھے۔ جن رئیسوں کے پاس مواضعات بھی تھے اور جن کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اُن کے مواضعات پر علیحدہ عملہ تھا۔ وہاں سے غلّہ اور دیگر اشیا بھیجنے کے لیے ضرورت کے وقت رعایا میں کسی کو پکڑ لیا جاتا تھا جو بے گار کے نام سے موسوم ہوتا تھا۔ اس آدمی کو لمبے لمبے سفر سر پر بوجھ لاد کے کرنا پڑتے تھے جس کی مزدوری شرمناک حد تک بہت کم ہوتی تھی۔

محل کے حسابات کی جانچ رئیس خود فرماتے تھے۔ پیشکار روزمرّہ کے حسابات کا رجسٹر دوسرے یا تیسرے دن پیش کرتا تھا اور اُسی کو ہر روز یا جب بھی ضرورت ہوتی اخراجات سے متعلق زبانی یا تحریری ہدایات ملتے تھے۔ وہ خزانچی سے روپیہ حاصل کر کے متعلقہ عملہ کی وساطت سے کاروبار چلاتا تھا۔ یہ نظام بظاہر بہت معقول تھا لیکن خرابی یہ تھی کہ نواب کو حسابات کے جانچ کرنے میں یا تو دلچسپی نہ ہوتی یا پھر وہ اس صلاحیت سے محروم ہی ہوتے تھے حسابات کی جانچ صرف اس طرح ہوتی تھی کہ پیشکار متعلقہ رجسٹر حاضر کرتا اور سرکار والا جاہ

ملاحظہ فرما کے صرف یہ دیکھ لینے کہ اُن کے کارندہ نے آمدنی و خرچ کے مدات کی میزان صحیح جوڑی ہے یا نہیں۔ بعض رئیس تو یہ بھی نہیں کرتے تھے اور آنکھ بند کر کے اعتماد فرما لیتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت سے رئیسوں کی تباہی بڑی حد تک خود انھیں کے ناکارہ، نااہل اور بددیانت پیشکاروں کی بدولت آئی تھی۔

محل کے ملازمین کی تعداد رئیس کی مقدرت اور ثروت اور اُس کے حوصلے کے تناسب سے متعین رہتی تھی لیکن ہر حال میں مردانے اور زنان خانے کے علیحدہ علیحدہ ملازمین ہوتے تھے اور اُن کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہوتی تھی۔ عمائدین کی ڈیوڑھیوں پر آٹھ سے سولہ تک پہرہ دار رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ دن اور رات بھر دو دو یا چار چار کی ٹولی میں صدر دروازہ پر مسلح ہو کر پہرہ دیتے تھے۔ انھی میں اُن کا ایک جمعدار بھی ہوتا تھا جو پہرہ داروں کے اوقات و فرائض مقرر کرتا۔ مال و متاع کی حفاظت و نگہبانی کے علاوہ ان پہرہ داروں کا یہ فرض تھا کہ کسی اجنبی آدمی کو محل کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔ نئے سودے والے یہاں تک کہ نئی اور نامانوس سودا بیچنے والی عورتیں بھی اندر نہیں جا سکتی تھیں۔ یہ پہرہ دار بہرحال اتنے ذہین اور سمجھدار تھے کہ نواب کی خدمت میں حاجت مندوں یا دربار میں شرفِ حضوری حاصل کرنے والوں کو اندر جانے کی اجازت دیتے تھے۔ برابر آنے والوں کو ہر وقت اذنِ عام حاصل رہتا تھا۔ اسی صدر دروازہ پر گھڑی اور گھڑیال کا بھی انتظام رہتا اور ایک علیحدہ آدمی گھڑیال بجانے کے لیے مقرر رہتا تھا۔

رئیسوں کے محل بڑے بڑے رقبہ اراضی میں تعمیر تھے۔ ہر املاک میں متعدد کمرے، کوٹھریاں، صحنچیاں، برآمدے اور حجرے تھے اور یہ سارا علاقہ زنانہ محل سرا سے علیحدہ ہوا کرتا تھا۔ اسی مردانہ حلقہ کی نگہداشت، صفائی اور دیکھ بھال کے لیے متعدد آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی کیوں کہ وسیع صحن اور بہت سے آراستہ و پیراستہ کمروں کی دیکھ بھال اور صفائی ہونا چاہیے تھی۔ ان ضروریات کے لیے ایک یا حسب ضرورت ایک سے زیادہ خاکروب مقرر رہتے اور جائداد منقولہ کی نگہداشت نیز کمروں کی صفائی کے لیے مکان دار اور فراش ملازم تھے۔ یہ تمام عملہ اپنے اپنے فرائض علی الصباح انجام دیتا تھا تاکہ رئیس کے برآمد ہونے تک محل کا ہر گوشہ صاف و شفاف نظر آئے اور اگر سرکار اتفاقیہ اِدھر آ جائیں تو ہر کمرہ میں ہر چیز سلیقہ سے اپنی جگہ پر لگی ہوئی موجود ہو۔ فراش کمروں کی صفائی کرتے تھے اور مکان دار جملہ

سازوسامان کا نگہبان تھا۔

مردانے باورچی خانہ کا عملہ علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک آدمی ہاون دستہ میں مسالے کوٹنے کے لیے مامور رہتا تھا۔ بہترین غذاؤں میں کٹا اور چھنا ہوا مسالہ پڑتا تھا۔ یہ کام اتنا اہم تھا کہ آدمی علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ کوٹنے اور چھاننے کے علاوہ مسالہ پیسنے کا کام بھی اُسی آدمی کے حوالہ رہتا۔ اچھا کھانا پکانے میں مسالے تیار کرنے کے لیے بھی ایک، فن کار آدمی کی ضرورت ہوتی تھی۔ باورچی کے لیے مشّاق اور فن کار ہونا لازمی تھا۔ رئیسوں کے باورچیوں میں فن کارانہ صلاحیتوں کے مقابلے ہوتے تھے اور ایک دوسرے پر فوق لے جانے کی کوشش میں آئے دن نئے نئے اختراعات ہوا کرتے تھے۔ ہر باورچی خانہ میں صرف ایک ہی بلند پایہ باورچی ہوتا تھا لیکن دو آدمی اس کے مددگار ہوتے تھے جن میں ایک نان پز ہوتا تھا جو صرف چپاتیاں پکاتا تھا۔ شیرمال، باقرخانی یا اسی قسم کی دوسری چیزیں پکوانے کے لیے یا تو تنور گڑوایا جاتا اور باہر سے آدمی بلائے جاتے یا سہولت کے مدِ نظر بازار ہی سے یہ اشیا فرمائش کر کے تیار کرائی جاتی تھیں۔ باورچی کا دوسرا مددگار کھانے تیار کرانے میں اُس کی مدد کرتا تھا یہ آدمی خود بھی اچھا خاصا باورچی ہوتا تھا۔ ان ملازمین کے علاوہ باورچی خانہ میں ایک آدمی صفائی رکھنے، پتیلیاں اور کھانا پکانے کے دوسرے ظروف دھونے مانجھنے کے واسطے مقرر رہتا تھا، ایک آدمی کھانا کھانے کے برتن دھونے اور صاف کرنے پر مامور رہتا اور کم سے کم دو تین آدمی متفرق کاموں نیز تیاری کے بعد رئیس کے دسترخوان تک خوانوں میں کھانا لے جانے پر معین رہتے تھے۔ اصل باورچی کا دوسرا مددگار باورچی پیالوں، پلیٹوں، قابوں اور طشتریوں میں کھانا نکال کر سلیقہ سے خوانوں میں لگا دیتا اور خوان پوش ڈھک کر کسنوں سے باندھ دیا جاتا پھر وہ متفرق کام کرنے والے ملازم اُن خوانوں کو سرکار کے روبرو پہنچا دیتے تھے وہاں خدمت گار سلیقے سے دسترخوان چُن دیتے تھے۔ یہ سارا کام اتنی ہنرمندی اور سلیقہ سے ہوتا تھا کہ رئیس کے دسترخوان پر غذائیں گرم گرم ہی مہیا رہتی تھیں۔

متفرق عملہ میں دو[2] درزی جو ہر روز کچھ نہ کچھ سلائی کا کام کرتے، دو دھوبی جو گھر ہی میں ہر روز کپڑے دھوتے تھے کیوں کہ دن میں دو بار کپڑے بدلے جاتے تھے، ایک حجّام، تین چار بہشتی پانی بھرنے کے لیے، آٹھ فینس کے کہار اور موسم گرما میں حسبِ ضرورت پنکھا قلی تعینات رہا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر ضرورت کی فراہمی کے لیے محل کے اندر ہی آدمی موجود رہتے

تھے۔ باہر سے کسی کو بلانا نہیں پڑتا۔ متذکرہ بالا سارا عملہ نیز اصطبل خانہ پیشکاری ہی کے زیرِ اقتدار رہا کرتا تھا لیکن گھوڑوں اور اصطبل پر ذاتی طور سے رئیس ہی نگرانی فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً باورچی کو بھی بلا کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق فرمائشیں کرتے اور ہدایات صادر فرماتے تھے۔ اصطبل کے عملہ میں ہر رئیس کے یہاں دو گھسیارے، دو آدمی گھوڑوں کے پرستار اور ایک کوچ وان ضرور رہا کرتے تھے۔ جن رئیسوں کے یہاں بڑی بڑی گاڑیاں، چوکڑیاں اور گھوڑوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اُن کے اصطبل کا عملہ بھی زیادہ ہوتا تھا۔ گھوڑوں کے پرستاروں کا صرف یہی کام نہیں ہوتا تھا کہ وہ اُن کی غذا کا خیال رکھیں اور وقت کے اوپر جسم کی کھال صاف کر دیا کریں بلکہ اُن کو کافی ہوشمندی کے ساتھ اِن جانوروں کی صحت کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ عندالضرورت رئیس خود اپنے گھوڑوں کی تیمارداری کرتے تھے۔ ایک مخصوص آدمی اصطبل صاف رکھنے پر تعینات رہتا تھا تاکہ گندگی کے باعث گھوڑوں کی صحت پر کوئی خراب اثر نہ پڑے۔

اُن ملازمین میں جن کا براہِ راست تعلق رئیس سے ہوتا تھا خدمت گار اور عصا بردار تھے۔ یہ لوگ اُن کی ذات سے متعلق رہتے تھے۔ اور اُن کی تقرری یا علیحدگی رئیس کے ہی منشا پر ہوتی تھی۔ تقرّری کسی نہ کسی کی سفارش پر ہو جاتی تھی لیکن علیحدگی مالک کی ناخوشنودی پر ہوتی تھی۔ برطرفی کے لیے شاذ و نادر ہی مواقع پیدا ہوتے تھے البتہ علیحدگی ہو جاتی تھی اور اس کے یہ معنی تھے کہ اُس معتوب آدمی کو حاضر ہونے کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ کچھ نہ کچھ مدّت کے بعد اُسی کی عاجزی و لجاجت سے یا کسی دوسرے کی سفارش پر خطا معاف ہو جاتی اور وہ آدمی اپنی حیثیت پر بحال ہو جاتا تھا۔ یوں تو تقرب کا درجہ اطبا، شعرا، اور مصاحبین کو حاصل رہتا تھا لیکن بعض پرانے خدمت گار بھی مقرّب بارگاہ ہو جاتے تھے۔ ان خدمت گاروں کے تقرّر میں کوئی تعداد کہیں مقرّر نہیں تھی۔ صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد رئیس کی مکرمت پر منحصر ہوتی تھی۔ مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں کے یہاں، جن کے خانوادہ سے مجھے اپنے عہدِ طفلی سے تعلق و تقرب حاصل رہا ہے، تقریباً پچیس خدمت گار ضرور ملازم تھے، جن میں بعض بہت مقربِ تھے اور منزلت و شرف میں مصاحبین کے ہم پلّہ ہو گئے تھے۔ اِن خدمت گاروں کے فرائض میں رئیس کی خدمت کرنا اور تعمیلِ احکام کرنا تھا۔

مصاحبوں کا طبقہ اپنی جگہ پر ایک ادارہ تھا۔ ان لوگوں کا شمار شرفائے لکھنؤ میں تھا اور

بعض گراں قدر شعرا، اور فن کار بھی اسی طبقہ میں شامل تھے۔ لکھنؤ کی معاشرت پر زوال آنے اور ہمارے رئیسوں کے اُٹھ جانے کے بعد وہ لوگ بھی باقی نہ رہے جو رؤسا کے مصاحبین میں داخل تھے۔ ایک ایک ڈیوڑھی سے سیکڑوں جانوں کی پرورش ہوتی تھی اور جب ڈیوڑھیاں نہ رہیں تو یہ لوگ بھی مر کھپ کے ختم ہو گئے۔ اور اُن کے کمالات بھی فنا ہو گئے۔ موجودہ زمانہ کے لوگ اُس طرزِ زندگی سے ناواقف ہیں اس لیے وہ مصاحبوں کے بارے میں صرف یہی رائے قایم کر سکتے ہیں کہ یہ لوگ بے کار آدمی تھے جو بلا مشقت اپنا اور اپنے اہل و عیال کا کاروبارِ زندگی چلاتے تھے۔ لیکن اگر اُن کے طور طریقوں اور حسنِ خدمات کا اُنھی کے دور اور ماحول کو پیشِ نظر رکھ کے جائزہ لیا جائے تو آج بھی ہم کو اُن کی قدر کرنا پڑے گی۔ اُس زمانہ میں ہمارا لکھنؤ شعر و نغمہ میں ڈوبا ہوا تھا، معمولی معمولی سودے والے بھی موزونیت اور ترنّم میں آوازیں لگاتے تھے، شرافت و انسانیت کے سب ہی پرستار تھے، تہذیب و اخلاق کا ہر کس و ناکس گرویدہ تھا۔ ایسے دور میں یہ لوگ نمایاں طور پر خوش گفتار، بذلہ سنج، خوش اخلاق، راست باز وفا شعار، پاک باطن اور پاک ظاہر ثابت ہونے ہی پر مصاحبین کے صفوف میں جگہ پاتے تھے۔ خدا پرستی اور خدا ترسی شرفا کا شعار تھا، امیر ہوں یا غریب، بڑے اور چھوٹے قریب قریب سب ہی عبادت گزار تھے۔ بعض رئیس بات بات پر استخارہ کے پابند تھے۔ اُن کے یہاں استخارہ دیکھنے کی خدمت مصاحبین کے حوالے رہتی تھی۔ اُن کی قدر دانی اُن کے اوصاف کی وجہ سے تھی، جو جتنا زیادہ متّصف ہوتا اتنا ہی زیادہ تقرّب کا مستحق ہوتا تھا۔ رئیس عموماً خاموش رہنے کے عادی تھے۔ دوسروں کی باتیں سُن کر وہ مسرور ہوتے اور اگر پسندِ خاطر نہ ہوتیں تو خاموش ہی رہ جاتے تھے۔ رئیس کے مزاج اور وقت کے مطابق بات کرنا ہر مصاحب کا فریضہ تھا جس کو جو بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دیتا اُسی کو زیادہ منزلت حاصل ہوتی تھی۔ اُس زمانہ میں گالیاں بکنا عیب نہیں تھا لیکن عمائدین کے حضور سوءِ ادب سمجھا جاتا تھا پھر بھی موقع و محل دیکھ کر یہ لوگ کبھی کبھی مزاحاً آپس میں گالم گلوچ کر لیتے تھے جس کو سُن کر رئیس اپنے منہ پر رومال رکھ کر مسکرا دیتا تھا۔ اُن کے فحشیات میں بھی مقصد ہوتا تھا جو وہ حاصل کر لیتے تھے یہ ایسا فن تھا جس کا مظاہرہ کرنے میں بڑی بڑی گراں قدر ہستیوں کو بھی باک نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ مہاراجہ سر محمد علی خاں والی محمود آباد بہت زیادہ متردّد تھے اور تمام حاضرینِ بزم جو [illegible] قم بھی تھا یہی سوچ رہے تھے کہ اُن کے پژمردہ مزاج کی کس طرح اصلاح کی جائے۔

کئی بزرگوں نے باری باری مؤدبانہ کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دفعتاً منجھو صاحب سوز خواں نے ثاقبؔ مرحوم کو مخاطب کر کے فحش مذاق کیا اور اُن کی خوشدامن کو گالی دی۔ ثاقبؔ مرحوم نے برجستہ وہی جملہ اُن کی ساس پر دُہرا دیا۔ یہ دونوں بزرگ زبردست فن کار، مہذب، معمّر اور شائستہ تھے لیکن انھوں نے گالم گلوچ کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ مہاراجہ ہنس پڑے اور محفل جاگ اُٹھی۔

رئیس کے اصلاحِ مزاج اور تفننِ طبع کے لیے وہ ہر بر محل طرزِ تکلم پر آمادہ ہو جاتے تھے لیکن دوسروں سے مکالمت میں بلندیِ کردار کے کسی اصول کو قربان نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک افسوسناک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ میرے عزیز ترین اور بے تکلّف دوست رزا بہادر مرزا صادق علی خاں کے مصاحبین میں ایک بزرگ رضا حسین مرحوم تھے جن سے مرزا بہادر کے سب دوستوں کی بہت بے تکلّفی تھی۔ ان بزرگ کو جنون کی حد تک جھوٹ اور جھوٹ بولنے والے سے نفرت تھی اور فحش مذاق بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ایک بار میرے ایک اور عزیز دوست شہنشاہ حسین مرحوم نے جو میری ہی طرح مرزا بہادر کے بے تکلّف دوستوں میں تھے اُن محترم کو مخاطب کر کے ایک ایسا کلمہ مذاق میں کہہ دیا جو ظاہر بہ ظاہر جھوٹ تھا اور فحش بھی تھا۔ حالاں کہ اس فحش کلمہ کی زد خود شہنشاہ مرحوم کے اوپر پڑتی تھی مگر اُن کو برداشت نہ ہو سکا اور وہ اتنے خفا ہوئے کہ باوجود ہم سب کی کوشش اور مرزا بہادر کی سفارش کے انھوں نے تاعمر اُس گناہ کو معاف نہیں کیا۔

مصاحب کے لغوی معنی ہیں ”پاس بیٹھنے والا“۔ اسی لحاظ سے مصاحبین کی ذمہ داریاں متعین تھیں۔ اُن کے ذمّہ کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور نہ اُن کی حاضری کے لیے اوقات معین تھے۔ لیکن ہر رئیس کے یہاں اتنی زیادہ تعداد میں مصاحب ہوتے تھے کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ لوگ موجود رہا کرتے تھے۔ وہ خود بھی یہ سمجھتے تھے کہ اُن میں سے کس کس کو خصوصیت کے ساتھ کس وقت ضرور حاضر رہنا چاہیے۔ ظاہر بہ ظاہر اُن کا یہ فریضہ تھا کہ وہ رئیس کی محفلوں میں خواہ درباروں کی ہوں یا تخلیہ کی، حاضر رہیں اور پوری مزاج شناسی کے ساتھ بر محل گفتگو کریں۔ دستر خوان پر تمام موجودہ مصاحبین کی شرکت اور آدابِ دستر خوان ملحوظ رکھتے ہوئے باہم دگر مکالمت ضروری تھی۔ بعض مخصوص مصاحبین کے ذمّہ یہ خدمات بھی تھیں کہ وہ دربار کا ماحول خوشگوار بنائے رکھیں تاکہ کسی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا نہ ہو، خریداریِ اشیا کے

موقع پر جو صرف کپڑا یا زیورات و جواہرات کی خریداری تک محدود ہوتا تھا رئیس کی معیت میں رہیں اور عند الضرورت مشورہ بھی دیں نیز یہ کہ شام کی ہوا خوری میں اُس کے ساتھ رہا کریں تاکہ تفریح تنہائی کی صعوبت سے محفوظ رہے۔ یہ خدمات صرف انھیں مصاحبین کے ذمّہ ہوتی تھیں جن کو مقربین کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔

وہ زمانہ ارزانی کا تھا، اسی لحاظ سے تمام اخراجات بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ ملازمین کی تنخواہیں اور مشاہرے اتنے کم تھے جو آج کی دنیا کے لیے ناقابلِ یقین ہوں گے۔ چنانچہ پست درجہ کے نوکروں کو مثلاً خاک روب، مہتر، باورچی خانہ اور اصطبل کے ماتحت ملازم، چار آنے سے دو روپیہ ماہوار تک تنخواہیں ملتی تھیں۔ خدمت گاروں، عصا برداروں، پہرہ داروں، اور اسی درجہ کے دوسرے نوکروں کو پانچ روپیہ سے بیس روپیہ تک مشاہرہ ملتا تھا مصاحبین کو پانچ روپیہ سے بیس روپیہ تک، شعرا اور اطبا کو پندرہ یا بیس روپیہ ماہوار وظیفہ عطا ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے مقرّرہ رقوم، تنخواہ یا مشاہرہ نہیں کہلاتے تھے بلکہ وظیفہ تھے جو رئیس مرحمت فرماتا تھا۔ ریاست کے کارپرداز عملہ کی تنخواہیں حسبِ مراتب دس روپیہ سے سو روپیہ تک تھیں۔ خزانچی ہو یا میر منشی جس کو بھی سو روپیہ ماہوار ملتا تھا اُس کے لیے اپنی سواری کے واسطے اپنا یکہ رکھنا ضروری ہوتا تھا۔ تنخواہوں کے علاوہ ملازمین کی بالائی آمدنیاں بھی تھیں۔ ملازمین کے یہاں شادی اور غمی کے ہر موقع پر اُن کی دست گیری ہوتی تھی، تیوہاروں اور تقریبوں میں انعام و اکرام دیے جاتے تھے۔ یوں بھی وقتاً فوقتاً داد و دہش ہوتی رہتی تھی۔ رئیس مخملی جوتے پہنتے تھے جن میں کارچوب ہوتا، چاندی کا بکلس لگا ہوتا اور کبھی کبھی موتی بھی ٹکے ہوتے جس کو جوتے کا ایک پرانا جوڑا مل جاتا وہ اُس کو بہت دنوں تک پہنتا بھی اور قیمتی سامان علیحدہ کر کے روپیہ بھی حاصل کر لیتا تھا۔ اسی طرح کپڑوں سے بھی مراعات ہوتی تھیں۔ سال میں دو بار نئے کپڑے بنانا شانِ ریاست میں داخل تھا۔ گرمی اور سردی کی آمد پر توشک خانہ قریب قریب خالی کر دیا جاتا تھا۔ جو کپڑے بلا استعمال ہوتے وہ اعزا و اقارب کو مرحمت کر دیے جاتے ایسے کپڑوں کو مندرس کہتے تھے، جو چند بار پہنے ہوئے ہوتے وہ اُترن کہلاتے اور ملازمین کو بخش دیے جاتے اور جو زیادہ استعمال شدہ ہوتے وہ پھٹے پرانے موسوم ہو کر پست درجہ کے نوکروں کو عطا کر دیے جاتے تھے۔ اِس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ ہر تین برس میں کوئی ملازم ایسا باقی نہ رہے جو محروم ہو گیا ہو۔ پھر بھی اس بخششِ عام میں سب سے زیادہ خدمت گار مستفیض ہو جایا

کرتے تھے۔ شعرا، اطبا اور مصاحبین کے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا اس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی صرف دینے اور لینے والے باخبر رہا کرتے تھے۔

## (۵) دربار اور بیرونی معاشرت

روسا و عمائدین کی صحیح معنوں میں پبلک زندگی وہی تھی جو اُن کے درباروں سے متعلق تھی۔ اسی اجتماع میں اُن کی ملاقاتیں خواص و عوام، امیر و غریب، عزیز و اقارب، دوستوں اور اجنبی لوگوں سے ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے درباروں کے دن اور اوقات خود معین کرتے تھے اور حتی الامکان پابندیِ اوقات کا خیال ملحوظ رکھتے تھے۔ بعض روسا کے یہاں ایسی بیرونی نشست روزانہ ہوتی تھی، بعض کے یہاں مخصوص دنوں میں ہفتہ میں دو یا تین بار دربار لگتا تھا۔ شیش محل کے نوابین کا دربار ایک ایک دن کے وقفہ سے ہوتا تھا۔ اُن کے یہاں دنوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ شہر بھر میں پرنس ثریا قدر کی تنہا وہ ذات تھی جو ہفتہ میں صرف ایک دن بروز شنبہ دربار فرماتے تھے۔ اُن کی دوسری امتیازی شان یہ تھی کہ اُن کا دربار رات کو لگتا تھا اور رات بھر اجتماع رہتا تھا۔ اس دربار میں نامی گرامی شعرا جن میں مولانا صفی اور ظریف مرحوم کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ بعض علما کرام، متعدد شہزادگان و روسا اور بکثرت صاحبانِ حاجت آیا کرتے تھے۔ پرنس موصوف کا دسترخوان بھی بہت وسیع ہوتا تھا۔ حاضرین شریکِ طعام ہوتے، وہ یہ سمجھ کر آتے ہی تھے کہ شاہی دسترخوان پر شرکت کرنا عین تہذیب ہے۔ اُس زمانہ میں کھانے کے وقت موجود ہونا اور دسترخوان پر بیٹھنے سے انکار کرنا نہ صرف بدتہذیبی بلکہ رئیس کی اہانت سمجھی جاتی تھی۔

دوسرے رئیسوں کے یہاں عموماً صبح کو ۹ بجے کا وقت ہوا کرتا تھا جس کا سلسلہ کم سے کم ایک بجے تک ضرور چلتا تھا۔ اسی وقت دسترخوان بچھ جاتا اور کھانے کے بعد دربار برخاست ہو جاتا تھا۔ دربار کی نشست کے لیے بیرونی حصّہ محل میں سب سے بڑا کمرہ مخصوص رہتا تھا۔ اس کمرہ میں دیواروں پر خوشنما تصویریں اور خطاطی کے اعلا ترین نمونے آویزاں رہتے تھے۔ چھت میں جھاڑ، فانوس، قمقمے وغیرہ لٹکے رہتے تھے اور دیواروں میں دوشاخے اور ڈالے نصب رہتے تھے۔ ان سب میں کافوری شمعوں کی روشنی کا بندوبست رہتا تھا حالاں کہ شاید ہی کبھی روشنی کی ضرورت واقع ہوئی ہو کیوں کہ دربار دن کو ہی ہوا کرتے تھے۔ نشست کے لیے زیادہ تر

روسا کے یہاں زمین کا فرش ہوتا تھا۔ ہال نما کمرہ کے پورے رقبہ میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دریاں بچھی رہتی تھیں لیکن اوپر صرف ایک چاندنی ہوتی تھی جو انتہائی صاف وشفاف رکھی جاتی تھی۔ ذرا بھی کثافت آتی تو چاندنی فوراً بدل دی جاتی تھی۔ داخلہ کے دروازہ کے مقابل آخر میں اور فرش کے وسطی حصہ پر ایک بڑا خوشنما اونی یا ریشمی قالین بچھا رہتا تھا جس پر ایک اوٹ کے سہارے بہت بڑا گاؤ تکیہ لگا رہتا اور قالین پر دونوں جانب تکئیاں لگی رہتی تھیں پہلو میں شفاف زبیز کپڑے سے ڈھکا ہوا اگالدان بھی رکھا رہتا تھا۔ رئیس صدرِ محفل کی حیثیت سے اسی جگہ قالین پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر رونق افروز ہوتا تھا۔ بعض رئیسوں کے یہاں زمین کے بجائے تختوں کے چوکوں پر بالکل اسی طرح فرش کا انتظام ہوتا تھا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں کے یہاں نیچے پایوں کے ۱۶ تختوں پر فرش رہتا تھا۔ یہ تخت بڑے نہیں ہوتے تھے پھر بھی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ نشست کا کمرہ تقریباً پورا بھر جاتا تھا۔ بعض رئیسوں کے یہاں دربار کے کمرہ میں قیمتی مخملی صوفا سیٹ بھی لگے رہتے تھے بالخصوص نواب شفیع علی خاں کے یہاں گھسیاری منڈی اور سلطان علی خاں کے یہاں کشمیری محلہ میں بہت اچھا سامان تھا لیکن شاید ہی کبھی کبھی استعمال میں آیا ہو۔

دربار ہال سے متصل ایک تخت پر خدمت گار اور عصا بردار نیز اُن کا جمعدار بہت پہلے سے حاضر رہتے تھے۔ آنے والوں میں مخصوص ملازمین، مصاحبین، صاحبانِ ضرورت اور بعض متمکین دولت قبل ہی سے آکر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے تھے۔ اعزا واقارب اور مقتدر ہستیاں رئیس کی نشست کے دائیں جانب، شعرا و مصاحبین سامنے کی صف میں، مخصوص ملازمین، صاحبان حاجت اور نئے آنے والے جن کو تعارف کی ضرورت ہوتی تھی بائیں جانب بیٹھتے تھے۔ معززینِ شہر اور ملاقات کرنے والوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ رئیس کی برآمدگی گویا کہ ایک شاہی رسم تھی جو ہر مرتبہ انجام دی جاتی تھی۔ جو دربار ہر روز لگتے تھے اُن کے یہاں بھی اس ادائی رسم کا ہر روز دستور تھا۔ جس طرح بیرونِ محل خدمت گار، عصا بردار اور جمعدار استقبال کے لیے آمادہ رہتے تھے اسی طرح اندرونِ محل کنیزیں، خواص اور محل دار اُن کا جواب ہوتی تھیں۔ رئیس باہر نکلنے کی تیاری کرتا تو خواص کو کنیز آگاہ کرتی اور خواص محل دار کی وساطت سے جمعدار کو مطلع کرتی۔ اُدھر محل دار "خبردار! ہوشیار!" کی آواز بلند کرتی ادھر فی الفور یہی نعرہ لگا کے جمعدار خدمت گاروں اور عصا برداروں کو متنبہ

کر دیتا۔ بلاتاخیر محل دار باہر آتی اور پانوں کی گلوریوں سے بھرا ہوا خاصدان اور رئیس کا کیش بکس قالین کے دائیں جانب رکھ جاتی۔ پھر اندر سے دعاؤں کی آوازیں بلند ہوتیں جن کی تکرار باہر کے ملازمین بھی کرتے۔ انھی دعاؤں کی گونج میں سرکار برآمد ہوا کرتے تھے۔ دربار ہال میں یہ لوگ ہمیشہ پوری طرح ملبوس ہو کر آتے تھے۔ کرتے اور اچکن کے سب بٹن باقاعدہ بند رہنا اور ٹوپی کا سلیقہ سے سر پر رکھا ہونا ضروری تھا۔ اچکن کے دامن بھی بڑی احتیاط سے برابر کر لیے جاتے تھے۔ حاضرین تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے اور ہر ایک اپنے اپنے مخصوص طرز میں آداب و تسلیمات بجا لاتا۔ ملازمین دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مؤدّبانہ تسلیم عرض کرتے رئیس لبِ فرش جوتا اُتار کے آہستہ آہستہ داہنے اور بائیں سب کو سلام کا جواب دیتے ہوئے مسند پر جا کر تشریف فرما ہو جاتے تھے۔ بعد میں آنے والوں میں اگر کسی کا احترام ملحوظ ہوتا تو نصف قد سے کھڑے ہو کر سلام کر لیتے ورنہ جس طرح بیٹھ گئے اُسی طرح اختتامِ دربار تک اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے۔

مسند نشین ہونے کے بعد سب سے پہلے خاصدان کھول کر مخصوص لوگوں کو اپنے ہاتھ سے پان پیش کرتے اور باقی حاضرین کو کسی مقرب مصاحب یا ملازم کے ذریعہ پان کھلایا جاتا۔ اسی دوران کسی سے خصوصیت کے ساتھ تو کسی سے رسمی انداز میں مزاج پرسی ہوتی۔ لیکن ہر اُس شریکِ بزم سے جس سے تعارف ہوتا فرداً فرداً مزاج پرسی ہوتی تھی۔ اِس رسمی کارروائی کے بعد پیشکار مؤدّبانہ صاحبانِ حاجت کی درخواستیں پیش کرتا جس پر کیش بس کے قلمدان سے قلم نکال کر اپنے قلم سے احکام صادر کیے جاتے اور وہ سب درخواستیں احتیاط کے ساتھ پیشکار کو واپس کر دی جاتیں۔ اِن میں سے بعض صاحبانِ حاجت حاضر بھی رہتے تھے لیکن نہ اُن کو اور نہ حاضرین کو کبھی یہ پتہ چلتا کہ کون کون غرض مند ہیں اور کس کس کو کیا ملا۔ کم و بیش ہر ایک کی حاجت روائی ہو جاتی تھی جو دربار کے اختتام کے بعد پیشکار کی وساطت سے اُن لوگوں کو مِل جاتی تھی۔ اس کے بعد میر منشی کچھ کاغذات پیش کرتا جو رئیس کی املاک سے متعلق ہوتے تھے۔ ان پر بھی احکام صادر ہوتے۔ بعض معاملات میں میر منشی کے علاوہ متعلقہ ضلع دار یا کسی دوسرے محصل سے بھی گفتگو کی ضرورت ہوتی تو یہ کام بھی اسی وقت کم و بیش وقفہ میں ہو جاتا تھا۔ اس مقام پر قابلِ لحاظ اور قابلِ ذکر یہ بات ہے کہ اس تمام کارروائی کے دوران رئیس کسی نہ کسی حاضرِ بزم سے کچھ نہ کچھ باتیں ضرور کر لیتا تھا تاکہ مجمع میں

بدمزگی کا احساس نہ ہو۔ مزید براں مصاحبین ایسے مواقع فراہم کرتے رہتے تھے کہ لوگ آپس میں بھی نوک جھونک کرتے رہیں اور گرمیِ محفل میں اضافہ ہوتا رہے۔ ضابطے کی ضروری کارروائیاں ختم ہو جانے کے بعد کچھ لوگ آداب بجالا کے رخصت ہو جاتے تھے ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جو صاحبِ غرض تھے اور کچھ ملازمین ہوتے تھے۔ پیشکار کو یہ کہہ کر خود ہی رخصت کر دیا جاتا تھا کہ آپ کے ذمّہ بہت کام ہیں، اپنا حرج نہ کیجیے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد آہستہ آہستہ عملہ کے سب ہی آدمی ایک ایک کر کے اجازتِ رخصت حاصل کر لیتے تھے۔

عمائدینِ شہر نیز تمام اعزا و اقارب جو ملاقات کے لیے آتے وہ عمداً دربار کا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وقت گزار کے آتے تھے تاکہ نواب کو اپنے نجی معاملات سے فراغت ہو چکی ہو۔ نئے آنے والوں کا جن میں عزیزوں کے عزیز بھی شامل تھے تعارف حاصل کرنے کا انداز بھی شاہی دور کا یادگار طرز تھا۔ مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے کہ جب میں اپنی کتخدائی کے بعد اپنے خسر کے ہمراہ جو میرے چچا بھی تھے شیش محل کے نواب جعفر علی خاں بہادر کی خدمت میں پہلے پہل گیا تھا تو ایک ریشمی رومال میں پانچ اشرفیاں اُن کی خدمت میں نذر کی تھیں۔ انھوں نے اُس پر ہاتھ رکھ کر مجھے گلے لگا لیا تھا۔ ہاتھ رکھنے کے معنی تھے کہ انھوں نے نذر قبول کر لی پھر وہ رومال مع اشرفیوں کے میں نے جیب میں واپس رکھ لیا تھا۔ یہی دستور روسا کے یہاں جن سے عزیز داری ہو پہلی ملاقات حاصل کرنے کا تھا۔ دربار میں ایسی رسمیں بھی روزانہ ادا ہوتی تھیں اور تفریحی مشاغل بھی چلتے رہتے تھے

سنجیدہ باتوں میں شہر کے واقعات کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ آنے والے کوئی نہ کوئی خبر لاتے اور دربار میں اُس پر تبصرہ شروع ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایک ہی دن متعدد واقعات بیان ہو جاتے تو سارا وقت اِسی تذکرہ میں ختم ہو جاتا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے ضرور پیش کرتا۔ رئیس ہر ایک کی باتیں پوری توجّہ سے سنتا تھا لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ خود زیادہ بات کرے اظہارِ خیال کرتا بھی ہوتا تو دو چار جملوں سے زیادہ ارشاد نہیں ہوتا تھا۔ اس کم گوئی کی وجہ عدمِ صلاحیت نہیں تھی بلکہ ان رئیسوں کو بہت کم بولنے کی بچپن ہی سے تعلیم مل جاتی تھی اور وہ عمر بھر اُسی پر کاربند رہتے تھے۔ اُن کی ذہانت کا پتہ اُس وقت چلتا تھا جب وہ خود کسی بحث کو چھیڑ دیتے یا کسی مخصوص ایجاد کا ذکر آ جاتا۔ اُس وقت اُن کا خاموش رہنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ۔شعر و ادب کا کوئی مسئلہ ہو، فنونِ لطیفہ سے متعلق کوئی معاملہ ہو، بخت و پز کے بارے میں کوئی

نئی بات کہی جائے، کسی مرغوب تفریحی مشغلہ کی بات آجائے اُس وقت ان رئیسوں کے جوہر چمکنے لگتے تھے۔ میں نے یہ بات متعدد بار کہی ہے اور اس مقام پر پھر اُسی خیال کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہمارے اسلاف کو غدر کے دوران کچھ ایسے مشاہدات و تجربات ہوئے تھے جن کی وجہ سے خوف و ہراس اُن کی ذہنیت پر نسلاً بعد نسلٍ طاری رہا تھا اور وہ ہر اُس معاملہ یا مسئلہ میں لب کشائی نہیں کرتے تھے جس کا کوئی دور کا تعلق بھی سیاسیات یا شہر کے نظم و نسق سے ہو سکتا ہو۔ چنانچہ ان درباروں میں زیادہ تر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی یا شعر و ادب کی گرم بازاری رہتی تھی۔ لیکن یہ امر یقینی تھا کہ شہر کے تمام حالات و معاملات سے رئیس باخبر ہو جاتا تھا اور اُس کے خیالات یا خواہش کی رسائی عوام تک انھیں آنے والوں کے ذریعہ سے ہو جاتی تھی۔ یہ عمائدین شہر میں بڑے احترام کے مالک تھے اور ان کی مرضی اور مشورہ بالواسطہ حاصل ہونے کے باوصف عام طور سے واجب التعمیل سمجھا جاتا تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ معزز گھرانوں کے باہمی مناقشات فیصلہ کے لیے انھی روسا کے حوالے ہوتے تھے۔ فریقین دربار میں حاضر ہوتے، اپنا اپنا معاملہ بیان کرتے، دستاویزی ثبوت بھی پیش کرتے اور اگر کسی گواہی کی ضرورت ہوتی تو آئندہ دربار کے دن وہ کارروائی بھی ہوتی۔ بالآخر رئیس فیصلہ کر دیتا جس پر فریقین سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ اُس زمانہ میں شرفا عدالتوں کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور انھی زبانی ثالثوں کو قبول و منظور کرتے تھے۔ صداقت پرستاری کے دور میں جو کچھ کسی کی زبان سے نکل جاتا وہ اسی پر پابند رہتا تھا۔ اپنے قول سے انحراف کرنا انتہائی غیر شریفانہ حرکت تھی۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں سے قرض لینا عام دستور ہو گیا تھا اس لیے کہ آمدنی سے خرچ بڑھ رہے تھے، تباہی آنا شروع ہو چکی تھی لیکن ان لین دین کے معاملات میں بھی جو زبان سے کہہ دیا جاتا اُسی کے لوگ پابند رہتے تھے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل تک پرنوٹوں اور دستاویزوں تک پر شرفا اور روسا علامت نشانی بنا دیتے تھے جو صرف ایک لکیر کی شکل میں ہوتی تھی۔ بڑی بڑی دستاویزوں پر لکیر کے علاوہ مُہر لگا دی جاتی تھی اور ان دستاویزوں کے کاتب عدالتوں میں بھی اُس سے انکار یا اُس معاملات کے بارے میں کوئی جواب دہی نفی میں نہیں کرتے تھے۔

درباروں میں اپنے اپنے نجی معاملات پر احکام صادر کرنے اور داد و دہش کے سلسلہ میں عمّال کو ہدایتیں صادر کرنے کے بعد جو گفتگو عام طور سے شروع ہوتی اُس کا انداز یہ تھا کہ

رئیس کے مزاج شناس دوستوں یا مصاحبوں میں سے وقت اور حالات کا جائزہ لے کر کسی معاملے یا کسی موضوع پر کوئی شخص کوئی کلمہ بہت جامع و مانع کہتا اور اسی سلسلہ میں بات سے بات نکلتی اور تبادلۂ خیالات کا میدان گرم ہو جاتا تھا۔ اس گفتگو میں اگر ضلع جگت کا طرز آجاتا تو ہر شخص اپنا کمال دکھانے میں دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ پُرانے زمانے میں انھیں مذاکروں نے اُردو زبان کو جِلا دی تھی اور الفاظ نیز اُن کے محل استعمال سے لوگوں کو شناسا کیا تھا۔ دوسرا فائدہ اور فیض ان درباروں سے یہ تھا کہ لباس و طعام کے سلسلہ میں نئی نئی باتیں نکالی اور رائج کی جاتی تھیں۔ یہ اختراعات ابتداءً اپنے اپنے رئیس اور اُس کے حوالیوں تک محدود اور منسوب رہتے تھے لیکن کچھ ہی مدت کے بعد عام ملکیت ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر لیجیے کہ کوئی مخصوص طرزِ لباس یا غذا کسی ایک رئیس کے دربار میں ایجاد ہوئی تو وہ ایک مدت تک اُسی کے نام سے مشہور رہتی لیکن بعد میں عوام اُس کو اپنا لیتے تھے۔ ہر رئیس کے دربار سے کچھ نہ کچھ نئی چیز عوام کو ملتی رہتی تھی۔ زبان و بیان کی خوبیوں میں نئی نئی راہیں نکالنے اور اشیائے خوردنی و پوشیدنی میں طرح طرح کی نئی طرزیں پیدا کرنے کے علاوہ ان درباروں میں اپنے رئیس کے مخصوص تفریحی مشاغل پر بھی دل کھول کر مباحثے ہوتے تھے اور رئیس کو خوش کرنے کے لیے ہر موجودہ شخص کچھ نہ کچھ نئی بات کہتا تھا۔ اطمینان اور فارغ البالی کے دور میں تفریحی مشاغل کی کمی نہیں تھی۔ بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی وغیرہ وغیرہ ایسے بے شمار مشاغل رائج تھے۔ ہر رئیس کو ان میں سے کسی ایک یا دو سے لگاؤ ہوتا تھا۔ اُس کے دربار میں اُسی مخصوص شغل پر تذکرے ہوتے، دوسرا ذکر ضمناً آجاتے تھے۔ اِن مباحثوں کی بدولت اُن تفریحی مشاغل میں بھی کچھ نہ کچھ جدتیں آئے دن نکلا کرتی تھیں لیکن یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ قریب قریب ہر رئیس کسی نہ کسی طوائف کو ملازم رکھے ہوئے تھا لیکن پھر بھی درباروں میں طوائفوں کا ضمناً بھی ذکر نہیں آنے پاتا تھا۔ گل و نغمہ پر دل کھول کر اور آئے دن تبصرے ہوتے لیکن جنسی وارداتوں یا صنفِ نازک میں کسی فرد کے نام تک نہیں آنے پاتے تھے۔ کہنا پڑتا ہے کہ وہ لوگ صنفِ نازک کی شدت کے ساتھ پردہ پوشی کرتے تھے، پردہ دری کے قائل نہیں تھے۔

درباروں میں سب سے زیادہ وقت غزل سرائیوں میں صرف ہوتا تھا۔ ماہِ محرّم اور ماہ صفر کی بیسویں تاریخ تک نیز ماہِ رمضان کے ایامِ عزا میں غزل سرائی سے اجتناب کیا جاتا

تھا اور غزل کے بجائے سلام پڑھے جاتے تھے۔ عشرہ محرم، چہلم اور ماہِ رمضان کی مخصوص غم کی تاریخوں میں دربار بھی نہیں لگتے تھے۔ اس کے علاوہ قریب قریب ہر روز شعر و سخن کا کچھ نہ کچھ چرچا ضرور رہتا تھا۔ ہر رئیس اپنے کو شاعر کہتا اور سمجھتا تھا۔ اُس کی خوشنودی کے لیے حاضرینِ بزم بھی اپنی اپنی طبیعت کی موزونی کا ثبوت فراہم کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی اگر روزانہ بکثرت اشعار نظم کرے تو کبھی کبھی ایک یا دو اشعار اچھے نکل آنا حیرت خیز نہیں ہوگا۔ یہی حال رئیسوں اور اُن کے درباریوں کا تھا۔ جو شعرا وابستہ دامانِ دولت ہوتے انھی کے کلام میں مزا ہوتا تھا ورنہ صرف لفاظی اور موزونی کے مظاہرے ہوا کرتے تھے۔ پھر بھی ان روزانہ مشاعروں کا لکھنؤ کی زبان دانی اور اُردو کو فروغ دینے میں بڑا اہم حصّہ تھا کیوں کہ خواص و عوام کی زبان کو انھیں نشستوں میں جلا ہوتی تھی۔ خواص سے عوام فیض حاصل کرتے تھے اور عوام کی خوش گفتاری کا اثر فطرتاً پست طبقہ کے لوگوں پر بھی پڑتا تھا۔

دربار میں ہر شخص کا آخر وقت تک قیام کرنا ضروری نہیں تھا بس طرح آنے والے دوپہر تک برابر آیا کرتے تھے اُسی طرح جانے والے اجازت رخصت لے کر چلے بھی جاتے تھے۔ ایک بجے کے قریب متعلقہ خدمت گار مؤدبانہ دریافت کرتا کہ دسترخوان بچھایا جائے اشارے سے اجازت دی جاتی اور وہ کھانے کے کمرہ میں مصروفِ انتظام ہو جاتا۔ یہ کمرہ بالعموم ہر رئیس کے یہاں نشست گاہ سے متصل ہی ہوتا تھا دو تین رئیس ایسے بھی تھے جن کے یہاں نشست گاہ ہی میں دسترخوان بچھا دیا جاتا تھا ورنہ سب ہی دربار برخاست کر کے دوسرے کمرے میں چلے جاتے تھے۔

اِسی مقام پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ درباروں کی یہ رسم صرف ان رئیسوں کے یہاں جاری تھی جن کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے فرمانروایانِ اودھ سے تھا۔ یہ لوگ یا شاہی خاندان کے یا وزرا کے گھرانوں کے اخلاف میں تھے۔ دوسرے صاحبانِ ثروت کے یہاں جن میں بڑے بڑے وثیقہ دار بھی تھے اور غیر مُسلم بھی تھے صرف شانِ ریاست کا مظاہرہ ہوتا تھا لیکن شاہی آن بان، رکھ رکھاؤ اور اولوالعزمی کے طور طریقے بہت کم تھے۔ بالکل آخر دور میں اودھ کے تعلق داروں نے ہمارے پرانے عمائدین کے آثار برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کے یہاں بھی مصاحبین تھے اور دربار کے طرز کی نشستیں ہوتی تھیں لیکن خالص مشرقی رنگ نہیں تھا، کچھ نہ کچھ مغربیت چھا چکی تھی۔ ان تعلق داروں میں مہاراجہ سر محمد علی خاں

والی محمود آباد، راجہ صاحب جہاں گیر آباد، راجہ صاحب سلیم پور اور چودھری شفیق الزماں کی ہستیاں بڑی حد تک مشرقی تہذیب کی دلدادہ تھیں۔ ان لوگوں کی خدمت میں بیٹھ کر پرانے طور طریقوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ان مخصوص ہستیوں کے بعد وہ بات بھی ختم ہو گئی تھی۔

## (۶) رئیسوں کے دستر خوان

دورِ جدید کے اطوار میں پانچ مرتبہ لوگ خوراک کے عادی ہیں۔ علی الصباح چائے کی پیالی ضروری ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ کم سے کم دو ایک بسکٹ ہونا ضروری ہوتا ہے، پھر ناشتہ کی باری آتی ہے جس میں ہلکی مقوی غذائیں استعمال ہوتی ہیں۔ دوپہر کو لنچ یعنی دن کا کھانا، شام کو پھر چائے ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس وقت بھی کچھ کھا لیتے ہیں اور رات کو بھاری غذائیں کھائی جاتی ہیں۔ پرانے لکھنؤ میں چائے کا رواج نہیں تھا، ناشتہ امیر و غریب سب کرتے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ متوسط طبقہ اور غریب بازار سے اشیا حاصل کر کے کھا لیتے تھے لیکن اُمرا و عمائدین اچھی طرح دن نکلنے کے بعد اپنے گھر کی تیار کردہ مقوی اور لذیذ غذائیں نوش کرتے تھے اور پھر دن اور رات کو کھانا ہوتا تھا۔ شام کو چائے یا کوئی چیز بھی کھانے یا پینے کا دستور نہیں تھا۔ موسمِ گرما میں سہ پہر کو کبھی کبھی کوئی شربت یا بالائی کی برف کی قفلیاں یا آبخورے خرید کر کھائے جاتے تھے۔ یہ برف والے رئیسوں کے دروازوں پر دوپہر کے بعد سے آوازیں لگاتے اور "بالائی کی برف" فروخت کر جاتے تھے۔ میرے عہدِ طفلی میں لکھنؤ کا بہترین قفلی والا غالباً ڈھورے کے نام سے موسوم تھا۔ وہ قفلیاں اور آبخورے دونوں فروخت کرتا تھا۔ بڑی بڑی قفلیاں ہوتی تھیں جن کو دونوں ہاتھوں سے ہلا ہلا کر اور گھما گھما کر وہ برف نکال کے پیش کرتا تھا۔ برف نکالنا بھی ایک ہنر تھا۔ یہ برف مٹی کی سوندھی سوندھی رکابیوں میں خریداروں کو پیش کی جاتی تھی اور مٹی کے کورے کورے چمچوں سے کھائی جاتی تھی۔ نزاکت کا یہ عالم تھا کہ صرف ہونٹوں اور تالو سے برف کھائی جاتی تھی۔ اسی طرح آبخورے بھی کاغذی، نازک اور بہت لطیف ہوتے تھے۔ اُن کی خوشبو سے برف کا ذائقہ دوبالا ہو جاتا تھا۔ برف دودھ اور میووں سے تیار ہوتی تھی لیکن چوں کہ دودھ کو اچھی طرح پکا کے بنتی تھی اس لیے بالائی کی برف کہتے تھے۔

بعض ہندو برف فروش بھی بہت اچھی برف تیار کرتے تھے۔ اُن کے یہاں بادام

اور پستہ کی اچھی خاصی مقدار میں ہوائیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ یہ لوگ "برف ملائی" کہہ کر آواز لگاتے تھے۔ حقیقتِ امر بھی یہی ہے کہ وہ چیز جس کو ہم بالائی کہتے ہیں۔ ابتداءً ملائی کہلاتی تھی۔ نصیر الدین حیدر بادشاہِ اودھ نے جن کی نفاست پسندی ضرب المثل تھی "ملائی" کا نام بالائی میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے بعد اسی لفظ نے شہرت قبول حاصل کر لی۔ البتہ عوام الناس میں بہت سے لوگوں نے عادتاً ملائی کو ملائی ہی برقرار رکھا اور یہی صورتِ حال اب تک چلی آتی ہے۔ مختصر یہ کہ ملائی ہو یا بالائی دونوں ناموں سے منسوب کر کے برف فروخت ہوتی ہے لیکن پہلا سا نہ رائحہ ہے اور نہ ذائقہ۔ برف کا کیا ذکر وہ قفلیاں اور آبخورے بھی ختم ہو گئے اور مٹی کی سوندھی رکابیاں اور کورے چمچے بھی کہیں نہیں دکھائی دیتے۔ اب دونوں وقت کے کھانوں کا حال سنیئے۔

غذاؤں کے اوقات کیا تھے اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ "غریبوں کو جب مل جائے اور امیروں کا جب دسترخوان بچھے"۔ اس فقرہ کے یہ معنی سمجھنا چاہیے کہ دورِ حاضر کی طرح پرانے زمانہ میں سختی کے ساتھ کوئی وقت معین نہیں تھا۔ غریبوں کو اپنے کام کاج سے جب فرصت مل جاتی تو گھر کی پکی ہوئی یا بازار سے غذائیں خرید کر لاتے اور اہل و عیال کے ساتھ کھا لیتے، بازار میں بہتر سے بہتر اشیا ارزانی کے ساتھ مل جاتی تھیں۔ امیروں کے یہاں بھی کوئی وقت مقررہ نہ تھا۔ ملازم بار بار دسترخوان بچھانے کی اجازت مانگتے لیکن یہ اجازت دربار کے دنوں کے علاوہ کبھی بھی آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ روساء گفتگو میں مشغول ہوتے یا کسی اور امر کی طرف متوجہ ہوتے کسی عالم میں بھی اُن کو خود دسترخوان طلب کرنے کی فکر نہیں رہتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دن میں بارہ بجے سے تین اور کبھی چار بجے تک اور رات میں نو بجے سے دوپہر رات کو دو بجے تک کسی وقت دسترخوان بچھتا تھا۔ تعین اوقات سے اتنی بے نیازی کے باوجود غذاؤں کے خوش رنگ، خوش ذائقہ، خوش رائحہ اور خوش سلیقگی سے پیش ہونے پر ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ اُن کے اسی ذوق و شوق کا اثر شہر کے تمام باورچیوں اور دوکانداروں پر بھی پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ فارغ البالی کا زمانہ، ارزانی کا دور، باشندوں میں نفاست و نزاکت اور تنوع و رنگینی کا ذوق، زندگی کے ہر شعبہ میں ایجادات و اختراعات کا شوق، غذائیں خصوصیت کے ساتھ توجہ کا مرکز تھیں۔ رئیسوں کی قدردانی نے بہترین باورچی پیدا کیے اور ان کے متوسلین و مصاحبین کی وساطت سے لوگوں کے مزاج و مذاق میں اچھے کھانوں کا

رجحان تیز ہوا۔ اِن حالات کا مجموعی فیض یہ تھا کہ کھانا پکانا، کھانوں میں لذّت و رنگ اور خوشبو کا امتزاج پیدا کرنا، یہاں تک کہ کھانا کھانا، سب کچھ فن کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ چوک بازار میں بیسویں صدی کی ابتدا تک عبداللہ کی دوکان کی پوری کچوریاں، سعادت کی شیرمالیں اور گاؤزبانیں، احمد کی باقرخانیاں، شبراتی کے اٹھارہ پرتوں والے پراٹھے، شاہد کا بٹیر پلاؤ، جمن کا مرغ مسلّم، ٹنڈے کے کباب، حیدر حسن خاں کے پھاٹک سے متصل گلی والا انناس کا فرعفرہ، کپتان کے کنویں والی برفیاں اور بہت سی ایسی ہی دوسری تیار شدہ غذائیں بے حد مرغوب اور مقبول تھیں۔ ارزانی کے باعث غریبوں کے دست رس میں تھیں اور انھیں کی فرمائش کر کے رئیسوں کے دسترخوانوں کے لیے بھی وقتاً فوقتاً پکوایا جاتا تھا۔

اچھا اور لذیذ کھانا کھانے کے ذوق کی وجہ سے گھروں کے اندر مستورات بھی پکانے کے فن میں ماہر تھیں۔ شرفا اور عوام کے گھروں میں معمولی اور سادہ کھانا بھی بہت خوش ذائقہ ہوتا تھا۔ بعض خاندانوں میں گھر کا پکا ہوا پلاؤ اور قورمہ بھی بہتر سے بہتر باورچی کی فن کاری سے ٹکر لیتا تھا۔ یہ فن رئیسوں کے محلوں میں بھی رائج تھا۔ امرا کی محلسراؤں میں زنانے اور مردانے باورچی خانے علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے لیکن پھر بھی کسی نہ کسی مخصوص چیز کا پکانا یا پوری طرح نگرانی کرنا بیگم صاحبہ کے ذمہ رہا کرتا تھا اور اس کھانے کا ایک پیالہ یا پلیٹ رئیس کے مردانے دسترخوان پر آنا لازمی تھا۔ رئیس کے دسترخوان پر اتنی تعداد میں کھانے چُنے جاتے تھے کہ بعض کے چکھنے کی بھی نوبت نہیں آتی تھی۔ دسترخوان پر شریک ہونے والوں میں ہر شخص کے آگے ہر کھانا جو حقیقتاً کھانے کے لیے ہوتا تھا اور محض شانِ ریاست میں زینتِ دسترخوان کے لیے چُنا نہیں جاتا تھا علیحدہ علیحدہ برتنوں میں لگایا جاتا تھا، البتہ پلاؤ اور میٹھے پلاؤ کی بڑی بڑی قابیں اور مخصوص شیریں غذاؤں کی بڑی بڑی پلیٹیں دسترخوان پر حاضر کی جاتی تھیں۔ اسی طرح بعض بڑے قد یا وزن کی غذائیں کسی ایک بڑے ظرف میں رئیس کے حضور پیش ہوتی تھیں۔ ان اشیا میں سے دیگر شرکا اپنا اپنا حصہ بقدر جثہ حاصل کر لیتے تھے۔ ایسی بڑے وزن کی اشیا میں مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں کے دسترخوان کی "بڑی روٹی" مشہور تھی جو دو من کے وزن میں میدہ اور قند کی آمیزش سے بیس یا تیس سیر گھی میں مشت مال کر کے تنور میں پکائی جاتی تھی۔ جسامت میں بہت بڑی اور غیر معمولی طور پر خستہ اور لذیذ ہوتی تھی۔ قورمہ، قیمہ اور

کباب کے علاوہ زیادہ تر دوسرے سالن اور ترکاریاں ایک ایک قاب، پلیٹ یا پیالے میں رئیس کے سامنے دستر خوان پر لگا دی جاتی تھیں، جس کا جی چاہتا اُن میں حصّہ حاصل کر لیتا تھا۔

غذاؤں کو اپنے بنیادی اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے چار بڑے بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی روٹی، سالن، دال اور چاول۔ انھی میں شکر کے انضمام سے میٹھا کھانا پانچویں قسم قرار دی جا سکتی ہے۔ انھی پانچ طبقوں میں غذاؤں کا جائزہ لیا جائے تو اُن کی تعداد بیش کرنا محال ہوگا۔ روٹی ہی کو لے لیجیے۔ ہر رئیس کے دستر خوان پر کم سے کم دو چپاتیاں ہر شخص کے آگے لگا دی جاتی تھیں جو غالباً کبھی کسی نے کھائی نہ ہوں گی۔ انھی چپاتیوں پر اسی ذیل کی دوسری چیزیں مثلاً شیر مال یا باقرخانی یا پوریاں یا پراٹھے، کوئی نہ کوئی غذا ہوتی تھی۔ ان اشیا میں بھی نفاست نے اور بھی اقسام فراہم کر دی تھیں۔ شیر مال کے بجائے گاؤ زبانیں اور باقرخانی کا بدل تافتانین ہو جاتی تھیں۔ پوریوں میں سادہ پوری کے بجائے کبھی لوچینی، کبھی بھری ہوئی سبز چنے کی اور کبھی بادام اور پستے کی تہ دی ہوئی پوریاں استعمال ہوتی تھیں۔ پراٹھوں میں دو اقسام بہت مستعمل تھے۔ لب جوڑ پراٹھے اور ورقی پراٹھے۔ انھی دونوں قسم کے پراٹھوں کے درمیان کوئی چیز اور شامل کر دی جاتی تھی تو اُن کا نام برسی پراٹھے ہو جاتا تھا۔ برسی پراٹھے اب بھی رائج ہیں لیکن پستہ اور دہی کے پراٹھے جو رئیسوں کے دستر خوان کی آبرو ہوتے تھے، اب یہ دونوں اقسام معدوم ہیں۔ اسی طرح ورقی پراٹھے بھی تیار کرنا غالباً اب کوئی نہیں جانتا۔ یہ پراٹھے اٹھارہ ورق کے تیار ہوتے تھے اور نہ صرف دبیز بلکہ بہت لذیذ ہوتے تھے۔ پوریاں اور پراٹھے میٹھے بھی پکتے تھے جو آخر میں میٹھی غذاؤں کی طرح استعمال ہوتے تھے۔ میٹھی پوریوں میں شکر قند اور بالائی کی پوریاں بہت مقبول تھیں۔ شکر قند کی پوریاں اب بھی رائج ہیں لیکن بالائی کی پوریاں پکانے والے اُٹھ گئے۔ شیر مال و باقرخانی اور پوری و پراٹھوں کے علاوہ روغنی روٹی اور بیسن کی روغنی روٹی بھی پسندیدہ روٹیاں تھیں۔ یہ نام اب بھی مشہور ہیں لیکن یہ روٹیاں اب اتنی لذیذ نہیں ہیں جتنی پہلے تھیں کیوں کہ ضروری اشیا میں مسکا گھی نایاب ہے اور وہ ہاتھ بھی نہ رہے جن کو پکانے کا سلیقہ تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ رئیس کی اصل غذا قورمہ اور چپاتی ہوتی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اب عنقا ہیں۔ چپاتی کا نام رومالی چپاتی تھا جس کی تعریف یہ تھی کہ بہت باریک اور

بڑی ہو، سرخ چتّیاں ہوں لیکن مائل بہ سیاہی نہ ہوں۔ راقم کے خاندان کا آخری باورچی مسمی محمد حسین ۱۹۳۴ء میں فوت ہوا اور اُس کے بعد پھر چپاتی کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ وہ پاؤ بھر آٹے میں پندرہ کے حساب سے چپاتیاں پکاتا تھا اور ہر چپاتی ایک منجھلی سینی کے برابر ہوتی تھی۔ اتنی تعداد میں اتنی بڑی روٹیاں پکا دینا ایک فن تھا جو مِٹ گیا۔ اسی چپاتی کی ایک قسم "فطیری" کے نام سے موسوم تھی جس کا پکانا کسی قدر محنت طلب تھا لیکن اُس کا استعمال مریضوں کے لیے بہت کارآمد سمجھا جاتا تھا غالباً اس وجہ سے کہ زودِ ہضم ہوتی تھی۔ شاذونادر دسترخوان پر آتی تھی لیکن زنان خانوں میں آئے دن پکا کرتی تھی۔

سالن کا جو چلن آج ہے وہ ہمارے اسلاف کے زمانہ میں نہیں تھا اور نہ وہ موجودہ طرز کے سالن کو پسند کر سکتے تھے۔ فی زمانہ گوشت میں بہت سی ترکاری شامل کر کے سالن پکایا جاتا ہے۔ اُس زمانہ میں ایسی شمولیت کا کوئی عام رجحان نہیں تھا۔ سالن ضرور پکتے تھے لیکن اُن میں ترکاریاں نہیں شامل ہوتی تھیں البتہ تال مکھانا، پستہ اور بادام شامل ہوتے تھے اور اُن غذاؤں کو تال مکھانے کا سالن، پستہ کا سالن اور بادام کا قورمہ سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان غذاؤں کا پکانا دقّت طلب اور فن کارانہ صلاحیت پر محمول تھا۔ ترکاریاں صرف سادہ پکائی جاتی تھیں اور ہر روز پکتی تھیں۔ راقم کے نانا صاحب مرحوم نواب حکیم شفاء الدولہ کے دسترخوان پر فصل کی تمام ترکاریاں دونوں وقت پکا کے پیش کی جاتی تھیں۔ اسی ایک طرزِ عمل سے باورچی کے فنی کمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہی ترکاری میں ہر روز اور دونوں وقت کس کس طرح رنگ اور ذائقہ میں تبدیلی پیدا کرا دیتا تھا۔ پھر بھی تین ترکاریاں ایسی تھیں جن کو گوشت کے ہمراہ پسند کیا جاتا تھا۔ مٹر کی پھلیاں اور سیم کے بیج کبھی کبھی قیمہ کے ہمراہ موسمِ سرما میں پکتے تھے۔ اُس وقت تک ولایتی پھلیاں معرضِ وجود میں نہیں آئی تھیں۔ اس لیے ہری اور تازہ مٹر فصل میں چند ہی روز دستیاب ہوتی تھی۔ گوشت کے ہمراہ بہت زیادہ مرغوب ترکاری شلغم تھی۔ اس غذا کو پہلے اور اب بھی شب دیگ کہتے ہیں۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کہ یہ غذا رات بھر پکتی اور صبح کو ناشتہ میں تافتان کے ساتھ کھائی جاتی تھی۔ خواص و عوام سب کو پسند تھی۔ جاڑے کے موسم میں قریب قریب ہر گھر میں دو ایک بار پکتی تھی جن کو مقدرت نہ ہوتی اُن کی تواضع ہمسایہ والے کر دیتے تھے۔ روسا و امرا کے یہاں موسمِ سرما میں کئی بار شب دیگ پکوائی جاتی اور عزیزوں نیز دوستوں کی ضیافت ہوتی تھی۔ روسا کے

یہاں سادے گوشت کے بجائے تیتر، بٹیر، ہریل، مرغ اور دیگر پرندوں کا ملا جلا ہوا گوشت استعمال ہوتا تھا۔ بادام کی گری، بالائی اور زعفران کی شمولیت اس غذا کو بے حد لذیذ اور بہت معطّر بنا دیتی تھی۔ یہ غذا لذیذ، لطیف، زود ہضم، مصلحِ معدہ و جگر، مولدِ خونِ صالح اور مقوی اعضائے رئیسہ سمجھی جاتی تھی۔

خالص گوشت کے کھانوں میں ہر رئیس کے دسترخوان پر دونوں وقت کسی نہ کسی طرح کا قیمہ، کوئی نہ کوئی کباب اور قورمہ ہونا لازمی تھا۔ قیمہ کھڑے مسالے (ہمارے اسلاف اس لفظ کو مصالحہ بولتے اور لکھتے تھے۔ راقم اس لفظ کو غلط العام تسلیم کرتے ہوئے صحیح سمجھتا ہے) یا ہلدی دار مسالے میں پکتا تھا، یا سیم یا مٹر کے ساتھ یا سویا میتھی یا پالک کے ساگ میں اور بہت کم بتھوا وغیرہ کے ساگ میں پکایا جاتا تھا۔ موسم کے لحاظ سے کچے گدر سیب اور کچے انگور میں بھی قیمہ پکتا تھا اور بہت پسند کیا جاتا تھا۔ کبابوں کے اقسام بے شمار تھے مثلاً کبابِ گل جو شکل و شباہت میں گلاب کے پھول کی طرح ہوتا تھا۔ کبابِ ہندی جن کے قایم مقام آج پتیلی کے کباب ہیں۔ کباب قندھاری جو بہت لطیف و نازک ہوتے تھے۔ کبابِ سنگ۔ جو بہت سخت ہوتے تھے۔ کباب ورقی جو تہ بہ تہ بنائے جاتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام اقسام اب معدوم ہیں، البتہ کچھ ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی بدلی ہوئی صورت میں اور گم کردہ رائحہ و ذائقہ ہو کر اب بھی موجود ہیں مثلاً شامی کباب کچے قیمہ کے اور اُبلے ہوئے قیمہ کے۔ سیخ کباب قیمہ کے، پسندے کے اور گولوں کی شکل۔ پتیلی کے کباب معمولی، خاصگی اور میوہ دار۔ کباب نرگسی جن میں اُبلا ہوا انڈا اس طرح بھرا جاتا ہے کہ سپیدی کا ایک حصہ آنکھ کی شکل میں نمودار رہے۔ کباب بیضاوی یہ کباب انڈے میں سے سپیدی زردی خارج کر کے مسالوں کے ہمراہ پھر چھلکوں میں بھر کر اُبال کے گوشت کے گاڑھے قلیے کا بگھار دے کر سیخ پر پکائے جاتے ہیں۔ چوں کہ ان کے پکانے میں بے حد زحمت ہوتی ہے اور کافی وقت صرف ہوتا ہے اس لیے یہ بھی اب معدوم ہیں۔ جو کباب فی زمانہ رائج ہیں وہ بھی اپنا اصل ذائقہ نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ اُن کے پکانے کا فن لوگ بھلا چکے ہیں اور اُن کے لیے جو مال مسالہ درکار ہوتا ہے وہ اصلی اور نفیس نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کباب کے بجائے ہم کباب کھا لینے کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ ان تمام اقسام کے علاوہ قریب قریب ہر بڑے رئیس کے یہاں کوئی نہ کوئی مخصوص طرز کے کباب اُسی گھر کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے چنانچہ میرے نانا حکیم شفاء الدولہ بہادر کے دسترخوان پر کوفتہ مولائے عجمی بڑی وقعت کے مالک تھے۔

اور ہر دوسرے تیسرے روز پکا کرتے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت تھی کہ ایک پتیلی میں صرف ایک کباب خواہ کتنے ہی وزن کا ہو، پکتا تھا۔ اس کے لیے قیمہ کے ہم وزن گوشت درکار ہوتا تھا جس کے قورمہ کے لعاب میں یہ کباب بھاپ میں پکا کر دم کیا جاتا تھا اس کے پکانے میں محنت کے علاوہ کئی گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ بہت لذیذ، مقوی، نرم و سبک اور زود ہضم کباب ہوتا تھا۔ خاندانی حالات پر زوال آیا تو ہمارے گھر والوں نے پکانے کی ترکیب میں رد و بدل کر کے دم پخت طریقہ پر اس کا پکانا اختیار کر لیا ہے۔

قورمہ وہ عدیم المثال غذا تھی جو اب یک لخت معدوم ہے اور جو غذا اس نام سے مشہور ہے اور ہر دعوت و تقریب میں پیش ہوتی ہے اُس کو اصل قورمہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ راقم نے تخمیناً پینتالیس برس سے نہ کہیں قورمہ دیکھا اور نہ کھایا ہے۔ رئیسوں کی اصل غذا یہی تھی اور اس کی تعریف میں کہا جاتا تھا کہ قورمہ وہ ہے جس کو ہر روز دونوں وقت کھائیے لیکن نہ جی سیر ہو اور نہ نیت بھرے۔ اس غذا کے معدوم ہو جانے کی وجہ اس کے اجزائے ترکیبی کا فقدان اور ہنرمند پکانے والوں کا ختم ہو جانا ہے۔ اصل قورمہ پکانے کے لیے بہترین گوشت، اعلیٰ درجہ کا مسکہ گھی، محنت سے کٹا اور چھنا ہوا مسالہ، میٹھے بادام کی گری، دہی اور بالائی، زعفران اور کیوڑہ درکار ہوتے تھے۔ یہ اجزا ہماری اکثریت کے مقدور سے باہر ہیں۔ اس کے علاوہ ہنرمند باورچی بڑی محنت سے اور تھوڑی مقدار میں قورمہ پکاتے تھے۔ عموماً ایک پلیٹ دسترخوان پر لگا دی جاتی تھی۔ اسی میں سے دوسرے حاضرین کو بھی رئیس کی مرضی کے مطابق حصہ مل جاتا تھا۔ اُس زمانہ کی تہذیب کے بموجب یہ حصہ ہر ایک کو بدیر و زود مل جاتا تھا۔

قورمہ، کسی نہ کسی قسم کا قیمہ اور کوئی نہ کوئی کباب دونوں وقت دسترخوان کا ضروری جزو ہوتا تھے۔ لیکن ہر رئیس کے بقدر استطاعت دو دو، تین تین اور بعض کے یہاں چار چار اور پانچ پانچ مخصوص کھانے بھی شامل رہتے تھے۔ ان مخصوص کھانوں میں بھیجا، کلیجی، کھیری گردے، گلے پائے، پسندے وغیرہ ہوتے تھے۔ مرغ یا دیگر پرندوں مثلاً تیتر، ہریل، بٹیر وغیرہ کا قورمہ یا کباب ہوتے تھے۔ مرغ مسلّم کا شمار کبابوں کے زمرہ میں تھا۔ انڈوں کو قورمہ، قیمہ یا بھیجا کی طرح پکایا جاتا تھا۔ ہر ترکیب سے یہ غذا بہت لذیذ ہوتی تھی۔ موسم سرما میں مچھلی بھی بہت شوق سے پکوائی جاتی تھی۔ اُس زمانہ میں تلی ہوئی مچھلی کا رواج نہیں تھا۔ البتہ مچھلی کا قورمہ، قیمہ، سالن اور کباب پکتے تھے۔ قورمہ میں ہلدی دار مسالہ نہیں ہوتا،

سالن میں ہلدی ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اِن تمام کھانوں کے پکانے کا چلن ہر ہر خاندان میں علیحدہ علیحدہ تھا اور رئیسوں کے مذاق بھی مختلف تھے ۔ عام طور سے روہو کا سالن اور مہا شیر کے کباب استعمال ہوتے تھے۔ بعض رئیس کانٹوں کی وجہ سے مچھلی کھاتے ڈرتے تھے، اُن کے یہاں زیادہ تر قیمہ یا کباب پکتے تھے کیوں کر اُن کے پکانے میں مچھلی اُبال کے پہلے کانٹے نکال دینا ضروری ہوتا تھا اسی کانٹے کے خوف نے کانٹا گلانے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ ابتداءً بگلہ کی ہڈی یا سہاگہ شامل کر کے مچھلی پکائی گئی۔ اور کانٹے گل گئے لیکن یہ محسوس ہوا کہ اس طرح پکانے سے مچھلی بدذائقہ ہو جاتی ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے سربرآوردہ باورچیوں نے مچھلی کو ہم وزن دہی میں ڈال کر اور پتیلی کو گل حکمت کر کے رات بھر پکانے کی طرز ایجاد کی۔ صبح تک کانٹے گل جاتے تھے اور ذائقہ بھی بڑی حد تک برقرار رہتا تھا لیکن یہ طرز سب رئیسوں کے یہاں مقبول نہیں ہو سکی اور بالآخر یہ چلن ہو گیا تھا کہ قورمہ یا سالن پکانے کے لیے بہت بڑے قد کا روہو تلاش کر کے فراہم کیا جاتا۔ کچھ کانٹے اُس کی کاٹ چھانٹ اور صفائی میں دور کر دیے جاتے تھے اور جو باقی رہ جاتے اُن کو پک جانے کے بعد علیحدہ کرنے میں زیادہ زحمت نہیں ہوتی تھی۔

انواع واقسام کی خوش رنگ وخوش ذائقہ غذاؤں کی فراوانی کے باوجود ہمارے اسلاف کے دسترخوان پر دال کا پیالہ ہونا بھی ضروری تھا البتہ سادہ چاول شاذ ہی ہوتے تھے۔ اگر ہوتے بھی تو گھی میں بھنے ہوئے نمکین چاول ہوتے جن کو چلاؤ کہتے تھے۔ عموماً انھیں چاولوں سے دال کھائی جاتی یا زبان کو ذائقہ فراہم کرنے کے لیے تھوڑی سی کسی دوسرے نمکین سالن وغیرہ میں شامل کر لی جاتی تھی۔ رئیسوں کے مطبخ خانوں میں باورچیوں نے دال پر بھی ریاضت کی تھی۔ جو دال دسترخوان پر لگائی جاتی وہ "خاصگی دال" کہلاتی تھی۔ اس کے پکانے کے علیحدہ علیحدہ طریقے رئیسوں کے باورچی خانوں میں رائج تھے اور ہر رئیس کے یہاں کوئی مخصوص دال پکتی تھی۔ ہر ایک باورچی خانہ میں ہر دال ریاستی دسترخوان کے لیے نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ میرے جدِاعلیٰ خان علامہ نواب تفضل حسین خاں کے یہاں صرف ارہر کی دال کا دستور تھا جو دو طرح سے پکتی تھی۔ ایک بادشاہ پسند اور دوسری سلطانی دال کہلاتی تھی۔ دونوں دالیں قریب قریب ایک ہی طرح پکتی تھیں، دونوں میں دہی، بالائی کا شامل کرنا ضروری تھا البتہ سلطانی دال میں ہم وزن گوشت کی یخنی بھی پڑتی تھی۔ دونوں دالیں بہت زیادہ لذیذ ہوتی تھیں۔

دال اور چاول ملا کر کھچڑی پکانے کا دستور بھی قدیم ہے۔ البتہ پہلی سی نفاست اور لذّت اب مفقود ہے۔ کھچڑی عام طور سے دھوئی ہوئی مونگ کی دال کی پہلے بھی پکتی تھی اور اب بھی پکتی ہے۔ یہ غذا عموماً بیماروں کے لیے مخصوص ہے۔ پرانے زمانے میں یہی کھچڑی بیماروں کے لیے بہت پتلی پکتی تھی جس کو شلّا کہتے تھے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے تلے ہوئے کباب دم دیے جاتے تھے تاکہ گوشت کا عرق بھی شامل ہو کر مریض کے لیے تقویت بخش ہو جائے۔ کباب علیحدہ کر کے شلّا کھلایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سادہ کھچڑی پر بھی بڑی بڑی ریاضتیں کی گئی تھیں۔ اس سلسلہ میں دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک بار میرے بچپن کے دوست مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں مرحوم نے تفنّنِ طبع میں اپنے باورچی کو تینتیس قسم کی کھچڑی اور بتیس طرح کی چٹنی تیار کرنے کی ہدایت دی تھی۔ میں نے خاص طرح سے وقت نکال کے اُن کے دستر خوان پر شرکت کی تھی اور حقیقتاً اتنی ہی کھچڑیاں اور چٹنیاں دیکھی اور چکھی تھیں جن میں بعض بہت خوش ذائقہ تھیں۔ کھچڑی پکانے میں باورچیوں سے زیادہ بیگمات کو کمال حاصل تھا۔ میرے عزیز دوست حکیم صاحب عالم مرحوم کی اہلیہ اور اُن کی صاحبزادی چھلکوں دار مونگ کی اور خود میری پھوپی صاحبہ مرحومہ مسور کی دُھلی دال کی کھچڑی ایسی پکا دیتی تھیں کہ اُن کے مقابلہ میں سادہ پلاؤ ہیچ تھا اور اُن کی خوشبو مزعفر کو مات کرتی تھی۔ یہ دونوں کھچڑیاں پکانے میں مال مسالے سے زیادہ فن کاری کو دخل تھا۔

چاول کے کھانوں میں نمکین چاول، میٹھے چاول اور فرنی شامل ہیں۔ نمکین چاول کو عرفِ عام میں پلاؤ کہتے ہیں جس کا ہر شادی و غمی کی تقریبات اور ہر دعوت و تواضع کے موقع پر نیز روسا کے پرانے دستر خوانوں پر ہر روز موجود رہنا ضروری تھا۔ پلاؤ کو بجا طور پر خاص لکھنؤ کی نفاست کا عطیہ کہنا صحیح ہوگا۔ دلّی میں بریانی کا رواج تھا۔ بریانی میں مسالوں کی زیادتی اُس کے رنگ روغن کو متاثر کرتی اور اُس کو بھاری غذا بناتی ہے۔ پلاؤ میں لطافت نزاکت، رنگ، روغن، رائحہ، ذائقہ ہر کیفیت بریانی سے بدرجہ اتم بہتر ہوتی ہے اسی لیے ہمارے اسلاف نے اس کو پسند کر کے فروغ دیا تھا۔ پلاؤ کی اتنی زیادہ قسمیں معرضِ وجود میں آگئی تھیں جتنی تعداد بتانا محال ہے۔ یوں تو مرغ پلاؤ، مچھلی پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، انڈہ پلاؤ، پسندہ پلاؤ ہر اچھا باورچی پکا لیتا تھا لیکن یخنی پلاؤ میں ہر فن کار اپنی اپنی علیحدہ صنعت کا مظاہرہ کرتا تھا جس کے سبب سے اختراعات و ایجادات کا لامتناہی سلسلہ قایم ہو چکا تھا۔ ایسے پلاؤ

کے اقسام گوشت کی مقدار کے فرق سے نیز دوسرے مزعفرانہ تراکیب کے استعمال سے متعین ہوتے تھے۔ کہیں سیر بھر چاول کے پلاؤ میں سیر بھر گوشت پڑتا جو سادہ پلاؤ کہلاتا تھا لیکن پھر سیر کو دو سیر سے لے کر چار سیر تک کی نوبت آگئی تھی۔ یہ پلاؤ جو گوشتا پلاؤ کہلاتا تھا اس میں سیر بھر چاول کے ساتھ دو سیر گوشت اور دو سیر کباب شامل ہوتے تھے۔ پلاؤ کا گوشت پارچوں کی شکل میں استعمال ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر رئیس کے یہاں علیحدہ علیحدہ ایجادات واختراعات ہوتے تھے اور ہر روز پلاؤ کھایا جاتا تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں سنا تھا کہ پلاؤ کے اقسام ستر سے زیادہ تھے۔ میری جوانی تک بہت سے ایسے اقسام رائج تھے جن کے نام تک غالباً دنیا اب بھول چکی ہے۔ مثلاً انار دانہ پلاؤ، نورتن پلاؤ، سوئیوں کا پلاؤ، بوقلموں پلاؤ وغیرہ۔ انار دانہ پلاؤ میں چاول کا ہر دانہ بقدر نصف کے یاقوت کی طرح سرخ اور باقی آدھا سفید ہوتا تھا۔ نورتن پلاؤ میں نو رنگ کے چاول علیحدہ علیحدہ چمک دمک دکھاتے اور دسترخوان کی زینت ہوتے تھے۔ یہ دونوں اقسام بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک مفقود ہو گئے تھے۔ البتہ سوئیوں کا پلا اور پلاؤ بوقلموں ہمارے گھر کی مستورات بھی بہت اچھا پکا لیتی تھیں مگر وہ بھی پچاس برس سے نہیں پک سکا۔ پلاؤ بوقلموں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بیک وقت میٹھا اور نمکین ہوتا تھا۔ اُس زمانہ میں اس ملے جلے ذائقہ کے ہمارے اسلاف خوگر تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ فی زمانہ یہ غذا شاید رئیسوں کو بھی پسند نہ آئے حالاں کہ یہ دولت ہی کی ایجاد تھی۔

دونوں وقت کھانا کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز کھانا خواص وعوام سب ہی کی عادت میں داخل تھا۔ متوسط طبقہ کے لوگ اور غربا بھی اس عادت کو بازاری چیزیں خرید کر آسودگی فراہم کرتے تھے۔ بہترین قسم کی مٹھائیاں، حلوے، کھیر، ربڑی، میوہ جات کے مرکبات، مربے یہاں تک کہ انناس کا مزعفر بھی بازار میں فروخت ہوتا اور ارزاں فروخت ہوتا تھا! اس لیے عام گھروں میں میٹھی چیزیں تیار کرانے کی بہت کم ضرورت ہوتی تھی۔ البتہ سفیدہ، زردہ اور میوہ دار کھیر کبھی کبھی گھروں میں پک جاتی تھی۔ روسا وامرا عام طور سے بازار کی چیزیں کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔ اُن کے باورچی خانوں میں معمولی چیزیں بھی بڑے اہتمام والتزام سے تیار ہوتی تھیں۔ جن کا رنگ روغن نظر فریب ہوتا تھا چنانچہ معمولی زردہ جو حقیقتاً زرد رنگ کا سفیدہ ہوتا تھا رنگ بہ رنگ زردہ بنا اور ایک ہی پتیلی سے کئی رنگ کا زردہ نکلنے لگا تھا بالآخر یہی رنگ بہ رنگ زردہ نارنجی زردہ ہوا جس کی تیاری میں سنگتروں کی

آمیزش ہوتی تھی۔ اسی طرح مزعفر تھا جس کی تیاری میں زیادہ مقدار میں گھی اور زعفران کی ضرورت ہوتی تھی۔ چاول کے بجائے اننّاس کا مزعفر ہوا۔ اس غذا میں پھر بھی چاول کی قدرے حاجت ہوتی تھی۔ لہٰذا زعفرانی سوئیاں معرضِ وجود میں آگئیں۔ یہ غذائیں اب بھی اپنی بگڑی ہوئی صورت اور تباہ حالت میں موجود ہیں لیکن رئیسوں کے دسترخوانوں کی تین گراں قدر شیریں غذائیں جو اُن کو بہت مرغوب تھیں اب معدوم ہیں۔ یہ غذائیں تھیں متنجن، یاقوتی اور شش رنگا۔

متنجن ایک طرح سے پلاؤ بوقلموں کا جواب تھا لیکن عہدِ قدیم میں اس میٹھے پلاؤ کو اُس نمکین پلاؤ سے زیادہ وقار اور اہمیت حاصل تھی۔ ہر بڑی تقریب میں، ہر رئیس کی دعوت میں اور شادیوں کے موقع پر جوڑے کے کھانے میں متنجن ضرور ہوتا تھا۔ لڑکیوں کی رخصت کے وقت متنجن کی دیگ ساتھ جانا ضروری تھا۔ متنجن کو میٹھا اور نمکین پلاؤ کہنا موجودہ زبان میں زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کو میٹھی غذا کے زمرہ میں قرار دینے کا جواز یہ تھا کہ اس میں چوگنی شکر پڑتی تھی یعنی سیر بھر چاول کے متنجن میں چار سیر شکر دی جاتی تھی۔ بعض روسا سادہ گوشت کے بجائے مرغ یا دوسرے پرندوں کے گوشت میں متنجن پکواتے تھے۔ اُن کو یہ غذا بہت مرغوب تھی۔ متنجن پکانا صرف ہونہار باورچیوں کا کام تھا۔ لیکن دوسری بہت زیادہ لطیف، خوشگوار اور ہر دلعزیز میٹھی غذا شش رنگا ہمارے گھر کی مستورات بھی تیار کر لیتی تھیں اور بہت اچھا تیار کرتی تھیں۔ برادر مرحوم نواب مرزا جعفر علی خاں اثر کی اہلیہ کو بہترین شش رنگا پکانے میں بڑی مہارت تھی اور چونکہ برادر مرحوم کی پسندیدہ ترین غذاؤں میں شش رنگا بھی تھا اس لیے اور زیادہ رغبت سے پکایا جاتا تھا۔ شش رنگا عام طور سے سیب یا اننّاس یا گاجر یا سبز چنے سے تیار ہوتا تھا۔ سیب کا شش رنگا بہترین ہوتا تھا۔ یہ غذا قیمہ، شکر، انڈوں سے نمک دے کر تیار ہوتی تھی۔ ایک ظرف میں بیک وقت چھ رنگوں کی چمک دیکھنے میں بھی بہت بھلی لگتی تھی مگر اس کو نہ صرف پکانے بلکہ پتیلی سے نکالنے میں بھی بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی تھی۔

متنجن کی طرح یاقوتی بھی باورچی ہی تیار کرتے تھے۔ بظاہر بہت سادہ تھی جو نشاستہ، شکر، دودھ اور بادام کی دودھ کے مانند پسی ہوئی گری سے تیار ہوتی تھی لیکن اس کا تیار کرنا ہنرمندی اور تجربہ کاری پر منحصر تھا۔ کھیر کی طرح پکائی جاتی تھی لیکن جب تک تیار نہ ہو جائے پکانے والے کا ہاتھ نہیں رُکتا تھا۔ یاقوتی کو پک جانے کے بعد مٹی کے کاغذی چھچلے برتنوں

میں نکالا جاتا اور اوپر سے پستہ کی ہوائیاں چھڑک دی جاتی تھیں۔ دستر خوان پہ ہر شرکت کرنے والے کے آگے ایک ایک ہنڈیا یاقوتی کی لگا دی جاتی تھی۔ یاقوتی کو بہت زیادہ لطیف، زود ہضم، مقوی اور مفرّح غذا سمجھا جاتا تھا جس کا استعمال دستر خوان پر سب سے آخر میں ہوتا تھا۔

اسی مقام پر دستر خوان کے آداب اور نشست و برخاست کے طور طریقوں کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ رئیس کے اشارے پر دستر خوان بچھ جاتا یعنی یہ کہ کھانے بھی لگا دیے جاتے تو رئیس اور اُن کے ہمراہ دوسرے لوگ بھی کھانے کے کمرہ میں داخل ہوتے۔ وہاں متعدد ملازم تسلوں میں گھاس ڈالے ہاتھوں میں پانی سے بھرے لوٹے لیے اور کاندھوں پر چادر نما رومال ڈالے مؤدّبانہ ایستادہ رہتے تھے۔ رئیس کا ہاتھ دُھلانے کے لیے ایک چمکتی ہوئی سلفچی کا علیحدہ انتظام رہتا اور ایک نوکر مخصوص لوٹے سے اُن کا ہاتھ دُھلاتا۔ دستر خوان پر سب سے پہلے رئیس رونق افروز ہوتے پھر حاضرین بہ لحاظ اپنے مدارج کے داہنے اور بائیں بیٹھ جاتے۔ دستر خوان عموماً زمین کے فرش پر اور بعض رئیسوں کے یہاں تختوں کے بڑے بڑے چوکوں پر بچھتے تھے۔ اُن کی سبائی شرکتِ طعام کرنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ چوڑائی غذاؤں کے تناسب سے ہوتی تھی۔ رئیس اپنی جگہ پر بیٹھ کر بسم اللہ کہتے تب کھانا شروع ہو جاتا تھا۔ آدابِ دستر خوان میں یہ ضروری تھا کہ جو جس طرح بیٹھ گیا اُسی طرح اختتام تک بیٹھا رہے۔ گھٹنے اُٹھا کر بیٹھنا معیوب تھا۔ کھانا انتہائی سکون اور خاموشی سے کھایا جاتا تھا۔ کھانے میں منہ سے ہلکی سے ہلکی آواز نکلنا بھی شدت کے ساتھ عیب سمجھا جاتا تھا۔ دستر خوان پر اک دم خاموش رہنا بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا اور بہت زور سے جلد جلد باتیں کرنا بھی عیب تھا۔ ہلکی پھلکی اور طنز و مزاح کی گفتگو ہوتی تھی۔ دستر خوان پہ کافی وقت صرف ہوتا تھا اس لیے کہ رئیس جو بہت آہستہ آہستہ کھانا کھاتے تھے اور کسی شخص واحد کا دستر خوان سے پہلے اُٹھ جانا ناقابلِ عفو بد تہذیبی تھی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد بھی دستر خوان پہ بیٹھے رہنا تہذیب میں داخل تھا۔ رئیس فراغت کر لیتے تو سب ایک بار دستر خوان سے اُٹھتے تھے اور جس طرح علیحدہ علیحدہ ابتدا میں ہاتھ دھوئے گئے تھے اسی طرح بعد میں بھی ہاتھ دھو کر فراغت کرتے تھے۔

غذاؤں کے سلسلہ میں ہمارا تذکرہ مکمل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ صبح کے ناشتہ کا حال نہ بیان کر دیا جائے۔ امیر و غریب سب ہی ناشتہ کرتے تھے۔ متوسط طبقہ کے لوگ

زیادہ تر بازار کی اشیا سے ناشتہ کرتے تھے۔ رئیسوں کے بچے بھی تفریحاً کبھی بازاری اشیاٗ میں بعض چیزوں کے دلدادہ تھے۔ اُس زمانے میں ایک گاؤزباں جو آدھی شیرمال کی صورت میں ہوتی تھی اور اُس پر جتنی بالائی بغیر تولے ہوئے آجائے دو موٹے پیسوں یعنی ایک پیسہ میں ملتی تھی۔ یہ غذا ہر موسم میں رائج تھی۔ اسی طرح متوسط طبقہ والے پانچ چھے پیسوں میں نہاری کا ایک پیالہ اور دو کلچے خرید کر آسودگی حاصل کر لیتے تھے۔ جاڑوں کے موسم میں بہترین ناشتہ تنکی اور نمش تھا جو بہت سستی اور لذیذ غذا تھی۔ خونچے والے علی الصباح نکل پڑتے اور محلّے محلّے آواز لگاتے تھے۔ لوگ اپنے گھروں کے دروازوں پر پسندیدہ ناشتہ خرید لیتے تھے۔ نمش دودھ سے بنائی جاتی تھی اور نان تنک یعنی تنکی بے حد باریک اور نازک روغنی روٹی ہوتی تھی جو ذرا زور سے چھونے پر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھی۔ اسی طرح بعض دوسری غذائیں بھی تھیں جو بازار میں سستی اور لذیذ فراہم رہتی تھیں۔ اُس زمانہ میں چائے یا کافی اور ڈبل روٹی اور مکھن کا نام بھی کسی کو مطلوب نہیں تھا اور حق بات تو یہ ہے کہ وہ غذائیں دستیاب ہو جائیں تو ڈبل روٹی اور مکھن ہیچ ہے۔ ہم آج بھی اس کی طرف توجہ نہ کریں گے۔

رؤسا وعمائدین کے یہاں ناشتہ کی غذائیں بھی گھر ہی میں تیار ہوتی تھیں۔ کچھ چیزیں باورچی پکاتا اور بعض اشیا زنانے باورچی خانہ میں تیار ہوتی تھیں۔ مثلاً یہ تنکی اور نمش رئیسوں کی بھی مرغوب غذا تھی۔ نمش بڑے اہتمام سے باورچی تیار کرتے لیکن نان تنک گھروں ہی میں ماہی توے کے اندر اوپر اور نیچے انگارے لگا کے پکائی جاتی تھی۔ اس نان تنک میں مسکا گھی بڑی مقدار میں اور زعفران کا استعمال ہوتا تھا۔ تنکی نمش کے علاوہ شب دیگ اور نافتان بہت گراں قدر ناشتہ ہوتا تھا۔ یا پھر انتہائی اعلیٰ درجہ کی فرمائشی شیرمالیں اپنے باورچی خانہ کی تیار شدہ نہاری کے ساتھ استعمال ہوتی تھی۔ رئیسوں کے یہاں نہاری میں معمولی گوشت کے بجائے ہریل تیتر، بٹیر، مرغ وغیرہ کا گوشت ڈالا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جوزی حلوا سوہن یا پنیری یا انڈے کا حلوا بھی موسم سرما میں ناشتہ کا لازمی جزو تھا۔ جوزی حلوا سوہن حلوا اور پنیری دریبا بار لوگ بناتے تھے جو رکابدار کہلاتے تھے اور رئیسوں کے گھروں پر لا کر فروخت کر جاتے تھے۔ اب رکابدار بھی معدوم ہیں اور جوزی حلوا سوہن حلوا نیز وہ پنیری بھی مفقود ہے۔ موسم گرما میں مختلف قسم کی نان استعمال ہوتی تھیں۔ نان کی اقسام میٹھی یا نمکین ہوتی تھیں۔ بہت نرم ونازک اور نفیس ولطیف ہوا کرتی تھیں۔ ہر نان علیحدہ علیحدہ کسی مخصوص چیز سے پکائی جاتی تھی اور بہت

ریاض و محنت سے تیار ہوتی تھی۔ راقم کو نان کی جن اقسام کا ذائقہ حاصل ہوا تھا وہ نان تنک کے علاوہ نان شیر، نان پستہ، نان بادام اور نان مغربی تھیں جو اپنا جواب ہی نہیں رکھتی تھیں اور ان سب کا تیار کرنا بہت زیادہ وقت طلب تھا۔ یہ نان اور مختلف قسم کی روغنی روٹیاں بہترین اور لذیذ ناشتہ تھیں کوئی نہ کوئی نان یا روغنی روٹی یا دونوں چیزیں بالائی کے ساتھ یا تلے ہوئے انڈے کے ساتھ نوش کی جاتی تھیں۔ گرمیوں کی فصل میں مختلف قسم کے حلوے اور مربے شیرینی میں استعمال ہوتے تھے۔ کبھی کبھی یہ حلوے اہتمام کے ساتھ گھروں میں تیار ہوتے تھے لیکن مربے رکابداروں ہی سے خریدے جاتے تھے۔ ناشتہ کے وقت کوئی بڑا دسترخوان نہیں بچھتا تھا۔ عموماً ۹ بجے صبح کو ناشتہ تیار ہو کر ایک چھوٹے دسترخوان پر رئیس کے حضور پیش ہوتا تھا جس میں صرف گھر والے یعنی بیگم اور کوئی مخصوص بچہ یا بچے شریک کر لیے جاتے تھے اس موقع پر رئیس انتہائی خوش طبعی سے اپنے اہل و عیال ہی سے باتیں کرتے تھے۔ بظاہر تھوڑا کھانا ہوتا تھا لیکن اس میں بھی کافی وقت صرف ہو جاتا تھا۔ ناشتہ سے فراغت کرنے کے بعد روسا اپنی اپنی بیرونی قیام گاہ میں آجاتے تھے اور اگر دربار کا دن ہوتا تو اس کی تیاری کر کے پھر دربار ہی میں تشریف لاتے تھے۔ بعض مخصوص مصاحبین کو جو علی الصباح آجاتے تھے نواب ہی کے دسترخوان کا ناشتہ اندر سے بھیج دیا جاتا تھا۔

## (۷) وضعداریاں

وضعداری کی خوبیاں سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اس اصطلاح کے معنی و مفہوم پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ وضع کے معنی و مفہوم ہیں "دستور اور ترتیب" اس لیے وضعدار اُس شخص کو کہنا چاہیے جو اپنی زندگی کے تمام کاروبار، رہن سہن، میل ملت میں ایک ترتیب رکھتا ہو اور متوازن طور پر ایام گزاری کرے۔ جس طرز کو اختیار کرے اُسی پر ہمیشہ کاربند رہے۔ یہ ترتیب فقر و فاقہ اور تنگ دستی و عسرت میں بھی اُسی طرح ممکن ہے جس طرح دولت و ثروت اور جاہ و جلال میں، بشرطیکہ آدمی اپنی طبیعت میں ٹھہراؤ اور اپنی خصلت میں انسانیت و شرافت کے جوہر اکتساب کرلے۔ انسان اپنی خواہشات اور بوالہوسی میں مبتلا ہو کر یہ جوہر کھو بیٹھتا ہے کیوں کہ اپنی خود غرضیوں میں دوسروں کے حالات پر توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ سماج، انسانیت اور شرافت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لیے دور میں

کے ساتھ روابط و تعلقات میں وضعداریاں لوگوں کی عادت ثانیہ ہوگئی تھیں۔ پھر بھی ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہمارے پرانے شہری سب کے سب محاسن اخلاق سے آراستہ و پیراستہ اور انسانیت و شرافت کا مجسمہ تھے لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اُن کا دوسروں کے ساتھ ظاہری برتاو، رکھ رکھاو اور میل ملاپ کچھ اس طرز پر تعمیر ہوگیا تھا کہ اُن میں ترتیب کی خوبیاں از خود نمایاں ہوگئی تھیں اور ان خوبیوں کی قدر کرتے ہوئے انھوں نے بہتر سے بہتر وضعدار بننے کی کوششیں کی تھیں یہاں تک کہ پورا سماج اس صفت سے متصف ہوگیا تھا۔ اسی لیے وضعداری بلندیِ کردار کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی۔ غریب یا رئیس، متوسط طبقہ کا فرد ہو یا پست درجہ کا کاروباری، جو جتنا وضعدار ہوتا تھا اتنی ہی اُس کے مخصوص ماحول میں قدر و منزلت ہوتی تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وضعداری لکھنؤ کے مخصوص کلچر میں اتنا پیوست ہوگئی تھی کہ اس وصف کے حامل ہر طبقہ ہر صنف اور ہر درجہ میں ملتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی وضعداریوں میں اتنی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں گے۔ روسا و عمائدین بھی جن کا عوام سے کوئی رابطہ نہیں تھا بڑی بڑی وضعداریوں کے لیے مشہور و معروف تھے۔ جس کی جتنی زیادہ وضعداریاں مشہور ہوتی تھیں اتنا ہی اُس کا زیادہ احترام ہوتا تھا اور محافل و مجالس میں قدر دانی ہوتی تھی۔ اُن کے نام مثالاً پیش کیے جاتے اور اُن کے چرچے ہوتے تھے۔ اس کے برعکس بدوضع افراد خواہ وہ رئیس ہوں یا غریب مطعون تھے اور اُن میں سے بعض کی صحبت سے بھی احتراز کیا جاتا تھا۔

یوں تو وضعداری کے لیے خوش اخلاقی، خوش گفتاری، مہر و وفا اور پابندیِ اوقات کے اوصاف سے متصف ہونے کی ضرورت سمجھی جاتی تھی لیکن پرانے لوگوں میں یہ خصلت مزاج اور مذاق کا ایک جزو بن گئی تھی۔ یہاں تک کہ سودا بیچنے والوں کی زندگی میں بھی ایک پیشہ ورانہ ترتیب تھی جس پر وہ سختی سے عمل کرتے تھے ترکاری والے یا دوسرے پھیری لگا کر سودا بیچنے والے جس ترنّم اور موزونیت سے اشیا فروخت کرتے تھے اُن کے قصص و واقعات زبان زد ہیں اور ابھی بہت دنوں تک یاد رہیں گے۔ لیکن خرید و فروخت کے معاملات میں جو وضعداریاں رائج تھیں اور اُن پر لوگ سختی سے کاربند تھے قابلِ لحاظ ہیں۔ مثال کے طور پر رکابداروں ہی کا یہ عالم تھا جن میں کی ہر فرد کسی نہ کسی ڈیوڑھی سے وابستہ تھی۔ بلا لحاظِ قیمت ہر رکابدار اپنے ہی مخصوص رئیس کو سودا دے جاتا تھا اور کبھی یہ فکر نہیں کرتا تھا کہ دوسری جگہ زیادہ قیمت پر اپنی اشیا

فروخت کردے یہی کردار تمام سودے بیچنے والوں کا تھا، وہ اپنے خریداروں کا پاس ولحاظ کرتے تھے۔ خریدار بھی اسی طرح اُن کے قدردان تھے۔ ایسے بکثرت واقعات راقم کے علم میں ہیں کہ دوکاندار مخصوص مال جو اُن کے کسی مخصوص خریدار کی پسند کا ہوتا ہرگز فروخت نہیں کرتے تھے۔ خواہ زیادہ قیمت ہی کیوں نہ مل رہی ہو۔ کبھی کبھی وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے یہاں آئے ہوئے خریدار کو واپس کر کے وہ مال اپنے خریدار کے گھر جا کر دے آتے اور قیمت سے کم وبیش ہونے کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ کتابوں کی خریداری کے سلسلہ میں ایسے بکثرت تجربات مجھے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی معیت میں ہوئے تھے۔ ایسے مشاہدات بھی ہوئے تھے کہ فرمائش حاصل کرنے کے بعد سامان کی فراہمی میں وقت کی پابندی بھی ملحوظ رکھی جاتی تھی تاکہ اپنے خریدار کو زحمت نہ ہو۔ چوک بازار کے دوکانداروں کو یہ سلیقہ تھا کہ وہ اپنے حسنِ کلام اور شیریں زبانی سے خریداروں کو ترغیب دیتے اور مطلب برآری کر لیتے تھے۔ اشیا کی قیمتیں اجنبی خریدار کو دُگنی، تگنی اور کبھی کبھی چوگنی بتائی جاتی تھیں۔ یہ طریقۂ کار عام تھا اس لیے ہر خریدار دوکانوں پر اچھی طرح مول تول کا ارادہ کر کے جاتا لیکن یہ اطمینان رہتا کہ جو مال فروخت ہو رہا ہے وہ ٹھیک اور بے عیب ہے، دوکانداری میں مال کے سلسلہ میں دیانت داری شرط تھی۔ سوداگری کا یہی طور طریقہ وضعداری کہلاتا تھا جس میں اونچ نیچ سب برابر کے شریک اور باشعور تھے۔

شرفا کی وضعداریاں مشہور زمانہ تھیں۔ لباس، طعام، میل ملت، زندگی کے ہر شعبہ اور روزمرہ کی ہر ضرورت میں وضعداری کو دخل تھا۔ اُن کے طور طریقے یہ تھے کہ سر برہنہ یا کپڑوں کو کھلا پہن کر باہر نکلنا تہذیب سے گری ہوئی بات تھی۔ لہٰذا وہ گھروں میں جس طرح بھی رہتے ہوں لیکن باہر نکلتے تو سر پر ٹوپی حسبِ قاعدہ و دستور ڈھکی رہتی اور اچکن، چپکن بالا پر کا کرتہ، انگرکھا یا دگلا جو بھی جسم پر پوشاک ہوتی اُس کے سب بٹن، جو اُس زمانہ میں بوتام کہلاتے تھے، بند رہتے اور تکمے لگے رہتے۔ چپکن کے اندرونی بندوں کا بھی بندھے رہنا ضروری تھا تاکہ پوشاک ڈھیلی نظر نہ آئے۔ لباس کے سلسلے میں یہ وضعداری اتنی سخت تھی کہ گھروں سے باہر نکل کر اپنی ڈیوڑھی یا اپنے دروازہ پر کسی آنے والے سے ملاقات کرنے آتے تو سر ڈھکا رہنا ضروری تھا۔ صاف شفاف کپڑے پہننا شرافت کی علامت تھی۔ سر جھکا کے آہستہ چلنا بھی وضعداری میں داخل تھا۔ دوستوں سے جس طرح ایک مرتبہ میل ملت قایم

ہو جاتا اُس کو اسی طرح زندگی بھر نباہ دینا عین وضعداری کا تقاضا تھا۔ جس سودے والے کی دوکان سے جو سودا دو چار بار خرید لیا اُسی کے یہاں وہی چیز خریدتے رہنا وضعداری تھی۔ جس رئیس کے دربار میں جس طرح ایک مرتبہ حاضری ہو جاتی اور جس طرح پہلی بار بیٹھے اسی طرح حاضری دینا اور بیٹھنا وضعداری کا شعار تھا۔ مختصر یہ کہ وضعداری کے معنی ہی یہ تھے کہ اپنی معاشرت میں جو ترتیب ایک مرتبہ دے لی اُسی کو برقرار رکھنا اُن کے نزدیک شرافت کے معنی تھے اور زندگی بھر اُسی پر عمل پیرا رہنا ضروری ہوتا تھا۔ اس وضعداری میں وقت اور مقام تک کی پابندی ہوتی تھی اور دوستانہ تعلقات میں ان طور طریقوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہتی تھی۔

جہاں تک روسا وعمائدین کا معاملہ تھا۔ یہی لوگ ہماری پرانی معاشرت کے معمار تھے۔ انھی کے محلوں اور درباروں سے زندگی کے ہر شعبہ میں کوئی نیا دستور کوئی نیا چلن رائج ہوتا تو وہ انھی کے حلقۂ متعلقین ومتوسلین میں پہلے قبول کیا جاتا پھر اُنھی کے مقربین کی وساطت سے شرفا وعوام تک پہنچ کر شرفِ قبول حاصل کر لیتا تھا۔ ایسے درباروں کی کمی نہیں تھی اس لیے مجموعی طور پر بہت سی وضعداریاں کسی نہ کسی رئیس کے یہاں سے شروع ہو کر شہر کے ایک ایک گوشہ تک پہنچ جاتی تھیں۔ ان رئیسوں نے اپنے ہر فعل وعمل کو وضعداری کا پابند بنا لیا تھا۔ شادی بیاہ میں وضعداریاں برتی جاتی تھیں۔ مرنی غمی میں وضعداریاں نباہی جاتی تھیں اور سارا روزمرہ، رہن سہن، میل ملاقات کے رشتے وضعداریوں کے اوپر قایم تھے۔ بعض رئیسوں کے یہاں کوئی مخصوص طرز اُس کی وضعداری کہلاتا تھا۔ مثلاً تحسین گنج کے محمد نواب صاحب کے گل مچھے اور اُن کے سر کی انتہائی چھوٹی دیوار کی کشتی نما ٹوپی جو آلپینوں کے سہارے بالوں میں ٹانک لی جاتی تھی اُن کی وضعداریاں تھیں۔ شیش محل کے نواب رضا حسین خاں مرحوم نے اپنے لیے ایک مخصوص طرز کا لباس ایجاد کیا تھا جس کو وہ کوٹ کہتے تھے اور اُس پر صدری پہنتے تھے۔ وہی کوٹ اور صدری پہننا اُن کی وضعداری تھی۔ اُن کا کوٹ آج کی اچکن کی طرح ہوتا تھا۔ چوں کہ دامن کم چوڑے ہوتے اور آستینیں تنگ نہیں ہوتی تھیں اس لیے اس کا نام کوٹ رکھ لیا تھا اور اس لباس کے شہر بھر میں صرف وہی خوگر تھے۔ اسی طرح جو مخصوص غذا کسی مخصوص دسترخوان سے نسبت حاصل کر لیتی تھی وہ اسی رئیس کی وضعداری میں شمار ہوتی تھی اور اُس کا نام بھی اُسی رئیس کا

رکھا ہوا ہوتا تھا اور اس مخصوص غذا کا دوستوں اور عزیزوں کی دعوت کے موقع پر موجود رہنا وضعداری میں داخل تھا۔

روسا و شرفا اپنے مخصوص دوستوں اور عزیزوں کو اپنے یہاں کے کھانوں کا تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ تحفے مخصوص موقعوں سے متعلق ہو جاتے تھے۔ وضعداری میں جو تحفہ ایک بار بھیج دیا وہ برابر اُسی تاریخ اور وقت پر اسی طرح بھیجا جاتا تھا۔ شہر کے ممتاز وکیل شیخ علی عباس مرحوم کا روسائے لکھنؤ میں شمار تھا اور وہ اُسی آن بان سے اپنی زندگی گزار گئے وہ ہر سال ایک مخصوص تاریخ کو اپنے یہاں کے مٹر پلاؤ کی ایک ڈش میری خوشدامن صاحبہ کو جو میری چچی بھی تھیں بھیجا کرتے تھے۔ اُن کے یہاں کا مٹر پلاؤ اپنی آپ مثال ہوتا تھا اُس میں گوشت اور کباب کے علاوہ میوہ جات بھی شامل رہتے تھے، بے حد لذیذ، خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہوتا تھا اور شہر بھر میں اُس کے تذکرے مثالاً ہوتے تھے۔ شیخ صاحب جب تک زندہ رہے اُس تحفہ کا سلسلہ برابر جاری رہا اور میری خوشدامن صاحبہ تاریخ و وقت کو یاد رکھ کر برابر اُس کی منتظر رہا کرتی تھیں۔ دوپہر کو بارہ ایک بجے کے درمیان اُس کا آجانا لازمی تھا۔ اس تاریخ اور وقت میں کبھی فرق نہیں آیا۔

تحائف کے سلسلہ میں وقت، مقدار اور تمام سابقہ جزئیات پر نظر رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ اپنی کتخدائی کے بعد میں نواب جعفر علی خاں رئیس شیش محل کی خدمت میں سلام و آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوا تھا اور میں نے اُن کی خدمت میں اشرفیوں کی نذر پیش کی تھی جس پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے شرفِ قبول بخشا اور مجھے گلے لگایا تھا، یہ تمام طور طریقے وضعداری تھے۔ پھر بھی اُس وضعداری میں اتنا خلوص تھا کہ اُن کی شفقت و محبّت کا احساس میرے دل کی گہرائیوں تک اُتر گیا تھا۔ اُسی روز شام کو انھوں نے مختلف لذیذ اور پُر تکلف غذاؤں کے پانچ خوان مجھے بھجوائے تھے جو ہمیشہ اُن کی حیات تک اسی روز اور اُسی وقت میرے لیے آتے رہے تھے۔ یہ حُسنِ سلوک بھی وضعداری پر مبنی تھا۔ مجھے بہر حال اپنی بدوضعگی کا خیال اگر اب بھی ندامت ہوتی ہے کہ میں غالباً دو برس کے بعد سے اُس دن کو اُسی وقت یاد کر پاتا تھا۔ جب وہ خوان آجاتے تھے۔ جناب ممدوح کے دربار میں وضعدارانہ طور سے سارا کاروبار قمری مہینوں اور تاریخوں کے اعتبار سے ہوتا تھا اس لیے اس گراں قدر نوازش کی یاد مجھے صرف اُس کے موصول ہو جانے پر آجاتی تھی اور دل ہی دل میں اپنی کوتاہی پر ندامت ہوتی تھی۔

اس وضعداری کا سلسلہ تخمیناً آٹھ یا نو برس تک جاری رہا تھا جو اُن کی وفات پر ختم ہو گیا۔

لکھنؤ کے روسا و عمائدین کی تمام معاشرت یوں تو ایک خاص ترتیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی لیکن کبھی کبھی کسی افتاد یا غیر معمولی واقعہ یا کسی اتفاق کے سبب سے وہ ترتیب بگڑ جاتی تو اُس بگڑی ہوئی صورت کو وہ اس طرح اپنا لیتے تھے کہ وہی اُن کی مخصوص وضعداری ہو جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ یا سانحہ یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ نواب حیدر حسین خاں مرحوم جن کے نام نامی سے موسوم پھاٹک اب تک چوک میں موجود ہے شام کے وقت محل سے ہواخوری کے لیے برآمد ہوئے۔ اپنی گھوڑا گاڑی پر روانہ ہونے والے ہی تھے کہ مقابل سے آتے ہوئے ایک شناسا بزرگ جو اُسی محلہ میں رہتے تھے، اُن کو آداب و تسلیمات بجالائے لیکن ساتھ ہی مسکرا بھی دیے جو تہذیب سے گری ہوئی حرکت تھی۔ نواب مرحوم نے جوابِ سلام دیا اور وہ آگے بڑھ گئے لیکن اُن کے مسکرا دینے پر خیال جما رہا جس کی وجہ سمجھنے کے لیے اپنی وضع قطع کا جائزہ لیا تو یہ محسوس ہوا کہ اُن کے انگرکھے کا تکمہ کھلا ہوا تھا۔ گرمی کی شدت کے باعث یا کسی اور وجہ سے وہ تکمہ لگائے بغیر گھر سے برآمد ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ تکمہ لگانے کا خیال بھی محو ہو گیا تھا۔ اُن کو بڑی خفت محسوس ہوئی جس کا ازالہ صرف اس طرح کیا گیا کہ پھر انھوں نے زندگی بھر انگرکھے کا تکمہ نہیں لگایا اور یہی کھلی ہوئی گردن کا انگرکھا اُن کی وضعداری میں داخل ہو گیا۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کلچر کی تعمیر میں اتفاقات کو بھی دخل تھا۔ وہی اتفاقات کبھی کبھی بے ترتیبی کو بھی قبول کرا کے عین ترتیب بنوا دیتے تھے۔

آپس میں میل ملت کے سلسلہ میں قدم قدم پر اور بات بات میں وضعداری ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ جہاں جہاں شادی بیاہ میں شرکت کے مراسم قایم ہو جاتے اُن پر سختی کے ساتھ عمل ہوتا تھا۔ اگر کسی اہم مجبوری کے باعث یہ شرکت محال ہو جاتی تو اپنی نیابت کرا کے نیوتا دینے کی وضعداری ہوتی تو وہ بھی سختی کے ساتھ برقرار رکھی جاتی تھی۔ روسا و عمائدین کہیں آنے جانے کے زیادہ خوگر نہیں تھے۔ جن دوستوں یا عزیزوں سے ایسے تعلقات ہو جاتے اُن پر سختی سے عمل پیرا رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ماہِ محرم کی مجلسوں میں بھی شرکت کے یہی دستور تھے اور ایسی وضعداریاں اولاد بلکہ در اولاد تک سے نباہی جاتی تھیں۔ روسا کی یہ وضعداریاں دوسروں کے لیے باعثِ عزت افزائی سمجھی جاتی تھیں بالخصوص مصاحبین اور مقربین کے گھروں میں اگر کھڑے کھڑے بھی رئیس آجاتے تو اُس کے چرچے محلے والوں میں ہونے لگتے اور یہی کہا جاتا کہ

فلاں فلاں رئیس نے وضعداری برقرار رکھی۔ ملاقاتوں میں وضعداری پابندیِ اوقات کے ساتھ نباہی جاتی تھی۔ نواب سید اصغر حسین مرحوم نرسنی پر رہتے تھے اور نواب سلیمان قدر کی ڈیوڑھی محلہ مولوی گنج میں تھی۔ یہ دونوں رئیس اپنی اپنی سواریوں پر شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتے تو ان دوستوں کی دریا کے کنارے والی سڑک پر جو اب میڈیکل کالج کے پیچھے واقع ہے ملاقات ہونا وضعداری میں داخل تھا۔ دونوں بزرگ کچھ ایسے اوقات سے گھر کے باہر نکلتے کہ مقررہ وقت پر اُسی ایک مخصوص مقام پر ایک دوسرے سے ملاقی ہو جاتے تھے۔ مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں کی یہ وضعداری مشہور تھی کہ وہ اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کی خیریت روزانہ دریافت کراتے تھے۔ اُن کے یہاں خدمت گاروں کی تعداد کثیر تھی۔ انھی میں ایک خدمت گار کے ذمہ صرف یہی ایک کام رہتا تھا کہ وہ سویرے نکل جاتے اور دن بھر ہر ایک کے گھر جا کر خیریت دریافت کرے اور شام کو مرزا بہادر کی خدمت میں مفصل رپورٹ پیش کرے۔ کہیں سے علالت یا پریشانی کی کوئی خبر مل جاتی تو اُس عزیز یا دوست کی مناسب مدد کرنا یا خبر رکھنا بھی وضعداری میں داخل تھا۔

روسا و عمائدین کے تمام طرز زندگی سے جس میں وضعداری کو بہت دخل تھا۔ ڈیرے دار طوائفیں بھی بہت متاثر تھیں۔ انتہائی صاف ستھرے کپڑے پہننا، پورے جسم کا بجز چہرے، گٹوں تک ہاتھ اور پیروں کے ڈھکا رہنا، شرافت و متانت سے گفتگو کرنا، تہذیب و اخلاق کا ہر موقع و محل پر لحاظ رکھنا، تمام رفتار گفتار میں شائستگی برقرار رکھنا اُن کے لیے ضروری تھا۔ اُن کے تعلقات روسا و عمائدین سے تھے اور اُن کی خدمت میں سلام و آداب بجا لانے نیز مزاج پرسی کے لیے یہ طوائفیں جایا کرتی تھیں۔ ایسے مواقع پر اوقات اور مواقع مقرر تھے جن کی پابندی وضعداری میں داخل تھی۔ اِن تعلقات میں کوئی جنسی لگاؤ نہیں ہوتا تھا۔ حاضر ہونا، مؤدبانہ بیٹھنا، دلچسپ اور شائستہ گفتگو کرنا پھر واپس چلے آنا ان ملاقاتوں کا ماحصل ہوتا تھا لیکن ہر بات اور ہر حرکت وضعداری پر محمول ہوا کرتی تھی۔ جو طوائف جس رئیس کے یہاں چوپہلے پر جاتی وہ ہمیشہ اسی طرح جاتی اور جو کسی کے یہاں شکرم گاڑی پر جاتی وہ ویسی ہی گاڑی کی پابند رہتی تھی۔ جس طوائف کو محل کے اندر جانے کی اجازت ہوتی اس کے لیے وضعداری کے تحت رئیس کی ملاقات کے پہلے یا بعد میں محل میں جانا ضروری تھا۔ اسی طرح طوائفوں کے یہاں ایام عزا میں مجلسیں ہوتی تھیں۔ اِن مجلسوں کے حصے جس جس رئیس کے

یہاں جانے کا دستور ہو جاتا وہ حصّے اسی طرح برابر بھیجے جاتے تھے۔ بعض روسا و عمائدین کے یہاں مجلسوں کے رقعے اور حصّے جو عموماً قبل مجلس روسا کے یہاں جاتے تھے۔ یہ طوائفیں خود لے کر حاضر ہوتی تھیں۔ اسی طرح جہاں جہاں وضعداری میں داخل ہو جاتا روسا بھی مجالس یا دوسری تقریبات کے حصّے اور تحفے طوائفوں کو بھیجتے تھے۔ یہ تمام مراسم وضعداری کہلاتے تھے۔

ان تمام واقعات کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ جو کام ایک مرتبہ ہو جاتا اُسی طرح اور اُسی وقت وہ برابر ہوتا تھا۔ تعلقات میں یہ پابندی وضعداری کہلاتی تھی جس پر عمل درآمد کرنے کے لیے تاریخ و وقت و مقام کی پابندی ضروری تھی اور اُس کے تمام جزئیات جس طرح پہلے دن ظہور پذیر ہوتے اسی طرح برابر ہوا کرتے تھے۔ کسی طرح کا بھی رد و بدل جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس وضعداری کا پابندیِ وقت والا عنصر ہماری موجودہ معاشرت میں بڑی حد تک برقرار ہے لیکن اس طرزِ عمل میں جو رومانیت اور خلوص تھا وہ لکھنؤ کی قدیم معاشرت کے فنا ہونے کے ساتھ ہی سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا۔ پابندیِ اوقات پر بھی مغربی رنگ ہے، مشرقی چھاپ باقی نہیں رہی۔

## تیسرا باب

# شرفا اور اُن کا طرزِ زندگی

(۱) وضع قطع اور طور طریقے
(۲) رہن سہن، طرزِ گفتگو اور میل ملت
(۳) لباس و طعام
(۴) ذریعۂ معاش
(۵) امرا و شرفا کی مشترک خصوصیات

# (۱) وضع قطع اور طور طریقے

شہزادگان و عمائدین و روسا کے علاوہ جن میں بڑے بڑے وثیقہ دار بھی شامل تھے، ہماری آبادی کا ممتاز طبقہ جس کو ہم متوسط طبقہ بھی کہہ سکتے ہیں شرفائے لکھنؤ پر مشتمل تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو قلیل آمدنی میں سکون و قناعت سے زندگی بسر کر لیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے محتاج پڑوسیوں کی مدد کرتے اور خود حتی الامکان خوش پوشاک اور صاف ستھرے رہتے تھے۔ مزاج میں یہ لوگ بے حد سادے اور بھولے بھالے تھے۔ اُن کی یاد آتی ہے تو یہ صورتیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں کہ سروں پر پٹے، پٹوں پر دوپلّی ٹوپی، جسم پر گرمیوں میں صاف اور زیادہ تر سفید لباس یعنی شربتی کا انگرکھا یا تنزیب کا بالا بر کا کرتا یا اچکن، جاڑوں میں اونی چھینٹ کا سادہ یا انگرکھا نما دگلا یا کوتی اور روئی دار سوتی کپڑے کا لباس پہنتے تھے۔ ٹانگوں میں سفید چوڑی دار یا رنگین تنگ مُہری کا پائجامہ ہوتا تھا۔ پیروں میں گھیتلا جوتا پہنتے تھے لیکن اکثریت جوتی ہی پہنتی تھی جس کو اُس زمانہ میں زیرپائی کہا کرتے تھے۔ گھر سے نکلتے تو ہر ایک کے منہ میں پان کی گلوری دبی رہتی، آنکھوں میں سرمہ لگا رہتا اور کپڑوں سے بھینی بھینی عطر کی خوشبو آتی تھی۔ یہ لوگ نرم گفتار، آہستہ خرام، انسانیت پرست اور انسان دوست تھے۔ ہندو ہوں یا مسلمان سب کی تہذیب شستہ و شائستہ تھی۔ شہر میں بکثرت ہندو اور مسلمان دولت مند اور رئیس تھے، ہندو رئیسوں کے یہاں مسلمان اور مسلمان عمائدین کے یہاں ہندو ملازم رہتے تھے۔ یہی ملازمت اُن کا پیشہ تھا جس کا سلسلہ ایک ہی خاندان میں نسلاً بعد نسلاً چلا کرتا تھا اور وہی تنخواہیں اُن کی بسر اوقات کا ذریعہ تھیں۔ اختلاف مذہب کی بنا پر تعلقات میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا تھا اور یہ تمام ملازم طبقہ شرفائے لکھنؤ میں داخل تھا۔

ہندو ہوں یا مسلمان، شرفائے لکھنؤ کا عام طور سے یہ روزمرہ کا دستور تھا کہ علی الصباح یادِ خدا کرنا، مسجدوں یا مندروں میں جانا اور اپنے اپنے عقائد کے مطابق عبادتِ الٰہی بجا لانا عبادتوں کے جداگانہ رسوم تھے۔ لیکن اُن کی ادائی اس طرح نہیں ہوتی تھی کہ مختلف عقیدے رکھنے والوں کی دل آزاری ہو یا یہ کہ کوئی اپنے سے خلاف عقیدہ رکھنے والے کے طرزِ عبادت میں

رخنہ اندازی کرے۔ رواداری عینِ ایمان تھا اور دوسروں کے مذہبی عقائد کا احترام کرنا عینِ شرافت سمجھا جاتا تھا۔ عبادت گزاری سے فارغ ہونے کے بعد خانگی ضروریات کی طرف توجہ مبذول ہوتی تھی مثلاً ضروری اشیا کی خریداری، بال بچوں کے سلسلہ میں متعلقہ امور یا خود اپنے حوائج کی فراہمی وغیرہ۔ ان تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد ہر شخص اپنی معاشی زندگی کی مصروفیات کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ ملازم پیشہ لوگ روسا وعمائدین کی ڈیوڑھیوں یا سرکاری دفتروں کی طرف رُخ کرتے اور آزاد پیشہ والے اپنے اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ انھی آزاد پیشہ والوں میں مدرسین، اطبا، وکلا اور بہت سے صناع اور فن کار شامل تھے۔ وہ معاشرت طبقاتی تھی۔ اس لیے کسی مخصوص پیشہ کے ہر آدمی کا ایک ہی طبقہ میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ دولت وثروت کی کمی یا فراوانی سے کسی مخصوص فرد کے طبقہ کا تعین ہوتا تھا۔ چنانچہ شیخ علی عباس اور سید شہنشاہ حسین کے ایسے کامیاب وکلا اور حکیم میرن صاحب اور حکیم منّے آغا صاحب کے ایسے ممتاز اطبا کا شمار روسا میں ہوتا تھا۔ اِن لوگوں کے یہاں بکثرت ملازمین ومصاحبین رہا کرتے تھے اور سارا رہن سہن رئیسانہ تھا۔ شیخ علی عباس، سید شہنشاہ حسین اور حکیم میرن صاحب کا ضمناً ذکر آچکا ہے۔ اب اس مقام پر ایک مقتدر ڈاکٹر کا بھی حال سن لیجیے جن کا شمار شرفا لکھنؤ میں تھا اور جو بہت کامیاب ڈاکٹر بھی تھے

ڈاکٹر رام لال چکرورتی وضعدار، خوش اخلاق اور خوش گفتار بزرگ تھے۔ کہا جاتا تھا کہ اُن کو دستِ شفا حاصل تھا۔ اس لیے بھی وہ بہت ہر دلعزیز تھے۔ غربا پر بالعموم لطف وکرم رہتا تھا اور اُمرا وروسا کے یہاں بھی اُن کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی۔ اُن کا مکان اب بھی بلرام پور ہسپتال کے قریب برقرار ہے۔ اور اسی مکان میں وہ مطب فرماتے تھے۔ قریب قریب ہر وقت حقہ منہ سے لگا رہتا تھا لیکن یہ وہ حقہ ہوتا تھا جس کو اُس زمانہ میں "ناریل" کہتے تھے ناریل کی شکل کا پیندا ہوتا تھا اور چھوٹا سا سیدھا بینچا مع نگالی کے اُس میں لگا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک ہاتھ میں حقہ لے کر دوسرے ہاتھ کی مدد سے اور زیادہ تر ایک ہی ہاتھ کے سہارے حقہ پیا کرتے تھے۔ مریضوں کے یہاں اپنی چوپہیا گھوڑا گاڑی پر جاتے تھے اور حقہ ساتھ رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اُن کے ہمراہ ایک جلیل القدر تعلقدار کے یہاں، جن کے وہ معالج تھے، جانے کا اتفاق مجھے بھی خوش بختی سے حاصل ہو گیا تھا۔ تعلقدار صاحب کیا بیمار تھے اِس کا اندازہ دیر تک بیٹھنے کے بعد بھی مجھے کچھ نہیں ہو سکا، غالباً بیماری کا وہم

تھا۔ ڈاکٹر نے بہر حال اُن کو دیکھا، حال سنا اور نسخہ بھی لکھ دیا۔ وہ عموماً مریض کے یہاں دیر تک قیام کرتے تھے اور باتیں بھی بہت کرتے تھے۔ تعلقدار صاحب نے دورانِ گفتگو میں دریافت کیا کہ جنون کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کتابوں میں تمام تفصیلات درج ہیں، کتنی قسمیں ہیں یہ سوچ کر بتا سکوں گا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا کہ راجہ صاحب! اودھ میں کتنے تعلقدار ہیں۔ انھوں نے جوش میں آکر لمبی چوڑی داستان سنائی۔ اور تعداد بھی بتائی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے انتہائی متانت کے ساتھ روانگی کی اجازت چاہی اور یہ کہا کہ آپ نے جنون کی قسمیں دریافت کی تھیں وہ یاد آگئیں، جتنی تعداد تعلقداروں کی انھوں نے بتائی تھی ڈاکٹر صاحب نے وہی تعداد اقسامِ جنون کی بتادی اور ہم وہاں سے لطف لیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ ڈاکٹر رام لال کے مزاج میں بہت زیادہ طنز و مزاح کا عنصر تھا اور وہ اپنی اسی خصلت سے مریضوں کو مسحور کر لیتے تھے۔

اسی مقام پر ایک اور مکالمہ قابلِ ذکر ہے جو مرحوم مہاراجہ سر محمد علی محمد خان والیِ رامپور اور حکیم منّنے آغا فاضل کے درمیان ہوا تھا۔ مہاراجہ رئیس اعظم اور مقتدر ترین عمائدینِ شہر میں تھے۔ مہاراجہ کا دربار گرم تھا۔ منجملہ دیگر حاضرین کے حکیم منے آغا فاضل بھی تشریف فرما تھے۔ حکیم صاحب بڑے وقار کے مالک تھے اور اُس زمانہ میں شرفا کا یہ طرۂ امتیاز بھی تھا کہ وہ اپنے ذاتی وقار کو ہر حال میں برقرار رکھتے اور بڑی سے بڑی ہستی کے روبرو اپنے کو سبک کرنے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ اس موقع پر جب کچھ ریاست و تونگری کی عظمت کا ذکر آیا اور منجھو صاحب سوز خوان نے اپنی تیکھے دار تقریر میں دولت و ثروت کو بہت بڑھا چڑھا کر سراہا تو حکیم صاحب سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے مہاراجہ مرحوم کو براہ راست مخاطب کرکے فرمایا کہ "مجھ میں اور آپ میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ آپ کے دستر خوان پر انواع و اقسام کی نعمتیں ہوتی ہیں، میرے یہاں بھی میری پسند کا بے حد خوش ذائقہ کھانا پکتا ہے۔ البتہ غذاؤں کی تعداد کم ہوتی ہے مگر میرا اور آپ کا معدہ دونوں ایک ہی مقدار میں غذا قبول کرتے ہیں اور ہم دونوں کے یہاں ایک ہی طور پر کیموس بنتا اور خونِ صالح پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح لباس کو لیجیے۔ آپ کے توشک خانے میں سیکڑوں جوڑے بھرے پڑے ہیں لیکن میں اور آپ ایک وقت میں ایک ہی جوڑا پہنتے ہیں۔ گرمیوں میں جامدانی کا انگرکھا اور جاڑوں میں جامہ وار کی اچکن آپ بھی پہنتے ہیں اور میں بھی پہنتا ہوں۔ اسی طرح بوسٹک کا ایک جوڑا جوتا آپ بھی پہنتے ہیں

اور میں بھی پہنتا ہوں اس سے زیادہ تعداد میں استعمال ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تمام یکسانیت کے باوجود مجھ میں اور آپ میں یہ فرق ہے کہ رات کو جب میں پلنگ پر لیٹتا ہوں تو فوراً غافل ہو جاتا ہوں اور علی الصباح تازہ دم ہو کر اُٹھتا ہوں۔ برخلاف اس کے سرکار کو آدمی رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہوگی اور دماغ کو فکروں سے فراغ نہ ملتا ہوگا۔" حکیم صاحب کی تقریر کے دوران مہاراجہ برابر مسکراتے رہے لیکن اختتام پر اُن کا چہرہ متغیر تھا۔

انہی شرفائے لکھنؤ میں ایک طبقہ وثیقہ داروں کا تھا جو اب بھی اپنی گئی گزری حالت میں موجود ہے۔ اُس زمانہ میں بعض وثیقہ داروں کے بڑے بڑے وثیقے تھے جن کا شمار عمائدین شہر میں تھا۔ یہ لوگ اودھ کے شاہی خاندانوں سے کسی نہ کسی رشتہ سے منسلک تھے۔ عزیزداری کے علاوہ کسی نہ کسی قسم کا تقرب بھی ایک قابلِ لحاظ رشتہ تھا۔ شاہانِ اودھ نے بڑی بڑی رقوم ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرض دے کر معاہدے کیے تھے جن کے تحت ان وثیقہ داروں کو سود کی آمدنی بحصہ رسدی حسبِ فرمان شاہی بطور وثیقہ کے ملتی تھی۔ اور اب بھی ملتی تھی حالاں کہ اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد اب وثیقوں کی تقسیم گویا کہ برائے نام رہ گئی ہے۔ اِن وثیقہ داروں میں مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندو اور عیسائی صاحبان بھی تھے جن میں پنڈت برج ناتھ شرما ایڈوکیٹ اور مسٹر فلپ سابق رجسٹرار چیف کورٹ آف اودھ کے نامِ نامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں بزرگ وثیقہ دار ہونے کو اپنے لیے باعث معاضرت سمجھتے تھے لیکن مسلمان وثیقہ داروں کے لیے وثیقہ ہی اُن کے ضروریاتِ زندگی فراہم ہونے کا وسیلہ تھا۔ اِن صاحبان نے بڑی لاپرواہی اور انجام سے بے نیاز ہو کر تعیش پرستی میں اپنی عمریں گزار دی تھیں۔ ہر ماہ قرض لیتے اور وثیقہ ملتے ہی اصل معہ سود ادا کرنا پڑتا تھا۔ باقی مدت پھر قرض پر ایام گزاری ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ہر ماہ قرض بھی ادا نہ ہوتا اور مہاجن کا مطالبہ بڑھتا ہی جاتا جس کی ادائی کے لیے اثاثہ فروخت کرنے کی باری آجاتی۔ اُن کے اخراجات میں ضروریاتِ زندگی سے زیادہ خوش پوشاکی، خوش خوراکی، تعیش پرستی اور اُن کے تفریحی مشاغل پر مصارف ہوتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لکھنؤ کے تفریحی مشاغل کو زیادہ تر شہرت اسی طبقہ والوں کی بدولت تھی جو اپنی ایک علیحدہ جگہ معاشرہ میں بنائے ہوئے تھے۔ دوسرے طبقوں کے لوگ بھی انہی سے متاثر ہوا کرتے تھے اور اپنے اپنے اوقات پر مصروفیات سے فراغت کر کے تفریحی مشاغل میں دلچسپیاں لیتے تھے۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود بعض

وثیقہ داروں نے شرافت کے اعلیٰ نمونے پیش کیے تھے اور اُن میں بہت سے اچھے شاعر و ادیب پیدا ہوئے۔

قدیم لکھنؤ میں شام کا وقت تفریح کے لیے ہمیشہ مخصوص رہا ہے۔ اُس زمانہ میں تھیٹر، بائیسکوپ یا سنیما وغیرہ کا چلن نہیں تھا۔ رؤسا و عمائدین ہواخوری کرتے اور شرفا و عوام چوک کی سیر کرتے تھے۔ گول دروازہ سے اکبری دروازہ تک آہستہ آہستہ گھوم لینا یا پھر کسی دوکاندار کے یہاں نشست جما لینا شرفا کا مشغلہ رہتا تھا۔ چراغ جلنے تک بہت بڑی اکثریت اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جاتی تھی لیکن پھر بھی چوک اور اُس سے متصل علاقوں میں روزانہ تفریح کے سامان فراہم رہتے تھے جس سے اچھی خاصی تعداد میں لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔ نخاس میں ایک چائے، شربت کی دوکان تھی، دوکاندار کا نام غالباً علی حسین تھا۔ اس دوکان سے قریب ایک افیونی بڑے لطف لے کر اور نہایت سریلی آواز میں طلسم ہوش ربا سنایا کرتا تھا جس کو سننے کے لیے جم غفیر لگا رہتا تھا۔ اسی طرح ایک صاحب جو سید صاحب کے نام سے مشہور تھے اور شیخ علی عباس مرحوم کی گلی میں رہتے تھے روزانہ کبھی کبھی پاٹا نالہ اور زیادہ تر چوک میں مثنوی زہرِ عشق بڑے دردناک لہجہ میں سنایا کرتے تھے۔ پوری مثنوی اُن کو زبانی یاد تھی اور سننے کے لیے بے پناہ ہجوم رہتا تھا۔ جس میں بسا اوقات گریہ و زاری کی صدائیں بھی بلند ہو جایا کرتی تھیں۔ اِن سید صاحب کو کبھی کبھی طوائفیں بھی اپنے کوٹھوں پر مدعو کرتی تھیں اور مثنوی پڑھواتی تھیں۔ ایسے مواقع پر اُن کی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ یہ تفریحی مشغلے نمازِ عشا کے وقت تک اور کبھی کبھی کچھ اور زیادہ دیر تک جاری رہتے تھے۔ لیکن سن رسیدہ لوگ اور متین شرفا بہت پہلے ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور نماز سے فراغت کر کے اپنے اپنے محلّوں میں نشست جماتے تھے۔ یہ مخصوص نشست محلّہ کے بزرگ ترین شخص کے گھر پر ہوتی تھی۔ قریب قریب ہر محلہ میں ایک محترم فرد میرِ محلّہ کے نام سے موسوم تھا۔ اور اسی لقب سے اُس کا احترام کیا جاتا تھا۔ ایسی نشستوں میں لطائف و ظرائف، داستان گوئی، ضلع جگت، طنز و مزاح اور شعر و سخن کے چرچے رہا کرتے تھے۔ یہ صحبتیں رات کو دیر تک گرم رہتی تھیں۔

غروبِ آفتاب کے بعد والے ان اجتماعات میں ایک جاذبِ نظر اور دل پذیر یک رنگی اور ہم آہنگی ہوتی تھی کیوں کہ ایک مقام پر ایک ہی مزاج، خیال، پیشہ، مشرب اور

ایک ہی مقصد لے کر لوگ جمع ہوتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ڈالی گنج پار کے اُس علاقہ میں جو مکارم نگر کے نام سے مشہور تھا، ہیجڑے ناچتے اور گاتے تھے۔ باتیں بھی کرتے تو اپنے ہی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ پاٹا نالہ میں افیونی کہانیاں کہتے تھے اور اپنے ہی طرز میں ہنسی مذاق کرتے تھے۔ باورچی ٹولہ اور محلہ پل غلام حسین میں باورچی جمع ہوتے تھے جن میں مشاق فن کار اپنے اپنے کارنامے سناتے جو دوسرے شرکا کے لیے درس آموز ہوتے تھے۔ اسی طرح دوسرے فن کار اور صناع بھی اپنی اپنی ٹولیاں راتوں کو جماتے اور اپنے اپنے پیشوں سے متعلق باتیں کرتے تھے۔ شرفاء لکھنؤ اپنی اپنی محلہ وار نشستوں میں ہلکی پھلکی، سادہ اور بلا ضرر باتیں کرتے تھے۔ علمی اور ادبی گفتگو ہوتی تو اُس میں بھی یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ اختلاف رائے کی گرما گرمی محفل میں نہ آنے پائے۔ ہر شخص کے پیشِ نظر یہ مقصد رہتا تھا کہ ہنسی خوشی وقت گزارا جائے اور جو محفل سے اُٹھے اُس کا دل باغ باغ ہو۔ ایسی بہت سی صحبتوں میں مجھے بھی شرکت کے مواقع ملے تھے۔ میں نے اُس وقت بھی یہی محسوس کیا تھا کہ ان بزم آرائیوں میں زندگی اور حاصل زندگی کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا تھا۔ کوئی گفتگو کارآمد یا سود مند نہیں ہوتی تھی اور نہ وہاں کوئی تلخ و تیز یا ضرر رساں بات کسی کی زبان سے نکلتی تھی۔ سیاسیات سے اُس زمانہ میں کسی کو کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ اِن محفلوں میں فقہ اور اصول کے لیے کوئی جگہ تھی۔ اِن لوگوں کی ساری توجہ اسی پر مرکوز رہتی تھی کہ خود بھی ہنسیں اور دوسروں کو ہنسائیں۔ لہٰذا اُن کے تذکروں میں صحت و عدم صحت کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ میرے تجربے اور مشاہدہ کی اِن محفلوں میں سب سے زیادہ بارونق اور گرم نشست نواب بہادر علی خاں عرف نواب الّو صاحب بیاںؔ کے یہاں محلہ گولا گنج میں رہا کرتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک شام کی کارروائی درج ذیل ہے۔

نواب الو صاحب کے مکان کے زیریں حصّہ میں ایک خوشنما اور کسی قدر وسیع ہال تھا جس میں زمین کا فرش تھا۔ وہ خود ایک طرف نمایاں جگہ پر وسط میں بیٹھتے تھے لیکن اُن کی نشست کے لیے کوئی خاص تزک و اہتمام نہیں رہتا تھا۔ اُس دور کی تہذیب کے مطابق سر سے پاؤں تک پورا ضروری لباس پہنے رہتے تھے۔ دوپہر کے چند گھنٹوں کے علاوہ دن بھر اور رات کو مغربین کی نماز کے بعد سے دیر تک اسی نشست گاہ میں تشریف رکھتے تھے اور ہر وقت کچھ نہ کچھ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ اِن آنے والوں میں شرفا اور ادیبوں کے علاوہ

محلّے کے دوکاندار بھی کبھی کبھی آجاتے تھے۔ نواب صاحب اُن سے بھی بڑے خلوص انہماک اور دلچسپی سے باتیں کرتے جو اُنھی کے متعلقہ کاروبار کے بارے میں ہوتی تھیں کیوں کہ وہ اپنے کو ہر موضوعِ سخن پر اظہارِ خیال کرنے کا اہل سمجھتے تھے اور بلا تکلف ہر ایک کو اپنی رائے پیش کر دیتے تھے۔ اس ادعائے ہمہ دانی کے باوصف وہ عام طور سے پہلے دوسروں کی سنا کرتے تھے اور جب طبیعت گرما جاتی تو بہت دیر تک مسلسل افسانہ کے طرز پر گفتگو کرتے تھے جس کو تمام شرکا صرف حُسنِ بیان سے لذت اندوز ہونے کے لیے ہمہ تن ذوق و شوق سے سنتے تھے۔ اس مخصوص شام کو کچھ ترکاریوں کا ذکر آگیا تو حاضرین میں سے کسی نے یہ کہا کہ آج میں نے ایک آدمی کو ایسے گولر بیچتے دیکھا تھا جن کا چھلکا ہلکے زرد رنگ کا اور قد نارنگی کے برابر کا تھا۔ یہ بیان بھی یقیناً غلط تھا لیکن نواب صاحب کو جوش آگیا اور انھوں نے اپنے لکھنؤ سے کلکتہ اور پھر کلکتہ سے سنگاپور تک سفر کرنے کی ایک طویل داستان سنائی جس میں ہر ہر منزل پر کسی نہ کسی عجیب و غریب واقعہ کا ذکر تھا اور پھر یہ فرمایا کہ وہ سنگاپور میں اپنے فلاں فلاں دوست کے یہاں، جن کا نام بھی بتایا تھا، مقیم تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور لب سڑک کرسی پر بیٹھے تھے۔ ناگاہ اُس طرف سے ایک آدمی ٹوکرے میں تین پھل لیے ہوئے گزرا جو تربوز کے برابر اور اُسی کے ہم رنگ تھے۔ دریافت کرنے پر سودے والے نے بتایا کہ وہ پھل حقیقتاً گولر تھے۔ قیمت پوچھنے پر اُس نے آٹھ آنہ فی گولر دام بتائے۔ یہاں تک تو یہ افسانہ پھر بھی غنیمت تھا لیکن ہم لوگوں کو اُس وقت پورا لطف آگیا جب انھوں نے یہ فرمایا کہ "میں نے ایک گولر خرید لیا، دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کو توڑا تو ایک کوّا نکل کر اس طرح اُڑا کہ اُس کے پنجوں سے میرے ماتھے پر زخم آگیا جس میں سے دھل دھل خون بہنے لگا۔" اس کے بعد اپنے ماتھے پر ایک پرانے زخم کا نشان دکھا کر فرمایا کہ "یہ دیکھیے، کلام اللہ کی قسم اب تک نشان موجود ہے۔" حاضرین میں سب ہی جانتے تھے کہ وہ سنگاپور کبھی نہیں گئے مگر لطف اندوز سب ہوئے۔ اُن کی گفتگو میں ہر ایسا غلط واقعہ اُنھی کی ذات سے متعلق ہوتا تھا۔ نواب اتو صاحب شاعر نہیں تھے۔ لوگوں نے اُن کے طرزِ گفتگو کو ملحوظ رکھ کر اُن کو بیاںؔ کا لقب دیا تھا اور ان قدر دانوں میں مرزا ہادی رسواؔ کے ایسے گراں قدر ادیب بھی تھے جو بسا اوقات شام کی نشستوں میں شرکت فرماتے تھے۔

ایسی شام کی محفلوں کو یاد کر کے اگر ایک طرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ فارغ البالی کے

دور میں یہ سب بے کاری کے مشغلے تھے تو دوسری طرف شرفائے لکھنؤ کی معصوم طبیعتوں اور پاکیزہ طینتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ موجودہ دور میں ناکارہ ثابت ہونے لیکن اپنے عہد میں شرافت وانسانیت کی دنیا آراستہ کر گئے تھے۔ اُن کی یہ نشستیں اگر کسی طرح کارآمد نہیں ہو سکتی تھیں تو بھی یہی کیا کم تھا کہ ہماری اُردو زبان کو اپنی اُنھی صحبتوں میں یہ لوگ جِلا دے گئے۔ اس لیے ہم کو اُن کے اِن تمام طور طریقوں کی قدر ہی کرنا پڑتی ہے۔

## (۲) رہن سہن، طرزِ گفتگو اور میل ملّت

شرفا لکھنؤ میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کو ہم کسی طرح بھی خوش حال اور فارغ البال نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لیے اُن کا رہن سہن اور اُن کی خانگی زندگی اُنھی کی حیثیت کے مطابق معصومیت کی حد تک سادہ تھی۔ بچپن میں اُن کی مائیں یہ تعلیم دیتی تھیں کہ "تھوڑا کھانا بناؤ سے رہنا"۔ "جو کپڑے کو تاہ کرے، کپڑا اُس کو شاہ کرے" وغیرہ وغیرہ۔ اس تعلیم کا زندگی بھر دماغوں پر اثر رہتا تھا اور بڑی حد تک اُن کا طرزِ عمل ویسا ہی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ گھروں میں واپس آتے ہی کپڑے بدل ڈالتے تھے تاکہ اُن کی صفائی اور پاکیزگی میں فرق نہ آنے پائے اور دوسرے روز بھی بدستور اُجلے اور شفّاف رہیں۔ گھروں میں اپنی اپنی حسب حیثیت کپڑے پہنتے تھے۔ خوش حال لوگ ہر وقت کرتے اور پائجامے پہنے رہتے تھے لیکن کم مقدرت والے موسم کے لحاظ سے ٹھنڈی یا گرم صدری نما بردار بنڈی اور جانگیہ پہنتے تھے پیروں میں جوتی اور سر پر ٹوپی رہنا بہر حال ضروری تھا کیوں کہ ننگے پیر اور ننگے سر ہونا شرافت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ شریف بہو بیٹیاں پائنچوں دار پائجامے یا کلی دار پائجامے پہنتی تھیں۔ گھروں کے اندر پہننے والا پائجاموں کا گھیر بہت کم ہوتا تھا البتہ دوسری جگہ جاتے وقت بڑے بڑے گھیر کے پائجامے استعمال ہوتے تھے۔ کپڑا خواہ سستا ہی کیوں نہ ہو لیکن اُس کا خوش رنگ اور خوش وضع ہونا ضروری تھا۔ رنگ اور وضع کی پسندیدگی اپنی اپنی طبیعت اور اپنے اپنے مذاق پر منحصر ہوتی تھی۔ یہ مستورات پائجاموں کے ساتھ گھروں میں انگیا اور کرتی یا جاڑوں میں کرتی کے اوپر روئی دار شلوکہ پہن کر دوپٹہ یا رضائی اوڑھا کرتی تھیں۔ تقریبات کے موقع پر اسی انگیا کرتی پر سوتی یا اونی شلوکہ بھی پہن لیا جاتا تھا۔ دو چار اچھے اور قیمتی جوڑے ہر غریب گھر میں بھی رکھے رہتے اور عند الضرورت کام آتے تھے۔ بچوں کے لیے بھی رہن سہن کا

یہی رواج تھا۔

مالی حیثیت کے تناسب سے ہر شریف کے گھر کا اندرونی ماحول اور بندوبست تقریباً یکساں ہوتا تھا۔ ہر گھر میں مہترانی ملازم رہتی تھی جو سویرے ہی مکان کے صحن اور بیرونی حصہ مکان میں جھاڑو دے کر صفائی کر دیتی تھی۔ کمروں، دالانوں اور دوسرے مقامات اقامت و نشست میں جھاڑو دینا اور صفائی کرنا، گھر والوں کے ذمہ رہتا تھا۔ یہ فرض بیگم یا اُن کی صاحبزادیوں کو انجام دینا ہوتا تھا۔ کسی چھت یا دیواروں کے کونوں میں مکڑی کا جالا لگا رہنا منحوس سمجھا جاتا تھا۔ جس کی نظر پڑ جاتی وہ فی الفور صفائی کرتا تھا۔ گھروں میں کم سے کم ایک ملازمہ ضرور ہوتی تھی جس میں کھانا پکانے کا سلیقہ ہونا لازمی تھا۔ باورچی خانہ اسی کے حوالہ رہتا تھا۔ وہ صبح کو بہت سویرے جھاڑو دے کر مہترانی کے آنے کے قبل ہی ترکاریوں وغیرہ کے چھلکے اور دوسرے فضلات باہر نکال دیتی اور فوراً چولھا جلا دیتی تھی۔ پہلے ناشتہ اور فوراً البعد کھانا پکانے کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ یہ ماما خواہ کتنی ہی ہنرمند کیوں نہ ہو لیکن باورچی خانہ کی نگرانی اور کھانا پکانے میں اشتراک و تعاون گھر والی کے لیے ضروری ہوتا تھا اس لیے اور یہ حقیقت بھی ہوتی تھی کہ گھر والی کے ہاتھ لگائے بغیر اتنا خوش ذائقہ، خوش رنگ اور خوشبودار کھانا پک ہی نہیں سکتا تھا جو شرفا لکھنؤ کے مذاقِ سلیم کو آسودگی فراہم کرتا۔ باورچی خانہ کی ذمہ داریوں میں برتنوں کی دیکھ بھال بھی گھر والی کرتی تھی۔ اگر کوئی برتن یا باسن میلا ہوتا تو ماما معتوب ہو جاتی تھی۔ اُس زمانہ میں لوگ حفظانِ صحت کے رائج الوقت اصولوں سے بہرہ مند نہیں تھے لیکن اُن کی نفاست پسند طبیعتیں اُن کی صحت مندی اور طوالتِ عمر کی ضامن تھیں۔ بہت کم ایسے مواقع آئے ہوں گے کہ لوگ مسموم اور ناپاک غذاؤں کی پیدا کردہ بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہوں۔ باورچی خانہ اور برتنوں کی صفائی کے ساتھ پانی کے لوٹوں اور گھڑوں کی پاکیزگی پر بھی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ ہر گھر میں تانبے یا پیتل کے لوٹے ہوتے تھے۔ اور پینے کا پانی موسم کے لحاظ سے مٹی کے گھڑوں، جھجریوں اور صراحیوں میں رکھا جاتا تھا۔ لوٹے ہر تیسرے چوتھے روز راکھ سے مانج کر دھلوائے جاتے اور مٹی کے برتنوں کو باری باری چوتھے یا پانچویں روز دھوپ میں رکھ کر سکھا لیا جاتا تھا۔ گھڑے عموماً گھڑونچیوں پر ڈھکے ہوئے رکھے جاتے اور اسی طرح ڈھکے ہوئے لوٹے ہر وقت پانی سے بھرے ہوئے گھر کے کسی کونے میں ایک چھوٹے تخت یا چوکی پر رکھے رہتے تھے۔ اسی چوکی پر شیشی میں کوبیدہ منجن اور ایک بیسن دانی

میں بیسن رکھا رہتا تھا۔ صابن سے لوگ واقف بھی نہیں تھے۔

متوسط درجہ کے قدیم شرفا کے مکانات چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے جن میں اچھے سے اچھا مکان تین چار کمروں، ملحقہ کوٹھریوں، دو تین دالانوں اور ایک مختصر صحن پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک کمرہ میاں اور بیوی اپنے سونے کے لیے علیحدہ کر لیتے تھے، دوسرا کمرہ بچوں یا دوسرے ساتھ رہنے والے عزیزوں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا، ایک کمرہ میں اٹھنے بیٹھنے کا انتظام رہتا اور اگر چوتھا کمرہ ہوا تو اس کو جہانداری کے نام پر مختص کر دیا جاتا، کوٹھریوں میں سامان و اسباب رہتا، نشست گاہ میں تخت بچھے رہتے تھے اور بیگم کا پاندان ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ اسی پر دوپہر یا رات کو کھانے سے فراغت کرنے کے بعد بیوی کھٹر کھٹر ڈلی کاٹ کر پان بناتیں اور پہلو میں موجود شوہر کو کھلاتی تھیں۔ بعض گھروں میں اس تخت پر عام طور سے دری اور چاندنی بھی نہیں ہوتی تھی اور آنے والے آکر بلا تکلف کھرّے تخت پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ دوستوں سے ملاقات کرنے کے لیے گھر کے باہر کمرہ یا صحنچی یا سائبان ورنہ ڈیوڑھی ہی میں ایک تخت پڑا رہتا تھا۔ اسی کے قریب لوہے کی دو یا تین کرسیاں جن میں لکڑی کی پٹریاں جڑی ہوتی تھیں رہا کرتی تھیں۔ بعض لوگوں کے یہاں ایسی کرسیوں کے بجائے سینٹھے کے مونڈھے ہوتے تھے۔ جن شرفا کے یہاں باہر کا ملازم ہوتا اس کے لیے بھی یہی جگہ قیام گاہ کا کام دیتی تھی۔ اس کی چارپائی یہیں بچھتی تھی اور جب کوئی مہمان آتا تو کونے میں کھڑی کر دی جاتی تھی۔ کسی کونے میں ملازم کا سامان وغیرہ بھی رہتا تھا۔

ملازم کا اصل فریضہ اس کی ڈیوڑھی میں زیادہ سے زیادہ مدت تک موجودگی تھی۔ اس کے علاوہ ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں جنس وغیرہ اکٹھا خرید لانا، دن میں ایک یا دو بار روزانہ کے متفرق ضروریات فراہم کر دینا، کسی خاص کام کو کسی خاص موقع پر انجام دینا اور اگر ضرورت ہو تو بچوں کو مکتب تک پہنچانا اور لے آنا، ملازم کے فرائض میں داخل تھا۔ باقی اوقات آرام سے گزرتے تھے۔ شریفوں کے گھروں میں ملازموں کی حیثیت خاندان کے ایک رکن کی ایسی ہوتی تھی۔ ان کے آرام اور تمام ضروریات زندگی کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ وہ دور تہذیب و شائستگی تھا چنانچہ نوکروں پر خفگی اور ناراضگی میں بھی شستگی اور شائستگی برقرار رہتی تھی۔ ماما پر بیگم کو غصہ آجاتا تو طنزاً اس کو نیک بخت کہا جاتا۔ کم بخت یا بد بخت کے ایسے کلمات زبان سے نہیں نکلتے تھے۔ اسی طرح اگر کسی بزرگ کا مزاج اپنے ملازم کی

کسی سنگین لغزش پر برہم ہو جاتا تو وہ اُس سے نمک فراموش کہہ کر خاطب کرتے تھے۔ نمک حرام کہنا آدابِ شرفا سے بعید تھا۔ مالکوں کے اس برتاؤ کا فطری طور پر یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے ملازم بھی خواہ مرد ہوں یا عورتیں اپنے آقاؤں کے ساتھ وفا شعار رہتے اور اپنی جانیں تک نثار کرنے پر آمادہ رہا کرتے تھے۔ وہ صرف خدمت گار ہی نہ تھے بلکہ جس کے ملازم ہوتے اُس کی جان اور آبرو کے محافظ بھی رہا کرتے تھے۔ اُن کا اپنا کردار بھی اُسی ماحول کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا جہاں وہ ملازمت کرتے تھے۔ اسی مقام پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ شرفا کے گھروں میں آدمیوں کی ملازمت کا سلسلہ نسلاً بعد نسلاً چلا کرتا تھا۔ ایک ہی خاندان میں کئی پشتوں کے نوکر نظر آیا کرتے تھے اور یہ کہا جاتا تھا کہ فلاں فلاں کا فلاں سرکار میں خون پل گیا ہے۔

رہن سہن کے آداب میں یہ بھی داخل تھا کہ کوئی عزیز اپنے کسی ایسے عزیزِ قریب کے گھر میں جہاں مستورات سامنے ہوتی تھیں بغیر دستک دیے اور دو تین بار آواز لگائے داخل نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ تیسری مرتبہ پکارنے پر جواب ضرور مل جاتا تھا اور "آیئے" کی آواز آجاتی تھی۔ بعض شرفا اپنے گھروں میں بھی داخل ہونے کے قبل پکار کر کہہ لیتے تھے کہ "ہم آرہے ہیں"۔ معاشرہ میں یہ وہ تہذیب تھی جو اپنی بیوی کے ساتھ ضروری سمجھی جاتی تھی۔ دوسروں کے گھر میں جا کر خواہ وہ کتنی ہی قربت کیوں نہ رکھتے ہوں، وہاں کے ماحول یا کسی خانگی بندوبست کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جو نکتہ چینی سمجھی جائے معیوب تھا۔ اسی کے ساتھ اپنے دوست یا عزیز کے حالات کا اندازہ کر کے اُس کو خاطر و تواضع کا موقع دیا جاتا تھا۔ مہمان کی خاطر داری کرنا ہر شریف آدمی کا فرض تھا۔ کبھی کبھی مہمانوں کی تواضع اپنی حیثیت سے بڑھ کر کی جاتی تھی۔ مہمان اگر پہلے سے اطلاع دے کر آتا تو گھر کی حسبِ مقدرت آرایش و زیبایش بھی کی جاتی تھی۔ ایسی ضرورت کا کچھ نہ کچھ سامان ہر گھر میں محفوظ رہتا تھا۔ کھانے وغیرہ کی دعوت کرنے میں کبھی کبھی شرفا مقروض بھی ہو جاتے تھے۔ آنے والے بھی اپنے میزبان کی مجبوریوں کا خیال رکھتے تھے۔ واپسی کے قبل اُن کے بچوں کو شیرینی کے نام سے کچھ نہ کچھ رقم عطا کر دیتے تھے۔ خوش حال عزیز اور دوست مہمان آتے تو اپنے ہمراہ کچھ نہ کچھ سوغات ضرور لاتے تھے۔ دورانِ قیام میں جس سے بھی گفتگو ہوتی شستگی، شایستگی اور تہذیب و اخلاق کا خیال رکھا جاتا تھا۔ طرزِ گفتگو

وہی رہتا تھا جو اُس زمانہ میں گھروں کے باہر رائج تھا۔

طبقۂ شرفا میں قریب قریب سب ہی اپنے زمانہ کے معیارِ تعلیم کے مطابق پڑھے لکھے تھے۔ اُردو عام زبان تھی اور اکثر و بیشتر فارسی میں بھی اچھی خاصی لیاقت رکھتے تھے۔ رؤسا و عمائدین کی صحبتوں کی بدولت بکثرت شرفا عربی کے بھی گرویدہ ہو گئے تھے اور اُن کی زبانوں پر بکثرت عربی فقرے چڑھ گئے تھے۔ ان فقروں اور عربی الفاظ کا اتنا زیادہ جا و بیجا استعمال ہونے لگا تھا کہ بسا اوقات عوام کے دماغ پر ناقابلِ برداشت حد تک بار پڑ جاتا تھا۔ آسمان سے ہلکی ہلکی بارش ہوتی تو کہتے تھے کہ "تقاطر امطار ہو رہا ہے" شادی کے لیے بزاز سے کپڑا خریدنے جاتے تو یہ فرماتے کہ " جامۂ عروسی بلا تلا لو ز طاہری درکار ہے "۔ دودھ والے سے "لبن خالص بلا انضمام ماء" کی فرمائش کرتے تھے اور ایک مرتبہ ایک بڑھیا ترکاری والی سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ " اے عجوزہ عدا بیچے گی یا کیلا" وغیرہ وغیرہ۔ اس رسم و رواج میں ظریف مرحوم نے انقلاب پیدا کرایا تھا جس کے بعد عوام و خواص سب ہی میں سلیس اُردو رائج ہو گئی۔ ہندو برادری کے کائستھوں میں فارسی رائج تھی اور یہ سب فارسی کے دلدادہ تھے۔ شادی بیاہ کے رقعے بھی فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ وہ لوگ بھی جو پوری طرح زبان داں نہیں تھے، فارسی بولنے اور لکھنے کے پرستار تھے اور اپنی من گڑھت فارسی بولتے تھے۔ ایسی فارسی اتنی زیادہ مضحکہ خیز ہو گئی تھی کہ اُس کو برقرار رکھنا خود انھیں کی برادری کو شاق ہونے لگا تھا۔ راقم کے والد محترم کے ایک دوست برج بلب کشور اچھے خاصے پڑھے لکھے ادیب اور شاعر تھے۔ اپنی برادری کی فارسی دانی کا مذاق اُڑانے میں اُن کو بہت لطف آتا تھا۔

فارسی و عربی کا وقتی بحران ہو یا سلیس و شستہ اُردو کا پاکیزہ رواج، لکھنؤ والوں کی گفتگو اور عام بول چال ہمیشہ شیریں اور خوشگوار ہوتی تھی۔ سونے میں سہاگہ اُن لوگوں کا مذاقِ شعر و نغمہ تھا جس کے وہ ہمیشہ خوگر رہتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے اور ہر اونچے نیچے شخص کی زبان سے جو بات نکلتی تھی وہ دودھ سے دُھلی ہوئی اور شکر کی طرح شیریں ہوتی تھی۔ پھل اور ترکاری بیچنے والے بھی ترنّم اور موزونیت کے پرستار تھے۔ اُن کی آواز اور اُن کے الفاظ دلوں کو مسحور کر لیتے تھے۔ اِن خُردہ فروشوں کی شیریں زبانی اور اُن کے دلکش لب و لہجوں کے کچھ دھندلے اور مٹے ہوئے نمونے تخمیناً چالیس برس قبل تک

مل جاتے تھے اور اب صرف اُن کے افسانے بڑے بوڑھوں کو جو زمانے کی ستم گاریاں دیکھنے کو زندہ رہ گئے ہیں یاد آتے اور پہروں تڑپاتے ہیں۔ ککڑی بیچنے والے کی یہ صدا کہ "مجنوں کی پسلیاں ہیں، لیلا کی انگلیاں ہیں، کیا پتلی پتلی ککڑیاں ہیں!" پرانے لکھنؤ کے بوسیدہ کھنڈرات میں اب بھی گونج رہی ہے اور ایک فقیر کا طرزِ گداگری اور اُس کی مناسب حال شوخ و شیریں گفتار اس قابل ہے کہ پرانے لکھنؤ کی تاریخ میں ہمیشہ جلی حرفوں میں لکھی رہے۔ یہ فقیر صبح ہی سے چوک میں بھیک مانگتا تھا۔ اُس کا طریقہ یہ تھا کہ بظاہر خوش حال لوگوں کے پیچھے لگ جاتا اور جب تک کچھ مل نہ جاتا برابر طرح طرح کی دعائیں دیتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک دوسرے صوبے سے نووارد خوش حال بزرگ اپنی ٹم ٹم پر چوک میں داخل ہوئے وہ صاحب باوجود تونگری کے حد سے زیادہ بخیل تھے جس کا فقیر کو احساس نہیں ہوا۔ وہ حسبِ عادت پیچھے لگ گیا۔ چوک کی تنگ سڑک پر اُس زمانہ میں ٹم ٹم کا تیز چلانا ممکن نہیں تھا۔ سواری آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی اور یہ غریب دعائیں دیتا ہوا پیچھے پیچھے اکبری دروازہ تک پہنچ گیا۔ انھوں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آگے بڑھ کر ڈھال آگئی۔ ٹم ٹم تیز ہو گئی اور فقیر کے لیے پیچھا کرنا دشوار ہو گیا۔ اتفاقاً رئیس کی چھڑی ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آگری، انھوں نے ٹم ٹم روک لی۔ فقیر نے دوڑ کر چھڑی اٹھائی، جھپٹ کر رئیس کو مودّبانہ پیش کر دی اور ساتھ ساتھ پھر دعائیں دینے لگا۔ رئیس نے چھڑی لے کر ٹم ٹم آگے بڑھا دی۔ اب یہ غریب رُک گیا اور زبان سے صرف اتنا کہا کہ "ایک ہماری شرافت دیکھیے!" ککڑی والے کی صدا اور فقیر کے اس جملہ سے اُس زمانہ کے شریفوں کی شائستگی اور حسنِ گفتار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غربا پروری، انسان دوستی، داد و دہش اور اخوت و محبت، ان تمام اچھی خصلتوں سے شرفائے لکھنؤ متصف تھے۔ متمول نہ ہوتے ہوئے بھی دریا دلی اور فیاضی میں کسی طرح بھی کم نہیں تھے۔ انسانی ہمدردی اُن کے خمیر میں شامل تھی اور دوستوں سے دوستی نباہنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے جس کی ادائی میں حتی المقدور کبھی کوئی کوتاہی گوارا نہیں کرتے تھے دوستانہ روابط میں خلوص و مہر و وفا کی مثالیں اتنی بہتات سے ملتی تھیں کہ اُن کا تذکرہ کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے اور اُن حقیقتوں کو آج کے زمانے والے باور نہ کر کے افسانے قرار دیں گے کیوں کہ ہماری دوستی کا معیار بدل چکا ہے اور رفق و مدارا کی تمام پرانی

قدریں فنا ہو چکی ہیں۔ اس لیے بے شمار واقعات کو نظر انداز کر کے صرف ایک واقعہ دو ایسے دوستوں کے تعلقات کا مثالاً پیش کیا جاتا ہے جن میں ہم کسی کو بھی خوش حال اور مالی اعتبار سے آسودہ نہیں کہہ سکتے۔ محلہ نواز گنج میں سکسینہ برادری کے ایک شاعر تھے، اُن کے ایک بے تکلف دوست اور شاعر جو مسلمان تھے، محلہ حیدر گنج قدیم کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۱۴ء کی تباہ کن بارش میں بے شمار مکانات منہدم ہو گئے تھے، ان ہندو شاعر کو اپنے مسلمان دوست کی، جن سے ایک طویل مدت سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، بڑی فکر تھی۔ دفعتاً ایک شام کو کسی قدر تاخیر سے وہ مسلمان شاعر اپنے ہندو دوست کی خبر لینے اُن کے گھر پہنچ گئے۔ انھوں نے آنے والے کا نام دریافت کرایا اور نام سنتے ہی بیرونی نشست گاہ کے دروازے کھلوا دیے، کچھ وقفے کے بعد وہ خود اس شان سے باہر آتے کہ ایک ہاتھ میں کھانے کا تھال تھا اور دوسرے میں ایک پوٹلی تھی۔ دونوں صاحب سلامت کر کے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے۔ میزبان نے اپنے دوست سے کہا کہ تمھاری اتنی رات چڑھے آنے کا باعث یقیناً کوئی پریشانی ہوگی، لہٰذا اگر بھوکے ہو تو پہلے کھانا کھاؤ، اس کے علاوہ دوسری ضرورتوں کے لیے کچھ روپے جو گھر میں تھے لیتا آیا ہوں۔ یہ رقم کم ہو تو بیوی کے ہاتھ گلے کا زیور بھی پوٹلی میں موجود ہے۔ آنے والے دوست نے یقین دلایا کہ انھیں کوئی ضرورت لاحق نہیں ہے۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، تمھارے دیکھنے کو دل بے تاب تھا اس لیے وقت و بے وقت کا لحاظ کیے بغیر چلا آیا۔ پھر دونوں نے ساتھ کھانا کھایا اور دیر تک شعر و سخن کی محفل گرم رہی۔ راقم کے والد مرحوم سے اِن دونوں بزرگوں کی ملاقات تھی اور وہ دوستی نباہنے کے معاملہ میں اس واقعہ کا بھی تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے اِن دونوں دوستوں کے نام اور مکانوں کے پتے بھی بتائے تھے۔ راقم کے بذاتِ خود تجربات کے تحت یہ کوئی تعجب خیز یا اپنی آپ مثال واقعہ نہیں تھا لیکن آج ہم اس مثال کو اخوت و محبّت کا کارنامہ قرار دینے پر مجبور ہیں۔

اس اخوت و محبت، شستگی و شائستگی اور خوش کرداری و خوش اطواری کے دور میں بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہمارا سماج یک لخت بدکرداروں اور بداطواروں سے بری و پاک تھا۔ اس زمانہ میں بھی متوسط اور پست طبقہ میں ایسے افراد تھے جن کو مفسدہ پرداز، مرہنگ ملچشور اور بدمعاش کہا اور سمجھا جاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ اُن کا کوئی

مقام ادبستانِ لکھنؤ کی کسی صنف میں نہیں تھا۔ عمائدین و روسا اُن کے ناموں سے بھی ناواقف تھے اور شرفا و عوام اُن سے خائف ہو کر گریز کرتے تھے، لہٰذا اُن کو حرفِ غلط کی طرح محو کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے اور اُن کا کوئی تذکرہ اس تالیف میں نہیں آئے گا۔ البتہ انھیں اچھے لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن کا شمار صنفِ شرفا میں ہوتا تھا لیکن اُن سے کچھ ایسے ناسزا وار حرکات سرزد ہوئے تھے جن کا خمیازہ اُن کو بھگتنا پڑتا تھا۔ ایسی ایک مشہور اور نمایاں مثال ایک بزرگ کی تھی جو محلہ وزیر گنج کے رہنے والے تھے، انھوں نے ایک بار اپنے ایک ہم محلہ کو کسی بات پر خفا ہو کر چاقو مار دیا تھا، گو کہ وہ شخص ہلاک نہیں ہوا اور بہت جلد زخم مندمل ہو گیا لیکن چاقو مارنا ہی ایک ناقابلِ عفو گناہ تھا اور یہ حرکت اتنی زیادہ قابلِ لحاظ تھی کہ اس واقعہ کے برسوں تک چرچے ہوتے رہے تھے۔ اور اُن بزرگ کو "خونی" کا لقب ایسا ملا کہ اُن کی زندگی میں یہ داغ کسی طرح صاف نہیں ہو سکا۔ ہمارا قدیم سماج کسی نازیبا اور ناشائستہ حرکت کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا اور ایسے مجرم کو قانون کی سزا سے زیادہ خواص و عوام میں مطعون ہو جانے کی سختیاں عمر بھر برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ محفلوں اور صحبتوں میں اُس پر نفرین ہوتی اور سڑکوں اور گلیوں میں لوگ انگشت نمائی کرتے تھے۔ قانون کی سزا میں پھر بھی ایک مدت کا تعین ہوتا تھا اور ہوتا ہے لیکن معاشرہ کی یہ سزا بلا تعینِ مدت برقرار رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اتنی شدید عقوبت دوسروں کے لیے موثر تنبیہ کا کام کرتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے جو غالباً عدم واقفیت یا کسی تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی، اور اب تک بہت سے دماغوں میں موجود ہے۔ کہا جاتا تھا اور اب بھی بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ شرفائے لکھنؤ کے کردار اور اُن کے طور طریقوں میں نمائش اور ریاکاری کارفرما کرتی تھی۔ معترضین کہتے ہیں کہ اُن کے میل جول میں جو خلوص نظر آتا تھا وہ ظاہری تھا، اُن کی اصل غرض خود آرائی اور خود نمائی رہا کرتی تھی۔ یہ الزام سرتاسر غلط بلکہ بہتان ہے۔ یوں تو دقیق نظر سے دیکھا جائے تو ہر انسان کے ہر فعل کو خود نمائی اور خود غرضی پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن اُس کے عمل میں خلوص کا جائزہ لینے کے لیے پورے کردار کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ اس معیار کے تحت دیکھا جائے تو یہ حقیقت فوراً ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اُن لوگوں کے دل میں ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے کا خیال لگا رہتا تھا جس کے شواہد ہر وقت فراہم رہتے تھے، صرف یہی ایک صورتِ حالِ

اُن کے خلوص کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ وہ داد و دہش اور غربا پروری میں اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ ایک ہاتھ کی خود اُن کے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ اس کے علاوہ مثل مشہور ہے کہ چیزوں کی حقیقت اُن کے اضداد سے پہچانی جاتی ہے، لہٰذا شرفا کے کردار کو اُن کے اوقاتِ افلاس میں پرکھنا چاہیے تاکہ اُن کے باطن کا انکشاف بہ آسانی ہو جائے۔ مثال میں ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

محلہ کٹرہ ابوتراب خاں میں ہمارے آبا و اجداد کی محل سرا کے قریب ایک بزرگ کا مکان تھا جو شرفا لکھنؤ میں شامل تھے۔ ایک روز افلاس نے ایسا گھیرا کہ گھر میں یک لخت فاقہ تھا لیکن حسبِ دستور سویرے ہی چولہا جلایا گیا اور اُس پر ایک بڑی پتیلی میں پانی بھر کے اور سل کا بٹہ ڈال کر چڑھا دیا گیا، اوپر سے دو تین اینٹیں بھی دھر دی گئیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد حسبِ معمول محلہ کی ایک ملاقاتی ضعیفہ تشریف لائیں۔ انھوں نے خلافِ معمول بڑی پتیلی دیکھ کر گھر والی سے سوال کیا۔ "بہن آج کیا پکا رہی ہو"۔ انھوں نے فی الفور جواب دیا۔ "کلّے پائے چڑھے ہیں"۔

اس جواب کو آپ دروغ بافی کہیں یا ریاکاری سمجھیں لیکن پرانی تہذیب میں ایسا جھوٹ بھی شرافت کی دلیل تھا اظہارِ تموّل ہو یا غربت کی پردہ پوشی، دونوں مظاہروں میں شرافت برقرار رکھی جاتی تھی اور سچ پوچھیے تو غیرت مندی میں ریاکاری کو کوئی دخل ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ لوگ خوش حالی اور بدحالی دونوں حالتوں میں غیور تھے، شریف تھے اور پُر خلوص تھے۔

## (۳) لباس و طعام

ہر انسان کے لیے پیٹ میں روٹی اور جسم پر کپڑا ایسی ضروریاتِ زندگی ہیں جن کی فراہمی تمام دوسرے لوازمات پر ہمیشہ مقدم رہی ہے۔ صاحبانِ ذوق اور اربابِ دول نے ان ضروریات سے متعلق اشیائے خوردنی اور ملبوس میں طرح طرح کے ایجادات و اختراعات پہلے بھی کیے تھے اور اب بھی کرتے رہتے ہیں۔ البتہ طبیعتوں اور مذاق میں اختلاف کے باعث وضع قطع اور نوعیت ہمیشہ بدلتی رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کھانے اور پہننے کی جو چیزیں اور اُن کی وضعیں کل پسند تھیں آج مرغوب نہیں ہیں، اسی طرح ہمارے اسلاف اگر آج زندہ ہوتے تو وہ جدید غذاؤں اور موجودہ لباس کو کبھی پسند نہیں کر سکتے تھے۔ اُن لوگوں کے مزاج میں نزاکت

لطافت اور نفاست کا جو معیار داخل تھا وہ یقیناً دورِ حاضر میں پورا نہیں ہوتا۔ رؤسا و عمائدین ہی نہیں، شرفائے لکھنؤ اور عوام کے بھی رجحانات یکساں طور پر ایک ہی مذاق میں ڈوبے ہوتے تھے۔ وہ معاشرہ اس طرح پر منضبط تھا کہ تنوع اور رنگینیوں کی تلاش شہزادگان و رؤسا کے درباروں اور محلوں میں ہوتی تھی، دوست احباب نیز مقربین و مصاحبین کوشش و مشاورت میں شریک ہوتے اور جب کوئی ایجاد سامنے آجاتی تو انھیں حاضرین درِ دولت کی وساطت سے شہر بھر میں پھیل جاتی، شرفا اُس کو فی الفور قبول کر لیتے تھے۔ قدیم لکھنؤ کی یک رنگی و یگانگت میں اسی عمل اور ردِ عمل کی کارفرمائی تھی چنانچہ لباس وطعام کے بارے میں خواص و عوام کا ذوق مشترک تھا۔ اسی اشتراک کی بدولت اُن کی ظاہری شکل و شباہت میں بنیادی اختلاف بہت کم تھا۔

لباس میں سب سے زیادہ محترم سر کی پوشاک سمجھی جاتی تھی۔ سر برہنہ گھر سے باہر نکلنا بہت معیوب تھا۔ اس پوشاک میں تنوع کم اور یک وضعی زیادہ تھی۔ کچھ لوگ چوگوشیہ، بعض قالب کی، بعض اور پرانی وضع کے لوگ مندیل پہنتے تھے لیکن وہ ٹوپی جو لکھنؤ کا مستند لباس تھا دوپلی کہلاتی تھی جس میں دو پلّو جوڑ دیے جاتے تھے۔ اُسی دوپلی ٹوپی میں طرح طرح کی ایجادیں کر کے وضعیں تراش لی گئی تھیں اور ان ٹوپیوں کا کپڑا بھی مختلف اقسام کا ہوتا تھا۔ جامدانی کی ٹوپیاں بھی رائج تھیں۔ جاڑوں کے موسم میں کشتی نما مخملی ٹوپیاں انھیں دوپلی ٹوپیوں کی قایم مقام ہو جاتی تھیں۔ بعض نازک مزاج شرفا نے مندیل کی ایک مخصوص قایم مقام ٹوپی اختیار کر لی تھی جو اسی شہر کی ایجاد تھی۔ دفتی کا گول گھیرا جو نیچے بڑا اور اوپر چھوٹا ہوتا تھا کاٹ لیتے تھے اور اُس پر ریشمی یا زربفتی کپڑا چڑھا دیتے تھے اور یہ ایک خوشنما اور خوش رنگ ٹوپی ہو جاتی تھی۔ جدیدیت کا زور آتے ہی پرانی ٹوپی نے بھی اپنی جگہ خالی کرنے کا بندوبست شروع کر دیا تھا اور ترکی ٹوپی نیز ایرانی ٹوپی مقبول ہو گئی تھیں۔ ایرانی ٹوپیاں بعض عمائدین بھی استعمال کرنے لگے تھے۔

چپکن، اچکن، انگرکھے، دگلے یا بالابر کے کرتے شرفائے لکھنؤ کا اصل لباس تھا جو پہن کر وہ باہر نکلتے تھے۔ چپکن حقیقتاً عربی لباس قبا کی ترمیم شدہ صورت تھی۔ غالباً اس کی ایجاد دلّی میں ہوئی تھی لیکن لکھنؤ والوں نے اس میں بہنات کے ساتھ بٹنوں، گوٹ اور گول گلے کی آمیزش کر کے اپنے مذاق کا بنا لیا تھا۔ چپکن کلائیوں، صدر اور کمر پر چسپت

رہتی تھی لیکن دامن بڑے بڑے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُس کی قایم مقام اچکن ہوگئی تھی اور وہی شرفا کا عام لباس تھا۔ اچکن میں دامنوں کا گھیر چھوٹا اور بدن پر چستی کم ہوتی تھی لیکن آستینیں گول ہی رہا کرتی تھیں۔ سامنے صدر پر بالا بر نہیں ہوتا تھا اور اسی کی شکل قریب قریب موجودہ شیروانی کی سی آگئی تھی۔ اچکن کے نیچے کرتے پہننے ہی کا دستور تھا۔ بعض لوگ اِن کرتوں کے نیچے دو بر کی انگیا نما بنڈی بھی پہن لیتے تھے۔ انگرکھا گرمیوں میں اور دگلا جاڑوں میں پہنا جاتا تھا۔ انگرکھے ململ، تنزیب، شربتی یا جامدانی کے پہنے جاتے تھے اور دگلے عموماً چھینٹ کے بنتے تھے۔ بہت رنگین، خوشنما اور پھول دار چھینٹ اُس زمانہ میں سستی اور آسانی سے مل جاتی تھی۔ جاڑوں میں روئی کے استعمال کی بہتات تھی۔ روئی دار صدریاں، روئی دار شلوکے، روئی دار اچکنیں اور روئی دار دگلے عام رواج میں داخل تھے۔ دگلے انگرکھے کی شکل کے ہوتے تھے۔ بعض معمر شرفا اپنے پاجاموں میں بھی روئی بھروا لیتے تھے۔ سردی سے محفوظ رہنے کی فکر میں روئی کا استعمال کثرت سے ہوتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ زیادہ سردی لگ جانے سے آدمی فالج میں مبتلا ہو جاتا ہے لہٰذا حفاظت کی ہر امکانی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ اچکنوں پر عام طور سے بڑا رومال گلے میں اوڑھ لینے کا دستور تھا، یوں بھی ہر شریف گلے میں رومال ضرور باندھ کر باہر نکلتا تھا۔ جاڑوں میں خوش نما رنگین رضائیاں اوڑھ کر بھی لوگ سڑکوں پر نکل آتے تھے۔

جسم کے زیریں حصہ میں پائجامہ پہنا جاتا ہے۔ چوڑی دار طرز کا پائجامہ مرغوب خواص و عوام تھا۔ محفلوں اور تقاریب میں چوڑی دار سفید رنگ کا پائجامہ پہننا قریب قریب لازمی ہوتا تھا۔ اُس کے علاوہ تنگ مہری کے پائجامے پسند کیے جاتے تھے۔ ڈھیلی مہری کے پائجامے پہننے کا بہت کم رواج تھا۔ ایسے ڈھیلے پائجامے علما فضلا اور اطبا کے لیے مخصوص تھے اور وہ لوگ بھی زیادہ تر مشروع کے پائجامے پہنتے تھے۔ شرفا بھی رنگین پائجامے پہن لینے میں تکلف نہیں کرتے تھے۔ مالی اعتبار سے کمزور رنگین گاڑھے یا گزی کے پائجامے بڑے ذوق و شوق سے پہنا کرتے تھے۔ پیروں میں عام طور سے جوتیاں استعمال ہوتی تھیں جن کو زیرپائی کہتے تھے۔ اُن کی شکل و صورت سیدھی سادی سلیپر کی طرح ہوتی تھی۔ خاص خاص موقعوں پر گھتیلے جوتے پہنے جاتے تھے۔ نئے طرز کے جوتوں میں سب سے پہلے پمپ جوتوں کا رواج ہوا تھا۔ اِن جوتوں پر ریشمی فیتی ٹکے رہتے

تھے اور بعض خوش حال شرفا چاندی کے نکلس ٹکوا لیتے تھے اور ایسے جوتے فرمایش کر کے زرد مخمل کے بنواتے تھے۔ جراب پہننے کا عام رواج نہیں تھا حالاں کہ اونی خانہ ساز جرابیں اور اسی طرح کے اونی دستانے بعض عمائدین کے یہاں رائج تھے۔

عام طور سے شرفا سڑکوں پر اور بازاروں میں سادہ اور سفید لباس پہن کر نکلتے تھے۔ جن کے لیے انتہائی صاف و شفاف نظر آنا ضروری تھا لیکن محفلوں، تقریبات اور اجتماعات میں یہ طرز بدل جاتا تھا۔ اس کو اُن کا ذوقِ خود آرائی کہا جائے یا خود نمائی کہ وہ ایسے مواقع پر نہایت زرق برق اور پھول دار کپڑے استعمال کرتے تھے۔ سفید جامہ زیب تن ہوتا تو اُس کے لیے بھی قیمتی ہونا ضروری تھا۔ یہی روسا و امرا کا بھی طرۂ امتیاز تھا اور خوش حال شرفا انھیں کی تاسّی کرتے تھے۔ اُن کے پاس بھی بعض لباس اتنے ہی قیمتی نکل آتے تھے جیسے رئیسوں کے یہاں ہوتے تھے۔ البتہ تعداد میں کمی بیشی کا فرق ہونا ناگزیر تھا۔ اس کے علاوہ ایک ہی کپڑا اپنی نوعیت کے اعتبار سے ارزاں یا گراں ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ ٹانڈہ کی جامدانی کا ایک تھان جو ایک انگرکھے کے لیے کافی ہوتا تھا اپنی وضع قطع اور فن کاری کے اعتبار سے پانچ روپیہ سے لے کر پچیس تیس روپیہ تک کا ملتا تھا۔ شربتی، تنزیب اور ململ وغیرہ کی قیمتوں میں بھی اسی لحاظ سے فرق ہوتا تھا۔ ہر رئیس اور متوسط درجہ کا آدمی اپنی حیثیت کے ماتحت انھیں کپڑوں کے مختلف اقسام میں کسی نہ کسی قیمت کے کپڑے کو خرید سکتا تھا۔ ہر شریف کے گھر میں سستے اور قیمتی ملبوس فراہم رہتے تھے جن میں بعض اونچے درجے کے کپڑے کسی نہ کسی رئیس کے مرحمت کردہ ہوتے تھے۔ کپڑا رکھنے اور پہننے کا سلیقہ لوگوں کے مزاج و عادات کا جزو بن گیا تھا۔ اسی سلیقہ شعاری کی بدولت کپڑے اپنے رنگ و روغن میں برسہا برس تک محفوظ رہتے تھے۔

شرفائے لکھنؤ میں ایک ممتاز طبقہ علمائے دین کا بھی تھا۔ یہ حضرات عربی لباس پہننے کے ہمیشہ قائل رہے۔ سنی علما گول عمامہ اور شیعہ علما عموماً سیاہ عمامہ اور سبز رنگ کی قبا استعمال کرتے تھے۔ عبائیں عموماً سیاہ ہوتی تھیں۔ پائجامے سفید پہنتے تھے۔ سنی علما کے پائجامے ٹخنوں کے اوپر گول اور اونچے رہتے تھے شیعہ علما ڈھیلی مہری کا کسی قدر اونچا پائجامہ پہنتے تھے سنی علما میں معمر حضرات خضاب ضرور لگاتے تھے اور ان تمام حضرات کی قباؤں کے بندوں میں تسبیحِ احمر لٹکی رہتی تھی۔ سرمہ لگانا بھی کارِ ثواب تھا۔ اِن تمام بزرگوں کا چہرہ پاک و نورانی اور جسم معطّر رہتا تھا۔ طرزِ گفتگو عام شہریوں سے کچھ زیادہ ہی نرم و نازک تھا۔ دنیا سے بے تعلق

رہ کر یہ صاحبان اپنی اپنی زندگی بسر کر لے گئے۔ عبادت الٰہی اور بندگانِ خدا کے حق میں دعائے خیر ان کا وظیفہ تھا۔ شرافت، پاکیزگی اور نیکی اُن کے ظاہر اور باطن دونوں میں پیوست تھی۔

ہندو برادری میں بھی شرفا کا لباس مسلمانوں ہی کے ملبوس سے مماثل تھا۔ وہ لوگ بھی باہر نکلتے تو اچکن، پائجامے اور دو پلی ٹوپی ہی پہن کر نکلتے تھے۔ رنگین اور زرق برق لباس کے وہ بھی دل دادہ تھے۔ دونوں جماعتوں کے افراد میں بظاہر کوئی نمایاں شان امتیاز نہیں تھی بالخصوص کائستھ برادری میں سکسینہ اور سریواستو صاحبان کا تمام رہن سہن اور عادت و اطوار مسلمانوں ہی کے ایسے تھے۔ فکر و مذاق میں بھی یک رنگی اور ہم آہنگی تھی۔ اور جو امتیازی شان ہندو کائستھوں کے لباس میں تھی وہ صرف اچکنوں میں وضع کا قدرے فرق تھا۔ مسلمانوں کی اچکنوں میں داہنی جانب بٹن لگتے تھے اور اب بھی لگتے ہیں۔ اس ساخت کی وجہ سے بایاں دامن داہنے کو ڈھک لیتا ہے لیکن ہندو صاحبان کی اچکنوں میں بائیں جانب بٹن ٹکتے تھے اور داہنا دامن بائیں کو ڈھکتا تھا۔ اس امتیاز کے علاوہ بعض ہندو صاحبان کی ٹوپیاں بھی نمایاں طور پر مختلف ہوتی تھیں۔ مسلمانوں نے بھی بانات کی ایرانی ٹوپی پہننا شروع کر دی تھی لیکن اس کو دو ایک کشمیری ہندوؤں کے علاوہ اور کسی نے نہیں اپنایا۔ جدیدیت پر آمادہ ہندو صاحبان بانات کی گول نما بانات کی ٹوپیاں جو فلٹ کہلاتی تھیں استعمال کرتے تھے۔ یہ ٹوپی مسلمانوں میں ماسٹر محمد احمد مرحوم وکیل کے علاوہ اور کسی مسلمان نے استعمال نہیں کی۔ اس برائے نام فرق کے مقابلہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جو اخوت و محبت کا جذبہ موجزن رہتا تھا آج ہم کو اپنے اُسی قدیم معاشرہ پر فخر و ناز ہے۔

خوش حال شرفا کی مستورات بھی بیگمات پکاری جاتی تھیں۔ اور گھروں میں بھی اُن کا رہن سہن امیرانہ تھا لیکن کم مقدرت گھرانے والیاں عام طور سے "اہلیہ" کہلاتی تھیں اور اُن کا طرزِ زندگی سادہ تھا۔ اُن کو گھر داری اور بچوں کی تربیت و پرداخت نیز خود اپنے شوہروں کی رفاقت سے فراغت نصیب نہیں ہوتی تھی۔ البتہ جب کسی تقریب یا دعوت میں عزیزوں یا دوستوں کے یہاں مدعو ہوتی تھیں یا خود اپنے گھر میں کوئی تقریب ہوتی تو اُن کو اپنی ذاتِ خاص پر توجہ کا موقع مل جاتا تھا۔ ایسے مواقع جب بھی آتے تو دو تین روز قبل سے تیاریاں

شروع ہو جاتی تھیں۔ جتنے زیادہ مستطیع گھر میں جانا ہوتا اتنا ہی فراوانی کے ساتھ کپڑے لتے اور بناؤ سنگار کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اچھے سے اچھا رنگین اور قیمتی جوڑا جو میسر ہوتا پہنا جاتا۔ ایک روز قبل ہی سے ہاتھوں اور پیروں میں تازہ مہندی لگائی جاتی اور دن کے دن کنگھی چوٹی کر کے سرمہ، مسی اور عطر سے زیبائش ہوتی تھی۔ چوٹی اصطلاحِ عام میں وہ مصنوعی لمبی اور گھنی چوٹی ہوتی تھی جو اصلی چوٹی میں شامل کر کے رنگین ریشمی فیتے کے ہمراہ کمر کے نیچے تک لٹکائی جاتی تھی۔ جن مستورات کے اصلی چوٹیاں چھوٹی ہوتی تھیں اُن کے لیے یہ مصنوعی چیز بہت کار آمد ہوتی تھی کیوں کہ کاکل کا کم سے کم تا بہ کمر لٹکنا حسن و جمال کے لوازمات میں داخل تھا۔ اُن کے لباس زریں کا صرف اِسی قیاس آرائی پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس سماج میں مردوں کے لیے زرق و برق اور پھول دار و چمک دار لباس پہننا شایانِ شان سمجھا جاتا ہو تو عورتوں کے لیے کیا کچھ نہ ضروری رہا ہوگا۔ اس روپہلی سنہری اور چمکتی دمکتی پوشاک کے ساتھ خوش حال گھرانوں کی عورتیں سر سے پاؤں تک طلائی اور نقرئی زیورات میں لدی ہوئی مہمان جاتی تھیں۔ پیروں کے انگوٹھے، پیر بالخصوص ٹخنے، کمر، صدر، گلو، کان ناک، ماتھا، مانگ، انگلیاں اور کلائیاں یہ سارے عضو سادہ اور جڑاؤ زیورات سے آراستہ و پیراستہ رہتے تھے۔ نئی دُلہنوں کے لیے ناک میں نتھ پہن کر جانا لازم تھا۔ کیوں کہ نتھ سہاگ کی علامت تھی۔ اِن تمام زیورات کے علیحدہ علیحدہ نام اور بعض ایک ہی عضو جسم کے کئی کئی زیور بھی ہوتے تھے۔ وہ زمانہ بھی ایسا تھا جب غریب سے غریب شریف گھر میں بھی کچھ نہ کچھ نقرئی اور طلائی زیور ضرور ہوتے تھے اور ایسی عورتوں کو بھی کم ہی سہی مگر زیور پہن کر جانا ضروری ہوتا تھا۔ کم زیور ہونا بد نما نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن جھوٹے موتی یا جواہرات یا ملمع کردہ طلائی زیور کا استعمال ناقابلِ عفو گناہ تھا۔ دیکھنے والوں کی نظریں فوراً زیورات کے اصلی یا نقلی ہونے کو پہچان سکتی تھیں۔ اس لیے اور کم مایہ لوگوں نے بھی ایسے تصنع کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ بہر حال زیوروں کی تعداد میں بہتات اور قیمتی لباس کا استعمال ہر ہر گھرانے کی علیحدہ علیحدہ استطاعت پر منحصر ہوتا تھا۔ اسی طرح خوش حال گھرانوں کی بیگمات کی سواریاں بھی روسا و عمائدین کے محلات کی طرح شاہانہ تزک و احتشام سے نکلتی تھیں۔ عام شرفا کی مستورات بہر حال چوپہلوں پر سوار ہوتی تھیں۔ یہی سواری اِن ہستیوں کے لیے مناسب و موزوں بھی تھی۔

طعام کے سلسلے میں بھی شرفا کا مذاق بہت بلند تھا۔ ہر شریف گھر میں خواہ خوش حال ہی کیوں نہ ہو لڑکیوں کو بچپن ہی میں کھانا پکانے کا فن بڑے انہماک سے سکھایا جاتا تھا شادی ہو جانے کے بعد لڑکی اپنے شوہر کے ذوقِ طعام کے تحت اور ہنر مند ہو جاتی تھی۔ اس طرح ہر گھر کا کوئی نہ کوئی مخصوص کھانا محلہ بھر میں شہرت کا مالک ہوتا تھا۔ غریب سے غریب شریف آدمی کے گھر میں خواہ ایک ہی پتیلی پکے لیکن جو کچھ پکتا تھا لذیذ، خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہوتا تھا یہاں تک کہ صرف دال پکتی تو وہ بھی آج کے سالن سے بہتر ہوتی تھی۔ غذاؤں میں یہ اوصاف پکانے والی کے سلیقے اور ہنر مندی سے پیدا ہوتے تھے اور ہر اہلِ خانہ کو ہر روز اپنے شوہر کے لیے مخصوص طور پر خود پکانا پڑتا تھا یا پوری طرح باورچی خانہ کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ انھیں گھر والیوں کی بدولت کھانا پکانے کے فن میں بہت سی نئی نئی ترکیبیں رائج ہوئی تھیں، چنانچہ وہ کھانا جو آج "سالن" کے نام سے مشہور ہے گھر کی عورتوں ہی کی ایجاد تھا۔ متوسط طبقہ کے لوگ بادام کا قورمہ، تال مکھانے کا سالن یا اسی قسم کی دوسری بیش بہا غذائیں اپنے گھر میں پکوانے کے، باوجود ارزانی کے، مقدرت نہیں رکھتے تھے۔ لہذا ترکاریوں کو گوشت کے ہمراہ پکا کر، ایک ایسا مرکب معرضِ وجود میں لایا گیا جو میوہ جات کے سالن کا بدل ہو گیا اور آج تک رائج ہے۔ امرا و روسا کے یہاں ترکاریاں سادہ پکتی تھیں، شرفا کے یہاں ہر ترکاری کا گوشت کے ساتھ سالن پکنے لگا۔ پہلے بہت لذیذ ہوتا تھا لیکن اب بھی یہ غذا بہت اچھی تیار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بہت سی دوسری غذاؤں کے پکانے میں جو اپنی پسندیدہ ہوتی تھیں گھر والیوں نے کمال حاصل کر لیا تھا اور بعض خاندانوں میں باورچی سے بہتر کھانا پک جاتا تھا۔ یہ مستورات تنور میں پکنے والی چیزیں یا بڑی مقدار میں کھانے نہیں پکا سکتی تھیں لیکن روزمرہ کے تمام خصوصی کھانے بھی بہتر سے بہتر تیار کر لیتی تھیں چنانچہ ہمارے خاندان کی دالیں جو بادشاہ پسند اور سلطانی دال کے نام سے مشہور ہوئیں ہمارے گھر کی بیگمات ہی اچھی سے اچھی پکاتی تھیں۔ کئی باورچیوں نے تجربے کیے لیکن وہ ہمیشہ ناکامیاب رہے۔ یہی حال اور بہت سی دوسری غذاؤں کا بھی تھا جن میں خصوصیت کے ساتھ مٹر پلاؤ میوہ دار اور کوفتہ معلائے بھی قابلِ ذکر ہیں۔

اسی مقام پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ روسا و شرفا کی عورتوں کو ہم

سلیقہ شعاری میں ماہر نہیں قرار دے رہے ہیں۔ ان میں بکثرت ایسی مستورات تھیں جن کو ہم بدسلیقہ کہیں گے لیکن ایک خصلت ہر گھر کی ہر عورت میں مشترک تھی اور وہ تھی اپنے شوہر پر جان قربان کرنا۔ اُن کے شوہروں کو کھانا کھلانے کا ذوق تھا اس لیے اس مخصوص فن میں ہر عورت زیادہ سے زیادہ کمال حاصل کرنے کی فکر میں رہتی تھی۔

بازاروں میں بھی بہتر سے بہتر غذائیں ہمہ وقت تیار رہتی تھیں اور اُن کی قیمتیں ہر چھوٹے بڑے کی دسترس میں تھیں۔ شرفا کے دسترخوان پر بازار کی کسی نہ کسی چیز کا موجود رہنا ایک عام دستور تھا۔ دسترخوان بچھتے وقت اگر کسی خاص چیز کی یاد آجاتی تو فی الفور منگا لینا دشوار نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کم مقدرت کے شرفا شام کو چوک میں ہوا خوری کے بعد واپسی پر کوئی نہ کوئی چیز اپنے اہل و عیال کے لیے خرید کر خود ہی لیتے آتے تھے۔ ایسی خریداری کے لیے پراٹھے اور کباب عام پسندیدہ غذائیں تھیں۔ ایسے لوگوں کے یہاں صبح کو ناشتہ گھر میں تیار کرانے کا بہت کم رواج تھا۔ گلی گلی سودے والے نماز صبح کے بعد ہی سے دروازہ دروازہ آوازیں لگانا شروع کر دیتے تھے۔ ان تیار شدہ چیزوں کی پورے گھر کے لیے خریداری میں کفایت ہوتی تھی اور گھر والوں کو پکانے کی زحمت سے فراغت بھی رہتی تھی۔ ناشتہ کے لیے جاڑوں کے موسم میں تنکی و نمش یا نان نہاری اور گرمیوں میں گاؤزباں و بالائی بہترین لذیذ و نفیس غذائیں تھیں جو گھر بیٹھے خرید لی جاتی تھیں اور صرف چند پیسوں میں گھر بھر کو آسودگی حاصل ہو جاتی تھی۔ تنکی، نمش اور بالائی لکھنؤ کی مخصوص غذائیں تھیں۔ بالائی لکھنؤ کے نام ہی کے ساتھ مشتق تھی۔ باہر سے آنے والے لوگ واپسی پر اپنے ہمراہ یہاں کی بالائی اور چوک کی مرزا والی دوکان سے بالائی کی گلوریاں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لیے بطور تحفہ لے جایا کرتے تھے۔ بالائی کو ابتداءً ملائی کہتے تھے۔ اسی طرح دہی، دہی کہلاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ بادشاہ اودھ نصیر الدین حیدر نے ملائی کا بالائی اور دہی کا دہی نام بدل دیا تھا جو اسی زمانہ سے مقبول ہو کر رائج ہے۔ بازار کی غذاؤں نے شرفا کے ذوق و شوق کی بدولت ٹنڈے کے پراٹھے کباب، حسین علی کی نہاری، مرزا کی بالائی کی گلوریاں، حیدر حسین خاں کے پھاٹک کا زعفر، نخاس کی شیرمال اور بالائی نے اتنی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی کہ آج تک اُن دوکانداروں اور غذاؤں کے نام مشہور ہیں۔

اُس دور میں کھانا کھانے کی تیاری اور دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانا اپنے مخصوص طرز اور تہذیب کے تحت فن کے درجہ پر پہنچ گیا تھا۔ دستر خوان بچھنے کے لیے قطعی طور پر کوئی وقت معین نہیں تھا لیکن شہر بھر میں عام طور سے شرفا دوپہر کو اور رات کو نمازِ عشا سے فراغت کرنے کے کچھ مدت بعد کھانا کھانے کے عادی تھے۔ سرکاری ملازمین اور وکلا کے علاوہ سب لوگ دوپہر تک اپنے اپنے گھر آجایا کرتے تھے۔ وکلا صاحبان کے لیے لنچ کے مقررہ وقت پر کچہری ہی میں کسی تخلیہ کی جگہ پر دستر خوان بچھا دیا جاتا تھا اُن کے ہمراہ ملازمین جاتے تھے اور کبھی کبھی مصاحبین بھی پہنچ جاتے تھے۔ وقت پر کھانا بھی گھروں سے آجاتا تھا۔ ملازمین دستر خوان پر تہذیب و آداب ملحوظ رکھتے ہوئے کھانا سامنے لگاتے اور یہ خیال رکھتے تھے کہ غذائیں مناسب طور پر گرم رہیں۔ وہاں بھی ساتھ کھانے والے موجود ہوتے، شریک طعام ہو جاتے تھے۔ البتہ یہ فرق رہتا کہ گھر کی طرح کچہری کا دستر خوان وسیع نہیں ہوتا تھا۔ کھانے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی اور غذاؤں میں بھی تنوع اور کثرت نہیں رہتی تھی۔ اسی انداز سے اونچے دوکاندار جن کا شمار شرفائے لکھنؤ میں تھا، اپنی اپنی دوکانوں میں دوپہر کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ گھروں میں بیویاں اپنے شوہر کے لیے دستر خوان بچھاتی یا ماما سے بچھواتی تھیں۔ دستر خوان تختوں کے چوکے پر جن کا ہر گھر میں رہنا ضروری تھا، بچھایا جاتا تھا۔ اسی تخت سے قریب ایک چوکی پر لوٹوں میں پانی اور بیسن دانی میں بیسن بھرا رکھا رہتا تھا۔ چوکی سے متصل طشت یا سلفچی یا آفتابہ جس پر تھوڑی گھاس دھری رہتی، رکھا رہتا تھا۔ بعض گھروں میں یہ ظرف دستر خوان کے تخت سے متصل رہتا اور ملازمہ لوٹا لے کر ہاتھ دھلاتی تھی۔ دستر خوان بچھ جانے اور کھانا لگ جانے کے بعد ہاتھ دھوئے جاتے اور خاندان کے سب لوگ بسم اللہ کہہ کر ایک ایک کر کے بیٹھ جاتے لیکن بزرگِ خاندان پہلے بیٹھتا تھا، اُس کے بیٹھنے کے قبل کسی کا بھی بیٹھ جانا بدتہذیبی میں شمار ہوتا تھا۔ عام طور سے بیوی بچے شریک طعام رہتے تھے۔ بچوں کی تعداد بڑھ جانے پر ایک ساتھ کھانا کھانے کے دستور میں پابندی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن زن و شوہر کا ایک ساتھ کھانا کھانا ضروری ہوتا تھا۔ اِس اشتراک میں صرف اُس وقت فرق آجاتا تھا جب گھر میں کچھ مہمان آجاتے تھے۔ ایسی صورت میں عورتیں عورتوں کے ساتھ اور مرد مردوں کے ہمراہ علیحدہ علیحدہ کھانا کھاتے تھے۔ عورتوں کا مردوں کے ہمراہ یا مردوں کا مہمان عورتوں کے ساتھ

کھانا کھانا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ البتہ خون کے رشتہ سے قریب ترین عزیزوں کے ساتھ ان اصولوں میں سختی کے ساتھ پابندی نہیں ہوتی تھی۔ دستر خوان پر گھر والے ہی کیوں نہ شریک طعام ہوں، آدابِ دستر خوان کی پابندی ضروری ہوتی تھی۔ زور سے ہنسنا، زور سے آواز بلند کرنا یا زیادہ باتیں کرنا خلافِ تہذیب تھا۔ کھانا آہستہ آہستہ کھانا اور خاموشی سے نوالے چبانا شرافت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ پیٹ بھر جانے کے بعد بھی جب تک تمام حاضرین فراغت نہ کرلیں دستر خوان سے اُٹھ جانا بدتمیزی تھی۔ سب کا ساتھ اُٹھنا اور مالک خانہ پر سبقت نہ کرنا آئین میں داخل تھا۔ بعد فراغت حسب مراتب جن کا تعین عمر کی مدت پر ہوتا تھا یکے بعد دیگرے لوٹوں والی چوکی پر شرکا دستر خوان ہاتھ دھوتے تھے۔ دونوں وقت دستر خوان بچھنے اور کھانا کھانے کا یہی دستور تھا جس میں معقول وقت صرف ہوجایا کرتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد، خواہ وہ گھر کا روزمرّہ والا کھانا ہو یا مخصوص دعوتوں کا، ہر موقع نیز ہر محل پر لکھنؤ کی معاشرت میں پان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، یہاں تک کہ گلوری پیش کرنا ہر چھوٹی بڑی تواضع میں ضروری تھا۔ یوں بھی لوگ دن بھر پان کھایا کرتے تھے اور یہ مصرع ضرب المثل بن گیا تھا کہ

برگ سبز است تحفۂ درویش

اس برگِ سبز پر ہر خاص و عام کی توجہ تھی۔ دعوتوں اور ضیافتوں میں پان کی گلوریاں چاندی کے ورق میں ملفوف کرکے پیش کی جاتی تھیں لیکن ذائقہ اور لذت کے اعتبار سے وہی پان اعلیٰ درجہ کے ہوتے تھے جو پان کے قدردانوں کے یہاں بنا کرتے تھے۔ رئیسوں کی نفاستِ طبع اور لطافتِ مزاج نے پان تیار کرنے، پان کے اجزا ترکیبی میں لذت و جمال پیدا کرنے، پان بنانے اور پان کھانے کو فن اور ہنر کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔

جہاں تک پان کے پتّے کا تعلق تھا لکھنؤ والوں کو ہمیشہ دیسی دسوری پان مرغوب رہا ہے مگر اُس زمانہ میں ان پتّوں پر ریاض کرکے اُن کو لذیذ، نفیس اور خوش رنگ بنایا جاتا تھا۔ بالو کی تہ میں پان کے پتّے رکھ دیے جاتے تھے اور اوپر سے پانی چھڑکا جاتا تھا۔ پان دوسرے تیسرے دن اُلٹ دیے جاتے تھے پھر بھی کثیر تعداد میں سڑ جاتے تھے۔ بالآخر جو پان تیار ہو کر نکلتے وہ پستئی رنگ کے ہوجاتے تھے اسی لیے اُن کو پستئی پان کہتے تھے۔

اُن کی لطافت کا یہ عالم ہوجاتا تھا کہ گلوری منہ میں رکھ کر زیادہ کچلنے یا چبانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور ذائقہ بھی بہت عمدہ ہوتا تھا۔ اچھے پستئی پانوں کی متعدد دوکانیں چوک اور دوسرے مختلف مقامات پر تھیں۔ آخری دور میں بہت اچھے پستئی پان محلہ وزیر گنج کی اُس دوکان پر ملتے تھے جو اب اقبال منزل کی عمارت کے نیچے واقع ہے۔ وہ پان بہر حال مفقود ہیں۔ نہ کھانے والے رہے اور نہ بنانے والے

پان کے اجزائے ترکیبی میں کتھہ، چونا، ڈلی، الائچی اور تمباکو شامل ہیں۔ پرانے شہریوں کے مذاقِ سلیم نے اِن اجزا کے علاوہ اور کسی چیز کا پان میں استعمال کبھی پسند نہیں کیا۔ البتہ اِن میں کی ہر چیز پر توجہ کی جاتی تھی اور ان میں کی ہر چیز گھروں ہی میں تیار ہوتی تھی۔ کتھہ خوب گنٹوا کے بھگویا جاتا اور جوش دے کر چھان کے راکھ کے ایک مسطح اور زمین سے قدرے بلند ڈھیر پر ایک دبیز کپڑے پر پھیلا دیا جاتا تھا۔ تاکہ آہستہ آہستہ راکھ میں پانی جذب ہو کر کتھہ خشک ہوجائے۔ یہ عمل سایہ میں ہوتا تھا اور دھوپ سے بچانے کی فکر رہتی تھی کیوں کہ دھوپ میں سیاہی آجاتی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے روز عرق کیوڑہ اوپر سے چھڑکا جاتا تھا۔ دس بارہ روز کے بعد کتھہ خشک ہو کر اس قابل ہوجاتا تھا کہ اُس کی لوذین تراش لی جائیں، ان لوذوں کو کسی ایسے بانس کے برتن میں جس میں نیچے سے ہوا آسکے بچھا دیا جاتا تھا اور اب پوری طرح سایہ میں خشک کرلیا جاتا تھا۔ عندالضرورت دو چار ٹکڑے پاندان کی کلھیا میں توڑ کے ڈال دیے جاتے اور پانی میں شامل کر کے پان میں لگانے کے قابل بنالیا جاتا تھا۔ یہ کتھہ سفیدی مائل اور خوشبو دار ہوتا تھا۔ چونا پانی میں ڈال کر ٹھنڈا کرلینا بہت سہل کام ہے۔ آج بھی یہی طریقہ رائج ہے لیکن اُس زمانہ میں چونا تیار کرنا بھی سہل کام نہیں تھا۔ رئیسوں کے یہاں چھوٹے چھوٹے موتیوں کا چھنا ہوا اور حل کیا ہوا سفوف چونے میں شامل کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض گھروں میں سیپ کا چونا بنایا جاتا تھا جس میں اصل چونے کا جزو کم اور پسی ہوتی اور چھنی ہوئی باریک سیپ زیادہ ہوتی تھی۔ اس قسم کا چونا کثرت سے رائج تھا کیوں کہ قیمتی نہیں ہوتا تھا البتہ بڑی محنت سے تیار ہوتا تھا۔ ڈلی کترنا بھی ایک دقیق ہنر تھا۔ رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اس کام کے لیے فن کار عورتیں ملازم رہتی تھیں۔ شرفا کے یہاں اُن کی بہو بیٹیاں اس ہنر میں کمال حاصل کرلیتی تھیں۔ ہر ڈلی کے چار ٹکڑے کر کے پہلے اندر کا گودا

اور باہر کے چھلکے کا سخت حصہ دور کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ڈلی کے ٹکڑوں کو دھوپ میں خشک کر کے باجرے کے دانوں کی طرح کاٹا جاتا تھا۔ فن کاری کا یہ تقاضا تھا کہ سب ٹکڑے برابر کے ہوں اور ایک ہی وضع قطع کے نظر آئیں۔ پان میں ڈالنے کے لیے الائچیوں کو چھیل کر دانے نکال لیے جاتے تھے اور اُن کو پاندان کی کسی ڈبیا میں اس طرح محفوظ کیا جاتا تھا کہ نم ہوا یا تری سرایت نہ کر سکے۔ سفید الائچی پسند کی جاتی تھی۔ عہدِ قدیم میں ہری الائچی کا چلن نہیں تھا۔ تمباکو پتی کا استعمال ہو یا قوام کا لیکن وہ بھی گھروں ہی میں تیار ہوتا تھا۔ پرانے زمانہ میں بازار کا تمباکو معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ ہر رئیس کے گھر میں تمباکو بنانے کے علیحدہ علیحدہ نسخے تھے اور ہر جگہ کا الگ الگ ذائقہ تھا۔

پان بنانے کا بھی ایک اسلوب تھا جو اپنی اپنی پسند کے تحت گلوری کی خوب صورتی اور اُس کی لذت اور خوشبو کا ضامن ہوتا تھا۔ یہ اسلوب پان کے اجزائے ترکیبی کو مخصوص مناسبت سے استعمال کرنے پر محمول ہوتا تھا۔ ہر گھر میں وہی اجزا استعمال ہوتے تھے۔ لیکن ذائقوں میں نمایاں فرق ہوتا تھا۔ راقم کو ہر امیر اور قریب ہر رئیس نیز تمام ممتاز شرفا و عمائدین کے یہاں پان کھانے کا اتفاق ہوا تھا لیکن چودھرائن، شیخ علی عباس، حکیم صاحب عالم اور مرزا محمد صادق علی خاں کے یہاں کی ایسی گلوریاں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ چودھرائن، بہر حال طوائف تھیں۔ اُن کے پیشہ کے لوازمات میں پان بنانے کا فن داخل تھا۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے روسا اور مقتدر شرفا اُن کے یہاں سے فرمائش کر کے پان منگوایا کرتے تھے۔ اس لیے اُن کو اس فن میں کمال حاصل ہونا ضروری ہی تھا۔ البتہ دوسرے تین حضرات کے یہاں کی گلوریاں خود انھیں کے مذاقِ سلیم کی مرہونِ منّت ہوتی تھیں۔ شیخ علی عباس کے یہاں چونا بنانے کی ترکیب ذائقہ اور رائحہ پیدا کرنے کی ذمہ دار تھی۔ حکیم صاحب عالم کے یہاں ڈلی کی قلت اور الائچی کے دانوں کی کثرت مزا پیدا کرتی تھی۔ مزید برآں صرف ایک پان کی گلوری اُن کے یہاں بنتی تھی۔ اس لیے جتنی دیر وہاں بیٹھیے پان پر پان کھانے کو دل بے قرار رہتا تھا۔ مرزا بہادر کے یہاں گلوری جسامت میں بڑی ہوتی تھی۔ کئی پانوں کی گلوری بنتی تھی لیکن اس طرح کہ کتھہ چونا کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی اور گلوری کو جہاں سے بھی دانتوں میں دبایئے ڈلی کا ٹکڑا ضرور موجود رہتا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت خیز بات یہ تھی کہ گلوری کو کسی چیز پر گھسیٹ کے

مار دیا جاتا تو بنا ہوا پان پاش پاش ہو جاتا تھا لیکن جس جگہ پان موڑ کے گلوری بنائی جاتی وہ مقام کبھی نہیں کھلتا تھا۔

لوگوں کے انداز بھی پان کھانے میں مختلف تھے۔ بکثرت رئیس گلوری منہ میں رکھ لیتے، بہت دیر تک گال میں دبائے رکھتے، کچھ عرق معدہ تک پہنچ جاتا پھر اُس کو بجنسہ تھوک کے دوسری گلوری منہ میں دبا لیتے تھے۔ انھوں نے شاید ہی کبھی پان صحیح معنوں میں کھایا ہو، بعض رئیس تھوڑی دیر تک گلوری چباتے، جتنا کھا پاتے کھا لیتے اور باقی منہ سے خارج کر دیتے تھے۔ نفیس طبع رئیسوں میں بہت کم ایسے تھے جو پوری گلوری کھا لیتے ہوں۔ کہا جاتا تھا کہ پان کی گلوری منہ کا مزا بدلنے کے لیے کھانا چاہیے نہ کہ بکری کی طرح پتے چبا کر معدہ بھر لینے کے واسطے۔ ہر رئیس کے قریب اور تقریباً ہر شریف کے گھر میں مخصوص جگہ پر اُگالدان رہتا تھا جس کا مصرف ہی یہ تھا کہ اسی میں پان تھوکا جائے۔ ہر رئیس کے اُگالدان پر رومال ڈھکا رہتا تھا۔ پان تھوکتے وقت یہی رومال منہ کے سامنے رکھ لیا جاتا تھا تاکہ کوئی دوسرا اس حرکت کو دیکھ نہ لے۔ کسی کے سامنے تھوکنا یا اُگالدان میں پان اُگل دینا، مذموم تھا۔ یہاں تک کہ پان کی پیک تھوکنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ تمباکو علیحدہ سے کھائی جاتی تھی اس لیے مقدار میں زیادتی کا کوئی موقع ہی کبھی نہیں آتا تھا لیکن اگر سہواً تمباکو زیادہ کھا لی گئی یا کسی اور وجہ سے منہ میں گلوری کا لعاب ناقابلِ قبول ہو جاتا تو پورا پان اُگالدان میں تھوک دیا جاتا تھا۔ پان چبانے اور کھانے کے طرز میں لازمی تھا کہ جبڑوں کی حرکت نمایاں اور تیز تر نہ ہو اور نہ ہونٹوں سے کسی قسم کی کوئی آواز نکلے۔ رئیسوں کی محفل میں یہ التزام شرافت و تہذیب کے حدود میں داخل تھا اور عام طور سے لوگ اس طرز پر عادتاً عامل تھے۔ مستورات کے لبوں پر پان کی ہلکی سرخی آجانا اُن کے حسن و جمال میں اضافہ کا باعث تھا۔ لیکن سرخی میں اتنی فراوانی کہ ہونٹوں پر دھڑی جم جائے شدید ترین عیب تھا۔ مرد بہت پان کھاتے تھے لیکن اپنے دانتوں اور ہونٹوں کو سرخی سے پاک رکھنا ہی پسند کرتے تھے۔ بعض امیروں اور رئیسوں کو عورتوں کی طرح دانتوں اور ہونٹوں میں مسّی ملنے کا شوق تھا لیکن انھوں نے بھی کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ

مسّی آلودہ لب پر رنگ پان ہے

# (۴) ذریعۂ معاش

امرا و روسا کی قربت کے سبب سے شرفائے لکھنؤ اُن کے طرزِ معاشرت سے اتنے زیادہ متاثر تھے کہ خود اُن میں اپنی برتری کا احساس شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔ محنت و مشقت کو وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنا اُن کے لیے باعثِ ننگ تھا، کاروباری زندگی کو اپنی منقصت جانتے تھے۔ بعض لوگوں نے اپنے بعض مخصوص کمزور حالات کے تحت ہمت کر کے کچھ دوکانیں کھول لی تھیں لیکن وہ اتنے بڑے پیمانے پر کھول لی گئی تھیں جن کو چلانا اور پرانے دوکانداروں سے مقابلہ کرنا ناتجربہ کار آدمیوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا رفتہ رفتہ وہ سب دوکانیں ختم ہو گئیں اور انجامِ کار خسارہ ہی رہا۔ صنعتی فن کاریوں میں چکن و کامدانی و کارچوب کا کام تھا یا پھر تانبے، پیتل، لوہے اور مٹی وغیرہ کی برتن سازی تھی۔ اول تو یہ تمام کاروبار مخصوص طبقوں کے ہاتھ میں تھا جن سے شرفا کے مزاج و مذاق کو کوئی ربط ہو ہی نہیں سکتا تھا، دوسرے یہ کہ ان طبقوں کے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کر لینے کے بعد روسا و امرا سے سارے روابط منقطع ہو جانا یقینی تھا جس صورتِ حال کو یہ لوگ کسی طرح برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہی بلند پایہ ہستیاں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کی علمبردار تھیں اور شرفا اُس کلچر کو کلیجے سے اس طرح لگائے ہوئے تھے کہ اُس کو کسی حد تک بھی چھوڑ دینا اُن کو گوارا نہ تھا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس زمانہ میں کسبِ معاش کے وسائل بہت محدود تھے۔ کاروباری زندگی کے مشاغل بہت کم تھے اور وہ دوسرے طبقات کے تصرف میں تھے۔ اس طرح شرفائے لکھنؤ کے لیے صرف شعر و ادب یا طب یا وکالت یا ملازمت کے دروازے کھلے ہوئے تھے اُس زمانہ کے معیارِ تعلیم کے تحت یہ لوگ تعلیم یافتہ کہلانے کے مستحق بھی تھے لہٰذا انھیں میدانوں میں وہ گامزن ہوئے اور ترقیاں بھی کی تھیں۔ لیکن وکالت کے علاوہ ہر دوسرے پیشہ میں ملازمت ہی آخری سہارا دیتی تھی۔ شعر و ادب یا طب کے دلدادہ بھی ملازمت کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ بہت کم ایسے طبیب تھے جو آزاد رہ کر خاطر خواہ حصولِ معاش کر سکتے ہوں اور صنفِ شعرا میں لوگوں کے لیے، مدرسی کے علاوہ اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ سرکاری ملازمتوں کی تعداد بھی بہت کم تھی لیکن اُن کا حصول دشوار نہیں تھا۔ جو بھی انگریزی اسکول

سے آٹھواں درجہ جو مڈل کلاس کہلاتا تھا پاس کر لیا، تعلیم یافتہ قرار پا کر کسی نہ کسی سرکاری محکمہ میں برسرِ کار لگ جاتا تھا۔ اس سہولت کے باوجود شرفا کی بہت بڑی اکثریت کسی نہ کسی رئیس کے دامنِ دولت سے منسلک رہتی تھی۔ ان رئیسوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی لیکن کسی کے یہاں ملازمت کے لیے کسی خاص مذہب و ملت کا پابند ہونا ضروری نہیں تھا۔ بلا تفریقِ مذہب و ملت ملازمت مل جاتی تھی۔ ان ملازمتوں میں عہدے اور منصب کے اعتبار سے تقسیم اقتدار تھا اور اسی تناسب سے ملازمین کو مشاہرے ملتے تھے شعرا اور اطبا بھی ملازم رکھے جاتے تھے لیکن اُن کا بہت زیادہ احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا اور اُن کے ساتھ مخصوص رکھ رکھاؤ برتا جاتا تھا۔ روسا کے مقربین خاص میں بڑی تعداد ایسے شرفا کی ہوتی تھی جو مصاحبین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے لیکن اُن کو رئیس کی مزاج داری میں دخل ہوتا تھا اور رئیس بھی اُن پر اعتماد رکھتا، اپنے نجی معاملات میں اُن سے مشورہ لیتا اور اُن کی دل جوئی اور خاطر جمعی کا خود ہی خیال رکھتا تھا۔ انھیں مصاحبین میں بعض بلند پایہ شاعر، فن کار اور طبیب بھی شامل تھے۔

مقربین اور مصاحبین کے علاوہ جن کے مشاہرے رئیس کی مرضی پر منحصر تھے، ملازمین کی تنخواہیں اُن کے عہدوں اور مناصب کے اعتبار سے معین ہوتی تھیں۔ عموماً پانچ روپیہ ماہوار سے سو روپیہ تک کا تعین ہوتا تھا۔ قلیل تنخواہ دار کبھی کبھی دو دو یا اس سے بھی زیادہ ڈیوڑھیوں سے منسلک رہتے تھے۔ اُن کی خدمت گزاری کے ہر ہر جگہ علیحدہ علیحدہ وقت مقرر رہتے تھے۔ تنخواہوں کے علاوہ ملازمین پر اُن کے آقاؤں کے مراعات بھی برابر ہوا کرتے تھے۔ اسی مجموعی یافت کے سہارے اور بے انتہا ارزانی کی برکتوں سے شرفائے لکھنؤ کی گزر بسر بلا کسی شدید زحمت کے ہو جایا کرتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی خوش سلیقگی سے وہ جب گھر سے نکلتے تو سفید پوش ہی رہتے تھے۔ تہذیب و شائستگی اُن کا وطیرہ تھا اور اس تہذیب و شائستگی کا اہم عنصر توکل اور پیدا کرنے والے پر اعتماد و بھروسہ تھا۔ اسی توکل اور خدا پرستی کی بدولت وہ اپنی اچھی یا بُری حالت پر صبر و شکر کر کے زندگی گزارے گئے لیکن رشک و حسد، طمعِ زر، دل تنگی و بے حوصلگی اور اسی قسم کے تمام دوسرے مصائب سے اپنا دامن بچائے رہے۔ اسی قناعت کوشی کے مسلک پر سختی کے ساتھ کار بند ہونے کے باعث اُن کو بظاہر کوئی روحانی یا جسمانی اذیت متاثر نہیں کر سکی۔ خندہ پیشانی سے زندگی گزاری اور اطمینان کے ساتھ دنیا کو خیرباد کہا۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ زمانے والے اُن کو بے حس اور

لاپرواہ قرار دیں لیکن زندگی کی معصوم مسرتوں سے وہی فیضیاب تھے اور اپنی بے تحاشا حوصلہ مندی کے سبب سے آج ہم اُن نعمتوں سے محروم ہیں۔

# (۵) امرا و شرفا کی مشترک خصوصیات

امرا اور شرفا میں مالی اعتبار سے نمایاں فرق ہونے کے باوصف ان کے ذوق اور مذاق میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت تھی۔ بہت سی خصوصیات، مثلاً شستگی، شائستگی تہذیب، اخلاق، انسان دوستی، عالی ہمتی اور شرافتِ نفس، ان دونوں طبقوں میں مماثل اور مشترک تھے۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ انھیں خصائلِ حمیدہ کی بدولت لکھنؤ کی پرانی معاشرت کو شہرتِ دوام کا شرف حاصل ہوا اور جس کی کوئی نظیر ہندوستان تو درکنار دنیا کے کسی ملک میں پیش نہیں ہو سکی۔ اس شہر میں امیر ہوں یا غریب سب ہی کو دوسروں کے احساسات کا لحاظ رہتا تھا اور کوئی بھی کسی کو خواہ وہ مقابلتاً کم حیثیت ہی کیوں نہ ہو، شکایت کا موقع عمداً نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ رکھ رکھاؤ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو سہل معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقتاً بہت مشکل امر تھا کیوں کہ وہ دور نازک مزاجیوں کا تھا۔ قریب قریب ہر شہری نازک مزاج تھا، اس لیے امرا ہوں یا شرفا سب اپنی ملاقاتوں میں تہذیب و ادب کے تمام پہلو ملحوظ رکھتے تھے۔ اُن کے یہاں ملاقات کے لیے کوئی دوست عزیز یا کوئی اور معزز شہری آجاتا تو اُسی کے شایانِ شان خیر مقدم ہوتا تھا۔

رئیسوں کے درباروں میں مستقل آنے والوں کو کوئی نہ کوئی معینہ شرف حاصل رہتا تھا لیکن مخصوص لوگوں میں کسی کی آمد پر روسا اپنی جگہ سے کچھ بلند ہو کر، کسی کے واسطے نصف قامت سے کھڑے ہو کر اور بعض عمائدین کے لیے سروقد آداب تکریم بجالاتے تھے۔ شرفا کے یہاں اُن کے عزیز، دوست اور دوسرے لوگ ملنے کے لیے برابر آیا کرتے تھے۔ اِن مواقع پر بھی بجنسہ اُسی ادب و تہذیب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی تقریب وغیرہ کے موقع پر شرفا کے یہاں کوئی بلند پایہ رئیس آجاتا تو وہ گھروں سے باہر نکل کر اُس کا استقبال کرتے تھے۔ شہزادگان بالخصوص وہ صاحبانِ عزت و جلال جن کا سلسلۂ نسب براہ راست شاہانِ اودھ سے ملتا تھا۔ اور زیادہ تعظیم و تکریم کے مستحق تھے۔ اُن کے لیے احترام کے آداب و رسوم بھی مخصوص تھے جن کو بڑے سے بڑا رئیس بخوشی خاطر بجالاتا

اور اس بجاآوری میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے، جو اُس زمانہ سے متعلق ہے جب ہمارا پرانا کلچر دم توڑ رہا تھا اور نئی قدریں پرانی عمارتوں کو مسمار کر کے اپنے لیے نیا مقام تعمیر کرنے پر آمادہ ہو چکی تھیں۔

جانِ عالم واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے پرنس افسر الملوک انتزاعِ سلطنت کے بعد پہلی اور آخری مرتبہ لکھنؤ تشریف لاتے تھے۔ اُن کی آمد کی خبر سُن کر سارا شہر اشتیاقِ دید میں اُبل پڑا تھا، بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں جن میں روسا وعمائدین کے علاوہ اعلیٰ سرکاری عہدے دار اور ہائی کورٹ کے جج بھی شامل تھے اُن کے استقبال کے لیے بغیر کسی دعوت یا خواستگاری کے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ پلیٹ فارم پر پنجاب میل کے آتے ہی راجہ محمد امیر احمد خاں مرحوم والی محمود آباد نے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور مودّبانہ جھک کر سات مرتبہ تسلیمیں کیں۔ پھر پرنس بہادر کے ہمراہِ رکاب محمود آباد ہاؤس قیصر باغ گئے۔ وہاں پہنچ کر بالاخانہ پر ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں پرنس کو کچھ وقفے کے لیے سکون حاصل کرنا تھا۔ یہاں ایک مزین صوفے پر پرنس تشریف فرما ہوتے۔ اس صوفے سے متصل دونوں جانب بہت سی کرسیاں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں لیکن اُن پر کوئی رئیس یا بزرگ نہیں بیٹھا۔ زمین پر دری اور قالین کا فرش تھا۔ اسی فرش پر لکھنؤ کے بڑے بڑے رئیس، ممتاز معززین، افسرانِ اعلیٰ، ہائی کورٹ کے جج اور خود راجہ صاحب محمود آباد بھی بیٹھے اور اسی کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ یہ تھا وہ استقبال اور وہ اکرام جو سابق بادشاہ کے فرزند کو پیش کیا گیا تھا۔ راقم نے کلکتہ میں انھیں راجہ صاحب کے والد بزرگوار مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں مرحوم کو بھی بجنسہ اسی طرح پرنس افسر الملوک کا احترام کرتے دیکھا تھا۔ انھوں نے بھی سات تسلیمیں بجا لاکر زمین کے فرش ہی پر بیٹھ جانا پسند فرمایا تھا اور پرنس کے حضور یا برابر کسی کرسی پر بیٹھنے کی جسارت نہیں فرمائی تھی۔

یہ واقعہ بہر حال سب سے زیادہ جلیل القدر شخصیت سے متعلق تھا لیکن ادب و تہذیب لکھنؤ والوں کے خمیر میں شامل تھے۔ وہ حسبِ مراتب دوسروں کا احترام کرتے اور ملاقات ہوتے ہی مراسمِ سلام بجا لاتے تھے۔ اودھ کے حکمراں عقیدتاً مسلمان اور نسلاً ایرانی تھے لیکن جس تہذیب و معاشرت کی انھوں نے تعمیر کی تھی وہ نہ عربی تھی اور

تہ ایرانی۔ اُس کو ہم خالص لکھنؤ کلچر ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرے مسلمان ملکوں نیز ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں مسلمان "السّلامُ علیکم" یا "سلام علیکم" کہہ کر ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ لکھنؤ میں خود اپنی زبان میں سلام کرنے کا چلن رائج ہوا اور اس سلام کے لیے متعدد الفاظ وضع کیے گئے۔ یعنی "آداب"۔ "تسلیم"۔ "تسلیمات"۔ "بندگی"۔ "کورنش"۔ "مجرا"۔ یہ الفاظ "عرض ہے" یا "بجالاتا ہوں" کے ساتھ مستعمل تھے۔ اول الذکر تینوں الفاظ اب تک رائج ہیں۔ باقی طور طریقے متروک ہو گئے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ ہی ختم ہو گیا جہاں ہر ہر موقع اور محل پر علیحدہ علیحدہ طرز سے سلام کرنے کا رواج تھا مثلاً یہ کہ "کورنش" ادبی صحبتوں اور مشاعروں میں داد پانے پر شعرا اور ادیب بجالاتے تھے۔ "مجرا" عرض کرنے کی اصطلاح رئیسوں کے درباروں میں مستعمل تھی۔ "بندگی" بھی ملازمین اپنے آقاؤں کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ سلام کرنے میں بھی مراتب کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور ان مدارج کا تعین دولت و ثروت کی فراوانی، علم و فضل میں کمال اور بسا اوقات پاکبازی کے ساتھ کبر سنی کی بنیادوں پر ہوا کرتا تھا، یہی طور طریقے جوابِ سلام کے بھی تھے۔ شرعاً نیز اخلاقاً جوابِ سلام واجب ہے۔ لکھنؤ والے بھی جوابِ سلام میں تامل نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے رئیس اپنے چھوٹے سے چھوٹے درجہ کے ملازم کو بھی اُس کے مؤدبانہ آداب و تسلیمات کا جواب دست بہ سر ہو کر اور زبان سے "سلام، سلام" کہہ کر دیا کرتے تھے۔ اپنے سے عمر میں چھوٹوں کو اُن کے سلام کا جواب دعاؤں کے الفاظ میں دیا جاتا تھا۔ مثلاً "زندہ رہو" "سلامت رہو" "خوش رہو" "عمر دراز ہو" "صاحبِ اقبال ہو"۔

ہر ملاقات میں سلام کے بعد مزاج پرسی بھی تہذیب میں داخل تھی۔ اس مزاج پرسی کے لیے بھی کوئی ایک لفظ یا ایک اصطلاح متعین نہیں تھی بلکہ متعدد فقرے رائج تھے۔ مثلاً "مزاجِ شریف" "مزاجِ مبارک" "مزاجِ اقدس" "مزاجِ عالی" "مزاجِ مقدّس" "مزاجِ معلّیٰ" "مزاجِ گرامی" وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سب کے استعمال کے لیے علیحدہ علیحدہ مراتب تھے۔ شرفا بے تکلف دوستوں سے "مزاجِ شریف" یا "مزاجِ مبارک" کہتے تھے۔ رئیسوں سے اُن کے درباروں میں "مزاجِ مقدّس" یا

"مزاجِ گرامی" یا "مزاجِ عالی" کہہ کر مزاج پُرسی ہوتی تھی۔ علما کرام کے حضور "مزاجِ عالی" یا "مزاجِ معلّی" مستعمل تھا۔ امرا و روسا بھی اپنے مقربین، مصاحبین اور ملازمین کی مزاج پُرسی کرتے تھے۔ اُن کا انداز یہ تھا۔ "کہیے سب خیریت ہے"، "مزاج اچھا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ معاشرت میں اس تمام رکھ رکھاؤ کی بدولت ایک طرف تو ہماری پرانی تہذیب نکھر رہی تھی تو دوسری طرف اُردو زبان پر صیقل ہو رہی تھی اور اُس کے خزینے میں بیش بہا الفاظ و فقرات سے اضافہ ہوتا رہتا تھا اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ایک ہی موقع و محل پر استعمال ہونے والے الفاظ کی، صرف مراتب کی بنیاد پر امتیازی تقسیم میں بہتات کا شرف اُردو زبان کے علاوہ اور کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہوا۔ استخبارِ مزاج کا جواب بھی فرضِ عین ہوتا تھا لیکن اس موقع پر جواب دینے والے کو عجز و انکسار سے کام لینا پڑتا ہے لہٰذا جواب میں صرف یہ کہا جاتا تھا کہ "شکر ہے"، "اچھا ہوں"، "الحمدللہ"، "آپ کی عنایت"، "خیریت ہے" وغیرہ وغیرہ۔ پہلا فقرہ امرا و روسا خاموشی سے گردن جھکا کر اپنے ملازمین وغیرہ کی مزاج پرسی کے جواب میں فرما دیتے تھے۔ دوسرا فقرہ بے تکلف دوستوں میں رائج تھا۔ تیسرا عام طور پر مستعمل تھا۔ باقی دونوں اور کچھ اور فقرے شرفا موقع و محل سے جواب میں کہا کرتے تھے۔

طرزِ تکلم اور آدابِ نشست و برخاست کا تذکرہ بھی اسی مقام پر ضروری ہے۔ امرا و شرفا اپنے طرزِ تکلم میں شستگی و شایستگی کے ساتھ مخاطب کے مدارج اور اُس سے اپنے روابط کا خیال رکھتے اور ادب و تہذیب کے تمام فروعات ملحوظ رکھتے تھے۔ بڑے سے بڑا رئیس اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم سے "تو" کر کے بات نہیں کرتا تھا۔ مخصوص ملازمین میں کسی سے اگر کبھی "تم" کہہ کر بات کر لی تو اُس کو کسی مخصوص قدر دانی یا مہربانی کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ اُمرا و شرفا اپنے روزمرّہ میں ہر آدمی سے، خواہ وہ کم درجہ ہی کا کیوں نہ ہو "آپ" کر کے بات کرتے تھے۔ اپنی جوان اولاد اور دیگر عزیزوں سے جو رشتے میں چھوٹے ہوتے "آپ" ہی کہہ کر تخاطب کرتے تھے۔ روسا و امرا و زعما کے درباروں نیز شرفا کی خاص صحبتوں میں ہمیشہ احتراماً مکالمہ ہوتا اور بغیر کسی مخصوص تعظیمی لفظ یا فقرہ کو زبان سے ادا کیے تخاطب نہیں ہوتا تھا۔ ایسے الفاظ یا فقرے۔ "جناب"، "جنابِ عالی"، "جنابِ والا"، "قبلہ"، "قبلہ و کعبہ"، "حضرت"، "سرکار"، "حضور"، "حضورِ والا"، "حضرت والا"، "حضورِ عالی"

وغیرہ مستعمل تھے لیکن عام طور سے اُن کا محلِ استعمال جدا جدا تھا۔ مثلاً "قبلہ" اور "قبلہ وکعبہ" صاحبانِ علم اور علمائے کرام کے لیے مخصوص تھا۔ "قبلہ" عموماً والد بزرگوار یا کسی دوسرے رشتہ کے بزرگ کو کہتے تھے۔ "حضور" "سرکار" "حضور والا" "حضور عالی" کہہ کر اپنے آقائے ولی نعمت کو مخاطب کرتے تھے۔ ان مواقع پر محلِ استعمال کے اعتبار سے اور بہت سے دوسرے فقرات بھی رائج تھے مثلاً "عالی مرتبت" "ولیِ نعمت" "فیض گنجور" وغیرہ وغیرہ۔ "جناب" "جنابِ عالی" اور "جنابِ والا" علیٰ قدر مراتب احباب واعزا کے لیے تخاطب میں مخصوص فقرات تھے۔ لکھنؤ والوں کو پاسِ ادب کا اتنا خیال رہتا تھا کہ اجنبی آدمیوں سے بھی "آپ" اور "جناب" کے بغیر بات نہیں کرتے تھے۔

جلیل القدر رئیسوں کے درباروں میں مستقل آنے والوں کے لیے بیٹھنے کی جگہ متعین تھی شرفا کی نشست گاہوں میں بھی آنے والے وضعداریوں کے تحت اپنی اپنی جگہ اختیار کر لیتے تھے۔ صاحبِ دربار یا مالک خانہ صدر مقام پر بیٹھتا تھا۔ درباروں میں رئیس کے داہنی جانب دوست احباب اور ہم عصر روسا تشریف فرما ہوتے اور بائیں جانب مقربین و ملازمین اور صاحبان حاجت بیٹھا کرتے تھے۔ رئیس سے کسی کو کوئی بات راز میں کہنا ہوتی یا کسی خاص موضوع پر گفتگو کرنا ہوتی تو وہ باجازت سامنے آجاتا اور بالمقابل بیٹھ کر گفتگو کرتا تھا۔ شرفا کے یہاں ایسی کوئی امتیازی شان نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ہر بزم میں زور سے بات کرنا یا دوسرے کی آواز پر جواب میں اپنی آواز بلند کر دینا آدابِ محفل کے منافی تھا۔ نشست میں بھی مراتب ملحوظ رکھنا بہت زیادہ ضروری تھا۔ یہ مراتب عہدہ ومنصب، ثروت و وقار اور عمر میں خوردی و بزرگی کے تناسب سے پرکھے جاتے تھے۔ انھیں مدارج کی بنا پر پیش وپس کی تفریق ہوتی تھی۔ کم سن لوگوں کا بزرگوں کے برابر، آگے یا اُن کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا شدت کے ساتھ ناقابلِ عفو گناہ تھا یہ ایسی تقصیر تھی جس پر خطا کار کو خفگی و ناراضگی کی سزا بھی بھگتنا پڑتی تھی۔ آدابِ نشست و برخاست میں یہ بھی ضروری تھا کہ جو جس طرح اگر بیٹھا ہے اسی طرح بیٹھا رہے۔ کسی خاص مجبوری میں اور معذرت خواہی کے ساتھ پہلو بدلا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اجازت لیے بغیر بزم سے اُٹھ جانا بہت معیوب تھا۔ آمد و رفت میں یا کسی فعل و عمل کے وقت ایک کا دوسرے پر پیش قدمی کرنا بھی خلافِ تہذیب تھا اور برابر والوں سے بھی یہی رکھ رکھاؤ برتا جاتا تھا۔

چنانچہ ایسے مواقع پر "پہلے آپ" "پہلے آپ" کہنے کا افسانہ زبان زدِ خلائق ہے۔ زمانہ کی گرم رفتاری نے رنگ بدلا تو "پہلے آپ" "پہلے آپ" کا فقرہ مقامِ طنز و مزاح میں باقی رہ گیا لیکن تہذیب و شرافت کی وہ حسین و دل کش عمارت جو اس کے پسِ پشت تعمیر تھی مسمار ہو گئی۔

امرا و شرفا کی نشستوں میں سود و سودا یا دنیاداری کی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اپنے گھر کے مالی حالات یا اشیا و اجناس کی قیمتوں کے تذکرے کرنا شرمناک حد تک معیوب تھا۔ عام طور سے شعر و ادب یا دنیاوی معاملات میں بے نیازانہ ہلکی پھلکی باتیں ہوتی تھیں۔ البتہ زبان و بیان کے حسن و قبح پر سختی سے نظر رہتی تھی۔ سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت میں حرف آتا تو بلا تکلف ایک دوسرے کو ٹوک دیتے تھے۔ ضلع جگت میں مکالمہ چھڑ جاتا تو گھنٹوں کے لیے فراغت ہو جاتی تھی۔ افسانوی رنگ میں شہر کے آئے دن آنے والے واقعات پر تذکرے ہوتے تھے لیکن اس طرح کہ ہر افسانہ حقیقت بن جاتا تھا۔ افسانہ گو خود بھی اُس واقعہ کو صحیح سمجھتا اور حقیقت کی طرح پیش کرتا تھا۔ یہ لوگ امیر ہوں یا غریب بالعموم خوش گفتار اور صادق القول تھے۔ جھوٹ بولا بھی جاتا تو اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ دروغ بیانی از خود واضح ہو جاتی تھی اور یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ دروغ گو کا منشا ہی مزاح اور تفننِ طبع تھا۔ مختصر یہ کہ ہمارے پرانے شہری خود بھی سچ بولتے تھے اور دوسروں کو بھی سچا سمجھتے تھے۔ یہ خصلت اتنی پائدار تھی کہ اُن کی نشستوں میں مہمل سا مہمل اور ناقابلِ فہم افسانہ بھی کم سے کم وقتی طور پر باور کر لیا جاتا تھا کیوں کہ وہ یہ سوچنے کو بھی تیار نہیں ہوتے تھے کہ اُن کا کوئی عزیز یا دوست اُن سے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ بہت پرانے طرز کے رئیسوں میں ایسے رجحانات اور زیادہ تھے کیوں کہ وہ کسی کو جھوٹا کہنے یا سمجھنے کو خلافِ تہذیب قرار دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

مشہور شاعر اور ادیب فصاحت مرحوم متعدد شہزادگان اور رئیسوں بالخصوص نوابانِ شیش محل کے درباروں پر پابندیِ اوقات حاضر باشی کرتے تھے۔ اُن کے صاحبزادے ہمارے ہم درس اور بے تکلف دوست تھے۔ وہ بچپن ہی سے خوش مزاج اور تیز طبع تھے ایک مرتبہ ہماری ٹولی چپ تعزیہ میں شرکت کرتی ہوئی چوک سے گزر رہی تھی۔ کثیر مجمع تھا۔ اکبری دروازہ پار کرتے ہوئے جہاں مٹی کے کھلونوں کی دوکانیں آراستہ تھیں، کسی کی کہنی

کا دھکا لگ کر ایک ہاتھی گر کر کچل گیا۔ واپسی پر جب ہم لوگ گھر پہنچے تو فصاحت مرحوم نے اپنے صاحبزادے سے مجمع کا حال دریافت کیا۔ انھوں نے طفلانہ شرارت میں مبالغہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ "ابا اتنا جمِ غفیر تھا کہ ایک ہاتھی کچل گیا۔"

فصاحت مرحوم بے حد خفقانی تھے، دن بھر ہاتھی کچل جانے کا تصوّر بندھا رہا۔ شام کو گولا گنج میں نواب الو صاحب کے یہاں انھوں نے اس افسانے کو حقیقت بنا کر پیش کیا جس کو سب نے باور کر لیا۔ دوسرے روز صبح کو شیش محل کے دربار میں انھوں نے بھی روایت بیان کی۔ فصاحت مرحوم ہمہ وقت تسبیح بہ کف رہتے اور بہت زیادہ خوش گفتار تھے۔ اُن کی عمر اُس وقت ستر بہتر برس سے کم نہ ہو گی۔ غرض کہ اُس دربار میں بھی یہ حکایت حقیقت بن گئی اور یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ قریب قریب ہر رئیس کے دربار میں بھی چرچا ہوتا رہا کہ ہاتھی کچل گیا۔ غالباً دو یا تین روز کے بعد میری ملاقات مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں مرحوم سے ہوئی اور اس افسانہ کا تذکرہ انھوں نے مجھ سے فرمایا تب میں نے اُن کو اصل واقعہ سنایا اور پھر اُن کے دربار سے اس واقعہ کی تردید ہوئی اور حقیقت لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔ مگر دو تین روز تک اس غلط بیانی کی بدولت محفلوں میں گرما گرمی رہی تھی۔

رؤسا و شرفا۔ بلکہ شہر لکھنؤ کے قریب قریب سب باشندے انگریزی حکومت سے اتنا زیادہ خائف تھے کہ پولیس کے کانسٹبل یا کچہری کے مذکوری کو بھی دیکھ کر گھبرا جاتے تھے۔ بعض مقتدر عمائدین کے تعلقات حکامانِ بالا سے ضرور تھے اور اُن کو حکومت میں وقار بھی حاصل تھا لیکن شرفا کچہری کا ذکر سن کر کانپ جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب رؤسا و شرفا قرض کی لعنت میں گرفتار ہو چکے تھے اور اُن کے خلاف بڑے بڑے سود سمیت دعوے ہونے لگے تھے تو وہ پیروی مقدمہ کے مقابلہ میں یک طرفہ ڈگری ہو جانا گوارا کر لیتے تھے۔ اس ضمن میں ایک محترم بزرگ کے حاضر عدالت ہونے کا واقعہ قابل ذکر ہے جو اس صدی کی تیسری دہائی میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ یہ بزرگ وثیقہ دار تھے اور والد مرحوم سے تعلقات کی بنا پر میں اُن کو چچا کہتا تھا۔ اُن کے خلاف عدالت خفیفہ میں تخمیناً پانچ سو روپیہ کا دعویٰ ہوا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ انھوں نے صرف پچاس روپے قرض لیے تھے اور مہاجن نے بڑھا چڑھا کر دعویٰ

کیا تھا۔ میں وکالت کے پیشہ میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے اُن کو مشورہ دیا کہ وہ تاریخ پیشی پر خود آئیں اور پیروی مقدمہ میرے حوالہ کر دیں۔ میں نے اُن کو یہ بھی باور کرایا کہ جج خفیفہ عبدالحق صاحب بہت معقول آدمی تھے لیکن پھر بھی وہ بدقت کچہری آنے پر آمادہ ہوئے اور آئے بھی تو اس طرح کہ ایک ہاتھ میں تسبیح تھی جس پر وہ مسلسل دعائیں اور آیاتِ قرآنی پڑھتے رہے تھے۔ مقدمہ کی پکار ہونے پر جسم میں لرزہ پڑ گیا اور تلاوت میں اور تیزی آگئی۔ عدالت نے پہلا سوال کیا۔ "نواب صاحب! آپ مدعی کے قرض دار ہیں؟" وہ زبان سے جواب نہیں دے سکے اور اپنے گلے پر ہاتھ رکھ کر سر ہلا دیا۔ جس کے معنی تھے۔ "جی ہاں، گلے گلے پانی میں۔" پھر عدالت نے کہا کہ اس کا دعویٰ ہے کیا آپ کو تسلیم ہے؟" اب میں نے اُن سے کہا کہ تسبیح ہاتھ سے رکھیے اور زبان سے جواب دیجیے، تب انھوں نے وہی سب کچھ کہا۔ جو مجھ سے کہہ چکے تھے۔ عدالت نے طرح طرح سے مدعی کو سمجھایا، اُس سے جرح بھی کی، بالآخر تین سو روپیہ مجموعی رقم کی ڈگری بالاقساط صادر ہونا قرار پاگیا۔ عدالت نے کہا۔ "بیس روپیہ ماہوار قسط سے ادا کر دیجیے۔" اب انھوں نے بے قرار ہو کر کہا۔ "نا بیٹا! مر جاؤں گا بیٹا مر جاؤں گا!" پیشکار نے اس جواب پر اُن کو ڈانٹا تو عدالت نے اُس کو روکا اور فرمایا کہ "یہ قدیم لکھنؤ کی تہذیب اور زبان ہے، آپ نہ بولیے، میں مزے لے رہا ہوں۔" مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی آمدنی اور خرچ کی مدّات صفائی اور دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیے اور پندرہ روپیہ ماہوار قسط طے پاگئی۔ اِن مدّاتِ اخراجات میں اُن کے مرغ اور کبوتروں کے علاوہ افیون کا خرچ بھی شامل تھا۔ میرے علم و یقین میں یہ واحد مقدمہ تیسری دہائی تک ایسا تھا جس میں قدیم لکھنؤ کے ایک ممتاز پرانے طرز کے شہری کی موجودگی میں پیروی مقدمہ ہوئی تھی۔

وہ دور بہر حال ختم ہوا، موجودہ زمانہ میں جب کہ سود و سودا کی ہر طرف گرم بازاری ہے، نہ ویسے لوگوں کی سماج کو ضرورت ہے اور نہ وہ پُرانی قدریں نئی معاشرت میں کار آمد ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ اور ہو کر رہا۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ پُرانے لوگوں اور اُن کے طرزِ زندگی کے مٹ جانے کے بعد وہ گراں قدر خوبیاں بھی خاک میں مل گئیں جو شرفائے لکھنؤ کے لیے سرمایۂ افتخار تھیں یعنی متانت و سنجیدگی،

خوش اطواری و خوش کرداری، صداقت و راست بازی، اخوت و محبت، مہر و وفا رافت و الفت، تہذیب و اخلاق، نفاست و لطافت اور سب سے بڑھ کر رواداری اور جذباتی ہم آہنگی۔ آج ہم فرقہ وارانہ یک جہتی کے جتنے نعرے بھی بلند کریں لیکن پہلی سی وہ بات کہاں، جب اختلاف مذہب و ملت کے باوصف دلوں میں کدورت نہیں تھی اور نہ منافرت کا کوئی شائبہ ہمارے کرداروں میں تھا۔ یہی تھا لکھنؤ کا وہ اصل معاشرہ جس پر آج بھی پرانے شہریوں کو بجا طور پر فخر ہے۔

## چوتھا باب

# عوام و خواص کے تفریحی مشاغل

(۱) بٹیر بازی
(۲) کبوتر بازی
(۳) مرغ بازی
(۴) پتنگ بازی
(۵) میلے اور دیگر تفریحی اجتماعات

# (۱) جانوروں کی لڑائیاں اور بازیاں

فارغ البالی اور خوشحالی کے دور میں فطری طور پر انسان لہو ولعب میں مبتلا ہوتا اور تفریحی مشاغل کا متلاشی رہتا ہے۔ شاہانِ اودھ کو بھی طرح طرح کے شوق تھے لیکن اُن میں شجاعت اور دلیری کے رجحانات کی زیادہ کارفرمائی تھی۔ سعادت علی خاں کے دورِ اقتدار میں انگریزوں کا اثر اور نفوذ امورِ سلطنت میں بھی بڑی حد تک مسلط ہوگیا تھا۔ اُن کے لئے پالیسی کے تحت اور اپنے دوررس مفاد میں یہ ضروری تھا کہ وہ فرمانروایانِ اودھ کی توجہ انتظامی معاملات کی طرف سے ہٹا کر دوسرے بے سود مشاغل کی طرف مبذول کراتے رہیں چنانچہ انھوں نے سعادت علی خاں کے جانشین غازی الدین حیدر میں درندوں کی لڑائی دیکھنے کا زبردست شوق پیدا کرایا اور اس شوق کی ہر طرح ہمت افزائی کرتے رہے۔ غازی الدین حیدر نے ان تفریحی مشاغل کے لئے وسیع انتظامات کرائے تھے۔ موتی محل سے متصل دو کوٹھیاں تعمیر ہوئی تھیں جہا بیٹھ کر وہ چوپایوں اور درندوں کی لڑائیاں دیکھتے۔ و رلطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ لڑائیاں موتی محل کے مقابل دریا پار ہوا کرتی تھیں جہاں وسیع رقبہ میں رمنہ تیار کرایا گیا تھا اور اس میں جانوروں کے لئے کٹھرے لگوا کر اُن کو بسا دیا گیا تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں اب محلہ نشاط گنج آباد ہے۔

ان جانوروں میں جن کو اودھ کے بادشاہ خونیں ڈرامے کی سیر کرتے تھے اونٹ، ہاتھی، شیر، مینڈوے، گینڈے، بارہ سنگھے اور مینڈھے شامل تھے۔ یہ ذوق غازی الدین حیدر کے بعد ہی کم ہونے لگا تھا رفتہ رفتہ درندوں کی لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا لیکن اُن کو پالنے کا مذاق برابر برقرار رہا۔ آخری تاجدارِ اودھ کے یہاں عظیم الشان زندہ عجائب خانہ تھا جس میں دنیا کے تمام جانور جو دستیاب ہو سکے پلے ہوئے تھے۔ واجد علی شاہ کو شیر پالنے کا خصوصیت کے ساتھ بہت ذوق تھا لیکن ایسا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ اُن کو درندوں اور چوپایوں کی لڑائی سے کبھی بھی دلچسپی رہی ہو۔ عوام بادشاہوں کے مسلک کی تقلید کرتے ہیں لیکن لکھنؤ والوں نے درندوں کی لڑائی پر کبھی کوئی توجہ نہیں کی۔ اس طرح یہ فن، اگر اس کو فن کہا جائے تو سلطنت کے زوال کے پہلے ہی مٹ چکا تھا البتہ مینڈھے پالنے اور لڑانے کا چسکا لگ چکا تھا جو ایک مدت تک برقرار رہا۔ عید الاضحی کے موقعہ پر مینڈھے کی قربانی میں ثوابِ عظیم حاصل ہونے کے مسلمان قائل تھے اس لئے یہ جانور

ان کو مطبوع تھا البتہ لڑانے والوں نے لڑانے کا شوق اکتساب کر لیا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا تک مینڈھے پالے اور لڑائے جاتے تھے لیکن یہ شوق شرفا اور روسا میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ نیچے طبقہ کے ایک مخصوص پیشہ والوں میں یہ دلچسپیاں رہا کرتی تھیں۔

لکھنؤ کے مزاج کو درندوں اور چارپایوں کی خونیں لڑائیوں سے مناسبت نہیں تھی اسلیے ہمارے شرفا اور بھی اُدھر متوجہ نہیں ہوئے لیکن لڑائیوں کی بنیادی حیثیت اور شرفا کے مزاج نے مل جل کر طیور کی لڑائیوں کے تخیل کو جنم دیا۔ چنانچہ شاہی زمانہ ہی میں یہ ذوق پوری تابانی کے ساتھ ابھر آیا تھا۔ خوش حالی کی برکتوں نے اس فنِ اختراعات میں بھی اضافے کرائے اور شہریوں نے متعدد طیور پال کر اور لڑا کے اپنے شوق کو پورا کیا۔ اس میدان میں طوطے، لوے، گلدم، لال، تیتر، مرغ، کبوتر اور بٹیر بہت کارآمد ثابت ہوتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے اس فن میں بھی بڑی بڑی جدت افزائیاں کی تھیں لیکن جب حالات بدلے اور فلاکت منڈلانے لگی تو ہر تفریحی مشغلہ پر زوال آیا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں لوے، گلدم، لال اور توتے کی لڑائیوں کا مشغلہ یک لخت ختم ہو گیا تھا البتہ توتے اور لال بکثرت خاندانوں میں خوبصورت چڑیوں کی حیثیت سے پلے رہتے تھے۔ ان طیور کا پالنا بھی بمقابلہ لوا اور گلدم کے سہل تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ذوق بھی جاتا رہا۔ اب خال خال گھروں میں توتے اور لال دکھائی دیتے ہیں۔ گلدم اور لوے کا پالنا پہلے ہی متروک ہو چکا تھا البتہ تیتر ایک مدت تک پالے اور لڑائے جاتے تھے مگر یہ شوق عام طور سے شرفا میں کبھی مقبول نہیں ہوا اور جو لوگ اس بازی سے دلچسپی رکھتے تھے اُن کو مستثنیات میں شمار کیا جاتا تھا ایسے لوگوں میں صرف راجہ نواب علی خاں مرحوم کے ایک رشتہ میں بھائی ٹھاکر ضامن علی خاں اور بابا ہزارہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں میں بھی ٹھاکر صاحب کو کبوتروں سے زیادہ اور تیتر سے کم ذوق تھا اور بابا ہزارہ کا باغ قریب قریب تمام لڑنے والے جانوروں یعنی تیتر بٹیر اور مرغ کا اکھاڑہ تھا۔ عام طور سے شرفائے لکھنؤ کو بٹیر، کبوتر اور مرغ کی بازیوں پر توجہ تھی۔ روسا و عمائدین کو ان بازیوں سے بھی کم رغبت تھی اور جن کو رغبت تھی اُن کی تعداد بھی کم تھی۔

## (۲) بٹیر بازی

بٹیر دو نسلوں کے ہوتے [illegible] ھاکرا اور چنک۔ اس لفظ کو بعض لوگ چنگ بھی بولتے

تھے لیکن اونچے طبقہ والے چنک ہی کہا کرتے تھے۔ اول الذکر بڑے قد کے اور بھاری جسم کے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر جاڑوں کے موسم میں دستیاب ہوتے ہیں اور صرف غذا میں استعمال ہوتے ہیں۔ بہت لذیذ گوشت ہوتا ہے جس کے کباب بہت اچھے تیار ہوتے ہیں۔ چنک پالنے اور لڑانے میں کام آتے ہیں۔ شہزادگان و روسا کو بٹیر پالنے یا لڑانے کا کبھی ذوق نہیں ہوا۔ یہ تفریحی مشغلہ اشرفا وعوام کا تھا جنھوں نے اس شوق کو بھی فن کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔ بٹیروں کے رہنے کے لیے سینک کی چمکتی ہوئی بڑی خوبصورت کابکیں بنوائی جاتی تھیں جن کی چھت پر ہاتھی دانت کی ترشی ہوئی حسین وجمیل گڑیاں لگی رہتی تھیں۔ بٹیر لڑانے کی تیاریاں ایک مدت پہلے سے ہوتی تھیں۔ بٹیر باز اپنی لڑانے والی مخصوص بٹیر کو پانی سے نہلائے اور گھنٹوں ہاتھ میں دبائے رہتے تھے تاکہ اس کا جسم سڈول ہو جائے۔ گھر سے باہر نکلتے یا کسی اجتماع میں شرکت کرتے تب بھی بٹیر ہاتھ میں دبا رہتا تھا۔ کبھی کبھی بٹیر ہاتھ میں پھڑک کر نکل بھاگنے کی کوشش کرتا تو اس کو اور زور سے دبا لیتے تھے۔ ایک بار ---- میر نفیس مرحوم کی مجلسِ خوانندگی میں ایک بزرگ سب سے پیچھے والی صف میں بٹیر ہاتھ میں ---- دبائے بیٹھے تھے۔ وہ افیونی تھے یا کسی وجہ سے غنودگی طاری ہوئی تو اُن کا بٹیر زور کر کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فٹ فٹ کر کے اڑا اور میر صاحب کے ہاتھ میں مرثیہ پر جا گرا۔ انھوں نے ہاتھ گھما کے ایک جانب بٹیر کو پھینک دیا لیکن مجلس میں کسی ایک کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نہیں آئی اور مجلس بدستور جمی رہی۔

بٹیر کو ہاتھ میں دبائے رکھنے کے علاوہ اور بھی ریاض اُس پر کیے جاتے تھے بعض لوگ مہندی سے اور بعض جو پان بہت کھاتے تھے بٹیر کا سر اپنے منہ میں لے کر پان کی پیک سے رنگتے تھے۔ یہ حرکت لڑانے کے پہلے متعدد بار ہوتی تھی اور بٹیر باز اس فعل کو مکروہ نہیں سمجھتے تھے۔ راتوں کو اس کے کانوں میں بہت زور سے کو، کو کرتے تھے۔ اس کو کوکنا کہتے تھے۔ غالباً غرض یہ تھی کہ بہرا ہو ہو جائے اور پالی میں تماشائیوں کا شور وغوغا سن نہ سکے یا یہ کہ پہلے ہی سے چیخنے کی آوازوں کا خوگر رہے۔ تیسرا ریاض بٹیر کو دُبلا کرنے پر ہوتا تھا۔ اُس کو مصری کھلائی جاتی اور بہت سی دوسری دوائیں جو تجربات میں بٹیر بازوں کو معلوم تھیں کھلائی جاتی تھیں۔ دُبلا ہو کر بٹیر میں چھلاّپن آجاتا اور وہ خوب لڑتا تھا۔ لڑانے کے پہلے بٹیر کی چونچ چاقو سے چھیل کر نکیلی کر دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے مقابل کو اچھی طرح زخمی کر سکے۔ جب بٹیر تیار ہو لیتا تب لڑائی کے لیے پالی میں اُتارا جاتا تھا۔ پالی کے لیے کسی وسیع میدان کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ کسی متوسط درجہ کے کمرہ میں زمین

بردری اور شفاف سفید چاندنی بچھا کر آسانی کے ساتھ بٹیر بازی ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی سادگی اور سہولت کے باعث بٹیر کی پالیوں کا عام رواج ہو گیا ہو۔ اسی چاندنی کے فرش پر کالکن چھڑک دی جاتی تھی اور فریقین اپنا اپنا بٹیر چھوڑ دیتے تھے پھر یہ دونوں پرندیا ہم دگر نبرد آزما ہو جاتے تھے دونوں بٹیریں اپنی اپنی چونچوں سے ایک دوسرے کے سر پر حملہ کرتی تھیں اور پنجوں سے جسم کو زخمی کر دیتی تھیں۔ اس لڑائی میں کامیاب بٹیر کبھی کبھی اپنے حریف کا پوٹا پنجوں سے چاک کر دیتی تھی اور وہ جاں بحق تسلیم ہو جاتی تھی۔ یہ لڑائی بیس پچیس منٹ میں شروع ہو کر ختم ہو جاتی تھی اور کامیاب بٹیر کا مالک جو شرط بھی بدی گئی ہو جیت لیتا تھا۔ ایک ایک دن میں کئی کئی پالیاں سر ہو جاتی تھیں۔

پالی میں جو بٹیر جیت جاتا تھا اس کو محنت کر کے اور زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی تھی اور دوسرے اور تیسرے سال پھر پالی میں اتارا جاتا تھا۔ پالیاں جاڑے کے موسم ہی میں لڑائی جاتی تھیں جیتا ہوا بٹیر برسات کے موسم میں نئے پر نکال لیتا تھا دو برس یعنی تین پالیاں جیتنے کے بعد پھر بٹیر بیکار ہو جاتا تھا اور قابل لڑائی کے نہیں رہتا تھا۔ ایک پالی جیتنے کے بعد ہی مالک کی نظر میں اس کا بٹیر بہت گراں قدر ہو جاتا تھا۔ دوسری فتح کے بعد اُس کو نوکار اور تیسری کامیابی کے بعد کُریز کہتے تھے۔ کریز میں یہ صفت ہوتی تھی کہ کوئی نیا بٹیر اُس کے مقابل دو منٹ کو بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ جن لوگوں کو پالی لڑانے کا سلیقہ تھا اور صاحب حیثیت بھی تھے وہ کریز بٹیر ہی پالی میں اتارا کرتے تھے۔ روپیہ کمانے کے شوق میں جو لوگ بٹیریں لڑاتے تھے وہ بہت زیادہ قابل مذمت حرکتیں کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ اپنے بٹیر کو لڑانے کے قبل نشیات کھلا دیتے تھے۔ ایسا بٹیر پالی تو جیت لیتا تھا لیکن فوراً یا کچھ ہی دیر کے بعد مر جاتا تھا۔ کچھ لوگ اپنے بٹیر کے منہ اور چہرے پر کچھ کڑوی اور بد بودار چیزیں لیپ کر دیتے تھے تاکہ مخالف بٹیر کو حملہ کرنے میں تکلیف ہو اور وہ از خود شکست خوردہ ہو جائے لیکن ایسے طور طریقے شرفا کی پالیوں میں رائج نہیں تھے۔ شرفا کے گھروں میں پالیاں بہت پاک وصاف ہوتی تھیں اور تماشائیوں میں جن کے ہجوم لگ جاتے تھے مخصوص اور معزز لوگوں کی ضیافت بھی ہوتی تھی۔ شرفا اپنے اپنے بٹیروں کے نام بھی رکھتے تھے اور جب ان کے نام لے کر پکارتے تو ان کے بٹیر فوراً اُن کی طرف حرکت میں آجاتے تھے۔

بٹیر بازوں نے اپنے فن میں بڑے بڑے کمال پیدا کر لئے تھے۔ بٹیروں کے چہرے بدل

دینا، اپنی بٹیر دوسرے کے کربز کی ہم شکل کرکے باتوں باتوں میں اُس سے بدل لینا اور اسی قسم کی دوسری بددیانتی کی حرکتیں عام ہوگئی تھیں لیکن جو گراں قدر ہنر ان کو آتا تھا وہ شکست خوردہ بٹیر کو از سرِ نو بہت اچھا لڑاکا بنا لینا تھا۔ اس فن میں کچھ لوگ بہترین ماہر تھے۔ یہ صاحبان بھگّا بٹیر کو دوائیاں کھلا کھلا کے اور طرح طرح سے ریاض کرکے ٹھیک کرلیتے تھے۔ ان لوگوں میں چوبداری محلہ کے حسن میاں اور باغ مرزا اُجّا کے بتّے صاحب بڑی شہرت کے مالک تھے۔ دوسرے لوگوں میں جن کے پاس بٹیروں سے متعلق مجرّب نسخہ جات تھے اور وہ خود ہی دوائیں تیار کرکے دوسروں کو فراہم کرتے تھے چوبداری محلہ کے عنایت علی کشمیری محلہ کے بسم اللہ خاں، پاٹا نالہ کے نواب پتّے صاحب اور نور باڑی کے امیر علی بڑی معروف ہستیاں تھیں۔ اس زمانہ میں ایسے نسخے شدت کے ساتھ راز رکھے جاتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بٹیر بازی تو کسی نہ کسی حد تک باقی رہ گئی لیکن فن کاریاں رخصت ہوگئیں اور پالیوں کی تعداد میں بھی بے انتہا کمی ہوگئی ہے۔ اس زمانہ میں قریب قریب ہر محلہ میں پالیاں جمتی تھیں جن میں باغ بابہزارہ کی ترکھی گنج کے رئیس چھوٹے آغا صاحب آہنی پھاٹک کے نواب بنّے صاحب اور احاطہ مرزا علی خاں میں ایک معتمد بزرگ کے یہاں کی پالیاں بڑی شہرت کی مالک تھیں جہاں تماشائیوں کے جمِ غفیر لگ جاتے تھے۔

بہت سے بٹیر بازوں کو بٹیر پالنے اور بٹیر لڑانے کے علاوہ بٹیر پکڑنے کا بھی شوق تھا۔ ایسے بٹیر کھلانے کے بھی کام آجاتے تھے۔ بٹیر کا گوشت بالخصوص تازہ پکڑے ہوئے بٹیر کا گوشت بہت لذیز اور مقوی ہوتا ہے۔ انھیں شکار کئے ہوئے بٹیروں میں سے پالنے اور لڑانے کا اسٹاک بھی تیار ہوتا تھا۔ بٹیر کا شکار گرمیوں کی شدت کم ہونے کے بعد اور ہلکی برسات میں رات کو ہوتا تھا۔ بٹیر باز کچھ بٹیریں شکار ہی کی غرض سے پالتے اور اُن کو بہت زور سے برابر بولتے رہنا سکھاتے تھے۔ ایسے بٹیروں کو پھندیت کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بٹیر کے شکار کے لئے ارہر کا کھیت بہت کارآمد ہوتا ہے۔ دیہات کے ...ن ...دل میں رات کو بٹیروں کی آوازیں سنی جاتی تھیں وہیں ارہر کے کھیت کے نزیب جال بچھا دیا جاتا تھا اور پھندیت رات بھر آوازیں لگایا کرتے تھے۔ انھیں آوازوں پر اڑتے ہوئے بٹیر نیچے اُتر آتے اور ارہر کے کھیت میں پہلتے جاتے تھے۔ صبح اچھی خاصی تعداد میں یہ بٹیر کھیت میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ علی الصبح ان کو ہنکا کر جال کی طرف دوڑایا جاتا تھا اور وہ سب کے سب گرفتار ہو جاتے تھے۔ چند اُڑ یا بھاگ بھی جاتے ہونگے لیکن بڑی تعداد جال میں اسیر ہو جاتی تھی۔

# (۳) کبوتر بازی

کبوتر تمام طائروں میں سب سے زیادہ معصوم صفت، بھولا اور شریف پرند ہے۔ اور اس کی نوع و نسل کے اعتبار سے بیشمار قسمیں ہیں۔ انھیں میں ایک "یاہو" کہلاتی تھی۔ یہ کبوتروں بھر غٹرغوں کے بجائے "یاہو" کے نعرے لگاتا تھا۔ اسی صفت کی وجہ سے مقدس اور پاکباز لوگوں میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ یوں بھی ہر کبوتر یہاں تک کہ جنگلی کبوتروں تک کے لئے دانہ اور پانی کا بندوبست کرنا برکت اور فراخیِ رزق کا باعث سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کبوتروں کا گھر میں پالنا دفعِ بلّیات کا موجب ہوتا ہے۔ ثوابِ اُخروی اور فلاحِ دنیوی کا وسیلہ جان کر قدیم لکھنؤ میں کبوتر پالنے کا گھر گھر رواج تھا۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں کبوتر نہ پلے ہوں۔ لیکن معصومیت فطرت میں داخل ہونے ہوئے بھی کبوتر آپس میں لڑتے ہیں۔ یہ تماشا اُس وقت دیکھنے میں آتا ہے جب کسی کبوتر کے خانے میں کوئی غیر کبوتر داخل ہو جائے یا داخل کر دیا جائے۔ ایسی لڑائی کبوتری تو بہت کم لڑپاتی ہے لیکن نر کبوتر بہت زور و شور سے لڑتے ہیں۔ غالباً نر کبوتر کی اسی فطرت کو دیکھ کر لکھنؤ والوں نے کبوتر لڑانے کی بھی ایجاد کی تھی۔ دورِ شاہی میں جہاں درندوں اور چوپایوں کے علاوہ پرندوں کی لڑائی کا چلن رائج ہوا تھا انھیں پرندوں میں کبوتر بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ جس طرح بٹیر تیار کر کے پالی میں اتارے جاتے تھے اسی طرح کبوتروں کو بھی لڑائی کے لئے تعلیم دی جاتی تھی لیکن چونکہ یہ حرکت کبوتر کی فطرت سے بعید تھی اس لئے یہ مشغلہ فنا ہو گیا اور کبوتر صرف پالنے اور اڑانے کے لئے مخصوص ہو گئے۔

کبوتر بازی ایک علٰحدہ فن ہے لیکن کبوتر پالنا لکھنؤ میں عام بات تھی۔ جو لوگ کبوتر باز نہیں تھے اور صرف پالنے کے دلدادہ تھے اُن کی پسندیدہ اقسام کے بھی بیشمار کبوتر مل جاتے تھے۔ ایسے کبوتر اونچے نہیں اُڑتے تھے اور زیادہ تر ہر پھر کے زمین ہی پر رہتے تھے۔ روسا و عمائدین کے یہاں عموماً اسی نوع کے کبوتر پلے رہتے تھے۔ پسندیدہ اقسام میں شیرازی، چپ، لوٹن، خرقہ بند، مکھی، نیلے، لقّے، بھولے، خوردنوکے، چوپا چندن اور محترم والے شمار ہوتے تھے۔ آخر الذکر قسم ایک خواجہ سرا محترم کے نام سے منسوب تھی۔ یہ تمام نام ظاہر کرتے ہیں کہ ان میں ہر ایک کے پسِ پشت کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ تھی۔ یہ وجہ جو کچھ بھی رہی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے بعض اپنے

حسن و جمال میں، بعض نزاکت و لطافت میں، بعض اعضا و جوارح کی ساخت کے اعتبار سے، بعض رنگینی اور شوخی کے اعتبار سے اور بعض اپنے قد و قامت میں تناسب کی خوبیوں کے باعث بیحد خوبصورت، دلکش اور جاذب نظر تھے۔ آخرالذکر صفت میں شیرازی کبوتر اپنا جواب نہیں رکھتا۔ پلنے والے کبوتروں کی فہرست متذکرہ بالا ناموں پر ختم نہیں ہوتی۔ ان کے اقسام گنوانا موجودہ دور میں ناممکن ہے کیونکہ بہت سی نسلیں ختم ہو چکی ہیں یا کم سے کم نظر نہیں آتی ہیں۔ راقم کے مرحوم دوست راجہ رام کمار بھارگو کے یہاں سیکڑوں کی تعداد میں کبوتر پلے تھے جن کے اقسام درجنوں میں گنے جا سکتے تھے۔

ہمارے امرا و روسا اتنے زیادہ تعیش دماغی میں گرفتار تھے کہ وہ ہر شوق کو فن کے درجہ تک پہنچا کے دم لیتے تھے چنانچہ کبوتر پالنے میں بھی کمالات کے مظاہرے کر دیئے تھے۔ ہر رئیس کے یہاں بڑی تعداد میں کبوتر رہتے تھے جن کے لئے صاف اور شفاف کمروں میں لکڑی کے خانہ دار بکس رکھے رہتے تھے۔ ایک ایک بکس میں کم سے کم اوپر اور نیچے تین تین خانے ہوتے تھے۔ ہر خانہ میں کبوتروں کا ایک جوڑہ بند کیا جاتا تھا۔ ایک ملازم ان سب کی دیکھ بھال کے لئے مقرر رہتا تھا۔ وہ علی الصبح سب خانے کھول دیتا۔ دانہ اور پانی باہر متعدد ظروف میں فراہم رہتا تھا۔ کبوتر اپنے اپنے خانوں سے باہر آتے اور دانہ پانی کھا پی کر کھلی ہوئی جگہ پر تازی ہوا میں گھوما کرتے تھے۔ ایک خاکروب ان کے کمرے اور بکسوں و خانوں کی صفائی کے لئے ملازم رہتا جو کبوتروں کے باہر آجانے کے بعد پوری طرح غلاظت دور کر دیتا ہے۔ کبوتروں کے مخصوص ملازم کا کام اپنے جانوروں کی نگہبانی کرنا بھی تھا۔ خانوں میں صفائی کے بعد خس و خاشاک رکھ دیا جاتا تھا تاکہ کبوتریاں اسی پر انڈے دیں اور اُن کو سے کر بچے نکالیں۔ اس تمام صفائی اور فراہمی خوراک کے علاوہ کبوتروں کو سنوارنے کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے نقرئی چھلے کبوتریوں کے پیروں میں اور انگوٹھی نما گھیرے شیرازی کبوتروں کی ٹانگوں میں پہنائے جاتے تھے۔ بعض رئیسوں کے یہاں کبوتروں کو مختلف رنگوں میں رنگنے کا بھی دستور تھا۔ بعض رئیس سادگی پسند تھے ان کے یہاں بہت سے کبوتر ہوتے ہوئے بھی صرف ایک یا دو قسم کے پرند رہا کرتے تھے۔ مرزا بہادر مرزا احمد صادق علی خاں کے یہاں صرف سفید رنگ کے کبوتر تھے۔ یعنی یہ کہ ہر رئیس کے یہاں اسی کے ذوق و مذاق کے تحت کبوتروں کا اسٹاک رہا کرتا تھا۔

اڑنے والے کبوتروں کی بھی کئی قسمیں تھیں لیکن کبوتر بازوں کو گرہ باز اور گولے پالنے پر ساری توجہ تھی۔ ان اقسام کے اچھے سے اچھے کبوتر اب بھی دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن اُن پر اب وہ ریاض ہو ہی نہیں سکتا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ بڑی محنت سے پالے جاتے تھے، اُن کی خدمت کے لئے ملازم رہا کرتے تھے، صحت و توانائی پر نظر رکھی جاتی تھی، صحتمندی میں بہتر غذائیں اور بیماریوں میں اچھی دوائیں فراہم کی جاتی تھیں مختصر یہ کہ جس طرح آدمیوں کے لئے حفظانِ صحت اور بقا کے لئے تدابیر ضروری ہیں وہی اسلوب کبوتروں کے ساتھ بھی سختی سے برتا جاتا تھا۔

یوں تو گولے اور گرہ باز دونوں اڑنے والے کبوتر ہیں لیکن پھر بھی دونوں کے اطوار میں نمایاں فرق ہے گولے اڑانے سے اُڑتے اور بلانے سے اتر آتے ہیں لیکن گرہ باز اڑانے سے اڑ جاتے ہیں مگر اپنی مرضی سے واپس آتے ہیں۔ وہ آسمان پر اپنے گھر کے اوپر بہت بلند ہو کر چکّر لگاتے رہتے ہیں اور علی الصباح کے اُڑائے ہوئے دوپہر کو بلکہ کبھی کبھی شام کو اترتے ہیں۔ کبوتر سے زیادہ کسی طائر کو اپنے گھر سے اُنس نہیں ہوتا۔ اس کے لئے شام تک اپنے خانہ میں واپس چلا جانا اُس کی فطرت میں داخل ہے اڑایا ہوا کبوتر اگر واپس نہ آیا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ یا تو کسی شکاری جانور نے اُسے ختم کر دیا یا کسی غیر نے پکڑ لیا ہے۔ پھر بھی ایسی مثالیں بکثرت ملتی تھیں کہ پکڑا ہوا کبوتر موقع پاکر پھر اپنے گھر آجاتا تھا۔ یہ واپسی کبھی کبھی مدتوں کے بعد ہوتی تھی۔ پرانے لکھنؤ میں بہترین گرہ باز جھوائی ٹولہ کے شبیر حسین خاں اور کٹرہ ابوتراب خاں کے نواب محمد حسین خاں کے یہاں پلے تھے اور بہترین گولے تالاب گنگنی شکل کے شہنشاہ دولہا اور سرائے معالی خاں کے دو بھائیوں بڈھن صاحب اور منے صاحب کے پاس تھے یہ دونوں بھائی بادشاہ اودھ محمد علی شاہ کے اخلاف میں تھے اور ان کی محلسرا اس جگہ پر تھی جہاں آج کالی چرن اسکول واقع ہے شہنشاہ دولہا کو گولہ کبوتروں کا اتنا شوق تھا کہ انھوں نے قریب قریب ہر قسم کے گولے پال رکھے تھے۔ ہر رئیس کے یہاں بڑی تعداد میں کبوتر رہتے تھے اور اچھے اچھے فنکار اُن کی خبر گیری کے لئے ملازم تھے۔

کبوتر بازی کی اصطلاح کا اطلاق انھیں لوگوں پر ہوتا تھا جو شرط بد کر یا مقابلہ پر کبوتر اڑاتے تھے بعض شرفا اور عوام نقد یا جنس میں شرطیں لگاتے تھے لیکن رئوسا و عمائدین کے یہاں مقابلے ہوتے تھے چنانچہ مشہور تھا کہ ایک زمانہ میں ایک رئیس نے بیک وقت نو سو کبوتریاں اڑائی تھیں تو ان کے مقابلہ پر دوسرے رئیس نے اسی تعداد میں نر کبوتر اڑا کر مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔ وہ دور انیسویں صدی ہی میں ختم ہو گیا تھا اسی کے پس ماندہ حالات

بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک برقرار تھے۔ چنانچہ اس دور میں بھی ہر محلہ میں صبح کے وقت کبوتر بازوں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ یہی وقت کبوتر اڑانے کا ہوتا ہے۔ کبوتروں کے رہنے کی جگہ کے قریب لکڑی یا بانسوں کا ایک بلند براکیٹ نما اڈہ رہتا ہے جو کبوتروں کو بلندی پر بیٹھنے کا مقام ہوتا ہے۔ گرہ باز کبوتروں کے لیے یہی اڈہ بسا اوقات نیچے اُترنے یا اونچا اڑنے کے لئے زینہ کا کام دیتا ہے۔ کبھی کبھی گرہ باز کبوتروں کے لئے مکان کی چھت یا کارنس پر اُن کے بیٹھنے کا ٹھکانا مقرر ہو جاتا ہے اُس کو انٹیا کہا کرتے تھے۔ گرہ باز کبوتروں کو صرف ایک ڈھیلہ پھینک کر اڑا دینا کافی ہوتا تھا البتہ کبوتر باز جب تک وہ اونچے نہ ہو جائیں للکارا کرتے تھے گولے کبوتر چھیپی کے اشارے سے اڑائے جاتے تھے ایک لکڑی میں مرچھل کی طرح کپڑا بندھا رہتا تھا۔ کبوتر باز آواز لگاتے اور چھیپی ہلا ہلا کے کبوتر اڑاتے تھے۔ اسی طرح اُن کو آواز دے کر نیچے بلاتے بھی تھے۔ دوپہر تک عموماً یہ مشغلہ جاری رہتا تھا۔ اصل بازیاں گرہ بازوں کی اڑان پر لگائی جاتی تھیں اور اب بھی لگائی جاتی تھیں لیکن یہ فرق ہو گیا ہے کہ پہلے سے توانا کبوتر نہیں ہیں، دوسرے یہ کہ جو ٹکڑیاں کبوتروں کی پہلے اُڑائی جاتی تھیں اُن میں اب بہت کمی ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں دس بارہ کبوتروں سے زیادہ کی ٹکڑی اڑائی نہیں جاتی تیسرے یہ کہ کبوتر بازوں میں اب پہلے کی ایسی حوصلہ مندی نہیں ہے۔ بہرحال یہ میچ شرطیں لگا کے پہلے بھی ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں۔ ٹکڑی میں ایک ایک اور دو دو یا چار چار کر کے کبوتر اُترتے ہیں جس کا کبوتر سب سے آخر میں اُترتا وہی کبوتر باز میچ جیت جاتا تھا۔ ہر ہر گھر میں جہاں سے کبوتر اڑائے جاتے میچ کے دن ایک ایک جج بیٹھا رہتا تھا جس کو عموماً اب بھی شام تک موجود رہنا پڑتا ہے۔ کبوتر بازوں کی پہلے بھی منظم ٹولیا تھیں اور اب بھی انھوں نے مقابلہ کے لئے کلب قائم کر رکھے ہیں۔

## (۳) مرغ بازی

تمام بازیوں میں مرغ بازی کو وہی حیثیت حاصل تھی جو آج کل کے کھیلوں میں کرکٹ کا مقام ہے۔ مرغ بازی میں شاہانہ طرز تھا اور اُس کے لئے بہت سے لوازمات ضروری تھی۔ یوں تو ہر نوع اور نسل کے مرغ آپس میں لڑتے ہیں لیکن مرغ بازی کے لئے اصیل نسل کے مرغ کا ہونا لازمی تھا۔ اس زمانہ میں اصیل مرغ کے پیدا کرنے کے واسطے بڑے

بڑے انتظامات تھے۔ ایسے مقامات کارخانے کہلاتے تھے جہاں اصیل مرغ پیدا ہوتے اور اُن کو تربیت دی جاتی تھی اور اُن کی غذا اور حفظانِ صحت کیلئے تجربہ کار فن کار تعینات رہتے تھے۔ ایسے آزمودہ کار لوگوں کو مرغ باز کہتے تھے۔ مرغ لڑانے والے عموماً انھیں کارخانوں سے مرغ خریدتے تھے لیکن اُن کو بھی اپنے مرغ کی حفاظت اور تربیت و پرورش کیلئے مرغ باز ملازم رکھنا پڑتے تھے۔ یہی مرغ باز لڑائی کیلئے مرغ کو تیار کرتے تھے۔ ان تیاریوں میں پرندے کے پٹھوں اور جسم کی مالش کرنا، غذا اور صحت کا خیال رکھنا اور میدان میں لڑائی کے لیے اتارنے کے قبل خار باندھنا اور اُس کی چونچ چھیل کر نوک نکالنا ضروری تھا۔ چونچ میں نوک نکال دینے کے بعد پھر مرغ کو زمین پر کھانا نہیں دیا جاتا تھا تاکہ وہ نوک رگڑ کر خراب نہ ہو جائے۔ کسی ملائم چیز پر اُس کی غذا کے دانے بکھرا دیئے جاتے تھے۔ بعض فن کار اپنی ہتھیلیوں پر دانہ چگا دیتے تھے۔

عہدِ شاہی میں مرغ بازی کا بہت رواج تھا۔ سعادت علی خاں کے زمانے سے انتزاع سلطنت تک سب بادشاہ نیز بڑے بڑے روسا مرغ بازی کے دلدادہ تھے، شرفا میں بھی بہت سے خوشحال مرغ لڑانے کا شوق رکھتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ ذوق کم ہوتا گیا اور تخمیناً پچاس برس قبل بالکل ختم ہو گیا۔ آخری دور میں صرف ایک مرغ کا کارخانہ تھا جو نور باڑی میں بادی علی خاں عرف نواب گھسیٹا قائم کئے ہوتے تھے، اُن کے یہاں بہت ممتاز فن کار میر مونگا ملازم تھے۔ نواب گھسیٹا کے علاوہ ڈیوڑھی آغا میر کے نواب نظیر علی خاں، وزیر گنج کے ذاکر حسین عرف مغل صاحب ٹوریہ گنج کے نواب بکھن صاحب، اسبتھی کے گوورشاہ صاحب اور نواز گنج کے ایک رئیس کے پاس بھی بہت اعلا درجہ کے مرغ تھے۔ محلہ چک منڈی کے ایک جراح نامی کچھو کو بھی اس فن میں بڑا ملکہ تھا اُس کے پاس بہت اچھا اصیل مرغ تھا اور وہ خود بھی مرغ باز تھا بعض مقتدر عیسائیوں کو بھی مرغ بازی کا شوق تھا۔ جن میں مسٹر فلمنگ ساکنہ چوراسہ لال باغ عقب سبطین آباد اور مسٹر اکمن ساکنہ جلال پور نزد تال کوڑہ کے نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام صاحبان میں بھی نواب بکھن صاحب اور مسٹر فلمنگ کے مرغ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بیحد خوبصورت، خوش رنگ، خوش وضع اور تنو مند تھے۔ اصیل مرغ لال رنگ کے ہوتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے مرغ گہرے لال رنگ کے تھے جن کی چمک بہت جاذبِ نظر تھی۔

یہ کہنا بھی غالباً غلط نہ ہوگا کہ مرغ صحیح معنوں میں خود نہیں لڑتے تھے بلکہ لڑائے جاتے

تھے۔ مرغ باز جوان کی تربیت کے لئے ملازم ہوتے تھے وہی لڑواتے تھے۔ لڑوانا بھی ایک ہنر تھا۔ مشہور اور ممتاز مرغ بازوں میں میر موتگا کے علاوہ مرزا جان، سیتل منّے اور چھنگا بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ کشمیری محلے کے مصطفےٰ حسین اور بعض دوسرے مرغ باز بھی تھے۔

ہر اُس شخص کے یہاں جس کو اصیل مرغ پالنے اور لڑانے کا شوق تھا کوئی نہ کوئی مرغ باز مستقل طور پر نہ سہی تو مخصوص اوقات کے لئے ملازم رہنا ضروری تھا۔ مرغ بازی کے لئے وسیع و عریض جگہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ لکھنؤ کے امراء و شرفا پتنگ بازی کے علاوہ کوئی دوسرا شوق کھلے ہوئے مقام پر پورا نہیں کرتے تھے لہٰذا مرغ بازی کے لئے بڑے بڑے ہالوں یا دیواروں سے گھرے ہوئے احاطوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ بازیاں عام طور سے "کاظمین" کے قریب احاطۂ برہان الملک اور راقم کے جدِّ اعلا نواب تجمل حسین خاں کی بارہ دری واقعہ کٹرہ ابوتراب خاں میں ہوتی تھیں۔ ان دونوں علاقوں پر جب فلاکت آگئی تو مرغ لڑانے والے اپنے لئے خود کسی جگہ کا تعین کر لیتے تھے۔ آخری بازی غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ نواب بکھن صاحب کی محلسرا میں خود انہیں کا مرغ مسٹر فلمنگ کے مرغ سے لڑا تھا اور اُسی نے بازی جیتی تھی۔ نواب بکھن صاحب کے مرغ باز چھنگا تھے۔ کچھ مدّت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور لکھنؤ کی مرغ بازی ختم ہو گئی۔

میدان میں لڑنے والے دونوں مرغوں کو "جوجوڑ" کہلاتے تھے اُنہیں کے مرغ باز اُتارتے تھے یہ اُتارنا ایک بڑا فن تھا۔ وہی فن کار گراں قدر قرار پاتا تھا جس کا مرغ اترتے ہی اپنے مدِّ مقابل پر پہلے وار کر دے اُس کے بعد دونوں مرغ چونچوں اور اپنے پیروں سے لڑائی شروع کر دیتے تھے۔ مرغ باز دونوں طرف اپنے اپنے مرغ کو للکارتے اور اُس کی ہمّت افزائی کرتے رہتے تھے۔ للکارنے اور ہمت افزائی کرنے کے لئے بھی ہر فن کار کے کچھ مقررہ فقرے اور الفاظ ہوتے تھے جن کو ان کا مرغ سمجھتا اور اثر مقبول کرتا تھا۔ دیکھنے والے تماشائیوں کو بھی احساس ہو جاتا تھا کہ ہر مرغ اپنے مرغ باز کی آواز اور للکار کو سُنتا، سمجھتا اور حسبِ ہدایت عمل بھی کر رہا ہے۔ دونوں مرغ چونچوں اور لاتوں سے لڑتے لڑتے لہو میں ڈوب جاتے تو برضامندیِ فریقین دونوں مرغ باز اپنے اپنے مرغ کو علیحدہ کر کے اٹھا لیتے اور مناسب تدارک کرتے تھے۔ یہ تدارک "پانی کرنا" کہلاتا تھا۔ مرغ باز اپنے اپنے مرغ کے زخمی سروں پر پانی چھوڑتے تھے، زخموں کا خون خود اپنے منہ سے چوستے تھے تاکہ خون کی روانی بند ہو جائے اور

کچھ ایسا تدارک بھی کرتے تھے کہ تھوڑی دیر میں مرغ چونچال ہو کر پھر لڑائی پر آمادہ ہو جاتے اور پالی میں اُتار دیئے جاتے تھے۔ ہر لڑائی میں جو کئی کئی دن تک بلکہ کبھی کبھی دس بارہ روز تک چلتی تھی یہ تدارکی عمل وقفہ وقفہ سے ہوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی کسی ایک مرغ کی چونچ بھی ٹوٹ جاتی تھی تو مرغ باز فن کاری سے اُس کو درست کر دیتے تھے اور لڑائی جاری رہتی تھی لیکن جب ایک مرغ زخم خوردہ ہو کر اُٹھنے کے قابل ہی نہ رہتا یا کسی اور سبب سے لڑائی کے قابل نہ رہتا تو دوسرے مرغ کی فتح کا اعلان ہو جاتا اور اُس کا مالک کامران ہوتا تھا۔

دوسری بازیوں کی طرح مرغ کی لڑائی میں بھی شرطیں لگائی جاتی تھیں اور ہار جیت ہوتی تھی۔ یہ شرطیں ہر بازی میں لگتی تھیں اور اس ہار جیت میں تماشائیوں کا بھی حصّہ بقدر حصّہ ہوتا تھا۔ وہ لوگ بھی باہم دگر شرطیں لگایا کرتے تھے۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ مرغ بازی کے مقابلے اچھے خاصے گراں اور قیمتی پڑتے تھے لیکن ان میں لمبی لمبی شرطیں نہیں لگائی جاتی تھیں جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ مرغ کی لڑائی میں فتح و شکست کا اندازہ کر لینا قریب قریب محال تھا اس کے برعکس تیتر کی لڑائی میں جہاں امرا و روسا کبھی شرکت نہیں کرتے تھے ہزاروں کی ہار جیت ہو جاتی تھی جس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ تیتروں کے بارے میں قیاس آرائی سہل تھی یا پھر متعدد آدمی شریک ہو کر شرطیں لگاتے ہوں گے۔ یہ شوق بہر حال کہاروں اور اسی درجہ کے دوسرے طبقوں میں محدود تھا۔ وہ دور بہر حال ختم ہو گیا اور اب جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ صرف اپنی ہوسناکیوں کو تسلّی دینے کے برابر ہے۔

تیتر پالنے اور کبھی کبھی لڑانے کا شوق اب بھی کہاروں وغیرہ میں پایا جاتا ہے لیکن مرغ بازی یک لخت طاقِ نسیاں کی زینت بن چکی ہے اور اصل اصیل مرغ کہیں نظر نہیں آتا۔

## (۴) پتنگ بازی

لفظ پتنگ صرف بازی کے ساتھ استعمال ہوتا آیا ہے ورنہ شرفا کی زبان پر ہمیشہ ,, کنکوا ،، رائج رہا جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ کنکوا لڑانے اور اونچا اُڑانے کے دلدادہ تھے ,, پتنگ ،، میں ہر نوع کے کنکوے شامل تھے پتنگ دنیا بھر کے قریب قریب ہر ملک

میں کسی نہ کسی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی تاریخ سے قطعِ نظر ہندوستان کے تمام صوبوں میں بھی اس کے اڑانے کا چلن تھا اور ہے۔ لیکن ہندوستان بالخصوص لکھنؤ میں اس کی تاریخ ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ ابتداً پتنگ اڑائے جاتے تھے، لڑانا بہت بعد میں سیکھا گیا۔ یہ سچ ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد میں جن کنکووں کے نام ملتے ہیں اُن میں "بانچی" بھی شامل تھی۔ یہ چھوٹا کنکوا لڑانے کے لئے ہی ہوتا ہے اس لئے یہ رائے قائم کرلینا غالباً صحیح ہوگا کہ اسی عہد سے کنکوا لڑانے کا چلن رائج ہوگیا تھا۔ پھر بھی بیسویں صدی کے اوائل میں راقم نے رئیسوں کو وہ مخصوص پتنگ اڑاتے دیکھا تھا جو بہت پرانی واضع کے تھے اور جن میں بعض کا لڑانا ممکن ہی نہ تھا اُن کے نام تھے "تکل"، "مکڑ"، "آدم"، "اژدھا"۔ تکل مختلف صورتوں کی ہوتی تھی دوتاؤ کاغذ کی ایک تکل بنتی تھی جس میں دوسیدھے ٹھڈے اور بیچ کے جوڑے حصہ کے اوپر اور نیچے دو کانپیں لگتی تھیں۔ نیچے دُم یا جُھل جُھل لگتی تھی۔ اس پتنگ کا ساز و سامان اُس زمانہ میں بھی گراں تھا۔ راقم نے خود کبھی نہیں دیکھا لیکن معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ بعض منچلے رئیس اس کا پیچ لڑا لیتے تھے جس پر فی پیچ دو ڈھائی سو روپیہ صرف ہوجاتا تھا۔ مکڑ پتنگ بنانے کے لئے پہلے مکڑی کی شکل کا غذ کا گردہ کاٹ لیا جاتا تھا پھر اس میں گٹ خنے بنا کے تاگے جوڑے جاتے تھے۔ ساخت کے اعتبار سے اس کے لئے سولہ ٹھڈے اور چار کانپیں ضروری ہوتی تھیں عموماً ایک تاؤ اور کبھی کبھی دوتاؤ کا مکڑ بنتا تھا۔ آدم اور اژدھا کے بنانے کا بھی یہی اسلوب تھا البتہ بہت سے جوڑ بند بنانا پڑتے تھے جس کے لئے متعدد کانپوں اور ٹھڈوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ بانچی بہت چھوٹی اور خوبصورت کنکیا ہوتی تھی جس میں منقشی جھل جھل اور تصویریں ہوا کرتی تھیں اڑنے میں بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ بعض بیگمات نے بھی بانچی لڑانے میں بہت مہارت حاصل کرلی تھی۔ آدم، مکڑ اور اژدھا بازوں کے موسم میں جب بندھی ہوئی ہوا ہوتی تھی رئیس بڑھاتے اور تھوڑی دیر کے بعد اتار لیتے تھے بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں پتنگوں کے سارے اقسام متروک ہوگئے تھے اور موجودہ شکل کا کنکوا اڑانے اور لڑانے کے لئے مخصوص ہوگیا تھا۔

کوئی شوق بھی جب فن بن جاتا ہے تو اُس کے تمام لوازمات تیار کرتے ہیں

ہنر مندی درکار ہوتی ہے چنانچہ کنکوا بنانا، سادی تیار کرنا، مانجھا سوتنا اور چرخی کھڑا نا سب ہی میں فن تھا کیونکہ کنکوا اچھا ہو تو پیچ اچھا لڑے۔ سادی چکنی اور مضبوط ہو تو کنکوا دور تک اڑے، مانجھا عمدہ ہو تو پیچ کاٹنے میں مدد ملے چرخی چکنی ہو تو آسانی سے ڈور پھینکے ان تمام ضرورتوں کو فراہم کرنے میں ہنر مندوں نے بہترین ہنر دکھائے تھے اور فن کاری کے اعلا ترین نمونے پیش کیے تھے۔

پرانے زمانے میں بلجیم کا بدیسی کاغذ کنکووں میں استعمال ہوتا تھا۔ ہر رنگ کے تاؤ ہوتے تھے اور تخمیناً پچاس برس قبل اُن کی قیمت دو روپیہ فی رِم تھی۔ ہمارے صنّاع بڑی کوڑیوں سے کاغذ کو گھوٹتے تھے اور نقش ابھار لیتے تھے چارخانہ کی صورت جو جھکیا کہلاتی تھی جو کاغذ پر کوڑیوں کے گھسنے سے تیار ہوتی تھی یہ فن اتنا ترقی پذیر تھا کہ سادہ کاغذ چارخانہ دار لہریا دار اور دوسری طرز کی لکیروں سے دیدہ زیب بن جاتا تھا۔ یہی فن اور آگے بڑھا تو ہمارے ہنر مندوں نے اچھے سے اچھے نقوش انار دانہ قریب قریب لکیریں کھینچ کر تیار کر دیئے تھے۔

کنکوے کے اوپر قوس کی شکل میں کانپ اور درمیاں میں لانبا ٹھڈا ہوتا ہے۔ ان دونوں کو تیار کرنے کے لئے بنگال کے بانس کی کھپچیاں استعمال ہوتی تھیں اور حتی المقدور ایسی کھپچیاں منتخب ہوتی تھیں جن میں دو سے زیادہ پوریں نہ ہوں۔ بہترین کنکوا وہ ہوتا تھا جس کے کانپ ٹھڈوں میں کوئی پورا نہ ہو، ایک پور والے قابلِ قبول ہو جاتے تھے لیکن دو پوروں والے کانپ ٹھڈوں کے کنکووں میں کنکوا بنانے والی کی ہنر مندی کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ تین پور والی کھپچیاں اچھے اور بڑے کنکووں میں استعمال نہیں ہوتی تھیں۔ کانپ میں یہ صفت دیکھی جاتی تھی کہ کنکوا سیدھا اڑے، اڑائے نہیں اور ٹھڈے کی یہ تعریف تھی کہ کنکوا بے جھول یعنی سڈول اُڑے۔

کنکوے کے جزائے ترکیبی میں نیچے کی طرف دُہرے چپکائے ہوئے کاغذ کو جن کو پتلی پتلی تیلیوں کے سہارے لگایا جاتا ہے پتّا کہتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ کنکوے کا بیلنس برابر رہے۔ پہلے کنکووں کو پتّے کے بجائے مقیشی جھل جھل لگانے کا رواج تھا۔ اب پتا اس کا قائم مقام ہے۔ اسی قسم کی ایک اور ایجاد تھی جس کی وجہ سے کنکوّے کی ہئیت ہی بدل جاتی تھی اس طرز میں نیچے کا حصہ کم اور اوپر کا زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دو دو رنگ کے

کاغذ برابر سے لگا دیتے تھے لیکن اس میں جھل جھل ضرور لگتی تھی۔ اس کو جانگیہ کنکوا کہتے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب کنکووں کے نام رکھنے کا چلن رائج ہو گیا تھا۔

کنکوا سازی کے فن میں پیشہ ور دوکانداروں کے علاوہ بعض روسا و عمائدین بھی اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ دوکانداروں میں ڈیوڑھی آغا میر کے آغا صاحب جس شہرت کے مالک تھے اتنے ہی باکمال نواب مجید الدولہ کے صاحبزادے نواب پٹن صاحب اور نواب یوسف حسین خاں سکنہ عقب سلطان المدارس سکنہ سرا معالی خاں بھی تھے۔ آخر دور میں راقم کے عم محترم نواب فضل حسین خاں بہترین فنکاروں میں شمار ہوتے تھے وہ اپنے ہونہار اور رشید فرزند جعفر علی خاں اثر کے لئے کنکوے بنایا کرتے تھے۔ اثر مرحوم کو ان کے والد مرحوم ہی نے کنکوا اڑانا بھی سکھایا تھا۔ اثر مرحوم کا شمار بہترین کنکوا اڑانے والوں میں تھا۔

کنکووں کی قسموں کا تعین قد و قامت اور ان کے رنگ کی بنا پر ہوتا تھا۔ قد و قامت میں آدھے تاوے کے پون تاوے اور ایک تاوے اب تک رائج ہیں لیکن روسا و عمائدین سوا تاوے، ڈیڑھ تاوے اور کبھی کبھی دو تاوے کنکوے بھی اڑاتے تھے نام رکھنے میں کنکوا کاغذ کے رنگ سے پکارا جاتا تھا جیسے سفید، ہرا، نیلا، سرمئی وغیرہ۔ لکھنؤ والوں کے شوق رنگینی نے مختلف رنگ کے کاغذوں کو آپس میں چسپ کرا کے ان اقسام میں بکثرت اضافے کرا دیئے تھے۔ اس طرح ہر مخصوص طرز ایک علیحدہ کے نام کی مالک ہو گئی تھی۔ مثلاً چپ دو رنگ کا کاغذ درمیان میں جڑا ہوا، پٹی دار لمبائی میں دو رنگ کی پٹیاں بھیئیر یا پانچ رنگ کی لمبی پٹیاں، سلیمانیہ چپ میں تیسرے رنگ کی پٹی طوقیہ اوپر کی طرف طوق، طوقیہ آنکھوں دار، طوقیہ مچھلی دار، طوقیہ صراحی دار جن میں طوق کے ساتھ آنکھیں مچھلیاں اور صراحیاں بنی رہتی تھیں، بدھی دار، چاند تارا، رنگ دار، دوپٹا، دو بازہ دونوں بازو علیحدہ علیحدہ رنگ کے، گل چینیا پتے کے اوپر دوسرے رنگ کا کاغذ لگا ہوا، پھاڑیا جدھر پہاڑ نما چار ٹکڑے دو دو ٹکڑے دونوں طرف لگے ہوئے، کرونديا نصف سرخ نصف سفید الفیا بیچ میں الف بنا ہوا الفیا یا ندار الفیا میں دونوں طرف پان بنے ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ رنگ میں انگ، ملانے میں اور آگے بھی جدت طرازیاں ہوئیں۔ کنکووں کی تصویروں سے بھی آرائش ہونے لگی۔ کنکوے پر سانپ مینڈھک کو نگلتے ہوئے دکھایا گیا وغیرہ وغیرہ

بدھیاں جوڑنا، پٹیاں لگانا، تصویریں کاٹ کر پیوست کرنا اور یہ ساری کاریگری اس طرح ہوتی تھی کہ جوڑ نہ دور سے معلوم ہو اور نہ کھلنے پائے۔ یہ ساری ہنرمندی اب ایک افسانہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

زمانِ حال میں کنکوا مانجھے اور ڈور کے ذریعہ اڑایا اور لڑایا جاتا ہے۔ پرانے زمانہ میں مانجھے کو ڈور کہتے تھے اور ڈور کے بجائے سادی کا لفظ مستعمل تھا۔ کنکوا لڑانے میں اوپر مانجھا بقدرِ ضرورت باندھا جاتا تھا اور پیچ کی لمبائی کا تعین سادی سے ہوتا تھا۔ اصلی سادی تخمیناً پچاس برس قبل ختم ہوگئی تھی اور اس کی جگہ پر جرمنی اور جاپان کی پھرکیاں استعمال ہونے لگی تھیں۔ اب وہ بھی دستیاب نہیں ہیں فیکٹریوں کا بنا ہوا ڈورا استعمال ہوتا ہے اور وہی ڈور کہلاتا ہے۔ اصلی سادی لکھنؤ کی بڑی گراں قدر صنعت تھی۔ اس کے بنانے والے دریا پار آباد تھے اور اُن کی بستی ڈوروالا محلہ کہلاتی تھی۔ پرانے فنکاروں میں مدار نامی ایک شخص اور اُس کے ساتھی بے مثل سادی بناتے تھے۔ اُس کو بنانے کے لیے سوت صاف کر کے بٹ لیا جاتا تھا اور ایسے تاروں کو پرانے چاولوں کی چھنی ہوئی پیچ سے مانجا جاتا تھا۔ گول چکر میں گڑی ہوئی لکڑیوں پر سوت کے تار تنے رہتے اور مانجنے والے تیز رفتاری کے ساتھ اُن کو پیچ سے رنگتے تھے۔ مانجنے والوں کے ہاتھوں اور پیروں کی پھرتی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ الغرض منجھے ہوئے تاروں سے سادی تیار ہوتی تھی۔ معمولی اور سستی سادی دو یا تین تاروں سے بٹ کر تیار ہوتی تھی لیکن روسا اپنے اپنے مخصوص پسند کی بنواتے تھے جو پانچ سے سات، نو سے گیارہ اور تیرہ سے سترہ تاروں تک کی تیار کرائی جاتی تھی۔ یہ سادی بہت چکنی اور مضبوط ہوتی تھی۔ کنکوا اڑانے والوں کی نہ انگلیاں کٹتی تھیں اور نہ کنکوے پر ہوا کا وزن بڑھ جانے سے یہ سادی ٹوٹتی تھی۔

کنکوا لڑانے میں مانجھے کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ اسی کے بل بوتے پر پیچ کاٹے جاتے ہیں یوں تو ہاتھ کی ہنرمندی کو پیچ کاٹنے میں بڑا دخل ہے لیکن مانجھا اچھا نہ ہو تو ساری ہنرمندی بیکار ہو جاتی ہے۔ پرانے زمانہ میں مانجھا سادی پر تیار ہوتا تھا اور چونکہ مانجھے کے لئے مہین ہونا ضروری تھا۔ اسلئے اس کی سادی بھی مہین سے مہین تر پسند کی جاتی تھی اچھا مانجھا سوتنے کیلئے

مہین اور مضبوط سادی کے علاوہ اچھی تیار کی ہوئی لبدی اور فن کارانہ صلاحیت درکار ہوتی تھی لبدی بنانے کے لئے چاول نفیس شیشہ خوب کوٹ کر اور باریک کر کے چھالٹین میں چھانا جاتا تھا تاکہ میدہ کی طرح باریک ملائم ہو جائے۔ یہ چھنا ہوا شیشہ خوب گلے ہوئے چاولوں میں اس طرح ملایا جاتا تھا کہ آپس میں دونوں پیوست ہو جائیں پھر گھی کوار کا مغز، انڈوں کی پھٹی ہوئی سفیدی اور کوئی رنگ شامل کر کے لبدی تیار کر لی جاتی تھی۔ اس تیار شدہ لبدی کو کاغذ میں رکھ کر مانجھا سوتا جاتا تھا سوتنے والے گھوڑے کے بالوں کے ہلکے دستانے پہن لیتے تھے تاکہ لبدی گرم ہو کر سادی کے رگ و ریشہ میں اتر جائے اور اُن کے ہاتھ بھی محفوظ رہیں چاول اور انڈوں کی سفیدی شیشہ کی صلاحیت کو محفوظ کر دیتی تھی اور مانجھے میں چکناتی بھی آجاتی تھی۔ سادی پر سُتائی کا عمل دس پندرہ منٹ تک ہوتا تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ لبدی اچھی طرح دبا کر اور طاقت سے پھیری جائے اِس ہنر شعاری میں کاظم اور علی بخش کے نام دور دور تک مشہور تھے۔

کنکوے بازی میں چرخی کو بھی اہمیت ہے کیوں کہ پیچ لڑانے میں ڈور ہی پھینکتی ہے۔ چرخی کی ایجاد ہونے سے پہلے یہ کام گولوں اور اچکوں سے لیا جاتا تھا جن کے نام تک محو ہو چکے ہیں۔ یوں تو چرخی دکھانے کے لئے بعض رئیسوں کے یہاں آدمی ملازم تھے لیکن کسی مناسب اور موزوں جگہ پر اٹکا دینے سے چرخی آسانی کے ساتھ ڈور فراہم کر دیتی ہے۔ بشرطیکہ اچھی بنی ہوئی ہو۔ اچھی چرخی شیشم کی پرانی لکڑی سے بہترین طریقہ پر کھراد کے تیار ہوتی تھی اس کے خصوصیات تھے مضبوط ہونا، چکنی ہونا، اور بقدر ضرورت گہری ہونا، تاکہ زیادہ سے زیادہ مانجھا اور سادی چڑھانے کے بعد بھی ہلکی رہے۔ رئیسوں کی چرخیوں میں ڈنڈی کے اوپر چاندی اور سونے کے پتر چڑھے رہتے تھے۔ عام چرخیوں پر بھی دونوں طرف پہیوں کے اوپر پیتل کے پان جڑے رہتے تھے جو چرخی کو جاذب نظر بنا دیتے تھے۔

اس زمانہ کے بہترین چرخی بنانے والوں میں باغ مکا کے متن صاحب اور سعادت گنج کے چھوٹے صاحب بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان لوگوں کے بعد وہ پرانی چرخیاں بھی ختم ہو گئیں اور اب پلاسٹک کی چرخیاں ان کے قائم مقام ہیں۔

کنکوا لڑانے میں لکھنؤ والوں نے نفاست و نزاکت کے جو مظاہرے کیے تھے

وہ اب یہاں سے بھی مفقود ہیں۔ کنکوے صرف موسمِ سرما میں اُڑائے اور لڑائے جاتے تھے اور اس موسم میں بھی اگر ہوا او پر بندھی ہوئی نہ ملتی تو کنکوے اتار لئے جاتے تھے۔ صاحبانِ ذوق اپنے اپنے کوٹھوں پر کنکوے بڑھاتے اور لڑاتے تھے رفتہ رفتہ افراد کی ٹولیاں معرضِ وجود میں آئیں لیکن محل تعریف میں بہترین لڑانے والوں ہی کے نام لئے جاتے تھے اس نبرد آزمائی میں بڑے بڑے مقابلے ہوتے تھے لیکن روسا وعمائدین شرطیں لگا کے کبھی میدان میں نہیں اُترے۔

کنکوا کس طرح لڑایا جاتا ہے اس کے بارے میں صرف اتنا ہی الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہے کہ جیامٹری کے اصولوں کے تحت زاویئے بنا کے قط دیئے جاتے ہیں۔

عام طور سے۔ اوپر، نیچے، داھنے اور بائیں سمت سے زاویئے بناتے ہیں۔ اوپر سے حملہ کرنے والے زیادہ تر اپنے کنکوے کو ڈھیل دے کر قط دیتے ہیں۔ نیچے والے کنکوا گھسیٹ کر زاویہ بناتے اور قط دیتے ہیں۔ داہنے اور بائیں جانب سے حملہ آور بہت سے علحدہ علحدہ کرتب دکھاتے ہیں۔ پیچ کاٹنے کے لئے ہر حال میں صحیح زاویہ اور مناسب قط ضروری ہے بظاہر یہ ترکیبیں سہل معلوم ہوتی ہیں لیکن جب دونوں طرف فن کار ہوں تو ایک ایک پیچ میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔

پیچ لڑانے میں اکہرا پیچ پہلے بھی رائج تھا لیکن بعض استادوں نے دُہرا پیچ لڑانا ایجاد کر لیا تھا یہ لوگ اوپر سے کنکوے کو غوطہ دے کر مانجھے سمیت مخالف کے کنکوے کے پار اس طرح لے جاتے تھے کہ مانجھے سے مانجھا نہ لڑنے پائے اور پلٹ کے نیچے سے زاویہ بنا کے ایسا قط لگاتے تھے کہ مخالف کا کنکوا فوراً کٹ جاتا تھا۔ اس فن کے بہترین ماہر شہزادہ نواب سلطان بخت بہادر تھے۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ وہ پہلے کچھ دور تک کنکوا بڑھا کے آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، داہنے بائیں، غوطہ دے کر، گھما پھرا کے اور گھسیٹ گھسیٹ کے کنکوے کی صلاحیت اور ہوا کی موزونیت کا جائزہ لیتے تھے۔ ہر طرح کا اطمینان حاصل کر لینے کے بعد کنکوا بڑھاتے اور دور پہ پیچ لڑاتے تھے اُس زمانہ میں اچھے پیچ کئی کئی سو فٹ کی دوری پر لڑائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کنکوا اتنا دور ہو جاتا تھا کہ اُس کو آسانی سے دیکھ لینا ہر شخص کے بس میں نہیں ہوتا تھا۔

کنکوا لڑانے میں ساز و سامان کی نفاست و عمدگی کے علاوہ لڑانے والے کی ہنرمندی اور آزمودہ کار ہاتھوں کی صفائی زیادہ جوہر دکھاتی ہے۔ اُن لوگوں کے ہاتھ بھی منجے ہوتے تھے اور دلوں میں خود اعتمادی بھی ہوتی تھی۔ انھیں فن کاروں میں ایک گراں قدر ہستی نواب محمد ہادی علی خاں والد رفیق الدولہ ساکن کشمیری محلہ کی تھی جن کا آخری دور میں کوئی مثل و نظیر نہیں تھا۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ جارج پنجم کی جوبلی کے موقع پر کنکوا لڑانے کے لئے جب وہ دلی بلائے گئے تھے تو وہ اپنے ہمراہ چرخی، مانجھے کا ایک تکلا اور صرف ایک کنکوا لے کر گئے تھے۔ تکلا مانجھے کو ایک ہاتھ پر انگوٹھے اور چھنگلیا کی حرکت کے سہارے لپیٹ کر بنایا جاتا ہے اور صرف ایک پیچ کے لئے کافی ہوتا ہے۔ موصوف اتنا ہی سامان لے کر دلی گئے تھے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے پیچ کاٹ کر وہی سامان اپنے ہمراہ واپس لے آئے تھے۔

ایک کنکوے سے ہرا چھا لڑانے والا متعدد پیچ کاٹ دیتا ہے لیکن اگر کسی ایک میدان میں ایک کنکوے سے کوئی ایک لمبا پیچ لڑانے والا نو پیچ کاٹ دیتا تھا تو اُس کی بڑی قدردانی ہوتی تھی اور وہ کنکوا فوراً اتار کے محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ ایسے کنکوے کو نوشیرواں کہتے تھے۔ برادر مرحوم مرزا جعفر علی خاں اثر کے پاس ایسے متعدد کنکوے محفوظ تھے۔ کہا جاتا تھا کہ نوشیرواں کا پنہ نوچ کے مخالف پارٹی کے لیڈر یا اس فرد سے جو شکست خوردہ ہوتا دستخط کرا لئے جاتے تھے لیکن ہمارے خاندان والوں نے نیز اُن دوسرے روسا و عمائدین نے جن سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے اپنے مدمقابل سے اُس کی شکست خوردگی تسلیم کرانے کا کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔

کنکوا بازی کے شوق نے لکھنؤ میں ہر طبقے کے لوگوں کو کسی نہ کسی نہج سے متاثر کیا تھا جو لوگ خود نہیں لڑاتے تھے وہ کنکوے جھپٹاتے اور ڈور لوٹتے تھے۔ یہ مشغلے بھی غریبوں کی آمدنیوں کا ذریعہ بن گئے تھے کنکوا جھپٹانے والے کنکوا بازی کے میدان سے فاصلہ پر اپنی بازی گری دکھاتے تھے بعض ایسے مشاق تھے کہ بلا تکلف کٹا ہوا کنکوا اپنے کنکوے میں جھپٹا لیتے تھے۔ یہ شغل اب بھی ہوتا ہے لیکن موجودہ زمانے والے مانجھے یا ڈور کے بجائے تار جن میں ہلکی لکڑی یا کاغذ کی گلیاں بندھی ہوتی ہیں استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے تار بہرحال ضروری ہوتا ہے ڈور لوٹنے

والے کنکوے کے میدان کے قریب یا متصل مکانوں کی چھتوں پر اپنا شوق پورا کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی لڑانے والے کی ڈور لوٹنے کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کئی کئی آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ لوٹنے کا انداز یہ تھا کہ اِدھر کسی لڑانے والے کی ڈور میں جھول آیا لوٹنے والے نے سمجھ لیا کہ پیچ کٹ گیا اور اُس نے فوراً لنگر مار کے ڈور گھسیٹ لی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ غلط فہمی میں لنگر مار دیا جس کے نتیجہ میں کنکوا لڑانے والے کا پیچ کٹ جاتا تھا۔ ایسے موقع پر اکثر اور بیشتر لنگر مارنے والے کو تلاش کر کے سزا دی جاتی تھی۔ اس طرح ڈور لوٹنے کو مرپٹیا کاٹنا کہا جاتا تھا۔

یہ شوق بہت چھوٹے چھوٹے بچوں میں بھی تھا اور اب بھی ہے۔ یہ بچے میدانوں میں جمع ہو کر آپس میں کئی کئی بالشت کے فاصلہ پر پیچ لڑاتے ہیں۔ جس کی پتنگ کٹ جاتی وہ اس کو اٹھا لاتا ہے اور اسی سے اپنا مشغلہ کافی دیر تک جاری رکھتا ہے۔ انھیں بچوں کا ذوق فراہم کرنے کے لئے پرانے کنکوا بنانے والوں نے بہت چھوٹی چھوٹی کنکیاں بنانا شروع کر دی تھیں جو دھیلے اور دمڑی میں بھی مل جاتی تھیں۔ ایسی پتنگوں کو دھیلچیاں اور دمڑجیاں کہتے تھے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی کنکیاں بھی بہت اچھی اور خوبصورت ہوتی تھیں۔ یہ فن کاری بھی ختم ہو گئی

## (۵) میلے اور دیگر تفریحی اجتماعات

شہر لکھنؤ کی قدیم معاشرت میں تفریحی اجتماعات کا بھی ایک مخصوص مقام تھا۔ ان میں بعض نششتیں روسا وعمائدین کے یہاں ہوتی تھیں جن میں اعزا واحباب ہی شرکت کرتے تھے اس لئے ہم ان کو روسا وشرفا کے تفریحی اجتماعات قرار دیتے ہیں۔ یہی نشستیں اور مختصر ہو جاتی تھیں تو رئیسوں کے ذاتی تفریحی مشاغل تک محدود رہتی تھیں۔ ایسے اجتماعات میں عوام کا گزر نہیں ہوتا تھا لیکن اُن کے لئے بھی دلچسپیوں میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اُن کے اجتماعات دوسرے رنگ سے دوسرے مقامات پر ہوتے تھے جن میں بسا اوقات شرفائے لکھنؤ بھی وقتی طور پر شرکت کر لیتے تھے۔ طبقاتی نظام کے دور میں پست طبقہ بھی تھا۔ اس طبقہ کے لوگ بھی

اپنے ذوق و شوق کو اپنے مذاق کے مطابق آسودہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خوشحالی اور فارغ البالی کے زمانہ میں ہر انسان کے لئے تفریح اور دلچسپی کے مشغلے ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن لکھنؤ کو یہ خصوصیات حاصل رہی ہے کہ یہاں کے لوگوں کی تفریحوں اور دلچسپیوں میں بھی افادیت کے پہلو بھی برابر شامل رہے ہیں جیسا کہ سطورِ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

روسا و عمائدین کے یہاں بڑے تفریحی اجتماعات میں کشتی لڑانے ڈنڑ پیلنے اور مگدر ہلانے کا دستور تھا۔ ڈنڑ پیلنا اور مگدر ہلانا ذاتی فعل تھا جو تنہائی میں ہوتا تھا لیکن کشتی لڑنے کے سلسلہ میں ان ورزشوں پر بھی مباحثے ہوتے تھے اور ہر ایک اپنی اپنی فنی صلاحیتوں کے تذکرے کرتا تھا۔ کشتی لڑنا بہر حال ایک مرغوب شوق تھا۔ رئیسوں کے یہاں اپنے اپنے اکھاڑے بنے ہوئے تھے اور کشتی سکھانے کے لئے فنکار ملازم تھے۔ ایسے مواقع پر اعزا اور مخصوص احباب جمع رہتے اور کشتی لڑانے کے قبل اور بعد بھی صحبت جمع رہتی تھی۔ بعض رئیسوں کے یہاں ایسی بھی صحبتوں کیلئے کشتی لڑنا ایک ضمنی فعل ہوتا تھا۔ کشتی کے فن پر گفتگو زیادہ اہم مشغلہ رہتا تھا۔ یہ شوق شرفا اور عوام میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ بہت سے شرفا نے بھی اپنے اپنے گھروں میں اکھاڑے بنوا لئے تھے اور اُن کے دوست نیز ہم محلہ کشتیاں لڑا کرتے تھے۔ عوام کے اکھاڑے علحدہ تھے۔ جن میں بلوچپورہ اور جھوائی ٹولہ کے اکھاڑے بڑی مرجعیت کے مالک تھے۔ جھوائی ٹولہ میں ایک صاحب جو چھوٹے سید کے نام سے مشہور تھے اس فن میں کمال رکھتے تھے اور وہی عام لوگوں کو کشتی لڑنا سکھایا کرتے تھے روسا و شرفا کے انھیں اجتماعات میں بہت سے دوسرے فنوں کے بھی چرچے رہتے تھے اور بہت سے لوگ ان کے ماہر بھی تھے۔ انھیں فنوں میں سپہ گری بالخصوص تلوار کی لڑائی کا فن بھی داخل تھا۔ اس فن کے دلدادہ علما بھی تھے۔ خاندان اجتہاد یعنی خانوادۂ غفران مآب میں اس فن کو سیکھنے اور سکھانے کا بڑا ذوق تھا۔

فنِ سپہ گری کے ذیل میں بعض اور فنون بھی داخل تھے۔ مثلاً علی مدد، برچھا ہلانا، تیر اندازی وغیرہ لیکن ان فنوں کو سیکھنے کا روسا شرفا کے علاوہ عوام کو کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ لکڑی چلانے کا فن تھا جس کا ایک طرز علی مدد کہلاتا تھا جس کے بارے

ہیں یہ کہا جاتا تھا کہ ہر کس و ناکس کو یہ فن سکھانا ہی نہیں چاہیے۔ رئیسوں کے یہاں چھوٹے چھوٹے اجتماعات ہوتے تھے جن میں یہ فن سیکھے اور سکھائے جاتے تھے۔ شرفا بھی تعلقات کی بنا پر شرکت کرتے تھے اور فنون میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن راقم کو ایسے باکمال لوگوں کے نام کبھی معلوم نہیں ہو سکے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ نام معلوم کرنے کے مواقع ہی فراہم نہیں ہوئے البتہ ایک فن ایسا تھا جس کو سیکھ کر بعض شرفا نے کمالات دکھائے تھے اور اپنے لیے کار آمد ثابت کیا تھا۔ وہ بنوٹ کہلاتا تھا۔ اس لفظ کا صحیح لغوی تلفظ بنوٹ ہے لیکن لکھنؤ والوں نے نزاکتِ زبان کا لحاظ کر کے 'ن' کی تشدید کو جزم سے بدل دیا کیونکہ تشدید کی آواز کے فوراً بعد "ٹ" کا صوت گوشِ فصاحت پر گراں گزرتا تھا۔ اس طرح یہ لفظ غلط العام ہو کر اب صحیح بنوٹ ہے۔ اس فن کا ماہر متعدد آدمیوں سے تن تنہا مقابلہ کر کے اپنے کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ محلہ گولا گنج کے ایک رئیس شیدی عنبر کا واقعہ راقم کو بذاتِ خود معلوم ہے۔

شیدی عنبر کثیر جائداد کے مالک تھے اور ان کو متعدد فنون سے دلچسپی تھی۔ بنوٹ میں انھوں نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ زمینداری کے سلسلے میں ان کے ایک حریف ان کی جان کے دشمن ہو گئے تھے اور ان کو مار ڈالنے یا مارنے پر کچھ لٹھ بند تعینات کر دیے تھے۔ پھر بھی شیدی صاحب پر خود اعتمادی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور ان کے معمولات بدستور برقرار تھے۔ وہ شام کو روزانہ پیدل ہوا خوری کو نکلتے تھے اور اس سڑک سے جو اب بلرام پور ہسپتال کے متصل ڈھال میں اترتی ہے ریذیڈنسی جایا کرتے تھے۔ اس روز شام کو انھوں نے کچھ سرہنگ آدمیوں کو لاٹھیوں سمیت مقابل سے آتے دیکھا۔ حسبِ رواج ان کی گردن اور شانے پر ایک بڑا رومال پڑا تھا۔ انھوں نے فوراً رومال اتار کر کھول ڈالا اور اس کے ایک کونے میں جیب سے نکال کر ایک پیسہ باندھ لیا۔ آنے والوں نے لاٹھیاں تان کر حملہ کرنا ہی چاہا تھا کہ انھوں نے پینترا بدل کے ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔ جس کے سر پر رومال میں بندھا ہوا پیسہ لگ جاتا وہ زمین پر گر پڑتا۔ دو تین آدمی اس طرح مضروب ہو کر گر پڑے اور باقی مفرور ہو گئے۔ شیدی صاحب صحیح و سلامت گھر واپس آ گئے۔

اس مقام پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ کشتی ہو یا سپہ گری، تلوار چلانا ہو یا بنوٹ دکھانا، ان تمام فنون کا شمار سنجیدہ ہنرمندی میں ہوتا ہے اور یہ اور بھی یقینی ہے کہ شاہی دور میں یہ تمام فنون بڑی ریاضت سے سیکھے اور سکھائے جاتے تھے۔ ان کا بڑا ذوق و شوق عوام و خواص میں تھا اور ان کو کار آمد بھی سمجھا جاتا تھا لیکن قدیم لکھنؤ کے آخری دور میں ہمارے

رؤسا و عمائدین ان کو صرف تفریحی مشغلہ کی طرح سمجھتے اور وقتی دلچسپیوں کا ذریعہ بنائے ہوتے تھے۔ ان فنون سے متعلق رؤسا کی محفلوں اور شرفا کی انجمنوں میں بڑے قصص و حکایات بیان ہوتے تھے جن میں سے بعض معجزہ اور کرامت کے درجے پر پہنچ جاتے تھے لیکن حقیقتِ امر یہ ہے کہ فنون کی برکتیں تفریحات میں گم ہو گئی تھیں اس لیے ہم نے بھی ان کا تذکرہ تفریحی اجتماعات کے ذیل میں پیش کر دیا۔

رؤسا و عمائدین کے محلوں نیز شرفا کے گھروں میں چھوٹی چھوٹی تفریحی صحبتیں آئے دن بلکہ قریب قریب ہر روز گرم رہتی تھیں۔ ان میں چوسر اور شطرنج کے کھیل گھنٹوں ہوا کرتے تھے۔ شرفا میں متعدد لوگوں نے ان فنون میں کمال حاصل کر لیا تھا اور ان میں کی ہر فرد کسی نہ کسی رئیس کی ڈیوڑھی سے منسلک تھی ایسے مواقع پر دوست احباب بھی تماشائیوں کی طرح جمع رہتے تھے جن کی حسبِ موقع و محل تواضع ہوتی تھی۔ ان کھیلوں کا شرفا میں بھی رواج تھا، ان کے یہاں مقابلتاً زیادہ مجمع لگا رہتا تھا۔ محلے کے لوگ آکر تماشائی بن جاتے تھے۔ لیکن عوام کا ان نجی صحبتوں میں کوئی گزر نہیں ہوتا تھا۔ جن رئیسوں نے ایسے کھیلوں میں مہارت حاصل کر کے شہرت حاصل کر لی تھی ان میں تالاب گنگنی شکل کے شاہزادہ چھبن صاحب اور شاہزادہ منجھو صاحب کے نامِ نامی زبان زد تھے اور شرفا میں آخری دور کے طاہر صاحب تقی صاحب اور لالہ بنڈل بڑے بڑے نام کر گئے تھے۔ چوسر کھیلنے میں تقی صاحب کی شہرت دور دور تک تھی اور ملک کے بہترین چوسر کھیلنے والوں میں ان کا شمار تھا۔

رؤسا کی انجمنیں ہوں یا شرفا کی صحبتیں عوام کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا ان کے لیے تفریح کے مقامات بازاریں تھیں اور چوک تھا۔ چوک میں چراغ جلنے کے قریب ہی سے ایک سمت زہرِ عشق کے دلدوز لہجہ میں پڑھے جانے کی آواز بلند ہونے لگتی تھی تو دوسری طرف داستان گوئی شروع ہو جاتی تھی۔ اس طرح تخاسؔ میں داستانِ امیر حمزہ سُنانا قریب قریب ہر روز کا ورد تھا۔ داستان گوئی ایک مخصوص ہنر بن گیا تھا۔ داستانِ امیر حمزہ بہت مقبول تھی لیکن داستان سرا کچھ اور قصے بھی سنایا کرتے تھے اور اس طرح سناتے تھے کہ واقعات کا پورا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔ زیادہ تر حسن و عشق کے افسانے ہوتے تھے لیکن ان کے تاثرات ہیجانی کیفیت پیدا کرانے سے زیادہ درس آموز ہوتے تھے۔ وہاں سے جو لوگ اٹھتے تھے وہ کچھ نہ کچھ اثر قبول کر کے اٹھتے تھے اس طرح سماج میں ایک طرح کی شیرازہ بندی کا کام یہ داستانیں کرتی تھیں۔ جو لوگ مجتمع ہوتے تھے وہ

متصل دوکانوں پر یا اپنے اپنے مقرر کردہ مخصوص مکانوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ ان میں بعض شرفا بھی ہوتے تھے حالانکہ اُن کی اکثریت اپنے اپنے محلے کے میرِ محلہ کے یہاں جمع ہوا کرتی تھی۔ انھیں عوامی نشستوں میں لوگ آپس میں ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے۔ ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے اور کبھی کبھی پہروں ضلع جگت میں ایک دوسرے سے خطابت بھی کرتے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں کو اپنی زبان نکھارنے کے لیے ایسے ہی تفریحی اجتماعات مواقع فراہم کرتے تھے۔

دوسرے محلوں میں بھی عوام کی نشستیں ہر شام کو ہوتی تھیں لیکن ایک ہی مذاق اور ایک ہی طرز کے لوگ۔ جمع ہو کر گھنٹوں اپنے اپنے پیشوں یا اپنی مخصوص دلچسپیوں کی باتیں کرتے تھے۔ باتیں کرنے میں پاٹا نالہ کے افیونی اور مکارم نگر کے زنخے اور ہیجڑے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ افیونیوں کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ لوگ بہت خوب کہانیاں بھی سناتے تھے۔ مکارم نگر میں فحشیات کا دور دورہ ہوتا تھا لیکن عام طور پر ہم قافیہ الفاظ استعمال ہوتے تھے اور ان کی گالیوں میں بھی ایک طرح کی ندرت ہوتی تھی۔ یہ لوگ تالیاں بجا بجا کے، ناچ گا کر اور باتیں بنا بنا کے اپنے گرد انبوہِ کثیر جمع کر لیتے تھے۔ مجمع بھی چھوٹے لوگوں کا ہوتا تھا جو ہنسی اور مذاق میں کافی وقت گزار دیا کرتے تھے۔ عوام میں، بہت سے لوگ نوٹنکی کے قدردان بھی تھے۔ مختلف محلوں میں مقررہ زمانہ اور وقت کے لحاظ سے نوٹنکی ہوتی تھی، نوٹنکی کرنے والوں کے گروہ ہوتے تھے۔ غالباً دو یا تین منڈلیاں شہر بھر میں تھیں اور ان میں بھی بعض آدمی مشترک تھے۔ ایک خوبصورت اور خوش گلو لڑکا ہیروئن کا پارٹ کھیلتا تھا۔ جہاں تک راقم نے سُنا تھا ہر مقام پر ایک ہی حسن و عشق کا افسانہ کھیلا جاتا تھا۔ کام کرنے والوں سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی پر ناٹک کی کامیابی کا دار و مدار ہوتا تھا رؤسا تو درکنار شرفائے لکھنؤ بھی نوٹنگی کبھی نہیں دیکھتے تھے۔ اس کھیل تماشہ کا پرانا طرز اب تک برقرار ہے لیکن پرانی شائستگی اور لطافتِ زبان مفقود ہے۔

شہر لکھنؤ کے ان تفریحی اجتماعات کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ گو کہ یہاں عوام نیز مالی اعتبار سے پست درجے والوں کا مجمع ہوتا تھا لیکن باہر کی دنیا کے لیے یہی لوگ ہماری قدیم شائستہ تہذیب کے نمائندے تھے۔ وہ لوگ بہت پڑھے لکھے اور عالم و فاضل نہیں تھے۔ لیکن ماحول کا یہ اثر تھا کہ جس کی زبان سے جو فقرہ نکلتا وہ گویا پھولوں کی ایک لڑی ہوتا تھا۔ جاہل سے جاہل شخص بھی اپنی زبان پر نظر رکھتا اور متانت اور سنجیدگی سے گفتگو کرتا تھا۔ ان اجتماعات میں بالکل آزادانہ طور پر نشستیں ہوتی تھیں لیکن آداب و تہذیب کے لوازمات برقرار رکھے

جاتے تھے۔ سودے والے سودے بیچتے رہتے اور داستان گو اپنا مشغلہ جاری رکھتے۔ کسی کا فعل دوسرے کے کاروبار میں خلل انداز نہیں ہوتا تھا۔ ایک دوسرے سے مربوط باہمدگر قربت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ وہ تماشا بہت دلفریب اور پُرکشش ہوتا تھا۔ جب ایک طرف گنے والے گنڈیریاں چھیلتے جاتے اور دوسری طرف داستان گو یا اُن کے ہمراہی افیون گھولا کرتے تھے۔ اُس آن دبان سے نہ کہیں گنڈیریاں چھیلی گئی ہوں گی اور نہ اس اہتمام سے کسی دوسرے شہر میں افیون گھولی گئی ہوگی جو ہمارے قدیم پاٹا نالہ اور نخاس کا طرۂ امتیاز تھا۔ داستان گویوں کو بھی جو زیادہ تر افیونی تھے وہ کمال حاصل تھا جس کی نظیر غالباً دنیا بھر میں کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ فی البدیہہ اور برجستہ قصے تصنیف کئے جاتے تھے جن میں حسن و عشق کی داستانوں کے علاوہ عندالضرورت رزم و بزم اور عیاری و مکاری کے افسانے بھی تراش لیے جاتے تھے۔ داستانوں میں جا بجا اشعار کی بہتات ہوتی تھی جن سے ہر فرد لطف اندوز ہوجاتی تھی اور سب ہی تلمیحات کو بھی ذہن نشین کر لیتے تھے کیونکہ قدیم لکھنؤ میں آخری دور تک یہاں کے در و دیوار شعریت و موزونیت میں سرشار تھے اور ہر شخص بقدر جثہ ادب نواز تھا۔ اسی موزونیت اور شعریت کی چھاپ اُن جم گھٹوں پر بھی نظر آتی تھی۔ جو دوسرے محلوں میں یہانتک کہ مکارم نگر میں بھی لگے رہتے تھے۔ پرانے لکھنؤ کی یہ بہار بیسویں دہائی کے اوائل میں مائل بہ خزاں ہوگئی تھی اور تیسری دہائی شروع ہونے کے قبل ہی ملیا میٹ ہوگئی۔ ان اجتماعات میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ ہر فرد ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی اور ایک ہی مزاج میں رنگی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ سب لکھنوی تھے، ان میں نہ کوئی ہندو تھا اور نہ کوئی مسلمان تھا، نہ کوئی شیعہ تھا اور نہ کوئی سنّی تھا۔ اخوت و محبت رواداری و پائیداری شرافت و انسانیت ہر ایک کی خو بو کی ناقابلِ علیحدگی جوہر تھے جن کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

اسی مزاج اور اسی نیک نہادی کا نتیجہ تھا کہ ان اجتماعات میں کبھی دو آدمیوں میں باہمدگر کوئی لڑائی جھگڑا یا مناقشہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ لوگ فرشتہ نہیں تھے، آپس میں اختلافات بھی ہوتے تھے اور شکر رنجیاں بھی پیدا ہوتی تھیں لیکن عوامی اجتماعات میں ایسے برسرپیکار لوگ ایک دوسرے سے کترا کے گزر جاتے تھے اور کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیتے تھے کہ ان کی باہمی کشمکش محفل کی گرمیوں کو ٹھنڈا کر دے۔ سماج میں بدقماش اور سرہنگ بھی تھے لیکن ان کی جگہ معاشرہ میں نہیں تھی۔ اس رکھ رکھاؤ اور شرافت و تہذیب کی بنیاد اس ترتیب پر قایم ہوئی تھی کہ عوام شرفائے لکھنؤ سے متاثر تھے اور شرفا اپنے مقام پر رؤسا و عمائدین کا تتبع کرتے تھے جو اخلاق و انسانیت

کا مجسمہ تھے۔ ان کی دولت و ثروت نے ان کو اور جس جس طرح سے بگاڑا ہو لیکن خصائلِ حمیدہ سے محروم نہیں کیا تھا۔

ان اجتماعات سے کہیں زیادہ پُرانے لکھنؤ کے باشندوں کی متانت و سنجیدگی، شرافت و تہذیب اور آہستہ خرامی و خوش گفتاری اُن مواقع پر واضح ہوتی تھی جب وہ خالص سیر و تماشا کے لیے میلوں میں تفریح کرتے تھے۔ ان میں سے بعض میلے ایسے بھی تھے جن میں رؤسا و عمائدین بھی اپنی اپنی سواریوں پر آتے اور بڑے ذوق و شوق سے تماشا کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں خواص و عوام سب ہی کے لیے مؤدب رہنا ضروری ہوتا تھا۔ ایسے میلوں کی تعداد بہرحال بہت کم تھی جن میں عمائدینِ شہر بھی شریک ہوتے تھے۔ بڑی تعداد ان میلوں کی تھی جو عوام کے لیے مخصوص تھے۔

میلے ہر ہر شہر، ہر قریہ اور ہر دیہات میں ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہوتے ہیں لیکن قدیم لکھنؤ کے میلوں کی ایسی شائستگی، صفائی اور دلفریبی کسی دوسری جگہ نہ دیکھی گئی اور نہ سُنی گئی۔ لکھنؤ کے میلوں کی طرح واجد علی شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں ڈالی تھی۔ قمری کلینڈر کے بموجب بادشاہ کی ولادت ماہ ذیقعدہ کی تیرھویں تاریخ کو ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی چھٹی کے موقع پر ان کی والدہ محترمہ نے ان کو جوگی بنایا تھا اور ان کی سالگرہ برابر جوگیا لباس میں ہوتی تھی۔ بادشاہ نے "میلۂ سلطانی" کی اسی تاریخ میں بنا رکھی تھی۔ کہنے کو وہ "میلۂ سلطانی" تھا لیکن تمام خواص و عوام کو شرکت کے لیے اذنِ عام تھا البتہ ہر شخص کے لیے جوگیا لباس میں آنا ضروری تھا۔ وہ خود بھی وہی لباس زیب تن فرماتے تھے اور تمام علما و فقہا، امرا و رؤسا، شعرا و ادیب نیز تمام شہری جوگیا لباس میں آتے اور میلے میں لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس "میلۂ سلطانی" کے مفصل حالات تاریخوں اور تذکروں میں مندرج ہیں۔ اس مقام پر صرف اتنا ہی بیان کر دینا ضروری ہے کہ اس میلے کی بنیاد پڑنے کے بعد ہی خواص و عوام کی دلچسپیوں نے سیکڑوں میلوں کی بنیادیں ڈال دی تھیں اور بادشاہ کی تاشی کرتے ہوئے وہی پرانی طرز ایک مدت تک برقرار رکھی گئی تھی۔ حالات و ضروریات نے بعد میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کیے لیکن پھر بھی بیسویں صدی کے اوائل تک کم ہونے پر بھی میلوں کی بہتات تھی اور بعض اب تک برقرار ہیں۔

لکھنؤ کے یہ پرانے میلے اپنی اپنی مخصوص نوعیت کے مالک تھے۔ ارزانی اور بے فکری کے دور میں ہر آدمی کو سیر و تماشا کا ذوق پیدا ہونا فطری بات تھی۔ رؤسا و شرفا کو تفریحات کے لیے مواقع اور مقدرت حاصل تھی لیکن عوام بالخصوص غریب عوام ایسے وسائل کے متلاشی رہتے تھے اس کے علاوہ

اس زمانہ میں صرف ایک بڑا خرید و فروخت کا مرکز چوک تھا۔ محلہ کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں روزمرہ کے خرچ کا غلہ یا دیگر اشیائے خوردنی دستیاب ہو جاتی تھیں لیکن دوسری ضروری اشیا کی خریداری کے لیے زحمت ہوتی تھی جب محلے محلے میلے لگنے لگے تو لوگوں کو بڑی سہولتیں ہو گئی تھیں۔ ہر محلے میں ہر ماہ میلہ لگتا تھا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے دکاندار زمین پر فرش بچھا کر اپنا اپنا سامان فروخت کرتے تھے یہ سامان متفرق چھوٹی چھوٹی چیزوں پر جن کی آئے دن ضرورت ہوتی تھی فروخت ہوتا تھا۔ بعض دکانیں نفائس کی بھی ہوتی تھیں۔ جابجا چھوٹی چھوٹی دکانیں مٹھائیوں اور پکوانوں کی بھی لگی رہتی تھیں جہاں سے سیر کرنے والے خریداری کر کے قرب و جوار میں کسی مقام پر بیٹھ کر کھا لیا کرتے تھے۔ بچوں کے لیے پرانے طرز کے جھولوں وغیرہ کا بھی انتظام بھی رہتا تھا۔ محلہ کے لڑکے میلے کے منتظر رہتے اور علیٰ ہذا ہمہ وقت میلہ کے اختتام تک کھیل کود کیا کرتے تھے۔ محلہ والے صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھومنے نکلتے تھے بعض لوگوں کے معطر لباس کی خوشبو سے راہیں بس جاتی تھیں۔ یہ میلے عموماً محلے والوں ہی کے لیے مخصوص رہتے تھے لیکن بعض اتنی شہرت کے مالک ہو گئے تھے کہ دوسرے محلوں کے لوگ بھی آ جاتے تھے آپس میں ملاقاتیں ہوتی تھیں اور بڑی چہل پہل رہتی تھی میلوں میں شہرت صفائی، طرح طرح کی خوبصورت چیزوں کی موجودگی اور آرائش و زیبائش کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اس زمانے میں بجلی کی روشنی نہیں تھی لہٰذا لوگ قندیلیں، شمعیں اور طوغین بڑی نفاست و نزاکت سے روشن کرتے تھے۔ جن میں تنوع بہت دیدہ زیب ہوتا تھا۔ یہ میلے دوپہر تک اپنے شباب پر آ جاتے تھے اور رات کو ختم ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں رات بہت دیر میں نہیں آتی تھی۔ نمازِ عشا کے چند ساعت بعد رات کا شمار لگ جاتا تھا۔

شہر کے تمام میلوں کے تفصیلات تو درکنار ان کی صحیح تعداد بھی بتانا بہت دشوار ہے۔ البتہ اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ بعض میلے مقررہ اوقات میں اور بعض مخصوص موسموں میں ہوا کرتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے مقامات حالات کے تحت بدلتے رہے تھے۔ مثلاً شہر کا ایک بہت پرانا میلہ تھا جو آٹھوں کا میلہ کہلاتا تھا۔ یہ ہولی کے آٹھویں روز تالاب گنگنی شکل میں لگا کرتا تھا۔ پھر یہ عیش باغ منتقل ہوا اور اس کی مرعیت میں کمی آ گئی۔ کچھ مدت کے بعد نخاس میں لگنے لگا تھا اور غالباً اب بھی کہیں نہ کہیں لگتا رہتا ہے اسی میلے کی طرح محلہ نگریان میں ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ جس میں خواص و عوام بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے۔

شہر لکھنؤ کا مرکزی مقام چوک تھا جہاں متعدد میلے لگتے تھے۔ محلہ وار سالانہ اجتماعات میں سب سے آخر کا میلہ چوک ہی میں لگتا تھا جس میں جوق در جوق لوگ بڑے اشتیاق سے شرکت کرتے تھے۔

سی محلہ میں کالی جی کا مندر بھی ہے۔ وہاں بھی ہر ہفتہ میلہ ہوتا تھا اور اس میلے میں بھی بڑے ہجوم لگے رہتے تھے۔ سالانہ میلوں میں علی گنج کا میلہ اب تک شہرت کا مالک ہے۔ کئی روز تک بازار گرم رہتا ہے گو کہ اب پہلی سی بات نہیں رہی لیکن اس میلے میں اب بھی مٹی کے برتن اور دیگر ضروریات کی چیزیں اچھی اور سستی مل جاتی ہیں۔ اس میلہ کو کاتک کا میلہ کہتے ہیں۔

بعض میلے مخصوص طبقوں کے نام سے مشہور تھے کیونکہ اسی طبقہ کے لوگوں نے ان کی بنا ڈالی تھی۔ ایسے میلوں میں سب سے نمایاں حیثیت مہتروں کے میلے کی تھی جو وکٹوریہ اسٹریٹ پر لگا کرتا تھا۔ یہ لوگ جھنڈوں میں طرح طرح سے ناریل باندھتے اور نیران کرتے تھے۔ انھیں جھنڈوں کے گرد اپنے مخصوص انداز میں ناچتے اور گاتے تھے۔ اچھا خاصہ مجمع لگ جایا کرتا تھا۔ شرفا اپنے اپنے بالا خانوں سے تماشا دیکھا کرتے تھے۔

متذکرہ بالا تمام میلوں سے بدرجہا زیادہ کچھ اور میلوں کی اہمیت تھی جو روسا و عمائدین کے نزدیک بھی قابلِ ستائش تھے اور جن میں وہ گراں قدر ہستیاں بھی شرکت کرتی تھیں۔ شہزادگان اور روسائے عظام اپنی اپنی سواریوں پر تشریف لاتے تھے اور انھیں سواریوں پر ٹھہر کر یا گھوم کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ جوق در جوق لوگ آتے رہتے اور جگہ جگہ جم غفیر لگا رہتا تھا۔ یہ میلے عیش باغ میں ہر سال ساون کے مہینے میں غالباً ہر جمعہ اور ہر ہفتہ کو لگا کرتے تھے۔ تال کٹورہ روڈ سے ملکہ جہاں کی کربلا تک لق و دق میدان میلہ گاہ تھا۔ اس میلہ میں تفریح کے جملہ سامان فراہم رہتے تھے۔ افیونیوں کی داستان گوئی اور دوسرے قصہ گو لوگوں کی چرب زبانی اپنے ارد گرد آدمیوں کے ٹھٹھ لگوا لیتی تھی۔ مٹھائیوں اور پکوانوں ایک سے ایک بہتر سجی ہوئی دکانیں جاذب نظر ہوتی تھیں اور بے ساختہ کچھ نہ کچھ خرید لینے پر طبیعت آمادہ ہو جاتی تھی۔ کھیل تماشوں کی بھی بہتات رہتی تھی جانور تماشے دکھاتے اور گھوڑوں پر کھیل ہوتے تھے۔ شہر کی تمام طوائفیں بھی ان میلوں میں بڑے شوق سے جایا کرتی تھیں۔ مختصر یہ کہ اہلِ لکھنؤ کے لیے فصل برسگال صحیح معنوں میں موسم بہار بن کر نمودار ہوتی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندوں میں جھولا جھول کر نوجوانوں کو گرم گرم پوریاں کھانے میں جو لذت ملتی تھی وہ اب خواب و خیال میں بھی باقی نہیں رہی کہ وہ میلے ہی نہیں رہے۔

دوسرا قابلِ ذکر اور گراں قدر میلہ "عید کے پیچھے ٹر" کہلاتا تھا۔ عیش باغ کی عیدگاہ میں عید کے دوسرے روز یہ میلہ پہلے بھی لگتا تھا اور اب بھی لگتا ہے۔ البتہ فرق یہ ہو گیا ہے کہ پہلی سی بہاریں نہیں اور نہ آدمیوں کا وہ ہجوم رہتا ہے۔ دوسرے میلوں کی طرح یہاں بھی بازار میں لگی تھیں

اور کھیل و تماشہ کے جملہ ساز و سامان فراہم رہتے تھے۔ مزید براں شہر کے تمام ممتاز افسیوں اور داستاں گو یہاں آتے اور داستانیں سنایا کرتے تھے۔ اُن کا ذوق و شوق اُن کے ساتھ رہتا لیکن دوسروں کے لیے ان کی دعوت حرف و حکایت بہت گراں قدر ہوتی تھی۔ یوں تو وہ متعدد افسانے سناتے تھے لیکن داستانِ امیر حمزہ اس طرح سناتے تھے کہ ہر روز سننے والوں کو بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔

شہر کا سب سے زیادہ صاف ستھرا، شستہ و شائستہ اور گراں قدر اجتماع ہولی کا میلہ تھا۔ جو اب تک گول دروازے کے مقابل کمپنی باغ میں لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شہر کے تمام دوسرے میلوں کا سلسلہ جن میں محلہ وار میلے بھی شامل تھے، ہولی کے میلہ ہی سے شروع ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں ہولی کھیلنے کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ یہاں رنگ رلیاں دوپہر تک ختم ہو جاتی ہیں اس کے بعد نہا دھو کر تمام شرفا سہ پہر کو اس میلے میں شرکت کرتے گھومتے پھرتے اور ایک دوسرے سے معانقہ کر کے ہولی کی مبارکباد دیتے تھے۔ بہتر سے بہتر پانوں اور نفیس سے نفیس عطر سے ضیافت ہوتی تھی۔ میلہ کے تفریحات علیحدہ رہتے شرفا و رؤسا کا باہمدگر معانقہ اور خلوص کی گفتگو اتنی بڑی نعمت تھی جس سے اب ہم محروم ہیں۔ عوام بھی بڑے سے بڑے لوگوں سے بغل گیر ہونے میں تکلف نہیں کرتے تھے۔ راقم کو اپنے عنفوانِ شباب میں اس میلہ میں بابو لشتیر ناتھ سریو دستوا اور پنڈت جگت نرائن مُلّا کے ہمراہ ایک بار اس میلے میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ عم محترم نواب غلام حسین خاں سے ان دونوں محترم ہستیوں سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ اسی رشتہ سے میں ان کو چچا کہتا تھا۔ اُس زمانے میں دستور تھا کہ ایسے مقامات پر جہاں سیر و تفریح غرض ہو بزرگ اپنے چھوٹوں کو ساتھ لے جاتے تھے۔ چنانچہ میں ہمراہ تھا اور ہمارا وہاں قیام بہ مشکل تین گھنٹہ رہا ہوگا لیکن وہ وقفہ چند منٹ کی مدّت سے زیادہ محسوس نہیں ہوا۔ شرافت و انسانیت، اخلاق و تہذیب اور اخوت و محبت کی جو جو مثالیں پیش ہوتی رہی تھیں وہ سب اب طاقِ نسیاں کی زیب و زینت بن چکی ہیں۔ یہ میلہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق یک جہتی اور ہم آہنگی اور انسان پرستی و انسانی دوستی کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں غالباً کوئی ایک مسلمان بھی ہولی کے دن رنگ نہیں کھیلتا تھا ہو سکتا ہے کہ جب بھی بہت لوگ ایسے رہے ہوں جو رنگ کھیلنا خلافِ شرع سمجھتے ہوں لیکن ہولی ملنے اور باہمی تعلقات میں عدیم المثال ہم رنگی تھی اور یہ اتحاد پُر خلوص تھا۔

اسی طرح بہت سی دوسری رنگینیاں بسنت کے موقع پر بھی چھائی رہتی تھیں۔ لوگ عام

طور سے بسنتی کپڑے پہن کر دھوم مچاتے اور نئی رُت کا خیر مقدم کرتے تھے۔ سرکاری دفتروں اور مٹھائی والوں کی دکانیں بڑی آرائش و زیبائش کے ساتھ جاذبِ نظر ہوتی تھیں۔ کپتان کے کنویں کے برفی والے اپنے خونچوں کو خوب سج کر اور رنگ رنگ کی مٹھائیاں لگا کر بڑی گرم جوشی سے دوکانداری کرتے تھے۔ چوک میں بالاخانوں پر بسنت کا سماں بہت دلفریب اور نظر فروز ہوتا تھا۔ ذوقِ تماشا میں نیچے جمِ غفیر لگے رہتے تھے۔ گول دروازہ کے متصل مٹھائیاں خریدنے کے لیے جمگھٹ نظر آتے تھے۔ بسنت کو یاد رکھنا اور بسنت منانا قومی فریضہ ہوتا تھا جس کی ادائی میں غفلت برتنے پر لوگ موردِ طعن ہو جاتے تھے چنانچہ یہ اصطلاح فراموش کاروں کے لیے رائج تھی کہ آپ کو بسنت کی خبر نہیں! "بسنت آمد فصلِ بہار کی رُت کا نام تھا اور اس فصلِ بہار کا جاڑے کے اختتام پر جشن منایا جاتا تھا۔ سردی کے موسم میں دیوالی کا سماں گرم جوشیاں پیدا کرتا تھا۔ رکاب گنج اور یحییٰ گنج کے محلے دلہن بنے رہتے تھے۔ یحییٰ گنج ظروف خریدنے کا مرکز تھا۔ ہر شخص کے لیے پیتل کا کوئی نہ کوئی برتن خریدنا ضروری ہوتا تھا اور ہر محلہ کی بازار میں شکر کے کھلونوں اور جُھڑوے کُرمُرے اور کھیلوں کی دکانیں لگائی جاتی تھیں جہاں کئی روز تک خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا تھا۔ دیوالی کا خاص دن آتا تو رات کو ہر گھر میں ننھے ننھے چراغ بڑی کثرت سے روشن ہو جاتے تھے۔ دیوالیوں کی ٹھنڈی روشنی دل کو اور آنکھوں کو نور بخشتی تھی۔ ان چراغوں سے سارا شہر جگمگا اُٹھتا تھا۔ اور ہمارے شہری جوق در جوق سیر و تماشا کے لیے گھوما کرتے تھے۔

مسلمانوں کے مذہبی تقریبات کے مواقع پر بھی میلے لگ جاتے تھے۔ اُن کے دو اہم تیوہار عید الفطر اور عید الاضحیٰ بڑے انہماک اور جوش سے منائے جاتے تھے۔ عید الفطر کے دن طرح طرح سے سوئیاں پکتی تھیں جن میں جعفرانی سوئیاں اور کھڑے دودھ کے ساتھ سوئیوں کا مزعفر بہت لذیذ، خوش رنگ اور خوش بودار غذائیں تھیں۔ انھیں سوئیوں میں رئیسوں کے علیحدہ علیحدہ مذاق کے تحت تنوع بھی تھا۔ چاندی اور سونے کے ورق سوئیوں کی پلیٹوں کو اور زیادہ دیدہ زیب بنا دیتے تھے۔ ہر آنے والے کی تواضع ہوتی تھی اور دوستوں نیز عزیزوں کے گھروں پر تحفے بھی بھیجے جاتے تھے، عید الاضحیٰ کے دن نمکینیت کا دور دورہ ہوتا تھا۔ مینڈھوں اور بکروں کی قربانیاں قریب قریب ہر گھر میں ہوتی تھیں۔ نہ صرف گوشت بلکہ گوشت کے لذیذ کھانوں کے بھی تورے دوستوں کے یہاں بھیجے جاتے تھے اور جو لوگ عید ملنے آتے ان کی تواضع پراٹھوں اور کباب نیز پلاؤ سے بھی ہوتی تھی۔ ان دونوں تیوہاروں کے دن لوگوں کی آمد و رفت سے سڑکوں پر بھی بہت چہل پہل رہتی تھی۔ ہندو

اور مسلمان سب بھائی بھائی تھے۔ ایک دوسرے کے گلے ملتے تھے اور ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کرتے تھے۔ نمازِ عید سے فراغت کرنے کے بعد مٹھائیاں خریدنا بالخصوص اگر بچے ساتھ ہوتے جو زیادہ تر ہوا کرتا تھا تو اور زیادہ ضروری ہوا کرتا تھا۔ مٹھائیوں کی دوکانیں آراستہ پیراستہ اور معطر ہوتی تھیں۔ مٹھائیوں پر سونے اور چاندی کے ورق جھلملاتے تھے جن کو دیکھ کر بچوں میں خریداری کا ولولہ اور تیز ہو جاتا تھا۔ مسلمان مٹھائی والوں کی مخصوص دوکانیں چوک میں مسجد تحسین سے متصل، پاٹا نالا پر اور ایک عبداللہ کی دوکان نظیر آباد میں مرجعِ خاص و عام رہا کرتی تھیں۔ ہندو حلوائیوں میں اعلیٰ درجہ کی دوکانیں گول دروازے سے متصل تھیں۔ اسی جگہ سے قریب رام آسرے کی برفی دور دور تک مشہور تھی۔ اس برفی کی حلاوت، صورت، خوشبو اور نفاست بھلائے نہیں بھلائی جا سکتی۔ لکھنؤ ایسا لٹا کہ ہر خوبی و نفاست خاک میں مل کر رہ گئی۔

اسی سلسلے میں بعض ایسے اجتماعات کا ذکر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا جو یقیناً تفریحی مشاغل کی فہرست میں شامل نہیں کئے جا سکتے لیکن ہماری قدیم معاشرت کا جزو لاینفک تھے۔ ایسے اجتماعات متبرک اور مقدس مقامات اور بزرگانِ دین کے مزارات پر ہوا کرتے تھے۔ ہمارے شہر میں صوفیائے کرام کے کئی مزارات ہیں جہاں عرس بھی ہوتے ہیں اور غزلیں اور قوالیاں بھی سنائی جاتی ہیں لیکن شاہ مینا شاہ صاحب کا مزار خصوصیت کے ساتھ خواص و عوام کی مرجعیت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں شاہ صاحب کا ہر سال عرس ہوتا ہے، جس میں قرآن خوانی، قوالی اور دیگر مراسم ادا ہوتے ہیں۔ اس موقع پر بڑے بڑے عقیدتمند حاضر ہو کر آستان بوسی کا شرف حاصل کرتے ہیں لیکن جس خاص رسم و رواج کا تعلق ہماری قدیم معاشرت ہے وہ ہر قمری ماہ کی پہلی جمعرات کو جو نوچندی جمعرات کہلاتی ہے، بڑے زور و شور سے ادا ہوتے تھے۔ چوک کی بڑی بڑی طوائفیں اس آستانہ پر حاضر ہونا اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتی تھیں۔ بڑی بڑی موسیقار وہاں جا کر قوالی گاتی تھیں اور سامعین محظوظ و مثاب ہوتے تھے۔ طوائفوں کی موجودگی اور ان کی موسیقی کی بدولت بڑے بڑے انبوہ لگ جاتے تھے۔ شہر کے عوام بلا تفریقِ مذہب و ملت اس دعوت چشم و گوش میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ رسم اب بھی جاری ہے لیکن پہلی عظمت ختم ہو گئی۔

## (۶) سنیما اور تھیٹر

بیسویں صدی کے اوائل تک لکھنؤ والوں کو سنیما سے کوئی قابلِ ذکر ذوق نہیں تھا

یوں بھی شہر بھر میں صرف ایک ہال تھا جو رنک تھیٹر کے نام سے موسوم تھا اور اُسی جگہ پر تعمیر تھا جہاں آج کونسل ہاؤس سے متصل بڑا ڈاک خانہ واقع ہے۔ اُس زمانہ تک بولتی ہوئی تصویروں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ رنک تھیٹر میں خاموش تصویریں اسٹیج پر نظر آتی تھیں۔ اور زیادہ تر رومانی ڈرامے پیش ہوتے تھے کبھی کبھی صلیبی لڑائیوں کے دور سے متعلق افسانے دکھائے جاتے تھے۔ تماشائیوں میں بہت بڑی اکثریت انگریزوں کی ہوتی تھی۔ تجارتی تماشا گاہ کی حیثیت سے یہاں یونائیٹڈ سروس کلب کی طرح ہندوستانیوں کے داخلہ پر کوئی قدغن نہیں تھی لیکن پھر بھی لکھنؤ کے شہری انگریزوں اور انگریزیت سے اتنے خائف اور بے زار تھے کہ وہ وہاں تماشا دیکھنے بھی نہیں جاتے تھے۔ ہندو اور مسلمان معدودے چند جاتے تھے اور یہ لوگ وہی ہوتے تھے جن کو انگریزی زبان اور انگریزی معاشرہ سے تازہ تازہ قلبی لگاؤ پیدا ہوا تھا۔ میرے بچپن کے دوست اور عزیز سید شہنشاہ حسین مرحوم جو ایک مدّت تک میرے ہم درس بھی رہے تھے، نوعمری ہی میں اپنے بعض کلکتہ کے اعزا سے متاثر ہوکر انگریزیت کے پرستار ہو گئے تھے انھیں کے ہمراہ مجھے بھی سینما کا ذوق ہوا۔ رفتہ رفتہ ہم سب کی ایک مختصر ٹولی بن گئی تھی اور ہم سب ہفتہ میں ایک بار سینما دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ لیکن یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ ہم دونوں اپنے اپنے خاندان کے ہم جولیوں اور عزیزوں کو اس شوق پر کبھی آمادہ نہیں کر سکے۔

انگریز عموماً فطری طور پر خاموشی پسند اور متین لوگ تھے، وہ رنک تھیٹر میں تماشا دیکھنے آتے تھے اور اسی تماشے میں محو رہتے تھے۔ لیکن سینما دیکھنے کا منشا صرف سیر و تفریح تک محدود نہیں تھا، وہ لوگ افسانے میں افادیت تلاش کرتے، اُس سے سبق لینے کی کوشش کرتے اور اسٹیج کی ایکٹنگ میں حسن و قبح کا جائزہ لیتے تھے۔ اُسی زمانہ میں ہماری دوستی متعدد اینگلو انڈین اور بعض یوروپین نوجوانوں سے ہو گئی تھی۔ ان میں ایک مسٹر کمنگ، سے بے تکلفی بہت بڑھ گئی تھی جو برسوں بعد تک برقرار رہی تھی۔ مسٹر کمنگ لا مارٹینر کالج میں پروفیسر مقرر ہوتے اور بالآخر پرنسپل ہوکر سبک دوش ہوتے تھے۔ وہی ہم سب کی سینما دیکھنے میں رہنمائی کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ رنک تھیٹر بھی ایک تعلیم گاہ ہے جہاں تعلیم حاصل کرنے میں بھی ویسی ہی دماغ سوزی کرنا چاہیے جو مدرسوں اور کالجوں میں درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم لوگ بھی انگریزوں ہی کی طرح انتہائی متانت و سنجیدگی سے ڈرامے دیکھا کرتے تھے۔

سارا ہال سکوت میں غرق رہتا اور جو بیرے اور ملازم ہال کے متصل بار سے تماشائیوں کے حسبِ طلب شرابیں لے کر آتے تھے وہ بھی بہت چپکے چپکے چلتے تھے۔ غالباً اُن کے پیروں میں ایسے جوتے ہوتے تھے جن سے آواز نہ پیدا ہو۔ سکوت و متانت اور خاموشی و سنجیدگی کا یہی عالم ہال میں ہر روز رہتا تھا۔ البتہ سال میں ایک دن پچیس دسمبر کا ایسا ہوتا تھا جب بہت کم شہری وہاں قدم رکھتے تھے۔ ان شہریوں سے میری مراد انگریز سول سروس کے اور تاجر پیشہ لوگوں سے ہے۔ اُس روز فوجیوں کی آزادی کا دن ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ دسمبر کی بیسویں یا اکیسویں تاریخ کو سنیما دیکھ کر رخصت ہوتے ہوئے ہم نے حسبِ عادت مسٹر کننگ سے آئندہ ہفتہ کو ملاقی ہونے کا تذکرہ کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اب آئندہ ملاقات آئندہ سال ہوگی۔ دوسری جنوری کے بعد والے ہفتہ کی شام کو آؤں گا۔ ہم نے اتنی طویل غیر حاضری کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ پچیس دسمبر کو یہاں آنا مناسب نہیں ہوگا اور اسی روز سے بڑے دن اور نئے دن کے سلسلے میں مختلف مقامات پر میلے ہوں گے وہاں مصروفیت رہے گی۔ ہم لوگ بھی ایک اسکول موسومہ سینٹ فرنسس کے میلے سے خوگر ہو چکے تھے۔ دوسرے مقامات کے میلوں کا پتہ اور تاریخیں دریافت کیں نیز ساتھ ہی ساتھ پچیسویں دسمبر کو رنک تھیٹر سے اجتناب کی وجہ بھی پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ اُس روز فوج کے سپاہی آتے اور بہت ہلڑ ہنگامہ مچاتے ہیں۔ ہم لوگوں کے دل میں اُس روز کا تماشا دیکھنے کے لیے بڑا شوق پیدا ہوا۔ اور ہم عمداً وہاں پہنچے۔ ایک کونے کی صف میں ہم سب اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گئے۔ پورا ہال سپاہیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب بدمست تھے لیکن پھر بھی سیری نہیں تھی۔ بار بار بیئر کی بوتلیں منگاتے اور غٹ غٹ پی جاتے تھے۔ کوئی شخص بھی تماشا نہیں دیکھتا تھا اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ آپس میں زور زور باتیں کرتے اور ہنسی مذاق میں بے پناہ ہلڑ مچا رہے تھے۔ دفعتاً دو گوروں نے اُس صف پر توجہ کی جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے پہلے ہم کو مے نوشی کی دعوت دی، ہم نے مؤدبانہ معذرت خواہی کی، اُدھر سے اصرار اِدھر سے انکار ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ہاتھ کی بوتلیں فی الفور پی ڈالیں اور خالی بوتلوں کا پیندا ہم میں سے ہر ایک کی آنکھ پر باری باری ملحق کر کے کہا کہ ان چندھی چندھی آنکھوں سے کیا دیکھ رہے ہو ان رنگین شیشوں سے دیکھو، حقیقت امر یہ ہے کہ میں خوف زدہ ہو کر اُٹھ کر کھڑا ہوا اور ہم سب تماشا چھوڑ کر

باہر نکلے۔ اس مقام پر یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ ہماری اس احتجاجی واپسی پر ہال میں سناٹا چھا گیا اور ہم نے باہر نکلنے کے بعد دور تک پھر کسی ہلڑ ہنگامے کی آواز نہیں سنی۔

رنک تھیٹر خالص انگریزی تجارتی محلہ میں واقع تھا اور یہاں بھی خالص انگریزی عمل دخل تھا لیکن ہم ہندوستانیوں کو اسی ہال سے سنیما کا ذوق پیدا ہوا تھا۔ بیسویں صدی کی غالباً دوسری دہائی میں پہلا ہندوستانی پکچر پیلس قیصر باغ کے چوراہے پر تعمیر ہوا تھا۔ یہ ہال اب بھی موجود ہے لیکن کچھ مدت تک بند رہنے کے بعد اب اس کا نام آنند ہے پہلے الفنسٹن پکچر پیلس تھا۔ اس سنیما گھر کے کھلتے ہی لکھنؤ والوں کو متحرک تصویریں دیکھنے کا تیزی سے شوق پیدا ہوا۔ ہر منگل اور ہر ہفتہ کو فلم بدلتا اور ان دونوں دنوں میں بڑا مجمع رہتا تھا۔ ابتداً یہاں بھی خاموش تصویریں دکھائی جاتی تھیں اور سب ہی فلم انگریزی اور بدیشی ہوتے تھے جن کو دیکھنے کے لیے خواندہ اور ناخواندہ بکثرت لوگ جایا کرتے تھے جن میں کچھ جدّت میں لذت حاصل کرتے اور بعض سنیما ہال کو شام کی تفریح گاہ بناتے تھے۔ کچھ نوجوان صنفِ نازک کے تماشائی ہو کر جاتے تو بہت سے بظاہر متقی لوگوں کو ہال کی دھندلی روشنی میں سکر و سرور کے مزے لوٹنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہاں بھی ابتدا ہی سے بار اور ریسٹورنٹ موجود تھا۔ ان تمام محرکات کے باوصف اس ہال میں کبھی شور و شغف برپا نہیں ہوا۔ سب خاموش تماشائی رہتے۔ لکھنؤ کی قدیم تہذیب کے بارے میں یہ امر باعثِ مفاخرت ہے کہ یہاں کے ترکاری اور میوہ فروش بھی جو بکثرت قربت کی وجہ سے اس ہال میں آتے اور چونّی والے کہلاتے تھے، شستہ اور شائستہ تھے۔ رفتہ رفتہ فلم سازی کا کاروبار اسی ملک میں شروع ہوا۔ نئی نئی فلمیں تیزی سے بننے لگیں، دوسری طرف سنیما بازی کا ذوق خواص و عوام میں ابھرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر حلقۂ شہر میں اب سنیما گھر موجود ہے۔

لکھنؤ کے پرانے باشندوں کے مزاج و مذاق سے تھیٹر بہت قریب تھا۔ مختلف محلوں میں آئے دن نوٹنکی ہوتی جس میں پست طبقہ کے عوام شریک ہوا کرتے تھے۔ روسا و شرفا کبھی نوٹنکی نہیں دیکھتے تھے لیکن حسن و عشق کے مظاہرے سب کے لیے دل پزیر تھے۔ اسی ذوق کو خواص میں تھیٹر دیکھنے سے تسکین ہوتی تھی۔ یہ بات بہرحال قابلِ لحاظ ہے کہ مقامی باشندوں نے کبھی کوئی عوامی تھیٹر قایم نہیں کیا۔ البتہ جب بمبئی سے کوئی تھیٹریکل کمپنی آجاتی اور ڈرامے کھیلتی تو بڑے مجمعے انبوہ لگ جاتے تھے۔ اسٹیج میں جگہ ملنا محال ہو جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں آغا حشر کی کمپنی بمبئی سے آیا کرتی تھی اور بہت مرغوب تھی۔ یہ کمپنی تقریباً ہر سال

موسم سرما میں آتی تھی۔ رفاہ عام کی عمارت کے مقابل نواب ممّے صاحب نے اپنی وسیع افتادہ زمین پر اسٹیج بنوا رکھا تھا جو ہر سال کرایہ پر اُٹھ جاتا تھا۔ کمپنی کے ایکٹروں اور اسٹاف کے لیے محلہ وزیر گنج اور گولہ گنج میں متعدد لوگ اپنے اپنے مکان خالی رکھتے تھے۔ موسم سرما کی آمدنی سے اُن کے سال بھر کا خرچ بڑی حد تک پورا ہو جاتا تھا۔ کمپنی مالک اسٹیج اور مالکان مکانات کو بڑے بڑے کرائے ادا کرتی تھی پھر بھی اُس کو کبھی خسارہ نہیں ہوتا تھا۔ اسٹیج پر عموماً آغا حشر کے لکھے ہوئے ڈرامے کھیلے جاتے تھے جن میں بعض انگریزی ناولوں سے بھی ماخوذ ہوتے تھے مگر اُن کو ہندوستانی رنگ میں رنگ دیا جاتا تھا۔ انگریزی قصہ بھی ہندوستانی حکایت کا روپ اختیار کر لیتا تھا۔ گانوں میں زیادہ تر غزلیں ہوتی تھیں، جن کی زبان بہت سلیس اور شیریں ہوتی تھی۔ گانے والے ان غزلوں کو راگ اور راگنیوں میں گاتے تھے۔ ایک مرتبہ آخرِ شب ایک ایکٹر نے سوہنی میں غزل کچھ اس طرح گائی تھی کہ مجمع بے قابو ہو گیا تھا اور شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہو جو پُرنم نہ ہو گئی ہو۔

آغا حشر تھیٹریکل کمپنی میں ایک لڑکا خادم حسین نامی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں آیا کرتا تھا۔ وہ حسین و خوبرو تھا، خوش گلو اور خوش مذاق تھا، اپنے فن سے اُس کو فطری تعلق تھا اور زنانہ پارٹ کرنے میں اُس کا جواب نہیں تھا۔ اُس کو پتنگ بازی میں بھی کمال حاصل تھا۔ لکھنؤ میں اُس کے لیے محلہ گولہ گنج میں امام باڑہ دارو غہ واجد علی کے قریب ایک مکان مخصوص رہتا تھا جہاں وہ اپنے شرکا کار کے ساتھ قیام کرتا تھا۔ ہر روز شام کو امام باڑہ مذکور سے متصل ایک چھت پر پتنگ لڑاتا تھا۔ اُس کو پتنگ بازی کا نظارہ کرنے کو گلیوں میں ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ اُس کے پرستار بڑی مقدار و تعداد میں اُس کو پتنگ بازی کا سامان تحفتاً پیش کرتے تھے جس کو وہ خندہ پیشانی سے قبول کرتا اور ایسے دوستوں کو برابر یاد رکھتا تھا۔ وہ خود بھی میل ملّت میں بہت اچھا تھا اور اُس کا کردار و اخلاق بھی بہت بلند تھے۔ غالباً ۱۹۱۸ء میں کسی وجہ سے کمپنی نے اُس کو علیحدہ کر دیا تھا یا وہ خود علیحدہ ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ والوں میں بددلی پیدا ہوئی اور اُس سال کمپنی خسارے میں رہی۔ اس کے بعد پھر وہ کمپنی کبھی نہیں آئی لیکن محلہ گولہ گنج کے پرانے باشندوں کے دلوں میں خادم حسین کی یاد ابھی تک برقرار ہے۔

آغا حشر تھیٹر میں خواص و عوام بڑی تعداد میں ڈرامے دیکھتے تھے لیکن شہزادگان اور بڑے

بڑے روسا وہاں جانے سے احتراز کرتے تھے کیوں کہ ٹکٹ سے داخلہ معیوب سمجھتے تھے اور عوام کی شمولیت میں سیر و تفریح اُن کے لیے خلافِ شان تھی۔ اس کے علاوہ سرِ شام سے آخرِ شب تک گھر کے باہر جاگتے رہنا اُن کے بس میں نہ تھا لیکن ڈرامے اور تھیٹر کے تذکرے اُن کے درباروں میں ہوا کرتے تھے جن سے وہ لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ انھیں روسائے عظام میں پرنس باقر علی خاں اتنے زیادہ متاثر ہوتے تھے کہ انھوں نے خود اپنے گھر میں ڈرامہ کھیلنے کا مکمل انتظام کر ڈالا تھا۔ موصوف کی وسیع و عریض املاک آغا میر ڈیوڑھی ریلوے سٹیشن کے قریب چڑھائی کے بائیں جانب واقع تھی جہاں اُن کا محل اب تک موجود ہے۔ انھوں نے اپنے ایک وسیع ہال میں تھیٹر کا اسٹیج تیار کرایا تھا۔ خوش رنگ اور خوش نما قیمتی پردے بنوائے تھے۔ جملہ ساز و سامان بہترین تھا۔ خوبرو اور خوش قامت نوجوان لڑکے ملازم رکھے تھے جن کو ایکٹنگ کی تعلیم انھوں نے خود دی تھی۔ دامنِ دولت سے منسلک شعرا ڈرامے لکھا کرتے تھے جن کے پلاٹ زیادہ تر خود انھیں کے تیار کردہ ہوتے تھے۔ ڈرامہ لکھنے والوں کے سرخیل کلیم مرحوم تھے اور منجھو صاحب آرزو تیار کردہ ڈراموں اور متعلقہ گانوں اور نظموں پر اصلاح دیا کرتے تھے۔ یہ ڈرامے پرنس موصوف کی مرضی پر کھیلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ہر روز اسٹیج آباد ہوتا تو کبھی مدتوں تک بند رہتا تھا۔ تماشائیوں میں انھیں کے مصاحبین و ملازمین اور شرفا و روسا میں انھیں کے احباب شامل رہتے تھے۔ دوسرے لوگوں کو شرکت کا کبھی موقع نہیں ملا۔ عوام کی قسمت میں دور کا جلوہ بھی نہیں تھا۔ پرنس موصوف کو چند برسوں تک بڑا انہماک رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ذوق کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اسٹیج اکھڑ گیا اور سارا ساز و سامان تلف و برباد ہو گیا۔ جو چیز جس نے مانگ لی اسی کو مرحمت کر دی گئی۔ یہ شوق اُن کے علاوہ اور کسی رئیس کو نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ سنیما بازی مقبول ہو گئی اور ڈرامے صرف کالجوں اور اسکولوں تک محدود ہو گئے تھے۔ دورِ حاضر میں رات بھر جاگ کر تھیٹر دیکھنے کی فرصت کسی کو نہیں ہے لہٰذا اب کسی تھیٹریکل کمپنی کا خیال بھی کسی کو نہیں آتا۔

## پانچواں باب

# طوائف بازی

(۱) زنان خانگی

(۲) زنان بازاری

(۳) ڈیرے دار طوائفیں

# (۱) زنانِ خانگی

سب سے پہلے یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ میں "طوائف بازی" کی اصطلاح کبھی رائج نہیں تھی۔ لکھنؤ کے اہل زبان جنسی خواہشات پورا کرنے کے مشغلہ کو تماش بینی یا عیّاشی کہتے تھے۔ اِن دونوں فقروں کا استعمال بھی علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا۔ پیشہ ور عورتوں کے درجات تھے۔ زنانِ بازاری جو برسرِ عام بیٹھتی اور کسب کرتی تھیں رنڈیاں کہلاتی تھیں۔ اُن سے تعلقات کرنے کے لیے "رنڈی بازی" عوامی اصطلاح تھی اور یہی فقرہ مناسب و موزوں تھا لیکن روسا و عمائدین اس اصطلاح سے اجتناب کر کے اپنی گفتگو میں اس فعل کو "تماش بینی" کہتے تھے۔ انھیں پیشہ ور عورتوں میں بلند پایہ عورتوں کو طوائف کہتے تھے۔ وہ ڈیرے دار طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں اور معاشرہ نے اُن کو بلند مقام دے رکھا تھا۔ اُن کے سلسلہ میں "عیاشی" کی اصطلاح مستعمل تھی۔ جسم فروشی کرنے والی عورتوں میں رنڈیوں اور طوائفوں کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی تھا جن کو زنانِ خانگی یعنی خانگیاں کہا جاتا تھا ان سے تعلقات کے لیے کوئی مخصوص فقرہ بولا نہیں جاتا تھا۔ عام طور سے اس کو بھی عیاشی سمجھا جاتا تھا۔

زنانِ خانگی کے بارے میں یہ روایت مشہور تھی کہ اُن کی صنف کا کوئی وجود لکھنؤ کے باہر نہیں تھا۔ غدر کی تباہ کاریوں میں خواص و عوام کے ہزارہا گھر تباہ و برباد ہو گئے تھے اور بہت سے شرفا نانِ شبینہ کو محتاج تھے۔ انھیں خانماں برباد لوگوں کے گھروں میں بہت سی عورتوں کو بھوک کی مصیبت سے تنگ ہو کر جسم فروشی پر آمادہ ہونا پڑا تھا۔ بعض شوخ چشم اور تیز مزاج مستورات پردہ کے باہر نکل کر چھجوں اور کوٹھوں پر آ بیٹھتی تھیں لیکن بہت سی ایسی بھی تھیں جو بے نقاب ہونے پر جسارت نہ کر سکیں اور اندرون خانہ ہی کسب کر کے اپنے خاندان کو روٹی فراہم کرتی تھیں لیکن یہ کاروبار صیغۂ راز میں نہیں چل سکا۔ رفتہ رفتہ ان زنانِ خانگی کے ناموں کی شہرت بھی ہونے لگی، طبقاتی نظام کے دور میں اُن کو بہت جلد ایک صنف کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اُن کے لیے "خانگیوں" کی اصطلاح معرضِ وجود میں آ گئی۔ یہ طبقہ بہر حال تقریباً پچاس برس قبل

ہی معدوم ہو گیا تھا لیکن لکھنؤ کی معاشرت میں اُس وقت اُن کا بھی ایک مقام تھا۔

خانگیاں گھروں کے اندر ہی رہتی تھیں اور سختی کے ساتھ پردہ کرتی تھیں۔ گھروں کا تمام رہن سہن صاف، سادہ اور شریفانہ طرز کا ہوتا تھا۔ تماش بینوں سے تمام گھر والے جن میں مرد بھی شامل تھے پردہ کرتے تھے، اُن کے سامنے کوئی مرد یا عورت نہ آتا تھا اور نہ اُن سے خانگی کے علاوہ گھر کا کوئی آدمی گفتگو کرتا تھا۔ ایسے گھروں میں آنے والے شہرت سُن کر اکیلے یا دلالوں کی وساطت سے آیا کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں بہت سے مرد اور عورتیں بھی دلالی کا پیشہ کرتی تھیں۔ یہ دلال زنان بازاری نیز خانگیوں سے رابطہ قایم کیے رہتے تھے۔ خانگی کے دروازے پر پہنچ کر دروازہ کی کنڈی کھٹ کھٹائی جاتی تھی۔ ایسے مکانات بھی گلی کوچوں میں عمداً پسند کیے جاتے تھے اور خانگیاں معہ اپنے اعزا واقارب کے سکونت پذیر رہتی تھیں۔ تماش بینوں کو صرف شام یعنی وقت غروب آفتاب یا اُس کے بعد ہی آنے کی اجازت رہتی تھی۔ کنڈی کھٹ کھٹانے کی آواز سنتے ہی خانگی دروازے پر آجاتی، گھر میں پردہ کا انتظام پہلے ہی سے رہتا اور آنے والا تنہا یا معہ دلال کے اُس کمرہ میں پہنچا دیا جاتا جو کسب معاش کے لیے مقرر ہوتا تھا

تماش بین کو خانگی کے گھر میں دس بارہ منٹ سے زیادہ ٹھہرنے کی نہ اجازت تھی اور نہ ضرورت پڑتی تھی۔ آنے والا اگر اخلاقاً گفتگو دراز کرتا تو پردہ کے پیچھے سے آواز بلند ہو جاتی اور اُس کو واپس بلا لیا جاتا تھا لہٰذا اسی قلیل وقفہ میں خالص تجارتی طرز پر معاملے طے یا ختم ہو جاتا تھا۔ خانگی خود اپنی فیس تماش بین سے براہ راست یا دلال کی مداخلت پر اُس کی وساطت سے طے کرتی تھی۔ فیس کی مقدار کا تعین خانگی کی عمر اور اُس کے حُسن وجمال کے تناسب سے ہوتا تھا۔ مشتاقِ وصال یا تو منہ مانگی رقم ادا کر کے شب باشی کی شرط پر ٹھہر جاتا یا فی الفور محروم ہو کر واپس ہو جاتا تھا۔ وہاں جانے والے عموماً رات بھر قیام نہیں کرتے تھے۔ چند گھنٹوں ہی میں رات بھر کا حساب کتاب بے باق ہو جاتا تھا۔ تماش بین کی واپسی کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لیا جاتا اور پھر کسی دوسرے آنے والے کے لیے نہیں کھلتا تھا۔ یہ خانگیاں اپنا سارا کاروبار انتہائی رازدارانہ طور پر کرتی تھیں۔ کسی تماش بین کے گھر بڑی سے بڑی فیس پر بھی جانا یا اُس کے ہمراہ کسی سیر و تفریح کے لیے گھر کے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔

ایسے گھروں میں شہر کے آوارہ منش یا آزاد مزاج لوگوں کی رسائی نہیں تھی۔ غالباً وہ خود بھی وہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ رازدارانہ تعیش اُن کے مزاج اور ذوق کے خلاف ہوتا تھا۔ شرفا بھی وہاں جانا معیوب سمجھتے تھے۔ اس طرح یہ ٹھکانے صرف ایسے من چلے شریف نوجوانوں کے کام آتے تھے جن کے پاس اپنے نفسیاتی جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خود اپنے گھروں میں کوئی علیحدہ جگہ دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ ان نوجوان کے علاوہ نئے بگڑے خوش حال لوگ بھی جن میں انگریزیت کا نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا وہاں جایا کرتے تھے۔ ایسے ہی نوجوانوں میں بعض اتنے فریفتہ ہوجاتے تھے کہ وہ برابر جانے لگتے اور ایک دوسرے کا مزاج دان ہوکر مستقل تعلقات قایم کرنے کے خواہش مند ہوجاتے تھے جن میں بہت سے اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتے تھے۔ بہت سی خانگیوں نے ایسی ہی ازدواجی زندگی اختیار کرکے دوسرے محلوں میں سکونت اختیار کرکے شریفانہ زندگی کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ لیکن اکثریت اپنے پیشہ سے اس لیے دست بردار ہوتی تھی کہ شریف من چلے نوجوان فلاکت میں مبتلا ہوکر مردہ دل ہوگئے تھے اور ان درون پردہ پیشہ ور عورتوں کو کسی نہ کسی دوسرے ذریعہ سے روزی کا سہارا مل گیا تھا۔ ان کے پاس رقص و موسیقی کا کوئی ہنر نہیں تھا جو اُن کو پیشہ سے وابستہ رکھتا۔ بہر حال اس طبقہ کا آغاز افلاس میں ہوا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح بخیر ہوگیا۔

## زنان بازاری

زنان بازاری یعنی رنڈیوں کا وجود لکھنؤ ہی کی خصوصیت نہیں تھی۔ انسان ہر ملک میں قوتِ شہوانی سے مغلوب ہوتا ہے اور دوسری خواہشات کی طرح جنسی خواہش کو بھی آسودہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے چنانچہ اس حاجت برآری کے لیے قریب قریب ہر شہر، ہر قریہ بلکہ ہر دیہات میں زنان بازاری یعنی پیشہ ور عورتوں کی موجودگی ہمیشہ رہی تھی بموجودہ دور میں بھی قانون امتناع کے باوجود یہ کاروبار ہر جگہ کسی نہ کسی نہج سے جاری ہے۔ دوسرے مقامات کے مقابلہ میں لکھنؤ کی زنان بازاری کی بہر حال یہ امتیازی شان تھی کہ وہ یہاں کی معاشرت سے متاثر ہوکر شائستگی اور شستگی سے آراستہ اور زبان و بیان کی خوبیوں سے پیراستہ ہوگئی تھیں اور جو کسی نہ کسی سبب سے اِن طور طریقوں کو قبول نہ کرسکیں وہ تبذل

قرار پاکر شرفا و عوام کی نگاہوں میں ناقابلِ توجہ رہیں اور اُن میں پست و بلند کی تفریق واضح طور سے ہو گئی تھی جس میں حسن و جمال کے معیار کو کبھی کوئی جگہ حاصل نہیں ہوتی۔ بلند درجہ والی رنڈیاں کہلاتی تھیں اور پست طبقہ کی کمانے والیاں کسبیوں یا ٹکابیوں کے نام سے موسوم تھیں۔ "ٹکابیوں" کا لفظ زیادہ مستعمل تھا۔

رنڈیوں کے گھروں کا اندرونی ماحول صاف اور ستھرا رہتا تھا۔ اُن کی نشست گاہوں میں جہاں ملاقاتیں ہوتی تھیں شفاف فرش بچھا رہتا تھا، اُس پر سلیقے سے گاؤتکیے لگے رہتے تھے اور اچھی طرح منجھا ہوا پاندان ایک پہلو میں رکھا رہتا تھا۔ دیواروں پر اور چھتوں میں حسبِ مقدرت تصویروں اور قمقموں وغیرہ کی آرائش بھی رہتی تھی۔ بر زنِ بازاری کا یہ شعار تھا کہ شام کو نہا دھو کر، قیمتی اور خوش نما لباس میں اور زیورات سے نکھر کر اپنے بالاخانہ کے چھجے پر چوک کی طرف رُخ کر کے جلوہ افروز ہو جایا کرتی تھی۔ اس صنف کی قریب قریب سب رنڈیاں چوک میں کوٹھوں پر رہا کرتی تھیں۔ چوک کی ہر شام کو تفریح شرفا و عوام سب کی عادت تھی۔ حقیقت امر یہ ہے کہ قدیم چوک میں چہل پہل اور راہ گیروں کے دیدہ و گوش کی اصل ضیافت انھیں رنڈیوں کی بدولت ہوتی تھی۔ شرفا ان پیشہ ور عورتوں کے کوٹھوں پر بلا تکلف چڑھ جاتے تھے، احتیاط ملحوظ ہوتی تو پیچھے کے دروازے سے جس کا ہر مکان میں ہونا ضروری تھا داخل ہو جاتے تھے۔ بعض مقتدر اور ممتاز افراد بھی راہ چلتے ہوئے سر اُٹھا کر اوپر بیٹھی ہوئی پری جمال سے اشارے اور کبھی کبھی بات بھی کر لیتے تھے۔ یہ طریقہ عام تھا کہ لوگ راستہ سامنے چلتے مگر نگاہیں بالاخانوں کی طرف لگی رہتی تھیں چنانچہ اسی حالت میں ایک مرتبہ ایک جلیل القدر خانوادہ کے ایک نوجوان اپنے حقیقی چچا سے ٹکرا گئے تھے، دونوں کے قدم زمیں پر تھے مگر نظریں بالاخانوں پر تھیں۔ ایسے حادثے وسط چوک میں برابر ہوا کرتے تھے۔

رسمِ زمانہ کے مطابق ان مقامات پر بھی آداب و تہذیب کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا گو کہ زنانِ بازاری تماش بین کو اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوتے چھجے سے دیکھ لیتی تھی اور دونوں میں اشارے پہلے ہی ہو جاتے تھے لیکن ہر آنے والے کا یہ شعار تھا کہ وہ اجازت طلب کر کے کمرہ میں داخل ہوتا تھا۔ اسی طرح رنڈی کے لیے بھی اُس کو صدر مقام پر بٹھانا فرض تھا اور بلا تاخیر پان بنا کر پیش کرنا ضروری ہوتا تھا۔ رسماً کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی تھیں،

نئی ملاقات میں زیادہ دیر ٹھہرنے اور گفتگو کرنے کا کوئی محل ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے یا تو تعارف حاصل کرکے آنے والا رخصت ہوجاتا یا پھر اگر رغبت میں شدت ہوتی تو شب باشی کی معاملت پر افہام و تفہیم کی باری آجاتی تھی۔ معاملہ طے ہوجاتا تو آنے والا وقتی طور سے حقوق ملکیت استعمال کرنے کا مجاز ہوجاتا تھا۔ محروم واپس ہونے والے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ رقم پاندان میں رکھ دینا تہذیب میں ضروری تھا۔ یہ رقم عموماً دو تین روپیہ سے زائد نہیں ہوتی تھی۔ شب باش رات کا کھانا وہیں کھاتے تھے۔ زنان بازاری کے گھر میں پہلے ہی سے اس صورتِ حال کا لحاظ رکھا جاتا تھا پھر بھی کچھ مخصوص غذائیں بازار سے منگالی جاتی تھیں۔ ایک اچھی رنڈی کے یہاں شب باشی کا معاوضہ دس روپیہ سے کم نہیں ہوتا تھا۔

انھیں زنان بازاری میں بعض بہت اچھی فن کار تھیں، اُن کو رقص و موسیقی میں کمال حاصل تھا بعض اپنے حسن و جمال کے لیے بھی ممتاز تھیں۔ انھیں خصوصیات کی بدولت اُن کو اُمرا کی محفلوں میں بھی کبھی کبھی باریابی مل جاتی تھی، تقریبات کے مواقع پر اُن کو مجرے کے لیے طلب کیا جاتا تھا اور معقول حق الخدمت عطا ہوتا تھا ایسی رنڈیاں مالی اعتبار سے خوش حال تھیں لیکن راقم کے علم و یقین میں امرا و عمائدین میں کسی نے کبھی اس طبقہ کی کسی عورت سے جنسی تعلق نہیں کیا، حسن و جمال کے وقتی تماشا یا اُن کی فن کاری سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُن کی قدر دانی ہوتی تھی۔ البتہ خوش حال شرفا اُن سے دوستانہ تعلقات قایم کرنے اور ملوث ہونے میں کوئی تکلف نہیں کرتے تھے۔ جنسی تعلقات بہرحال متعدد ملاقاتوں اور کافی بے تکلفی ہوجانے کے بعد قایم ہوتے تھے اور وہ بھی معقول مدت معینہ کے لیے مقررہ تنخواہ پر ہوا کرتے تھے۔ تنخواہ بہرحال کہنے کو ہوتی تھی، تواضع اور خاطر داری میں بدرجہا زیادہ رقم صرف ہوجایا کرتی تھی۔ کسی نئی معروف بلکہ ضرورت سے زیادہ مشہور رنڈی کے گھر بھی خوش حال شرفا جنسی خواہش کی آسودگی کے لیے نہیں جاتے تھے دلالوں کی وساطت سے یا کسی اور ذریعہ سے اپنے گھروں پر بلوالیا کرتے تھے۔ راہ و رسم پیدا ہوجانے کے بعد ہی رنڈیوں کے گھروں میں آمد و رفت ہونے لگتی تھی اور جنسی تعلق کا سوال پیدا ہوتا تھا۔

اسی مقام پر دلالوں کے طبقہ کا بالاجمال تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اِن

لوگوں کی ایک منظم جماعت تھی جو تمام زنان بازاری اور خانگی سے رابطہ قایم کیے ہوئے تھی۔ صرف ڈیرے دار طوائفوں کے یہاں نہ ان کا رسوخ تھا اور نہ اُن کے گھروں میں اُن کی آزادانہ آمدورفت تھی۔ دلالوں میں بھی درجات کا فرق تھا۔ جن لوگوں کی رسائی عالی مقدار شرفا کے یہاں تھی اُن کا شمار بلند درجہ کے دلالوں میں تھا۔ وہ لوگ شام کو تفریح کرتے ہوئے جس نئی عورت کو بالاخانہ پر پسند کر لیتے تو انھیں دلالوں میں سے کسی متعارف دلال کے وسیلہ سے اُس کو بلوا لیتے تھے۔ زیادہ تر یہی دلال خود کسی مخصوص رنڈی کے حسن و جمال یا اُس کی فن کارانہ صلاحیت کے تذکرے کر کے شرفا کو ملاقات کرنے پر آمادہ کر لیتے تھے اور اشارہ پاتے ہی مطلوبہ کو پیش کر دیتے تھے۔ دلالوں کی وساطت سے حاصل کردہ زنان بازاری کی فیسوں میں ہونا ضروری تھا اور یہ دلال دو طرفہ کمائی کرتے تھے۔ اس طرح اُن کی دوہری آمدنیاں ہو جاتی تھیں۔ ہر دلال کا ظاہری رہن سہن شریفانہ تھا، زندگی آسودگی سے گزرتی تھی۔ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اِن میں سے بعض کے اخلاف اونچے اونچے درجوں پر فائز تھے۔

زنان بازاری میں پست درجہ والی پیشہ ور عورتیں جو ٹکابیوں کے نام سے موسوم تھیں رنڈیوں بالخصوص ڈیرے دار طوائفوں سے یک لخت علیحدہ رہتی تھیں۔ یہ علیحدگی صرف مقامات سکونت میں نہیں تھی بلکہ اُن کی کوئی راہ رسم بلند پایہ رنڈیوں سے بھی نہیں تھی۔ یہ ٹکابیاں چوک کے قرب و جوار والی گلیوں کے چھوٹے چھوٹے مکانات یا کوٹھریوں میں، اکبری دروازے سے متصل دو چار کوٹھوں پر جو بعض کھانوں کی دوکانوں، پر واقع تھے اور چاول والی گلی کے اُن بالاخانوں پر جن میں کوئی سکونت اختیار کرنا گوارا نہ کرنا رہا کرتی تھیں۔ شام کو اپنے مکانوں کے دروازوں یا بالاخانوں کی چھتوں پر اپنے امکان بھر صاف کپڑے پہن کے بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کے یہاں کوئی معقول نشست گاہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ اگر کہیں چادر بچھی ہوئی مل جاتی تو کوئی معقول آدمی اُس پر غلاظت و کثافت کے باعث بیٹھنا پسند بھی نہ کرتا۔ ہر بازاری عورت کے یہاں انتہائی ضروری ساز و سامان میں پاندان داخل تھا۔ ان عورتوں کے یہاں زیادہ تر اُس کا بھی فقدان رہتا تھا۔ بعض چھوٹی چھوٹی پن ڈبیوں پر قناعت کیے ہوئے تھیں۔

یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ ان میں بعض بہت حسین و جمیل تھیں، بعض بلا کی خوش گلو

اور خوش گفتار بھی تھیں لیکن ان میں کی ہر فرد لکھنؤ کے آداب و شائستگی سے بے گانہ تھی بعض دیہاتوں سے آکر بس گئی تھیں اور بعض کا تعلق لکھنؤ کے سماج میں انتہائی پست طبقہ سے تھا جو معاشرت کی خوبو سے ناواقف تھا۔ اِن عورتوں میں لڑائی جھگڑے اور گالم گلوج ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے عوام بھی اِن طور طریقوں کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اُن عورتوں سے بات کرنا یا اُن کو مڑ کر دیکھ لینا بھی معیوب تھا۔ شرفا اُن محلوں سے گزرتے تو سر جھکائے تیزی کے ساتھ نکل جاتے تھے۔ اِن کسبیوں کو بہر حال انتہائی پست درجہ کے کاروباری آدمیوں سے سابقہ پڑتا تھا جو کم سے کم قیمت پر اپنے جنسی خواہشات کو وقتی طور پر آسودگی فراہم کر دیتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اس طبقہ کی بھی ضرورت تھی۔

## (۳) ڈیرے دار طوائفیں

اس طبقہ کی زنان بازاری طوائفیں کہلاتی تھیں لیکن "ڈیرے دار" کی وجہ تسمیہ کے بارے میں دو روایتیں مشہور تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ اُن کے مورث خیمے ڈیرے ہمراہ لاتے تھے اور انھوں نے اپنی علیحدہ چھاؤنی قایم کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن کی عورتوں نے جسم فروشی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا لہٰذا ایسی عورتیں ڈیرے دار کہلانے لگیں۔ بعض دوسرے لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ طوائفیں عوامی اجتماعات میں مثلاً متعدد میلوں نیز محرم اور چہلم کے موقع پر شرکت کرنے جاتی تھیں تو کسی قریبی میدان میں اپنا ڈیرہ نصب کر کے اسی میں اپنی نشست گاہ بنا لیتی تھیں۔ روسا و عمائدین کا بھی یہی انداز تھا۔ ایسے اجتماعات کے متصل اُن کی چھولداریاں ڈال دی جاتی تھیں اور وہ وہیں تشریف فرما ہوتے تھے۔ اسی رئیسانہ امتیازی شان کی بدولت ان طوائفوں کو ڈیرے دار کہا جانے لگا تھا۔ راقم کے خیال میں پہلی روایت افسانہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیوں کہ لکھنؤ میں نووارد لوگوں کو اپنی عورتوں سے کسب کرانے کے بعد کوئی شرف حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا اور نہ ایسی عورتوں میں تہذیب و اخلاق اور خصائل حمیدہ کا اتنا زیادہ امتزاج ہو سکتا تھا کہ وہ لکھنؤ کے معاشرہ میں بلند مقام کی مالک بن جاتیں۔ اصلی صورتِ حال جو کچھ بھی ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یہ طوائفیں بہت زیادہ مہذّب اور بلند کردار کی مالک تھیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اِن کے پاس ڈیرے رہا کرتے تھے جو مخصوص مقامات

پر اُن کی نشست کے لیے نصب ہو جاتے تھے۔ یہ حالات خود میرے چشم دید تھے۔

ڈیرے دار طوائفیں اپنی صلاحیتوں کے سبب سے اور اپنے اطوار و کردار کی بدولت مرتبت کی مالک تھیں۔ اِن میں بعض رقص میں اور بہت سی موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ زینت محفل ہر طوائف تھی۔ آداب و شائستگی اور تہذیب و اخلاق سے ہر ایک مزین تھی۔ روسا و عمائدین کے درباروں میں اُن کو رسوخ حاصل تھا اور بعض مقتدر ترین طوائفوں کو روسا کی محل سراؤں میں داخل ہو کر بیگمات کے حضور حاضر ہونے کی اجازت بھی تھی۔ اُن کے تمام اطوار اور سارا رہن سہن شریفانہ تھا۔ گھروں کے باہر نکل کر ادھر اُدھر گھومنا یا بالاخانوں کے چھجوں پر بیٹھنا اُن کے نزدیک فعل قبیح تھا۔ جنسی تعلقات میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھیں انھوں نے کسی ایک رئیس یا زیادہ سے زیادہ دو تین رئیسوں کی ملازمت کر کے اپنی عمریں گزاریں تھیں یا آخر عمر میں کسی شریف سے عقد مناکحت کر کے پردہ میں زندگی کے باقی دن گزار دیے تھے لیکن اُن کے دوستانہ تعلقات بیک وقت متعدد رئیسوں سے رہا کرتے تھے۔ ایسی مثالیں معقول تعداد میں ملتی تھیں جہاں ان طوائفوں کے دوستانہ روابط مدت مدید تک کسی ایک رئیس سے رہتے ہوئے بھی کبھی کوئی جنسی رشتہ پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ آج کی دنیا ان واقعات کو باور نہیں کرے گی۔ لہٰذا ضمناً صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ میرے دیرینہ کرم فرما مرزا عابد حسین صاحب رئیس بنجاری ٹولہ بقیدِ حیات ہیں۔ اُن کے نانا صاحب مرحوم نواب علی بہادر صاحب شہر کے ممتاز رئیسوں میں تھے۔ نواب صاحب کے گہرے دوستانہ تعلقات مشہور طوائف حیدر جان سے تخمیناً چالیس برس سے زائد کی مدت تک برقرار رہے تھے۔ اِن دونوں میں قریب قریب ہر روز ملاقاتیں ہوتی تھیں اور دیر دیر تک خلوت و جلوت میں ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا لیکن کبھی اُن کے باہمی روابط پر خواہشاتِ نفسانی کا غلبہ نہیں ہوا جس کی شہادت ہر وہ شخص دیتا تھا جس کو ان دونوں سے قربت تھی۔

یہ طوائفیں طبیعتاً گرہستن ہوتی تھیں اس لیے اُن کو چوک میں آباد ہونے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ صرف وہی طوائفیں چوک میں رہتی تھیں جن کے اپنے ذاتی مکانات وہاں تھے یا یہ کہ اُن کے بزرگ برسہا برس قبل وہاں آباد ہو گئے تھے اور سکونت کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلاً چلا آ رہا تھا۔ اُن کی اکثریت دوسرے محلوں میں سکونت اختیار کیے تھی۔ چنانچہ اللہ یا ندی اور نجا محلہ چاول والی گلی میں رہتی تھیں جہاں اُن کے مکانات کے کھنڈرات انھیں کے نام کے امام باڑوں

سے اب تک موسوم ہیں، مغل جان چوک سبزی منڈی میں، حیدر جان پارچہ والی گلی میں، جستو جان امین آباد میں، بگّن محلہ جھاؤ لال میں، مشتری نخاس میں، بڑی حیدن ٹکسال میں اور اسی طرح بہت سی دوسری مختلف مقامات پر رہتی تھیں لیکن ان سب میں نہ صرف مکمل اتحاد بلکہ زبردست نظم و ضبط تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ دو حقیقی بہنیں نہوا اور بچوا ان سب کی چودھرائن تھیں جن کا حکم ہر معاملہ میں سب کے لیے واجب التعمیل ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ بہت سی دوسری رنڈیاں بھی اپنا رہن سہن اور طور طریقے بدل کے اسی سلسلہ میں آگئی تھیں۔ رقص و موسیقی کے فنون میں کمال حاصل کر کے انھوں نے بھی رؤسا و عمائدین کے یہاں باریابی حاصل کر لی تھی اور پستی و بلندی کا طبقاتی امتیاز بھی اُن کے لیے دور ہوگیا تھا۔ لیکن کچھ ہی مدت کے بعد رؤسا و عمائدین کی دولت و ثروت پر تیزی کے ساتھ زوال آنا شروع ہوگیا اور رفتہ رفتہ قدردان ختم ہونے لگے۔ بالآخر وہ معاشرہ بھی مٹا اور ڈیرے دار طوائفوں کا سارا طبقہ نیست و نابود ہوگیا۔

رؤسا و عمائدین کے علاوہ شہر کے تمام معززین اور مقتدر شرفا سے ان طوائفوں کی ملاقاتیں تھیں۔ لیکن وہ خود عام طور سے دوسروں کے یہاں نہیں جاتی تھیں۔ معززین و شرفا خود ہی اُن کے یہاں جاتے اور وہاں کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ صحبتیں شعر و نغمہ یا رنگین و پُر حلاوت گفتگو سے گرم رہتی تھیں۔ طوائفیں اپنے مخصوص رئیس کے یہاں ہر شام کو حاضری دیتی تھیں یا پھر کسی دوسرے رئیس کے یہاں عند الطلب چلی جاتی تھیں۔ ایسی ملاقاتیں عموماً دن کو ہوا کرتی تھیں۔ اُن معززین و شرفا کے یہاں بھی آمد و رفت رہتی تھی جن سے بے تکلفانہ تعلقات قایم ہوجاتے تھے۔ ایسی تمام صحبتوں میں بلا تکلف ہنسی مذاق اور فقرے بازیاں ہوتی تھیں لیکن کبھی کوئی مبتذل کلمہ کسی کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ تہذیب کا اتنا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ہر محفل میں خواہ وہ مقربین اور بے تکلف دوستوں ہی کی کیوں نہ ہو طوائف کے لیے پوری جسم پوشی ضروری تھی۔ چہرہ اور گٹوں تک ہاتھ پیر کھلے رہتے تھے جسم کا تمام باقی حصہ پوری احتیاط کے ساتھ مستور رہتا تھا۔ انھیں رئیسوں اور دولت مند شریفوں کے فیض سے اُن کے رئیسانہ ٹھاٹھ تھے اور کثیر خانگی مصارف پورے ہوتے تھے۔ تقاریب کے علاوہ تخلیہ کی صحبتوں میں آئے دن مجرے ہوتے تھے۔ راتوں کو دیر تک اور بسا اوقات دن کو بھی محفلیں جم جاتی تھیں۔ اس طرح ان طوائفوں کی کثیر آمدنیاں

تھیں۔ حصولِ منفعت کے لیے بھی ان فن کاروں کے واسطے یہ ضروری تھا کہ وہ رئیس کی مزاج داں ہوں اور اُن کے عادات و اطوار تہذیب و شائستگی کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ اس ہنرمندی میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا اور اُن کی یہ خوش اطواری نمائشی نہیں تھی بلکہ اُن کے طرزِ زندگی میں اتنی گہری سرایت کر گئی تھی کہ اُن کے گھر کا ظاہری ماحول بھی پاک و پاکیزہ نظر آتا تھا۔ روسا و شرفا حُسنِ اخلاق کی تعلیم کے لیے اپنے بچوں کو ان طوائفوں کے گھروں میں بھیجا کرتے تھے۔ چودھرائن کا محل شرفا و روسا کے لڑکوں کے لیے ایک اچھا خاصا مکتب تھا جہاں اٹھنے بیٹھنے، رفتار و گفتار اور تہذیب و اخلاق کے علاوہ خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم بھی بڑی خوش سلیقگی سے دی جاتی تھی۔ اور یہ ساری تربیت مذہبی عصبیت اور تنگ نظری سے بالکل پاک و صاف رہتی تھی۔ خوردی و بزرگی اور ہر طرح کے حفظِ مراتب کا درس بچپن ہی میں مل جاتا تھا۔

ان طوائفوں میں سب ہی کے گھر کا ماحول یکساں طرز کا تھا البتہ اپنے اپنے مالی حالات کے تحت زیبائش و آرایش میں کمی یا بیشی ہوتی تھی۔ جھاڑ، فانوس، قمقمے، شمعدان، گلدان تصاویر اور مرقعے سب کے گھروں میں تھے۔ ملاقات کرنے والوں کے لیے نشست کی جگہ علیحدہ رہتی تھی جس میں صفائی اور زیبائی کا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ کسی کے یہاں زمین کے فرش پر تو کسی کے یہاں تختوں کے چوکوں پر نشست ہوتی تھی۔ صاف ستھری چاندنی پر صدر مقام میں ریشمی یا اونی قالین پر گاؤ تکیے لگے رہتے تھے۔ آنے والے صدر مقام پر بٹھائے جاتے تھے اور طوائف قالین کے داہنے یا بائیں جانب بیٹھتی تھی۔ اُس کا جسم پوری طرح ڈھکا رہتا تھا۔ ملاقات کے اوقات سہ پہر یا شام کو ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک طوائفیں بھی شرفا کی بہو بیٹیوں کی طرح پائجامے، انگیا کرتی یا شلوکے اور دوپٹے استعمال کرتی تھیں۔ عام طور سے بارہ گز کے کلی دار پائچوں کے پاجامے پہنے جاتے تھے۔ پائجاموں کے رنگ کی مناسبت سے کرتیاں اور شلوکے ہوتے تھے۔ جاڑوں میں عموماً مخمل کے شلوکے پہنتی تھیں اور کڑھے ہوئے کامدانی کے کنارے دار ڈوپٹے اوڑھتی تھیں جاڑوں میں اونی چھینٹ کی دُلائیاں بھی رائج تھیں۔ خاص موقعوں پر جامہ واریں بہتر سے بہتر رنگ اور وضع کی استعمال ہوتی تھیں۔ لباس ہر ایک کا بقدرِ مقدرت قیمتی ہوتا تھا۔ اُسی زمانہ میں محلہ اچھوتی گلی میں ایک گلی در گلی مکان میں ایک طوائف نامی ایجنٹ والی خورشید

رہتی تھی جو بہت قدیم زمانہ کی وضع برقرار رکھے تھی۔ وہ عمر بھر چکن پہنتی اور اوپر دوپٹہ اوڑھتی رہی تھی۔ ساری پہننے کا چلن سب سے پہلے چودھرائن کے گھر سے رائج ہوا تھا۔ چھوٹی چودھرائن یعنی بچوا نے اپنے گھر کی مجلس میں ساری پہنتی تھی۔ اُس وقت، اس جدّت پر طعن و تشنیع اور تمسخر کیے گئے لیکن چوں کہ چودھرائن کی ایجاد تھی اس لیے سب طوائفوں نے رفتہ رفتہ اسی وضع کو قبول کر لیا تھا۔

انھیں طوائفوں میں بعض بہت خوش حال تھیں اور اُن کا طرزِ زندگی رئیسانہ تھا، لیکن یہ تموّل اور خوش حالی کسی ظاہری حسن و جمال کی بدولت نہیں تھی بلکہ اُن کے حُسنِ اطوار اور شائستگی و صلاحیت کی مناسبت سے اُن کو تفوق حاصل ہوتا تھا۔ خصائل و محامد کا جس سے جتنا بلند مظاہرہ ہوتا تھا اتنا ہی اُس کو روسا کی والہگی اور شیفتگی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اس طبقہ کی ہر فرد نے لکھنؤ کی ثقافت کو اپنے میں جذب کر لیا تھا جس کی خوبیاں ہر ایک کی انفرادی صلاحیت کے تحت واضح ہوا کرتی تھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں حسن و جمال کے اعتبار سے بعض بہت زیادہ کریہہ منظر تھیں لیکن وہ بڑی بڑی پری جمالوں سے کہیں زیادہ منظورِ نظر تھیں۔ ان طوائفوں کے یہاں لکھنؤ کی ہر چھوٹی بڑی روایت ملتی تھی۔ اُس زمانہ میں شرفا و روسا کے ناموں کے بجائے اُن کے عرف شہر بھر میں رائج تھے اور بڑے بڑے رئیس اپنے اپنے عرف سے مشہور تھے۔ یہی حالت ڈیرے دار طوائفوں کی بھی تھی۔ اُن کے نام بہت کم لوگوں کو معلوم تھے لیکن اُن کے عرف زبان زد تھے۔ مثلاً اچھن بائی کا نام محمدی تھا، تنہوا کا بدر منیر، بچوا کا ماہ منیر وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح وہ دور شعر و نغمہ کا تھا، لکھنؤ کے در و دیوار نغمیت میں سرشار تھے۔ ان طوائفوں نے بھی موزونیِ طبع کے بہتر سے بہتر جوہر دکھاتے تھے۔ فی البدیہہ شستہ و شائستہ جملے بولنا، برمحل فقرے چسپ کرنا، مناسب حال اشعار پڑھنا، اشعار کی خوبیوں پر نظر رکھنا اور فی الفور تبصرہ کرنا اُن کا شعار تھا، بعض خود بھی شاعرہ تھیں اور برجستہ مصرعے موزوں کر لیتی تھیں۔ مثالاً صرف ایک طوائف کا تذکرہ مقصود ہے۔

اس نمودار و نامدار طوائف کا نام مشتری تھا۔ وہ بہت بدشکل اور کثیر الاولاد تھی لیکن ممتاز طوائفوں کی صفِ اوّل میں اُس کا مقام تھا کیوں کہ وہ بذلہ سنجی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی اور فنِ موسیقی میں بھی کمال رکھتی تھی۔ ایک شادی کی تقریب میں جب کہ وہ

حاملہ تھی بیٹھے بیٹھے ذوق کی یہ غزل گا رہی تھی ؎

دل اُس بت پر شیدا ہوا چاہتا ہے
یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے

اُس زمانہ میں سرِ محفل طوائف پر جملے کسنا اور اُس کا برجستہ جواب بھی دینا تہذیب میں داخل تھا اور گرمیِ بزم کا وسیلہ ہوتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر ایک صاحب نے برجستہ اور باآواز بلند یہ شعر موزوں کر کے پڑھ دیا ؎

سنا ہے کہ بی مشتری پیٹ سے ہیں
کوئی دم میں بچہ ہوا چاہتا ہے

مشتری نے سنا اور بظاہر کوئی اثر قبول نہیں کیا لیکن جو شعر گا رہی تھی اُس کو ختم کر کے فی البدیہہ یہ شعر کہا اور گا دیا ؎

خوشی تم کو کیوں کر نہ ہووے برادر
کہ ہمشیر زادہ ہوا چاہتا ہے

یہی طوائف جھوائی ٹولہ میں غالباً حکیم عبدالحکیم مرحوم کی شادی میں مجرا کر رہی تھی۔ حاضرین میں پٹنہ کے ایک نوجوان جو طب پڑھ رہے تھے موجود تھے۔ یہ صاحبزادے جن کا نام غالباً رکن الدین تھا بہت من چلے تھے۔ اُن کو شاعری سے ذوق بھی تھا۔ اُس زمانہ میں ذوق کی غزلیں بہت گائی اور پسند کی جاتی تھیں۔ موسیقی کا فن شباب پر تھا۔ غزل میں راگ اور راگنیوں کے تصرف سے گانے والی کے کمال کا امتحان ہوتا تھا۔ اس محفل میں مشتری جو غزل گا رہی تھی اُس کا مطلع تھا ؎

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
ہے حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا

وہ صاحبزادے پہلا مصرع سنتے ہی دوسرا مصرع باآواز بلند پڑھ دیتے تھے۔ لکھنؤ میں یہ حرکت آدابِ محفل کے خلاف تھی۔ مشتری نے دو مرتبہ برداشت کیا۔ تیسری مرتبہ جب اُس نے یہ مصرع گایا کہ:

بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا

اور انھوں نے فوراً یہ دوسرا مصرع پڑھ دیا کہ

لیکن یہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

تو مشتری نے انتہائی متانت و سنجیدگی سے اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "اب میری کیا ضرورت ہے، آپ ہی اس جگہ پر آجائیے۔"

تمام ڈیرے دار طوائفوں کو موسیقی میں کمال حاصل تھا اور بعض رقص میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ یہ سب بہت بلند پایہ فن کاروں کی شاگرد تھیں۔ دونوں بہنیں جو چودھرائن کہلاتی تھیں رقص کے فن میں ملک کے مشہور اور مایۂ ناز رقاص بندادین کی شاگرد تھیں اور اس فن میں انھوں نے بدرجۂ اتم کمال حاصل کر لیا تھا۔ بڑی بہن تنھوا کسی قدر بلند قامت اور فربہ تھیں، چہرہ کا رنگ بہت گورا تھا۔ اُن میں یہ کمال تھا کہ پیشواز پہن کر مجرا کرنے کھڑی ہوتیں تو جسم سمٹ جاتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پری مائلِ پرواز ہے چنانچہ یہ واقعہ یادگار تھا کہ مرحوم مہاراجہ صاحب بہادر والیِ محمود آباد کے صاحب زادے اور ولی عہد یعنی مرحوم راجہ صاحب کی شادی بھی شہر کے نیز دور دور سے بے شمار طائفے طلب تھے۔ تنھوا کو معلوم نہیں تھا کہ اُن کو بھی رقص کرنا ہوگا اس لیے وہ پیشواز کے بغیر آئی تھیں۔ مہاراجہ مرحوم کی مخصوص فرمائش پر انھوں نے غالباً گوہر جان سے، جو اُن کے مقابلہ میں نحیف الجثہ تھیں، اُن کی پیشواز عاریتاً لے کر پہن لی تھی لیکن اُن کے قامت پر بالکل درست و چست معلوم ہوتی تھی۔ مہاراجہ نے خوش ہو کر اُن سے پری کہہ کر خطاب فرمایا تھا۔ اُن کی چھوٹی بہن بچوا بھی رقاصہ تھیں لیکن اُن کی زیادہ شہرت بھاؤ تاؤ بتانے میں تھی۔ اس فن میں اُن کا کوئی مثل و نظیر نہیں تھا۔ اسی شادی میں بچوا نے غالب کی غزل گائی تھی اور صرف یہ ایک مصرع

ترے تیرِ نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے

چھتیس مرتبہ گایا اور ہر بار نیا بھاؤ بتایا تھا۔

فنِ موسیقی میں متذکرہ بالا تمام نیز بہت سی دوسری طوائفیں مثلاً عظیمن، نظیر جان، بنّن، بنو، نور جہاں، زہرا، مشتری، کلّن، جدّن وغیرہ وغیرہ بڑی باکمال تھیں۔ ان میں بعض راگ اور راگنیوں میں غزل گانے کے لیے ممتاز تھیں۔ چودھرائن، حسّو، بڑی جدّن اور کلّن مرثیہ خوانی اور نوحہ میں بھی عدیم المثال تھیں۔ یہ طوائفیں اپنے تعزیوں کے ہمراہ مرثیہ پڑھتی تھیں تو سڑکوں پر راستے بند ہو جاتے تھے، جمِ غفیر لگے رہتے تھے۔ انھیں بلند پایہ اور فن کار طوائفوں میں ایک خورشید بھی تھی جو چلبلی خورشید کے نام سے موسوم تھی۔ اُس نے آخر میں ایک

جلیل القدر تعلقدار اور رئیس سے مناکحت کر کے پردہ نشینی اختیار کر لی تھی اور اُس کے بعد کبرا بیگم کے نام سے شہرت حاصل کی۔ یہ خاتون بلا کی طباع اور ذہین تھی۔ متعدد فنون میں دستگاہ رکھتی تھی، موسیقی میں پہلی صف کی موسیقار تھی، گھوڑے کی بہترین شہسوار تھی، سائیکل بہت تیز چلاتی تھی اور کنکوا لڑانے میں بھی اُس کے مثل و نظیر بہت کم تھے۔ اُس طبقاتی دور میں بھی شرفا و روسا اُس سے کنکوا لڑانا عار نہیں سمجھتے تھے۔

رقص و موسیقی کی محفلوں میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کا اِن طوائفوں سے گفتگو کرنا یا تہذیب و متانت سے مزاح کر لینا معیوب نہیں تھا۔ مجرا ختم کرنے کے بعد طوائفیں معتدر لوگوں کے قریب آ کر ہم کلام ہو جاتی تھیں اور کوئی انگشت نمائی نہیں کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ اُس زمانہ کی تہذیب پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب لکھنؤ کلچر کی آخری شمعیں ٹمٹما رہی تھیں، موسیقاروں میں اچھن بائی کا کوئی مثل و نظیر نہیں رہ گیا تھا، جو دو چار زندہ تھیں وہ بھی خانہ نشین ہو چکی تھیں اس لیے موسیقی کے دل دادہ اچھن بائی کا گانا سننے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک محترم نے اپنے صاحب زادے کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہونے کی خوشی میں دعوت کی اور حسبِ رواج و دستور طوائفوں کے مجرے کا بھی انتظام کیا۔ تین طائفے بلائے گئے تھے جن میں ایک اچھن بائی کا تھا۔ شرکا بزم کی پہلی صف میں بابو بشیشر ناتھ سریواستو جو بعد میں اودھ چیف کورٹ کے چیف جج ہوئے اور پنڈت جگت نرائن ملاّ تشریف فرما تھے۔ یہ حضرات ہماری پرانی کلچر کے ستون اور موسیقی کے قدر شناس تھے۔ پنڈت جگت نرائن ملاّ کے صاحب زادے پنڈت تیج نرائن ملاّ جو بعد میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج ہوئے اپنے پدرِ عالی مقدار کے پہلو میں رونق افروز تھے۔ ان حضرات کی موجودگی کی وجہ سے اچھن بائی کا گانا کافی دیر تک ہوتا رہا۔ مجرا ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کر آئیں اور انھیں صاحبان کے قریب بیٹھ گئیں اور پنڈت تیج نرائن ملاّ کی مزاج پرسی کی۔ وہ اُس زمانہ میں کچھ علیل رہ چکے تھے انھوں نے جواب دیا "خدا کا شکر ہے اب اچھا ہوں، بہت دنوں بیمار رہا۔ اچھن بائی نے دریافت کیا۔ "نصیب دشمناں کیا بیماری تھی؟" انھوں نے جواب دیا کہ سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ نیند قطعاً نہیں آتی تھی۔ اچھن بائی نے کہا کہ "مجھے بلوا لیا ہوتا، میں سرہانے بیٹھ کر گا دیتی فوراً نیند آ جاتی۔" ملاّ صاحب نے مسکرا کر برجستہ جواب دیا۔ "آپ کے گانے سے مجھے کیا نیند آتی۔ قبلہ کے سرہانے آپ گائیں تو انھیں فوراً نیند آ جائے گی۔" "قبلہ" سے مراد اُن کے

والدِ محترم تھے جو پہلو میں تشریف فرما تھے۔ عمر کے اعتبار سے اچھن بائی پنڈت تیج نرائن ملا سے کافی بڑی تھیں۔

اسی قسم کی بزلہ سنجیاں اور ظریفانہ دستانسرائیاں رئیسوں کی نجی صحبتوں میں ہر روز ہوا کرتی تھیں۔ میرے محترم دوست مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں مرحوم کے یہاں کی نشستیں جن کا لطف برسوں اور بلا ناغہ ہر روز حاصل ہوا کرتا تھا جب یاد آتی ہیں تو بے ساختہ آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں اور پہروں تک دل کی حرکت قابو میں نہیں آتی۔ مرزا بہادر خانوادہ آغائی صاحب کے آخری چشم و چراغ تھے۔ شہر کے ممتاز اور دریا دل رئیسوں میں تھے بے حد پُرخلوص اور زندہ دل انسان تھے۔ اُن کے یہاں شام کو بلند پایہ طوائف کی حاضری لازمی تھی، نغمہ سرائیاں ہوتی تھیں یا شعر و ادب کی محفلیں گرم ہوتی تھیں، کبھی کبھی ضلع جگت میں گھنٹوں باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بے تکلّف دوستوں کا مجمع اور ایک ماہ وش پری پیکر کی سنگت، نشاط و طرب کا ترنم، کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ:

وقت کے ہاتھوں پہ روشن ہیں ابد کی مشعلیں

بہر حال وہ وقت گزر گیا، وہ محفل اجڑ گئی، وہ بساط پُر شکن ہو گئی، وہ محفل رہی اور نہ وہ محفل آرا، نہ ویسے جلسے ہیں اور نہ وہ پُر کیف و پُر لطف تذکرے، اُن کی یاد باقی ہے مگر وہ بھی شمع خموش کی طرح افسردہ ہے، اُن حکایتوں کو بیان کرنے کی نہ دل میں طاقت ہے اور نہ قلم میں یارائی، البتہ مثالاً ایک ایسا واقعہ پیش کیا جاتا ہے جو چودھرائن کے گھر اور میری ذات سے براہ راست متعلق تھا۔

چودھرائن کے گھر سے میرا سلسلہ لڑکپن ہی میں قایم ہو چکا تھا۔ عم محترم فضل حسین خاں مرحوم یعنی برادر مرحوم مرزا جعفر علی خاں اثر کے والد ماجد کی گہری دوستی بڑی چودھرائن یعنی نہوا سے تھی اور یہ تعلقات ایسے تھے کہ دونوں بہنوں کی آمد و رفت ہمارے گھروں میں تھی۔ اور اُن کی راہ و رسم بیگمات سے بھی تھے۔ اسی طرح میرے ایک دوسرے بزرگ نواب محمد علی خاں المعروف بہ نواب بنّے صاحب مرحوم سے دیرینہ اور قریبی تعلقات چھوٹی چودھرائن یعنی بچوا سے استوار تھے۔ یہ روابط اتنے پُرخلوص تھے کہ چچا بنّے صاحب کا فرقِ مبارک انتقال کے وقت بچوا کے آغوش میں تھا۔ انھیں تعلقات و روابط کی بنا پر میں اور چچا بنّے صاحب کے صاحب زادے سید شہنشاہ حسین مرحوم جو میرے عہدِ طفولیت کے بے تکلف اور پُرخلوص

دوست تھے اُن کے گھر جاتے تھے۔ بڑی چودھرائن کو ہم لوگ " اَپّن " اور چھوٹی کو " ماما " کہتے تھے۔ یہ دونوں بہنیں ہم لوگوں کو اولاد سے کم نہیں سمجھتی تھیں۔ ہم دونوں کی زندگی کا جوانی آجانے کے بعد تک قابلِ لحاظ حصہ انھیں کے گھر میں بسر ہوا تھا۔ جہاں انسانیت و شرافت اور تہذیب و اخلاق کی تعلیم کے علاوہ روحانی مسرتیں بھی حاصل ہوا کرتی تھیں۔ بڑی بہن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ چھوٹی بہن کے صرف ایک لڑکی رشکِ منیر تھی جو مجھ سے عمر میں چند سال چھوٹی تھی، گھر کا چشم و چراغ تھی اور رقص و نغمہ میں اپنی والدہ کی صحیح معنوں میں جانشین تھی۔ رشکِ منیر کے مزاج میں بلا کی صفائی، سادگی اور نزاکت تھی۔ اُس کو زرق برق پوشاک سے نفرت تھی، بے حد سادہ اور صاف ستھرا لباس پہنتی تھی۔ دن میں دو بار غسل کرنا اور کپڑے بدلنا، علی الصباح سو کر اُٹھنا اور معمولاتِ زندگی کو وقتِ مقررہ پر انجام دینا اُس کا شعار تھا۔ جسم میں یا جسم پر کپڑوں میں خوشبو لگانا گوارا نہیں تھا لیکن ہر اتوار کو کپڑوں کی الماری خالی کر کے فرانسیسی سنٹ " امبر روز " کی پوری بڑی شیشی لکڑی کے پٹروں پر چھڑک دی جاتی تھی تاکہ خوشبو چھن کر کپڑوں کو بسا دے۔ " عمر خیام " نامی فرانسیسی صابن نہانے دھونے میں استعمال ہوتا تھا اور سر میں لگانے کے لیے حیدر آباد کا " دکن ہیر آئیل " مرغوب خاطر تھا۔ آخر الذکر تینوں اشیا کی فراہمی میں بسا اوقات زحمتیں اٹھانا پڑتی تھیں لیکن اُن کا بدل نہ کبھی تلاش کیا اور نہ تلاش کرنے پر طبیعت راغب ہوتی۔ اس نازک مزاجی اور نازک دماغی کے ساتھ مذاقِ سخن بھی بہت بلند تھا۔ مرزا غالب کا اُردو دیوان حفظ تھا اور ہر موقع و محل سے مناسب شعر پڑھ دینا اُس کی عادت میں داخل تھا۔

رشکِ منیر کے کمرے میں ایک شام کو ہم چند دوست بیٹھے ہوئے تھے جن میں خصوصیت کے ساتھ کلکتہ کے دو دوستوں ہاشم ابراہیم صالح جی سیٹھ اور سید محمد عبد الرسول شاکی کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔ میرے عزیز ترین دوست شہنشاہ مرحوم بھی موجود تھے۔ بات میں بات چلی اور ہاشم صاحب نے اپنی تجارت کا تذکرہ کرتے ہوئے لاکھوں اور کروڑوں کی داستان سنائی۔ شاکی نے جن کا عرف مدّی تھا اور جن کو میں اور شہنشاہ مدّی بھائی کہتے تھے اپنا کلام سنانا شروع کیا جس کا سلسلہ عرفی کے بعض اشعار تک پہنچ گیا۔ اِن اشعار کو سن کر شہنشاہ نے کہا کہ یہ تو " در فخر خاندانِ خود می گوید " کا معاملہ ہے۔ ایسی باتیں اُردو زبان میں ہم سب لوگ پیش کر سکتے ہیں اور اسی سلسلہ میں اپنے اسلاف اور اُن کے آخری تاجدار

اودھ کے ساتھ وفاداری کے تذکرے سنائے۔ شہنشاہ کے بعد مجھے بھی کچھ کہنا چاہیے تھا لہٰذا مقامِ مفاخرت میں جو کچھ بھی کہہ سکتا تھا کہہ گیا۔ میری داستان سرائی بھی سب نے لطف اندوز ہو کر سنی لیکن میرا کلام ختم ہوتے ہی رشکِ منیر نے جو سب کی حکایتیں غور سے سن رہی تھی صرف ایک شعر پڑھا جس کو سن کر سب سکتے میں آ گئے اور مجھے حقیقتاً چکر آ گیا۔ وہ شعر یہ تھا ؎

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروش شوخیِ داغِ کہن ہنوز

یہ شعر سب کے لیے نشتر بدل تھا لیکن میرے حق میں اس کی اذیت بہت جانکاہ تھی۔ میں نے جن اسلاف کا ذکر کیا تھا اُن کی کوئی وراثت مجھے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ نہ ویسی دولتِ علم تھی اور نہ میرے پاس اُن کا ایسا جاہ و اقتدار تھا۔ بہرحال اس وقت صرف یہ بات کہنا ہے کہ شعر ایک ایسی عورت کی زبان سے جس کا تعلق طوائفوں کے طبقہ سے تھا، پڑھا جانا اور بہترین موقع و محل پر پڑھا جانا ہماری قدیم معاشرت کی برتری ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایسی تھیں وہ طوائفیں جن کے قدردان ہمارے برگزیدہ اسلاف تھے۔

اس مقام پر چودھرائن کے حالات کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کیوں کا اُن کا اقتدار تمام طوائفوں پر قایم تھا اور سب ڈیرہ دار طوائفیں ہر شعبۂ حیات میں انھیں کی تقلید کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اُن کے یہاں شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں ہر ڈیرے دار کی شرکت لازمی تھی۔ ایسے اجتماعات آئے دن ہوا کرتے تھے لیکن ایک بار ایک ایسا یادگار مجمع بھی ہوا تھا جس کی مثال پہلے یا بعد کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دو طوائفیں شدید علالت کی حالت میں چوپہلوں پر سوار ہو کر حاضر ہوئی تھیں۔ یہ واقعہ غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء کا ہے۔ جب مرکزی ایوانِ قانون ساز میں بازاری عورتوں کا پیشہ ختم کرنے کی تجویز پیش ہو رہی تھی۔ میرے محترم اور بزرگ لیکن بے تکلف دوست چودھری محمد علی مرحوم تعلقدار ردولی کے ایما پر اس بِل کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ بڑی چودھرائن کے زیرِ صدارت انھیں کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ بڑے جوش و خروش میں ایک احتجاجی تجویز منظور ہوئی تھی جس کی تائید میں متعدد طوائفوں نے معرکۃ الآرا تقریریں کی تھیں۔ قطعاً یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ جلسہ تعلیم یافتہ ماہرینِ سیاست کے اجتماع سے کسی طرح بھی کم وزن تھا۔

بہر حال تجویز منظور ہوئی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی خدمت میرے اور چودھری صاحب مرحوم کے سپرد ہوئی تھی۔ اُس وقت ہماری یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی تھی اور جہاں تک مجھے یاد آتا ہے حکومت کے ایک مقتدر رکن نے ہماری تائید کی تھی۔

چودھرائن اُس عالیشان محل سرا میں رہتی تھیں جو وسط چوک میں واقع تھی اور جہاں اب اصغر علی محمد علی کے عطر کی دوکان اور اُن کا کارخانہ ہے۔ شاہی زمانہ میں یہ محل سرا میرے نانا نواب حکیم شفاء الدولہ بہادر کی املاک تھی جہاں وہ سکونت پذیر تھے۔ غدر کے بعد جب انھوں نے فیض آباد مراجعت فرمائی تو اس تمام جائداد کو ایک سو روپیہ کے بالعوض ایک رئیس سید اکبر حسین مرحوم کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ املاک اکبر حسین صاحب سے چودھرائن نے خرید لی تھی۔ اُن کے زمانہ تک یعنی ۱۹۲۶ء تک جب کہ وہ قابض و متصرف تھیں محل سرا اپنی اصل حالت میں برقرار رہی تھی۔ اس عالیشان عمارت کا صدر دروازہ چوک کی طرف تھا، ایک دروازہ عقب میں تھا اور ایک چور دروازہ پہلو میں تھا۔ محل سرا کے پیچھے کا حصہ ایک وسیع و عریض مکان تھا جو زنان خانہ کہلاتا تھا۔ چودھرائن کے عزیز و اقارب اور متعلقین اسی مکان میں رہتے تھے جن کی تعداد کسی طرح بھی بیس پچیس افراد سے کم نہیں تھی۔ ان اعزا میں اُن کے بھائی، بھتیجے مع اہل و عیال کے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض کچھ فکرِ معیشت کر لیتے تھے لیکن زیادہ تر سب کی کفالت انھیں دونوں بہنوں کے ذمّے تھی جو سالارِ قبیلہ تھیں۔ یہ اخراجات نقد کی صورت میں دیے جاتے تھے۔ اپنی گھرداری کا انتظام وہ لوگ خود کرتے تھے۔ ہر خاندان کا علیحدہ باورچی خانہ اور علیحدہ بندوبست تھا۔

محل سرا کے بیرونی حصہ میں دونوں بہنیں، اُن کی ایک تیسری بہن اور لڑکی رشک منیر رہا کرتی تھیں۔ یہ ایک مشترک خاندان تھا جس کی گھرداری باقی خاندان والوں سے بالکل علیحدہ تھی۔ وہ تیسری بہن جس کا نام مہر منیر تھا عالمِ شباب میں انتقال کر گئی تھی اور اُس کے بعد باقی ماندہ تین افراد کے نام سے گھر چل رہا تھا۔ اس بیرونی علاقہ میں صدر دروازہ سے آمد و رفت تھی، اندر آنے کے لیے چند سیڑھیاں طے کرنا پڑتی تھیں، اُس کے بعد صحن تھا، سیڑھیوں اور صحن کے دونوں جانب کمرے تھے۔ صدر پھاٹک اور تمام زیریں کمروں کے اوپر بھی ہال اور متعدد کمرے تھے۔ صدر پھاٹک اور متصل کمروں کے بالاخانہ پر تین بڑے

کمرے تھے جن میں رشک منیر رہتی تھی۔ ایک کمرہ ڈرائنگ روم تھا جو بڑے سلیقہ سے آراستہ و پیراستہ رہتا تھا، زمین کا فرش تھا اور متصل ہی جدید طرز کا فرنیچر بھی لگا رہتا تھا لیکن نشست ہمیشہ فرش ہی پر ہوتی تھی۔ دوسرا کمرہ خواب گاہ اور تیسرا حمام تھا۔ صحن کے آگے تین درجہ کی شہ نشین تھی جس کا تیسرا اور بلند درجہ امام باڑہ تھا۔ شہ نشین کے بالاخانہ پر بھی متعدد کمرے تھے جن میں چھوٹی چودھرائن ماہ منیر رہتی تھیں۔ شہ نشین کے پہلے دونوں درجوں میں تختوں کے چوکے تھے جن پر صاف ستھرا فرش ہمہ وقت بچھا رہتا تھا۔ اسی شہ نشین کے دوسرے درجہ میں تختوں کے چوکے پر ایک کونے میں دیوار سے متصل ایک پلنگ بچھا رہتا تھا جس پر بڑی چودھرائن اپنے ڈیل ڈول سمیت ضعیفی کے باعث زیادہ تر لیٹی ہوئی تسبیح پڑھا کرتی تھیں اور ساتھ ہی اُن کا اوپر کا پاؤں برابر حرکت میں رہتا تھا جس کے سبب سے کبھی کبھی اُن کا پیٹ کھل جاتا تھا۔ شہ نشین کے پہلے دونوں درجوں کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں رہتا تھا۔ اس لیے جو شخص بھی اندر آتا اُس کا بڑی چودھرائن سے فوراً سامنا ہو جاتا تھا۔ خلافِ وقت آنے والوں میں ایک صاحب ایسے تھے جن کا مکان مسکونہ قریب ہی تھا، اُن سے بڑی بہن سے بے تکلفانہ مراسم تھے، جب دل گھبراتا چلے آتے تھے۔ وہ بھی بوڑھے تھے اور چودھرائن بھی بوڑھی تھیں مگر دونوں میں بڑی پُر لطف باتیں ہوتی تھیں۔ ایک روز وہ دوپہر کو آگئے اور اُن کی آواز سن کر چھوٹی چودھرائن بھی کوٹھے سے نیچے آگئیں۔ بڑی بہن کے پیٹ کا ایک حصہ کھلا ہوا تھا، چھوٹی بہن کو ناگوار ہوا۔ انھوں نے موصوف کے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم نہ وقت دیکھو اور نہ بے وقت، گھر میں گھس آتے ہو۔" انھوں نے مسکرا کر اور کھلے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔ "کیا کروں، میں تو اس پیٹ کا عاشق ہوں" بڑی بہن نے فوراً جواب دیا۔ "کیسے عاشق نہ ہوگے، نو مہینے تو اسی پیٹ میں رہ چکے ہو۔"

شہ نشین کا پہلا درجہ عام نشست گاہ تھی جو صبح اور شام رئیسوں کے دربار کی طرح آباد رہتی تھی۔ حاضرینِ بزم میں روسا شرفا شعرا اور دوست احباب رہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی دورِ جدید کے مقتدر تعلیم یافتہ حضرات بھی آجاتے تھے۔ بہت پُر لطف باتیں ہوتی تھیں۔ ان دونوں بہنوں سے بالخصوص چھوٹی بہن سے بات کرنے میں وہ لذت ملتی تھی جو کہیں اور نصیب نہیں تھی۔ دونوں وقت دسترخوان بھی اسی جگہ بچھتا تھا اور پچیس تیس بشر کا شریک طعام رہتے تھے۔

کوئی جلیل القدر دوست اِن بہنوں میں کسی ایک یا دونوں سے مخصوص ملاقات کے لیے تشریف لاتے یا رات کو کوئی رئیس رقص و سرود کا خواہش مند آجاتا تو ایسے مواقع کے لیے بالاخانہ پر ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ ایسی ہی ضروریات کے لیے مخصوص تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام رئیسانہ ٹھاٹھ کی وجہ سے اخراجات میں بہتات تھی۔ دوسری طرف بیسویں صدی کے اوائل ہی سے عمائدینِ شہر کی دولت و ثروت پر تیزی سے زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُن کی آمدنی گھٹتی رہی مگر وہ دونوں بہنیں برابر قرض لے کر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی زندگی وضعداری سے بسر کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ مکان بھی رہن ہو گیا۔ لکھنؤ کے علاوہ کلکتہ میں بھی اُن کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ لہٰذا اُدھر کا رُخ کیا۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اخراجات اور بڑھ گئے، آمدنی میں حسب ضرورت اضافہ نہیں ہوا، کھلے ہوئے ہاتھ بند نہیں ہو سکے، بڑھے ہوئے حوصلے کم نہیں ہوتے اور فضول خرچیاں روکی نہیں جا سکیں۔ چھوٹی چودھرائن خصوصیت کے ساتھ بہت من چلی اور فراخ دل تھیں۔ اُن کو سیر و تفریح کا بھی بہت ذوق تھا۔ باہر نکلتی تھیں تو گھر کے نیز دوستوں کے بچے ہمراہ ہوتے تھے گویا کہ ایک چھوٹا سا قافلہ ساتھ چلتا تھا اور یہ بھی ضروری ہوتا تھا کہ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی چیز خرید کر دی جائے اس کے علاوہ دونوں بہنیں ضرورت سے زیادہ متواضع تھیں۔ اُن کے انھیں عادات و اطوار کی وجہ سے کلکتہ کا قیام بھی اُن کے لیے سود مند نہ ہو سکا۔ حالاں کہ اُن کی آمدنی یقیناً وافر تھی۔

اس وافر آمدنی کا اندازہ بہر حال کبھی کسی کو نہیں ہو سکا۔ ڈیرے دار طوائفیں رئیسوں کی ملازمت کرتی تھیں اور اُن کے نرخ متعین تھے۔ چودھرائن کے گھر کا نرخ ایک ہزار روپیہ ماہوار تھا، جو اُس ارزانی کے زمانہ میں ایک کثیر رقم تھی۔ بالائی آمدنی اُس مستقل تنخواہ سے بدرجہا زیادہ ہوتی تھی۔ اور ملازمت کا یہ حال تھا کہ اُس کا سلسلہ اُس وقت تک ختم ہی نہیں ہوتا تھا جب تک کہ اُن کا صاحبِ دولت و ثروت پرستار مفلوک الحال ہو کر اپنے گھر نہ بیٹھ رہے۔ لکھ پتی آتے تھے اور مفلس ہو کر واپس جاتے تھے۔ مگر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ کاروبار اس طرح چلایا جاتا تھا کہ کبھی کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہیں ملا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ چودھرائن نے اُن سے یا فلاں فلاں شخص سے کوئی چھوٹی یا بڑی رقم طلب کی ہو۔ ان دونوں بہنوں اور اُن کے گھر میں کچھ ایسا جادو تھا کہ صاحبانِ

دولت زر و جواہر تو درکنار اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں چھوٹی بہن سے متعلق ایک واقعہ مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔ راقم اُس زمانہ میں کالج کا طالب علم تھا اور دسمبر کی تعطیل میں اُنھیں کے یہاں مقیم تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت ایک گراں قدر رئیس، جن کو اُن کے ہمراہی مہاراجہ کہتے تھے، چھوٹی چودھرائن سے ملاقات کرنے آئے تھے تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں پھر انھوں نے ہوا خوری کے لیے ساتھ چلنے کی فرمایش کی۔ آگے آگے مہاراجہ اپنی کار پر اُن کو ہمراہ لے چلے اور پیچھے پیچھے گھر کے سب لڑکے، خود چودھرائن کی موٹر میں روانہ ہوئے۔ چورنگی پہنچ کر ایک جواہرات کی دوکان پر جس کا نام غالباً ہملٹن تھا دونوں موٹریں رکیں اور ہم سب باہر آئے۔ دوکان میں داخل ہوتے ہی مہاراجہ نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ خرید لیجیے۔ انھوں نے انکار کیا اور یہ کہا کہ "آپ کا دیا ہوا سب کچھ ہے، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔ ساری دوکان گھوم ڈالی گئی اور اُدھر سے اصرار مگر اِدھر سے انکار ہوتا رہا۔ صدر دروازہ پر واپسی ہوئی تو مہاراجہ نے فرمایا کہ "آپ نے میرا دل توڑ دیا، اگر آپ نے کوئی ایک چیز بھی خرید لی ہوتی تو میں بہت شکر گزار ہوتا"۔ چودھرائن نے جواب دیا کہ "آپ کا یہی حکم ہے تو میں ایک عدد سر آنکھوں پر رکھ لیتی ہوں"۔ اور فی الفور ایک ایسا گلوبند اٹھا لیا جو اُس دوکان کا سب سے زیادہ قیمتی زیور تھا۔ یہ ہیروں کا جڑاؤ نکلس تھا جس کی قیمت ہزاروں روپے تھی۔ پھر بھی اس تحفہ میں کسی جنسی تعلق یا دیرینہ تعلقات کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ اُن کو نہ اپنا گھر لٹا دینے میں کوئی باک ہوتا تھا اور نہ دوسرے کو تباہ کر ڈالنے میں کوئی درد محسوس ہوتا تھا۔

کلکتہ کے دوران قیام میں رقص و سرود کا کاروبار بھی کامیابی ہی کے ساتھ چلتا رہا تھا لیکن لکھنؤ سے قطع تعلق کر لینا ممکن نہ ہو سکا۔ ایک تو وہاں کا ماحول اُن کے مزاج کے لیے سازگار نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ آمدنی سے اخراجات زیادہ تھے اور وہاں بھی قرض کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ یہ صورت حال پریشان کن تھی کہ سارا خاندان، جن سے وابستگی بہت تھی، لکھنؤ میں تھا، بعض عزیزوں کی شادیاں بھی کرنا تھیں لہٰذا واپسی ہوئی اور اس طرح واپسی ہوئی کہ تباہی کا دروازہ کھل گیا۔ اس شہر پر فلاکت منڈلا رہی تھی۔ تقریبات میں اُن کے اقتدار کی طوائفوں کا مجرے کے لیے طلب ہونا قریب قریب ختم تھا۔ جسم فروشی کی لعنت کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان حالات میں ایک طرف پیشہ کی آمدنی

بمنزلہ صفر کے رہ گئی تھی تو دوسری طرف وضعداریاں اور فضول خرچیاں عادت میں داخل تھیں۔ قرض کے بل بوتے پر کام چلتا رہا، رفتہ رفتہ سب زیور فروخت ہو گئے، قیمتی ساریاں بھی بک گئیں، بالآخر قرض کی ڈگری میں مکان بھی عدالت سے نیلام ہو گیا۔ تھہراً ایک بار پھر کلکتہ کا رُخ کیا۔ لیکن ہنوز فلاح کی کوئی صورت نہیں نکلی تھی کہ رشک منیر نے جو کمائی کا واحد ذریعہ تھی عالمِ شباب میں انتقال کیا۔ اُس کی میت لاکر لکھنؤ میں سپردِ خاک کی اور اُس کے بعد کہیں باہر جانے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مختصر یہ کہ صرف چار برسوں کی مدّت میں گھر کا یہ حال ہو گیا کہ جائداد منقولہ میں بھی کوئی قیمتی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انتہائی عروج اور بے انتہا تعیش کے بعد شدید ترین مصائب و آلام میں مبتلا رہ کر ان دونوں بہنوں نے اقلِ قلیل وقفہ میں یکے بعد دیگرے انتقال کیا اور لکھنؤ کی خاک کا پیوند ہو گئیں۔ لیکن انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے کنبہ والوں کو اچھی تعلیم و تربیت دے کر اس قابل بنا دیا تھا کہ آج اُن کا شمار شریف زادوں میں ہے اور کوئی بھی عسرت میں مبتلا نہیں ہے۔

ڈیرے دار طوائفوں نے روسا و امرا کی صحبتوں میں اخلاقی اور روحانی فضائل کا اکتساب کر کے جہاں ایک طرف اپنے جنسی رجحانات و احساسات پر قابو حاصل کر لیا تھا اور اپنی منجملہ دوسری خوبیوں کے اس کمال کی بدولت بھی شرفا و عوام کی نظروں میں ایک بلند مقام کی مالک بن گئی تھیں۔ وہاں دوسری طرف انھوں نے اپنی ہنرمندانہ صلاحیتوں اور اپنے فن کارانہ سلیقوں سے نہ صرف اپنے پرستاروں بلکہ معاشرہ کے ہر شعبہ کو بھی متاثر کیا تھا۔ روسا کے بچّے اُن کے دامانِ تربیت میں آداب و اخلاق سیکھتے تھے اور یہی تہذیب اُن کی وساطت سے دوسروں میں بھی آتی تھی۔ بچّے جوان ہو کر اپنے متوسلین اور مقربین کے لیے درس آموز ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا اور وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ انھیں طوائفوں کی صحبتوں میں ادیبوں اور شعرا کو نازک خیالیاں آتی تھیں۔ اُن کے یہاں سے بہتر ندرت کی مثالیں کہیں اور نہیں ملتی تھیں۔ معدودے چند متقی اور متشرع شاعروں کے علاوہ جن میں مولانا صفی کا نام نامی سرِفہرست ہے باقی تمام موزوں طبع حضرات نیز بلند پایہ شعرا کسی نہ کسی ڈیرے دار طوائف سے دوستانہ روابط رکھتے تھے فن کار اور صنعت گر اگر کسی رئیس سے اپنی کاریگری کی داد یا اُس کے صلہ میں انعام و اکرام پاتے تھے تو اس کے پسِ پُشت بھی طوائف ہی کی قدردانی ہوتی تھی۔ پیشہ ور روپیہ کمانے

کا بہترین طرز بھی اسی طبقہ سے سیکھ سکتے تھے کیوں کہ طوائف حصولِ زر ہی کے لیے پیشہ کرتی تھی۔ عام شرفا انھیں طوائفوں کے جلیس ہو کر بات کرنے کا ہنر اپناتے تھے۔ مرحوم حکیم منے آغا فاضل شہر لکھنو کے نامور طبیب، گراں قدر شاعر اور ممتاز رئیس تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرنے کے لیے رنڈی بازی سے سلیقہ آتا ہے۔ رنڈی سے مراد ڈیرے دار طوائف تھی اور اس سلیقہ کا آنا اُن کے نزدیک خوش گفتاری پر منحصر تھا وہ فرماتے تھے کہ ؎

سب کچھ آتا ہے بے محبت کے
بات کرنا مگر نہیں آتی

اور یہ محبت ڈیرے دار طوائف سے کرنا وہ ہر شعبہ میں ترقی کی ضامن سمجھتے تھے۔ اُن کے اِن فرمودات میں یقیناً بڑی حد تک صداقت تھی۔ طوائف کے اِن تمام محاسن کے علاوہ اُس کی وفاداریاں بھی اپنی آپ مثال تھیں۔

دورِ حاضر میں یہ سمجھنا یا دوسروں کو یہ سمجھانا بہت مشکل مرحلہ ہے کہ طوائف سے غیر شہوانی محبت بھی ہو سکتی ہے یا یہ کہ وہ اپنے چاہنے والے کو بے غرض ہو کر پیار کر سکتی ہے۔ زمانہ اتنا بدل چکا ہے کہ حسن پرستی اور بوالہوسی میں امتیاز باقی نہیں رہا اور نہ کوئی صنفِ نازک کو اتنا بلند مقام دینے پر آمادہ ہے کہ ایک عورت کی صحبت صرف روحانی لذت کی آسودگی تک محدود کر دی جائے۔ فی زمانہ یہ صورتِ حال طوائف کے سلسلہ میں سوچی ہی نہیں جا سکتی۔ لیکن اسی شہر لکھنو میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی تھیں جہاں بغیر کسی جنسی تعلق کے رئیس اپنی مرغوبِ نظر طوائف پر گرویدہ رہتا تھا اور طوائف بھی اُس کی محبت میں پروانہ وار فریفتہ رہتی تھی۔ اس فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ رئیس کے تباہی و بربادی میں مبتلا ہونے کے بعد بھی طوائف ساتھ چھوڑ کر دوسری طرف کبھی رُخ نہیں کرتی تھی اور اسی ایک رئیس کی دائمی رفیقِ حیات رہ کر اپنی زندگی کے اچھے اور بُرے سب دن گزار دیتی تھی۔ ڈیرے دار طوائفوں کا یہی ایک وطیرہ ایسا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسا و امرا کا طبقہ ختم ہوا تو ان طوائفوں کا حلقہ بھی نیست و نابود ہو گیا۔ ایسی پاک و پاکیزہ محبت میں استواری اور وفاداری کے جوہر شامل ہونا بھی فطری بات تھی۔ چنانچہ وہ طوائفیں زیادہ تر ایک ہی رئیس کی ہو کر رہتی تھیں۔ اپنی حیثیت کو منکوحہ بیگم کے مرتبہ سے کم تر سمجھتی تھیں لیکن اُن کی اولاد کے

ساتھ شفقتِ مادری میں کوئی کمی نہیں آنے دیتی تھیں۔ انھیں میں بعض ایسی بھی تھیں جو رئیس کی بے راہ روی پر کڑی گرفت بھی رکھتی تھیں۔ راقم کے حافظہ میں واقعہ ہمیشہ تازہ رہے گا جب ایک طوائف نے عید کے موقع پر ایک جوتی بھی قبول کرنے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کیوں کہ اُس سال رئیس نے بعض مالی مشکلات کی وجہ سے اپنی بیگم کے لیے نیا جوڑا نہیں تیار کرایا تھا۔ رئیس سے مہر و وفا میں اُس کے اہل و عیال کی پاس داری بھی ضروری تھی۔ شادی و غمی کے ہر موقع پر کم سے کم وہ طوائف جس کو محل میں داخل ہونے کی عزت مل جاتی تھی، بیگمات کی برابر رفیق و شریک رہتی تھی۔ ان طوائفوں کی یہ خصلت بھی زریں حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ وہ اپنے رئیس کے اصلاحِ حال کی برابر فکر رکھتی تھیں اور اُن کی ہمہ وقت یہ کوشش رہتی تھی کہ اُن کا وقار بلند رہے۔ اس سلسلہ میں ایک جلیل القدر ہستی کا واقعہ کسی قدر تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

ان بزرگ کا سلسلۂ نسب شہر کے عظیم ترین مرثیہ گو اور مرثیہ خواں خانوادہ سے تھا، لیکن اُن کو اپنے آبائی فن کی طرف عنفوانِ شباب تک کوئی توجہ نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے بجائے اُن کو موسیقی سے غیر معمولی شغف تھا اور طبلہ بجانے میں اعلیٰ کمال حاصل کر لیا تھا۔ اِن صلاحیتوں کا مالک ہوتے ہوئے طوائفوں سے رابطہ قایم ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ ایک مخصوص طوائف سے دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے اور وہ اسی کے یہاں زیادہ اوقات گزاری کرنے لگے تھے۔ ایک بار کسی ضرورت کے تحت طوائف کو بنارس جانا پڑا۔ آپ بھی ہمراہ تشریف لے گئے۔ دو کر یا تیسرے روز علی الصباح ہوا خوری کے لیے نکلے تو ایک بڑا پوسٹر ایک دیوار پر چسپاں نظر آیا۔ اُس کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک مجلس کا اشتہار تھا جس میں کسی مخصوص مقام پر صرف چند گھنٹوں کے بعد اُنھیں کے والد بزرگوار مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور اُلٹے پیروں قیام گاہ واپس ہوئے۔ طوائف نے اتنی جلد واپسی اور پریشانی کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے سارا ماجرا سنا دیا اور یہ بھی فرمایا کہ اب میں تین دن تک گھر کے باہر نہیں جاؤں گا۔ یہ سنتے ہی طوائف کے دل میں اُن کے والد محترم کو مرثیہ پڑھتے ہوئے دیکھنے اور سننے کا اتنا ولولہ پیدا ہوا کہ وہ ضبط نہ کر سکی۔ اُس زمانہ میں طوائفوں اور بیگمات کا لباس ایک ہی طرح کا ہوتا تھا اس لیے اُس کو تیاری میں دیر نہ لگی۔ صرف برقع اوڑھا اور ایک راہبر کو ساتھ لے کر روانہ

ہوگئی۔ مقامِ مجلس سے قریب ایک محترم کے محل میں بے تحاشا داخل ہوئی، اپنے کو لکھنؤ کی بیگم بتا کر تعارف حاصل کیا اور مجلس سننے کی خواہش ظاہر کی۔ سب نے اُس کو باعزت جگہ دی اور ہر امکانی سہولت فراہم کر کے اُس کی تمنا پوری کی۔ تخمیناً تین چار گھنٹہ تک وہاں قیام کر کے پورے سکون واطمینان سے مجلس سنی اور دل میں ایک نیا جذبہ لے کر واپس ہوئی۔ واپسی پر کچھ ایسے انداز اور اتنے خلوص سے اپنے دوست کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی تلقین کی کہ وہ بہت متاثر ہوئے اور اُسی وقت سے طبلہ کو خیرباد کہا، فکرِ سخن میں غرق رہنے لگے یہاں تک کہ اپنے والد کی ایک مجلس میں پیش خوانی کر کے اُن کا دل شاد کیا۔ کچھ برسوں کے بعد اُن کے والد محترم کا انتقال ہوگیا اور ایک قلیل مدت میں وہ محترم مرثیہ خوانی پر اُن کے قایم مقام ہوئے اور اکمل افراد میں اُن کا شمار ہونے لگا تھا۔ شہر کے ممتاز شعرا کی صفِ اوّل میں اُن کی جگہ تھی۔

وہ دور فکر وفن کا تھا، شعریت میں لکھنؤ کے در و دیوار ڈوبے ہوئے تھے۔ طوائفوں میں بھی بعض بہت اچھی شاعرہ تھیں اور زود گو تھیں۔ اُن کے خاندانوں سے بھی بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے تھے جنھوں نے بے محفل ادب کو رخشاں و درخشاں بنا دیا تھا۔ چودھرائن کے ایک بھائی صاحب کا شمار بہترین ناول نگاروں میں تھا۔ شعرا کی صف میں ایک گراں قدر ہستی جو اپنے زہد و تقویٰ میں ممتاز تھی ایک طوائف ہی کی آنکھوں کا نور تھی۔ ایک اور بزرگ جو شعر وادب کے علاوہ علومِ مغربیہ میں بھی مہارت رکھتے تھے اور اتنا کمال حاصل تھا کہ کالج کی پروفیسری کے منصب پر فائز ہوتے ایک مقتدر طوائف کے گھرانے کا چشم و چراغ تھے۔ ان تینوں بزرگوں کے خاندانی حالات سے راقم بذاتِ خود واقف تھا لیکن ایک اور ہستی تھی جو ان سب سے زیادہ گراں قدر تھی اور جس کو بعد میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اُن کے بارے میں بھی کہا جاتا تھا کہ وہ ایک بہت ممتاز طوائف کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ اس روایت کے صحیح ہونے کے بارے میں بعض قوی دلائل تھے۔ انھوں نے اپنے آبائی حالات نہ کبھی قلمبند کیے اور نہ زبان سے بیان کیے تھے۔ لیکن طوائفوں کی باتیں اس طرح کرتے اور لکھتے تھے کہ عزیزدارانہ قربت کی جھلک الفاظ میں نظر آتی تھی۔ اس ذیل میں اُن کا ایک ناول اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتا۔ تھا اور آج بھی گراں قدر ہے اور اُس کو پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے گھر کے

حالات خود بیان کر رہے ہیں۔ یہ چند مثالیں نمونتاً پیش کر دی گئی ہیں ورنہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ طوائفوں کے گھروں سے شاعری کے بے شمار ستارے افقِ ادب پر طلوع ہوئے تھے۔

ان تمام خصوصیات سے بڑھ کر طوائفوں کی ایک خاموش لیکن گراں قدر خدمت یہ بھی کہ اُن کا اس شہر میں جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی پیدا کرانے میں بہت بڑا حصہ تھا۔ ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، ایک رنگ میں ڈوب کر وقت گزارنا، مذہبی قید و بند سے آزاد ہو کر محبت و الفت کے میدانوں میں باد پیمائی کرنا، تعصب و تنگ نظری سے بچنا اور دور رہنا، یہ تمام عادات و اطوار طوائفوں کے تھے جن کے اثرات ملاقی ہونے والوں پر پڑتے۔ اُن کا نظامِ زندگی یہ تھا کہ ہر ڈیرے دار طوائف چودھرائن کے احکام کی تابع اور انھیں کے یہاں کے طور طریقوں کی پیروی اپنے لیے باعثِ مفاخرت سمجھتی تھی۔ چودھرائن کا گھرانا اچھے خصائل میں مثالاً پیش کیا جاتا تھا۔ اس طرح تمام ڈیرے دار طوائفیں ہنرمند بن گئی تھیں۔ اسی مقام پر یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ ڈیرے دار طوائفوں کی شرفا و عوام کی نظروں میں منزلت و وقار دیکھ کر معمولی اور ادنیٰ طوائفیں بھی اُن کی تاسّی کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا فیض حاصل کرتی تھیں۔ اُس زمانہ میں جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے بھی کوٹھوں پر چڑھ جانا معیوب نہیں تھا اس لیے چوک کا ہر کوٹھا شام کو آباد رہتا تھا اور ہر جگہ میل ملّت، راہ و رسم اور زبان و بیان میں ظاہری طور پر یک رنگی تھی۔ انسان کے ظاہر کا بھی اُس کے باطن پر بدیر و زود اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ہمارے شہر میں طوائفوں کے کلچر نے یگانگت اور موانست پیدا کرانے میں بہت بڑا رول ادا کیا تھا۔ روسا و عمائدین کے ساتھ ہم سابقہ طوائفوں کے بھی شکر گزار ہیں جن کے چھوڑے ہوئے اثرات کی بدولت ہمارے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کبھی نہیں ہوئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد جب شمالی ہندوستان میں بہت سے مقامات پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے تو ہمارے شہر میں کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی تھی۔ یہ سب فیض تھا ہمارے بزرگوں کے اخلاق اور اُن کی طوائفوں کے اطوار کا۔

## چھٹا باب

# فنونِ لطیفہ

(۱) رقص و موسیقی
(۲) مصوّری و خطاّطی
(۳) شناوری و غوطہ زنی

# (۱) رقص و موسیقی

موسیقی ہندوستان کا وہ فن ہے جس کا کوئی جواب دنیا کا کوئی ملک کبھی پیش نہیں کرسکا۔ مسلمانوں نے یہاں آکر زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا تھا اور ایک مخلوط کلچر کی بنیاد ڈال کر اس خوش نما گلدستہ کو تیار کیا لیکن موسیقی میں کوئی مداخلت نہیں کرسکے۔ اس فن کو جس طرح یہاں رائج تھا قبول کرلیا اور اسی میں صنعت گری سے گلکاریاں کرکے اُسی کو اور نکھار دیا۔ البتہ ایک جدید طرز کا اضافہ ضرور کیا اور اس طرز کو ہم قوّالی کہتے ہیں۔ موسیقی کی یہ صنف عراقی موسیقی کی نقل تھی۔ پھر بھی ہندوستان میں آکر وہ بھی ہمارے ہی فن میں رنگ گئی اور اب ہم بجا طور سے اس کو بھی ہندوستانی موسیقی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ قوّالی کو صوفیائے کرام کی سرپرستی کی بدولت فروغ حاصل ہوا تھا۔ ان کے نزدیک قوّالی کی طرز غنا کی تعریف میں نہیں آتی تھی اس لئے اُس کے اوپر حرمتِ غنا کا اطلاق بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ چوں کہ قوّالی کے اشعار کا موضوع ہمیشہ حمد و نعت و منقبت تک محدود رہا ہے اس لئے ان بزرگانِ دین کے لئے موسیقی کی یہ صنف ہمیشہ ممدوح و مطبوع رہی تھی۔ چنانچہ اب بھی ان کے مزاراتِ مقدسہ پر اُن کے سالانہ عرس میں بہت اچھی قوّالی سُننے میں آتی ہے۔ اس مخصوص طرز کے علاوہ موسیقی کے تمام دوسرے اصناف بنیادی طور پر خالص ہندوستانی ہیں۔

اودھ کے حکمران ایرانی النسل تھے اور اُن کی طبیعتوں میں نزاکتوں اور لطافتوں کے جوہر تھے وہ ہمارے قدیم موسیقی کے بہت جلد دلدادہ ہوگئے تھے اور اسی کی سرپرستی کرکے انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں بہت سے اختراعات رائج کئے تھے۔ سرپرستی کا یہ ولولہ عہدِ شجاع الدولہ ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ عہدِ آصف الدولہ میں دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا تو تمام فنکار یہیں چلے آئے۔ آصف الدولہ بھی موسیقی کے دلدادہ تھے اور اس فن کی عظمت کا اُن کو بہت احساس تھا چنانچہ انھوں نے موسیقی سے متعلق ایک کتاب فارسی زبان میں لکھوائی تھی جس کا نام اصول اللغات الآصفیہ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس فن پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قول انتزاعِ سلطنت اودھ تک کی مدت کے لئے صحیح ہو۔ لیکن قدیم لکھنؤ کے آخری دور میں راقم کے محترم دوست راجہ نواب علی خاں مرحوم نے جو اس فن میں کمال رکھتے تھے، ایک ضخیم کتاب تحریر

فرمائی تھی جس کا نام "معارف النغمات" تھا۔ کہنے کو یہ کتاب اُردو زبان میں ہے لیکن اُس دور میں اردو پر عربی اور فارسی کا شدید غلبہ تھا جس کے سبب سے اس کتاب کی زبان کو اُردوئے معرب کہنا زیادہ صحیح ہوگا مثال کے طور پر ایک جملہ پیش کیا جاتا ہے جس میں فاضل مصنف نے لفظ "آواز" کی تعریف اس طرح فرمائی ہے "آواز ایک ارتجاج ہے ہوائے محیط بالابدان کا جو بہ سبب تصادم واصطکاک اجزائے لینہ وصلبیہ کے پیدا ہو" راقم کو اول الذکر کتاب کو سرسری نظر سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور راجہ صاحب کی تصنیف بھی دلچسپی سے پڑھی اس لئے یہ عرض کرنے میں تامل نہیں ہے کہ نقش ثانی بہر حال نقش اوّل سے بہتر ہے۔

آواز کی مذکرہ بالا تعریف سے یہ لازمی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ موسیقی کے عناصر ترکیبی میں سُر اور لے ہیں۔ اچھی آواز اچھا سُر نکالنے میں مددگار ہوتی ہے اور موسیقار کی فنکارانہ صلاحیت لَے سے اُس کو مزیّن کرتی ہے۔ یہ تزئین تعین اوقات سے حاصل ہوتی ہے اور تعین اوقات ایک سُر سے دوسرے سُر کا درمیانی رشتہ ہوتا ہے۔ موسیقاروں نے سُر اور لَے میں نرت کا اضافہ کر کے فن کو کمال تک پہنچا دیا تھا۔ نرت کے معنی ہیں "بتلانا" یعنی یہ کہ جو خیال موسیقی میں پیش ہوتا تھا فنکار اسی کا نقشہ اعضا یا کسی ایک عضو کو حرکت دے کر پیش کر دیتا تھا۔ یہ فنکاری رقص میں بھی دکھائی جاتی تھی۔ شاہانِ اودھ کے دور میں عورتوں کے مقابلہ میں مرد کہیں زیادہ فنکار تھے۔ اور انھوں نے بڑے بڑے نام پیدا کئے تھے۔ غازی الدین حیدر کے دور میں شوری نے ٹپے کا راگ ایجاد کیا تھا اور حیدری خاں جو سڑے حیدری خاں کہلاتا تھا موسیقی میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ صرف پوریوں اور بالائی کی تواضع پر غازی الدین حیدر کو اپنا گانا سنایا تھا اور جب بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا کہ "حیدری خاں! مانگ کیا مانگتا ہے؟" تو اُس نے پہلے یہ اقرار لے کر کہ جو مانگے گا وہ مل جائے گا یہ درخواست کی اس فرمائش کی کہ "حضور یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی نہ بلوائیے گا اور نہ گانا سنیئے گا"۔ بادشاہ نے متعجب ہو کر اس فرمائش کی وجہ دریافت کی تو اس نے یہ جواب دیا تھا کہ "آپ کا کیا ہے؟ مجھے مروا ڈالئے گا پھر مجھ سا حیدری خاں نہ پیدا ہو گا۔ اور آپ مر جائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا" اور یہ بھی حقیقت ہے کہ پھر کوئی دوسرا حیدری خاں پیدا نہیں ہوا۔

واجد علی شاہ کے دور تک لکھنؤ کی موسیقی نے اپنا پرانا رنگ بدل دیا تھا۔ اُن کو موسیقی سے فطری لگاؤ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ آرام کرنے میں ان کے پیر کا انگوٹھا ہلتا تھا تو اس میں بھی لَے تھی۔ وہ

خود بڑے فن کار تھے۔ اُن کے یہاں تان سین کے متعدد اخلاف ملازم تھے اور موسیقاروں کو خطابات مرحمت ہوتے تھے۔ بادشاہ نے خود بھی ٹھمریاں اور دادرے تصنیف کیے تھے۔ تمام امرا و دوابستگانِ سلطنت موسیقی کے دلدادہ تھے۔ سعادت علی خاں کے زمانہ ہی سے بڑے بڑے عالم و فاضل بھیرویں سننے کے شیدائی تھے۔ راقم کے مورثِ اعلا آغا علامہ نواب تفضل حسین خاں نمازِ صبح کے بعد بھیرویں سنتے تھے۔ آخری دور میں اس طرزِ موسیقی میں بڑی بڑی لطافتیں پیدا کر دی گئی تھیں۔ راگ اور راگنیوں کا ذوق لکھنؤ والوں میں اتنی شدت کے ساتھ سرایت کر گیا تھا کہ انتزاعِ سلطنت کے بعد بھی بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک روسا و امرا کی محفلوں میں آئے دن موسیقی کی گرمیاں رہا کرتی تھیں غزلیں بھی راگ اور راگنیوں میں گائی جاتی تھیں اور ہر ایک کے گانے کا وقت معین تھا۔ مثلاً دو پہر رات کے بعد سوہنی گائی جاتی تھی اور دو پہر دن کے بعد 'پیلو' کے لیے وقت کا تعین تھا۔ بھیرویں گانے اور سننے کے لئے علی الصباح کا سہانا سماں بہت مناسب و موزوں ہوتا تھا۔ ایک گراں قدر بزرگ کے صاحبزادے کی رسمِ کتخدائی میں چھپن چھری نے غزل، جس کا مطلع یہ تھا، بھیرویں میں اس طرح گائی تھی کہ محفل میں کوئی ایسا نہ تھا جو متاثر نہ ہوا ہو۔

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا۔ بھلائی دیکھی، برائی دیکھی، عذاب دیکھا ثواب دیکھا مصرعِ ثانی میں "بھلائی" "برائی" "عذاب" "ثواب" اور پہلے مصرع میں "عجب عجب" اور "انتخاب" کے الفاظ کو علحدہ علحدہ اور طرح طرح سے بنایا تھا۔ یعنی یہ کہ یہی ایک شعر تخمیناً نو دس مرتبہ گایا تھا۔ ہر مرتبہ نیا لطف آتا تھا اور ایک ہی شعر کی بار بار تکرار قطعاً ناگوار نہیں ہوتی تھی۔

انتزاعِ سلطنت اودھ کے بعد قدیم لکھنؤ کے آخری دور میں موسیقی کا سارا کمال طوائفوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ مردوں میں جو لوگ ہنرمند تھے وہ انھیں طوائفوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ جو اس پیشہ سے کارہ تھے وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ البتہ روسا و عمائدین کی صحبتوں میں کبھی کبھی مخصوص طلبی پر جا کے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا دیتے تھے۔ بعض روسا و عمائدین کو خود بھی اتنا شغف تھا کہ وہ انہیں فن کاروں سے گانا سیکھتے اور راگ و راگنیوں کی مشق کرتے تھے۔ ایک جلیل القدر خانوادہ کے ایک محترم بزرگ چھوٹے آغا صاحب اعلا درجہ کے فن کار تھے۔ اُن کو تمام راگ اور راگنیوں کے گانے میں کمال حاصل تھا لیکن روسا کی محفلیں ہوں یا طوائفوں کے مجرے

راگنیوں میں سوزخواں مرثیے پڑھتے تھے۔ گھروں میں مستورات نوحے پڑھتی تھیں اور شادی بیاہ کی تقریبوں میں ڈومنیاں گایا بھی کرتی تھیں۔ طوائفیں آئے دن کسی نہ کسی رئیس کے یہاں تقاریب کے مواقع پر مجرے کرتی تھیں جس میں محلے کے عوام کو شرکت کے لئے اجازت رہتی تھی۔ مرد اور عورت سب ہی نقل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ من چلے اور خوش گلو نوجوان طوائف کی زبان سے جو غزل سن لیتے اُس کو اُسی دھن اور سُر میں باآواز بلند گلیوں اور کوچوں میں الاپا کرتے تھے یہ ایک حقیقت ہے کہ لکھنؤ کی آخری بہار شعر و نغمہ میں سرشار تھی اور در و دیوار سے ترنم اور موزونیت ٹپکا کرتی تھی۔

موسیقی کے ساتھ سنگیت کا ہونا بھی ہمیشہ لازمی رہا ہے۔ عہد قدیم میں طنبورہ، بین اور ستار بہت مقبول باجے تھے۔ ستار غالباً سب سے زیادہ پرانی ایجاد ہے۔ اس کے موجد امیر خسرو تھے۔ بین کو غالباً کبھی کوئی ممتاز جگہ سنگیت میں حاصل نہیں ہوئی۔ بین بجانے والے اس کا استعمال منفرداً ہی کرتے اور لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ البتہ طنبورہ اور ستار کو موسیقی کی سنگیت میں داخل تھا۔ مگر سارنگی کے وجود میں آجانے کے بعد ستار کا بھی علحدہ ایک مقام ہو گیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں موسیقار کی سنگت کے لئے سارنگی اور طبلہ کافی سمجھے جاتے تھے وہی دستور اب بھی قائم ہے۔ طنبورہ پر تو مشقِ فن سیکھتے ہیں یا بلند پایہ فنکار ہاتھ میں طنبورہ لے کر خود ہی بجاتے اور خود ہی گاتے تھے حقیقت امر بھی یہی ہے کہ سارنگی کو ہر فنکار کے سُر سے زیادہ مناسبت ہے۔ اور ہر گانے والی کی صلاحیت کا امتحان طبلہ ہی کی تھاپ پر گانے سے ہوتا ہے۔ یہی حال طبلچی کا بھی ہے اس کی فنکاری کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ وہ موسیقار کی تان پر طبلہ بجاتا رہے۔ مختصر یہ کہ موسیقی اور سنگیت لازم و ملزوم ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے زمانے میں طوائفیں اپنے طبلچی اور سارنگیے بڑی کاوش سے تلاش کرتی تھیں۔ فنکار طوائف نئے اور ناآزمودہ کار سازندوں کے ہمراہ مجرا کرنا پسند نہیں کرتی تھی حالانکہ تخمیناً پچاس برس قبل تک بہت اچھے سارنگیے اور طبلچی موجود تھے وہ لوگ خود بھی ہر نئی نویلی گانے والی کے ساتھ طبلہ یا سارنگی بجانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جودھرائن کے طبلچی عابد حسین نامی نے گھر بیٹھ رہنا گوارا کر لیا تھا لیکن جودھرائن کے بعد پھر کسی کے ساتھ طبلہ نہیں بجایا۔ یہ سارا دور ۱۹۳۰ء کے قریب ختم ہو گیا تھا۔ پھر نہ پرانے طائفے رہ گئے تھے اور نہ با کمال سازندے۔ رفتہ رفتہ نئے طرزِ موسیقی نے شرف قبول حاصل کر لیا جس کو کوئی علاقہ قدیم موسیقی سے نہیں ہے۔

رقص بھی ہندوستان کا قدیم ترین فن ہے۔ اس کو بھی فرمان روایانِ اودھ نے بجنسہ اپنا لیا تھا اور قدر دانی و سرپرستی فرما کے عوام و خواص میں مقبول کرا دیا تھا۔ اس فن میں کمال یہ تھا

کہ رقص کرنے والے کو اپنے حرکات وسکنات اور اپنے سارے جسم کے وزن پر قابو رکھنا اور حسب ضرورت اُن کو استعمال کر کے مناسب مظاہرے کرنا پڑتا ہے۔ اسی کمال کا یہ نتیجہ تھا کہ فنکار تلوار کی باڑھ اور بتاسوں پر بلکہ کوڑیوں پر بھی رقص کر لیتے تھے۔ نہ تلوار کی باڑھ اُن کو زخمی کرتی تھی۔ نہ بتاسے ٹوٹتے تھے اور نہ کوڑیاں پیروں کے نیچے پھسلتی تھیں۔ اِن جسمانی حرکات کا مظاہرہ موسیقی کے طرز پر ہوتا تھا۔ رقص کی یہی تعریف تھی کہ رقاص اس طرح چلت پھرت دکھائے کہ اس میں شاعرانہ دلکشی کا لطف آجائے۔ بالفاظِ دیگر جذبات کی بھرپور ترجمانی رقص میں ہو جائے اور اسی نمائشِ جذبات کا اصطلاحی نام "نرت" رکھا گیا تھا۔ اور اودھ کے حکمرانوں کی ملازمت میں بڑے بڑے باکمال رقاص تھے۔ اس فن میں بھی لکھنؤ ہی کو افضلیت حاصل تھی۔ اور یہ خصوصیت تو ہمیشہ یادگار رہے گی کہ اس شہر نے باکمال رقاصوں میں ایک ایسا خاندان پیدا کر دیا جس میں یکے بعد دیگرے بڑے بڑے ہنر مند رقص کرنے والے پیدا ہوئے جن کی شہرت سارے ملک پر بلکہ بیرونِ ہند بھی چھائی ہوئی تھی۔ سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر، ان تینوں فرمانرواؤں کے عہد میں منجملہ دوسرے فنکاروں کے پرکاش جی بڑا نامور رقاص تھا۔ محمد علی شاہ کے دور سے واجد علی شاہ کے انتزاعِ سلطنت تک پرکاش جی کے دونوں لڑکوں درگا پرشاد اور ٹھاکر پرشاد نے رقص میں بڑے بڑے جوہر دکھائے تھے۔ واجد علی شاہ نے رقص کا فن درگا پرشاد سے سیکھا تھا اور اتنا کمال حاصل کر لیا تھا کہ وہ خود ایک گراں قدر رقاص اور اس فن میں بہت سے پہلوؤں کے موجد تھے۔ انھوں نے اس فن پر اپنے اختراعات پر مشتمل اپنی ایک تصنیف بھی اپنے ہی مطبع سے شائع کی تھی جس کا نام "بنی" تھا۔ درگا پرشاد کے جانشین اُن کے دونوں لڑکے کالکا اور بندادین تھے۔ پرانے استادوں میں ہر ایک رقص کے کسی ایک مخصوص فن کا ماہر تھا لیکن یہ دونوں بھائی تمام فنوں میں کمال رکھتے تھے۔ دونوں بھائی ملک بھر میں شہرت کے مالک تھے۔ اُن کا گھر رقص کا ایک اسکول تھا۔ کالکا کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا لیکن بندادین مدت تک بقیدِ حیات رہا تھا۔ ڈیرے دار طوائفوں کی جو دو ائن یعنی دونوں بہنیں ننھوا اور بچوا بندادین ہی کی شاگرد تھیں۔ بندادین کے بعد اسی گھر کے تین لڑکوں یعنی اچھن، شمبھو اور لچھو نے اپنے بزرگوں کا نام زندہ رکھا تھا۔ راقم کو ان تینوں فنکاروں کے کمالات دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور اب بھی اُن کا مکان واقع بازار جھاؤلال دیکھ کر آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں اور عظمتِ پارینہ کی یاد دل کو تڑپا دیتی ہے

رقص کا فن بھی ابتداً مردوں سے مخصوص تھا لیکن عہدِ شاہی میں طوائفوں نے اس فن کو سیکھ لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بہت پرانے زمانہ میں بھی بعض طوائفیں بہت اچھا رقص کرتی تھیں لیکن راقم نے دونوں بہنوں ننھوا اور بچوا کا رقص بیشمار بار دیکھا تھا جو اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں ان میں منجملہ بہت سی دوسری خوبیوں کے ایک کمال یہ تھا کہ گھنگرو بجانے میں جتنے گھنگرو وہ چاہتی تھیں اتنے ہی بجتے تھے۔ دونوں پیروں میں گھنگرو باندھ کے رقص ہوتا تھا جن میں درجنوں گھنگرو لگے رہتے تھے ننھوا نے ایک بار دونوں پیر ہلائے تھے لیکن صرف ایک گھنگرو بولا تھا۔ یہ سلیقہ عام لوگوں کی سمجھ سے اُس وقت بھی باہر تھا۔ موسیقی سے زیادہ رقص میں بتانے کی صلاحیت ضروری تھی، چنانچہ یہ بہنیں بھی ایک ہی بات کو سو سو اداؤں، دل فریب اشاروں، نزاکتوں اور طرح طرح کی وضع سے بتاتی تھیں۔ لکھنؤ کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ یہاں رقص میں مردانے اور زنانے طرز علیحدہ علیحدہ نمایاں رہا کرتے تھے۔ مردوں کے رقص میں شاعرانہ دلکشی ہوتی تھی، عورتوں کے یہاں معشوقانہ انداز، نازنیں لطافتوں اور پُر کیف نزاکتوں کے مظاہرے ہوتے تھے۔ ہر شادی بیاہ کے موقع پر طوائفوں کے علاوہ مردوں کے بھی طائفے بلائے جاتے تھے جن کو بھانڈوں کا طائفہ کہتے تھے۔ ان میں بھی بہت اچھے اچھے موسیقار اور رقّاص تھے۔ ایسی ہی مواقع پر رقص میں مردانہ اور زنانہ طور کے علیحدہ علیحدہ جوہر نمایاں رہتے تھے۔

بھانڈوں کا طائفہ اپنے طور طریقوں میں طوائفوں کے مجروں سے بہت مختلف ہوتا تھا۔ طوائفوں کے ہمراہ صرف سازندے ہوتے تھے اور اُن کے کمالات صرف موسیقی کی لطافتوں تک محدود ہوتے تھے لیکن بھانڈوں کے طائفہ میں اصل موسیقار جس کے نام سے طائفہ مشہور ہوتا تھا۔ زنانے لباس اور زنانے طرز سے، چوٹی باندھے، ماتھے پر ٹیکا لگائے، ہاتھوں میں زیور پہنے اور طوائف کے لباس اور پیشواز میں بر سرِ محفل آتا تھا۔ اُس کے ہمراہ سازندے اور کچھ اور بھانڈ مردانے مگر مخصوص وضع کے لباس میں ہوتے تھے جو پہلے اپنے کرتب دکھاتے پھر بھانڈ کی رقص و موسیقی میں ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کا پہلا کرتب گھوڑے بننا اور گھوڑے چھوٹنا تھا جس میں شہسواری کی تمام اصطلاحات استعمال ہو جاتی تھیں۔ اس کرتب بازی اور بھانڈ کے رقص و موسیقی کے درمیان ہمراہیوں کے لئے کوئی نہ کوئی نقل پیش کرنا ضروری تھا۔ یہ نقل انتہائی سنجیدگی اور لطافت کے ساتھ اُسی رئیس کی اتاری جاتی تھی جس کے یہاں وہ مدعو ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک رئیس کے یہاں کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو چودھری صاحب کے لقب سے

مشہور تھے۔ اُن کے لڑکے کی شادی میں بھانڈوں کا طائفہ تھا۔ ان بھانڈوں میں ایک شخص بڑی گھنی اور دراز ڈاڑھی لگا کر اور عبا و قبا و عمامہ پہن کر تقدس مآب قاضی کے بھیس میں دوزانو بیٹھا تھا۔ ناگہاں چار آدمی ایک بچہ درآغوش عورت کے ہمراہ سامنے آکر حاضر ہوئے۔ ان چاروں میں بظاہر سب سے زیادہ طرار شخص نے قاضی کے حضور عرض کیا کہ ہم چاروں ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست ہیں، ہمارے درمیان کبھی کوئی نزاع واقع نہیں ہوئی باہمی خلوص و محبت اتنا ہے کہ ہم سب ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، رہتے سہتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ ہم میں کی کوئی فرد کوئی کام تنہا نہیں کرتی۔ ہم نے اس عورت سے منہ کالا کیا تب بھی سب برابر کے شریک رہے اور کوئی رشک و حسد کا جذبہ ہم میں سے کسی میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ یہ عورت حاملہ ہوگئی اور بچہ پیدا ہوا ہے۔ اب یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوگیا ہے کہ یہ بچہ کس کا کہلائے کیوں کہ میں شیخ ہوں، یہ پٹھان ہیں، یہ تیسرا مغل ہے اور وہ چوتھا سید ہے۔" قاضی صاحب نے بڑے غور و خوض سے مقدمہ سُنا، اپنے پیٹ کو سہلایا، اوپر دیکھا پھر چاروں آدمیوں سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ "یہ بچہ چودھری ہے۔"

اس واقعہ پر نیز اسی قسم کے دوسرے بہت سے واقعات پر کبھی کسی رئیس کو شکایت پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس بھانڈوں کی اِن ستم ظریفیوں کی قدردانیاں ہوتی تھیں۔ ان کے مجرے مستورات میں اسی طرح پسند کئے جاتے تھے جیسے کہ طوائفوں کی موسیقی و رقص مردوں کو مرغوب تھے۔ آخری دور میں بھی بھانڈوں کے کئی اچھے طائفے موجود تھے۔ یہ لوگ اپنے کو کشمیری نسل کا کہتے تھے۔ ان طائفوں میں سب ہی کشمیری ہوں، یہ بات مشکوک ہے۔ آخری دور کے طائفوں میں جن کی فنکاریوں سے راقم کو لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا مصطفےٰ حسین اور علی جان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ راقم کی شادی میں مصطفےٰ حسین، جن کو ان کے ہمراہی بھانڈ میاں مصطفےٰ حسین کہتے تھے، کا طائفہ بلایا گیا تھا۔ ان بھانڈوں نے میرے بی اے پاس ہونے کا گٹ پٹ کر کے مذاق اڑایا تھا اور میرے والد مرحوم کو ان کی پرانی وضع قطع کا حوالہ دے کر اپنا ہم قوم قرار دیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مورثِ اعلا ایران سے براہ کشمیر ہندوستان آئے تھے۔ ان بھانڈوں کا یہ دستور تھا کہ جہاں بلائے جاتے وہاں کے جملہ حالات اور رئیس کا حسب نسب پہلے دریافت کر لیتے تھے اور انھیں معلومات سے اپنی نقل سازی میں فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہمارے گھر پر بھی یہی کھیل تماشہ ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد مرحوم برابر مسکراتے رہے تھے اور انھوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا لیکن میری پیشانی عرق آلود تھی۔

# (۲) مصوّری و خطّاطی

عہدِ شاہی کے ابتدائی دور میں یورپ کے ماہرینِ مصوّری کو درباروں میں رسوخ حاصل تھا ان میں خصوصیت کے ساتھ زوفینی کا نام بہت مشہور تھا۔ اس نے متعدد تصویریں بنائی تھیں جن کا شمار عدیم المثال فنی شاہکاروں میں ہوتا تھا۔ اس کی ایک تصویر مرغ بازی سے متعلق تھی جس کی ایک رنگین پلیٹ کچھ مدّت قبل تک امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ لکھنؤ میں موجود تھی۔ یہ مصوّر عہدِ آصف الدولہ میں آیا تھا۔ اس کے بعد مصوّری کے فن میں ہوم اور اس کے لڑکے کے نام ملتے ہیں جو غازی الدین حیدر کے دربار سے منسلک تھے۔ نصیر الدین حیدر کے یہاں ایک جرمن مصوّر ملازم تھا۔ یہی سلسلہ واجد علی شاہ کے عہد تک چلتا رہا تھا۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ان بدیسی مصوّروں نے اپنا کوئی نقش اودھ کی مصوّری پر نہیں چھوڑا اور نہ یہاں کے مصوّر اُن سے متاثر ہو سکے اودھ کا مایۂ ناز مصوّر ٹھاکر داس اپنی امتیازی شان میں سب سے علٰحدہ ہی رہا تھا۔ اور اپنا کمال اس وقت دکھا دیا تھا جب انگریز ریزیڈنٹ نے غازی الدین حیدر کے حضور ہندوستانی مصوّری کی منقصت کی تھی۔ اور بادشاہ کو بہت ناگوار ہوا تھا۔ ٹھاکر داس انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھا لیکن اُس نے ایک سرکاری نوٹ کی ہو بہو نقل بنا کے پیش کر دی تھی جس کو دیکھ کر ریزیڈنٹ دھوکا کھا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ دستاویز اصل نہ تھی بلکہ نقل تھی وہ مبہوت ہو کر معذرت خواہی کرنے لگا تھا۔

لکھنؤ کی مصوّری انگریزی طرز سے بالکل علٰحدہ اپنا مقام رکھتی تھی۔ ٹھاکر داس روغنی اور آبی تصاویر بناتا تھا اس کے علاوہ وہ ہندوستانی روایات کی تمثیلی تصویریں بنانے میں بھی ماہر تھا۔ اس نے راگ اور راگنیوں کی بے انتہا حسین اور جاذبِ نظر تصویریں بنا کر غازی الدین حیدر کو پیش کی تھیں جو بادشاہ کو بہت پسند آئی تھیں اور بہت مقبول ہوئی تھیں۔ ٹھاکر داس کے علاوہ اور بھی مصوّر تھے جنھوں نے اس فن کے ایک دوسرے مخصوص طرز میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ اپنی تصویروں میں سونا چڑھانے، سفیدہ بھرنے اور رنگ دینے کی ہنرمندی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایسے باکمال لوگوں میں محمد علی عرف "مانی رقم" اور اس کے بیٹے فضل علی عرف "بہزاد رقم" کے نام تاریخِ مصوّری میں ہمیشہ زرّیں حروف میں لکھے رہیں گے۔ بہزاد رقم واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے خاندانِ شاہی کے بعض محلات اور زنانہ مناظر کی لاجواب تصویریں بنائی تھیں۔ اسی دور میں

اور بھی باکمال مصوّر تھے جن میں بیجو بیگ، صاحب رائے، کاظم حسین خاں، درگا پرشاد اور کاشی رام کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی زمانہ میں ایک مصوّر میر محمد علی بھی تھے جن کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ انھوں نے دل آرام کی بارہ دری میں میر انیسؔ کے پڑھنے کی مجلس کا ایک نایاب روزگار قلمی مرقّع تیار کیا تھا۔ سامعین کی نشست کا انداز، میر انیسؔ کے منبر پر بیٹھنے کا اسلوب، ہاتھ میں مرثیہ لیے رہنے کا طرز، یہ تمام صورتیں اُس مرقّع میں ہوبہو نمایاں کر دی تھیں اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ یہ صفت گری بھی تھی کہ میر انیسؔ کے ہاتھ میں جو مرثیہ تھا اُس کے مطلع کا پہلا مصرع اپنے صحیح مقام پر اُس تصویر میں واضح تھا۔ وہ مصرع یہ تھا "برہم ہے مرقّع چمنستانِ جہان کا"۔ بیسویں صدی کے اوائل تک انیسؔ کے بہت سے قدر دانوں کے پاس اُس مرقّع کے نقول محفوظ تھے۔ راقم کو بھی ایک ایسی ہی نقل دیکھنے کا شرف کئی مقامات پر حاصل ہوا تھا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوٹو گرافی کا چلن عام ہو چکا تھا اسی سے فائدہ اٹھا کر رئیسوں نے اُس مرقّع کی تصویریں چھپوا کے آپس میں تقسیم کر لی تھیں۔ ایسی تصویریں تخمیناً پچیس تیس برس قبل تک دیکھنے میں آجاتی تھیں جن کو لوگ عقیدتاً اپنے امام باڑوں میں آویزاں رکھتے تھے۔

لکھنؤ کے فنِ مصوّری کی یہ بدنصیبی تھی کہ یہاں زوالِ اقتدار کے ساتھ ہی باکمال لوگوں کا قحط پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ مذاق بھی رفتہ رفتہ بدل گیا۔ پرانے شہپاروں کے نقوش کو برقرار بھی نہیں رکھا جا سکا۔ ہمارے بعض قدیم روسا و عمائدین اپنی وضع داریوں کے تحت فنکاری کے باقیات الصالحات کو ایک مدت تک کلیجے سے ضرور لگائے رہتے تھے۔ ان کے دربار ہال اور خواب گاہوں میں منجملہ بہت سے دوسرے سامان آرائش کے ایسے مرقّعے بھی آویزاں رہتے تھے۔ لیکن جب دولت پر زوال آیا اور دولت خانوں پر فلاکت منڈلانے لگی تو اور اثاث البیت کے ساتھ یہ نوادر بھی کوڑیوں کے بھاؤ فروخت ہو گئے۔ بیرونی سیاح آتے تھے اور نخاس کی بازار سے اُن کو سستے داموں گویا کہ مفت حاصل کر کے اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے یہاں تک کہ اب ہمارا یہ خزینہ بھی خالی ہے بعض قلم کاری کے بہترین نمونے کچھ تعلقداروں کے یہاں بھی موجود تھے۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ صاحب بہادر والی محمود آباد، راجہ صاحب جہانگیر آباد اور راجہ صاحب سلیم پور کے نام یاد آتے ہیں لیکن ان بیش بہا عجائبات کا کیا حشر ہوا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ زمانہ نے تعلقہ داروں کے پاس بجز ان کے نام کے اور کچھ نہیں چھوڑا۔ بہرحال اب لکھنؤ میں معدودے چند فن پارے اور کچھ پرانی مصوّری کے نقول عجائب گھر، شاہ نجف اور

امیرالدولہ لائبریری میں محفوظ ہیں۔

راقم نے جو پرانی قلمی تصویریں دیکھی تھیں اُن میں امرا کی شبیہیں، شاہی عمارات کے نقشے، جلسہ و جلوس، محلات و دربار کے مناظر، رقص و سرور کی محفلیں، میدانِ جنگ کی لڑائیاں یا سیر و شکار کی دلچسپیاں بنی ہوئی تھیں۔ پس منظر میں آسمان پر رنگ بہ رنگ بادل اور اڑتے ہوئے طیور تھے اور زمین پر پھولوں سے ڈھکی ہوئی برجیوں دار دیوار یا پھر قطار اندر قطار درخت دکھائے گئے تھے۔ یہ فنکاریاں کاغذ یا کرمچ یا شیشہ ابرق پر دکھائی گئی تھیں۔ ایسی ہی قلم کاری ہاتھی دانت اور ظروف وغیرہ پر بھی ہوتی تھی۔ چوں کہ تصویر کشی بہترین قسم کی خطاطی ہوتی ہے اسی لئے ہمارے قدیم روسا کو یکساں طور پر کتبوں کا بھی ذوق تھا۔ اُن کے درباروں نیز اُن کی خواب گاہوں میں انتہائی حسین اور جاذب نظر کتبے آویزاں رہتے تھے جن میں آیاتِ قرآنی، ادعیہ، نادِعلی اور بعض پسندیدہ اشعار خطِ نسخ و نستعلیق میں لکھے ہوتے تھے بعض کتبے عہدِ قدیم سے متعلق تھے۔ خطاطی شاہی زمانہ ہی سے بہت مرغوب شوق تھا۔ بعض بادشاہ بھی بہت اچھے خوش نویس تھے جن میں سعادت علی خاں کا نام سرفہرست آتا ہے۔ انھوں نے یہ فن علامہ تفضل حسین خاں سے سیکھا تھا جو خود بھی بڑے بلند فنکار تھے اور ان کے صاحبزادے تجمل حسین خاں بھی بہت اچھے خوش نویس تھے۔ تخمیناً پچاس برس قبل تک خان علامہ کے اخلاف میں خوش نویسی کا فن برقرار رہا تھا۔

خوش نویسی میں گلکاریوں کے اسلوب اور فنکاریوں میں صنعت گری کو نظر انداز کر دیجئے تو تحریر میں بنیادی طور پر صرف دو خط باقی رہ جاتے ہیں۔ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق۔ اول الذکر خط کوفی کی ترقی شدہ شکل ہے اور اس خط میں عربی لکھی جاتی ہے۔ خطِ نستعلیق فارسی اور اردو میں مستعمل ہے۔ شاہی زمانہ میں دونوں خط رائج تھے اور دونوں کے بہترین خطاط موجود تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ خطِ نستعلیق پر بڑی بڑی ریاضتیں کی گئیں بیسویں صدی کے اوائل میں نسخ میں خطاط بہت کم رہ گئے تھے لیکن نستعلیق لکھنے والوں کی تعداد کثیر تھی۔ خوش نویسی کے ذوق میں خاندان کے خاندان مشہور تھے۔ روسا و عمائدین میں بھی بہت سے خوش نویس تھے۔ لیکن بالآخر اس فن پر بھی زوال آگیا۔ آخری دور میں معدودے چند خوش نویس رہ گئے تھے جن میں سید محمد جواد مالک نظامی پریس اور شیخ ممتاز حسین جونپوری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں صاحبان نسخ اور نستعلیق دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ اس فن کے مٹ جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاپے خانے کھل گئے تھے۔ جن میں اچھے خوش نویس ملازمت کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ وہ لوگ روسا

وامرا کے دامنِ دولت سے متمتع رہے اور انھیں کے ساتھ ختم ہو گئے۔ چھاپے خانوں کی بدولت فنِ خطاطی میں ایک ہنر کا بہر حال اضافہ ہوا۔ یہ فن مصلح سنگی کے نام سے موسوم ہوا اور آج بھی مصلح سنگ ہر چھاپے خانے کے لئے ایک ناگزیر فرد ہے۔

## (۳) شناوری و غوطہ زنی

متعدد دوسرے فنوں کی طرح لکھنؤ والوں نے شناوری میں بھی بڑے بڑے کمال دکھائے تھے۔ دورِ واجد علی شاہ میں ایک بزرگ میر مچھلی کے نام سے مشہور تھے۔ یہ لقب ان کو اس لئے ملا تھا کہ وہ دریا اور شناوری کے دلدادہ اور اس فن میں باکمال تھے۔ ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی اور ان شاگردوں کے شاگردوں کا سلسلہ اب تک چلا آتا ہے ان لوگوں نے شناوری میں طرح طرح کے طرز نکالے تھے۔ ہر طرز ٹھاٹھ کہلاتی تھی۔ شناوری کس طرح ہوتی تھی یہ صورتِ حال ہر مخصوص ٹھاٹھ کے نام ہی سے واضح ہو جاتی ہے کیونکہ ہر ٹھاٹھ اسی طرح باندھا جاتا ہے جو اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ منجملہ بہت سے دوسرے اسلوب کے عام طرزِ شناوری کے یہ نام ہیں "چت" "اوندھی"، "کھڑی"، "پالتھی"، "کروٹ"، ان ناموں کو انسان کے جسم کی حرکت سے متعلق کر کے اختیار کیا گیا ہے۔ بعض دوسرے ٹھاٹھ کسی مخصوص شباہت کی نقل کر کے شناوری کرنے کے طرز کو واضح کرتے ہیں جیسے "ڈیوٹ"، "سنگھاڑہ"، "گٹھری"، "جوگی آسن"، "سادھو آسن"، "شیر کا ٹھاٹھ" ان تمام پتیروں میں اصل شناوری "کھڑی پیراکی" ہے اور سب سے زیادہ مشکل فنکاری "شیر کا ٹھاٹھ" بنانے میں ہے جس کا ماہر دورِ حاضر میں کوئی نہیں رہ گیا ہے۔

قدیم لکھنؤ کے آخری دور میں بہترین شناور محلہ مفتی گنج کے خلیفہ رضا حسین تھے۔ وہ قریب قریب ہر ٹھاٹھ باندھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور ان کے شاگردوں کی تعداد بتانا بھی مشکل ہے۔ اسی زمانہ کے استادوں میں ثریا منزل کے امجد اور حسین آباد کے چھبن صاحب بھی تھے۔ یہ لوگ اپنی اپنی ٹولیوں سمیت پیراکی کرتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگوں میں شیعہ کالج کے پرنسپل سید کلبِ علی مرحوم بڑی فنکارانہ صلاحیت کے مالک تھے۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بھی کثیر تھی۔ شناوری کی مشق کرنے کے لئے پرانے لوہے والے پل سے متصل اور کھلے ہوئے میدان سے ملحق دریا کا کنارا تھا یہاں استادوں اور شاگردوں کے جمگھٹ لگے رہتے تھے۔ فنکاریوں کے مظاہروں کے لئے لوہے والا پل مخصوص تھا جہاں سے مشّاق استاد دریا میں کود کر کے اپنے اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے

تھے۔ ان لوگوں کا باقاعدہ اکھاڑہ ماہِ شعبان کی تیسری تاریخ ہوتا تھا۔ اس موقع پر مقابلہ کا میدان دریا کے بجائے حسین آباد کا تالاب ہوا کرتا تھا۔ اسی ماہ کی پندرہویں تاریخ کو شناوری میں کمالات کے مظاہرے دریا کنارے ہوتے تھے۔ ان دونوں مواقع پر سیر کرنے والوں کے جمِ غفیر لگ جاتے تھے۔ روسا و عمائدین حسین آباد کی پکچر گیلری کے برآمدوں میں بیٹھ کر یہ نظارے دیکھا کرتے تھے۔ ان مقابلوں میں انعام و اسناد تفویض ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس فن سے بھی ذوق کم ہو گیا ہے، پیراکیوں کی تعداد بھی بہت گھٹ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی ماہِ شعبان کو اس فنکاری سے کچھ ایسا رابطہ قائم ہو گیا ہے کہ کچھ نہ کچھ مشغلہ ہر سال ہوتا رہتا ہے حالاں کہ اس کا چرچا حسین آباد اور ملحقہ محلوں تک اب محدود رہ گیا ہے۔

دریا کے انھیں شناوروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو غوطہ زن کہلاتے تھے۔ یہ لوگ پانی میں ڈوب کر سانس روک لیتے تھے اور توقف کر کے سر باہر نکالتے تھے۔ اس غوطہ زنی میں دیر تک پانی میں ڈوبے رہنے کے مقابلے ہوتے تھے۔ جو یقیناً بہت مشکل کام تھا۔ ایک آدمی گھڑی ہاتھ میں لے کر منٹ اور سکنڈ دیکھا کرتا تھا۔ جو شخص سب سے آخر میں سر پانی سے باہر نکالتا وہی کامیاب سمجھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ میں یہ شوق اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ غوطہ لگانے کی مشق حوض میں بھی ہونے لگی تھی۔ روسا کے باغوں اور مکانوں کے صحن میں بڑے بڑے حوض صاف و شفاف پانی سے بھرے رہتے تھے۔ من چلے نوجوان گرمیوں میں سہ پہر کو اکثر دیر تک نہاتے اور غوطے لگانے کی مشق کرتے تھے۔ انھیں غوطوں میں مقابلے ہوتے تھے اور شرطیں لگ جاتی تھیں۔ ایسا ایک مقابلہ تاریخی حیثیت کا مالک بن گیا تھا۔ یہ مقابلہ حکیم منے آغا صاحب فاضل مرحوم کے باغ والے حوض میں ہوا تھا اور مقابلہ کرنے والوں میں محلہ کے معتبر خانوادوں کے نوجوان تھے۔ کامیابی کا سہرا ہمارے ایک پُر خلوص دوست خواجہ عبدالرشید کے سر رہا تھا۔ خواجہ صاحب حیدر آباد ٹیلرنگ شاپ کے مالک تھے جو وکٹوریہ اسٹریٹ پر کپڑا سلوانے کی بڑی ہر دلعزیز دکان تھی۔ اس مقابلہ میں حکیم بچھن مرحوم امپائر تھے اور خواجہ نے تخمیناً بارہ منٹ تک غوطہ لگانے کا رکرڈ قائم کر دیا تھا۔ اُن کو یہ شرف مہینوں تک مسلسل اور دن میں کئی بار مشق کرنے کے بعد حاصل ہوا تھا لیکن اس ایک مثال کے بعد وہ خود بھی کوئی دوسری بہتر مثال بھی پیش نہیں کر سکے۔

## ساتواں باب

# علمی، ادبی، اور ثقافتی سرگرمیاں

(۱) فرنگی محل اور ندوۃ العلما
(۲) خاندانِ اجتہاد
(۳) سلطان المدارس
(۴) نوبستہ
(۵) جھوائی ٹولہ
(۶) اودھ پنچ اور دیگر جرائد
(۷) منشی نول کشور اور گنگا پرشاد ورما

# (۱) فرنگی محل

شہر لکھنؤ کو اس بارے میں بھی بجا طور پر فخر و ناز ہے کہ علومِ مشرقیہ کی ترویج سارے ملک میں اسی سرزمین سے ہوئی تھی۔ قدیم ترین عہد میں مختلف مقامات پر علومِ مشرقیہ و درسیہ کے لیے تعلیم کا سلسلہ تھا اور مدرسے قائم تھے جن میں دیوا، گورکھپور، جائس اور بنارس کی درسگاہیں شہرت کی مالک تھیں لیکن یہ خصوصیت صرف اسی شہر کو حاصل ہو سکی کہ یہاں اتنی بلند پایہ درسگاہ قائم ہوئی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی مقتدر اور مستند قرار پائی۔ اس تعلیمی ادارے کو دنیا میں پہلی علومِ مشرقیہ کی یونیورسٹی کہنا یقیناً صحیح ہوگا۔ یہ آج بھی اپنی اصلی مقام پر اور ایک حد تک اپنے پُرانی روایات سمیت فرنگی محل کے نام سے قائم ہے اور اس کا وقار بڑی حد تک اب بھی برقرار ہے۔ لہذا فرنگی محل کی پُرانی تاریخ اور اس کی وجہ تسمیہ پر نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عہدِ اکبر بادشاہ میں موجودہ لکھنؤ کی آبادکاری شروع ہو چکی تھی اور یہ شہر تجارت کا مرکز بن گیا تھا اسی زمانے میں ایک فرانسیسی تاجر یہاں آیا تھا اور حکومتِ مغلیہ سے پروانۂ اقامت حاصل کر کے چوک سے متصل قیام کیا تھا۔ وہ گھوڑوں کا تاجر تھا اور بہت جلد اس تجارت میں اس نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ غالباً تین چار مکانات ملحق بیک، دیگرے کوٹھی نما شکل میں تیار کرا کے اسی حویلی میں رہا کرتا تھا۔ اس حویلی کا نام فرنگی محل تھا۔ یہ نام اس نے خود رکھا تھا یا اسی نام سے اس کی کوٹھی موسوم ہو گئی تھی۔ بہر حال یہ نام صدیوں سے برقرار ہے۔ کچھ مدت کے بعد جب اس تاجر کا پروانہ مقامی تجدید نہ ہو سکا اور اس کو اپنے وطن واپس ہونا پڑا تو یہ عمارات بحق سرکار ضبط ہو گئیں۔ عہدِ اورنگ زیب میں جب بارہ بنکی کے قصبۂ بہنتی پور والے عثمانی شیخ زادوں نے مناقشات کی بنا پر ملحقہ قصبہ سہالی کے ممتاز عالم اور مقتدر صوفی بزرگ ملا قطب الدین انصاری کے مکان پر چڑھائی کر کے ان کو قتل کر دیا تھا تو اس برگزیدہ خاندان کے لیے اپنے وطن میں قیام کرنا بہت دشوار ہو گیا تھا۔ ملا صاحب کے منجھلے صاحبزادے ملا سعید نے دکن جا کر اورنگ زیب کو جو اس وقت وہاں برسرِ کارزار تھا، ایک محضر پیش کیا تھا جس کو شرفِ قبول حاصل ہوا بادشاہ نے یکے بعد دیگرے دو فرامین

جاری کیے۔ پہلا فرمان ملا قطب الدین انصاری کے خونِ ناحق کا قصاص لینے سے متعلق تھا، اور دوسرے فرمان میں اُن کے خاندان کو لکھنؤ میں سکونت پزیر ہونے کی اجازت دی گئی تھی اور یہی چاروں مکانات موسومہ فرنگی محل اقامت کے لیے مرحمت ہوتے تھے۔ بعد میں بعض اور ملحقہ عمارتیں شامل ہوتی گئیں یہاں تک کہ ایک چھوٹا سا محلہ فرنگی محل کے نام سے آباد ہو گیا۔ یہ پورا علاقہ علمائے فرنگی محل کی اقامت ہے اور اسی دائرہ میں وہ مہتم بالشان درسگاہ قایم ہوتی تھی جس کے بانی ملا نظام الدین خلف ملا قطب الدین انصاری تھے۔ اُن کے اخلاف اب بھی فرنگی محل میں آباد ہیں اور انصاری کے لقب سے ممتاز ہیں۔

ملا قطب الدین کے چار صاحب زادے تھے جن میں منجھلے نظام الدین تھے جو بعد میں ملا نظام الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے دوسرے تین بھائی بھی درس و تدریس میں کمال رکھتے تھے۔ اور اُن کی مختلف شاخوں میں بعض جیّد عالم اور گراں قدر صوفی گزرے ہیں لیکن ملا نظام الدین کا نامِ نامی زندۂ جاوید ہے۔ آپ کی عمر اپنے والد مرحوم کی ہلاکت کے وقت صرف چودہ برس کی تھی لیکن آپ اُس وقت شرحِ ملا جامی ختم کر چکے تھے، دل میں ذوقِ علم اور سر میں تکمیل کا سودا تھا، آپ نے دیوا، بنارس اور جائس جاکر بڑے بڑے علما کے آگے زانوے ادب تہہ کیا اور بالآخر لکھنؤ آکر ملا غلام علی نقشبندی سے درس لے کر مدارجِ تکمیل پر فائز ہوئے۔ علم وفضل کی برکتوں نے آپ کے دل میں تصوف کا بھی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ چالیس برس کی عمر میں آپ نے شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔ اسی وقت سے منقولات کے ساتھ معقولات پر بھی زور دیتے رہے تھے۔ تدریس کے ساتھ آپ کو فطری تعلق تھا۔ اسی صلاحیت کی بدولت آپ نے ایک ایسا نصابِ تعلیم مرتّب فرمایا تھا جو شہرۂ آفاق ہوا۔ آج بھی اُس کی افادیت تسلیم ہے اور درسِ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نصاب میں آپ نے صَرف و نحو، منطق و حکمت، فقہ و اصولِ فقہ، علمِ تفسیر و حدیث، علمِ کلام اور علمِ ریاضی سے متعلق مخصوص کتابیں شامل کر دی تھیں جن کی تعلیم بہترین علما وفضلا سے متعلق تھی۔ جن کے نام نامی آج بھی باعثِ برکت و مفاخرت ہیں۔

عہد آصف الدولہ میں، جب انھوں نے لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یہ شہر

گزر چکے تھے۔ اس درمیان میں اس تعلیم گاہ کے مدرسین مسلم ممالک میں بڑی بڑی شہرتوں کے مالک ہو چکے تھے اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبا ملک کے گوشوں گوشوں میں علم کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ اودھ کے فرماں روا عقیدتاً شیعہ تھے لیکن وسیع النظر بھی تھے۔ پاس داری اور رواداری اُن کا مسلک تھا۔ علم دوست اور مخیر بھی تھے۔ فرنگی محل کی قدر شناسی کرتے ہوئے انھوں نے اس ادارے کے بیشتر علمائے اہل سنت کو مسند قضا و افتا پر مامور بھی کیا تھا۔ لیکن کسی مورّخ یا واقعہ نگار کی زبانی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اودھ کے کسی بادشاہ نے بھی فرنگی محل کی کبھی کوئی نمایاں سرپرستی کی ہو۔ اسی طرح دلّی کے دربارِ مغلیہ سے بھی اورنگ زیب کے دو متذکرہ بالا فرامین کے بعد فرنگی محل کے حق میں کسی داد و دہش کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ اس موقر تعلیمی ادارے نے اپنی صلاحیت و افادیت نیز ملّا نظام الدین کی خلوص نیت کے بل بوتے پر معراج ترقی طے کیے تھے۔

اس گراں قدر درس گاہ میں ابتدا ہی سے صرف و نحو، معانی و بیان، شعر و ادب، عروض عربی، علم ہیئت، فقہ و اصول فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، الٰہیات، طبیعیات وغیرہ کے درس ہوتے تھے۔ مدرسین میں مولوی ظہور اللہ، مولوی ولی اللہ اور مولوی نعمت اللہ تعلیم و تدریس میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور مولوی عبد الحکیم، مولوی عبد الحیّ، مولوی محمد ابراہیم، مولوی سعد اللہ، مولوی تراب علی، مولوی واجد علی، معقولات و منقولات میں اکمل افراد سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں میں شیعہ ہوں یا سنّی، ہر عقیدہ رکھنے والے اسی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور تعلیم کا طرز انتہائی منصفانہ اور روادارانہ تھا جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ منبع شیعیت مولوی سید دلدار علی الملقب بہ غفران مآب نے اسی جامعہ میں تکمیلِ علم فرمائی تھی۔ نیز راقم الحروف کے مورث اعلیٰ تفضّل حسین خاں نے جو بزرگوں کے وقت سے سنّی العقیدہ تھے اسی درس گاہ میں زانوے ادب تہہ کیے تھے۔ لیکن جب وہ فارغ التحصیل ہو کر باہر آئے تو عقیدہ بدل چکے تھے۔ اس کے بعد سے وہ ہمیشہ شیعہ رہے اور اُن کے اخلاف سب کے سب شیعہ تھے۔ فرنگی محل کی تعلیم و تدریس میں اسی منصفانہ، غیر جانبدارانہ اور روادارانہ روش کی وجہ سے یہ ادارہ ہمیشہ ہندوستان نیز بیرونی ممالک کے عام مسلمانوں میں مقبول اور محترم رہا تھا۔ اسی ہر دلعزیزی نے اس کی بنیادیں اتنی مضبوط کر دی تھیں کہ ۱۸۵۷ء کے زلزلہ افگن حالات بھی اُن کو متزلزل نہیں کر سکے اور آج بھی اپنی زوال پزیر حالت میں یہ ادارہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار کے زمانہ تک فرنگی محل کی عظمت بڑی حد تک اپنے شباب پر تھی۔ یہاں بڑے بڑے عالم فاضل موجود تھے۔ درس دینے والوں میں ثقہ بھی تھے فقیہ بھی، صوفی بھی تھے ماہرِ علم حدیث بھی، مفتی بھی تھے اور مولوی بھی۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ فرنگی محل کا وہ ہمہ گیر فکر و نظر کا ماحول قابلِ ذکر ہے جس نے بدلتے ہوئے حالات میں بھی مولانا عبدالباری کا سا راہبر وار اہنما مسلمانوں کو فراہم کیا تھا جن کی ذہانت کو وقت کی الجھنوں اور گتھیوں کو سمجھ لینے اور اُن کو سلجھانے کی تدبیریں پیش کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی تھی۔ مولانا مرحوم کی چشمِ بصیرت نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ آنے والے دور میں مسلمانوں کے حق میں سیاسیات سے بے گانہ رہنا اُن کے حق میں خودکشی کے برابر ہوگا۔ انھوں نے خود بھی تحریکِ خلافت میں کچھ اس طرح حصہ لیا کہ مہاتما گاندھی کے ایسے سیاستداں کو بھی اُن کی قدر شناسی کرنا پڑی۔ ہمارے احاطۂ تحریر سے سیاسیات کو کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے ہم اس مقام پر صرف اتنا اور کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ مولانا عبدالباری ہی کی فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے کہ وطن پرور مسلمانوں کی صفِ اوّل میں فرنگی محل کی دو جلیل القدر ہستیوں مفتی رضا انصاری ورحیات اللہ انصاری کو مقام حاصل ہے۔

حالات روزگار ہر قدیم تعمیر کو منہدم اور ہر انہدام بے جا کی از سرِ نو تعمیر پر آمادہ رہتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی فارسی اور عربی پر زوال آیا اور اس زوال کے ساتھ اِن زبانوں کی درس گاہیں بھی آہستہ آہستہ ویران ہوتی گئیں۔ اب نہ پہلے سے مدرّس ہیں اور نہ حصولِ علم کے ویسے شیدائی۔ فرنگی محل میں بھی پہلی سی سرگرمیاں نہیں ہیں۔ ادارہ موجود ہے اور تعلیم دینے پر آمادہ بھی ہے لیکن اُن علوم پر اب مرجعیت باقی نہیں رہی۔ پھر بھی حضرات فرنگی محل کے شرف کے لیے یہی ایک خصوصیت کچھ کم نہیں ہے کہ اُن کا طرزِ عمل شہر کے موجودہ حالات میں عصبیت و تنگ نظری سے پاک و صاف ہے۔

## فرنگی محل اور ندوۃ العلماء

علومِ مشرقیہ کی تعلیم کے لیے فرنگی محل ایک مقتدر ایشیائی یونیورسٹی کی حیثیت ضرور رکھتا تھا لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں ایک نیا مکتبِ فکر معرضِ وجود میں آگیا تھا جس کے بانی سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ "اپنے عقیدہ کو عزیز رکھو لیکن مغربی

تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگ جاؤ" یعنی یہ کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں"۔ (حیاتِ شبلی ص ۲۹)

ظاہر ہے کہ علمائے فرنگی محل مغربی تہذیب کے دل دادہ نہیں ہو سکتے تھے اس لیے اس نظریہ کی ترویج کے لیے علیحدہ مرکز ضروری تھا۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے مسلم یونی ورسٹی کی بنیاد ڈالی اسی دوران بعض مقتدر علما دین کا شغفِ علوم تفسیر، حدیث اور رجال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ لوگ ان علوم کے پرانے طرزِ تعلیم سے کسی قدر برگشتہ بھی ہو رہے تھے۔ سرسید کے مکتبِ فکر کا سایہ پڑا تو اِن علما کے رجحانات بھی تیزی سے آگے بڑھے اور ایک قلیل مدت کی جد و جہد کے بعد دار العلوم ندوۃ العلما معرض وجود میں آگیا۔ یہ کہنا بہر حال صحیح نہیں تھا کہ لکھنؤ میں متذکرہ بالا علوم کی تعلیم نہیں ہوتی تھی یا یہ کہ ناقص تھی۔ فرنگی محل نے ایسے مفسرین پیدا کیے تھے جن کا پلّہ ملک بھر میں بھاری تھا۔ البتہ علم حدیث میں دلّی کو لکھنؤ پر فوقیت حاصل تھی۔ علمِ رجال علمِ حدیث کا تابع تھا۔ یہی علم حدیث کا ذوق ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالنے کا محرک ہوا تھا اور چوں کہ اس کے نصابِ تعلیم پر جدیدیت کا رنگ واضح تھا اس لیے یہ دار العلوم بہت جلد جاذبیت کا مالک ہو گیا۔

اس دار العلوم کا ابتدائی نقشہ ۱۸۹۲ء میں کانپور کے مدرسہ فیضِ عام میں تیار ہوا تھا۔ اِس تحریک کے اصل محرک اور بانی مولانا سید محمد علی مونگیری تھے لیکن اُن کے شرکا کار چند ایسے علما بھی تھے جن کا وقار عام مسلمانوں پر چھایا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان حضرات نے جب وفود روانہ کیے اور مسلمانوں سے اپیل کی تو اس درس گاہ کو قایم کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی اور ادارہ قایم ہونے کے بعد سے برابر عام مسلمانوں کی تائید حاصل ہوتی رہی۔ لیکن بانیانِ دار العلوم نے اپنی تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لکھنؤ ہی کی سرزمین کو پسند کیا جس کی صرف یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ اس شہر کی آب و ہوا اور ماحول کو درس و تدریس کے لیے فرنگی محل نے بہت سازگار بنا دیا تھا۔ ادارہ قایم ہوا اور جب اس کو علامہ شبلی مرحوم کی رہنمائی حاصل ہوئی تو فی الفور بامِ ترقی پر پہنچ گیا۔ مولانا کی ذاتِ گرامی بہت ارفع و اعلیٰ تھی۔ وہ صرف عالمِ علومِ دین ہی نہیں تھے بلکہ ایک گراں مایہ ادیب، بلند پایہ شاعر، مفکر و مورخ بھی تھے۔ تحریر و تقریر دونوں میں کمال حاصل تھا۔ "شعر العجم" اور "موازنۂ انیس و دبیر" کا مصنف ہوتے ہوئے ان کی عظمت مسلم ہو چکی تھی۔ انھیں کے نام پر مختلف صوبوں سے تشنگانِ علم و

فضل اور پرستاران شعر و ادب کھنچ کر ندوہ آ گئے تھے۔ یہاں تعلیم کا معیار بھی اچھا تھا اور رسوائی بھی بلند پایہ تھی۔ فرنگی محل میں اصول و فقہ اور مشرقی تہذیب کے دل دادہ تھے۔ لیکن یہاں یہاں ایسے لوگ جمع ہو گئے تھے جو مغربی تہذیب کو کسی نہ کسی حد تک قبول و منظور کر چکے تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنے دین پر استوار رہتے ہوئے مغرب سے بھی وہاں کی اچھی باتیں حاصل کر لی جائیں۔ لکھنؤ کے پرانے علما کو اس جدیدیت کو اپنانے میں یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ اسلام کے مقدس اصول متاثر ہو کر اپنی ٹھوس حقیقت کھو بیٹھیں گے۔ اُن کے نزدیک اسلام کے پیش کردہ دستورِ حیات میں کسی ترمیم و تغیر کی ضرورت نہ تھی۔ یہ صورتِ حال ندوہ العلما کے وجود نے نہیں پیدا کی لیکن زمانہ کے تغیر نے از خود مسلمانوں کو متاثر کر دیا۔

ندوۃ العلما ابتداءً خاتون منزل واقعہ محلہ کلن کی لاٹ نزد مولوی گنج قایم ہوا تھا۔ روز افزوں ترقی کے تحت اپنی علیحدہ عمارت اور بہتر مقام کی ضرورت لاحق ہوئی۔ فراہمی سرمایہ میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کاکوری کے تعلقہ دار منشی احتشام علی مرحوم جن کی کوٹھی اس وقت بھی قیصر باغ کے مغربی چوراہے پر برقرار ہے، اس خدمت پر برقرار ہوئے، محلہ بادشاہ باغ میں گومتی کے کنارے جن رفیع عمارات اور وسیع و عریض آراضی پر اس وقت یہ دار العلوم موجود ہے اُن کا حصول و تعمیر بڑی حد تک انھیں کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔ یہ ادارہ علامہ شبلی ہی کے زمانہ میں نئی عمارات میں منتقل ہو گیا تھا۔ اور برابر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ اب اس کا شمار بین الاقوامی مکاتب میں ہے۔ اس کے موجودہ قائد اور رہنما مولانا علی میاں ندوی انتہائی قابلیت کے ساتھ منازلِ ترقی اور مدارجِ شہرت طے کرانے میں سرگرم ہیں اور اس ادارہ نے دنیائے اسلام میں اچھی خاصی مرجعیت حاصل کر لی ہے۔

راقم کو ندوۃ العلما سے درس و تدریس کے سلسلہ میں کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن اس ادارہ کی وساطت سے میرا تعارف دو ایسی گراں بہا ہستیوں سے ہوا تھا جن کی یاد زندگی بھر تازہ رہے گی۔ اُن میں ایک شخصیت مولانا ابو الکلام آزاد کی تھی، وہ اس ادارہ کے طالب علم کبھی نہیں رہے لیکن ایک زمانہ میں "الندوہ" کی ایڈیٹری فرماتے تھے۔ اسی عمارت میں مقیم تھے اور مولانا شبلی سے افادہ حاصل کرتے تھے۔ میں اُس زمانہ میں خاتون منزل کے قریب ہی عمِ محترم نواب غلام حسین خاں کی قربت میں اقامت پزیر تھا۔ مولانا ئے مرحوم سے پہلی شناسائی اُسی زمانہ میں ہوئی تھی اور یہ کہنا حرف بہ حرف صحیح ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے بہت سے شعبوں اور

بعض اہم معاملات میں انھیں کی ذات گرامی سے رشد و ہدایت حاصل کی تھی۔ دوسری قابلِ قدر ذات حکیم عبد الوالی مرحوم کی تھی۔ موصوف کا تعلق جھوائی ٹولہ کے خاندان سے تھا اور اُن کو علامہ شبلی سے بڑی قربت حاصل تھی۔ مولانا بھی اُن کی ادبی صلاحیتوں کے قدر دان تھے۔ والی مرحوم عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے لیکن شعر و ادب کے ذوق میں ہم دونوں ہم مذاق تھے۔ اس لیے میں اُن سے بہت جلد تفاوتِ عمر کی کمزوری کو نظر انداز کر کے بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ زبردست نیشنلسٹ اور گاندھی جی کے پرستار تھے۔ انگریزی حکام سے اُن کو بغض کی حد تک نفرت تھی اور ایک مرتبہ ملازمت میں ماتحت ہوتے ہوئے بھی بارہ بنکی کے انگریز کلکٹر کی تحقیر کر کے اُس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کا خمیازہ اُن کو بہت سخت بھگتنا پڑا تھا لیکن اُن کے ابرو پر بل نہیں آیا اور نہ اپنے طور طریقے بدلے۔ وہ اتنی خوبیوں کے انسان تھے کہ ایسا مجمع الصفات پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔

# (۲) خاندان اجتہاد

مولوی سید دل دار علی کے خانوادہ کو "خاندان اجتہاد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس گھرانے کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ شہر میں ایک شیعہ مجتہد کا سب سے زیادہ پرانا خاندان یہی ہے جہاں سے شیعیت کی ملک بھر میں تبلیغ و ترویج ہوتی تھی اور جس کی دینی خدمات تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زرّین حروف میں لکھے رہیں گے۔ مولوی دل دار علی اپنے آبائی وطن قصبہ نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ آگئے تھے۔ یہاں فرنگی محل میں سلسلۂ درس جاری رکھ کر فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ وہ زمانہ آصف الدولہ کا تھا۔ گو کہ غازی الدین حیدر کے عہد تک محکمۂ قضا و افتا کلیتاً فرنگی محل کے مفتیوں کے اقتدار میں رہا تھا لیکن عہدِ آصفی ہی میں اُن کے وزیر سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نے شیعہ عقیدہ کو درباری حیثیت دے کر ایک شیعہ عالم مرزا محمد عسکری کو بھی مفتیِ دربار مقرر کرا دیا تھا۔ مرزا محمد عسکری کا مسلک اخباری تھا وہ اصولی شیعہ نہیں تھے۔ اس لیے انھیں نماز جمعہ و جماعت سے سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا مولوی دل دار علی کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد وزیر موصوف نے سندِ اجتہاد حاصل کرانے کے لیے عراق بھجوایا۔ جہاں سے وہ پانچ برس کے بعد اجازہ لے کر لکھنؤ واپس آگئے۔ آصف الدولہ کے دربار

میں وہ بڑے عزت واحترام کے مالک تھے لیکن انھوں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ غفران مآب کا خطاب بھی اُن کو بعد ممات ملا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت تعلیم و تدریس اور ترویج و تبلیغِ دین میں صرف فرماتے تھے۔ انھیں مساعیِ جمیلہ کی برکتوں سے اُن کے اخلاف میں اُن کے پانچ بیٹے اور تیرہ پوتے سندِ علم وفضل کے مالک ہوئے تھے۔ اِن آخرالذکر اخلاف میں آٹھ صاحبان اپنے عہد کے مجتہد اعظم تھے۔ اجتہاد کا یہ سلسلہ خاندان میں اب تک برقرار ہے۔

مولانا دلدار علی نے دربارِ شاہی میں کوئی منصب حاصل نہیں کیا تھا لیکن آصف الدولہ کی والدہ یعنی بہو بیگم صاحبہ نے اُن کو وافر آمدنی کی معافی عطا کردی تھی جو اُن کی ضرورتوں کے لیے بہت کافی تھی۔ اس لیے وہ پورے اطمینان اور سکونِ خاطر کے ساتھ اپنے معمولات بجالاتے رہے۔ وہ عراق سے ادبی ذوق بھی لائے تھے جس کا فرنگی محل میں فقدان تھا۔ اُن کی اسی اہلیت نے شعروادب اور فنِ عروض میں لکھنؤ کا پایہ بہت بلند کردیا تھا۔ اُن کے یہ گراں قدر اثرات قدیم لکھنؤ کے آخری دور تک برقرار رہے تھے جس کے نتیجہ میں مفتی محمد عباس کے لیے بلند پایہ فارسی شعرا وادیب اُجڑتی ہوئی ہماری پرانی محفل فکروفن کو جگمگاتے رہے تھے۔ ترویجِ دین کے سلسلہ میں مولوی دلدار علی وہ پہلے عالمِ دین تھے جنھوں نے شیعوں میں نمازِ جمعہ باجماعت پڑھائی تھی۔ اس کے پہلے غالباً سارے ملک میں اور یقیناً شمالی ہند میں شیعوں کی باجماعت نمازِ جمعہ کہیں نہیں ہوتی تھی۔ وہ نمازِ جماعت پڑھاتے اور بعد میں موعظ فرماتے تھے۔ ان مواعظ میں سب سے پہلے انھوں نے شیعیت اور تصوف میں حدِ فاصل قایم کرائی تھی۔

دوسری طرف مولوی دلدار علی نے امام حسین کی عزاداری کے اُس رجحان کو جو شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد میں پروان چڑھ رہا تھا فروغ دینے کی ہر امکانی کوشش کی عزاداری کے رائج الوقت رسم ورواج میں انھوں نے شہنائی، روشن چوکی اور ماہی مراتب کو جلوسوں میں شامل کرنے کی ممانعت کی اور بانک وپٹے کے کرتبوں کو خلافِ متانت قرار دیا اور ان سب کے بجائے جنگی باجے کی اجازت دی اور جلوسوں میں مہندی، علم، تعزیوں اور ذوالجناح کی شبیہوں کے اضافے کرائے۔ لیکن ہوا یہ کہ اُن کے امتناعی احکام پر زیادہ عمل نہیں ہوسکا اور وہ تمام ممنوعات مثلاً روشن چوکی، ماہی مراتب وغیرہ بدستور برقرار رہے البتہ شبیہوں کی تعداد میں روزافزوں بہتات ہوتی رہی۔

مولانا دلدار علی نے غازی الدین حیدر کے عہد میں شاگردوں کی ایک کثیر تعداد اور چار

صاحب زادے چھوڑ کر انتقال کیا تھا۔ اُن کے ایک صاحب زادے اُن کی حیات ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ باقی ماندہ چار بیٹوں میں ایک ہجرت کر کے اپنے والد کی حیات ہی میں عراق چلے گئے تھے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ایک صاحب زادے سید حسن بھی اپنے والد کی وفات کے تقریباً چار سال بعد ہی رحلت کر گئے تھے۔ اس طرح انھوں نے صحیح معنوں میں اپنے سب سے بڑے بیٹے سید محمد اور سب سے چھوٹے سید حسن کو اپنا جانشین چھوڑا تھا۔ سید محمد تاحیات خود سلطان العلما اور قبلہ وکعبہ کہلاتے تھے اور بعد وفات "رضوان مآب" کے خطاب سے ملقب ہوئے۔ سید حسن اپنی زندگی بھر سید العلما، میرن صاحب یا چھوٹے قبلہ کہلاتے تھے اور انتقال کے بعد "علیین مکان" سے ملقب ہوئے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کو اودھ کے شاہی دربار میں بڑا اقتدار حاصل تھا بالخصوص امجد علی شاہ کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ان مجتہدوں کے احکام پر ہمیشہ تسلیم خم کر دیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ایک محکمۂ شرعیہ قایم کر کے غفران مآب کے بڑے صاحب زادے مولانا سید محمد کو عدلیہ، پولیس، آب کاری تعلیم اور امورِ خیر کے شعبہ جات کا نگراں مقرر کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ سلطنتِ اودھ کے وجود تک خاندانِ اجتہاد کا وقار اور احترام برابر برقرار رہا تھا۔

شیعیت میں ہر فرد کے لیے عالمِ دین کی تقلید فرض قرار دی گئی تھی۔ لکھنؤ میں ابتداءً ایک ہی مجتہد اور عالمِ دین تھے اور جب اس اکائی میں کثرت ہوئی تو وہ بھی سب کے سب اسی ایک خاندان کے افراد تھے۔ اس طرح شہر کے تمام شیعہ مسلمان ایک ہی زنجیر میں کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہوئے باہم دگر متحد و متفق تھے لیکن رفتہ رفتہ شریعت کدوں میں اضافے ہونے لگے۔ دوسرے مقامات سے علما آ کر اسی شہر میں آباد ہوئے جن کے معاشرتی رجحانات بہر حال یہاں کی آبادی سے مختلف تھے۔ علما کے علیحدہ علیحدہ مرکز قایم ہونے کے نتیجہ میں شیعہ برادری بھی ٹولیوں میں تقسیم ہو گئی۔ لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ باہمی رقابتوں، رنجشوں اور اختلافات کو فروغ ہو گیا۔

فرنگی محل کے علما بالخصوص مولانا عبد الباری نے اپنی ہوش مندی سے رفتارِ زمانہ کی نبض بالکل ٹھیک دیکھی اور پرکھی تھی۔ اسی لیے انھوں نے سیاسی شعور کی طرف بھی رہنمائی کی تھی لیکن شیعہ علمائے دین نے ابتداً انگریزی تعلیم کو حرام قرار دیا۔ سرکاری نوکری کو شرعاً ناجائز ٹھہرایا۔ سیاسیات سے یک لخت کنارہ کشی کا مشورہ دیا۔ بعض اکابرینِ ملت نے حکومتِ

وقت سے وفاداری اور اُس کے احکام پر اطاعت شعاری ہی کو عین ایمان بتایا۔ ان تمام تعلیمات کا فطری طور پر یہ اثر ہوا کہ اس اقلیت در اقلیت جماعت کے افراد مذہب پرستی کے رسمی رجحانات میں مقید ہو کر رہ گئے اور چوں کہ مذہبی معاملات میں بھی اُن کا شیرازہ منتشر تھا اس لیے سیاسیات کا طوفان بلند ہوا تو اُن کو ہر سیاسی پارٹی نے عند الضرورت اپنانے کی کوشش کی ان ہنگامی حالات میں اُن کے علما اُن کو کبھی کوئی سیاسی نصب العین نہیں بنا سکے۔ بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں اصلاحات کی ایک کرن نمودار ہوئی تھی اور بعض ارباب بصیرت اپنی جماعت کی رہنمائی پر آمادہ تھے لیکن چوتھی دہائی میں قدیم رجحانات پھر عود کر آئے تھے۔

مذہبیات اور سیاسیات، یہ دونوں موضوع ہمارے لیے خارج از بحث ہیں۔ خاندان اجتہاد نے اپنی پرانی وضعداریاں برقرار رکھی ہیں، شستگی و شائستگی کا ہر مقام پر لحاظ رکھا ہے۔ سیاسیات سے وہ یقیناً کنارہ کش رہے لیکن خانہ جنگیوں میں انھوں نے اپنی "شان دار پسپائی" کو جارجیت پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ تبلیغ و ترویج عزاداری کی خدمت کا فریضہ اُن کو ورثہ میں ملا تھا جس کی ادائی میں وہ کوتاہی نہیں کرتے لیکن اسی کے ساتھ امن و آشتی، پاس داری و رواداری کے بھی وہ علمبردار رہے ہیں۔ اس لیے اُن کو یہ کہنے کا حق ہے کہ لکھنؤ کی قدیم پاکیزہ معاشرت میں اُن کا خاندان بھی حصہ دار تھا اور اُس کی روایات اب بھی وہ ایک حد تک برقرار رکھے ہیں۔ فرنگی محل اور خاندان اجتہاد، یہ دونوں ادارے مسلمانانِ لکھنؤ کے قدیم کلچر کے مذہبی معاملات میں پہلے بھی نمائندے تھے اور اب بھی ہیں۔

## (۳) سلطان المدارس

میڈیکل کالج کے دوسری جانب اور چوراہے سے متصل، قلب شہر میں ایک وسیع مثلث شکل کی اراضی پر ایک عمارت ہے جس کا صدر راستہ جگت نرائن روڈ پر اور جس کے عقب میں ڈاکٹر پیارے لال روڈ واقع ہے، یہ عمارت سلطان المدارس کے نام سے موسوم ہے۔ جو اپنی عظمتِ پارینہ کی یاد میں اُداس اور مضمحل نظر آتی ہے لیکن تقریباً ساٹھ برس قبل یہاں ایک گلستاں تھا جس کے لہلہاتے سبزے پر نظریں لوٹ جاتی تھیں اور اس سبزہ زار کی حفاظت کے لیے ہر جانب خاردار تاروں کا ایک گھیرا لگا ہوا تھا اور عمارت اپنی نفاست و صفائی کے اعتبار سے نہایت دیدہ زیب اور بے حد حسین و دل کش تھی۔ عمارت میں صدر مقام پر تعلیم گاہ

دو مراتب میں قایم تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے درجات جامعہ سلطانیہ کے نام سے اور مدرسہ سلطان المدارس موسوم تھا۔ پہلو کی عمارت میں جامعہ کے وائس پرنسپل جو بورڈنگ ہاؤس کے نگراں بھی تھے فروکش تھے نیز ایک متصل کمرہ میں دفتر تھا جس کے انچارج ایک داروغہ صاحب تھے جن کے ذمہ درس گاہ، بورڈنگ ہاؤس اور باورچی خانہ کے جملہ انتظامی امور تھے۔ اصل عمارت سے متصل عقب میں متعدد کمروں میں وہ طالب علم رہتے تھے جو بیرونِ شہر سے حصولِ تعلیم کے لیے آتے تھے۔ ان سب کو بلا معاوضہ تعلیم اور قیام وطعام کی سہولتیں فراہم رہتی تھیں۔ غذائیں بھی معقول تھیں اور صفائی و پاکیزگی کا بھی پورا اہتمام رہتا تھا۔

اس تعلیم گاہ کا قیام انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے بہت بعد عمل میں آیا تھا لیکن اس کی داغ بیل امجد علی شاہ کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ شیعہ عقیدہ کے طالب علموں کو علوم فقہ و حدیث اور تفسیر کے لیے ایک درس و تدریس کے مرکز کی ضرورت لاحق تھی۔ ہوسکتا ہے کہ فرنگی محل سے علیحدگی کا جذبہ بھی ابھرا ہو کیوں کہ نصیر الدین حیدر کے دور ہی سے شیعیت نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا تھا اور عہدِ امجد علی شاہ تک، جو بذاتِ خود بہت تقدس مآب تھے، شیعہ مجتہد کا نفوذ دربار میں بہت بڑھ گیا تھا۔ بہر حال ایک ایسی ہی درس گاہ شیعوں کے لیے علیحدہ قایم ہوئی اور جامعہ سلطانی کے نام سے موسوم ہوئی۔ امجد علی شاہ کے بعد ان کے جانشین واجد علی شاہ کے زمانے تک جامعہ سلطانی برقرار رہا تھا لیکن اس علیحدہ ادارے کے قیام میں تفریق کا کوئی شائبہ نہیں تھا اور نہ کبھی کوئی شیعہ، سنّی افتراق کا شائبہ پیدا ہوا کیوں کہ امجد علی شاہ کا منشا ہی صرف اس قدر تھا کہ تمام شیعہ انھیں کی طرح پابندِ شریعت ہو جائیں۔ اس مقصد میں اُن کو کس حد تک کامیابی ہوئی تھی اس کا اتنی مدت کے بعد اندازہ لگانا دشوار ہے۔ بہر حال یہ مدرسہ عہدِ واجد علی شاہ تک کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتا رہا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کی تباہ کاریوں میں اُس کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ دینی تعلیم کی ضرورت بہر حال محسوس ہوتی رہی یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں بعض عمائدین و علما شہر بالخصوص ترمنی گنج کے رئیس اعظم آغا ابو صاحب اور جناب مولانا سید محمد باقر مرحوم کی مساعیٔ جمیلہ سے موجودہ ادارہ معرض وجود میں آیا۔ حسین آباد مبارک کے ارباب حل و عقد نے اس کے اخراجات کی کفالت منظور کی۔ ابتدا میں اس کے درجات امام باڑہ آصفی میں لگتے تھے بعد میں موجودہ عمارت تعمیر ہوئی اور مدرسہ و کالج یہاں منتقل ہو گئے۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور اپنے حسنِ انتظام کی بدولت اس

ادارہ نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی تھی اور سارے ملک میں شہرت کا مالک ہوگیا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ درس گاہ اپنی فلاح و بقا کے لیے بھی حسین آباد کی مرہونِ منت تھی اور اب بھی ہے۔

جامعہ سلطانیہ کے پہلے پرنسپل مولانا سید محمد باقر مرحوم تھے اور انھیں کو ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس ادارہ کے بانی ہونے کے علاوہ وہ ایک جلیل القدر مجتہد اور ایک جید عالم تھے۔ تقدس و ورع، پاکبازی و پاک باطنی اور حسنِ اخلاق و شرافتِ نفس میں اُن کا مثل و نظیر کوئی نہیں تھا۔ اُن کو اس ادارہ سے والہانہ عشق تھا اور انھوں نے اُس کو ترقی دینے میں ہر امکانی کوشش کی تھی۔ بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل مدرسین مقرر کیے تھے جن میں مولانا عالم حسین، مولانا عبدالحسن اور مولانا سید محمد رضا مرحوم کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان اساتذہ میں شہرت دور دور تھی اور اسی شہرت کی بدولت بالخصوص مولانا سید محمد رضا مرحوم کے ذاتی وقار کے سبب سے ملک بھر میں مدرسہ کو مرجعیت حاصل تھی اور مختلف صوبجات سے دینی تعلیم کے خواہشمند طلبا یہاں کھنچ کر آیا کرتے تھے۔ ان اساتذہ نے اپنے طرزِ تعلیم سے طالب علموں میں انتہائی صحت مند ذہنیت تعمیر کرادی تھی۔ خالص شیعہ دینی تعلیم گاہ ہوتے ہوئے بھی عصبیت و تنگ نظری سے سارا ماحول پاک و صاف تھا۔ مذہبی اختلافی مسائل میں مذاکرے بھی ہوتے تھے، انجیل اور ویدوں پر بھی تبصرے ہو جایا کرتے تھے جن میں اساتذہ و تلامذہ دونوں حصہ لیتے تھے لیکن مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی عدم موجودگی کے باوصف اُن کے جذبات کا احترام رکھا جاتا تھا۔ اسی فیضِ تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس ادارے سے کامیاب ہو کر بعض بڑی بڑی مقتدر ہستیاں نمودار و نام دار ہوئی تھیں۔

راقم کو بادش بخیر وہ زمانہ یاد ہے جب وہ اپنے استادِ محترم مولانا سید محمد رضا مرحوم کے ہمراہ اسی ادارے میں ایک مدت تک مقیم رہا تھا۔ مولانا مرحوم ادب و تہذیب نیز تعلیم و تدریس کے معاملہ میں غیر معمولی طور پر سخت گیر تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے تلامذہ کے لیے پدرِ شفیق اور ناصحِ مشفق سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ بے انتہا خوش گفتار اور خوش مزاج انسان تھے، اُن کے پاس بیٹھنے اور بات کرنے میں شیرینی گفتار کا اتنا لطف ملتا تھا کہ وہاں سے بہ ہر وقت تک ہٹنے کو دل گوارا نہیں کرتا تھا۔ بہت بلند پایہ عالم تھے لیکن عمامہ، عبا اور قبا

پہننے سے ہمیشہ گریز کیا۔ لکھنؤ کے شرفا والی دوپلی ٹوپی، اچکن، ڈھیلا شریفوں والا پائجامہ اور چمڑے کا پمپ جوتا اُن کی وضع میں ہمیشہ داخل رہتے تھے۔ شام کو اپنے بعض مخصوص شاگردوں کے ہمراہ لکڑی ہاتھ میں لے کر ہوا خوری کے لیے پکّے پُل تک پیدل جاتے تھے۔ طبیعت میں کوٹ کوٹ کر نفاست بھری تھی۔ صاف و شفّاف لباس پہننا اور جیب میں قیمتی گھڑی رکھنا اُن کی عادت میں داخل تھا۔ پابندی سے دونوں وقت اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیتے تھے جس کا بہت ذوق تھا۔ دوسرا شوق گھڑی سازی کا تھا جس میں اُن کو بہت کمال حاصل تھا۔ غذا کے سلسلہ میں ذائقہ بہت اچھا رکھتے تھے لیکن کھاتے وہی تھے جو بورڈنگ ہاؤس کے نگراں کی حیثیت سے باورچی خانہ عام سے اُن کے لیے مقرر تھا۔ فرماتے تھے کہ اس عمارت کے اندر رہ کر وہی کھانا کھانا چاہیے جو سب کھاتے ہیں۔ اپنے لیے علیحدہ کوئی انتظام بھی اصولِ شریعت کے منافی ہے۔ یہ طرزِ عمل کسی کفایت شعاری کی بنا پر نہیں تھا۔ اُن کے تلامذہ قریب قریب ہر روز کسی مخصوص اچھی غذا کی تواضع اُن سے وصول کر لیتے تھے۔ پراٹھے، کباب، انناس کا مزعفر، بالائی کی برف والی قلفیاں وغیرہ وغیرہ۔ قریب قریب ہر روز ہم لوگ منگا منگا کے انھیں کے سامنے کھاتے تھے وہ بلا تکلف قیمتیں مرحمت فرما دیتے اور ہم لوگوں کو کھاتے اور آپس میں جھگڑتے دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ اُن کے حضور ہم لوگوں کو باہم دگر سنجیدہ ظرافت میں مزاح کی بھی اجازت تھی۔ بشرطیکہ حدود میں برقرار رہے، فصیح و بلیغ الفاظ میں اُن سے باتیں ہوتی تھیں، ع ہیبت بہر حال غالب رہتی تھی۔

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ مولانا سید محمد رضا مرحوم ایک شیعہ عالمِ دین تھے لیکن اُن کا رکھ رکھاؤ غیر شیعہ لوگوں کے ساتھ بھی بہت اچھا تھا چنانچہ جب انھوں نے اسی مدرسہ کے کمرہ میں انتقال فرمایا اور اُن کی میت محلہ پاٹا نالہ کی طرف غسل خانہ گئی تھی تو قریب قریب ہر دوکاندار نے جن میں بہت اکثریت غیر شیعہ تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ میت مولانا کی تھی اپنی دوکانیں بند کر کے جنازہ میں شرکت کی تھی اور جن لوگوں نے دوکانیں نہیں بند کی تھیں انھوں نے باہر آ کے میت کو کاندھا دیا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد ہی مدرسہ پر اضمحلال طاری ہو گیا تھا اور اُس کا زوال جامعہ کے پرنسپل کی وفات کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا جو اول الذکر سانحہ کے چند ہی برسوں کے بعد واقع ہوتی تھی۔

دو گراں قدر ہستیوں کا یکے بعد دیگرے اٹھ جانا ہی کچھ کم مصیبت نہ تھی۔ اُس میں یہ اور

اضافہ ہوگیا کہ نئے نظام و انصرام پر قدامت پرستی، تنگ نظری اور رجعت پسندی غالب تھی۔ ان حالات کے خلاف بورڈنگ ہاؤس میں مقیم اعلا درجہ کے طالب علموں نے احتجاج کیا چوں کہ معاملہ دینی درس گاہ کا تھا اور استبدادیت حکمراں تھی اس لیے اس اسٹرائک کو جو یوں بھی نئی چیز تھی عوامی تائید حاصل نہیں ہوئی۔ بعض جدیدیت پسند لوگوں نے جن میں راقم بھی شامل تھا، ان "باغی لڑکوں" کی جیسا کہ ان کو خطاب مل چکا تھا حمایت کی جو لا حاصل رہی۔ کم سن لڑکوں کو باقی رکھ کر قریب قریب تمام بالغ و باشعور طالب علم بورڈنگ ہاؤس سے انتہائی بے رحمی کے ساتھ خارج کر دیے گئے لیکن اسی وقت سے درس گاہ کا سارا وقار بھی ختم ہوگیا۔

سلطان المدارس کے علاوہ ایک اور بھی شیعہ دینی درس گاہ ہے جس کے بانی مرزا آغا حسن عرف آغائی صاحب تھے جو عہدِ شاہی میں نظامت کے عہدہ پر مامور تھے۔ اسی لیے وہ اب تک ناظم صاحب کے لقب سے معروف ہیں۔ انھوں نے من جملہ دیگر امورِ خیر کے اپنے نام پر ایک "مدرسہ ناظمیہ" قایم کیا تھا جس کے درجات ابتدا میں خود انھیں کے امام باڑے میں لگتے تھے۔ اب ایک عالیشان مکان میں یہ مدرسہ منتقل ہوگیا ہے۔ اس مدرسہ کے منتظم اعلیٰ ایک دوسرے مجتہد مولانا نجم الحسن تھے۔ انھوں نے اس درس گاہ کو ترقی دینے میں بڑی کوشش کی تھی۔ سلطان المدارس کے انحطاط سے اس مدرسہ کو تقویت بھی پہنچی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں تعلیم کا بہتر انتظام ہو لیکن لکھنؤ کی قدیم معاشرت میں جو مقام سلطان المدارس کو حاصل تھا وہ اس ادارہ کو نصیب نہیں ہوا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عوام کی توجہ عربی اور دینی تعلیم پر اب بہت کم ہوگئی ہے

## (۴) محلہ نوبستہ

ناقدر شناسی ہو گی اگر ہم اس تذکرہ میں اپنے برادرانِ ہنود کی اُن گراں قدر خدمات کو نظرانداز کر دیں جو انھوں نے اس شہر کی قدیم تہذیب کو فروغ دینے میں انجام دی تھیں یا یہ کہ جن کی بدولت ہماری معاشرت میں ہمہ گیری کی خوبی پیدا ہوئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اُن کا رہن سہن بھی مسلمانوں ہی کا ایسا تھا، اُن کے ذوق شوق میں بھی مسلمانوں کے رجحانات سے مماثلت تھی، اور اس شہر کے باشندوں میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان فکر و نظر میں بھی بڑی حد تک یگانگت تھی لیکن پھر بھی علم و ادب، شعر و سخن اور دوسرے فنون میں جو انھوں نے مہارت

حاصل کرکے شہرت حاصل کی تھی اُس کی وجہ سے لکھنؤ کا نام بھی دنیا میں بلند اور روشن ہوا تھا۔ اسی طرح ہماری قدیم تہذیب کے وہ بھی معمار تھے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہمارے سامنے آتی ہے کہ اُن کے ایسے فن کارانہ کارناموں کی نمود لکھنؤ میں اودھ کا دارالسلطنت قایم ہوتے ہی شروع ہوگئی تھی جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہندو برادران میں بھی بہت اچھا فطری رجحان شعروادب کی طرف پہلے ہی سے موجود تھا جس کو یہاں کے حکمرانوں کی قدردانی اور سرپرستی سے جلا ہوگئی تھی۔

آصف الدولہ کے دور ہی میں ہم کو راجہ جسونت سنگھ پروانہ اور رائے ٹیکارام تسلی کے ایسے باکمال شعرا نظر آتے ہیں جو اُردو کے علاوہ فارسی پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے، دونوں زبانوں میں مشقِ سخن کرتے تھے اور متعدد علوم پر بھی اُن کو دست گاہ تھی۔ اودھ کی تاریخ دیکھ ڈالیے ہر فرمانروا کے دور میں ایسی ہی جلیل القدر ہستیاں ملتی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جتنا جتنا زمانہ آگے بڑھ رہا تھا صاحبانِ کمال کے فنی شعور میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی جس کی بدولت منشی منولال صفا اور راجہ کندن لال اشکی کے ایسے جوہرِ نایاب بھی پیدا ہوئے۔ یہ لوگ عربی زبان پر بھی قادر تھے اور اُن کی تصنیفات عربی زبان میں بھی محفوظ ہیں۔ شعروسخن میں صفا کو میر تقی میر سے تلمذ حاصل تھا اور اشکی کو تلمیذ الرحمٰن کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا۔ بعض گراں قدر ہستیاں شعروادب کے علاوہ سیاسیات میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں اس لیے اُن کو درباروں میں جلیل القدر مناصب حاصل تھے۔ ان میں فخرالدولہ دبیرالملک راجہ رتن سنگھ المتخلص بہ زخمی اور مدبرالدولہ منشی الملک راجہ جوالا پرشاد بہادر محکم جنگ المتخلص بہ وقار کے اسمائے گرامی تاریخوں میں زریں حروف میں درج ہیں۔ وقار نے واجد علی شاہ کی مدح میں سات قصائد تصنیف کیے تھے اور اس مجموعہ کا نام قصائد سبعہ رکھا تھا۔ اس نام ہی سے ظاہر ہے کہ خود بادشاہ کی نظر میں ان قصائد کی کتنی زیادہ قدرشناسی تھی، یہ قصائد بہترین ادبی شاہ کار ہیں۔ زخمی نے کئی بادشاہوں کا دور دیکھا تھا۔ فارسی کے بہترین شاعر تھے۔ ایک ضخیم دیوان چھوڑا تھا جس کے مطالعہ کا شرف راقم کو حاصل ہوچکا ہے، زبان وبیان کی خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس دیوان کے علاوہ مختلف علوم وفنون پر زخمی نے متعدد کتابیں لکھی تھیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

دورِ شاہی کے شعرا اور ادیبوں کا تذکرہ ہمارے موضوع سے باہر ہے، متذکرہ بالا شعرا کے نام اور مثالاً اُن کا ذکر پیش کرنے میں صرف اتنا مقصد ہے کہ اُس زمانہ کے ہر استاد کے کچھ نہ کچھ

شاگرد تھے اور ان شاگردوں نے شرفِ اُستادی حاصل کرکے پھر اپنے شاگرد بنائے تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ برابر آگے بڑھتا رہا تھا مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رائے جواہر سنگھ جوہر کے شاگرد منشی شنکر دیال فرحت تھے اور فرحت کے شاگرد منشی رام سہائے تمنا تھے جو ہماری شعر و سخن کی آخری محفل تک رونق افروز رہے تھے۔ اسی طرح منشی خیراتی لال شگفتہ بڑے باکمال ادیب و شاعر تھے جن کے ارشد تلامذہ میں منشی لچھمن پرشاد صدر تھے اور اُن کا یکے بعد دیگرے سلسلۂ تلمذ برابر چلتا رہا تھا۔ بعض خاندان ایسے بھی تھے جن میں شعر و سخن کا مشغلہ کئی پشتوں تک چلا تھا۔ جیسے کہ رائے دیبی پرشاد کے یہاں اُن کے صاحب زادے وحشی، پوتے وجہی اور پر پوتے فہمی بہت اچھے شاعر ہوئے تھے۔ ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہمیت منشی دوارکا پرشاد اُفق کے خاندان کو حاصل تھی۔ اُن کے اسلاف میں کئی پشت قبل یکے بعد دیگرے سب ہی فارسی میں مشقِ سخن کرتے تھے۔ اُفق خود نیز اُن کے بھائی اور اولاد سب اچھے اُردو شاعر گزرے ہیں۔ غالباً ایک صاحب زادے اب بھی بقیدِ حیات ہیں اور خوش گو شاعر ہیں۔

انہیں شعرا میں متعدد ایسے تھے جن کو کثیر التلامذہ ہونے کا شرف حاصل تھا مثلاً بینڈوا لال زار کے کم سے کم دس تلامذہ ایسے تھے جو شہرت کے مالک ہوتے۔ اسی طرح بال کشن قمر کے بھی بہت سے شاگرد تھے جن میں مولوی عنایت اللہ سرور، عبداللہ خاں بشیر اور اطہر علی اطہر بھی شامل تھے۔ آخری دور کے گراں مایہ ادیب اور شاعر نوبت رائے نظر تھے جن کے شاگردوں میں میر وہب علی اثر، سید عبداللہ انجم، حافظ محمد حسین تمیز، منشی قدرت غنی صابر، منشی عبدالسبحان عقیق، سید مراد حسین مراد، منشی سلامت اللہ اسلم، منشی عبدالرشید خاں ارمان کے بھی نام ملتے ہیں۔ ان تمام شعرا اور اُن کے لے بہ لے شاگردوں کا سلسلہ ہمارے مشاعروں کی انجمنوں کے ختم ہونے تک جاری رہا تھا اور یہی شاگرد در شاگرد شعرا استادی کی منزلت حاصل کرکے انجمنوں کی زینت ہوا کرتے تھے۔ اس مقام پر مشاعروں کی انجمنوں میں وہ محفلیں بھی شامل سمجھنا چاہیے جو شعر و سخن کی روسا و عمائدین کے یہاں مختصر اجتماع میں آئے دن ہوا کرتی تھیں۔ ایسے اجتماعات ہندو برادران کے یہاں بھی محلہ نوبستہ، محلہ نواز گنج اور محلہ گنیش گنج میں کثرت سے ہوا کرتے تھے۔

شعر و سخن کے علاوہ دیگر صاحبان مختلف فنون کے بھی مالک تھے۔ بعض لوگوں کو مطلع کے کاروبار سے دلچسپی تھی اور وہ اس طرح بھی اپنے ذوقِ شعر و ادب کو کچھ نہ کچھ آسودگی فراہم

کرتے تھے۔ انھیں میں کچھ ادیبوں نے صحافت کا پیشہ بھی اختیار کر لیا تھا۔ یہ صحافت زیادہ تر سیاسیات سے بے گانہ ہوتی تھی۔ بیشتر شعرا انشا پرداز بھی تھے جن میں منشی ہندو لال زار کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اس فن میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بہت سے لوگوں کو خوش نویسی میں ملکہ حاصل تھا۔ منشی جگن ناتھ خوشتر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُن کے ہاتھ کی تحریر کو لوگ آنکھوں سے لگا لیتے تھے۔ اِن تمام شعرا نے اُردو کو فکر و فن سے اس حد تک مالا مال کر دیا تھا کہ اپنا مذہبی مقدّس ادب بھی ترجمہ کر کے اس زبان میں شامل کر دیا تھا۔ منشی جگن ناتھ اطہر نے رامائن کا بہترین ترجمہ کر کے اس مقدّس کتاب کے مطالب کا اُردو دانوں کے لیے نہ صرف ایک گراں قدر انکشاف پیش کیا ہے بلکہ یہ ترجمہ زبان و بیان کے اعتبار سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف بھی ہے۔ اسی طرح منشی جگن ناتھ خوشتر اور منشی شنکر دیال فرحت نے بھی رامائن کا بہت اچھا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے ہندو دھرم کی متعدد دوسری متبرک کتابوں کے بھی ترجمے کیے ہیں جو اُردو زبان میں بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ منشی رام سہائے تمنا نے بھگوت گیتا اور منشی طوطا رام شایاں نے مہابھارت کے بہترین ترجمے کیے تھے۔ تراجم کی اور بھی بہت سی دوسری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جہاں ہندو شعرا نے اپنی متبرک مذہبی کتابوں کے اُردو میں ترجمے کر کے اُردو والوں کو اُن سے روشناس کرایا تھا۔ بھگوت گیتا کی عظمت مسلم الثبوت ہے۔ فیضی نے اِس کا فارسی میں بڑا فاضلانہ ترجمہ کیا تھا۔ عہدِ قدیم میں فارسی رائج الوقت زبان تھی لیکن منشی لچھمن پرشاد صدر نے غالباً پیش بینی کرتے ہوتے اس فارسی ترجمہ کا بہت عمدہ اُردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ تمام ادبی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ہندو شعرا نے اپنی موزونیِ طبع کی جولانیاں شاعری کے ہر میدان میں دکھائی تھیں دورِ شاہی میں بکثرت نظمیں نعت و منقبت میں کہی گئی تھیں۔ ائمہ اطہار کی مدح میں بہت سے قصیدے مطبوعہ کتابوں میں درج ہیں۔ ایسے شعرا میں راجہ رتن سنگھ زخمی کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اُن کے فارسی کلیات میں ہفت بند اور قصائد بھی موجود ہیں۔ اُن کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اُن کے کلام میں عقیدت کو بھی مقام حاصل تھا۔ انتزاعِ سلطنت کے کچھ مدت کے بعد ایسی نظموں یا قصائد کا سلسلہ نظر نہیں آتا لیکن ہندو شعرا کی مراثی، سوز خوانی اور نوحہ خوانی سے وابستگی تقریباً پچاس برس قبل تک برقرار تھی۔ مرثیہ کی جدید طرز انیس کے زمانہ سے رائج

ہوئی تھی اور غالباً اُسی وقت سے ہندو شعرا نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی شروع کر دی تھی۔ عہدِ قدیم میں چھنولال دلگیر نے خوب خوب مرثیے کہے تھے۔ وہ اچھے غزل گو بھی تھے لیکن غزل میں طرب تخلص کرتے تھے۔ دلگیر کا تخلص مرثیوں ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ دورِ آخر میں لالہ نانک چند نانک باوجود ناخواندہ ہونے کے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں اپنے جوہر خوب خوب دکھا گئے۔ امام باڑہ ناظم صاحب میں انھوں نے آخری مجلس پڑھی تھی جس کے سننے والے اب تک موجود ہیں اور اُن کی آنکھیں اُس مجلس کو یاد کر کے بے ساختہ نمناک ہو جاتی ہیں۔

اُن تمام بلند پایہ اور گراں قدر شعرا کی تعداد کے بارے میں، جو اُستادی کے درجہ پر فائز تھے، قیاس آرائی کرنا ناممکن ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے جس میں لکھنؤ کے تمام ہندو شعرا کے نام اور حالات یک جا درج ہوں، معدودے چند انجمنوں کے علاوہ کسی انجمن کے گلدستے بھی شائع نہیں ہوتے تھے۔ اساتذہ شہر کے مختلف محلوں میں رہا کرتے تھے اور اُن کے شاگرد دوسرے محلّوں میں قیام پزیر ہوتے تھے۔ نامساعد حالات نے پُرانا شیرازہ ہی نیست و نابود کر دیا ہے۔ راقم نے اس بارے میں جستجو کی تھی تو اُس کو صرف محلّہ نوبستہ اور اُس کے قریبی علاقوں سے تقریباً سو نام شعرا کے فراہم ہوئے تھے جن میں اساتذہ بھی شامل تھے۔ اس فہرست میں باستثنا چند کے سب نام سکسینہ برادری کے کائستھوں کے تھے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس جماعت کے مقتدر افراد شاہی درباروں سے منسلک تھے اور وہی اثرات اس محلہ کے باشندوں کو شعر و ادب اور فکر و فن کا گرویدہ بناتے ہوتے تھے۔ بہر حال لکھنؤ کے ہندو شعرا میں سب سے زیادہ تعداد سکسینہ کائستھوں کی تھی جن کی آخری یادگار نوبت رائے نظر تھے۔ اور اُس کے بعد سریواستو کائستھوں کا نمبر تھا جن کے جلیل القدر رہنما تندے بال کشن قمر تھے۔ کشمیری برہمنوں نے بھی بلند پایہ فن کار اور ادیب پیدا کیے تھے لیکن اُن کی ساری آبادی کشمیری محلہ ہی میں محدود تھی۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں تبدیل سکونت کا سلسلہ شروع ہوا تھا، چنانچہ اُس دور کے بہترین نغز گو حضرت چکبست گولا گنج کے محلہ میں سکونت پزیر ہو گئے تھے۔

## (۵) جھوائی ٹولہ

دورِ حاضر میں جھوائی ٹولہ علمِ طب کی تعلیم کا مرکز ہے اس لیے ہم نے اس علم سے متعلق اپنے تذکرہ کا عنوان اسی محلہ کو قرار دیا ہے حالاں کہ پرانے زمانے میں امرا و شرفا کو علمِ طب سے شغف تھا اور

وہ اس کو بلند پایہ فن کی حیثیت سے اکتساب کرتے تھے۔ اپنے ناموں کے پہلے "حکیم" شامل ہونا باعثِ افتخار تھا اور اس علم میں فن کارانہ مہارت عزتِ دنیا اور نجاتِ عقبیٰ کا وسیلہ سمجھی جاتی تھی امرا و رؤسا کے یہاں نسلاً بعد نسلٍ علم طب کا مضمون نصابِ تعلیم میں شامل رہتا تھا۔ خان علامہ تفضل حسین خاں کے اخلاف میں تقریباً ساٹھ برس قبل تک قریب قریب ہر فرد حکیم تھا، حالاں کہ دو تین صاحبان کے علاوہ طبابت کا پیشہ کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ علم خاندان سے مفقود ہو گیا۔ حکیم مسیح الدولہ بہادر کے یہاں بھی اُن کے بعد تین پشتوں تک طبابت کا پیشہ برقرار رہا تھا۔ حکیم شفاء الدولہ بہادر نے اپنے تینوں صاحب زادوں کو علمِ طب کی تعلیم دی تھی اور اپنی سب صاحب زادیوں کے عقد کے لیے ایسے ہی شوہر منتخب کیے تھے جو علمِ طب حاصل کیے ہوئے تھے لیکن عملاً صرف ایک داماد اور ایک نواسے طبابت کی طرف آمادہ ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ علمِ طب کا حاصل کرنا شرفا و عمائدین کے یہاں عام رواج تھا۔

شرفا کو طبابت کی طرف اس لیے اور زیادہ مرجعیت تھی کہ اُن کے لیے یہ پیشہ کسبِ معاش کا ذریعہ آسانی سے بن جاتا تھا۔ ہر امیر و رئیس کے یہاں ایک طبیب کا ملازم رہنا ضروری تھا اور اس ملازمت میں عموماً مقربین اور محلہ والوں کے اعزا کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ملازم پیشہ طبیب اپنے اپنے محلوں میں مطب بھی کرتے تھے۔ چنانچہ شہر میں کوئی چھوٹا یا بڑا محلہ ایسا نہ تھا جس میں دو یا اس سے زائد حکیم نہ ہوں، بہت پرانے زمانے میں اطبا اپنے مطب میں نیز شرفا و عوام کے گھر جا کر بھی اپنے کسی حق الخدمت کے خواہاں نہیں ہوتے تھے۔ مریضوں کا علاج خوشنودیِ خدا کی نیت سے کیا جاتا تھا۔ اپنی بسر اوقات اُسی معقول یا قلیل آمدنی میں کرتے تھے جو اُن کو روسا و عمائدین سے ہو جاتی تھی۔ اُن کے نسخے زیادہ تر عطاروں کے یہاں بندھتے تھے۔ یہ صورتِ حال بہر حال قرین قیاس ہے کہ یہ عطار اپنے سرپرست حکیموں کی کچھ نہ کچھ مالی خدمت ضرور کرتے ہوں گے لیکن ایسی خدمت گزاریاں سختی کے ساتھ صیغۂ راز میں رکھی جاتی تھیں، اُن کا اظہار معیوب تھا۔ غربا و مساکین اور مفلوک الحال لوگوں کے لیے بہترین شفاخانہ موسومہ دار الشفا تھا۔ نصیر الدین حیدر نے اپنے عہد میں ایک طبی اور ایک ڈاکٹری ہسپتال قایم کیا تھا۔ یہ دونوں ہسپتال اپنی اصلی جگہ پر یعنی چوک اور وکٹوریہ گنج میں اب تک برقرار ہیں۔ وکٹوریہ گنج کے ڈاکٹری ہسپتال کی نوعیت بہت بدل گئی ہے لیکن دار الشفا انتہائی خراب حالت میں ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس کے سپرنٹنڈنٹ

حکیم نظیر حسن خاں خلف حکیم مظفر حسین خاں ولد حکیم مسیح الدولہ بہادر تھے۔ اُن کے دورِ کارکردگی میں غریبوں کو بہترین دوائیں ملتی تھیں اور بہت اچھا انتظام تھا۔ ہنرمند دواساز طازم تھے۔ ایک مستعد، ہوش مند اور قابل منیجر میر عباد علی مرحوم تھے جو دواسازی کی نگرانی اور مریضوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ زیادہ علیل مریضوں کی اقامت کا بھی بندوبست تھا۔ حکیم نظیر حسن خاں کے بعد اُن کے صاحبزادے جعفر حسین خاں سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ رفتہ رفتہ انتظام بگڑا، عوام کی مرجعیت بھی کم ہوتی گئی یہاں تک کہ اب یہ ہسپتال زوال پزیر ہے۔

اطبا میں فطری طور پر انھیں حکیموں کو شہرت اور ہردلعزیزی حاصل ہوتی تھی جن کے علاج سے سنگین اور پیچیدہ بیماریوں کے مریض شفایاب ہوتے تھے لیکن بعض طبیبوں کے بارے میں یہ عقیدہ بھی عام تھا کہ اُن کے پاس دستِ شفا ہے۔ ایسے ہی اطبا میں مولوی گنج کے ایک بزرگ حکیم پتّی کے نام سے مشہور تھے جو ہر بیماری کا علاج کسی نہ کسی پتّی کا استعمال کرا کے کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے بلند پایہ طبیب حکیم لسوڑہ کے نام معروف تھے وہ لسوڑہ کی پتیوں اور پھلوں سے قریب قریب ہر مرض کا علاج کرتے تھے۔ ان دونوں طبیبوں کو بڑی مرجعیت حاصل تھی۔ وکٹوریہ اسٹریٹ اور قرب وجوار کے محلے قدیم لکھنوی تہذیب کے مرکز تھے۔ اس علاقہ میں بہت سے ممتاز طبیب رہا کرتے تھے۔ اس سڑک کے ممتاز طبیبوں میں حکیم امیر حسن، حکیم مظفر حسین اور حکیم میرن صاحب کے مطب تھے جہاں مریضوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ وکٹوریہ اسٹریٹ کے ایک جانب محلہ پاٹانالا میں حکیم باقر حسین، کٹرہ ابوتراب خاں میں حکیم کمال الدین اور کچھ دور ہٹ کر حکیم شمس الدین بڑے کامل طبیب تھے۔ سڑک کے دوسری جانب چوک سبزی منڈی میں حکیم منے آغا فاضل زبردست شہرت کے مالک تھے۔ اسی نام کے ایک دوسرے طبیب حکیم منے آغا آفتاب بھی تھے جو اپنی علمی قابلیت میں ممتاز تھے۔ لکھنؤ کے طبیبوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ معالجات میں کشتہ کا استعمال نہیں کراتے تھے۔ عندالضرورت صرف ایک کشتہ، قلعی یعنی تانبے کا کشتہ مستعمل تھا۔ کشتوں کے استعمال میں ویدوں ہی کو امتیاز حاصل تھا۔ اطبا میں عہدِ پیشین کے مجربات کے علاوہ خود اپنے تیار کردہ مرکبات تجویز کرنے کا دستور تھا۔ ایسے مرکبات مریض کی عمر، اُس کے مزاج اور موسم کا لحاظ کرا کے تیار کرائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے مرکبات کو پرانے مجربات پر بھی ترجیح دی جاتی تھی۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں طبیبوں میں فیس قبول کرنے کا چلن ہو گیا تھا

اور بعض طبیبوں نے اپنے دواخانے بھی قایم کر لیے تھے۔ فیس کا تعین طبیب کی شہرت پر منحصر تھا۔ انھیں میں حکیم منے آغا فاضل نے آخر میں سولہ روپیہ اپنی فیس مقرر کر رکھی تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ یہ لوگ ہر ایک سے اپنی مقررہ فیس پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ فیس کی ادائیگی میں رعایتیں ہوتی تھیں اور بلا فیس معائنوں کی بھی بہتات رہتی تھی۔ جن حکیموں کے یہاں ذاتی دواخانے تھے وہ دواؤں کی قیمت میں بھی رعایت کرتے اور مفلوک الحال مریضوں کو گراں سے گراں دوائیں بلا قیمت دیا کرتے تھے۔ متعدد اطبا اپنے پیشہ ہی کی آمدنی سے کافی خوش حال تھے، ایسے طبیبوں میں حکیم عبدالحبیب، حکیم کمال الدین، حکیم شمس الدین، حکیم میرن صاحب، حکیم صاحب عالم اور حکیم منے آغا فاضل کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں کا شمار لکھنؤ کے روسا وعمائدین میں تھا اور اُن کا رہن سہن بھی بہت بلند تھا۔ حکیم شمس الدین، حکیم میرن صاحب، حکیم صاحب عالم اور حکیم منے آغا فاضل خصوصیت کے ساتھ قدیم لکھنؤ کی تہذیب کے نمائندے تھے اور اُن کے تمام طور طریقے اسی شہر کی معاشرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف دو طبیبوں یعنی حکیم صاحب عالم سید محمد قاسم اور حکیم منے آغا فاضل کے کچھ واقعات و حالات درج ذیل ہیں۔ ان دونوں حکیموں سے راقم کو قربت تھی، بالخصوص حکیم سید محمد قاسم سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔

حکیم سید محمد قاسم المعروف بہ حکیم صاحب عالم تہذیب و اخلاق کا مجسمہ اور مہر و محبت کا پیکر تھے۔ علمِ طب کے علاوہ فقہ و اصول اور متعدد علومِ درسیہ میں کمال رکھتے تھے۔ نہایت مقدس اور متشرع تھے۔ کبھی کسی لہو و لعب کی طرف توجہ نہیں کی، علما و فضلا کی صحبت کا ذوق تھا اور شعر و سخن کے دل دادہ تھے، طبیعت بہت موزوں تھی اور اچھے شاعر تھے لیکن نعت و منقبت میں قصیدے ہی کہتے تھے۔ غزل گوئی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ حالاں کہ بہت اچھا ذوق تھا۔ جوش ملیح آبادی سے بے حد محبت کرتے تھے اور یہ محبت اس حد کی تھی کہ اُن کی مے خواری کو بھی برداشت کیا کرتے تھے۔ وہ صحبتیں اب خواب ہیں جب ہم لوگ حکیم صاحب کے یہاں جمع ہوا کرتے تھے اور گھنٹوں شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور ان محفلوں میں بڑے پیمانے پر حاضرین کی خاطر داری بھی ہوتی تھی۔ صاحب عالم غیر معمولی طور پر متواضع تھے۔ وہ خود بھی بہت اچھا کھانا کھاتے تھے، دعوتوں میں اہتمام بلیغ ہوتا تھا۔ بہترین غذائیں کھلاتے تھے۔ اُن کے یہاں کے ایسے پان بھی شہر میں بڑے بڑے رئیسوں کے یہاں

کم ملتے تھے۔ دعوتیں کرنے کا اُن کو شوق تھا، آئے دن اُن کے دسترخوان پر دوستوں کا جماؤ لگا رہتا تھا۔ طبیب کی حیثیت سے اُن کا شمار سربرآوردہ حکیموں میں تھا۔ ثقل سماعت فطری تھا۔ اس کے علاوہ مریضوں کو زیادہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ بہترین نباض تھے۔ نبض دیکھ کر مریض کا حال خود بیان کر دیتے تھے۔ اُن کا دواخانہ معدن الادویہ ملک بھر میں نیز دوسرے ممالک میں بھی مشہور تھا۔ اُن کے یہاں کے تیار شدہ عرقیات و شربت وغیرہ افریقہ بھی جایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں انتہائی دیدہ زیب اور کار آمد طبی رسالہ بھی شائع کرنے لگے تھے لیکن مطب اور دواخانہ کی مصروفیت کے سبب سے اس شوق کو خیرباد کہنا پڑا۔ دواخانہ میں ادویہ بذاتِ خود نگرانی کر کے تیار کراتے تھے۔ قیمتی سے قیمتی مرکبات مخصوص دوستوں کو بلا قیمت پیش کر دیتے تھے۔ غربا کے لیے ہمیشہ مفت دوائیں دینا ہی اُن کا دستور تھا۔ دریا دلی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی دواخانہ کی آمدنی بھی اس تجارت کو چلانے میں ناکافی ہو جاتی تھی اور یہ کمی زمینداری کے محاصل سے پوری کرتے تھے۔ مریضوں کے گھر جانے کی فیس مقرر کر رکھی تھی لیکن اس پر عمل درآمد بہت کم ہوتا تھا، اس لیے کہ فیس نہ ملنے پر طلب کرنا اُن کی مروت سے بعید تھا، اُن کی ذات سے بڑے بڑے فیض جاری تھے اور حقیقت امر یہ ہے کہ اُن کے بعد صنفِ اطبا میں وہ خلا پیدا ہوا جو کبھی پُر نہ ہو سکا۔ اُن کی وضعداریاں یاد کر کے اب بھی بہت لوگ آہ سرد بھرتے ہیں۔

حکیم منے آغا فاضل اپنی آپ مثال تھے۔ علمی قابلیت بہت رکھتے تھے، متعدد فنون پر دست گاہ تھی۔ اس کے علاوہ اُن میں ریاست کی ہر شان تھی۔ بہت اچھا کھانا کھاتے اور بہت اچھا کپڑا پہنتے تھے۔ طوائفوں سے دوستانہ روابط تھے اور رقص و موسیقی کے بھی دل دادہ تھے۔ بذلہ سنج اور خوش گفتار تھے، بہت اچھے غزل گو تھے، طبیبوں میں بھی اُن کا ایک بلند مقام تھا۔ طبیعت میں ذہانت و ذکاوت میں اُن کی علمی قابلیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مہاراجہ محمود آباد کے یہاں، جن سے اُن کے بے تکلفانہ روابط تھے، ایک مرتبہ پٹنہ کے ایک رئیس کے مہمان تھے۔ انھوں نے حکیم صاحب کی موجودگی میں یہ کہہ دیا کہ "حکیموں کی دوائیں بہت غلیظ ہوتی ہیں، میں اگر بیمار پڑا تو کبھی بھی حکیم کا علاج نہ کروں گا۔" اُن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی عمر میں کبھی بیمار نہیں پڑتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد اُن کی علالت کی خبر آئی اور انھوں نے مہاراجہ مرحوم سے انھیں حکیم کو بغرض علاج روانہ کرنے کی فرمائش کی۔ حکیم صاحب پٹنہ پہنچے اور کچھ دوائیں ہمراہ

لیتے گئے تھے۔ اُن رئیس کو بخار آ رہا تھا جس کو کسی حکیم یا ڈاکٹر کے علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا، انھوں نے نبض دیکھی اور فرمایا "نواب صاحب! میں آپ کو دو روز میں اچھا کر سکتا ہوں لیکن میری دوا غلیظ ہوگی جو آپ کو کھانا پڑے گی" سامنے ایک حوض تھا جس میں کائی جمی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اسی کائی سے آپ کا علاج کروں گا۔ نواب صاحب اپنی بیماری سے بہت دل تنگ تھے انھوں نے کہا کہ "مجھے نہ بتائیے، آپ جو چاہے کھلا دیجیے" حکیم صاحب نے چاقو سے کائی کا ایک چھلکا اُتارا اور اپنے ساتھ کے سفوف کو شامل کر کے گولیاں تیار کیں پھر آ، گولیوں کو دن میں تین بار کھلا دیا۔ دوسرے روز بھی یہی علاج جاری رہا اور وہ رئیس شام تک صحت یاب ہو گئے۔ حکیم صاحب کے مریضوں میں اکثریت رئیسوں، نوابوں اور راجاؤں کی تھی۔ انھوں نے روپیہ خوب کمایا اور خوب اُڑایا تھا۔ روزانہ مطب کے بعد گھر سے نکل کر اپنی گاڑی پر مریضوں کو دیکھنے جاتے اور ہر فیس گاڑی کی گدّی پر رکھ دیتے تھے۔ ایک ایک دورہ میں چھ سات اور کبھی کبھی آٹھ دس مریض دیکھ لیتے تھے۔ ہر جگہ سے روپیوں میں فیس ملتی تھی جو گاڑی کی گدّی پر جمع ہوتی رہتی تھی۔ واپسی پر مجموعی رقم انگرکھے یا اچکن کے دامن میں سمیٹ کر گھر میں اپنی اہلیہ کے روبرو یہ کہہ کر پھینک دیتے تھے کہ "لو نیک بخت یہ تمھارا حصّہ ہے" طبیعت میں طنز و مزاح کے ساتھ بلا کی شوخی تھی طوالقول سے راہ چلتے مذاق کر لیتے تھے اور پردہ دار عورتوں پر بھی جو علاج کی غرض سے آتی تھیں فقرے چُست کر دیتے تھے۔ ایک بار ایک معظمہ ڈولی میں اور اُن کے شوہر ہمراہ آئے تھے۔ مریضہ کی نبض دیکھ کر حکیم صاحب نے شوہر سے کہا کہ "اماں! یہ تو پیٹ سے ہیں" انھوں نے کہا کہ جی ہاں، ماشاء اللہ اور بھی بچّے ہیں۔ حکیم صاحب نے پوچھا کہ کتنے بچّے ہو چکے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ گیارہ۔ حکیم صاحب نے مسکرا کر فی الفور فرمایا "اَلّا اللہ! سمندر ہے کہ اُبلتا ہی چلا آتا ہے" طنز و مزاح کے ایسے ہی بے شمار واقعات تھے جن کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔

متذکرہ بالا طبیبوں میں کسی کا بھی کوئی تعلق جھوائی ٹولہ سے نہیں تھا۔ ان میں کی ہر مقتدر شخصیت اپنا اپنا علیحدہ مطب قایم کیے تھی جہاں مریضوں کے علاج کے علاوہ طلبا کو علم طب میں درس بھی دیے جاتے تھے۔ یہی اسلوب جھوائی ٹولہ میں بھی رائج تھا۔ لیکن جب لکھنؤ کی مجموعی معاشرت پر زوال آنا شروع ہوا اور یہ انفرادی مطب کی درسگاہیں یکے بعد دیگرے ختم ہونے لگیں تو حکمائے جھوائی ٹولہ کی مساعیِ جمیلہ سے منظم درس گاہ معرض وجود میں آئی۔

اس کا نام تکمیل الطب ہے اور اس کے بانی حکیم عبدالعزیز مرحوم تھے۔ اس درس گاہ نے علمِ طب کو فنا ہونے سے بچالیا اور آہستہ آہستہ درس و تدریس کا سارا کاروبار اسی ادارہ میں سمٹ کر آگیا۔ اسی ادارہ سے تحصیل علم کر کے بیرون جات میں یہاں کے طلبا مطب کرتے ہیں اور اسی تعلیم گاہ کی شہرت دور دور سے طالبانِ علم کو یہاں گھسیٹ لاتی ہے۔ جھوائی ٹولہ نے بڑے بڑے جلیل القدر اطبا اب تک پیدا کیے ہیں۔ اس ادارہ کی تاریخ میں من جملہ بہت سے دوسرے ماہرین فن کے حکیم عبدالعزیز کا نام نامی سرِ فہرست ہے اور آخری دور میں حکیم عبدالمعید کا اسمِ گرامی اکمل افراد میں یادگار رہے گا۔ اس تعلیمی درس گاہ میں اچھے اچھے مدرس گزرے ہیں جن کی صلاحیتوں کی بدولت آج بھی یہ مدرسہ مقتدر اور ممتاز ہے۔ انھیں اطبا کی سرپرستی میں بڑے بڑے سلیقہ شعار اور ہنر مند عطار بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جھوائی ٹولہ میں تیار شدہ مرکبات کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں سنی گئی۔ مختصر یہ کہ لکھنؤ کے طبی عروج کی آخری یادگار جھوائی ٹولہ کا مدرسہ تکمیل الطب ہے۔ جس کی افادیت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے۔

## (۶) اودھ پنچ اور بعض دیگر جرائد

زبان و بیان کی خوبیوں میں نکھار پیدا کرنے، عوام کے فطری جذبات کو صحیح اور کارآمد عملی شاہراہوں پر آمادہ کرنے، رجحانات و احساسات کی راست راہ نمائی کرنے، عوام میں قوتِ ارادی اور قوتِ عمل کو تقویت فراہم کرنے اور مظلوموں کے شکستہ دل کو سہارا دینے کے لیے صحافت ایک زبردست، موثر اور سودمند وسیلہ ہے۔ سیاسیات کے میدان میں صحافت کی بہت زیادہ کارفرمائی ہوتی ہے لیکن اخلاقیات و معاشیات کے مبادیات میں بھی اس فن کو کم اہمیت نہیں ہے۔ لکھنؤ کے قدیم معاشرہ میں گو کہ سیاسیات کو خواص و عوام کی زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا لیکن صحافت کی افادیت اُس وقت بھی مسلم الثبوت تھی۔ تعیش اور فارغ البالی کے دور میں جب زندگی بسر کرنے کے انداز سہل انکاری پر قایم تھے سماج کو نئے رُخ کی طرف اودھ اخبار ہی نے موڑ دیا تھا اور اس نئی ذہنیت کی تربیت میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد اور اودھ اخبار کی حالات زمانہ سے باخبر کرنے کی کوششوں کو دخل تھا۔ ان دونوں کے صحت مند اثرات نے اُردو زبان کو نکھار دیا اور عوام کو متاثر کر کے اخلاق و کردار کو بلند کرنے میں سہارا دیا تھا۔

فسانۂ آزاد نے نہ صرف قدامت پرستوں کے لیے آسودگی و دلچسپی کا سامان فراہم کیا تھا بلکہ نوجوانوں میں بھی ناول بینی کا نیا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ اسی مذاق کی بدولت ادیبوں اور نثر نگاروں نے بڑے بڑے شاہ کار پیش کیے جو مقبولِ خاص و عام ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے تاریخی ناول لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمتِ پارینہ کی یاد تازہ کی اور اُن میں نئے حوصلے پیدا کیے۔ بعض دوسرے فن کاروں نے بھی ناول لکھے جن کے صحت مند اثرات سماج کے اخلاقیات پر پڑے تھے۔ اُس زمانے کی معاشرت کی صحیح عکاسی مرزا محمد ہادی رسواؔ نے اپنے ناول 'امراؤ جان ادا' میں کی جو آج تک ناول نویسی کی دنیا میں ایک بلند پایہ شاہ کار ہے۔
اسی تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا۔ یہی ناول پڑھنے کا شوق عوام میں پھیلا تو بازاری مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے سطحی اور پست تصنیفات بھی کثرت سے معرضِ وجود میں آئیں۔ رومان پرستی کی آسودگی کے لیے ویسا ہی ادب درکار تھا۔ یہ شوق شہر کے ایک ممتاز پبلشر مہادیو پرشاد ٹنڈن کے تجارتی کاروبار سے پورا ہوتا تھا۔ اُن کے مطبوعہ ناولوں میں فکر و فن کی خوبیاں بہت کم تھیں لیکن سستی رومانیت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ان ناولوں کی بدولت عوام میں بہت چہل پہل رہتی تھی اور ایک گونہ ادبی گرم بازاری بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک ناول کا یہ پلاٹ تھا کہ ایک نوجوان قیصر باغ کے چوراہے پر ایک پھول دار ریشمی رومال پڑا ہوا پاتا ہے جو اُس کے قیاس میں کسی حسینہ کا تھا، پھر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ جس کا رومال اتنا خوب صورت تھا وہ خود کتنی حسین و جمیل اور نازک اندام ہوگی۔ اُس کے دماغ میں ایک حُسن و جمال کا مجسمہ تیار ہوتا ہے اور اُس کی نظریں اس پری پیکر کے نظارے کے لیے بے تاب ہو جاتی ہیں۔ معاً وہ نادیدہ معشوق پر عاشق ہو جاتا ہے اور اُس کی تلاش میں آوارہ گرد ہو کر جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا ہے۔ یہ ناول اُس زمانہ میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زبان و بیان کے اسلوب اور منظر نگاری میں اُس کا پایہ بلند تھا لیکن پھر بھی اُس کا شمار کسی بلند پایہ ادب میں نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ذوق باقی نہیں رہا اور ایسے کم تر درجہ کی تخلیقات نے اپنی جگہ بلند پایہ ادب کے لیے خالی کر دی۔ ایسے پست لٹریچر کا پھر بھی ایک مقام تھا کیوں کہ فکر و نظر نے اُسی زینہ کو طے کر کے رفعت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ اُردو زبان کو سنوارنے میں ایسے بے فیض ادب کا بھی گراں قدر حصّہ تھا۔ ایسے ہی افسانے اُس زمانے کے اخباروں اور رسائل میں بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔

جن کی افادیت صرف اسلوبِ زبان تک محدود تھی۔

اودھ اخبار میں ابتداً زیادہ تر غزلیں اور افسانے جن کو رومانی کہانیاں کہنا زیادہ صحیح ہوگا، شائع ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ خبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا مگر یہ خبریں بھی عموماً سرکاری یا سرکار سے متعلق ہوتی تھیں۔ سیاسیات کا ایسا کوئی شائبہ جو قومیت یا وطن پرورانہ رجحانات سے متعلق ہو، اُس میں نہیں ہوتا تھا۔ البتہ شستگی زبان اور سلاست بیان اُس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نقشِ اول کے بعد پھر اور دوسرے نقوش بھی اُبھرے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اخبارات ورسائل نے مذہبیات کو بھی اپنے موضوعات میں شامل کرلیا تھا۔ پھر بھی اخبار بینی کا کوئی قابلِ ذکر شوق شہر کی پرانی آبادی کو پیدا نہیں ہوسکا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران خواص وعوام اخبار پڑھنے کے شائق ہو گئے تھے۔ شبیر حسن قتیلؔ مرحوم نے ستارہ جاری کیا تھا جو بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا تھا۔ اُس زمانے کے حالات کا دقیق نظر سے جائزہ لیا جائے تو کچھ ایسا محسوس ہوگا کہ غلام ہندوستانیوں کی رگِ حمیت پہلی بار پھڑکی تھی اور اُن میں غیر متعین اور غیر شعوری طور پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ اُبھرا تھا۔ امرا ورؤسا کے درباروں میں جنگ کے اذکار سن کے کانوں پر ہاتھ دھر لیے جاتے تھے لیکن عوام کی زبان پر یہ شعر وردِ رہتا تھا ؎

ہر طرح ہے شکست جرمن کی
بجز اس کے کہ بڑھے آتے ہیں

پھر بھی اُس زمانہ کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ باوجود فارغ البالی وارزانی اور امن وامان کے عوام کے لیے حکومتِ برطانیہ کا اقتدار ناخوش گوار تھا اور اسی جذبہ کو ستارہ نیز بعض شعرا کی نظموں نے وقتی طور پر گرما دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ظریفؔ کی ایک نظم جس کا مطلع یہ تھا، بہت زیادہ مرغوب خاطر تھی ؎

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جمادیں گے
جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلادیں گے

اِن جذبات کو پھر بھی کوئی دیرپا حیثیت حاصل نہیں تھی اور نہ عوام کے پیشِ نظر کوئی معینہ مقصد تھا جس پر اُن کی تنظیم ہوسکتی۔ اُن کے دلوں میں اُس وقت تک انتزاعِ سلطنت کا داغ تازہ تھا۔ اور وہ انگریزوں کو ظالم وغاصب سمجھ کر اُن سے خائف تھے۔ اور نفرت بھی

کرتے تھے۔ تحریکِ خلافت نے پہلی بار انھیں جذبات کو ایک عملی دھارے میں موڑ دیا تھا۔

اس تجزیہ کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے پرانے اخبار و جرائد نے اُردو کو فروغ دینے کے علاوہ اصلاحی اور تعمیری مباحث میں کوئی گہرا نقش نہیں اُبھارا تھا۔ البتہ ایک رسالہ اودھ پنچ ایسا تھا جس نے ادبی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور آگے چل کر سیاسی معاملات میں بھی راہ نمائی کی تھی اور اپنے دیرپا اثرات بھی قایم کئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح کے سنجیدہ اسلوب کا اُردو ادب میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس جریدہ کو ابتدا ہی میں باصلاحیت مقالہ نگار مل گئے تھے اور یہی سلسلہ آخر وقت تک برقرار رہا تھا۔ منشی سجاد حسین بانی اور ایڈیٹر تھے جن کے کلام اور بیان میں بلا کی شوخی بھری ہوئی تھی اور وہ خود بھی بہت خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں مرزا مچھو بیگ، منشی احمد علی کسمنڈوی اور پنڈت تربھون ناتھ ہجر شامل تھے۔ ان میں کا ہر فرد عالم، فاضل اور بلند پایہ صلاحیت کا مالک تھا۔ مرزا مچھو بیگ طنز و مزاح کے ساتھ شیریں زبان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ منشی احمد علی فارسی ادب کے ماہر اور بزلہ سنج تھے۔ ہجر کو ہندی شاعری پر عبور حاصل تھا اور وہ ہندی اور اُردو میں حسین امتزاج پیدا کرنے کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان جدا جدا خصوصیات کے ادیبوں کا ایک جا ہو کر اپنے اپنے کمالات کے نمونے پیش کرنا اودھ پنچ کی ہر دلعزیزی اور افادیت کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ یہ جریدہ بہت جلد بلند پایہ ادیبوں میں مقبول ہو گیا تھا، ادبیت کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی نے اُس کی دل کشی کو دوبالا کر دیا تھا۔ علمی اور ادبی مباحثوں کے لیے اُس کے کالم مخصوص تھے، اس طرح باوجود ظرافت کے سنجیدگی کا جوہر بھی اُس میں شامل ہو گیا تھا۔

اودھ پنچ کا پہلا دور منشی سجاد حسین کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ اُن کے ساتھی بھی ایک ایک کر کے راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے تھے۔ اس جریدہ کی بقا کا مرحلہ بہت سخت تھا۔ اس مصیبت میں شیخ ممتاز حسین عثمانی مرحوم نے جو پہلے سے شریک کار تھے اس خدمت کو انجام دینے کا فریضہ قبول کیا۔ وہ منشی سجاد حسین کے دوست اور ہم مذاق بھی تھے۔ انھوں نے اپنی ادارت میں اس موقر اخبار کا وجود اپنی سابقہ افادیت سمیت برقرار رکھا۔ اسی زمانہ میں راقم کو بھی اُن کی ظریفانہ صحافت سے دل چسپی ہو گئی تھی۔ اخبار کا دفتر وکٹوریہ اسٹریٹ سے متصل دلالی محلہ میں تھا اور اُسی مکان میں شیخ ممتاز حسین عثمانی بھی رہتے تھے۔ شیخ صاحب مرحوم عقیدتاً شیعہ تھے لیکن اخباری مسلک

تھا۔ شیعوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا تھا جو اپنے علم و عقل کے سرمایہ کو تقلید کے آستانے پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لہٰذا علمائے کرام سے اُن کا تصادم ناگزیر ہو گیا تھا۔ راقم کا تعلق بھی اسی جتھے سے تھا اور ہم سب کے سپہ سالار شیخ ممتاز حسین مرحوم تھے۔ اس طرح مذہبی رسم و رواج میں بھی اصلاح کے پہلو نکالنے اور اُن کی ترویج کرنے کے لیے اودھ پنچ ایک بڑا سہارا بن گیا تھا۔ شیخ صاحب کے قلم میں بانکپن تھا اور سپہ گری کی شان بھی تھی۔ بڑے بڑے فقہی مجادلے ہوتے تھے اور شیخ صاحب فاتحانہ انداز میں معرکہ آرائی فرماتے تھے۔

شیخ ممتاز حسین عثمانی تحریک خلافت کے زمانہ سے گاندھی جی کے موئید ہو گئے تھے۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جنھوں نے سب سے پہلے بدیشی اشیا کا استعمال اپنے اوپر ناجائز قرار دیا تھا اور لباس میں کھادی پہننا اختیار کر لیا تھا۔ اس سیاسی مسلک پر عامل ہونے کے باوصف اُن کی صحافتی دیانتداری نے اُن کو کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ اودھ پنچ کی معینہ پالیسی کو ترمیم کر کے سیاسیات بھی اُس میں شامل کر دیں لیکن انھوں نے اس موضوع کو سماجی اور معاشرتی ڈھانچے میں پیش کرنے کا طرز نکال لیا تھا اور اخبار میں عالمِ ارواح سے جانِ عالم واجد علی شاہ کے خطوط بنام حکومت برطانیہ کا ایک سلسلہ مدت تک شائع کیا تھا۔ یہ خطوط نہ صرف دلچسپ بلکہ پُر مغز اور دل گداز ہوتے تھے اور خواص و عوام سب ہی میں مقبول ہوتے تھے۔ اُن کا یہ اثر فی الفور ظاہر ہو گیا تھا کہ عمائدین کے یہاں نوجوانوں میں انگریزوں کے خلاف بے زاری کا جذبہ شدت کے ساتھ اُبھر آیا تھا۔ اُس زمانہ کے حالات کے تحت یہ بھی ایک گراں قدر کارنامہ تھا جس کو ہم وطن پرور تحریکات کا پیش خیمہ قرار دے سکتے ہیں۔ شیخ ممتاز حسین کا یہ کمال تھا کہ وہ اپنے قلم نے مفادِ ملک میں زندگی بھر قومی تحریکات کی حمایت کرتے رہے لیکن پھر بھی سیاسیات سے علیحدگی کے مسلک پر آنچ نہیں آنے دی۔

شیخ صاحب ہفت خواں تھے۔ اُن کو اُردو، فارسی، عربی، لاطینی، سریانی، انگریزی اور عبرانی زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ اوّل الذکر تین زبانوں میں کمال حاصل تھا۔ اسی ادبی مذاق و شغف کی بدولت اُن کے دوستانہ تعلقات تمام ہم عصر علما شعرا اور ادیبوں سے تھے جن میں ہر ایک اُن کا احترام کرتا تھا۔ دبستانِ لکھنؤ میں شعر و شاعری کا وہ بہترین دور تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے درمیان بڑے بڑے مجادلے اور مباحثے بھی ہوتے تھے۔ جن میں یاس عظیم آبادی کا تمام اساتذہ لکھنؤ کے خلاف مجادلہ اور چکبست و شرر کا گلزارِ نسیم سے متعلق مباحثہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں

ظاہر ہے کہ شیخ صاحب اور اودھ پنچ ان سرگرمیوں سے کنارہ کش نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ سے متعلق اس جریدہ کی فائلیں دلچسپ ادبی مطالعہ فراہم کرتی ہیں۔ شیخ صاحب کے دورِ کارکردگی میں منشی سجاد حسین کی ظرافت یقیناً کارفرما نہیں تھی لیکن انھوں نے ایک نقاد کی حیثیت سے علمی مباحث کو ظرافت کے کوزہ میں پیش کیا تھا۔ یہ کارنامہ یقیناً بہت گراں قدر تھا اور اُس ادبی و معاشرتی خدمت کو وہ اپنی زندگی بھر جب تک کہ زبان میں گویائی اور قلم میں یارائی رہی انجام دیتے رہے تھے۔ تپِ دق کی بیماری لاحق تھی، منہ سے برابر خون آیا کرتا تھا، بخار کی شدت سے بے بس ہو جاتے تھے لیکن جب بھی افاقہ ہو جاتا جہادِ نفس میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، اُن کی یہ خدمات یقیناً جہاد کی حیثیت رکھتی تھیں کیوں کہ اُن کی بدولت اُن کو ہر طرح کی صعوبتیں اُٹھانا پڑی تھیں۔

اودھ پنچ کا ہم عصر اور مدمقابل ایک دوسرا جریدہ پیامِ یار، تھا جو بہت مقبول تھا۔ اودھ پنچ کا طرز طنزیہ و مزاحیہ تھا لیکن پیامِ یار سنجیدہ ادبی میگزین تھا۔ ایک زمانہ میں ان دونوں گراں قدر رسالوں میں زبردست تصادم ہوا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے یہ بحث چھیڑ دی تھی کہ مثنوی گلزارِ نسیم حقیقتاً خواجہ حیدر علی آتشؔ کی لکھی ہوئی تھی جس کو انھوں نے اپنے عزیز شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کا مرتبہ بڑھانے کے لیے انھیں کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔ پنڈت برج نرائن چکبستؔ فی الفور مقابلہ پر آمادہ ہوئے۔ دونوں جانب ہم نوا شاعروں اور ادیبوں کی ٹولیاں جمع ہو گئی تھیں۔ ایک مدّت تک یہ ادبی معرکہ گرم رہا تھا۔ شررؔ کے دعوے کی دلیلیں پیامِ یار میں چھپتی تھیں جن کے جوابات مزاحیہ انداز میں اودھ پنچ میں شائع ہوتے تھے۔ وہ زمانہ لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں کے لیے بڑے لطف سے گزرا تھا۔ یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ طرفین میں کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی مضمون میں ذاتیات پر حملہ ہوا۔ فرقہ واریت کا شائبہ بھی نہیں آنے پایا تھا۔ اُن مباحثوں میں اتنی افادیت تھی کہ جب مولانا مرحوم کی دیانت دارانہ طبیعت اور منصفانہ تحقیقی نظر نے چکبستؔ کے دلائل تسلیم کر لیے تو اُن تمام موافق و مخالف مقالوں کا مجموعہ کتابی شکل میں معرکہ شرر و چکبست کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ختمِ بحث کے بعد ایک نظم یا غزل غالباً پیامِ یار ہی میں شائع ہوئی تھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔ ع

پیامِ یار نے دونوں کو رسوا کر دیا

اسی دور کا ایک موقر اور بہت مقبول ماہنامہ 'دل گداز' تھا جو مولانا شررؔ نکالتے تھے

انھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ادبی تخلیقات پیش کرنے کے لیے بیک وقت دو رسالے شائع کیے تھے۔ دوسرے کا نام "مہذب" تھا۔ لیکن یہ جریدہ بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔ البتہ دل گداز سے مولانائے محترم کو قلبی لگاؤ تھا۔ وہ جب حیدرآباد تشریف لے گئے تھے تو وہاں سے بھی دل گداز جاری کر دیا تھا پھر اُن کا اپنی ملازمت کے تحت لندن جانا ہوا تو یہ ماہنامہ بند ہو گیا مگر واپسی پر پھر تجدید کی۔ بالآخر جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو دل گداز اور لکھنؤ توام ہو گئے۔ مولانا شرر کو دل گداز سے اتنی وابستگی اور اُس کی اشاعت کو بار بار جاری کرنے میں وابستگی غالباً اس وجہ سے تھی کہ اُن کے تصنیف کردہ ناول بالاقساط اسی ماہنامہ میں ابتداً شائع ہوتے تھے۔ "مہذب" میں تہذیب و اخلاق سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے اور علمائے اسلام کی سوانح عمریاں بھی پیش ہوتی تھیں جن کا واحد مقصد دین کے پردہ میں تعلیمِ اخلاق تھا۔ اس کے برعکس دل گداز میں پہلے ہی اُن کی معرکہ آرا تصنیف "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" شائع ہوئی تھی جس نے نہ صرف مولانا کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا بلکہ اس ماہنامہ کو بھی بڑی شہرت اور ہردلعزیزی حاصل کرادی تھی۔ یہی شرفِ قبولِ اس صورتِ حال کا ضامن ہوا تھا کہ دل گداز متعدد بار بند ہوا اور پھر جاری ہو کر خواص و عوام میں مرجعیت باقی رکھ سکا۔ شاعر اور ادیب، علما اور فضلا اُس کی اشاعتوں کے منتظر رہتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

جس دور کا ہم تذکرہ پیش کر رہے ہیں اُس زمانے میں بہت سے ہفتہ وار اور ماہنامے نکلے اور بند ہو گئے تھے۔ علم و ادب کا اتنا ذوق تھا کہ جو جریدہ یا رسالہ شائع ہوتا، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ لیکن اُن سب کی بہار وقتی تھی اور اُن کی افادیت بھی دیرپا نہیں تھی۔ اُن کی اشاعتیں اُردو ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کر دیتی تھیں لیکن زمانہ تغیر پذیر تھا اس لیے تخلیقات بھی زوال پذیری پر آمادہ تھے، پھر بھی ماہنامہ 'الناظر' اور ہفتہ وار 'سچ' کا کچھ نہ کچھ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اُن کی افادیت دیرپا تھی۔

'الناظر' کے بانی، مالک اور ایڈیٹر مولانا ظفر الملک تھے۔ اُن کا تعلق کاکوری کے ایک مقتدر مخدوم زادہ گھرانے سے تھا، اُن کا اصل نام اسحٰق علی تھا لیکن وہ اپنے تاریخی نام ظفرالملک ہی سے مشہور ہوئے۔ کاکوری اُس زمانہ میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ مولانا کو مبدا فیاض نے علم و فضل کا ذوق دے کر پیدا کیا تھا اور وہ بچپن ہی سے درس و تدریس کے پرستار تھے۔ علوم مشرقیہ

میں کمال حاصل کیا اور اپنے شوقِ سیر و سیاحت میں ہانگ کانگ گئے تو وہاں سے بی اے پاس کر کے لوٹے۔ اُس زمانہ میں بی اے پاس کے لیے بڑی ملازمت کا مل جانا سہل تھا لیکن اُن کی غیور طبیعت اور آزادانہ روش ملازمت کی لعنت قبول نہیں کر سکتی تھی۔ سفر سے واپسی پر انھوں نے اپنے کسبِ معاش کے لیے کتب فروشی کا پیشہ اختیار کیا اور ماہنامہ الناظر کا اجرا کر دیا ابتداءً اُن کا کاروبار وکٹوریہ اسٹریٹ پر قایم ہوا تھا لیکن آخر میں محلہ بھوائی ٹولہ اپنے عزیز اور بے تکلف دوست خاں بہادر سید احمد حسین رضوی کی قربت میں منتقل ہو گئے تھے۔ فرض شناسی اُن کی طینت میں اور دیانت داری اُن کے خمیر میں شامل تھی۔ اس لیے وہ کتب فروشی کا کاروبار بہت خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلاتے رہے لیکن الناظر سے بھی کچھ کم شغف نہیں تھا۔ مضامین کی فراہمی ان کی ترتیب و تدوین، کتابت و طباعت کے انتظامات، یہ جملہ امور پھر بھی اُن کے شایانِ شان تھے لیکن اشاعتوں کی کاپیوں پر نام اور پتے لکھوانا، ٹکٹ چسپاں کرنا اور اُن کو باحتیاط ڈاک خانہ بھجوانا یہ کام بھی انھیں، کی نگرانی اور موجودگی میں انجام پاتے تھے۔

الناظر کا ثقافتی معیار بہت بلند تھا۔ کج بحثی یا ذاتیات تو در کنار، سطحی اور پست درجہ کے مضامین کو بھی اُس کے صفحات میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ مولانا ظفر الملک مناقشات سے خواہ وہ ادبی ہی کیوں نہ ہوں خود بھی دور رہنے کے قائل تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آگیا تھا جب وہ اس احتیاط کو برقرار نہیں رکھ سکے تھے اور اُن کا ماہنامہ انھیں کے دو دوستوں کے درمیان ایک ادبی معرکہ کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ ایک طرف اُن کے مخلص دوست اور مایہ ناز ادیب مرزا محمد عسکری مرحوم تھے اور مدمقابل اُن کے دوسرے دوست اور ہمسایہ اور بلند پایہ شاعر حکیم سید علی آشفتہ تھے۔ حکیم آشفتہ کی غزل کے ایک یا دو اشعار پر مرزا محمد عسکری ادیب نے عروضی اور ادبی اعتراضات وارد کیے اور اُن کے جوابات آشفتہ نے تحریر فرمائے۔ یہ دونوں مضامین الناظر میں شائع ہوئے تھے لیکن بحث نے طول پکڑا اور دونوں جانب حمایتی ٹولیاں صف آرا ہو گئیں۔ مرزا محمد عسکری ادیب کی تائید میں اثر مرحوم، صفی مرحوم، شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ وغیرہم نے بہت اچھے اور فاضلانہ مقالے لکھے۔ اُن کے جواب میں اُس زمانے کے نوجوانوں شاعروں میں قریب قریب سب ہی نے بلند پایہ اور مہذب خامہ فرسائی کی تھی۔ یہ بحث تقریباً دو برس تک ۲۵-۱۹۲۴ء میں چلی تھی۔ ہر اعتراض بلند پایہ اور ہر جواب شستہ اور شائستہ ہوتا تھا۔ یہ معرکہ ادبی مذاکروں پر مشتمل تھا اور اس سلسلے میں ہر مضمون جو الناظر میں شائع ہوا تھا کار آمد اور گراں قدر تھا۔

آخرالذکر ہفتہ وار "سچ" اُس زمانے میں جاری ہوا تھا جب لکھنؤ کا قدیم معاشرہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ انگریزوں کا تسلط پوری طرح ہو چکا تھا اور ہندوستانیوں میں آزادی کا رجحان جنم لے رہا تھا، پہلی جنگ عظیم نے خفتہ قوم کو بیدار کر دیا تھا اور وطن پرستی کی اُمنگ کروٹیں بدل رہی تھی۔ انحطاط وزوال کے دور میں اخلاق کا پست ہو جانا فطری بات تھی اور لکھنؤ والے درسِ اخلاقیات کے محتاج ہو رہے تھے۔ ان حالات میں مولانا عبدالماجد دریابادی آگے بڑھے اور ۱۹۲۵ء میں ہفتہ وار "سچ" کا اجرا ہو گیا۔ لیکن ابتدا میں اس کے ایڈیٹر مولانا ظفرالملک تھے اور شریکِ ادارت مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالرحمٰن ندوی رہا کرتے تھے۔ پھر بھی یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ پہلے صفحہ پر "سچی باتیں" کے عنوان سے مولانا عبدالماجد ایسے نوٹ لکھ دیا کرتے تھے جو بہت مقبول تھے۔ اردو کے متعدد اخبار و جرائد انھیں اسی عنوان کے تحت نقل کیا کرتے تھے اور چوں کہ ہر نوٹ کے نیچے "م" درج ہوتا تھا اس لیے ہر پڑھنے والا سمجھ لیتا تھا کہ قلم کاری مولانا عبدالماجد کی تھی۔ کچھ ہی مدت کے بعد "سچ" کی تمام و کمال ادارت مولانا عبدالماجد کے حوالے ہو گئی تھی اور مولانا ظفرالملک محض ناشر اور مہتمم رہ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھیں تحریروں میں جو صفحہ اوّل پر شائع ہوتی تھیں سیاسی رنگ بھی چھانے لگا تھا۔ بعض صفحات میں اسلام کے خلاف حملوں کا جواب ہوتا اور مغربی تہذیب کے مضرتناک اثرات سے بچنے کی مسلمانوں کو تلقین بھی دی جاتی تھی۔ "سچی باتیں" کچھ اس انداز سے لکھی جاتی تھیں کہ پڑھنے والوں پر گہرا اثر پڑتا تھا اور سیاسی تبصروں میں اتنی چستی اور صفائی ہوتی تھی کہ حکومتِ وقت کے لیے یہ ہفتہ وار ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا چناں چہ ضمانت طلب ہوئی جو داخل نہ ہو سکی اور اخبار بند ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد پھر جاری ہوا لیکن ۱۹۳۳ء میں بالکل بند کر دیا گیا۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد والے حالات ہمارے موضوع سے خارج ہیں لیکن سچ کی بات اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی یاد آجانے کے بعد اس تذکرہ کو اسی مقام پر ختم کر دینے کو دل گوارا نہیں کرتا کیوں کہ سچ کے بالکل بند ہو جانے کے بعد مولانا دریابادی کے دل و دماغ میں اُن کے حوصلے بلند سے بلند تر ہو گئے تھے، وہ ایک جلیل القدر عالم و ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ملک کی جنگِ آزادی میں ایک گراں قدر مجاہد کی حیثیت سے بھی برابر نبرد آزما رہے تھے۔ اُن کے پہلو میں حساس دل تھا اور اُن کی ہمتیں پہاڑوں کی طرح استوار تھیں۔ عوام کی صحت مند رہنمائی اور مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کے لیے اُن کے دل کی تڑپ سچ کے بند ہو جانے پر صبر و شکر نہیں کر سکتی تھی۔

پسماں چہ دو برس کے بعد انھیں کے منشا پر اور انھیں کے ایک عزیز شاگرد عبدالرؤف عباسی کے زیر اہتمام وہی سچ "صدق" کے نام سے جاری ہوا۔ مولانائے محترم بدستور ایڈیٹر رہے۔ صدق میں بھی "سچی باتیں" کے عنوان سے مولانائے موصوف کے لکھے ہوئے شذرات نکلتے تھے جن کو مختلف اخبارات و جرائد نقل کرتے اور اخبار بیں طبقہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ سچ کے مقابلہ میں صدق کی مدتِ حیات طویل تھی۔

متذکرہ بالا صحائف و جرائد ہفتہ وار یا ماہانہ ادبی کارنامے تھے۔ ان میں سیاسیات کی جھلک بھی آجاتی تھی لیکن ایسی نہیں ہوتی تھی کہ ہم اُن میں سے کسی کو بھی سیاسی اخبار کہہ سکیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس زمانہ میں کوئی خالص سیاسی اخبار مضبوط بنیادوں پر قایم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ حکومتِ وقت سے لوگ خائف رہتے، حکومت کی معمولی نکتہ چینی کو بھی بغاوت پر محمول کرتے اور سیاسیات کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتے اور اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے زمانہ میں دلی جذبات کا مظاہرہ ہوا۔ جرمنی کی فتح سے متعلق معمولی سے معمولی خبر پر خوشی کے مارے چہرے سرخ ہو جاتے تھے اور دلوں میں برطانیہ کی شکست کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ تحریکِ خلافت نے ایک حلقہ میں ان پوشیدہ جذبات کو اُبھرنے کا موقع دیا۔ اب دوسری طرف شبیر حسن قتیل کے اخبار "ستارہ" نے زبانوں کی لکنت کو بڑی حد تک صاف کر دیا تھا۔ فرنگی محل کے مولانا عبدالباری مرحوم نے مسلمانوں کی بہت بڑی حد تک رہنمائی کی اور اُن میں وطن پرورانہ جذبات اُجاگر کرائے۔ اس طرح صحت مند رجحانات منتشر افراد اور ٹولیوں میں ضرور پیدا ہوئے مگر کوئی منظم پارٹی یا جماعت ایسی نہ تھی جو ہندوستانیوں میں قومیت کا طوفان برپا کر دیتی۔ اور خالص وطن پرورانہ دھارے پر اُن کو بہا دیتی۔ ہوم رول کے نام پر ہندوستانیوں میں سیاسی تحریک چلائی جا رہی تھی لیکن اُس کی قیادت آرام کرسی والے قائدین کے ہاتھوں میں تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں معرضِ وجود میں تھیں، سیاسی تحریکات بھی شروع کی جا چکی تھیں لیکن عوام کی پوری طرح تائید حاصل نہیں تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں ایک سمجھوتہ بھی ہو چکا تھا لیکن مسلم عوام پھر بھی ان تمام کارروائیوں سے بیگانہ تھے۔ ان حالات میں ایک اچھے اُردو روزنامہ کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چناں چہ ۱۹۱۶ء میں مہاراجہ سر محمد علی خاں والی محمود آباد نے روزنامہ "ہمدم" جاری کرایا جس کی ادارت کے لیے سید جالب دہلوی کو منتخب کیا گیا۔ مہاراجہ مرحوم کی ذاتِ گرامی سے ملک و قوم کو بڑے بڑے فیض پہنچے تھے۔ وہ پکے نیشنلسٹ مسلمان تھے لیکن مسلمانوں کے ملی مفادات کا تحفظ بھی اُن کے نزدیک

ضروری تھا۔ اُس وقت ہمدم اخبار کو جاری کر کے انھوں نے ایک اہم سیاسی خدمت انجام دی تھی اور اُس کو اپنی ہی ملکیت قرار دے کر بڑی ہوش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اسی طرح اس اخبار کی ادارت کے لیے سید جالبؔ مرحوم سے بہتر اور کوئی دوسرا صحافی نہ منتخب کیا جا سکتا تھا۔ اور نہ کسی دوسرے کو منتخب کرنا دانش مندی کا تقاضا تھا۔

روزنامہ ہمدم کی سیاسی پالیسی اور اس کی سیاسی افادیت پر اظہار خیال کرنا ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے۔ متذکرہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا گیا اُس میں بھی ہم حق بجانب نہیں تھے لیکن سید جالبؔ کی شخصیت اور اُن کے کردار کو پیش کر دینا یقیناً ہمارا فرض ہے اور اس تذکرہ میں اُس کی ضرورت ہے۔ سید جالبؔ دہلوی بے حد مہذب اور شائستہ بزرگ تھے۔ بلند پایہ ادیب اور گراں قدر صحافی تھے۔ بات کرنے کا خصوصیت کے ساتھ بہت اچھا سلیقہ تھا۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ سے اُن کے مذاکرے بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ دونوں طرف سے طنز و مزاح کا سلسلہ شروع ہوتا تو ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یوں تو اعلیٰ درجہ کا صحافی ہوتے ہوئے اُن کا حافظہ بہت قوی تھا لیکن مرزا محمد ہادی رسوا کی طرح کبھی کبھی اُن کی یادداشت اتنا شدید دھوکا دیتی تھی کہ حاضرین دنگ رہ جاتے تھے۔ مرزا رسوا کا یہ واقعہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ خود فراموشی میں یہ بھی بھول گئے تھے کہ امراؤ جان ادا خود انھیں کا لکھا ہوا ناول تھا۔ اسی طرح سید جالبؔ کے بھول جانے کا یہ واقعہ اُس سے زیادہ حیرت خیز ہے، مرزا محمد عسکری ادیبؔ کے یہاں ایک بار ماہ رمضان میں افطار صوم کی ضیافت تھی جس میں مولانا ظفر الملک، مولانا عبدالحلیم شررؔ، خان بہادر سید احمد حسین رضوی اور بعض دوسرے جلیل القدر حضرات مدعو تھے۔ میں بھی عزیز دارانہ تعلقات کی بنا پر مرزا صاحب کے یہاں ہر موقع پر شریک رہا کرتا تھا۔ افطار صوم کا وقت آیا تو نماز باجماعت ہونا بھی ضروری تھا۔ سن و سال کی بزرگی کی بنا پر قرار پایا کہ سید جالبؔ صاحب نماز پڑھائیں اور وہ راضی بھی ہو گئے۔ پہلی رکعت میں سورہ الحمد کے بعد جب دوسری سورت شروع کی تو چند آیتوں کے بعد آگے نہ بڑھ سکے۔ تکبیر کہہ کر رکوع اور سجود بجا لائے یہاں تک تو غنیمت تھا نماز باطل نہیں ہوئی تھی لیکن دوسری رکعت میں سورہ الحمد کی تیسری یا چوتھی آیت پر اٹک گئے اور ایسا اٹکے کہ کسی طرح آگے کی آیت یاد نہ آئی۔ لاحول کہہ کر اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور کسی دوسرے نے فوراً اقتدا کر دی۔ یہ واقعہ میرا چشم دید ہی نہیں بلکہ نماز یوں میں ایک صف میں خود میں بھی شریک تھا۔ اس مقام پر یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ اُس زمانہ میں تہذیب و شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جالبؔ مرحوم کی اس غلطی پر کسی صف میں کوئی کھلبلی نہیں نمایاں

ہوئی اور نہ کسی نے اُن کی بزرگی و عظمت کا لحاظ کرتے ہوئی کوئی نکتہ چینی کی بلکہ اس ناسزاوار حرکت کو اُن کی ضعیفی اور کبر سنی پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ خود معصومانہ انداز میں خاموش ہو گئے تھے۔

## (۷) نول کشور اور گنگا پرشاد ورما

منشی نول کشور کے بعد بابو گنگا پرشاد ورما کی ذاتِ گرامی کی بدولت لکھنؤ کی ثقافتی زندگی کو بڑی بڑی سہولتیں ملی تھیں۔ موصوف ایک ممتاز شہری اور بڑے کامیاب وکیلوں میں تھے۔ نظیر آباد کی اُس سڑک پر جو خیالی گنج کی طرف جاتی ہے اُن کی محل سرا تھی اور کثیر جائداد از قسم نقد و جنس کے مالک تھے لیکن دولتِ اولاد سے محروم تھے۔ انھوں نے ایک ٹرسٹ قایم کیا اور اُسی کے تحت رفاہِ عامہ کے لیے ایک ہال تعمیر کرایا تھا۔ ایک اُردو اخبار موسومہ ''ہندستانی اخبار'' بھی نکالتے تھے اور ایک لائبریری بھی قایم کر دی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اُن کو پنڈت کشن پرشاد کول کا ایسا رفیق بھی مل گیا تھا۔ کول صاحب کی رہنمائی میں ٹرسٹ کے امور بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام پاتے تھے۔ لائبریری میں تمام جرائد اور اخبار آتے تھے اور ایک عظیم الشان ریڈنگ روم قایم تھا، ہر اچھی نئی کتاب خرید لی جاتی تھی۔ کول صاحب اسی عمارت میں زندگی بھر مقیم رہے اور گنگا پرشاد ورما کے انتقال کے بعد بھی سارا کاروبار انھیں کے منشا کے مطابق چلاتے رہے تھے۔ گنگا پرشاد ورما کے تعمیر کردہ ہال میں بڑے بڑے سیاسی اور غیر سیاسی اجتماعات ہوتے رہتے تھے اور اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں یہ عمل ایک بڑی نعمت ہے اور وسطِ شہر میں واقع ہونے کے سبب سے ہر اجتماع بہت کامیاب ہوتا ہے۔

گنگا پرشاد لائبریری کا اب بھی شہر کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہے لیکن پرانے صحائف و جرائد کی فائلیں وغیرہ اب موجود نہیں ہیں۔ سنا گیا تھا کہ کول صاحب نے اپنے دورِ کارکردگی میں اس سرمایہ کو لکھنؤ یونی ورسٹی کی لائبریری میں منتقل کر دیا تھا تاکہ طالبانِ علم اپنی تحقیق و تدقیق کے لیے حصول وسائل میں پریشان نہ ہوں اور دقت محسوس نہ کریں۔ مختصر یہ کہ اُردو زبان اور اُردو ادب کو ترقی دینے میں گنگا پرشاد ورما کا بھی ایک حصہ بلکہ بڑا حصہ تھا۔ آج بھی اُن کی میموریل لائبریری میں اُردو کتابوں کی معقول تعداد موجود ہے جن میں اکثریت بلند پایہ اور کارآمد تصانیف کی ہے اور یہ امتیاز کول صاحب مرحوم کی گراں قدر صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہے۔

# (۷) منشی نول کشور

تصانیف وتالیفات کی اشاعت علوم کی ترویج کا ذریعہ ہوتی ہے اور اشاعت کا بہترین وسیلہ طباعت ہے۔ یہ سچ ہے کہ طباعت کو فروغ ہونے کے بعد خطاطی کا فن ختم ہو گیا جو یقیناً ایک حسین اور گراں قدر فن تھا لیکن دنیا کی تیز رفتار ترقی کے دور میں علم وادب کی افادیت کو وسیع سے وسیع تر بنانے میں خطاطی زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ ایک اوسط درجے کے حجم والی کتاب کو خطِ نسخ یا خطِ نستعلیق میں لکھنے کے لیے کثیر وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مخطوطے حاصل کرنا ہر شخص کی مقدرت میں نہیں ہو سکتا تھا۔ مالی اعتبار سے خوش حال لوگ ہی اس شوق کو پورا کر سکتے تھے۔ مخطوطے اگر مطلا اور مذہب نہ ہوں تب بھی بہ اعتبار اپنی ریاضت ومشقت کے اُن کی اُجرت گراں ہی ہوتی تھی۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابوں کی اشاعت کے لیے کوئی ایسا بندوبست ہو کہ علم کا یہ خزینہ ہر خاص وعام کے دسترس میں آجائے۔

عہدِ قدیم میں ہر نئی ایجاد کو بادشاہ کی سرپرستی کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے عہد اور انھیں کی سرپرستی میں سب سے پہلا مطبع قایم ہوا تھا۔ اس مطبع کی ٹائپ کے حروف میں چھپی ہوئی کتاب موسومہ 'ہفت قلزم' ہندوستان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ یورپ میں مقبول ہوئی تھی۔ اُس کے بعد دوسرا مطبع ان کے فرزند اور جانشین نصیر الدین حیدر نے قایم کیا تھا۔ یہ ایک لیتھو پریس تھا جو ابتداً کانپور میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے چلایا تھا۔ نصیر الدین حیدر نے پریس خرید کر لکھنؤ منتقل کرا لیا اور اُس کے مالک کو ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ لیتھو پریس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے خطِ معکوس کی ایجاد ہوئی اور اس ایجاد کا شرف بھی لکھنؤ ہی کو حاصل ہے۔ مذکرہ بالا دونوں چھاپے خانے قایم ہو جانے کے بعد پھر اس کاروبار کو تجارتی شکل میں دوسرے لوگوں نے بھی اختیار کر لیا تھا جو وقت کے ساتھ پھولتا پھلتا رہا۔ ان مطابع میں بہت سے بہتر فن کار اور خوش نویس کام کرتے تھے، طباعت بہت دیدہ زیب ہوتی تھی، صنعت کاروں اور گل کاروں کے خوش نما نمونے پیش ہوتے تھے اور اس فن میں اتنی ترقی ہو گئی تھی کہ بعض چھپی ہوئی کتابیں بادی النظر میں مخطوطے معلوم ہوتی تھیں۔

شاہی دور کے آخر میں مطبع سلطانی بادشاہ کی ملکیت تھا۔ واجد علی شاہ بکثرت کتابوں اور مرثیوں کے مصنف تھے۔ اُن کی تصانیف اسی مطبع میں طبع ہوتی تھی فطری طور سے ان کتابوں

کی طباعت پر خاص توجہ ہوتی تھی جس کے نتیجے میں یہ فن کاریاں دوسروں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھیں۔ اسی دور میں شہر لکھنؤ نے طباعت کے بہتر سے بہتر شاہکار پیش کیے تھے۔ دست برد زمانہ سے جب زوال آنا شروع ہوا تو انیسویں صدی کے آخر تک طباعت کی بہت سی خوبیاں رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں خوش نویسی کا ذوق بھی گھٹتا گیا یہاں تک کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے فن کاروں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی اور اب اُردو طباعت کے سلسلہ میں کاتبوں کا مسئلہ مصنفین اور ناشرین کے لیے شدید ترین دردِ سر بن گیا ہے۔ دورِ آخر کی یادگار مطبع نول کشور کے یہاں بھی طباعت میں کتابت کی پہلی سی خوبی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مطبع اس لیے گراں قدر ہے کہ عہدِ قدیم میں اس ادارہ نے علوم و فنون کی جلیل القدر خدمات انجام دی تھیں۔ اُردو ادب خصوصیت کے ساتھ مطبع نول کشور کا اپنی اشاعت کے لیے مرہونِ منت ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ مطبع نول کشور کی سابقہ خدمات زرّیں حروف میں لکھے جانے کی مستحق ہیں۔ قریب قریب تمام مستند فارسی اساتذہ کے دیوان و کلیات اسی پریس سے شایع کیے تھے۔ اُردو کے ہر شاعر کا کلام اسی مطبع میں چھپتا تھا۔ نثر و نظم کے فارسی اور اُردو شاہکاروں کی اسی مرکز سے اشاعت ہوتی تھی۔ قرآن پاک کے بے حد خوب صورت اور دیدہ زیب نسخے نول کشور پریس نے فراہم کیے تھے۔ دینیات کی کتابیں اور اوراد و وظائف کی بیاضیں بھی اسی پریس سے مہیا ہوتی تھیں۔ میر انیسؔ کے مراثی کی پہلی چار جلدیں سب سے پہلے نول کشور پریس ہی میں چھپی تھیں۔ اس مطبع کے مالکان نے طباعت کی صحت اور خوش نویسی پر پوری توجہ رکھی تھی اور اسی مقصد کے حصول میں قابل ترین افراد کو طباعت کی نگرانی پر مامور رکھا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں نوبت رائے نظرؔ اور یاس عظیم آبادی ایسا جلیل القدر شاعر یہ خدمات انجام دیتے تھے اور آخری دور میں مرزا محمد عسکری ادیب کا ایسا بلند پایہ ادیب نگرانی کے فرائض پر مامور تھا۔ اتنے گراں قدر نگراں مقرر کرنے کی وجہ سے بلند پایہ کتابوں کی اشاعت بھی ہوا کرتی تھی اور اُردو میں تراجم بھی حاصل ہو جاتے تھے۔

مطبع نول کشور کے مالک بڑا اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے اور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور انشا پردازوں کے بڑے قدر داں تھے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ ۱۹۱۵ء کی قیامت خیز بارش میں جب ہر شہری مصیبت میں مبتلا تھا اور اسی زمانے میں نواب نوبت رائے نظرؔ نے یہ شعر کہا تھا ؎

لکھنؤ ہم پر فدا اور ہم فدائے لکھنؤ
کیا ہے طاقت آسماں کی جو چھڑائے لکھنؤ

تو مالکِ مطبع نے جو اودھ اخبار کے مالک بھی تھے اُن کو پچاس روپے اور ایک طلائی انگشتری ہدیتاً بھیجی تھی اور اودھ اخبار سے وابستہ کر لیا تھا۔

دورِ حاضر میں اس مطبع کو بھی مخالف طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فارسی زبان قریب بالکل فراموش ہو چکی ہے۔ اُردو اپنی بقا کے لیے شدید کش مکش میں مبتلا ہے۔ دینیات کی کتابوں اور عربی کی کتبِ درسیہ کا بازار بھی سرد ہے۔ تجارتی اعتبار سے یہ تمام حالات مطبع نول کشور کے حق میں مخالف ہی ہیں جن کا مقابلہ ہندی کتابوں کی اشاعت سے کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ مالی خسارہ نہ ہو لیکن ہمہ گیر خصوصیت جو اس پریس کو پہلے حاصل تھی اب یقیناً باقی نہیں رہی۔ ان نقصانات کے علاوہ پہلے کے مقابلے میں ایک اور نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ایک مطبع دو حصّوں میں تقسیم ہے اور تقسیم ہمیشہ مجموعی خوبی کو مجروح کر دیتی ہے۔ بہرحال پرانے قدر دانوں کو مطبع نول کشور کے نام ہی سے قلبی تعلق ہے اور اُن کی یہ تمنا ہے کہ یہ مطبع اپنی سابقہ روایات و افادیت پر بحال ہو جائے۔ ایسا ہونا ممکن بھی ہے کیوں کہ اس مطبع کی ایک تاریخ ہے اور اس کے سابقہ مہتم بالشان کارنامے دماغوں میں اب تک محفوظ ہیں۔ البتہ اس تمنا کا پورا ہونا صرف اسی حالت میں ممکن ہو سکے گا کہ اُردو کو اُس کا جائز حق پھر حاصل ہو جائے۔

آٹھواں باب

# ادبی اور ثقافتی اجتماعات

(۱) مشاعرے
(۲) صوفیائے کرام کے مزارات
(۳) مجالسِ مرثیہ خوانی

# (۱) مشاعرے

مملکتِ اودھ میں شجاع الدّولہ کے عہد ہی سے باکمال شعرا کی قدر دانی ہونے لگی تھی۔ آصف الدّولہ کے زمانہ تک قریب قریب تمام بلند پایہ شعرا دلّی سے لکھنؤ آگئے تھے۔ اِن میں میر تقی میرؔ اور مرزا رفیع سوداؔ کے ایسے استادانِ فن بھی یہیں کھنچ کر آئے اور اسی خاک کا پیوند ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام شعرا کے طرزِ فکر و بیان پر دلّی ہی کا رنگ غالب تھا۔ سید انشاؔ، مصحفیؔ، قتیلؔ، رنگینؔ اور جرأتؔ نے دلّی کے رنگِ سخن کو ایک موڑ فراہم کیا گو کہ اِن شعرا پر بھی دلّی کا مذاق حاوی تھا لیکن پھر بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھیں شعرا کے زمانہ سے لکھنؤ کا رنگ ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ اُن کے بعد وہ دور آیا، جس میں ناسخؔ نے زبان کو جلا بخشی اور آتشؔ نے شاعری کو شیرینی و چاشنی سے بہرہ مند کیا۔ حالات بدلتے رہے اور فطری طور پر حالات سے شاعری بھی متاثر ہوتی رہی۔ دربار اور دربار کے اثر سے سماج میں جتنی جتنی تعیش پرستی بڑھتی گئی اتنی ہی شاعری بھی بلندیِ فکر سے محروم ہو کر مائل بہ پستی ہوتی گئی تھی۔ وزیرؔ، رندؔ، امیرؔ، داغؔ اور جلالؔ وغیرہم کا کلام اسی دور کے سماج کا آئینہ دار ہے۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد جب ادبار آیا اور رفتہ رفتہ رجحانات و احساسات میں تبدیلی پیدا ہوئی تو شعرا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ رنگِ سخن میں انقلاب لانے کا خیال آیا تو یہ انقلاب انتہائی شاندار طریقہ سے آیا اور ملکتہ لکھنؤ میں ایک بلند پایہ فن نے جلوہ آرائی کی۔ یہ وہی زمانہ تھا جس کا تذکرہ ہم پیش کر رہے ہیں۔

شاعری کے رنگ میں انقلاب کا یہ تصوّر سب سے پہلے اودھ پنچ نے پیش کیا تھا۔ وہ اخبار طنز و مزاح کے رنگ میں شائع ہوتا تھا لیکن اس کی ظرافت صحت مند تھی اور اس کا مسلک سماج کی اصلاح کرنا تھا۔ چنانچہ اودھ پنچ کی اس تحریک کا حسب مراد خیر مقدم ہوا اور اُنیسویں صدی کے اختتام پر مولانا سید علی نقی صفیؔ نے جن کے دوستانہ روابط اودھ پنچ کے ایڈیٹر اور دوسرے مقالہ نگاروں سے تھے، ایک منظم ادارہ کی دائرۂ ادبیہ کے نام سے تشکیل کر دی۔ چونکہ قدیم تخییل اور زلف و گیسو کی شاعری سے دم الجھنے لگے تھے اس لئے تمام مشاہیرِ فن نے دائرہ کی رکنیت قبول کر لی۔ ان باکمال لوگوں میں منشی سجاد حسین ایڈیٹر

اودھ پنچ، شیخ ممتاز حسین عثمانی، مرزا محمد ہادی رسوا، پیارے صاحب رشید، مرزا کاظم حسین محشر اور مقبول حسین ظریف کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہی حضرات صفِ اول میں تھے اور صفی اس تحریک کی روحِ رواں تھے۔ اس وقت سے شستگی اور پاکیزگی زبان اور بلندیِ فکر و ندرتِ خیال پر زور دیا جانے لگا۔ چونکہ قریب قریب تمام مشاہیر دائرۂ ادبیہ میں شامل تھے اور جو عملاً شریک نہیں تھے انھوں نے بھی اس تحریک کو پسند کیا تھا اس لیے اس اقدام کو کامیاب بنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مشاعرے بھی اسی رنگ میں ہونے لگے اور دائرہ کی جانب سے نیز اودھ پنچ کے کالموں میں تبلیغ و ترویج کا سلسلہ تیزی کے ساتھ شروع ہو گیا۔

صفی نے اپنے چھوٹے بھائی مقبول حسین ظریف کے ذمہ یہ فریضہ عائد کر دیا تھا کہ وہ اودھ پنچ کے طرز پر ظریفانہ رنگ میں غزلیں کہا کریں جو قدیم تخئیل کو دور کرنے اور جدید رنگِ تغزل کو تقویت پہنچانے میں ممد و معاون ہوں۔ ظریف خود بھی اپنے رنگ میں بہت اچھا کہتے تھے اس پر سونے پر سہاگہ وہ اصلاحیں ہوتی تھیں جو صفی ان کے اشعار پر جب دیا کرتے تھے۔ یہ غزلیں جب مشاعروں میں پڑھی جاتی تھیں تو اُن کے پائندہ اثرات دماغوں پر پڑنا لازمی ہو جاتا تھا۔ ظریف کے چند اشعار نموناً پیش کیے جاتے ہیں:

| | |
|---|---|
| داغ کے درہم و دینار بھرے ہیں جس میں | دل وہ کیوں کر ہو اصراف کی تھیلی نہ ہوا |
| وہ ہو کیسا ہی دُبلا تارِ بستر ہو نہیں سکتا | غلط ہر آدمی اس طرح لاغر ہو نہیں سکتا |
| خیالِ ہجر میں فرضی مریضِ غم کا مرجانا | یہ سب کیا ہے سلامت جھوٹ کے پُل سے اتر جانا |
| کوشش ہو اٹھانے کی تو کیونکر نہ اٹھے گا | تُھکے نہیں ہیں آپ جو خنجر نہ اٹھے گا |
| زلف کی شست میں پھنس جانے سے معلوم ہوا | دلِ بیتاب نہ ہوگا کوئی مچھلی ہوگا |
| عجائب گھر ہے باغِ حُسن بھی اک قسم کا گویا | کہ دو ٹانگوں کا ہے جس میں صنوبر دیکھتے جاؤ |
| مجھے منظور پیمائش ہے طولِ شامِ ہجراں کی | بتاؤں گر کہیں سے آنت جو مل جائے شیطاں کی |

ادھر مشاعروں میں اصلاحات کا یہ سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف دائرۂ ادبیہ میں زبان و بیان کی خوبیوں یا سقم کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ جو اساتذہ مشاعروں میں میرِ مجلس ہوتے تھے وہی دائرہ کے روحِ رواں تھے اس لیے ان کے فیصلے فی الفور اور بآسانی نافذ ہو جاتے تھے۔ ان مشاعروں کے انعقاد کے لیے ایک انجمن موسومہ معیارِ ادب کی تشکیل کر لی گئی تھی۔ اس کے بھی مولانا صفی بانی تھے اور ہمیشہ صدر منتخب ہوتے رہے تھے اس دو طرفہ جد و جہد کا بہت اچھا اثر پڑا تھا جس

کی وضاحت کے لیے جوش ملیح آبادی کی ایک غزل کا مقطع درج ذیل ہے۔ جوش کے ابتدائی کلام میں یہ غزل شامل ہے۔ انھوں نے قدیم رنگِ تغزل سے تعبیر کیا تھا۔

کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام — وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

یہ مشاعرے ہر ماہ انجمن معیارِ ادب کے ہر متقدر رکن کے یہاں یا اس کی جانب سے کسی دوسرے مقام پر باری باری ہوا کرتے تھے۔ نشست کا انتظام کسی بڑے ہال میں یا کسی انتہائی پُرتکلف شامیانے میں جو کسی مخصوص غرض سے نصب کرایا جاتا ہوتا تھا۔ مشاعرے بعد نمازِ مغرب شروع ہوتے تھے اور نمازِ صبح کے قبل ختم ہو جاتے تھے۔ یہ التزام رہتا تھا کہ ہر شاعر کو اپنا کلام سنانے کا موقع مل جائے۔ شاعروں کو رات ہی کا وقت پسند خاطر ہوتا تھا لیکن دورِ آخر میں پرنس باقر علی خاں نے ایک بڑا مشاعرہ اپنے یہاں دن کو منعقد کیا تھا۔ پرنس موصوف خاندانِ شاہی کی ایک گراں قدر فرد تھے اور ان کی املاک ڈیوڑھی آغا میر اسٹیشن کے قریب چوک کے راستہ پر چڑھائی کے بائیں جانب واقع تھی۔ اُن کو شعر و سخن سے ذوق تھا اور مشاہیرِ فن سے دوستانہ روابط تھے اس لیے ان کی خاطر ہر ایک کو عزیز تھی۔ اس مشاعرہ کے علاوہ ایک یادگار شعری نشست دن کے وقت اس زمانے میں اور ہوئی تھی لیکن یہ دو شبانہ روز کا مسلسل مشاعرہ تھا جو تحسین گنج میں حامد علی خاں بیرسٹر کے یہاں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کی طرح "دل سے" "بسمل سے" تھی۔ ثاقب کی غزل حاصلِ مشاعرہ تھی۔ تین اشعار درج ذیل ہیں۔

کسی کا رنج دیکھوں ہو نہیں سکتا مرے دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے

چل اے ہمدم ذرا بزمِ طرب کا ساز بھی سن لے
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اُٹھ جائیں گے محفل سے

نہ سمجھا معنیِ گور و کفن سمجھا تو یہ سمجھا
تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامانِ منزل سے

بزمِ مشاعرہ میں شعرا آمنے سامنے نیز داہنے اور بائیں مقابل صفوں میں بیٹھتے تھے۔ درمیانی جگہ خالی رہتی تھی۔ نشست میں باقی جگہ سامعین سے پُر ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ مقامِ مشاعرہ سامعین کی کثرت سے ناکافی ہو جاتا اور باہر تک مجمع لگا رہتا تھا۔ تہذیب و آدابِ محفل میں یہ ضروری تھا کہ جو شاعر جس جگہ آکر اور جس مخصوص طرز سے ایک بار بیٹھ جاتا

وہ اسی طرح رات بھر بیٹھا رہتا تھا۔ زانو اور پہلو بدلنا عیب میں داخل تھا۔ ہر مشاعرہ طرحی ہوتا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ طرح دیتا تھا۔ انجمن معیارِ ادب کے ابتدائی دور میں مرزا غالب کی زمینوں میں طرح دی جاتی تھیں اور انھیں کے قوافی پر طبع آزمائی ہوتی تھی۔ مشاعرہ بانیٔ بزم کی طرحی غزل سے شروع ہوتا اور اختتام بھی اسی کے چند اشعار پر ہو جاتا تھا۔ بانیٔ مشاعرہ طرحی غزل سُنانے کے بعد اپنے آگے کی شمع داہنے جانب کے شاعر کے آگے بڑھا دیتا تھا۔ اسی طرح ہر شاعر غزل سُنا کر دوسرے کے آگے شمع بڑھاتا رہتا تھا یہاں تک کہ شمعدان میں جلتی ہوئی شمع پھر اسی منزل تک آجاتی جہاں سے وہ چلائی گئی تھی اب صبح کے آثار نمودار ہو جاتے تھے اور مشاعرہ ختم ہو جاتا تھا۔ عند الضرورت شمعدان بدلنے کا بھی انتظام رہتا تھا۔

اس دور کے مشاعرے لکھنؤ کے آداب وتہذیب اور ثقافت وتکلفات کی جیتی جاگتی تصویریں ہوا کرتے تھے۔ نومشق اور نوجوان شمع آنے کا بے قراری سے انتظار کرتے اور باری آنے پر فی الفور غزل سُنانا شروع کر دیتے تھے۔ معمر اساتذہ غزل پڑھنے میں طرح طرح کے عذر کرتے تھے۔ کوئی خرابیٔ صحت تو کوئی گلو گرفتگی کا شکوہ کرتا۔ کوئی یہ کہہ کر معذرت کرتا کہ عدیم الفرصتی کے باعث یا دوسری پریشانیوں کی سبب سے سُنانے کے قابل غزل تیار نہیں ہو سکی۔ ادھر سے عذرات پیش ہوتے تو سامعین اور دیگر شعرا اصرار کا طومار باندھ دیتے تھے۔ بالآخر غزل سنائی جاتی تھی۔ پڑھنے کا انداز بھی اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ تحت اللفظ کے اس طرز میں اگر آج مشاعروں میں کوئی غزل پڑھی جائے تو شاعر کی جان کو سیٹیوں اور بھبتیوں کی گونج میں ایک عتاب جھیلنا پڑے گا۔ کسی شاعر کے الفاظ میں ٹھہراؤ تو کسی کے لہجے میں کٹاؤ ہوتا تھا۔ محشر مرحوم الفاظ اور فقروں کو توڑ توڑ کے اور ٹھہر ٹھہر کے پڑھتے تھے۔ بعض شعرا زبان سے الفاظ ادا کرنے میں تلفظ اور صوتِ حروف کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ بعض میں یہ ہنر تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے رنگ اور چہرے کے چڑھاؤ اُتار سے سامعین پر شعر کا مفہوم واضح کر دیتے تھے۔ حکیم فدا احمد دانش اس ہنر میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ثاقب کا نرالا انداز تھا۔ اُن کی آواز میں فطری گداز تھا اور اُن کا چہرہ ہمیشہ غمگین نظر آتا تھا۔ اس لیے اُن کے پڑھنے اور رونے میں امتیاز مشکل تھا۔ غنائیت سے بہر حال کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ مولانا صفی کی وہ واحد ذات تھی جو لحن میں غزل پڑھتے تھے لیکن پھر بھی اُن کے پڑھنے کا وہی اسلوب تھا جو خود انھوں نے اپنے حسب ذیل شعر میں واضح کر دیا تھا۔

یہ حسنِ صوت گو مرغوب ہے طرزِ غزل خوانی
نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک مغنّی نکتہ داں مجھکو

اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ باوجود "حُسنِ صوت" اور لحن کے یہ ضروری نہ تھا کہ اُن کے ہر شعر کی داد دی جا تعریف بھی ہوتی ہو۔ شاعر اگر ہنرمند تھے تو اس دور کے سامعین بھی نکتہ داں تھے۔ حقیقی توصیف اور رسمی تعریف کا فرق سرِ مشاعرہ ہی واضح ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی نو کار اور نوجوان غزل گو مشاعرے سے پوری پوری دادِ سخن وصول کر لیا کرتے تھے۔

اشعار کی تعریف کرنا بھی اخلاقیات میں داخل تھا۔ اساتذہ اس فریضہ کو اپنے اپنے حسبِ مراتب ادا کرتے تھے۔ شاگرد اپنے استاد کے ہر ہر شعر کی تعریف کرتے تھے لیکن اصل تعریف وہی سمجھی جاتی تھی جس کی آوازیں سامعین کی صفوں سے بلند ہوتی تھیں۔ جس کا جو شعر پسند کیا جاتا وہ بار بار پڑھوایا جاتا اور دل کھول کر دادِ سخن دی جاتی تھی۔ جس استاد کی غزل میں زیادہ اشعار کی تعریف ہوتی تھی امروہے کے بارے میں یہ اصطلاح رائج تھی کہ فلاں فلاں شاعر نے "مشاعرہ لوٹ لیا۔" غزل کے اشعار کی تعداد کا غیر رسمی طور پر تعین ہو جاتا تھا۔ شعرا کی تعداد زیادہ ہوتی تو زیادہ سے زیادہ نو اشعار کی غزل پڑھی جاتی تھی ورنہ گیارہ اشعار تک اوسط درجہ کی غزل کے لیے کافی سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح جس شاعر کے چار پانچ اشعار بھی بلند پایہ قرار پاجاتے اسی کے سر مشاعرہ لوٹنے کا سہرا بندھ جاتا تھا۔ سخن شناس مجمع کی تحسین و آفریں پر شعرا کے لیے اظہارِ شکر و امتنان بھی ضروری تھا۔ چنانچہ یہ لوگ برابر آداب و تسلیمات بجالایا کرتے تھے۔ اساتذہ کی زیادہ تعریف ہوتی تھی۔ وہ لوگ انتہائی پُر وقار انداز میں اپنی ہیچ مداتی کا اظہار کرتے تھے۔ "میں کس قابل ہوں"، "آپ کی ذرہ نوازی ہے"۔ قدردانی کا جواب کچھ ایسے ہی فقروں میں دیا جاتا تھا۔ ایک بزرگ جناب کلیمؔ تھے۔ وہ اچھے شاعر تھے لیکن ان کا ہر انداز "اپنی آپ مثال تھا۔ صورت و شکل میں وہ کسی قدر کریہہ منظر تھے۔ اُن کے سیاہ رنگ، پستہ قامت گٹھے جسم، پھولے ہوئے گالوں اور اُن کی گول گول آنکھوں کا تمسخر کرتے ہوئے اُن کے بے تکلف دوست اُن کو بھینس کا انڈا کہا کرتے تھے۔ یہ لقب کس خصوصیت کی بنا پر دیا گیا تھا اس کا کوئی پتہ راقم کو کبھی نہیں چل سکا۔ بہر حال اُن کا مشاعروں میں یہ طرز رہا کرتا تھا کہ وہ جذبات میں ڈوب کر شعر پڑھتے اور فوراً پیچھے کی طرف پلٹ جاتے تھے۔ اس اثنا میں تعریفیں ہوتی تھیں پھر وہ اسی تیزی سے لوٹ کر اور جھوم جھوم کر تحسین و آفریں کا ہر ہر سمت علیحدہ علیحدہ الفاظ میں شکریہ ادا کرتے تھے۔ "تسلیم"۔

"تسلیمات"۔ "آداب" "کورنش" "نوازش"۔ "مجرا عرض ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اسی نعرہائے تحسین اور اظہارِ تشکر کے دوران کچھ فقرہ بازیاں بھی ہو جایا کرتی تھیں اور سامعین کی صفوں میں کبھی کبھی قہقہوں کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں لیکن اساتذہ اور مشاہیرِ فن ہمیشہ منہ پر رومال رکھ کر ہلکا تبسم فرما لیتے تھے۔

ہر مشاعرے کے بعد تمام غزلوں کا ایک گلدستہ شائع ہوتا تھا لیکن کسی کی کوئی غزل سلسلہ وار پیش نہیں کی جاتی تھی۔ اشعار کی ترتیب قافیہ وار ہوتی تھی اور ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان شاعر کا تخلص درج رہتا تھا تاکہ پڑھنے والوں کو موازنہ کرنے میں آسانی رہے۔ یہ گلدستہ ارکانِ انجمن کو بلا قیمت نذر کیا جاتا تھا باقی جلدیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی تھیں۔ سامعینِ مشاعرہ اپنی اپنی پسند کے اشعار یاد کر لیتے تھے یا لکھ لیا کرتے تھے۔ اُن کی وساطت سے نیز گلدستہ کی مدد سے شہر بھر میں ایک مشاعرے کے بعد سے دوسرے مشاعرے تک اشعار پر مذاکرے اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔ تعریف و توصیف ہوتی تھی، نکتہ چینیاں ہوتی تھیں اور تنقید و تبصرے بھی ہوا کرتے تھے۔ وارد کردہ اعتراضات شاگردوں کی وساطت سے یا کسی نہ کسی اور ذریعہ سے شعرا اور اساتذہ کے گوش گزار ہو جاتے تھے۔ پھر اُن کے جوابات اور صفائیاں بھی کسی نہ کسی وسیلے سے بازار میں آجاتی تھیں۔ اُس زمانے میں لکھنؤ کے در و دیوار شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسی بحثیں بہت ہوا کرتی تھیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ زبان کی نکھار اور خیال کی نزاکت میں یہ مذاکرے بہت کار آمد تھے۔ اس طرح ان مشاعروں کو زبان و بیان کی خوبیوں کے حق میں درسگاہ کہنا صحیح ہوگا۔

اسی سلسلہ میں وہ ہنگامہ آرائیاں بھی قابلِ ذکر ہیں جو ۱۹۱۱ء کے بعد ظہور پذیر ہوئی تھیں جب یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی عظیم آباد سے آکر لکھنؤ میں بس گئے تھے۔ وہ یقیناً ایک بلند پایہ شاعر تھے اور شعریت میں ڈوب کر بڑے دلکش لہجہ میں غزل پڑھتے تھے۔ اُن کو مشاعروں میں بہت جلد شرفِ قبول حاصل ہو گیا تھا لیکن وہ یہاں کے مسلّم الثبوت اساتذہ سے میل نہیں کھا سکے۔ ان کو یہ زعم تھا کہ وہ سب سے بہتر اور برتر شاعر تھے مگر یہاں کے اساتذہ اُن کے بیرونی ہونے کی وجہ سے اُن کو ان کا جائز مقام دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس احساس سے اس میں بد دلی پیدا ہوئی جس نے اُن کے مغلوب الغضب ہونے کے سبب سے مجادلہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ صلح مندی، آشتی اور حسنِ تدبیر سے کام لینے کے بجائے انھوں نے وہ لب و

ہجو اختیار کیا اور ایسی بدزبانیاں کیں جن کو لکھنؤ کی شائستگی و تہذیب کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نبرد آزمائی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ چونکہ یہاں کے اساتذہ پیرو میر و غالب تھے، یاس نے آتش کو سراہا، اپنے کو آتش پرست قرار دیا اور اسی کے ساتھ غالب منقصت اور توہین کو اپنا شعار بنا لیا۔ یہاں کے تمام سربرآوردہ شعرا کو "غلبچیون" کا لقب بخش دیا۔ یہ مجادلہ اسی منزل پر ختم نہیں ہوا بلکہ ایک ایک استاد کو علیحدہ علیحدہ صلواتیں سنائیں اور سب کو اپنا مخالف بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دوستوں نے بھی ایک ایک کر کے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا اور جو چھوٹا اس کو انھوں نے فوراً تیرِ ملامت کا نشانہ بنایا۔ بیخود مرحوم سے پہلے بہت گہرے دوستانہ تعلقات تھے پھر اُن کو بھی "حرصی ٹٹو" اور "میاں ٹھینگا" کے خطابات عطا ہوئے۔ اساتذہ میں سب سے زیادہ تر بزرگ و محترم مولانا صفی تھے۔ ان کی شان میں یہ کلمات استعمال ہوئے: "ایک تو وہ ہیں جن کا جوبن تو ڈھل چکا ہے مگر جیتون کی خونخواری جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔" پھر بھی یہ تہذیب یادگار رہے گی کہ یاس کی ان بدزبانیوں اور ان کے ان مجادلوں کا کبھی کوئی خراب اثر کسی مشاعرہ پر نہیں پڑا۔ یہ ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہیں لیکن مشاعروں میں یاس کو اُن کے حسب دلخواہ نہ سہی مگر ان کے ہر اچھے شعر پر برابر داد ملتی رہی تھی۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مشاعرہ میں یاس نے حسب ذیل مطلع پڑھا تھا تو مولانا صفی نے بلند آواز سے فرمایا تھا "پھر ارشاد ہو"

مزا گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے ــــ بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

اُن کے سر تھی بہر حال اپنے "استاد یگانہ" ہونے کا اتنا شدید سودا تھا کہ وہ ایسی ہلکی پھلکی تعریفوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ مشاعروں میں اساتذہ کے شاگرد تعریفوں سے چھتیں اڑا دیتے تھے مگر ان کو یہ فضیلت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی اس لیے اُن کی مایوسیوں کی کوئی انتہا باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے نتیجہ میں اُن کی بدزبانی بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ انھوں نے عزیز لکھنوی کی ہجو میں ایک رسالہ شائع کر دیا جس کی مکافات ان کو بہت سخت بھگتنا پڑی۔ مطبع نول کشور کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بیروزگاری کے عالم میں لکھنؤ چھوڑنا پڑا جس کا ان کو بہت دکھ ہوا۔ انھوں نے خود بھی بہت دکھ اٹھائے اور یہاں کے مشاعروں کی رونق بھی کم ہو گئی مگر اُن کے طنطنہ میں فرق نہ آیا۔ باہر سے بھی وہ مجادلہ برقرار رکھے رہتے تھے۔ ایک مدت کے بعد وہ پھر واپس آئے لیکن یہ وہ وقت تھا جب لکھنؤ کی بساطِ شعر و ادب پر شکن ہو چکی تھی اور یہاں

کی مسندِ وقار و تہذیب لٹ چکی تھی اس مرتبہ ان کو بعض نازیبا حرکتوں کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں لیکن لکھنؤ والوں سے خفا رہتے ہوئے بھی اُن کو یہیں کی خاک کا پیوند ہونا تھا اور وہی ہو کر رہا۔

بیسویں صدی کے اوائل ہی میں انجمن معیارِ ادب کے ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور اُن شعرا کی تعداد برابر بڑھتی ہی رہی۔ صفِ اول کے شعرا میں صفیؔ، ثاقبؔ، محشرؔ، آرزوؔ، ظریفؔ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آہستہ آہستہ بیخودؔ، عزیزؔ، اثرؔ، دانشؔ، اخترؔ ہاتفؔ، چکبستؔ، نوبت رائے نظرؔ، کلیمؔ، سراجؔ، منظرؔ، حکیم آشفتہؔ، ملاؔ، قدیرؔ وغیرہم کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان میں ہر ایک کے شاگرد بھی تھے۔ فطری طور پر بدمزگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ انجمن معیارِ ادب پہلے ہی خانہ جنگی کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کے بعد کئی انجمنیں بیک وقت اور کچھ یکے بعد دیگرے معرضِ وجود میں آئیں اور فنا ہوتی گئیں۔ بالآخر ایک انجمن جس نے کچھ مدت تک استقامت کا مظاہرہ کیا انجمن معراج الادب تھی۔ انجمن معیارِ ادب کے سر بر آوردہ اراکین اس انجمن میں شریک تھے لیکن جب لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت نے اس صدی کی تیسری دہائی میں دم توڑا تو یہ انجمن بھی ختم ہو گئی اور اسی کے ساتھ قدیم مشاعروں کی بہاروں پر بھی خزاں آ گئی۔ اس انجمن کا آخری مشاعرہ محلہ چاندی خانہ متصل جوبلی کالج نواب سید محمد کے یہاں ہوا تھا۔ طے ہو چکا تھا کہ وہ آخری مشاعرہ ہے اس لیے ساری محفل پر افسردگی طاری تھی۔ رات بھر گرمیٔ محفل کسی نہ کسی طرح برقرار رہی لیکن آخر وقت جب شمع حکیم فدا احمد دانش کے آگے پہنچی تو انھوں نے ایسا مطلع پڑھ دیا کہ انجمن جائے غم میں تبدیل ہو گئی۔ انجمن کا آخری مشاعرہ پڑھنے والا آخری شاعر اور وہ بھی ضعیف العمر اور نابینا تھا۔ ان تمام حالات کے پیشِ نظر ان کا یہ مطلع تمام حاضرین کو رُلا گیا تھا۔

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو نہ میخانے کو
آخری دور ہے بھر دے کوئی پیمانے کو

## (۲) صوفیائے کرام کے مزارات

تصوف کی تعریف میں کبھی کوئی معینہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ علما نے اپنے اپنے مخصوص مقام پر تصوف کی کسی مخصوص صفت کو بیان کر کے کوئی نہ کوئی تعریف پیش کی ہے، لیکن ایسی

ہر تعریف ویسی ہی مبہم اور نامکمل ہے جیسی اربابِ مذہب "خدا" کی تعریف فرمادیا کرتے ہیں جس کی غالباً یہ وجہ ہے کہ "خدا" اور "تصوّف" دونوں کی جامع ومانع تعریف الفاظ کی حدود سے باہر ہے۔ اس لیے ہم بھی صرف اسی بیان پر اکتفا کرتے ہیں کہ تصوّف وہ مسلک ہے جو بندے کو خالق سے واصل کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ اپنے خالق کی پرستش کرنا انسان کی فطرت میں داخل تھا، جس تمنا کی تکمیل وحصول کے لیے اُس نے طرح طرح سے عبادتیں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں میں تصوّف کا رجحان کسی نہ کسی نہج سے برابر ظاہر ہوتا رہا ہے اور اُس کے ظاہری اثرات بھی نمودار ہوتے رہے ہیں۔ اسلام سب سے آخر میں آیا تھا اور اس مذہب نے انسان کو جینے کے لیے ایک مکمّل درسِ حیات دیا تھا۔ اسی لیے خدا پرست مسلمانوں میں تصوّف کا رجحان بھی بڑی شدّت سے اُبھرا اور اس منزل میں بڑے بڑے اربابِ بصیرت پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے فیض سے بزمِ ہستی کو روشن کیا اور بنی نوعِ انسان کی راہِ حق میں رہنمائی فرمائی تھی۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں تصوّف کا رجحان بھی اُسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب اسلام ایک منضبط دین کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ صوفیائے کرام کے قریب قریب سب ہی طبقے حضرت علی کو شیخِ طریقت مانتے ہیں۔ جیسا کہ آسی غازی پوری نے فرمایا ہے ؎

چار یارانِ نبی میں آسی　　نسبت مجھے ہر یار کی ہے
طلبِ راہِ خدا میں لیکن　　پیروی حیدرِ کرار کی ہے

ایران میں ایک ایسا دور بھی گزرا تھا جب تصوّف وہاں اپنے بھرپور شباب تک پہنچ کر زندگی کے متعدد شعبوں پر حاوی ہو گیا تھا، بڑے بڑے اربابِ بصیرت پیدا ہوئے اور انھوں نے بنی نوعِ انسان کو درسِ معرفت دیا۔ ان خدا پرستوں نے اپنا پیام زیادہ تر نظم ہی میں سنایا تھا کیوں کہ نثر کے مقابلہ میں نظم ہی زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس طرح ایک طرف تصوّف کی ترویج ہوئی تو دوسری جانب فارسی شاعری میں نکھار آیا اور وہ اتنے بلند مقام پر پہنچی کہ اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اُن بلند پایہ صوفی شعرا کا دور حکیم سنائی سے شروع ہو کر سعدی و حافظ تک ختم ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں اوحدی، عطار، عراقی، اور مولانا روم کے ایسے باکمال فلسفی، حکیم اور صوفی شاعر پیدا ہوتے تھے جن کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان بزرگوں نے شرافت و انسانیت کی تلقین کی، اخوت ومحبّت کا درس دیا اور بندوں کو راہِ حق کی طرف پوری طاقت سے متوجہ کیا۔ لیکن صفوی دورِ اقتدار نے سیاسیات کے آستانے پر تصوّف کی قربانی پیش کردی

جس کے نتیجہ میں صوفیوں کو جلاوطنی کے صعوبات جھیلنا پڑے۔ ان لوگوں کے مسلک میں فقر و فاقہ کی ریاضت داخل تھی اس لیے بلا تکلّف ہجرت پر آمادہ ہو گئے اور بہت سے اکابرین ہندستان چلے آئے۔ اُن کے مسلک اور اہلِ ہنود کے طریقِ ریاضت میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، اُن کی تعلیم اور اُپنشد کے مقدّس اصولوں میں یگانگت تھی اور اس ملک کے قدیم باشندے متواضع بھی تھے اس لیے ایران کے جلاوطن صوفی آسانی کے ساتھ یہاں اس طرح بسے کہ یہیں کے ہو رہے۔ انھوں نے مختلف مقامات پر سکونت اختیار کی، بیعت کرنے والوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور رفتہ رفتہ اُن کا حلقۂ اثر وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ چنانچہ لکھنؤ بھی اُن کے فیضِ تربیت سے بارِیاب ہوا۔ راقم اس موضوع پر وضاحت و تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کرنے کا اہل اور مجاز نہیں ہے۔ پھر بھی دیوہ شریف کے حاجی وارث علی شاہ کا عقیدت کیش اور اُن کے برادرِ نسبتی خادم علی شاہ عرف دادا میاں کا جن کا مزار مبارک راقم کے مکان کے قریب کرسچین کالج میں واقع ہے، ارادت مند ہوتے ہوئے جن دوسرے صوفیا کے مزارات پر حاضری کا شرف ہوا تھا، نھیں کے تذکرے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ غالباً اتنا ہی بیان موضوعِ سخن کے لیے کافی ہوگا۔

لکھنؤ میں سب سے زیادہ قدیم مزار غالباً حضرت ابراہیم چشتی کا ہے جس کی کنکروں سے بنی ہوئی عمارت اُس کی پارینہ عظمتوں کی اب بھی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ یہ بزرگ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے عزیزِ قریب تھے اور غالباً اکبر بادشاہ کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے۔ اسی قبیلہ کے ایک اور بزرگ شیخ عبدالرحمن چشتی بہت بعد میں غالباً اودھ کے حکمران غازی الدین حیدر کے زمانہ میں آئے تھے۔ آپ نے ابتداً سات یا آٹھ برس تک شاہ میناشاہ صاحب کے مزارِ مبارک کی مجاوری کی تھی اور اُس کے بعد محلہ باورچی ٹولہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ صوفیا جہاں انتقال فرماتے تھے اسی مقام پر مدفون بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کا مزار محلہ باورچی ٹولہ میں تعمیر ہے۔ یہ عمارات ایک وسیع رقبہ میں ایک بڑی چہار دیواری سے گھری ہوئی ہیں اور اندر بہت سی قبور شاہ عبدالرحمن کے خلفا کی بھی ہیں۔

حضرت شاہ میناشاہ صاحب اپنے دادا حضرت شاہ قیام الدین عباسی المعروف بہ حاجی الحرمین کے ہمراہ تشریف لائے تھے اور قدیم مچھی بھون کے قریب اقامت فرمائی تھی۔ شاہ قیام الدین کے مریدین بڑی کثیر تعداد میں تھے۔ انھیں میں ایک بزرگ بڑے مرتبہ پر فائز ہو کر مخدوم شیخ سارنگ کے لقب سے معروف ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قوم کے ٹھاکر اور فیروز شاہ تغلق کے برادرِ نسبتی تھے۔

اُن کا مزار مجگاواں شریف تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی میں آج بھی مرجع انام ہے۔ اُن کی فضیلت اور مراتب کے بارے میں اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ شاہ میناشاہ صاحب کو انھیں کی بیعت حاصل تھی۔ شاہ میناشاہ صاحب کے مزارِ مبارک کو شہر بھر میں تمام دوسرے مزارات کے مقابلہ میں زیادہ مرجعیت حاصل ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیوں کہ شاہ میناشاہ کے کشف و کرامات کا تذکرہ الفاظ میں ناممکن ہے۔ اُن کے مریدیں بے شمار تھے اور اُن کی بیعت کرنے والے بھی بڑے بڑے رُتبوں کے مالک تھے اُن کے مزار مبارک کی خاک عقیدت مندوں کے لیے سُرمۂ بینش کا کام دیتی ہے۔

میڈیکل کالج کے قریب شاہ صاحب کا مزار ہے جس کے متصل انھیں کے نام سے موسوم سڑک واقع ہے۔ آپ کے دادا صاحب کا مزار قریب ہی حدودِ میڈیکل کالج میں جاکر تعمیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ میناصاحب کی وفات پر ملا جامی نے قطعۂ تاریخ کہا تھا۔ اعدادِ تاریخِ وفات حسب ذیل شعر سے نکلتے ہیں ؎

ہر کہ خواہد چشمِ دل بیناشود      سرمۂ خاک درِ میناشود

۸۸۴ھ

انھیں بہت پرانے آنے والوں میں سید قیام الدین مرحوم المعروف بہ شاہ لکھمن پیر بھی تھے جن کے مبلغ علم کا تو پتہ نہیں چل سکا لیکن اُن کے مزار کو اب تک بڑی مرجعیت حاصل رہتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ سپہ سالار مسعود غازیؒ کے ہمراہ آئے تھے اور بالآخر لکھنؤ آباد فرمایا تھا۔ غالباً ۵۲۵ھ میں وفات ہوئی تھی۔ آپ کا مزار چار باغ ریلوے اسٹیشن کی حدود میں واقع ہے۔ ہر سال عرس کے موقع پر کئی روز تک ہزاروں کی تعداد میں دور دور سے عقیدت مند حاضر ہو کر نذرانہ عقیدت مزارات پر پھول نچھاور کرتے ہیں۔ یہی ہمہ گیری اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ شاہ لکھمن پیر بڑے برگزیدہ بزرگ تھے۔

انھیں بہت پرانے آنے والے صوفیائے کرام میں ایک جلیل المرتبت شخصیت حضرت شاہ پیر محمد کی تھی۔ بعض مورخین کی رائے میں وہ حضرت شاہ میناشاہ صاحب کے ہمعصر تھے لیکن راقم کی تحقیق کے بموجب وہ منڈیاؤں ضلع جون پور سے ۱۰۸۶ھ میں وارد لکھنؤ ہو کر دریائے گومتی سے متصل خاص لچھمن ٹیلے پر سکونت اختیار کی تھی۔ اس ٹیلے کے بارے میں بعض معتقدات افسانوی حیثیت کے مالک ہیں۔ اس مقام پر اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اب وہ مقام شاہ

پیر محمد کا ٹیلا کہلاتا ہے اور وہ غار جس کے بارے میں طرح طرح کی روایتیں مشہور تھیں موجود بھی نہیں ہے۔ آپ کی قیام گاہ سے متصل اورنگ زیب نے، جب وہ خود یہاں آیا تھا، ایک عمدہ خوب صورت اور مضبوط مسجد تعمیر کرادی تھی جو ٹیلے والی مسجد کے نام سے مشہور اور آباد ہے۔ شاہ صاحب کا مزار مبارک بھی ٹیلے کے اوپر عقیدت مندوں کے لیے باعثِ نزولِ برکاتِ الٰہی ہے۔

صوفیائے کرام ہی کی صف میں کچھ ایسے خود فراموش اور فنا فی اللہ بزرگ بھی تھے جن کو اُن کے حواس گم کردہ خصوصیات و عادات کی بنا پر مجذوب کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیوں کہ وہ اپنی ہستی کو جیتے جی یادِ الٰہی میں جذب کر چکے تھے۔ اُن کو اپنے تن من کا ہوش ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ایسے ہی خدا شناسوں میں ایک بزرگ حضرت شاہ دوست محمد المعروف بہ شاہ دوسی علیہ الرحمہ تھے۔ آپ آپ نے پرانی بانس منڈی واقعہ محلہ ڈالی گنج میں قیام فرمایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ہی نے اپنے حلقۂ اقامت میں ایک باغ نصب کرالیا تھا جہاں وہ بلا تکلف اور ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر شاہدِ حقیقی کے جلوہ کا نظارہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے یہاں حاضر ہونے والوں میں شیخ عبدالرزاق بانسوی بھی تھے جو تشریف لا کر اُسی باغ میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ شیخ عبدالرزاق بانسوی خود بھی ایک بہت گراں قدر اور بلند پایہ صوفی تھے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ شاہ دوسی علیہ الرحمہ خانوادہ فرنگی محل کے ایک گراں قدر فرد تھے۔ فرنگی محل کے علما کا مسلک تصوّف تھا اور اُن کے مورثِ اعلیٰ شاہ نظام الدین جلیل المنزلت صوفی تھے۔ یہ قیاس آرائی اگر صحیح ہے تو شاہ دوسی علیہ الرحمہ بھی سہالی ضلع بارہ بنکی سے آکر لکھنؤ میں آباد ہوئے ہوں گے کیوں کہ علمائے فرنگی محل کا وطن مالوف سہالی ہی تھا۔ بہر حال اس مزارِ مبارک سے حضرات فرنگی محل کی وابستگی ہے اور وہی علما ہر سال اس مزار پر عُرس کیا کرتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور برگزیدہ، جلیل القدر اور خدا پرست ہستی کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کی زیارت کا شرف راقم کو بھی حاصل ہوا تھا۔ یہ ذات گرامی مولانا الحاج شاہ عین القضاۃ مرحوم کی تھی۔ آپ سے بکثرت لوگوں کو بیعت تھی اور آپ کے خلفا میں گجرات کے شیخ موسیٰ ترکیری بڑی فضیلت و کرامت کے مالک تھے۔ آپ حیدر آباد سے تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں تشریف لائے تھے اور اُس گلی میں جو اصغر علی محمد علی تاجر عطر کے کارخانے سے متصل ہے اور چوک کو وکٹوریہ اسٹریٹ سے ملحق کرتی ہے اقامت فرماتے تھے۔ یہاں آپ نے ایک مدرسہ موسومہ مدرسہ فرقانیہ قایم فرمایا تھا جہاں آپ درس و تدریس کے علاوہ طلبا کو قرآن و تفسیر قرآن کی تعلیم دیا

کرتے تھے۔ طلبا کے ساتھ شفقتِ پدری سے پیش آتے تھے اور ان کی حسبِ ضرورت کفالت بھی فرماتے تھے۔ مریدین اور معتقدین نیز عوام سے ملاقاتیں بھی کرتے تھے لیکن اُس کے لیے اوقات معین تھے اور یہ کاروبار بھی مسجد ہی کی حدود میں ہوا کرتا تھا۔ رسولِ اسلام کی تاریخ ولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو میلاد کرتے تھے اور پورے شہر کی عام دعوت ہوا کرتی تھی۔ بے حد متواضع اور بہت زیادہ غریب پرور تھے لیکن کبھی کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُن کے اتنے کثیر اخراجات کس طرح پورے ہوتے تھے۔ روسا و عمائدین سے نقد یا جنس کسی شکل میں بھی تحائف قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے یہ مشہور تھا کہ اُن کو دستِ غیب کی اعانت حاصل تھی۔ آپ کی وفات کا واقعہ بھی محیّر العقول ہے۔ آپ کے مریدین خاص میں ایک بزرگ حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر نے اپنی تصنیف موسومہ مصباح المشائخ میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے۔

۲ رجب المرجب ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء روز چہار شنبہ درمیان عصر و مغرب آپ اپنی جگہ پر حسبِ معمول بغرضِ ملاقات عام تشریف فرما تھے اور ایک ایرانی عالم مذہب شیعہ امامیہ جن کا نام اسد اللہ نجفی تھا، معہ اپنے ایک ہمراہی ملاقات کے لیے آئے۔ مولانا نے اُن کو سائل سمجھ کر بیٹھنے کے لیے اشارہ فرمایا۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم اہلِ علم ہیں اور آپ بھی عالم ہیں، بغرضِ ملاقات حاضر ہوئے ہیں، تب مولانا نے اپنے قریب بلا لیا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ آپ اب بھی درس دیتے ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ ہمارے دل و دماغ کمزور ہو گئے ہیں۔ اب ہم پڑھانے کے قابل نہیں رہے۔ پھر مولانا نے اُن کا مکان اور وطن پوچھا۔ انھوں نے نجف اشرف بتلایا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ تارک الدنیا ہیں اس لیے آپ کی زیارت کا شوق تھا۔ مولانا ترکِ دنیا دنیا کے لیے مذموم ہے لیکن مولانا آپ کے لیے ممدوح ہے جیسا کہ امیر فرماتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اُن اشعار کا کچھ حصہ پڑھا جس کو محمد بن علی بن شہید زندانی نے اپنی کتاب مناقب آل ابی طالب میں نقل کیا ہے۔ (جلد ثانی صفحہ ۳۰، مطبوعہ مصر) جس کو حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ نیز کتاب امالی مطبوعہ طہران صفحہ ۵۰ شیخ ابو جعفر الصدیق سے، جو معتبر ترین کتب امامیہ میں سے ہے، تفسیر صوت ناقوس میں بوضاحت درج کی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ آپ نے ایک نصرانی کو ناقوس بجاتے ہوئے سنا تو فرمایا کہ یہ ناقوس دنیا کی خرابیاں بیان کرتا ہے اور یوں کہتا ہے۔ پھر اُس آواز کی الفاظ میں تفسیر فرمائی۔ جو چند اشعار سید اسد اللہ صاحب نجفی نے عربی لہجہ میں خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر مولانا کو سنائے تھے، جن سے مذمت و ترغیبِ ترکِ دنیا

و شوقِ عقبیٰ پیدا ہوتا تھا اور جن سے حیات بعد الممات کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں مع ترجمہ درج ذیل ہیں۔

لا الٰہ الا اللہ حقاً حقاً اصدقاً اصدقاً — لولا حلم کنا نشقی جداً جداً اصدقاً اصدقاً

خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں حق اور صحیح ہے — اگر وہ حلیم نہ ہوتا تو ہم سب کی تشفی نہ ہوتی ٹھیک اور سچ ہے

اِنَّ المولیٰ یسئل عنا و یوقفنا و تحاسبنا — یا مولانا این الدنیا مھلاً مھملاً

یقیناً مولا ہم سے سوال کرے گا نیکی کی بابت محاسبہ کرے گا — اے مولا دنیا دار مھمل ہے مھمل ہے

فاین یوم یمضی عنا الّا وھو منقصنا — قد ضیعنا دار البقی واستوطنا دار الفنا

کوئی دن ایسا گزرتا ہے جس میں ہماری کمی نہیں ہوتی — بے شک تم نے ہمیشگی کے گھر کو ضائع کیا اور فنا کے گھر کو وطن بنایا

کلاً صوتی   کلاً صوتی — کلاً دفنا   کلاً موتی

ہر شخص کو ضرور مرنا ہے — اور ہر شخص کو فوت ہونا اور دفن ہونا ہے

اس کے بعد حکیم صاحب اُن تاثرات کا حال بیان کرتے ہیں جو مولانا ئے مغفور پر طاری ہوتے تھے اور بالآخر اُن کی وفات کا باعث ہوئے۔ کہتے ہیں کہ پہلے شعر کو سن کر عالم تحیر میں ڈوبے۔ دوسرے شعر کے بعد چہرہ پر تغیر نمودار ہوا، سرخی پر زردی دوڑ گئی۔ تیسرے شعر پر ایرانی عالم کو بغور دیکھا، تنفس تیز ہو گیا۔ چوتھے شعر کے بعد آسمان کو دیکھا اور سربسجود ہو گئے۔ چند منٹ گزرے تھے کہ ایک ہچکی کے ساتھ آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

صوفیائے کرام کے ان تمام مزارات پر اُن کے مخصوص یومِ وفات پر اُن کا عرس برابر ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے۔ یہ تقریبات عموماً تین روز تک جاری رہتی ہیں۔ معتقدین و مریدین قرآن خوانی، فاتحہ خوانی اور چادر چڑھانے کی رسموں میں شرکت کر کے ثوابِ دارین حاصل کرتے ہیں اور ایک مجمع قوالی کے شوق میں جمع ہو جاتا ہے۔ لیکن پہلی سی گرمیٔ محفل اب نہیں ہوتی۔ نہ پہلے سے فن کار، موسیقار ہیں اور نہ وہ آرائش و زیبائش کے ساز و سامان میسر آتے ہیں جو دورِ قدیم میں بہ آسانی فراہم ہو جاتے تھے۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ تقریباً ساٹھ برس قبل ماہِ ذیقعد میں جب شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے مزار پر پہلی بار اُن کے عرس میں شرکت کا شرف حاصل ہوا تھا تو مختلف رنگوں کی چھوٹی بڑی شمعوں کی جھاڑوں، فانوسوں اور قندیلوں میں روشنی بڑی دیدہ زیب تھی، عنبر و عود کی لپٹیں دماغ کو معطر کرتی اور دل کو خنکی بخشتی تھیں۔ ایسے پاکیزہ، باصفا اور معطر ماحول میں بہترین موسیقاروں کی فن کاریاں دماغ و دل کو مسحور کر لینے کے لیے ضرورت سے زیادہ کافی تھیں۔

اُس محفل میں بیٹھ کر اختتام سے پہلے اُٹھ آنا بڑے جبرِ نفس کا کام ہوتا تھا۔ صوفیا کے مسلک میں سماع جائز ہے لیکن یہ موسیقی ہمیشہ قوّالی کے طرز تک محدود رہی ہے۔ قوّالی میں حمد و نعت و منقبت پر مشتمل غزلیں گائی جاتی ہیں۔ عہدِ قدیم میں فارسی غزلوں کا زیادہ رواج تھا اور اس زبان کے قدرداں بھی کثرت سے موجود تھے۔ چشتی مرحوم کے مزار پر جس عرس کا تذکرہ پیش کیا جارہا ہے اُس میں ایک بلند پایہ قوّال نے امیر خسروؒ کی وہ غزل گائی تھی جس کی ردیف " جائے کہ من بودم " تھی۔ اس غزل کی دل پزیری اور موسیقار کی فن کاری نے احساساتِ دل و دماغ کو جتنا متاثر کیا تھا اس کی یاد بڑی حد تک برقرار ہے۔ اور اُس کو سوچ کر یہ اندازہ کر لینا دشوار نہیں ہوتا کہ ایسی محفلوں میں سننے والوں کو کیسے اور کیوں کر حال آتے اور آسکتے تھے۔ راقم کو اتنا تو یاد آتا ہے کہ موسیقار کی زبان سے جو الفاظ نکلتے وہ تیر کی طرح کلیجے میں چبھ جاتے تھے اور اُس فن کار کے بتانے پر جو جذبات دل میں امنڈتے وہ معاً دماغ کے اُفق پر چھا جاتے تھے۔ قوالی دماغ و دل دونوں کو متاثر کرتی تھی۔

حضرت شاہ مینا شاہ صاحب کے مزار پر اکیس لغایۃ تئیس صفر برابر عرس ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے جن میں بے شمار مرتبہ شرکت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اُن اجتماعات کے حالات کا تصوّر قایم کرنے کے لیے متذکرہ بالا تذکرہ کافی ہے۔ البتہ یہ عرض کرنا ہے کہ اس مزار کی ایک یہ بھی خصوصیت رہی ہے کہ یہاں ہر قمری ماہ کی پہلی جمعرات کو بھی جسے عرفِ عام میں نوچندی جمعرات کہتے ہیں، بڑے پُر بہار اجتماعات ہوا کرتے تھے۔ شاہ مینا شاہ صاحب کے مریدین نہ صرف لکھنؤ بلکہ بیرون جات میں بھی کثیر تعداد میں تھے۔ اس مزار کی زیارت کے لیے عام دنوں میں بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ نوچندی جمعرات کو سہ پہر ہی سے مشتاقانِ زیارت کا مجمع لگ جاتا تھا۔ کوئی اپنی منّت اُتارتا تو کوئی دوسرے مراسمِ عقیدت مندی ادا کرتا تھا۔ قوّالی کا سلسلہ رات کو دیر تک جاری رہا کرتا تھا۔ شہر کی قریب قریب ہر طوائف شام کو اس دربار میں حاضر ہو کر سرِ نیاز خم کرتی تھی اور اُن میں کی ہر فن کار تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی لیکن قوّالی گا کر بزمِ سماع کو ضرور گرم کر جاتی تھی۔ کبھی کبھی دوسرے مقامات کے موسیقار بھی اپنی عقیدت کے پھول مزار پر نچھاور کرنے کے لیے آجاتے تھے جن کی وجہ سے رونق بزم دوبالا ہو جاتی تھی۔ حسن و جمال کے پرستاروں اور شعر و نغمہ کے شیدائیوں کی زیادتی کے سبب سے اس مزار پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے۔ فن کاروں کو بھی اپنی ہنرمندی کی داد ملتی تھی جس کی وجہ سے قوّالی کا فن بڑی ترقی پر تھا۔ عرس کے دنوں کا کیا ذکر ہر نوچندی

جمعرات کو مزار مبارک پر حاضر ہونے والوں کا ایک مہذب اور شائستہ میلہ لگ جاتا تھا۔ حدودِ عماراتِ مزار سے باہر سڑک پر پھلوں، میووں، پکوانوں، مٹھائیوں، کھلونوں اور دوسری مختلف چیزوں کی بے شمار چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہر نوچندی جمعرات کو لگ جاتی تھیں۔ یہ دوکاندار دوپہر دن سے دو پہر رات گئے تک اپنا اپنا سامان فروخت کرکے خوش و مطمئن واپس چلے جاتے تھے۔ اس طرح اس مقدس مقام کو شہر کی گراں قدر ثقافت میں ایک عظیم المرتبت شرف حاصل تھا۔ شہر کے باہر سے آنے والوں کو اس اجتماع میں ہماری روایتی تہذیب و شرافت اور ہمارے قدیم اخلاقیات و جمالیات کے عدیم المثال جوہر پرکھنے کے مواقع حاصل ہوتے تھے۔ جو لوگ تقدس و ورع سے بے نیاز یہاں آتے تھے وہ بھی پاکیزگی و طہارت کا کچھ نہ کچھ احساس لے کر واپس ہوتے تھے۔ لکھنؤ والوں میں اکثریت کو اس مزار سے والہانہ عقیدت تھی اور وہ اس مقدس مقام کو دنیوی و اُخروی فلاح کا سہارا تسلیم کرکے یہاں آتے منّتیں مانتے اور دعائیں مانگتے تھے۔ ان مناجاتوں کو شرفِ قبول حاصل ہو یا نہ ہو ارادت مندی میں کمی نہیں ہوتی تھی لیکن اب عقیدت کوشی مجروح ہے۔ زمانہ اتنا بدل چکا ہے کہ ماضی کی یاد بھی اب افسانہ بن گئی ہے۔

ان خداشناس بزرگوں میں آخری نمودار و نامدار صوفی مولانا الحاج عین القضاۃ کی وفات ۱۹۲۵ء میں واقع ہوئی تھی۔ اس طرح یہ ثابت ہے کہ کم از کم اُس وقت تک ہمارا شہر صوفیائے کرام کی برکتوں سے فیضیاب تھا۔ یہی ایک امر فرمانروایانِ اودھ اور اہالیانِ لکھنؤ کی وسیع النظری اور بلند فکری کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایران میں صفوی حکومت نے جب تصوف کو خلافِ شریعت قرار دیا تھا تو اُس کا اثر یہ ہوا تھا کہ وہاں کی سرزمین صوفیائے کرام کے مقدس قدموں کی نعمت سے آہستہ آہستہ محروم ہوتی گئی تھی اور پھر وہاں سعدی و حافظ کا کوئی مثل و نظیر پیدا نہیں ہوا۔ اودھ میں بھی وہی تاریخ آصف الدولہ کے عہد میں دُہرائی گئی تھی۔ اُس زمانہ میں شیعیت کو دربار کا مذہب قرار دیا گیا تھا اور بعد ازاں مجتہد اعظم نے یہ فتویٰ بھی صادر فرمایا تھا کہ تصوف کا مسلک شرعاً ناجائز ہے۔ اس فتوے کا کیا اثر ہوا اس کا تو کوئی پتہ نہیں چلتا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ یہاں سے نہ کسی صوفی نے ہجرت کی اور نہ کسی صوفی کی آمد پر پابندی عائد ہوئی۔ جتنے بزرگانِ دین موجود تھے اور جو بعد میں آتے گئے اُن سب کی تبلیغ و ترویج کا سلسلہ بغیر کسی مزاحمت کے اور پوری آزادی کے ساتھ برابر جاری رہا تھا۔ صوفیائے کرام خواص و

عوام کی ذہنیت کو برابر متاثر کرتے رہے تھے جس کے نتیجہ میں خدا پرستی کے جذبہ کو تقویت پہنچتی تھی اور اسی وجدانی ارتقا کی بدولت اردو شاعری کو بھی فروغ حاصل ہوا تھا۔ تصوف نے ایران میں بھی شاعری کو نکھار بخشا تھا وہی شرف لکھنؤ میں بھی ہماری زبان کو حاصل ہوا۔ اور قدیم لکھنؤ کی ثقافت کے ختم ہونے تک برقرار رہا تھا۔ یہ اثرات اسی وقت سے پڑنا شروع ہو گئے تھے جب دربار پر شریعت و اجتہاد کا پورا پورا تسلط ہو چکا تھا۔ اس مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ اس دور میں جو بلند پایہ شعرا تصوف سے زیادہ متاثر ہوئے اُن میں اکثریت ایسے شاعروں کی تھی جو عقیدتاً شیعہ تھے۔ اس ذیل میں سب سے پہلا نام اپنی پوری تابانی سمیت خواجہ حیدر علی آتش کا زبان پر بے ساختہ آجاتا ہے، جن کے کلام میں تصوف کے مسلک کی بھرپور ترجمانی اور ترویج ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش کے خاندان میں کئی پشتوں سے پیری و مریدی کا سلسلہ تھا۔ یہ بزرگ صوفی منش اور فقیر مشرب تھے۔ آتش اپنے ماحول و وراثت سے پوری طرح متاثر ہوئے تھے اور اُن کا سارا کردار اور رہن سہن اُسی مسلک کا تابع تھا۔ آزاد نے اپنی تالیف 'آبِ حیات' میں اُن کی بود و باش کا تذکرہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ "ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کیے تھے بوریا بچھا رہتا تھا، اسی پر ایک لنگ باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے اور عمر چند روزہ کو اس طرح گزار دیا جیسے کوئی بے نیاز و بے پروا فقیر تکیہ میں بیٹھا ہوتا ہے۔" ترکِ دنیا اور صبر و قناعت کے مسلک کا عامل دوسروں کو بھی یہی درس دے سکتا تھا۔ چنانچہ خواجہ آتش کے کلام کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انھوں نے طرح طرح سے ترکِ دنیا، فقر و فاقہ اور صبر و قناعت کی تلقین فرمائی تھی۔ کہتے ہیں ؎

طلب دنیا کو کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیالِ آبرو ہے ہمتِ مردانہ آتا ہے

آتش نے ایک دوسرے مقام پر بھی اسی خیال کو اپنے میرِ شریعت اور پیرِ طریقت حضرت علی کو یاد کر کے اس طرح فرمایا ہے ؎

یہ ترک کردہ ہے شہِ مرداں سے پیر کی
دنیا کا خواستگار جو ہے زن مرید ہے

آتش نے ان تمام منازل سے گزر کر اُن کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے ؎

فقر کے کوچہ میں قدرِ دولتِ دنیا نہیں
ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس سے پتھر سیکڑوں

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشاہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے

تصوف کے منازل و مدارج اور اُس کے طریق و مراتب بیان کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے موضوعِ سخن سے عقائد اور فلسفیانہ بحثیں بھی غیر متعلق ہیں۔ جو کچھ بالاجمال سطور بالا میں عرض کیا گیا وہ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے تھا کہ اودھ کے حکمرانوں نے تصوف پر کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی اور اُن کے دورِ اقتدار میں اس مسلک کی برابر ترویج ہوتی رہی تھی اور فارسی کی طرح اُردو شاعری بھی اس تبلیغ کا وسیلہ تھی۔ آتش کا سنِ وفات ۱۲۶۳ ہجری بتایا جاتا ہے۔ اسی سال امجد علی شاہ نے انتقال فرمایا تھا اور جانِ عالم واجد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے۔ کچھ ہی مدّت میں دربار کی عیش پرستی نے خواص و عوام کی طرح اُردو شاعری کو بھی متاثر کر دیا تھا۔ شاعروں کے پیشِ نظر وصل و ہجر کی داستانوں زلف و گیسو کی الجھنوں، عشق و محبت کے افسانوں یا الفاظ کی بندشوں اور محاورات کے صحیح و بلیغ استعمال کے علاوہ کوئی گراں پایہ اور عمیق و دقیق موضوع باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔ خیال و بیان کی اس پستی و زبوں حالی کے دور میں آتش کے نقشِ اول کے بعد پھر ایک مدّت تک کوئی نقشِ ثانی نہیں اُبھر سکا۔ پھر بھی صوفیا کی تعلیم نے اتنا گہرا اثر قایم کر دیا تھا کہ داغ کے ایسے معاملہ بند شاعر کے یہاں بھی بلند پایہ اشعار نظر آجاتے ہیں۔ مثال میں صرف ایک غزل کے دو اشعار درج ذیل ہیں ؎

کہاں کہاں دلِ مشتاقِ دید نے یہ کہا
وہ چمکی برقِ تجلّی وہ کوہِ طور آیا

الٰہی اشکِ مصیبت کی آبرو رکھنا
یہ بے کسی میں بُرے وقت پر ضرور آیا

بہر حال اُردو کو جب نشاۃ ثانیہ کی دولت نصیب ہوئی اور اس دور کے شاعروں نے میرؔ و

غالب کی پیروی کو اپنا شعار بنایا تو رنگِ تصوف کا عود کر آنا ناگزیر تھا۔ صوفیائے کرام تو نہ تھے لیکن اُن کا مسلک اُن کے مزارات کی طرح پائندہ و تابندہ تھا۔ میر ظاہر بظاہر صوفی تھے اور غالب اپنے بارے میں خود ہی یہ فرما گئے تھے ؎

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

شعرا لکھنؤ نے انھیں باوجود بادہ خوار ہونے کے ولی سمجھا اور اُن کی پیروی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ تصوف کا مسلک اُردو شاعری میں ایک بار پھر جگمگا اٹھا اور جدید طرزِ فکر و ادا نے اپنی ندرت سے اُس کے جوہر اور زیادہ نمایاں کر دیے۔

اِس دور کے شعرا میں ہر ایک نے اپنی بساط اور صلاحیت کے مطابق تصوف کے وجدان و عرفان کی خوشہ چینی کی تھی اور ہر ایک نے اس پاکیزہ مسلک کے طریقوں اور اصولوں کو اپنے اپنے ذوق کے تحت سراہا تھا۔ اِن لاتعداد تخلیقات کا چھوٹے سے چھوٹا تذکرہ بھی دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے برابر ہوگا۔ لیکن صرف اس لیے کہ یہ حصۂ بیان یک لخت خالی نہ رہ جائے چند سطور حاضر ہیں جو یقیناً نمونتاً بھی کافی متصور نہ ہوں گی۔ راقم کے ذہن و قلم کو بہر حال خوفِ طوالت دامن گیر ہے کیوں کہ اس تذکرے کا یہ باب اپنی طوالت کے باعث قارئین کرام کی فکر و نظر پر اب بھی بار ہو سکتا ہے۔ ان اساتذہ میں مولانا سید علی نقی صفیؔ اور مرزا محمد ہادی عزیزؔ بلند پایہ قصیدہ گو بھی تھے ان صاحبان نے یہ قصیدے نعت و منقبت میں نظم کیے تھے۔ اس طرح اُن کو تصوف کے مسائل بیان کرنے کے لیے دو میدان حاصل تھے اور یہ دوسرا میدان زیادہ وسیع تھا پھر بھی اُن کی غزلیات سے تین تین اشعار نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں جن میں رنگِ تصوف شوخی کے ساتھ نمایاں ہے مولانا صفیؔ فرماتے ہیں ؎

راہ ہے پست و بلند آہستہ چلیے گا کلیم
ایک جانب دشتِ ایمن ایک جانب طور ہے

بغل میں داب کے ناقوس اک اذاں کے لیے
چلا ہوں کعبہ پرستاریٔ بتاں کے لیے

ایک سجدہ سے غرض ہے وہ یہاں ہو یا وہاں
بت کدے چلیے در کعبہ اگر معمور ہے

عزیزؔ لکھنوی انھیں خیالات کی ترجمانی اس طرح فرماتے ہیں ؎

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی
آئینۂ حیات ہے تیرا فروغِ حسن
زندہ وہی ہے جو کہ ترا روشناس ہے
ہے وفورِ عشق میں دل اک طلسمِ بےخودی
خود خبر اپنی نہیں اس درجہ غافل ہو گیا

ان اشعار میں پھر بھی سیدھی باتیں سادے طرز میں کہی گئی ہیں۔ اب ندرتِ خیال کی دو گراں قدر مثالیں بھی نموناً پیش کی جاتی ہیں۔ تصوف میں پہلی اور دشوار گزار منزل "ترک" ہے یعنی یہ کہ تمام علائقِ دنیا سے اجتناب اور اسی کے ساتھ خود اپنی خواہشات اور لوازماتِ زندگی سے احتراز۔ پنڈت برج نرائن چکبست نے فرمایا ہے ؎

رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی ہے
اسی پر ختم ہے افسانۂ دردو الم میرا

اول الذکر فلسفہ میں آرزو کا وجود بہر حال برقرار رہتا ہے لیکن چکبست اس وجود ہی کو فنا کر دینے کے قائل ہیں۔

## (۳) مولود شریف

مسلمانانِ عالم کا بہترین سرمایۂ حیات پیغمبرِ اسلام سے عقیدت اور محبت ہے۔ ہر ملک کا ہر مسلمان اپنے رسول کا تعلیم کردہ کلمہ پڑھتا ہے۔ انھیں کا نام لے کر جیتا اور مرتا ہے۔ یہ ورد یوں تو ہر شبانہ روز متعدد بار ہوتا رہتا ہے لیکن آنحضرت صلعم کی تاریخِ ولادت پر خصوصیت سے ساتھ جذبات زیادہ حرکت میں آجاتے ہیں۔ مسلمانوں کی بد قسمتی سے اُن کے درمیان تاریخِ ولادت کے بارے میں بھی اتحاد و اتفاق نہیں ہے۔ شیعہ صاحبان کے نزدیک آپ کی ولادت با سعادت سترہ ۱۷ ربیع الاول کو ہوئی تھی، اس لیے اس جماعت کے افراد اسی روز عید میلاد نبی مناتے ہیں۔ شہر لکھنؤ میں اس روز امام باڑہ ناظم صاحب واقع وکٹوریہ اسٹریٹ میں بڑے پیمانے پر اجتماع ہوتا ہے۔ سیرِ رسول پر تقریریں ہوتی ہیں اور نعت پیغمبر میں نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ امام باڑہ بڑے تزک و احتشام سے ایک وقت میں آراستہ کیا جاتا تھا اور بڑے پیمانے پر روشنی ہوتی تھی۔ رات گئے تک

صلوٰۃ کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ پرانی رسمیں اب بھی ایک حد تک برقرار ہیں۔ لیکن یہ جشن بہت بڑے پیمانے پر مسلمانوں میں اکثریت والی جماعت پہلے بھی مناتی تھی اور اب بھی مناتی ہے۔ اُن کے عقیدہ کے بموجب ولادتِ رسول بارہ ربیع الاول کو ہوئی تھی لہٰذا بارہ تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعض مورّخین کے نزدیک حضور اکرم کی وفات بھی اُسی روز ہوئی تھی اس لیے اس مخصوص دن کو بارہ وفات کہا جاتا ہے لیکن عملاً اس تاریخ کو صرف جشنِ ولادت منایا جاتا تھا اور اب بھی منایا جاتا ہے۔

ربیع الاول کا مہینہ شروع ہوتے ہی عام مسلمانوں کے گھروں میں بارہویں تاریخ کے لیے ضیافتوں، مکان کی آرایش اور روشنی سے زیبایش کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ بارہ وفات کے دن خوش حال لوگوں کے یہاں انواع واقسام کے لذیذ کھانے پکتے تھے اور عزیزوں دوستوں اور محلے والوں کی سیر چشمی کے ساتھ دعوتیں ہوتی تھیں۔ مالی اعتبار سے کم حیثیت لوگ جو پلاؤ اور مزعفر پکوانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے زردہ ہی پر قناعت کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں بہت عمدہ چاول اور نفیس گھی، یہاں تک کہ زعفران کی ایسی چیزیں بھی بہت ارزاں تھیں۔ غریبوں کے زردہ میں بھی زعفران کا رنگ شامل کر دینا دشوار نہیں تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُس زمانہ کا غریبوں کے یہاں کا زردہ آج کل کے مزعفر سے بہتر ہوتا تھا۔ بہر حال امیر ہوں یا غریب اپنے مہمانوں کی سب ہی سیر چشمی سے تواضع کرتے تھے۔ بعض لوگوں کے یہاں نیازِ رسول کے نام پر دوستوں کو حصے بھیجنے کا بھی دستور تھا۔ ان حصّوں میں تعداد اشیا بہت کم ہوتی تھی مثلاً یہ کہ صرف پلاؤ یا پلاؤ اور مزعفر ہوتا تھا۔ پراٹھے اور حلوا بہت متبرک تحفہ سمجھا جاتا تھا اور ایسے حصوں کی تقسیم میں بہتات تھی۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۱۷ء میں پراٹھے اور حلوے کے حصص احباب کے یہاں سے اتنی تعداد میں آ گئے تھے کہ اُن کو تقسیم کر دینا پڑا تھا۔ ان حصص میں بہترین پراٹھے اور حلوا میرے بچپن کے دوست سید محمد حسین صاحب کے والد المحترم نے بھیجا تھا۔ وہ حلوا غالباً انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے اور بڑی محنت سے تیار کیا تھا جس کی لذت کبھی کبھی یاد آ جاتی ہے۔ سید محمد حسین صاحب اب بھی بحمد اللہ بقیدِ حیات ہیں، حاجی الحرمین ہیں، شہر کے کامیاب ترین وکیلوں میں اُن کا شمار ہے اور محلہ ڈالی گنج میں مقبرہ عالیہ کے قریب اُن کا مسکن ہے۔ اُن کے یہاں اب بھی بڑے تکلف اور اہتمام سے بارہویں ربیع الاول کو دوستوں کی ضیافت ہوتی ہے۔ البتہ یہ رسم پرستی اوروں کے یہاں قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔

بارہ وفات کے دن کو دوپہر ہی سے مکانوں کی آرایش و زیبایش ہونے لگتی تھی۔ رنگین کاغذ کے خوشنما کٹے ہوئے پھولوں میں ابرق کے ورق منسلک کر کے منقش زرین تاروں سے بنایا جاتا تھا۔ یہ ساز و سامان سفید پھولوں کی لڑیوں میں اس انداز سے جوڑا جاتا تھا کہ دور سے دیکھنے والوں کے لیے یہ آرایش بہت دلفریب محسوس ہوتی تھی۔ پھولوں کی یہ منقشی لڑیاں مکانوں کے دروازوں میں بھی سلیقہ سے لٹکائی جاتی تھی اور گلیوں کوچوں میں اُن کا سائبان تان دیا جاتا تھا۔ شام کے وقت لڑیوں میں کلیاں پھولتی تھیں تو گلی کوچے معطر ہو جاتے تھے اور راہگیروں کو خوشبوئیں مست کر دیتی تھیں۔ رات کو روشنی کی چکا چوند میں پھولوں کے سائبان اور زیادہ زیب ہو جاتے تھے۔ اُس وقت تک برقی روشنی سے ہماری آنکھیں آشنا نہیں ہوئی تھیں، اس لیے شمعوں کی روشنی دلوں میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کر دیتی تھیں۔ مختلف رنگوں کی چھوٹی چھوٹی شمعیں جلائی جاتی تھیں اور قندیلوں، لال ٹینوں میں مقابلتاً بڑی سفید شمعیں جن کو شمع کافوری کہتے تھے، روشن کی جاتی تھیں۔ چھوٹی شمعیں جھلملانے لگتی تھیں تو ماالک خانہ فی الفور دوسری شمعیں روشن کر دیتے تھے۔ جن علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی وہاں دور دور تک محلے بقعۂ نور بن جاتے تھے۔ برقی روشنی ایجاد ہونے کے بعد رنگینیوں نے سادہ اور تیز روشنی کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔ صاف گوئی کے لیے اگر معاف کر دیا جائے تو راقم یہ کہنے کی جسارت کرے گا کہ شمعوں کا چراغاں بہر حال بجلی کے بلبوں کی روشنی سے کہیں زیادہ آسودگی فراہم کرتا تھا۔ بہر حال زمانے نے جب قدریں بدل ڈالیں اور پرانا کلچر ملیا میٹ ہو گیا تو اب برقی روشنی ہی بڑی نعمت ہے اور ہنر منداس روشنی میں بھی رنگینی اور حسن و جمال پیدا کر لیتے ہیں جس کا مظاہرہ ہر سال بارہ وفات کی شام کو مختلف محلّوں میں ہوتا ہے۔

آرایش و زیبایش کا سیلاب اُن محلّوں میں اور زیادہ دیدنی ہوتا تھا جہاں شب میں مولود شریف عہدِ قدیم سے منعقد ہوتے آئے تھے۔ ان مقامات میں خصوصیت کے ساتھ محلہ جومیٹیاں، چوک اور سبزی منڈی قابلِ ذکر ہیں جہاں جہاں علیحدہ علیحدہ اوقات میں اجتماعات ہوا کرتے تھے۔ ان تینوں علاقوں میں دن بھر دعوتِ عام کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ عموماً تنہائی لنگر اور گرم گرم پلاؤ کھلایا جاتا تھا۔ آنے اور کھانے والوں کی تعداد بے حد و بے شمار ہوتی تھی۔ پھر بھی سبزی منڈی کی دعوت دوسرے مقامات سے کہیں زیادہ وافر اور وسیع ہوتی تھی۔ سبزی فروشوں کے حوصلوں کی بر یا فہم کو تعریف کرنا ہی پڑتی تھی۔ شام کو یہ علاقے دُلہن بنے نظر آتے تھے۔

رات کو بعد نماز عشا مولود شروع ہوجاتا تھا۔ مولود شریف کے ان تینوں قدیم اجتماعات کے علاوہ چوتھا مولود امین آباد کی نئی تعمیر کے معرض وجود میں آنے کے بعد امین آباد پارک میں منعقد ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اُسی وقت اس پارک کے تین جانب وسیع اور بلند و بالا عمارتیں ہوچکی تھیں۔

اور یہی دوکاندار اس مولود کے بانی تھے۔ امین آباد پارک اور اُس کے تین جانب والی سڑکیں بڑی نزاکت و نفاست سے آراستہ و پیراستہ کی جاتی ہیں۔ رات بھر مولود شریف میں خواندگی ہوتی اور ہر شریک ہونے والے کو شیرینی کا ایک پیکیٹ پیش کیا جاتا تھا۔ یہ شیرینی عام طور سے میٹھی بوندیاں ہوتی تھیں لیکن تقسیم کرنے والے یہ خیال رکھتے تھے کہ کوئی آنے والا تبرک سے محروم نہ رہ جائے۔ کچھ برسوں کے بعد یہ مولود شریف امین الدولہ پارک میں جو بعد کی تعمیر تھی، منتقل کر دیا گیا تھا یہ پارک مقابلتاً وسیع و عریض ہے اس لیے یہاں مجمع اندر ہی سما سکتا ہے۔ یہاں کی آرائش بھی ہمیشہ دیدنی رہی ہے۔

متقی، پرہیزگار اور متشرع حضرات کا کیا ذکر وہ لوگ بھی جو دن بھر آرائش و زیبائش کی مصروفیات میں منہمک رہتے اور شام کو چراغاں کی سیر و تفریح سے لذتیں حاصل کرتے تھے رات کو بعد نمازِ عشا بھرپور عقیدت مندی اور پورے خضوع و خشوع کے عالم میں محفل میلاد میں بیٹھ کر ہمہ تن گوش ہوجاتے تھے۔ خواندگی میں شعرا نعتِ رسول میں اپنی اپنی نظمیں سناتے اور سامعین سے دادِ سخن پاتے تھے، فضلا اور علما سیرِ رسول اور تعلیم اسلام پر تقریریں کرتے تھے۔ بعض ایسے خوش گفتار اور بلند پایہ مقرر بھی تھے جن کے بیان کو سن کر کبھی کبھی آدمیوں کا سمندر لہریں مارنے لگتا تھا۔ اس اجتماع میں بلا تفریقِ مذہب و ملت حاضرین شرکت کرتے تھے۔ ہر تقریر کرنے والا اس کا خیال رکھتا تھا کہ اُس کے کسی کلمے یا فقرے سے سامعین میں سے کسی کا دل آزردہ نہ ہو اور رسول کے اُسوۂ حسنہ کے تذکروں سے لوگ فیض حاصل کر کے اُٹھیں اور اپنی زندگی میں آپ کے کردار اور تعلیم سے سبق حاصل کریں۔ یہ مقصد بڑی حد تک پورا بھی ہوتا تھا، کئی کئی دن بعد ان اجتماعات کے تذکرے سننے اور مقررین کے ارشادات پر صحت مند تبصرے ہوتے تھے۔ نوجوان مسلمانوں کے کردار میں بڑی حد تک انھیں تقریروں سے اصلاح بھی ہوتی تھی میرے ایک کرم فرما سید علی بیگ مرحوم نے میرے ہمراہ سبزی منڈی کے میلاد میں شرکت کی تھی اور وہ فرنگی محل کے ایک عالمِ دین کی تقریر سے اتنا متاثر ہوئے تھے کہ اس کے بعد میرے علم و یقین میں مجبوری کے علاوہ اور کسی حالت میں کبھی کسی سائل کو نفی میں جواب نہیں دیا۔ کچھ نہ کچھ ہر مانگنے والے کو گلی کوچے میں راہ چلتے ہوئے

جو مل جاتا پیسہ دو پیسے ضرور دے دیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ اجتماعات دنیاوی اعتبار سے بھی بہت کارآمد تھے۔ رات بھر نظم و نثر میں خواندگی کے بعد آخر شب سلام پر خاتمہ ہوتا تھا۔ حاضرین رسول مقبول کی بارگاہ میں سلامِ عقیدت پیش کرتے اور ثوابِ دارین حاصل کرتے تھے۔

## (۴) نیمہ شعبان کا بجرا

عام مسلمانوں میں ماہِ شعبان کی چودھویں تاریخ کو برابر اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کی ابتدا کے بارے میں یہ افسانہ مشہور تھا کہ اکبر بادشاہ اپنی ملکہ جودھا بائی کو اپنے مرحوم بزرگوں کو کھانا دیتے ہوئے بہت متاثر ہوا تھا اور اُس نے اسلام میں بھی کوئی ایسی ہی رسم تلاش کرنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ ایک مقتدر وزیر اور معتمد مشیر نے شب برات کی بنیاد قایم کردی جو مسلمانوں میں ملک بھر کے اندر مقبول ہوگئی۔ چنانچہ لکھنؤ میں بھی اسی روز یعنی شعبان کی چودھویں تاریخ کو دن میں روٹی میٹھے اور پانی سے بھرے ہوئے گھڑے پر مرحوم آبا و اجداد کی فاتحہ کا چلن گھر گھر رائج ہوا بیسویں صدی کے اوائل میں شاید ہی کوئی گھر ہو جہاں بزرگوں کی فاتحہ نہ ہوتی ہو، جاہل طبقہ کے کچھ لوگ یہ بھی عقیدت رکھتے تھے کہ شب برات کے حلوے سے مرے ہوئے لوگ زندہ آدمیوں کی طرح آسودگی اور لذت حاصل کرتے تھے۔ یہ حلوا عزیزوں اور دوستوں میں تحفتاً بھی تقسیم ہوتا تھا۔ لکھنؤ کی نفاست و نزاکت شب برات کے حلوے میں بھی رنگینیاں پیدا کرادی تھیں۔ ردے کے علاوہ چنے کا بہترین خوش ذائقہ حلوا بھی بننے لگا تھا لیکن جہاں تک راقم کو علم ہو سکا مُردوں کی فاتحہ صرف ردے کے حلوے پر ہوتی تھی۔

دن کو فاتحہ کی تقریب ادا کرنے کے بعد جوق در جوق لوگ قبرستانوں میں شام کو جا کر اپنے بزرگوں کی قبروں پر روشنی کرتے اور فاتحہ پڑھتے تھے۔ اس شام کو قبروں پر روشنی تمام قبرستان کو منور کر دیتی تھی اور دیکھنے میں شمعوں کا یہ چراغاں بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ مُردوں کو حلوا کھلانے کی غیر دل خوش کن رسم میں آتش بازی چھڑانے کے چلن نے دلچسپیوں کا سامان فراہم کر دیا تھا۔ عام روایت یہ تھی کہ مُردوں کے آنے کی خوشی میں آتش بازی چھڑا کر چراغاں ہوتا ہے لیکن آتش بازی چھڑانا ہی بجائے خود ایک رنگین مشغلہ تھا۔ اُس زمانہ میں ہر گھر میں رات کو طرح طرح کی آتش بازی چھڑائی جاتی تھی۔ مہتابی جلائی جاتی تو اُس کی روشنی آنکھوں میں خنکی پیدا کرتی تھی۔ انار چھڑائے جاتے تو اُن کے پھول بلند ہو کر سرو کی تصویر پیش کرتے تھے۔ کسی وسیع صحن

والے مکان میں چھچھوندر داغی جاتی تو مستورات فرار ہو کر دالانوں میں پناہ لیتی تھیں۔ چھچھوندر جلتی ہوئے پورے صحن کی مسافت طے کرتی تھی۔ عورتوں کو یہ خوف پیدا ہو جاتا تھا کہ اُن کے پائجاموں کے بڑے بڑے اور چوڑے پائنچوں میں نہ داخل ہو جائے۔ غرض کہ سیکڑوں طرح کی آتش بازی ہوتی تھی اور اُس کے خریدنے والوں میں بلاتفریق مذہب و ملت سب ہی شامل تھے۔ برادرانِ ہنود بھی آتش بازی چھڑاتے تھے۔ البتہ گھروں میں بڑی آواز کے پٹاخے نہیں داغے جاتے تھے اور نہ کوئی ایسی چیز چھڑائی جاتی تھی جو انسان بالخصوص بچوں کے جسم کو اذیت پہنچا سکے۔ ایسے تیز آواز والے پٹاخے سڑکوں اور میدانوں میں داغے جاتے تھے یا بھرپوری طاقت کے ساتھ اور شب بھر دریا کے کنارے آفت برپا کیا کرتے تھے جہاں نیمہ شعبان کی عید منائی جاتی تھی اور نمازِ صبح کے وقت بجا آیا کرتا تھا۔ صرف وہی تھوڑا وقفہ ہوتا تھا جب مولانا سید محمد باقر مرحوم دو رکعت نمازِ فجر پڑھاتے تھے کہ یہ آوازیں رُک جاتی تھیں ورنہ طلوعِ آفتاب کے وقت تک دھما دھمی اور گھما گھمی برپا رہتی تھی۔

## (۵) مجالسِ مرثیہ خوانی

فی زمانہ پرانے طرز کی مجالسِ مرثیہ خوانی کا رواج بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے عام طور سے یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اجتماعات خالص مذہبی نوعیت کے رہے ہوں گے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ایسی مجلسیں ماہِ محرم بلکہ ایام عزا میں بھی شاذ و نادر ہوتی تھیں بلکہ اس کے برعکس غیر زمانہ میں بہت بڑے پیمانے پر منعقد ہوتی تھیں جن میں بلاتفریقِ مذہب و ملت شعر و سخن کے شیدائی جن کی اُس زمانہ میں بہتات تھی، فن کاریوں اور طرزِ خواندگی کی خوبیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ مرثیہ ابتداءً مذہبی عقیدہ کے تحت کہا اور سنا جاتا تھا۔ عربی اور فارسی کے مرثیے اسی نوعیت کے تھے۔ ملا مقبل کے مرثیے ہوں یا محتشم کا دوازدہ بند، ان سب کی غایت امام حسین کا غم تازہ کرنا تھا۔ عہدِ قدیم میں اُردو زبان میں جو مرثیے کہے گئے تھے وہ بھی اسی طرز کے تھے۔ سودا، دل گیر، مسکین، افسردہ وغیرہم کے مرثیے رونے اور رُلانے کے لیے کہے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ مرثیہ نے مسدس کی شکل اختیار کی اور خلیق و ضمیر نے اُس کو ایک موڑ دیا لیکن انیس اور ضمیر کے شاگرد دبیر نے صنفِ مرثیہ گوئی کو آسمانِ کمال پر پہنچایا۔ دبیر کے مرثیے شوکتِ الفاظ، بلند خیالی اور علمیت سے مالامال تھے اور انیس کے

یہاں زبان و بیان کے محاسن کے علاوہ کردار نگاری، منظر عکاسی اور انسانی جذبات کے عدیم المثال ترجمانی کے جوہر تاباں و درخشندہ تھے۔ لکھنؤ والے علم و ادب کے پرستار تھے۔ انھوں نے فی الفور انیس و دبیر کی قدردانی کی اور یہ دونوں اساتذہ دنیائے فن میں آفتاب و ماہتاب کی طرح ضو فگن ہوئے۔ پھر انھیں کی خواندگی والی مجالس ایک علمی و ادبی اکھاڑہ بن گئی تھیں جس کے نتیجہ میں ان دونوں بزرگوں کے قدرشناس دو ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے تھے جو 'انیسیے' اور 'دبیریے' کہلاتے تھے۔ اساتذہ کے اُٹھ جانے کے بعد تک یعنی بیسویں صدی کے اوائل تک یہ معرکے گرم رہا کرتے تھے۔

انیسیوں اور دبیریوں میں مابہ النزاع صرف یہی ایک مسئلہ تھا کہ انیس اور دبیر میں کون بہتر مرثیہ گو ہے۔ یہ ادبی بحث کبھی کبھی ایسے مجادلہ کی شکل اختیار کر لیتی تھی جو لکھنؤ کی تہذیب و متانت کے منافی ہو جایا کرتی تھی اور صلح پسند عناصر کو مداخلت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ایسی معرکہ آرائیاں عوام اور بازار ہی تک محدود نہیں تھیں۔ کبھی کبھی ایسے ناخوش گوار مظاہرے بلند پایہ مقامات پر بھی ہو جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک دل چسپ افسانہ حقیقت کی حد تک ۱۱-۱۹۱۰ء میں محلے محلے لوگوں کی زبان پر تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ معرکہ مفتی اعظم کے شریعت کدہ پر گرم ہو گیا تھا اور نبرد آزما حضرات باہم دگر دست و گریباں ہونے پر آمادہ تھے تب ایک محترم اور ثقہ بزرگ نے جو وہاں موجود تھے اور جن کے ہاتھ میں دیوانِ حافظ تھا یہ تجویز پیش کر کے فتنہ فرو کیا کہ لسان الغیب سے مشورہ کر کے اُسی کو قبول کر لیا جائے۔ اُس زمانہ میں فال دیکھنے کا عام رواج تھا اور دیوانِ حافظ سے فال دیکھنا خصوصیت کے ساتھ مرغوب تھا۔ چنانچہ برسرِ پیکار ٹولیوں نے اس تجویز کو منظور کیا اور متفقہ طور سے یہ طے پا گیا کہ پہلے مرزا دبیر کے بارے میں استصواب کیا جائے۔ ایسا ہی ہوا اور یہ شعر نکلا ؎

آں را کہ خواندی استاد گر بنگری بہ تحقیق
صنعت گریست امّا طبعِ رواں ندارد

پھر انیس کے بارے میں استفسار ہوا تو یہ شعر برآمد ہوا ؎

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد
دلِ رمیدۂ ما را انیس و مونس شد

انیسیے اُچھل پڑے اور کہنے لگے کہ ہم تو ایک ہی بھائی کی تعریف کرتے تھے مگر لسان الغیب نے

دونوں بھائیوں کی قدر دانی فرمادی۔

یہ روایت صحیح ہو یا غلط لیکن یہ حقیقت ہے کہ دونوں اشعار دیوانِ حافظ میں موجود ہیں اور جس گھر سے یہ واقعہ متعلق بتایا جاتا ہے وہاں سب انیسؔ کے ماننے والے تھے۔ مفتیؔ اعظم خود ہی انیسؔ کے مخلص اور گہرے دوستوں میں تھے۔ ایک مرتبہ کسی معاملہ کے بارے میں انھوں نے انیسؔ کو خط لکھا تھا جو اُن کی طبعِ نازک پر بہت گراں گزرا، انھوں نے اپنی پاکیزہ زبان میں جواب لکھا لیکن آخر میں یہ شعر تحریر فرمایا تھا ؎

مرنجان دلم را کہ ایں مرغ وحشی
زجائے کہ برخاست مشکل نشیند

مفتیؔ اعظم بہت متاثر ہوئے اور صفائی پیش کرتے ہوئے معذرت خواہی کی اور انیسؔ کی دل جوئی کے لیے یہ شعر بھی لکھا ؎

نہ مرغ وحشی تو اے جان انیسی
بہرِ دل کہ درآئی تو ام نشینی

ان دونوں واقعات سے خواہ اول الذکر روایت افسانہ ہی کیوں نہ ہو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اُس زمانہ میں عام طور سے ادبی مذاق و شعور بہت بلند تھا اور لوگوں کا کردار بھی اعلیٰ تھا۔ اس لیے مرثیہ کی جدید طرز کو جو لکھنؤ ہی کی ایجاد تھی یہاں کے لوگوں نے خوب خوب سراہا اور قدر دانی کی۔

میر انیسؔ مرحوم نے پہلے انتقال فرمایا تھا۔ اُن کی وفات کا قطعہ تاریخ مرزا دبیرؔ نے کہا تھا۔ مادۂ تاریخ کا مصرع تھا

طورِ سینا بے کلیم اللہ و ممبر بے انیسؔ

جو اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میر انیسؔ کے انتقال کے بعد اُن کے اخلاف میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے فنون تقریباً پچاس برسوں تک کامیابی کے ساتھ برقرار رہے تھے۔ پہلے خود انھیں کے صاحب زادے خورشید علی نفیسؔ نے اپنے والد بزرگوار کی یاد تازہ رکھی تھی اور اُن کی جانشینی کا حق ادا کیا تھا۔ نفیسؔ کے بعد اُن کے نواسے میر علی محمد عارفؔ اور اُن کے صاحبزادے دولہا صاحب اور انیسؔ کے پوتے عروجؔ نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے کمالات کا ہر نہج سے مظاہرہ کیا اور لوگوں کے دلوں سے انیسؔ و نفیسؔ کی یاد مٹنے نہیں دی۔ عارفؔ مرحوم نے

پہلے ۱۹۱۶ء میں انتقال فرمایا تھا۔ اُس کے بعد خانوادہ انیس کی ساری عظمت سمٹ کر دولہا صاحب کی ذاتِ گرامی میں جمع ہو گئی تھی۔ تقریباً چودہ برسوں کے بعد وہ بھی نہ رہے۔ عارف اور عروج کے صاحب زدگان نے مشقِ سخن جاری رکھی تھی اور اپنے تصنیف کردہ مرثیے پڑھا بھی کرتے تھے لیکن قدیم ثقافت کے ساتھ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی پر بھی زوال آگیا اور یہ فنون بھی رخصت ہو گئے۔" مرزا دبیر کے خاندان کی شمع اتنی مدت تک بھی نہیں جل سکی۔ اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوج اُن کے قایم مقام ہوئے اور اوج کی جانشینی کچھ مدت تک اُن کے ایک شاگرد خبیر مرحوم نے فرمائی تھی۔ خبیر کے بعد یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔

اسی مقام پر خانوادۂ انیس کے بعض دوسرے مرثیہ گو شعرا کا ذکر بھی ضروری ہے۔ میر انیس کے یہاں بزرگوں کے وقت سے مرثیہ گوئی کا چلن تھا۔ وہ خود تین بھائی تھے اور تینوں مرثیہ گو تھے۔ اُن کو اپنے سب سے چھوٹے بھائی میر نواب مونس سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ وہ اُن کو مثل اولاد کے سمجھتے اور اُن کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ اس سلسلے میں بعض دل چسپ واقعات مشہور تھے مثلاً یہ کہ ایک بار مونس مرثیہ لے کر قریب شام آئے اور یہ خواست کاری کی کہ انیس بنظرِ اصلاح ملاحظہ فرما لیں۔ وہ شام کا وقت تھا اور مونس کو وہ مرثیہ دوسرے روز پڑھنا تھا۔ انیس اُس وقت اپنے گھر میں حوض کی جگت پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے جلد جلد ورق گردانی کی اور پھر مرثیہ کو چاک کر کے حوض میں ڈبو دیا۔ مونس کا چہرہ فق ہو گیا۔ انیس نے یہ کہہ کر تشفی دی کہ پریشان کیوں ہوتے ہو، مرثیہ پھر تیار ہو جائے گا۔ چنانچہ دونوں بھائیوں نے نمازِ مغربین کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک نیا مرثیہ تصنیف کر لیا تھا جو پہلے سے بدرجہا بلند تھا۔ مختصر یہ کہ مونس خود بھی بہت اچھے مرثیہ گو تھے لیکن لاولد فوت ہوئے۔ تیسرے بھائی انس تھے جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ انیس اپنی آخر عمر میں اُن سے کچھ خفا ہو گئے تھے۔ بہر حال اپنے وقت میں انس کا بھی ایک مقام تھا اور اُن کے بعد اُن کے صاحب زادے وحید نے بھی نام پیدا کیا تھا۔ اسی طرح نفیس کے علاوہ میر انیس کے دو صاحب زادے رئیس اور سلیس تھے۔ جو مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے لیکن ان میں سے کسی کو بھی وہ مرجعیت، فضیلت اور ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہو سکی جو نفیس کو اور اُن کے بعد عارف و عروج کو حاصل تھی۔ البتہ مجالس مرثیہ خوانی میں یہ شعرا بھی اپنا اپنا کچھ نہ کچھ حق ادا کر گئے تھے اور ایک حد تک شہر اور بیرونِ شہر نام بھی پیدا کر لیا تھا۔

انیس اور دبیر کے خانوادوں کے علاوہ ایک اور گھرانا دو بھائیوں میاں عشق اور تعشق کا تھا

جس نے متعدد مرثیہ گو پیدا کیے تھے جو ممبر و مجلس کی زینت ہوا کرتے تھے۔ اس خاندان میں میر انیس کی سب سے بڑی صاحب زادی منسوب ہوئی تھیں جن کے صاحب زادے سید مصطفےٰ المعروف پیارے صاحب رشید نے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ اپنے دونوں چچا صاحبان یعنی میاں عشق اور تعشق کے یکے بعد دیگرے شاگرد ہوئے تھے اور اُس مخصوص رنگ کے نمائندے تھے جو تعشق کا تھا۔ اسی خاندان میں سعید، حمید اور جدید بھی اچھے مرثیہ گو تھے لیکن اُن کا پلہ رشید کی طرح بھاری نہیں ہو سکا تھا۔ ان تین مرثیہ گو خاندانوں کے شاعروں کے علاوہ اسی دور میں اور بھی متعدد مرثیہ گو اور مرثیہ خوان تھے جنھوں نے اس صنفِ سخن میں بڑی بڑی ریاضتیں کی تھیں اور اپنی کاوشوں کا صلہ پایا تھا۔ برادرانِ ہنود میں نانک چند نانک کی ذاتِ گرامی بڑی شہرت کی مالک تھی۔ وہ اُردو زبان سے ناواقف تھے اور ناخواندہ شاعر تھے لیکن خوب خوب مرثیے کہے تھے اور خود ہی مجلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔ رؤسا شہر میں بھی مرثیہ گو شاعر تھے جن میں خصوصیت کے ساتھ نواب اصغر حسین فاخر، نواب مہدی حسین ماہر اور نواب سردار صاحب سردار کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ رؤسا بڑی بڑی مجلسیں کرتے اور نو تصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں اژدھام لگے رہتے تھے اور بڑی گھما گھمی ہوتی تھی لیکن فنیت کی خوبی اور طرزِ خواندگی میں برتری کے اعتبار سے عارف و عروج اور رشید کے نام ہی زندہ جاوید ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان استادانِ فن کے کمالات کا کچھ ذکر کریں اُس دور کی مجالس کا مجملاً کچھ حال بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں تاکہ قاری کی نظر کے سامنے اُن اجتماعات کا خاکہ بھی واضح ہو جائے۔

مجالس مرثیہ خوانی متفرق دنوں میں کسی نہ کسی خاص موقع و محل سے مختلف مقامات پر منعقد ہوتی تھیں لیکن ماہِ رجب اور ماہِ شوال کے مہینے ان مجلسوں کے لیے مخصوص تھے بالخصوص ماہِ رجب کی مجلسیں اکھاڑے والی کہلاتی تھیں۔ ان میں بیشتر امام باڑہ سید تقی صاحب اور امام باڑہ اکرام اللہ خاں میں ہوتی تھیں۔ اول الذکر امام باڑہ مسجد تحسین علی خاں واقع چوک کے عقب میں اب بھی موجود تھا۔ اکرام اللہ خاں کا امام باڑہ چاول والی گلی میں اب بالکل منہدم حالت میں ہے اور یہی عالم رہا تو نیست و نابود ہو جائے گا۔ ان امام باڑوں کی وسعتوں میں بڑے بڑے اجتماعات ہوتے تھے۔ مجالس کا وقت عموماً گیارہ بجے دن ہوا کرتا تھا لیکن سننے کے لیے اچھا مقام پا جانے کے خیال سے گھنٹوں قبل سے لوگ آنا شروع ہو جاتے تھے۔ مجلس کے

وقت تک تل رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہتی تھی۔ بعد میں آنے والوں کو کسی کونے یا ناہموار جگہ پر بیٹھنا یا کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ مجالس عموماً وقت کی پابندی سے شروع ہوتی تھیں اور عام طور سے تین گھنٹوں تک مرثیہ خوانی رہتی تھی۔ کبھی کبھی یہ مدت چار اور ساڑھے چار گھنٹوں تک بڑھ جاتی تھی لیکن مجمع ہمہ تن اشتیاق بنا ہوا بیٹھا رہتا تھا۔ مرثیے نو تصنیف پڑھے جاتے تھے اور زیادہ تر طولانی ہوتے تھے۔ مرثیہ خوانی تین چوتھائی سے کچھ زیادہ ہی پڑھ کر کسی پہلوان کی لڑائی پر جب مرثیہ شباب پر ہوتا، ختم کر دی جاتی تھی۔ یہی چلن واضح کرتا ہے کہ ان مرثیہ خوانی کی مجلسوں کو خالص فنی اور ادبی اعتبار سے سنا اور پرکھا جاتا تھا۔ مرثیہ گو حضرات ایک دوسرے کے اوپر سبقت کا اعلان کرنے کی غرض سے خود ستائی اور تعلّی کے مقامات بڑے زور و شور سے نظم کرتے اور دوسرے مرثیہ گو حضرات کی سابقہ مجالس میں پڑھے ہوئے معرکۃ الآرا مقامات کا جوابات نظم کر کے سناتے تھے۔ اس طرزِ عمل کو "ٹکر لینا" کہتے تھے اور اسی "ٹکر لینے" کی بنا پر یہ مجالس "اکھاڑے کی" کہلاتی تھیں۔ ان کے تذکرے ایک سال کی مجالس کے بعد سے دوسرے برس کی مجلسوں تک برابر ہوا کرتے تھے۔ حضرات لکھنؤ مجلسوں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے اور دل کھول کر بڑی بلند آوازوں میں تعریفیں کرتے تھے اپنے پسندیدہ بالخصوص صاحبانِ کمال یا صاحبانِ ثروت مرثیہ گو کی تعریفوں میں واہ واہ کر کے نعروں سے چھتیں ہلا دیتے تھے۔ ان تعریفوں میں بسا اوقات کمالِ فن کی قدردانی کے بجائے جنبہ داری اور جاہ پرستی کا پہلو نظر آتا تھا۔ طبقاتی زندگی میں جاہ پرستی کا عنصر نمایاں ہونا ہی ضروری تھا۔ اب مثال کے طور پر "ٹکر لینے" کا ایک ایسا واقعہ پیش کیا جاتا ہے جو ہمارے اجمالِ بیان کی تفصیل واضح کرتا ہے۔ یہ وہ موقعہ تھا جب نفیس کے ایک مرثیہ کے جواب میں نواب سردار صاحب سردار نے نو تصنیف مرثیہ پڑھا تھا۔

سردار صاحب کا اسمِ گرامی نواب قمر الدین حیدر المعروف بہ نواب سردار صاحب تھا۔ وہ ایک بڑے متموّل گھر کے چشم و چراغ اور ایک دریا دل رئیس تھے۔ اُن کو اپنے بزرگوں سے متروکہ میں کثیر جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے علاوہ سولہ لاکھ روپیہ نقد ملا تھا اور یہ سب رقم اُن کی حیات میں ختم ہو گئی تھی حالاں کہ انھوں نے صرف اڑتالیس برس کی عمر پا کر ۱۹۱۳ء میں انتقال فرمایا تھا۔ ان کو مرثیہ کہنے، مجلسیں پڑھنے اور بڑے بڑے حصے تقسیم کرنے کا والہانہ ذوق تھا۔ ابتداءً میر نفیس کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا لیکن ان میں ریاست کی آن بان تھی اور

نفیسؔ اپنے پدر بزرگوار کی طرح نازک طبیعت اور مستغنی مزاج تھے اس لیے شاگردی اور استادی کا یہ رشتہ منقطع ہو گیا اور سردار صاحب نے مولانا علی میاں کاملؔ سے تلمذ حاصل کر لیا۔ سردار صاحب کی برہمی اسی حد تک ختم نہیں ہوئی اور انھوں نے نفیسؔ کا جواب بلکہ بہتر جواب پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس زمانہ میں میر نفیسؔ کا ایک مرثیہ شعر و فن کا ایک معجزہ سمجھا جاتا تھا۔ سردار صاحب نے خوش اعتمادی سے اُسی کے جواب میں ایک مرثیہ عظیم الشان اجتماع میں پڑھ دیا۔ اُس وقت بھی بہت سے ادیب و نقاد یہی سمجھتے تھے اور آج بھی راقم اس رائے کا حامل ہے کہ مرثیہ میں تمام مخصوص مقامات علی میاں کاملؔ کے تصنیف کردہ تھے کیوں کہ انھیں کا رنگ و طرز ہر ایسے مقام پر پوری طاقت سے جھلکتا نظر آتا ہے جہاں مقابلہ ندرت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کثیر مدت گزر جانے کے بعد اصل مصنف کی جستجو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن دونوں مقابل کلام کا موازنہ اب بھی ادبی دلچسپی کو آسودگی فراہم کرے گا۔ اس مقام پر انھیں دونوں مرثیوں سے تین مقامات جن میں موضوعِ سخن ایک ہی ہے پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے مطلع کو ہی ملاحظہ فرمائیے۔ نفیسؔ کے مرثیہ کا مطلع اور دوسرا بند حسبِ ذیل ہے۔

سخن کا تاج جو گل تھا وہ اس چمن سے ملا　　مری زباں کو شرف مدحِ پنجتن سے ملا
یہ سب عروج ثنائے شہِ زمن سے ملا　　یہ رتبہ فاطمہؑ و حیدرؑ و حسنؑ سے ملا
یہ پایہ سبطِ پیمبر سے میں نے پایا ہے
یہ پایہ صاحبِ منبر سے میں نے پایا ہے

یہ بے خزاں مجھے گلشن ملا بہار کے ساتھ　　خود اپنے اوج پہ نازاں ہوں انکسار کے ساتھ
کہ عشق ہے مجھے حیدر کے گلعذار کے ساتھ　　جناں میں جاؤں گا محبوبِ کردگار کے ساتھ
چراغِ مہر سے روشن چراغ دیکھوں گا
یہ باغ دیکھ چکا اب وہ باغ دیکھوں گا

نفیسؔ کا مرثیہ ۱۵۸ اور سردار صاحب کا مرثیہ ۱۲۸ بندوں پر مشتمل ہیں۔ نفیسؔ کے مرثیہ میں اس صنفِ سخن کے اُن تمام اجزائے ترکیبی پر نظر رکھی گئی ہے جن کی بہترین مثالیں انیسؔ نے پیش کی تھیں۔ سردار صاحب کے یہاں مرثیہ کے بعض اہم مقامات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا زیادہ توجہ نہیں کی لیکن تکمر نیفے کا حوصلہ مرثیہ کی ابتدا ہی سے نظر آتا ہے۔ پہلے بارہ بندوں میں گیارہ صرف خود ستائی، خود نمائی اور تعلّی پر مبنی ہیں۔ انھیں سے ربط دے کر بارہویں بند میں

نفیس کے مطلع کا جواب ہے۔ کہتے ہیں۔

یہ فیض مجھ کو ثنائے شہ زمین سے ملا
یہ دُرِ بیش بہا مدح کے عدن سے ملا
ثمر نہالِ بلاغت کا اس چمن سے ملا
یہ امتیاز درِ قصرِ پنجتن سے ملا
کہ میری نظم کا آوازہ دور تک پہنچا
فروغ نام کا ایوانِ حور تک پہنچا

نفیس کے یہاں اپنے کمال پر فخر و مباہات کے ساتھ اظہار انکسار ہے لیکن سردار کے یہاں مرثیہ کے اصل مطلع میں بھی افتخار کا پہلو نمایاں ہے۔ یہ بھی غنیمت تھا کیونکہ سردار صاحب بہرحال ایک مقتدر اور محتشم رئیس تھے لیکن آگے چل کر نفیس کے صرف دو بندوں کا جواب چودہ بندوں میں دیا گیا ہے، وہ دو بند حسب ذیل ہیں جو حضرت علی کی مدح میں ہیں۔ اُن کے عقد کا تذکرہ ضمناً کیا گیا ہے۔

دیا وہ حق نے برادر کہ جو حبیبِ خدا
ملی وہ خلق میں بی بی جو بنتِ خیر ورا
جنابِ فاطمہ صدیقہ طاہرہ زہرا
علی نہ ہوتے تو پھر اُن کا کوئی کفو نہ تھا
سب اپنی نعمتوں کا اُن پہ اختتام کیا
کہ اُن کے بیاہ کا خود حق نے اہتمام کیا

بتول کو وہ دیا کردگار نے رتبا
کہ جس کی کرتے تھے تعظیم خود رسولِ خدا
نہ آسیا نے نہ مریم نے یہ شرف پایا
انھیں کا پیشِ خدا عرش حق پہ عقد ہوا
دکھائیں خلد میں شکلیں عجب سروں نے
کہ پھول اُن پہ نچھاور کیے تھے حوروں نے

سردار کے مرثیہ میں شادی کی یہ رسم بڑے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ علی کو رسول اسلام اُن کے گھر سے طلب کرتے ہیں، زبان وحیٔ القیام سے عقد مناکحت کا حکم من جانب خدائے بزرگ و برتر سناتے ہیں، بہشت میں بزمِ شادی کی ترتیب ہوتی ہے اور عرشِ معلّیٰ سے یہ صدا آتی ہے کہ " ولیمہ آج ہے جنت میں اُس کی شادی کا " کیونکہ " پڑھا ہے فاطمہ کے ساتھ ہم نے عقد اُس کا "، یہ صدا سن کر بہشت میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، حور و غلمان خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ من جملہ چودہ بندوں کے اس مقام پر صرف آٹھ بند پیش کیے جاتے ہیں۔

صدا یہ سن کے ہے سکّانِ خلد کا دل شاد
چہار سمت ہے ہنگامۂ مبارک باد
خوشی سے جھومتے ہیں قدسیانِ پاک نژاد
نشاط حوروں کو فردوس میں ہے حد سے زیاد
جناں کی نہروں میں فوّارے ساتھ چھٹتے ہیں
ہر اک روش پہ نچھاور کے پھول لٹتے ہیں

وہ حوریں اور وہ اُن کے قدوں کی رعنائی
وہ سادے سادے لباس اور وہ اُن کی زیبائی
وہ مل کے ابروؤں کی دلبری دل آرائی
کسی حسین نے گویا کہ لی ہے انگڑائی
وہ حُسنِ طوق کا زینت وہ گوشواروں کی
وہ ماہِ نو کی ضیا وہ چمک ستاروں کی

نکل کے قصر سے طوبیٰ کے سایہ میں آنا
وہ سینہ تان کے چلنا وہ اُن کا اٹھلانا
وہ ہاتھ ڈالے گلوں میں اِدھر اُدھر جانا
وہ دیکھ دیکھ کے آئینہ اور اترانا
اِدھر کو حوروں کو مجمع اُدھر کو غلماں کا
سماں ہے گلشنِ فردوس میں پرستاں کا

لباس نور کے پہنے ہیں جسم میں غلماں
لٹا رہے ہیں دُر و لعل خازنانِ جناں
کیا ہے جشن کا حورانِ خلد نے ساماں
ٹُنی ہے چاند سے ماتھوں پہ نور کی افشاں
خجل ہو جن سے کواکب کی ضو وہ گہنے ہیں
نکھر کے جمپئی جوڑے سبھوں نے پہنے ہیں

بیاں کیا ہو صفت اُن کے حسن کی پوری
وہ لال ڈورے وہ آنکھیں ہر اک کی مخموری
وہ رنگ ساعد و بازو کا اُن کے بلّوری
وہ ساق پاکہ خجل جس سے شمع کافوری
وہ لب کہ دیکھ کے رنگت ہو زرد سوسن کی
ہنسیں تو کھل گئیں کلیاں ہوائے گلشن کی

کرشمے آنکھوں کے سفّاک چتونیں قتّال
وہ گدری چوٹیاں اُن کی وہ لمبے لمبے بال
وہ حُسن سیبِ ذقن کا وہ گورے گورے گال
ملے فرشتوں کے دل اس بلا کی پیاری چال
وہ غمزے حشر بپا جن سے پارساؤں میں
لگاوٹوں کی نظر بانکپن اداؤں میں

وہ مانگیں کاہکشاں سی وہ آنکھ کا کاجل
وہ رنگ باہوں کا شرمندہ جس سے ہو صندل

وہ گردنوں کا بیاض اور وہ کالکوں کا بل	سروں پہ ڈالے ہوئے وہ حباب سے آنچل

لچک کمر کی غضب گردشوں میں ڈھاتی ہے

کہ بجلیاں دلِ عشاق پر گراتی ہے

ملائکہ میں ہے غل ہر طرف کہ صلِ علا	سوا علی کے یہ رتبہ کسے جہاں میں ملا

نبی سے چل کے کہو لے رسول ہر دوسرا	مبارک آپ کو ترویج صدرِ روز ہرا

نہ شادیاں کبھی ایسی ہوئیں نہ بیاہ ہوئے

خدا نے عقد پڑھا انبیا گواہ ہوئے

ایک مولوی کو یقیناً یہ حق حاصل تھا کہ وہ ہاتھوں میں حنائی ریش پکڑ پکڑ کے حوروں کی یاد میں تڑپ اُٹھے اور اپنی رال ٹپکا ٹپکا کے اُن کے حُسن و جمال اور آرائش و زیبایش کی خیالی تصویریں پیش کرے۔ ہم کو اس تعیش دماغی سے کوئی سروکار نہیں لیکن متذکرہ بالا بند اُس زمانہ کے جمالیاتی ذوق کے یقیناً ترجمان ہیں اور اُن کا مطالعہ اسی نظریے کے تحت کرنا چاہیے۔ مرثیہ میں یہ تذکرے اگر شامل نہ ہوتے تو بہر حال بہتر تھا۔ اب ایک تیسرے مقام کو بھی جو بینیہ ہے مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں شیر نگاری اور بین کو اہم مقام حاصل ہے۔

میدانِ کربلا میں امام کے تمام رفقا اور اعزا درجہ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں۔ آخر میں امام اپنے شیر خوار بچہ کو گود میں لے جاتے اور اُس کی پیاس بجھانے کے لیے پانی طلب کرتے ہیں، پانی کے بدلے گلے پر تیر لگتا ہے اور بچہ امام کے ہاتھوں پر شہید ہو جاتا ہے۔ امام ننھی سی قبر کھود کر اُس کو دفن کر دیتے ہیں۔ اور خالی گود خیمہ کا رُخ کرتے ہیں تاکہ اہلِ حرم سے آخری رخصت حاصل کر کے جامِ شہادت نوش کریں۔ اس موقع پر امام اور مادرِ شیر خوار کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے جس کو نفیس اور سردار دونوں نظم کرتے ہیں۔ پہلے نفیس کے بند پیش کیے جاتے ہیں۔

حسین جب علی اصغر کو دفن کر کے پھرے	اُٹھا کے رنج والم پارۂ جگر کے پھرے

مزار سے بصد اندوہ و غم پسر کے پھرے	سوئے خیامِ حرم سرد آہ بھر کے پھرے

بکا کرو یہ دلِ بے قرار کہتا تھا

جگر میں درد تھا بازوں سے خون بہتا تھا

پکاری ڈیوڑھی سے بانو مرا پسر ہے کہاں	خدا کے واسطے کہیے وہ سیمبر ہے کہاں

جہاں ہے آنکھوں میں تیرہ مرا قمر ہے کہاں　　سرورِ جان و دلِ مادر و پدر ہے کہاں
صغیر لال سے کیوں مُنہ کو موڑ آئے ہو
ستمگروں میں کہاں اُس کو چھوڑ آئے ہو

اُسے فرات سے سیراب بھی کیا کہ نہیں　　کسی نے تھوڑا سا پانی اُسے دیا کہ نہیں
ثواب یہ کسی بے رحم نے لیا کہ نہیں　　گلا تو خشک تھا قطرہ کوئی پیا کہ نہیں
ہمارے حق کی خوشی اُٹھ گئی زمانے سے
کلیجہ پھٹتا ہے تنہا تمہارے آنے سے

کہا حسین نے وہ بھی ہوئے شہیدِ جفا　　ملا نہ پانی کا قطرہ گلے پہ تیر لگا
یہ خون انھیں کا مری آستیں میں سب ہے بھرا　　اُگل اُگل کے لہو مر گیا وہ ماہ لقا
کوئی نہ پائے جو دُکھ ہم نے پائے ہیں بانو
انھیں سپردِ لحد کر کے آئے ہیں بانو

تمھارے لال کو لے جا کے رن میں پچھتایا　　ترس کسی نے نہ بچہ کے حال پر کھایا
لحد تو مل گئی لیکن کفن نہیں پایا　　اُسی لہو بھرے کرتے میں اُن کو دفنایا
وفورِ غم سے کہاں تابِ صبر ہے بانو
وہ سامنے علی اصغر کی قبر ہے بانو

یہ سن کے بانوئے بے کس کا غیر حال ہوا　　پکاری ہائے مرا شیر خوار مجھ سے چھٹا
ارے مرے علی اصغر یہ ماں ہو تجھ پہ فدا　　لہو میں تر ہوئے دو دن کی پیاس میں بیٹا
وہ جسم پھول سا اب اور گرم ریتی ہے
تمھاری قبر کی اماں بلائیں لیتی ہے

انیسؔ نے کردار نگاری کا جو معیار قایم کیا تھا اُس کے مطابق متذکرہ بالا پانچویں بند میں لفظ "پچھتایا" امام کی سیرت کے منافی ہے، اسی کمزوری کے علاوہ نفیسؔ نے اس مکالمہ کو کچھ اس طرح نظم کر دیا ہے جس کا جواب ممکن ہی نہیں تھا۔ سردار صاحب کا مرثیہ نقشِ ثانی ہے جو نقشِ اوّل کو سامنے رکھ کر نظم کیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ بات نہ آئی جو نقشِ اوّل میں تابندہ اور درخشندہ ہے۔ سردار کے بند بھی ملاحظہ ہوں۔

بنا کے قبر جو بے شیر کی پھرے سرور　　ہر ایک گام پہ گرتے تھے بادلِ مضطر

ہوا تھا حال یہ آنکھوں کا غم سے رو رو کر     حرم سرا کی نہ آتی تھی راہ شہ کو نظر
بیان اپنی مصیبت کا کرتے جاتے تھے
ہر اک قدم پہ دمِ سرد بھرتے جاتے تھے
محل کے در پہ جو پہنچے امامِ جن و بشر     پکاری پردے کے پاس آ کے بانوئے مضطر
قبائے پاک ہے رنگیں لہو سے سر تا سر     کہاں ہے ہنسلیوں والا میرا علی اصغر
اکیلے آئے اُسے گود میں نہ لے آتے
کسے حضور مرے ماہ وش کو دے آتے
گئے تھے آپ اُسے لے کے گود میں آقا     حضور آئے نہ آیا وہ اس کا باعث کیا
کریں تو آپ کچھ ارشاد اے شہ والا     کسی نے کھلا کے ترس آب بھر اُس کو دیا
قلق سے صدقے گئی اُس کا حال کیا ہوگا
ہزار چین سے ہو ماں کو ڈھونڈھتا ہوگا
یہ سن کے پہلے تو روئے بہت شہ دلگیر     جگر سنبھال کے بانو سے پھر یہ کی تقریر
گیا جہاں سے پیاسا وہ رشکِ ماہ منیر     ملا نہ آب لگا چاند سے گلے پر تیر
روانہ نہرِ لعیں پر وہ لالہ فام ہوا
ہماری گود میں دم توڑ کر تمام ہوا
گیا جہان سے دادی کے گھر وہ ماہ جبیں     قبا ہماری اُسی کے لہو سے ہے رنگین
تمھاری گود میں اس وقت تک رہا وہ حسیں     اب آج سے علی اصغر کی جا ہے زیرِ زمیں
تمھارے لال کی تربت بنا کے آئے ہیں
ابھی ہم اُس کو لحد میں سُلا کے آئے ہیں
سنا جو بانوئے مضطر نے شاہ کا یہ بیاں     گری زمیں پہ ہوا یوں زوالِ تاب و تواں
پکاری چھوڑ کے کانِ خلق میں نالاں     بلا لو اے علی اصغر مجھے بھی تم ہو جہاں
سفر میں داغ جدائی کا دے گئے بیٹا
لحد میں ساتھ نہ مادر کو لے گئے بیٹا

ظاہر ہے کہ سردار کے ان بندوں کو نفیس کے کلام سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ مولویت ضرور ہے لیکن نہ کردار نگاری ہے اور نہ جذبات کی دلوں کو متاثر کرنے والی ترجمانی۔ پھر بھی مجلس میں

سامعین نے دھوم مچادی تھیں اور بڑی بڑی تعریفیں ہوئی تھیں، حالاں کہ نفیس کے مرثیے کے متعلقہ مقامات زبان زد تھے۔ اور نجی صحبتوں میں نفیس کے بند پڑھے جاتے اور دل کھول کر داد سخن دی جاتی تھی۔ جلسہ داری اور جاہ پرستی کے مظاہروں والی ان مجالس کے علاوہ شعر و فن کی قدر دانی کے اعتبار سے رشید، عارف اور عروج کی خواندگی والی مجلسیں ہوتی تھیں جن میں زبان و بیان کی خوبیوں اور خواندگی کے محاسن پر نظر رکھی جاتی تھی۔ اب ان تینوں اساتذہ کا مختصر تذکرہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

سید مصطفےٰ مرزا المعروف بہ پیارے صاحب اور المتخلص بہ رشید میر انیس کی سب سے بڑی صاحب زادی کے فرزند تھے۔ اُن کے والد ماجد سید محمد مرزا اُنس ملکہ جہاں کے یہاں داروغہ کے منصب پر فائز تھے اور محلہ راجہ بازار میں رہتے تھے۔ اسی گھر میں رشید پیدا ہوئے تھے۔ پڑھنے لکھنے کی طرف فطری طور پر لگاؤ تھا اور گھر کا ماحول بھی ساز گار تھا۔ ابتدائے عمر ہی میں کتب متداولہ سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ حسب دستور زمانہ فن طب میں بھی مہارت حاصل کی اور اپنے ذوق سے سپہ گری کے جوہر بھی سیکھے۔ طبیعت موزوں پائی تھی اور مرثیہ گوئی دادھیال نیز نانہیال میں خاندانی مشغلہ تھا اس لیے فنِ عروض کی طرف بھی توجہ کی اور شاعری میں اپنے دونوں چچا سید حسین مرزا عشق اور سید مرزا تعشق کے حضور زانوے ادب تہ کیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ رشید اپنی دادھیال سے برابر وابستہ رہے تھے اور جیسا کہ خود انھوں نے فرمایا تھا کہ "مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو"۔ اُن کے کلام پر تعشق کا رنگ ہمیشہ غالب رہا۔ تعشق ایک رنگین مزاج شاعر تھے، بہت اچھے غزل گو تھے اور یہی رنگِ تغزل اُن کے مرثیوں کی بھی جان ہے اُن کے ایک مشہور مرثیہ کے مطلع کا پہلا مصرع تھا

سچ ہے دنیا میں شبِ ہجر بلا ہوتی ہے

یہ مرثیہ حضرت حُر کے حال میں ہے۔ حُر فوجِ مخالف کا ایک سپہ سالار تھا، اُس نے شب عاشور تڑپ کے کاٹی تھی اور روز عاشورہ لڑائی شروع ہونے کے قبل اپنی فوج سے علیحدہ ہو کر امام حسین کی طرف آ گیا تھا اور انھیں کے رفقا میں شامل ہو کر شہادت کی فضیلت پائی تھی۔ تعشق نے اپنے اس مرثیہ کے چہرہ میں شبِ فرقت کی بے چینی اور کرب و الم کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے۔ رشید نے بھی اسی رنگِ تغزل کی جا بجا تاسی کی ہے۔ اُن کے بعض مرثیوں کے مطلعے اس طرح شروع ہوتے ہیں۔ "رات غربت کی حقیقت میں غضب ہوتی ہے" "جب مے نور سے لبریز ہوا جام سحر"

وغیرہ وغیرہ۔

رشید نے انیس کے گھرانے سے علیحدہ ہوکر اپنے طرزِ فکر کی ایک نئی راہ نکال لی تھی، اور قدردانِ سخن کی کوئی کمی نہ تھی اس لیے اُن کی مجلسیں بہت مقبول ہوتیں۔ اُن کی آواز کو مرثیہ خوانی سے فطری تعلق بھی تھا جس کی بدولت ابتدا ہی سے اُن کو دادِ سخن ملنا شروع ہوگئی تھی اور اُن کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی۔ بیرون جات سے مشتاقانِ سخن اُن کو بلانے کے آرزومند رہا کرتے تھے لیکن وہ لکھنؤ کے باہر معدودے چند ہی مقامات پر گئے تھے۔ شہر کے باہر پہلی مجلس انھوں نے سرسی ضلع مرادآباد میں پڑھی تھی اور اُس کے بعد رامپور میں۔ جو سفر انھوں نے دُور دراز مقامات تک فرمائے تھے وہ صرف پٹنہ اور حیدرآباد تک محدود تھے۔ اِن مقامات پر اُن کی بڑی قدردانی ہوئی تھی۔ راجہ صاحب اصغرآباد اور راجہ صاحب سلیم پور اُن کے پرستاروں میں تھے۔ جن کے یہاں وہ برابر مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں باضابطگی اور وضعداری کے ساتھ ماہِ ربیع الاول کے تیسرے اتوار کو ایک نوتصنیف مرثیہ مرحوم سجاد حسین کارخانہ دار زردوزی کے مکان واقعہ اشرف آباد کے متصل درین دیال روڈ میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ بہت بڑی مجلس ہوتی تھی۔ جس میں شرکت کرنے کے لیے دوسرے اضلاع سے بکثرت لوگ آیا کرتے تھے۔ رشید مرحوم بے حد رنجان مرنج اور خاموش طبیعت کے انسان تھے۔ آخر عمر میں خاندانی نیز فنی رقابتوں کے اثرات سے بددل ہوکر شہر لکھنؤ میں مجلسیں پڑھنا ترک کردیا تھا تب اس شہر کے قدردانوں نے محلہ ٹپکا پور کانپور میں اُن کی خواندگی کی ایک مجلس بنا کرائی تھی جہاں انھوں نے بڑی طاقت سے مرثیہ پڑھا تھا اور بہت عمدہ پڑھا تھا۔ مرثیہ بھی بہت اچھا تھا اور پڑھنا بھی لاجواب تھا۔ لکھنؤ سے کثیر تعداد میں لوگوں نے جاکر شرکت کی تھی۔ رشید مرحوم نے تقریباً ستر برس کی عمر میں انتقال کیا اور صوفیائے کرام کے دستورِ تدفین کی طرح اُسی دالان میں مدفون ہوئے جہاں اپنی زندگی میں زیادہ تر بیٹھتے تھے۔

رشید کے فنی کمالات کے بارے میں بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے "بہار" کے مضامین میں بڑی بڑی خیال آفرینیاں اور موشگافیاں کی تھیں۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیوں کہ مرثیہ میں تغزل کے لیے یہی مضمون سب سے زیادہ مناسب و موزوں ہے۔ انیس اور اُن کے جانشین نفیس کے یہاں بھی "بہار" سے متعلق مضامین ملتے ہیں جو بہت لطیف اور بلند ہیں کیوں کہ اُن میں معنویت، بلاغت اور حالات و ماحول پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔ لیکن

رشید کے یہاں تغزل زیادہ ہے۔ انیس کے کلام میں بھی رنگِ تغزل بہت ہے لیکن انھوں نے اس طرز کو استعمال کرنے میں موقع اور محل کے ۔۔۔ بڑے امتیاز برتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اُن کے نزدیک صنفِ مرثیہ میں رنگِ تغزل کی بہتات پسندیدہ نہ رہی ہو لیکن رشید نے اس رنگ کو وسیع سے وسیع تر بنایا ہے اور "بہار" کی تعریف نیز "بہار" کی کیفیت بیان کرنے میں نازک خیالی اور رنگین بیانی کی تمام مقررہ حدیں پامال کر کے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ مرثیہ میں ساقی نامہ نظم کرنا بھی رشید کی ایجاد تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قول صحیح ہو لیکن راقم نے سب سے پہلا ساقی نامہ عارف کی زبان سے انھیں کی مجلس میں سنا تھا۔ ساقی نامہ اُس دور کے بعض دوسرے مرثیہ گو شعرا نے بھی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور سب ہی ایک ہی طرز کا ساقی نامہ کہتے تھے اس لیے اس مقام پر رشید کے کلام کا نمونہ پیش کرنے کی غرض سے اُن کے ایک مرثیہ سے "بہار" سے متعلق چند بند درج ذیل ہیں۔ یہ مرثیہ حضرت حُر کے حال میں اور ۱۴۰ بندوں پر مشتمل تھا۔ جہاں تک راقم کو یاد آتا ہے یہ مرثیہ لکھنؤ کی سالانہ مجلس کے لیے کہا گیا تھا اور وہیں پڑھا گیا تھا۔ اس مرثیہ کے مطلع کا پہلا مصرع ہے۔

جب شبِ قتلِ شہِ دیں کی سحر ہونے لگی

یہ مرثیہ انھوں نے بہت اچھا کہا تھا اور بہت اچھا پڑھا بھی تھا۔ "بہار" سے متعلق بندوں کے بہت سے مصرعے زبان زد ہوگئے تھے اور مدتوں تک اُن کے چرچے رہے تھے۔ وہی بند ملاحظہ ہوں۔

صبح کا وقت سہانا وہ ہوا کی سردی　　غنچے چٹکے کہ بجی صبح کی گویا وردی
گل کی پتی بھی صبا نے جو برابر کر دی　　دی صدا کانپ کے بلبل نے کہ بیدردی!
عشق ہے ان سے یہ عالم نہیں بے جا میرا
کوئی چھوتا ہے تو دُکھتا ہے کلیجا میرا

گل و بلبل میں جو باتیں تھیں ذرا گرما گرم　　آنکھ نرگس کی جھکی جاتی ہے اللہ ری شرم
اس قدر فصلِ بہاری نے کیا ہے آزرم　　خوابِ غفلت کی طرح ہوگئے ہیں کانٹے نرم
پھل ملا بلبلِ نالاں کو شکیبائی کا
پھول ہے داغِ جگر لالۂ صحرائی کا

پردہ داری ہے حسینانِ چمن میں یکسر　　اپنے پتوں میں درختوں نے چھپائے ہیں ثمر

نہ رُخِ گل پہ نظر جائے یہ ہے مدِّ نظر        آتی ہے کوہ سے پانی کی برابر چادر
غیرت آئی ہے بہت آکے بیابانوں میں
اپنے منہ ڈھک لیے ہیں غنچوں نے گریبانوں میں

طائرِ باغِ جہاں بس گئے ہیں طیرِ چمن        زور لٹاتا ہے ہر اک غنچۂ پئے خمیرِ چمن
دل صبا کا نہیں لگتا کہیں اب غیرِ چمن        بلبلیں دیواروں پہ چڑھتی ہیں پئے سیرِ چمن
شوق یہ ہے کبھی چلتی ہے کبھی گرتی ہے
جب ہوا پھرتی ہے گلشن کی طرف پھرتی ہے

کچھ سوا گلشنِ فردوس سے ہے مسکنِ گل        گل کو خود مست کیے دیتی ہے بوئے تنِ گل
جب چلی بادِ صبا پھاڑ کے پیراہنِ گل        پتیاں اُڑنے لگیں اُڑنے لگے دامنِ گل
جب اِدھر گلشنِ جنت سے نسیم آتی ہے
سب درختوں سے گلے ملتی ہوئی جاتی ہے

جب سنی پائے نسیمِ سحری کی آہٹ        اُٹھنے کو سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ
ہر طرف باغ میں کھلنے لگے غنچے چٹ پٹ        اُٹھ گئے سارے عروسانِ چمن کے گھونگھٹ
دل کھلے فصلِ گزشتہ کا تاسّف نہ رہا
اب ذرا بھی گل و بلبل میں تکلّف نہ رہا

دل ہیں ٹھنڈے کہ بہار آئی لب جو ہو کر        گل دماغوں میں سمانے لگے خوشبو ہو کر
وحشت آنکھوں کی روانہ ہوئی آہو ہو کر        آہِ بلبل کے شرر اُڑ گئے جگنو ہو کر
بولے طاؤسِ چمن شورِ قیامت اُٹھا
آتشِ گل سے دھواں ابر کی صورت اُٹھا

متذکرہ بالا بندوں میں تصنع اور تغزل کے بہترین شاہ کار یقیناً موجود ہیں۔ صنفِ مرثیہ میں اس رنگ کی گنجائش ہے یا نہیں یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اُس دور میں بہر حال اس طرزِ شاعری کی قدر ہوتی تھی اور لوگ جوق در جوق رشید کی مجالسیں صرف باغ و بہار سے متعلق مضامین اور اُن کی نازک خیالیاں سننے جاتے تھے اور آج بھی زبان میں شستگی اور بیان میں لطافت و نزاکت کے پرستار رشید کی مرصّع سازی کی قدر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ اُس معاشرہ میں ذاتیات کی بنا پر دلوں میں کدورت رکھنے کے لوگ قائل نہیں تھے اسی لیے

میر انیس اور میاں عشق کے خاندانوں میں تصادم نہیں ہوا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے پرستار دو علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں تقسیم ہوکر انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے لیکن ایسا کوئی مقابلہ اس تیسرے خانوادہ سے جس کے سربراہ عشق و تعشق تھے کسی شخص سے بھی اس طرح نہیں ہوا کہ جتھہ بندیاں ہوکر معرکے قایم ہوتے اور اختلافات بازار میں آجاتے۔ اسی ایک بحث کو دیکھ لیجیے کہ مرثیہ میں ساقی نامہ کو شامل کرنے کا سہرا رشید کے سر ہے یا حقیقتاً عارف اس کے موجد تھے۔ یہ بحث بھی چلتی رہی تھی اور ممبروں پر دونوں بزرگ سکون و اطمینان کے ساتھ مرثیے بھی پڑھتے رہے تھے۔ ایک کے پرستار دوسرے فن کار کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور دادِ سخن دل کھول کے دیتے تھے۔ مجالس میں کلام پر نظر رہتی تھی۔ گھروں کے اندر رنجشیں ہوتی تھیں۔ رشید کا احترام انیس کے نواسہ کی حیثیت سے تو عارف کا نفیس کے نواسہ کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ بالآخر عارف کی قدر دانی اس لیے زیادہ ہونے لگی تھی کہ وہ علم و فضل اور تقدس و ورع میں ممتاز ہوتے اور بہر حال شاعرِ بے بدل بھی تھے۔ مرثیہ گوئی میں انھوں نے انیس کے قایم کردہ تمام لوازمات کو اپنا لیا تھا۔

میر علی محمد کے دادا سادات بارہہ کے ایک گراں قدر فرد تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور میر انیس کے عقیدت مندوں میں تھے۔ اُن کے فرزند سید محمد حیدر خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے، شعر و سخن کا ذوق تھا اور مذاقِ سلیم کے مالک تھے۔ میر انیس دوسرے خاندان کے لوگوں کو عموماً اپنے تلامذہ میں داخل نہیں فرماتے تھے لیکن سید محمد حیدر کو اُن کی نظرِ انتخاب نے اس طرح پسند فرمایا کہ پہلے اپنی شاگردی کا رتبہ مرحمت کیا۔ اور جلیس تخلص عطا فرمایا۔ بعد ازاں اپنے خانوادہ میں دامادی کا شرف بھی عطا کیا۔ اپنے صاحب زادے میر خورشید علی نفیس کی بیٹی سے اُن کا عقد کرا دیا۔ اسی ازدواج کا ثمر میر علی محمد تھے۔ اُن کو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ انیس کے گھر میں پیدا ہوئے، شعر و ادب کی فضا میں پہلی سانس لی، آنکھ کھولی تو انیس کا روئے مبارک دیکھا اور اذان کے توسط سے انھیں کی آواز سب سے پہلے کانوں میں گئی۔ اس کو کم نصیبی کہا جائے یا خوش بختی کہ والد کا اُن کی صغر سنی ہی میں انتقال ہوگیا۔ لہٰذا اب اُن کی تمام پرورش و پرداخت نفیس ہی کی طرف منتقل ہوگئی تھی۔ وہی نانا تھے اور وہی ایک شفیق باپ کی طرح اُن کے کفیل رہے۔ میر علی محمد اس دنیا میں مبدا فیاض سے بڑی صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔ اوائل عمر ہی میں کتب متداولہ سے فراغت کرکے فقہ و ادب کی طرف توجہ کی اور ان علوم میں بھی مدارج اعلیٰ پر فائز ہوئے پھر فنِ طب اور فنِ سپہ گری کی طرف مائل ہوئے۔ یہ دونوں فنون انیس کے خاندان

میں جزوِ لاینفک زندگی تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ذوق و شوق سے خوش نویسی اور بنوٹ میں مہارت حاصل کی۔ نفیس نے خود ہی علم عروض کا درس دیا اور شاعری کی طرف متوجہ کر کے علی تخلص مرحمت فرمایا۔

میر علی محمد علی فطرتاً بزلہ سنج تھے۔ اس لیے بہت جلد اُن کا شمار اچھے غزل گو شعرا میں ہونے لگا تھا۔ مشاعروں میں شرکت کا مشغلہ بڑھا تو رات رات بھر گھر کے باہر رہنے اور صبح ہوتے ہی واپس آتے تھے۔ ایک بار ایسی ہی واپسی پر اُن کے ملازم کو آواز دینے پر نفیس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ صنفِ غزل میں اُن کی اِس بڑھتی ہوئی توجہ کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ انھوں نے خود اُٹھ کر گھر کا دروازہ کھولا مگر اُن کو تخاطب کر کے یہ بھی فرمایا کہ "علی! تم دوزخ میں گھر بنا رہے ہو" اس تہدیدی فقرہ کا انھوں نے اتنا اثر قبول کیا کہ مشاعروں میں جانا تو درکنار گھر سے نکلنا بھی بند کر دیا۔ نفیس نے اپنے ہونہار نواسہ کو اتنا زیادہ متاثر دیکھ کر اُن کی توجہ اپنے حسبِ منشا مرثیہ گوئی کی طرف مبذول کرائی۔ پہلے ایک مصرع دے کر رباعی کہلوائی پھر رباعیاں کہنے پر آمادہ کیا۔ رفتہ رفتہ سلام نظم کراتے۔ خود ہی اصلاح دیتے اور اُن کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ اپنے پڑھنے کی مجلسوں میں رباعیاں اور سلام پڑھوا کے پیش خوانی کراتے تھے۔ اب اُن کا تخلص علی کے بجائے عارف نفیس ہی نے تبدیل فرما دیا تھا۔ آہستہ آہستہ عارف مرثیہ کہتے اور نانا اصلاح دیتے تھے اور اُنھیں کی زندگی میں عارف نے اپنا ایک مقام مرثیہ گو شعرا کی صف میں قایم کر لیا تھا۔ نفیس کے انتقال کے بعد ممبر پر عارف ہی اُن کے جانشین ہوئے تھے۔ یہ شرف نفیس کے صاحبزادے دولھا صاحب عروج کو کچھ مدت کے بعد ہی ملا تھا۔

نفیس کے بعد مرثیہ کہنا اور مرثیہ پڑھنا آسان کام نہ تھا۔ لکھنؤ کے سامعین کو ازبر تھا کہ اس میدان کے تمام مبادیات انیس طے کر گئے تھے اور نفیس نے نئی نئی شاہراہیں نکال کے فنِ مرثیہ گوئی اور طرزِ مرثیہ خوانی کی تکمیل کر دی تھی۔ اس لیے عارف کے سامنے مضمون آفرینی اور طرزِ ادا میں جدت تلاش کرنا بہت سخت مرحلہ تھا مگر انھوں نے اپنی ذہانت و ذکاوت سے بڑی کامیابی کے ساتھ سر کیا۔ مرثیہ میں سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت زبان کو ہوتی ہے۔ انیس نے فرمایا تھا کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہے" نفیس نے اسی زبان کی حلاوت میں علمیت کی چاشنی کا اضافہ کیا تھا۔ عارف اُنھیں کی آغوشِ تربیت میں پروردہ تھے۔ اور اپنے گھر کی زبان کی خوبیاں اُن پر روشن تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دونوں بزرگوں کے طرز کی عکاسی اپنے کلام میں کرلی تھی

اپنی اس فن کاری کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں۔

پھولوں کی لفظ لفظ سے بو آشکار ہے　　حُسنِ صنوبرِ لبِ جو آشکار ہے
خوبانِ گل کی خوبیٔ رو آشکار ہے　　پتّی سے رگ تو رگ سے لہو آشکار ہے
سرخی سے اِس کی قلبِ خزاں داغ داغ ہے
سینچا ہے جس کو خونِ جگر سے وہ باغ ہے

مضموں یہ صاف صفحۂ کاغذ سے ہے عیاں　　شفاف و دل کشا ہے یہی حسنِ بوستاں
کیا عقلِ سادہ اس کی لطافت کرے بیاں　　آنکھیں چھپاتے دیکھیے اگر نرگسِ جناں
تنویرِ مہر و ماہ کی توام ورق پہ ہے
رخسارۂ صبیح کا عالم ورق پہ ہے

زبان کی خوبیوں کے ساتھ مضامین آفرینی بھی ضروری تھی اور عارف کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کا بھی خیال تھا۔ مرثیہ کے عناصر ترکیبی برقرار رکھنا تھا اور انھیں میں خیال و بیان کی وسعتیں تلاش کرنا تھیں۔ عارف ان تمام منازل سے کامیابی کے ساتھ گزرے تھے۔ مرثیہ میں شہدا کی رخصت، گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف، لڑائی اور شہادت کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ عارف کے مرثیوں میں یہ سب حالات موجود ہیں مگر اُسی کے ساتھ اُن کا مخصوص عنوان ذکر و نظر بھی نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر تلوار کی تعریف میں ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔ انیس اور نفیس نے سپاہیانہ انداز، فنِ سپہ گری اور فولاد کی خوبیوں کو ملحوظ رکھ کر تلوار کی تعریف میں بہتر سے بہتر جواہر پارے پیش کیے تھے۔ عارف نے ایک نئے اسلوب سے تلوار کی تعریف کی ہے، فرماتے ہیں

یہی ہے تیغ دوسرا آسمان سے آئی ہوئی　　بنی بنائی ہوئی اور سجی سجائی ہوئی
خدا کی بھیجی ہوئی مصطفا سے پائی ہوئی　　علی سے صفدر و غازی کی آزمائی ہوئی
بسر رفاقت حیدر میں اس نے راتیں کیں
نڈر تھی ایسی کہ شیرِ خدا سے باتیں کیں

روزِ عاشورہ حضرت علی کی تلوار یعنی ذوالفقار امام حسین کے قبضہ میں تھی اور اُسی سے انھوں نے جہاد کیا تھا۔ اس تلوار کی تعریف میں اُس کی گزشتہ تاریخ یاد دلا کے ایک نیا لطف پیدا کرا دینا عارف کا حصہ تھا۔ جس نے لکھنؤ والوں کے مذاقِ سخن کو فی الفور متاثر کر دیا تھا اور یہ بند برس ہا برس تک وردِ زبان رہا تھا۔

لکھنؤ کی سالانہ مجالس میں بالعموم امام حسین، حضرت عباس یا جنابِ حُر کے حال میں مرثیے پڑھے جاتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں مرثیوں میں پہلوانوں سے لڑائیاں نظم کرنا ممکن تھا اور یہی لڑائیاں رزمیہ شاعری کی اساس ہیں۔ جنابِ حُر بہت بڑے سپہ سالار تھے جو فوجِ مخالف کو چھوڑ کر امام حسین کی طرف آ گئے تھے۔ حضرت عباس فوجِ حسینی کے علم بردار تھے، اُن کی بہادری ضرب المثل تھی اور امام حسین بہر حال علی کے فرزند تھے، اُن کی رگوں میں شجاعت کا لہو موجزن تھا۔ چنانچہ انھیں تین شہیدوں کے حال پر مشتمل مرثیے کہے جاتے تھے اور مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کے ہنر میں معرکۃ الآرا مقابلے ہوا کرتے تھے۔ عارف کو نفیس کی حیات ہی میں پیش خوانی کا شرف حاصل ہو چکا تھا، جانشینی ملنے کے بعد انھوں نے اپنی اس حیثیت کو خوب خوب نباہا اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس حق کے اہل بھی تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عباس کے حال میں ایک مرثیہ کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلی منزل رخصت کی ہے۔ امام حسین کے لشکر میں اب حضرت عباس اور امام کے اٹھارہ برس والے کڑیل جوان فرزند علی اکبر کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں ہے۔ حضرت عباس امام سے رخصت طلب کرتے ہیں، حضرت علی اکبر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ حضرت عباس کے اصرار پر امام اجازتِ جہاد دیتے ہیں۔

بولے شہِ مظلوم کہ مجبور ہیں، بہتر! دیکھیں ہمیں فرقت میں قرار آتا ہے کیونکر
تیرہ ہے جہاں داغِ جدائی سے نظر میں
لو درد تو ہونے لگا بازو و کمر میں

ہے بعد تمھارے علی اکبر کی بھی باری تھوڑے سے پس و پیش کی حجت تھی پیاری
غم پیاس کا ہے نے الم فاقہ کشی ہے
اللہ یہ ایک ایک کو مرنے کی خوشی ہے

امام حسین سے اذنِ جہاد لینے کے بعد اہلِ حرم بالخصوص بی بی بچوں سے رخصت ہونا سخت مرحلہ تھا اور حضرت عباس کو میدانِ جنگ میں پہنچ جانے کی عجلت بھی تھی۔ حضرت عباس اپنی بی بی کو دائمی مفارقت کی خبر سنا کر اپنی قبر پر اُن کو آنے کی ترغیب دیتے ہیں، یہ مقام ملاحظہ ہو۔

کہنے لگی وہ زخمی تیغِ غمِ فرقت جلتی ہوں تو آنکھوں سے کروں گی میں یہ خدمت
اس وقت بگڑنے میں بنی واہ ری قسمت بے مانگے ہوئے دے چلے آنے کی اجازت

کیوں کڑھتے ہو یہ لال تو پروان چڑھیں گے

میں قہر کو جھاڑوں گی یہ قرآن پڑھیں گے

ان درد کی باتوں سے پھرا قلب پہ خنجر　　صدمہ ہوا بے حد تو لگے کانپنے تھر تھر

آنے لگے آنسو رخِ شفّاف پہ ڈھل کر　　نزدیک یہ تھا گر پڑیں غش کھا کے زمیں پر

ٹھہریں تو تڑپ کر دلِ مضطر نکل آئے

جلدی سے جگر تھام کے باہر نکل آئے

عباس علم دار میدانِ کارزار کا رُخ کیے گھوڑے پر سوار ہیں۔ گھوڑے کی تعریف ضروری ہے۔ عارف نے انیس سے علیحدہ ہو کر جس سادگی، شستگی اور صفائی سے گھوڑے کی تعریف نظم کی ہے وہ انھیں کا حصہ تھا۔ کہتے ہیں ؎

یہ وہ نہیں رہوار کہ چلنے میں جو اڑ جائے　　آنکھ اس کی نہ جھپکے جو نظر شیر سے لڑ جائے

سایہ کہیں قمچی کا روا رو میں جو پڑ جائے　　پھر دفعتاً اسوار اسے روکے تو بگڑ جائے

تیزی ہو جو ایسی تو ہوا کیوں نہ قدم لے

جب تک کہ زمیں پاؤں کے نیچے ہے نہ دم لے

اسی سلسلہ میں حضرت عباس کے سراپا سے متعلق ایک بند ملاحظہ ہو ؎

شانِ احدی حُسنِ سراپا سے عیاں ہے　　پھولوں کی لطافت رُخِ زیبا سے عیاں ہے

اندازِ صنوبر قدِ رعنا سے عیاں ہے　　ہیں نورِ خدا جسمِ مصفّا سے عیاں ہے

اس نور کے شایق ملک و جن و بشر ہیں

کیونکر نہ ہو، دریائے امامت کے گہر ہیں

عباس ابن علی جس لشکر کے مقابل ہیں وہ ہزاروں سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ فوج کی تعداد اور عباس کے ثبات قدم کا نقشہ عارف اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

مرقوم ہو کیا کثرتِ افواجِ ستم گر　　مضموں ہے یہ گنجایشِ تحریر سے باہر

پھیلا تھا کئی کوس تک اس طرح وہ لشکر　　سایہ کسی طائر کا نہ پڑتا تھا زمیں پر

تھا حبس ہوا ہونٹوں پہ ذی روح کا دم تھا

ذرّہ کو بھی اُڑنے کا ٹھکانا نہ بہم تھا

قربان دلیریِ علم دار وفادار　　جچتا نہیں نظروں میں ذرا لشکرِ کفّار

لاکھوں میں پیادے تو ہزاروں ہی ہیں اسوار　　لشکر کی سیاہی ہے کہ ہے روزِ شبِ تار
گو حد سے سوا مجمعِ افواجِ ستم ہے
اس پر بھی مگر جراءتِ عباسؑ کم ہے

اب عباس دلاور کے تیور ملاحظہ ہوں ؎

کچھ غیظ تصور نے وغا کے جو بڑھایا　　اک جوش لہو نے تنِ جرار میں کھایا
موقع تھا ابھی تیغ زنی کا جو نہ آیا　　چابے کبھی ہونٹ اور کبھی گردن کو ہلایا
شمر و بن سعد ستم آرا پہ نظر کی
گہہ فوج کو دیکھا کبھی دریا پہ نظر کی

میدانِ جنگ میں عباس محض لڑنے ہی نہیں گئے تھے بلکہ پیاسے بچوں کے لیے گھاٹ پر قبضہ کر کے پانی لانا بھی مقصود تھا۔ گھاٹ کو لشکر گھیرے ہوتے تھا۔ اس لشکر میں شمر بہت بڑا سپہ سالار تھا اور ابن سعد فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ اس تاریخی پسِ منظر میں صرف اسی ایک مصرع سے

گہہ فوج کو دیکھا کبھی دریا پہ نظر کی

تصورِ وغا میں جوش آجانے کی بہترین تصویر ہمارے سامنے ابھر آتی ہے۔ مرثیہ میں اس کے آگے لڑائی اور ساقی نامہ نظم کیے گئے ہیں۔

جنگ کے دوران اپنے ہیرو کا کسی بڑے پہلوان سے فاتحانہ مقابلہ نظم کرنا مرثیہ کی عظمت و تکمیل کے لیے ضروری تھا۔ بلند پایہ مرثیہ گو فنِ سپہ گری اسی لیے سیکھتے تھے تا کہ مقابلۂ جنگ کی تصویر ماہرانہ انداز میں پیش کر سکیں۔ عارفؔ اسی لڑائی میں ہیرو کی فتح مندی کے بعد ساقی نامہ نظم کرتے تھے۔ اور اسی کو پڑھ کر مجلسیں ختم کر دیتے تھے۔ یہی طرزِ عمل ان مجلسوں کو ادبی اجتماعات ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ ساقی نامہ جیسا کہ راقم کا خیال ہے عارفؔ ہی کی جدت تھی لیکن اگر بعض دوسرے اقوال کو صحیح مان کر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رشید نے سب سے پہلے ساقی نامہ نظم کیا تھا، تب بھی یہ امر مسلّم ہے کہ ساقی نامہ دورِ آخر کی تخلیق تھی۔ اسی زمانہ میں سردار صاحب کا وہ مرثیہ بھی آجاتا ہے جو انھوں نے نفیسؔ کے جواب میں پیش کیا تھا اور جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ نفیسؔ کے یہاں ساقی نامہ کا کوئی شائبہ نہیں تھا اس لیے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس مرثیہ میں ساقی نامہ کہہ کر عارفؔ یا رشیدؔ ہی کا تتبع کیا گیا تھا۔ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ساقی نامہ کی ایک ہلکی سی جھلک انیسؔ کے یہاں بھی ملتی ہے۔ اُن کے ایک مرثیہ میں یہ بیت

موجود ہے ؎

ہاں بادہ کشو پوچھ لو میخانہ نشیں سے
کوثر کی یہ لہر آگئی ہے خلدِ بریں سے

لیکن انھوں نے نیز میر نفیس نے ساقی نامہ کبھی نہیں کہا۔ بہر حال عارف اور رشید نے ساقی نامے کہے تھے اور خوب خوب کہے تھے۔ ہر ساقی نامہ میں ولائے ساقیِ کوثر یعنی حضرت علی کی محبت والی شراب طلب ہوتی تھی اور اُس کو بجا طور پر کوثر کی طرح صاف و شفّاف نظم کیا جاتا تھا۔ یہ ساقی نامے بہت لطف لے کر پڑھے جاتے تھے اور سامعین جھوم جھوم کے تعریفیں کرتے تھے۔ عارف ساقی نامہ بہت اچھا پڑھتے تھے اور اُن کا طرزِ مرثیہ خوانی خود انھیں کی ایجاد تھا۔

مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی میں بھی ہنر مندی ضروری ہے۔ مرثیہ خواں اگر بے ہنر ہو تو مرثیہ کی لذت بھی خاک میں مل جاتی ہے۔ انیس اِن دونوں کمالات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مرثیہ گوئی میں انھوں نے اس صنفِ سخن کو وہ منزلت بخشی تھی کہ مسدس کو آسمان تک پہنچا دیا اور مرثیہ خوانی کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ یہ فنِ معجزہ کہلایا۔ اُن کے پڑھنے کا یہ طرز تھا کہ الفاظ کی مناسبت سے آواز میں تغیرات پیدا کر لیتے تھے۔ مضامین کا مفہوم چہرے کے چڑھاؤ اُتار سے ادا کرتے تھے اور اعضا و جوارح کے حرکات و سکنات سے سامعین کے دلوں کو متاثر کر دیتے تھے۔ سنگدل سے سنگدل بھی اُن کی اِس جادوگری سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اُن کا ممبر پر بیٹھنے کا طرز بھی انھیں تک مخصوص تھا۔ راقم کے والد مرحوم نے انیس کو متعدد بار پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ انیس کی طرح کسی کو ممبر پر بیٹھنا تک نصیب نہیں ہوا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اوپر جا کر بیٹھ گئے ہیں بلکہ یہ محسوس ہوتا تھا گویا یہ ممبر ہی میں سے باہر اُگ آئے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات کبھی کسی کو حاصل نہیں ہوئیں۔ اُن کے جانشین سے زیادہ پیارے فرزند نفیس نے پڑھنے میں بھی بڑی حد تک اپنے پدرِ بزرگوار کی پیروی کی تھی۔ لیکن وہ بھی اپنے میں کمی محسوس کرتے اور اُس کمی کو اپنی تنومندی اور آواز کی طاقت کے بل بوتے پر پورا کرتے تھے۔ عارف نہ انیس کی طرح کمالات کے مالک تھے اور نہ نانا کی طرح توانا بسیلی اور قوی آواز رکھتے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ اُن کے خدوخال کا اُن کے قد و قامت سے تناسب ممبر و مرثیہ خوانی کے لیے اُن کو دیدہ زیب بنانے میں کارگر ہو جاتا تھا لیکن

فن کاریوں کے تقاضے کچھ اور تھے۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ایک مخصوص طرز اختیار کرلی تھی جس کو "بنانا" کہتے تھے۔ اس طرز میں اعضا و جوارح کو کسی نہ کسی موقع پر بر سر کار لانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی سارے جسم کو کسی نہ کسی مخصوص طریقے پر حرکت دینا پڑتی تھی۔ لیکن زیادہ تر بعض حرکات و سکنات ہی کے سہارے مطلب برآری ہو جاتی تھی۔ اُن کی غرض یہ رہتی تھی کہ جو واقعہ الفاظ میں پیش کر رہے ہوں اُس کی تصویر سامعین کے دماغوں میں اُبھر آئے اور اپنی اس کوشش میں وہ زیادہ تر کامیاب ہی رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ بیان کر دینا کافی ہوگا۔ عارف حضرت قاسم کے حال میں مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ جناب قاسم امام حسن کے صاحب زادے اور امام حسین کے بھتیجے تھے۔ وہ بہت کم عمر تھے اور شہادت کے وقت نو دس برس سے زیادہ سن نہیں تھا۔ میدان جنگ میں جانے کی تیاری کرتے ہو۔ جناب قاسم جنگ کے اسلحہ اپنے جسم پر سجا رہے ہیں، اس مقام پر ایک بیت میں عارف کہتے ہیں ؎

کچھ مسکراتے زیورِ جنگی سنوار کے
ڈالا گلے میں پر تلا ہیکل اُتار کے

اس بیت کو عارف نے اس طرح پڑھا تھا کہ دیکھنے اور سننے والوں کی نظروں کے سامنے ایک مسکراتے ہوئے بچہ کے ننھے ننھے ہاتھوں سے ہیکل اُتارنے کی تصویر صاف صاف نمودار ہو گئی تھی۔ یہ نقشہ انھوں نے اپنے ہاتھوں کی حرکت اور آنکھوں کے چڑھاؤ اُتار سے پیش کیا تھا لیکن قیامت کا وہ سماں تھا جب انھوں نے اُنھیں ہاتھوں سے گلے میں پر تلا ڈالا تھا۔ کمزوری و ضعف میں توانائی و قوت کا جوش اور کم سنی میں جوانمردی کا ولولہ، یہ متضاد کیفیات اپنے حرکات و سکنات سے واضح کر دینا آسان کام نہیں تھا۔ یہ وہ ہنر تھا جو کبھی کسی دوسرے کو عروج کے علاوہ نصیب نہیں ہو سکا۔ عروج کا پلّہ بہر حال بھاری تھا۔

میر خورشید حسین عرف دولہا صاحب المتخلص بہ عروج میر نفیس کے صاحب زادے تھے۔ اُن کا تخلص یقیناً انھیں کے والدِ بزرگوار کا عطا کردہ تھا لیکن مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی تمام فطری صلاحیتوں کے باوصف وہ اپنے والد ماجد کی حیات میں اس میدان کے نبرد آزما نہیں ہوئے، بلکہ اس کے برعکس دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرف ملتفت رہتے تھے۔ نفیس کے انتقال کے بعد اُن کو جانشینی کا شرف ملا تب انھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ مرثیہ کہنے اور مرثیہ پڑھنے پر توجہ فرمائی۔ لکھنؤ کے سخن فہموں نے مرثیے کی قدر دانی تو فرمائی لیکن کمال کو عارف کی طرف منسوب

کر دیا۔ یعنی یہ کہ عارف مرثیہ کہتے اور دولہا صاحب پڑھ دیتے تھے۔ عروج نے اس ناقدر شناسیٔ احباب کے بارے میں نہ کبھی کوئی کلمہ زبان سے کہا اور نہ اس ناانصافی پر اپنی دلی اذیت کا کسی طرح بھی کوئی اظہار کیا۔ بیرون جات کے متعدد مقامات پر اُن کے جوہر یقیناً اُسی زمانہ میں پرکھ لیے گئے تھے۔ اور اُن کی شہرت کا آوازہ دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں عارف نے انتقال کیا اور لکھنؤ والوں کو اپنی کج اندیشی کا احساس از خود پیدا ہونے کا موقع آ گیا۔

میر نفیس کے بعد انیس کے پڑھنے کی دو سالانہ مجلسیں عارف اور عروج میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ سید تقی صاحب کے امام باڑہ کی مجلس عارف پڑھتے تھے اور اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ والی مجلس عروج کے حوالے تھی۔ عارف کے انتقال کے بعد اُن کی مجلس بھی عروج کو پڑھنا پڑی۔ انھوں نے اپنا نو تصنیف مرثیہ کچھ اس طرز سے پڑھ دیا کہ بڑے بڑے ناقدین دنگ ہو کر رہ گئے۔ حکیم منے آغا فاضل کے ایسے بلند پایہ ادیب اور شاعر کی زبان سے یہ کلمہ نکلا تھا کہ "یہ مرثیہ انیس کہہ کر رات کو ان کے سرہانے رکھ گئے"۔ اس مرثیہ کے چہرہ میں انھوں نے عارف کی علالت اور وفات کا حال نظم کیا تھا۔ متعلقہ بند حسب ذیل تھے ؎

ابھی کا ذکر ہے یاد آپ کو بھی ہو گا ضرور — گئے جہاں سے کس طرح عارفِ مغفور
چلے تھے پڑھنے کو وہ مجلسِ امامِ غیور — کہ ناگہاں اجل آنے سے ہو گئے مجبور
دل و جگر میں خدنگِ ملال بیٹھ گئے
اٹھا جو درد کلیجا پکڑ کے بیٹھ گئے

افاقہ اس مرضِ سخت سے ہوا بھی نہ تھا — کہ ایک دوست کو فوراً خدا نے بھیج دیا
سنبھالا بڑھ کے انھوں نے یہ حال جب دیکھا — وہیں تھا ایک مطب اُن کو لے گئے اُس جا
تمام جسم تھا ڈوبا ہوا پسینے میں
مزاج پوچھا تو بتلایا درد سینے میں

ذرا سی دیر میں تھوڑی بہت دوا بھی ہوئی — مگر سکوں نہ ہوا جس قدر بھی کوشش کی
مکاں پہ لے کے چلیں سب کی رائے یہ ٹھہری — کہا جو اُن سے کہ چلیے کہا تمھاری خوشی
اُٹھائے کوئی، کیا رُخ نہ ایسی باتوں پر
وہ اُٹھ کھڑے ہوئے خود زور دے کے ہاتھوں پر

چلے بھی اُٹھ کے قدم بھی بڑھا کے اک رکھا
ہوا وہ درد مگر جس سے زور چل نہ سکا
زبان بند ہوئی ڈھل کے رہ گیا منکا
نہ پاؤں دوسرا لیکن جگہ سے اپنی ہلا
تعلق ان کو نہ پھر کچھ جہانِ زشت میں تھا
قدم تھا ایک یہاں دوسرا بہشت میں تھا

اس کے بعد امام حسین کی مدح اور کربلا کا تذکرہ کرتے ہوئے روزِ عاشورہ کی گرمی کا حال پیش کیا تھا جس کو سن کر بہت سے لوگوں کو انیسؔ کا وہ مرثیہ یاد آگیا جس کا مطلع ہے

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

انیسؔ کے بعد اس موضوع پر ایسا حسنِ بیان صرف عروج کا حصہ تھا۔ مثلاً چند بند درج ذیل ہیں۔

کہاں وہ دشتِ بلا اور کہاں شہ صفدر
کہاں وہ گرم ہوا اور کہاں علی کا پسر
کڑی وہ دھوپ ہے جس سے کہ موم ہو پتھر
غضب تو یہ ہے کہ بچے بھی ساتھ ہیں اکثر
حرم سمیت شہ مشرقین پیاسے ہیں
جہاں میں آگ لگی ہے حسین پیاسے ہیں

بیان کیجیے کیا حالِ گرمیٔ عاشور
زمین جل رہی تھی کربلا کی شکل تنور
کیا فلک پہ بخاراتِ ارض نے جو عبور
ہوا شعاع کی چلمن میں مہر بھی مستور
اُداسی چھا گئی رنگِ جہاں بدلنے لگا
یہ دوپہر کی تپش تھی کہ دن بھی ڈھلنے لگا

فلک سے آگ برستی تھی رن میں سر تا سر
نہ چین تھا کسی ذی روح کو کہیں دم بھر
اُمس تھی ایسی کہ رکتی تھی سانس رہ رہ کر
غبارِ دشتِ بلا تھا کہ آتشیں چادر
مثال تابۂ آہن زمین جلتی تھی
کہ دن کو دھوپ میں ذرّوں سے لو نکلتی تھی

تپش سے کھولتا تھا آبِ فرات بھی یکسر
تھی نہر یا تھی زمیں کی جبیں پسینے سے تر
ذرا نہ تہ سے اُبھرتی تھیں مچھلیاں باہر
کلیجا بھنتا تھا پانی کا پڑتا تھا جو بھنور
وہ حال اب نہیں دریا کی بھی روانی کا
نہ ٹپکی بوند جو دامن نچوڑا پانی کا

آخر میں امام حسین کی لڑائی نظم کرتے ہیں اور ساقی نامہ پر مرثیہ ختم ہوتا ہے۔ پڑھنے کا طرز

یہ تھا کہ متذکرہ بالا بیت :۔

حرم ہمیت شہ مشرقین پیاسے ہیں
جہاں میں آگ لگی ہے حسین پیاسے ہیں

کچھ اس طرح پڑھ دی تھی کہ سننے والوں کے دل بے قابو ہو گئے تھے اور جو لوگ دالانوں میں بیٹھے تھے انھوں نے دیواروں سے اپنے سر ٹکرا لیے تھے۔

اس مجلس کے بعد لکھنؤ میں عروج کو دفعتاً وہ عروج حاصل ہو گیا تھا جو نفیس کے بعد بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا تھا اور بعد میں تو ویسی منزلت کبھی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کے پڑھنے کی مجلسوں میں ریلے لگے رہتے تھے اور بلاتفریقِ مذہب و ملّت جوق در جوق لوگ شریک ہوتے تھے۔ وہ جب پہلے کے کہے اور پڑھے ہوئے مرثیے دوبارہ پڑھ دیتے تھے تب بھی کیفیت نشہ دوبالا کی سننے والوں کو لذت ملتی تھی۔ دوبارہ اور سہ بارہ مرثیے پڑھنے کی ضرورت اس لیے لاحق ہوتی تھی کہ عروج کے تصنیفات کی تعداد کم تھی اور ان میں بھی بعض ناتمام تھے۔ کبھی کبھی ان ناتمام مرثیوں میں اپنے والد بزرگوار کے بند شامل کر کے مرثیہ مکمّل کر لیتے تھے۔ اس صورتِ حال کا مجلس میں اعلان بھی فرما دیتے تھے۔

اُن مراثی کے نامکمّل رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ سالانہ اور بڑی مجالس میں پڑھنے کے لیے مرثیے نظم کرتے تھے اور ایسی مجلسوں میں خواندگی ساقی نامہ پر ختم ہوتی تھی۔ اس لیے اُن کی زیادہ تصنیفات بھی اسی مقام پر رُک جاتے تھے۔ یوں بھی کسی فن کار کی منزلت کا معیار تخلیقات کی فراوانی پر قایم نہیں ہوتا، مرثیہ کی صنف بھی اسی اصول کے تحت آتی ہے اس لیے ہم کو عروج کے کمال کا انھیں سولہ مرثیوں کی بنا پر تجزیہ کرنا چاہیے جو وہ مسلم الثبوت طور پر کہہ گئے ہیں۔ راقم کے نزدیک اُن کے دو مرثیے ہی کچھ ایسی خوبیوں اور خصوصیات کے مالک ہیں کہ مرثیہ گویوں کی صف میں اُن کا شمار اکمل افراد میں ہو جاتا ہے۔ اس تذکرہ میں انھیں دونوں مرثیوں کے متعلقہ حالات پیش کیے جاتے ہیں۔

راقم نے پہلی مرتبہ امام باڑہ جواہر علی خاں فیض آباد میں غالباً ۱۹۱۴ء میں عروج کی مجلس سنی تھی۔ انھوں نے جو مرثیہ پڑھا تھا اُس کا مطلع تھا

عندلیبِ چمنستانِ فصاحت ہوں میں

اس مرثیہ کا چہرہ سنتے ہی انیس کے اُس مرثیہ کی یاد آ گئی تھی جس کا مطلع ہے۔

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

اور چوں کہ اُس وقت اس مرثیہ کے بے شمار بند از بر تھے اس لیے یہ رائے قایم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ عروج نے اپنا مرثیہ اُسی رنگ میں اور اُسی طرز پر کہا تھا اور یقیناً بڑی کامیابی کے ساتھ کہا تھا۔ مثلاً چار بند درج ذیل ہیں ـــــ

عندلیبِ چمنستانِ فصاحت ہوں میں　　طوطیِ گلشنِ سرسبزِ بلاغت ہوں میں
نغمہ آرائے گلستانِ خلافت ہوں میں　　والہ و شیفتۂ حُسنِ سلاست ہوں میں
کیوں ترقی نہ ہو طبع کی رنگینی میں
سات پشتیں ہوئیں اس باغ کی گل چینی میں

میرے گلشن کا ہر اک پھول مہکتا ہی رہا　　عندلیبوں کو مرے سامنے سکتا ہی رہا
دمبدم باغ مضامین کا پھلتا ہی رہا　　رنگ معنی گلِ مضموں سے ٹپکتا ہی رہا
پھر مرے نغموں کے مشتاق ہیں سننے والے
پھول اب تک تو چُنا کرتے ہیں چُننے والے

میرے اسلاف نے اس باغ کی ڈالی بنیاد　　کوئی گلچیں کا نہ کھٹکا تھا نہ خوفِ صیاد
اُن کے دم تک تو بہت کچھ تھا یہ گلشن آباد　　اب بھی پھر فضلِ خدا سے نہیں ایسا برباد
نظر آتی ہے جو ہر وقت فضا جنت کی
سیر کرنے نکل آتی ہے ہوا جنت کی

تھی انھیں سے چمنستانِ جہاں کی رونق　　باغِ مداحیِ شہ تھا مرے اجداد کا حق
سامنے رہتے تھے گلہائے مضامیں کے طبق　　بلبلیں لیتی تھیں آ آ کے گلستاں کا سبق
مدحِ شہ سننے کو آتی تھیں جو گلزاروں سے
ورقِ گل پہ لکھا کرتی تھیں منقاروں سے

اس طرح مرثیہ کے چہرہ میں اپنے اسلاف کی برتری کا اظہار پورے زور و شور سے کیا ہے لیکن اپنے بارے میں صرف اتنا ہی اشارہ ہے کہ

اب بھی پھر فضلِ خدا سے نہیں ایسا برباد

اور آگے چل کر اتنا اور کہہ گئے تھے ـــــ

خودستائی مجھے منظور نہیں ہے زنہار　　اصل جوامر تھا میں نے وہ کیا ہے اظہار

میں کوئی شے نہیں اس کا ہے مجھے خود اقرار　　پھر خدا کو تو کوئی امر نہیں ہے دشوار
گو کہ ناچیز تھا اک ذرۂ بے قدر تھا میں
اُس کی ادنیٰ نظرِ مہر ہوئی بدر تھا میں

اس بند میں اپنی سابقہ زندگی کے طرز پر اشارہ ہے اور ضمناً اپنے کمال کو بھی کہہ گئے ہیں اور انھیں بندوں کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے باپ اور دادا کی تاسّی کی تھی۔ عارف کے رنگ سخن سے اُن کا طرز اُسی وقت علیحدہ تھا۔ چہرہ کے بعد اصل مرثیہ شروع ہوتا ہے جس میں از ابتدا تا انتہا وہی اسلوب اور ترتیب برقرار رکھی تھی جو انیسؔ کے متذکرہ بالا مرثیہ کی خصوصیات ہیں چہرہ کے بعد گریز کا یہ بند تھا ؂

سنیے اب حالِ شہنشاہِ امم تھوڑا سا　　مل کے ہم آپ کریں شاہ کا غم تھوڑا سا
قتلِ سادات ہوں کیا ہے یہ ستم تھوڑا سا　　پانی جو بیس پہر نہ ہو بہم تھوڑا سا
بھوک میں پیاس میں کوثر کے کنارے جائیں
اُمتی شاد ہوں سادات جو مارے جائیں

اس کے بعد امام حسین کے اصحاب اور اقربا کی جنگ اور شہادت کے واقعات اختصار کے ساتھ لیکن اُسی انداز میں نظم کیے تھے جو انیسؔ کے یہاں اُن کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس مقام پر آخری بیت یہ فرمادی تھی ؂

بہ گئیں خوں کی شطیں اہلِ جفا ہار گئے
مرتے مرتے بھی ہزاروں کو جری مار گئے

اب امام کے ساتھ صرف اُن کے صاحب زادے علی اکبر اور بھائی حضرت عباس باقی رہ گئے ہیں۔ یہ مرثیہ عباس علم بردار کے حال میں کہا تھا۔ اس لیے مخصوص حال کے تمام لوازمات اسی مقام سے شروع ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلی منزل حضرت عباس کی طلبِ رخصت کی تھی۔ عروج نے بالکل ایک نیا پہلو نکالا تھا جو اُن سے پہلے اور غالباً اُن کے بعد بھی کبھی کسی ممتاز مرثیہ گو نے اس طرح نظم نہیں کیا۔ حضرت عباس کے دو صاحب زادے تھے، اپنے باپ کی رخصت کے وقت وہ اپنی ماں سے اذنِ جہاد اس طرح طلب کرتے ہیں ؂

اس بیان سے ہے یہ ہم دونوں کا مطلب اماں　　نہر پر جائیں گے پانی کے لیے بابا جاں
بھر کے مشکیزہ کو دریا سے چلیں گے جس آن　　ہے یقیں ہم کو لڑائی بھی بڑی ہو گی وہاں

بند پانی کیے سب فوج جفا ہوئے گی
جنگ خشکی سے ترائی میں سوا ہوتے گی

اور یاں پیاس سے معصوموں کی حالت ہے تباہ — گر مناسب ہو تو کر دیجیے ہم کو ہمراہ
کم سنی گو ہے ہماری مگر ان شاء اللہ — ہمتیں ہوں گی ہماری نہ ذرا بھی کوتاہ
زرہیں چھوٹی سی ہمیں لا کے پہنا دو اماں
نیمچے دو کہیں رکھے ہوں تو لا دو اماں

کم سن بچوں کی نفسیات کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ بہر حال حضرت عباس اہلِ حرم سے اور اُس کے بعد امام حسین سے رخصت ہو کر میدان جنگ کی طرف بڑھنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ عروج اس مقام پر بھی ایک نیا اور مناسب گوشہ نکالتے ہیں۔ حضرت عباس کی وفاداری اپنی آپ مثال تھی۔ لہٰذا ایک وفادار مجاہد اس موقع پر اپنے بھتیجے یعنی امام کے صاحب زادے علی اکبر سے مخاطب ہوتے ہیں کیوں کہ اب فوج حسینی میں اُن کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں ہے ؎

کر کے تسلیم شہ دیں کو بصد عزّ و وقار — کہ ہم شکلِ پیمبر کو قریں با دلِ زار
رو کے اکبر سے یہ بولے کہ چچا تم پہ نثار — مری جان اب شہ ذی جاہ سے رہنا ہشیار
عزم فرمائیں تو میداں میں نہ جانے دینا
ابن زہرا پہ کوئی آنچ نہ آنے دینا

حضرت عباس کی جوانی بہار پر تھی، حسن و جمال کے مالک تھے اور لشکرِ حسینی کے علم بردار بھی تھے۔ تمام دوسرے رفقا و اعزا سے اُن کا پلّہ بھاری تھا، اس لیے اُن کی روانگی بھی اُسی طرح ہونا چاہیے۔ فرماتے ہیں ؎

زلف حورِ چمنستانِ جناں ہاتھ میں لی
داب کر رانوں میں گھوڑے کو عناں ہاتھ میں لی

اسی مقام پر گھوڑے کی تعریف بھی کر دیتے ہیں جو اسی بیت سے منسلک ہے ؎

باگ لیتے ہی اُڑا صورتِ آہو گھوڑا — لے چلا مثل صبا دوش پہ خوشبو گھوڑا
بن گیا راہ میں چلتا ہوا جادو گھوڑا — فرق کرتا نہیں تیزی میں سرِ مو گھوڑا
گر اسی چال سے یہ صاحبِ دل جائے گا
دم میں اب لشکرِ کفار سے مل جائے گا

جست یوں کرتا ہے میداں میں غازی کا سمند
صید کو دیکھ کے جس طرح بھرے شیر زغند
چوکڑی بھرنے میں آہو سے سوا ہے وہ چرند
تیز رو ایسا کہ پاتے نہ کبھی جس کو پرند

اپنے راکب کا اشارہ جو یہ پا جاتا ہے
پتلیاں جھاڑے ہوئے شکل ہوا جاتا ہے

ایسا جاندار تو گھوڑا نہیں دیکھا اب تک
برچھیوں اڑتا ہے جھپکی ہے جو راکب کی نظر
سوئے پستی کبھی آتا ہے جو وہ چھو کے فلک
تا سمک جاتی ہے رہوار کے ٹاپوں کی دھمک

اثرِ نقشِ قدم واں بھی عیاں سارے ہیں
پشت ماہی پہ یہ ٹاپوں کے نشاں سلے ہیں

گھوڑے کی تعریف کے ساتھ اسوار کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جلوہ گر گھوڑے پہ ہے بازوئے سلطانِ امم
سر پہ ہے سایہ فگن فوجِ حسینی کا علم
رو پہ ڈالے ہوئے رہوار رواں ہے ضیغم
بر میں ہے جست قبا ڈاب میں شمشیر دو دم

سر پہ سر شوکت و نصرت بھی اقبال بھی ہے
پشت پر مہر نبوت کی طرح ڈھال بھی ہے

حضرت عباس ابھی راہ میں ہیں اور اُدھر دشمن کو اُن کے جاسوس خبریں پہنچا رہے ہیں۔ "عباس عازم جہاد ہیں"، "آرہے ہیں"، "ترائی کی طرف رخ ہے"۔

آگ بھرے گی ترائی میں خبردار رہو

یہاں تک کہ آپ میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔ بہادرانہ انداز میں دشمن کی فوج کو دیکھا اور رجز خوانی فرمائی۔ امام حسین پر ظلم کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بھوکے پیاسے کے ستانے کا مزا دیکھ تو لو
کس طرح لڑتے ہیں لاکھوں سے دغا دیکھ تو لو

اب میدانِ کارزار گرم ہے، اسی جگہ تلوار کی تعریف میں ایک بند پیش کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

ہوش اڑتے ہیں دیکھ کے پریوں کے سجاوٹ ایسی
مل لے دشمن کے گلے سے بھی، لگاوٹ ایسی
ناز سے چلتی ہے تھم تھم کے رکاوٹ ایسی
کبھی ثابت نہ بگڑنا ہو بناوٹ ایسی

خاتمہ اس کے لیے حسن خداداد کا ہے
تن پھریرا تو ہے بے شبہ، یہ فولاد کا ہے

اُس دور میں سب مرثیہ گو ساقی نامہ کہنے لگے تھے۔ عروج نے بھی خوب خوب ساقی نامے کہے تھے اور انصاف تو یہ ہے کہ جو کیف عروج کے یہاں تھا وہ عارف کے یہاں بھی کبھی نہیں ملا۔ اسی مرثیہ کا ایک بند یہ تھا۔

ساقیا بادۂ گلرنگ سے ہاں بھر ساغر  دے دل آرام و مصفا و معطر ساغر
جلد اب آتشِ سیال سے کر پر ساغر  کب سے ہے میرے لب خشک پہ ساغر ساغر
سب ہیں مشتاق کہ مُہرِ خمِ صہبا ٹوٹے
سال بھر بعد تو ہم رندوں کی توبا ٹوٹے

عروج کی زبان انیس کے گھر کی زبان تھی۔ اُن کا مزاج انیسیت اور شعریت کے ماحول میں ڈھلا تھا۔ راقم کو تجسس کے بعد بھی یہی پتہ چلا تھا کہ انھوں نے زانوے ادب کبھی کسی کے آگے تہہ نہیں کیا تھا۔ ابتدا" اُن کو مرثیہ کہنے اور پڑھنے کی طرف کوئی رغبت نہیں تھی لیکن جب توجہ کی تو تمام خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ انیس و نفیس کا سارا کلام رہنمائی کے لیے کافی تھا اور وہ دفعتاً آسمانِ شہرت و وقار پر تمام فن کارانہ مشّاقی سمیت طلوع ہو گئے تھے۔ اُن کے پڑھنے کا بھی یہی معاملہ تھا۔ یہ مرثیہ جس طرح پڑھتا تھا اُس کا تذکرہ الفاظ میں پیش کرنا محال ہے صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ جو مقام پڑھتا تھا اُس کی تصویر سامعین کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دی تھی۔ اُس وقت اُن کی آواز بھاری بھرکم تھی اور اُن کا جسم توانا تھا، آواز پر اتنا قابو تھا کہ جہاں چاہتے گداز آجاتا اور جہاں چاہتے گرج پیدا کر لیتے تھے۔ آنکھوں کی حرکت اور ہاتھوں کی جنبش میں جادو تھا جو حاضرین کو مسحور کر لیتا تھا۔ اسی ایک مصرع کو

پشت پر مہرِ نبوت کی طرح ڈھال بھی ہے

اس طرح پڑھتا تھا کہ ڈھال کی شبیہ نظر آنے لگی تھی۔ انھوں نے بظاہر گردن جھکا کے مرثیہ کو اپنی پشت پر الٹ کر رکھ لیا تھا اور مرثیہ کا زیر بند جو سیاہ تھا ڈھال نظر آنے لگا تھا۔ راقم نے اس مجلس میں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ شرکت کی تھی۔ انھوں نے آبدیدہ ہو کر یہ فرمایا تھا کہ "آج انیس کی یاد تازہ ہو گئی، دولہا صاحب نے انھیں کے طرز میں مرثیہ کہا اور انھیں کی طرح پڑھا۔"

عروج کو راقم نے آخری بار اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں مجلس پڑھتے سنا تھا اور غالباً اُن کی وہ ہی آخری خواندگی تھی۔ وہ علیل تھے، خود سے نہیں آسکے تھے بلکہ لائے گئے تھے اور سہارا دے کر ممبر پر بٹھا دیے گئے تھے۔ اُن کا چہرہ بہت مضمحل تھا، گردن جھکی ہوئی اور کمر خمیدہ تھی،

دونوں شانے ڈھلے ہوئے تھے اور سینہ پر جامدانی کا انگرکھا ڈھیلا نظر آ رہا تھا۔ آواز بہت نحیف تھی لیکن سر پر جمی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی اُن کے استقامت مزاج کی غمّازی کر رہی تھی۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر سامعین پر مایوسی طاری ہوئی اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ چند بند بھی نہیں پڑھ سکیں گے۔ انھوں نے رباعی پڑھی پھر سلام کے کچھ اشعار پڑھے۔ انھیں میں یہ شعر بھی تھا ؎

گلا بچہ کا نازک ، تن میں رعشہ ، درد بازو میں

نکالا کانپتے ہاتھوں سے شہ نے تیر کیوں کر سے

پھر انھوں نے مرثیہ شروع کیا اور آواز کھلنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں اُن کی شخصیت اس طرح بدلی کہ پھر وہ مریض و علیل دولہا صاحب نظر نہیں آتے تھے۔ سینہ کشادہ ہو کر جسم پر انگرکھا چست ہو گیا، گال پھول گئے، کاندھے چڑھ گئے اور پھر وہی پاٹ دار آواز جس کے ہم مشتاق تھے بلند ہونے لگی۔ انھوں نے تقریباً تین گھنٹہ میں پورا مرثیہ پڑھا، پوری طاقت سے پڑھا اور اسی انداز سے پڑھا جو اُن کی امتیازی شان تھی۔ یہ مرثیہ امام حسین کے بھانجوں یعنی جناب زینب کے صاحب زادوں عون و محمد کے حال میں تھا اور یقیناً میر نفیس کے اُس مرثیہ کو سامنے رکھ کر کہا تھا جس کا مطلع تھا

کیا جگر بند شہنشاہِ رسالت کو ملے

لیکن ہر مقام بہت الگ ہو کر کہا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عروج نے آخر میں وہی سولہ بینیہ بند شامل کر لیے تھے جن پر نفیس کا مرثیہ ختم ہوا تھا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ نفیس نے ان سولہ بندوں کو کچھ اس طرح پڑھ دیا تھا جس کی مثال خود انھیں کے پڑھنے میں کبھی نہیں ملی تھی، اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ مجلس اُن کے پڑھنے کی آخری مجلس تھی۔ دولہا صاحب بھی ان بندوں کو کچھ اسی طرح اپنی آخری مجلس میں پڑھ گئے تھے کہ سننے والوں کے دلوں پر جن میں راقم بھی شامل ہے آج تک تاثر باقی ہے۔ جہاں تک مرثیہ میں فنی کمال کا معاملہ تھا اُس کا چہرہ یقیناً نفیس کے مرثیہ کے مقابل میں بہت کمزور تھا لیکن بعض دوسرے مقامات مقابلتاً بہتر نہیں تھے تو کم تر بھی نہیں تھے۔ بالخصوص عون و محمد کا سراپا بہت عمدہ نظم کیا تھا۔ مثلاً چند بند درج ذیل ہیں۔

اے زہے نور و جمالِ دل و جانِ حیدر ماہ چھپ جائے جو کرے اُن کی جبینوں پہ نظر

کم نہیں مصحفِ رب سے کبھی زیر میں یہ سر لیلۃ القدر سے ہیں قدر میں یہ گیسو بڑھ کر

پھر کے آغوش میں زلفوں نے جو بل رکھے ہیں

شبِ معراج میں قرآن کھلے رکھے ہیں

سورۂ قدر کے آئے ہیں بعینہ ابرو    ہیں مژہ زیر و زبر فرق نہیں ہے سر مو
دیکھیں ان آنکھوں کی شوخی تو خجل ہوں آہو    قامتیں وہ کہ فدا جن پہ ہو سروِ لبِ جو
باڑھ پر اب جگر و جانِ بتول آتے ہیں
ساتھ ان تازہ نہالوں کے پھول آئے ہیں

ضوفگن ہوتے ہیں رخسارۂ نورانی جب    تاب سے آنکھ جھپک جاتی ہے خورشید کی تب
گو کہ سوکھے ہوئے ہیں پیاس کی شدت کے سبب    کھیل اعجازِ مسیحا کو سمجھتے ہیں یہ لب
منزلت پیش خدا سب سے سوا ان کی ہے
جو کرے مردوں کو زندہ وہ دعا ان کی ہے

ہیں چمن خال و لب و عارض و گیسو ان کے    سینے حُبِّ شہِ والا سے مملو ان کے
رشکِ آئینۂ مہتاب ہیں پہلو ان کے    ہیں بھرے زورِ یداللہ سے بازو ان کے
پہلواں ہو جو نہ مرحب سا تو کیا زور کھلے
درِ خیبر ہو تو ان بازوؤں کا زور کھلے

چھوٹے چھوٹے سے عماموں کی سروں پر وہ پھبن    بر میں وہ چست قبائیں وہ سڈول ان کے بدن
گل سے رخ، مشک سے مُنہ، غنچہ لب پھول سی تن    کم سنی، بھول پنا، غیظ سے ترچھی چتون
ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے استادہ ہیں
جانیں لینے پہ بھی دینے پہ بھی آمادہ ہیں

دونوں جراروں کے چہروں پہ عجب کیسی رونق    دھوپ کی ہے نہ انھیں پیاس کی پروا مطلق
سامنے ان کے جگر شیروں کے ہیں خوف سے شق    دونوں آ کر نہ الٹ دیں کہیں لشکر کا ورق
جنگ کو کھیل سمجھ کر یہ دلیر آتے ہیں
بچے کہتے ہیں کہ بپھرے ہوئے شیر آتے ہیں

عروج کی صحت اس مجلس میں کئی برس قبل سے خراب ہو چکی تھی۔ کبھی سنبھل جاتے تھے تو کبھی پھر گر جاتے تھے۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں اکہتر برس کی عمر پا کر انتقال فرمایا۔ انھیں کی وفات کے ساتھ انیس و نفیس کے گھر کا درخشندہ و تابندہ چراغ گل ہو گیا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے فنون لطیفہ پر زوال آ گیا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس شہر کی آخری بہار خزاں ہو گئی۔

اسی مقام پر اُن افسوس ناک حالات کا بالاختصار ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو مرثیہ گو اور مرثیہ خواں حضرات سے متعلق مختلف ٹولیوں کے درمیان رونما تھے۔ انیسیے اور دبیریے پہلے ہی سے موجود تھے لیکن یہ اختلافات بیسویں صدی کی پہلی دہائی ہی میں قریب قریب ختم ہو گئے تھے اور جب اپنے شباب پر تھے اُس وقت بھی متعلقہ افراد کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ انیس اور دبیر کے درمیان کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اس دور میں غزل گو شعرا کی طرح مرثیہ خواں حضرات کی بھی ٹولیاں منظم ہو گئی تھیں۔ ایک طرف تو خاندان انیس اور میاں عشق کے گھرانے کے درمیان بدمزگی تھی تو دوسری طرف جو محاذ سردار صاحب نے نفیس کے خلاف قایم کیا تھا وہ ایک مدت تک برقرار رہا تھا۔ خانوادۂ انیس اور خاندانِ عشق کی اندرونی رقابتیں طشت از بام نہیں ہوئیں لیکن دوسرے محاذ کی گرماگرمی مجلسوں اور ممبروں تک پہنچ گئی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ خود انیس کے گھرانے میں رقابتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ عارف مرحوم کی نمود دوسرے عزیزوں کو شاق ہوتی تھی۔ وہ بھی مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے لیکن مرجعیت سے محروم تھے۔ چنانچہ سلیس ابن انیس کے صاحبزادے قدیم نے جیسا کہ کہا جاتا تھا سردار صاحب نے رابطہ قایم کر لیا تھا۔ قدیم جو مرثیہ پڑھتے تھے ایک ٹولی اُس کو انھیں کا کلام قرار دے کر آسمان تک بلند کر دینے کی قائل تھی تو دوسری طرف یہ کہا جاتا تھا کہ وہ کلام حقیقتاً کامل کا تھا۔ اور سردار صاحب نظم کرا کے قدیم کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ حقیقت امر جو کچھ بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ قدیم نے عارف کے خلاف اکھاڑہ قایم کر لیا تھا اور یہ گرماگرمی ایک مدت تک چلتی رہی تھی پھر بھی اتنا کہنا پڑتا ہے کہ لکھنؤ والوں نے کسی مقابلہ یا مجادلہ میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور باہم دگر اختلافات میں بھی متانت و سنجیدگی کو برقرار رکھا تھا۔

ناانصافی ہو گی اگر اس سلسلے میں اُن مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ یک لخت نظرانداز کر دیا جائے جن کا کوئی تعلق کسی مرثیہ گو خاندان یا صنفِ روسا و عمائدین سے نہیں تھا۔ وہ دورِ شعر و ادب کا تھا اور جس طرح غزل گو شعرا کی بہتات تھی اسی طرح بہت سے لوگ مرثیہ کہتے اور پڑھتے تھے۔ ان سب کو دنیا نے آج فراموش کر دیا ہے۔ انھیں فن کاروں میں ایک بزرگ قاری یعقوب علی خاں بھی تھے۔ قاری صاحب محلہ گولا گنج میں رہتے تھے، اُن کا قدیم مکان اب تک اپنی جگہ پر موجود ہے حالاں کہ اولاد ذکور میں اب غالباً کوئی نہیں ہے کیوں کہ اُن کے ایک ہی صاحب زادے تھے جنھوں نے عین عالمِ شباب میں قاری صاحب کی زندگی ہی میں انتقال فرمایا تھا۔ قاری صاحب نے ننانوے برس

کی عمر پاکر ۱۹۲۹ء میں انتقال فرمایا تھا اور آخر عمر تک شعر و سخن کا مشغلہ جاری رکھا تھا۔ غزلیات، قصائد، مرثیے، تاریخیں، ہر صنفِ سخن میں اُن کا کلام تھا۔ علمِ عروض میں درجۂ کمال پر فائز تھے اور صنائع و بدائع کے پرستار تھے۔ اُن کا بہت سا کلام صنعت غیر منقوط میں تھا اور اسی ربط سے دو تخلص اختیار کیے تھے۔ صنعتِ غیر منقوط میں مشقِ سخن فرماتے تو ہدد تخلص کرتے تھے ورنہ عام طور سے نصرت تخلص تھا۔ اُن کا ایک مرثیہ جس کا مطلع تھا

آمد ہے رن میں ضیغم شیر الٰہ کی

صنائع و بدائع کو یک جا کرنے کا بیش بہا کارنامہ تھا۔ یہ مرثیہ ۱۱۸ بندوں پر مشتمل تھا جس کے پہلے ۶۴ بندوں میں ۲۶ صنعتوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ یہ صنعتیں حسب ذیل تھیں۔

صنعت مرصع، صنعت جمع، صنعت عکس، صنعت تقسیم، صنعت رد العجز علی الصدر، صنعت ذو قافیتین، صنعت علّہ، صنعت تجنیس، صنعت توشیح، صنعت رجوع، صنعت لف و نشر، صنعت ارصاد، صنعت لزوم مالا یلزم، صنعت سیاق الاعداد، صنعت طباق، صنعت تفریق، صنعت مراۃ النظیر، صنعت اشتقاق، صنعت تحت النقاط، صنعت فوق النقاط، صنعت افطار، صنعت غیر منقوط، صنعت طرز العکس، صنعت مقلوب، صنعت مقطع، صنعت موصل۔

قاری صاحب انتہائی سادہ مزاج بزرگ تھے اور انتہائی سادہ زندگی بسر کر گئے۔ مرثیہ پڑھنے کا طرز بھی بلا تصنع تھا لیکن جذبات میں ڈوب کر مرثیہ پڑھتے تھے۔ پرنس ثریا قدر بہادر کے دربار سے منسلک تھے اور اُن کے یہاں مجالس بھی پڑھتے تھے۔ اپنے احباب کی فرمائش پر بلا تکلف مرثیہ پڑھ دیتے تھے۔ گولا گنج کے امام باڑہ داروغہ واجد علی میں بہت سی مجلسیں پڑھی تھیں جن میں راقم کو بھی شرکت کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ متذکرہ بالا مرثیہ راقم کے پاس موجود ہے۔

## نواں باب

# قدیم عزاداری

(۱) محرم و چہلم
(۲) تعزیے، شاہی اور عوامی
(۳) جلوس ہائے محرم و چہلم
(۴) مجالس و خواندگی
(۵) تقسیم تبرک

# (۱) محرم تا چہلم

ماہ محرم قمری کلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔ اس مہینہ کی دسویں تاریخ کو کربلا کے میدان میں امام حسین معہ اپنے بہتر اعزا و رفقا کے شہید کر دئے گئے تھے۔ اس المیہ کی یاد میں تمام مسلمانانِ عالم محرم آتے ہی متاثر ہو جاتے ہیں اور پہلے دس دن سوگ مناتے ہیں۔ اودھ کی سلطنت کے قیام سے پہلے لکھنؤ کے مسلمان بھی یقیناً محرم کے ابتدائی دس دنوں میں رائج الوقت مراسم عزا بجالاتے تھے۔ جن میں اسی زمانے کے طرز پر تعزیے بنتے اور رکھے جاتے تھے۔ تعزیہ خاص ہندوستانی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور شاہ نے ہندوستان میں اپنے دوران قیام تعزیے کی بنا ڈالی تھی جس کو بہت جلد رجعیت حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ شیخون کے دورِ اقتدار میں جو عزاداری ہوتی تھی اس میں اسی پرانے طرز کے تعزیے رکھے جاتے تھے اور مراسم میں باک بنوٹ، اکھاڑوں، ڈھول، دماموں، باجوں، تاشوں کا رواج تھا جو مدتوں تک اپنے پرانے طرز ہی پر برقرار رہا تھا اودھ کے فرمانروا ایرانی نسل اور عقیدتاً شیعہ تھے۔ اُن کو امام حسین کی عزاداری سے بہت شغف تھا اس لیے اودھ کی حکومت قائم ہوتے ہی جدید طرز کی عزاداری معرض وجود میں آگئی تھی۔ آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا تو کچھ ہی مدت کے بعد درباری مذہب شیعہ ہو گیا تھا۔ اور بہت جلد میر دلدار علی جو بعد میں مجتہد ہوئے مذہبی امور میں صاحبِ اقتدار ہو گئے تھے۔ انھوں نے عزاداری کی ترویج ہی نہیں کی بلکہ اس کی طرف میں اصلاحات بھی نافذ کیے۔ انھوں نے شہنائی، روشن چوکی اور ماہی مراتب کو جلوس ہائے عزا میں شامل کرنے کی مخالفت کی، ملک اور پٹے کے کرتبوں کو عزاداری کی متانت کے منافی قرار دیا، جانوروں کی تصاویر اور اُن کے مجسموں کو استعمال کرنا خلافِ شرع قرار دیا اور اُن سب لوازمات کے بجائے جنگی باجے کی اجازت دی۔ تعزیوں کے جلوسوں میں مہندی، علم اور ذوالجناح کی شمولیت کو جائز قرار نہیں دیا بلکہ ہمت افزائی کی کیوں کہ یہ تمام نئے لوازمات عزاداری کے جلوسوں میں ضروری قرار پا گئے لیکن اُن کے ممنوعات بھی برقرار رہے کیونکہ عوام میں ان کی مقبولیت مسلم تھی اور اودھ کے حکمراں اتنے وسیع النظر تھے کہ انھوں نے اپنی رعایا کے مذہبی رجحانات میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت کبھی پسند نہیں کی۔ درباری عزاداری میں مجتہد کا حکم جاری و ساری ہو گیا لیکن عوام کا چلن اپنے طرز پر برقرار رہا۔

محرم اور عزاداری کا یہ سلسلہ بہر حال دس دن تک جاری رہتا تھا اور محرم کی بارہویں تاریخ کو سوگ نشینی کی مدت ختم ہو جاتی تھی۔ یہی دستور آصف الدولہ، سعادت علیخاں اور غازی الدین حیدر کے زمانے تک جاری رہا تھا۔ غازی الدین حیدر کے صاحبزادے اور جانشین نصیر الدین حیدر فرمانروا ہوئے تو ان کی ملکہ نے امورِ مملکت میں کافی دخل حاصل کر لیا تھا۔ وہ کٹر قسم کی مذہبی خاتون تھی اور شیعیت میں اُن کے رجحانات ہندوؤں کے رسم و رواج سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ یہ انھیں کا اثر تھا کہ بادشاہ نے محرم کے مراسم میں اضافے کر کے بیسویں صفر تک سوگ نشینی کی مدت کو بڑھا دیا۔ نصیر الدین حیدر کو عزاداری اور سوگ نشینی سے اتنا شغف تھا کہ وہ اس ایک ماہ اور بیس دن میں تاجِ شاہی زیبِ فرق کرنے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ چونکہ بادشاہ کی تاج سے نسبت لازم و ملزوم کی تھی اس لیے وہ ان ایام میں مور کے پروں کا بنا ہوا مخصوص تاج استعمال کرتے تھے۔ محرم اور عزاداری سے گرویدگی جو نصیر الدین حیدر کو تھی وہی اُن کے بعد اُن کے جانشینوں میں بھی برقرار رہی بلکہ ایک کے بعد دوسرے کے دورِ اقتدار میں یہ دلبستگی بڑھتی ہی رہی۔ چنانچہ واجد علی شاہ کو محرم اور عزاداری سے اتنا انہماک تھا کہ وہ شبِ عاشور عوام کے گھروں میں جا کر تعزیے خانوں کی زیارت کرتے اور ہر ہر مقام پر کچھ چڑھاوا چڑھاتے تھے۔ ایک تو بادشاہ کا تشریف لانا اور دوسری طرف کچھ نہ کچھ مالی منفعت ہو جانا اس طرزِ عمل کی وجہ سے لکھنؤ میں گھر گھر تعزیہ داری کو فروغ ہو گیا تھا۔ بعد انتزاعِ سلطنت لکھنؤ والوں نے سوگ نشینی کی مدت میں توسیع کر کے اس زمانے کو ۸ ربیع الاول تک بڑھا دیا تھا اور وہی چلن اب تک برقرار ہے۔ اس طرح لکھنؤ میں عزاداری کی میعاد اب دو ماہ اور آٹھ دن ہے۔

اودھ کے حکمراں فراخ دل اور وسیع النظر تھے۔ انھوں نے اگر ایک طرف تعزیہ داری کو فروغ دیا تھا تو اسی کے ساتھ مقامی تیوہاروں کو بھی اپنا لیا تھا۔ درباروں میں بڑے بڑے تزک و احتشام ہولی کھیلی جاتی تھی اور جوش و خروش سے بسنت منایا جاتا تھا۔ اُن کی سرکار میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یکساں طور پر سرپرستی ہوتی تھی۔ اسی رواداری اور منصفانہ حُسنِ سلوک کی وجہ سے بھی لکھنؤ کی عزاداری کو جو پہلے ہی سے رائج تھی اور زیادہ مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ ہر شہری محرم آتے ہی عزادار نظر آنے لگتا تھا۔ محرم کا چاند دیکھنے کے بعد واجد علی شاہ سبز لباس پہن لیتے تھے اور اس کے بعد تمام ملازمین و متمسکین سیاہ پوش ہو جاتے تھے۔ گھر گھر تعزیہ داری ہوتی تھی۔ ہندو شعرا بھی مرثیے اور نوحے نظم کرتے تھے اور بعض

ہندو تعزیہ دار اپنے تعزیوں کے ساتھ خود اپنا ہی تصنیف کردہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان باتوں کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ انتزاعِ سلطنت کے تخمیناً پچاس برس بعد اس کسی قسم کا کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ہمارے شہر کا محرم اپنی آپ مثال تھا۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ عزاداری کے سلسلے میں جتنے رسم و رواج لکھنؤ میں رائج تھے ان کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے ملک میں یہاں تک کہ کربلا میں بھی جہاں امام کا مزار ہے کوئی عمل در آمد نہیں ہوا۔

اسی مقام پر فرماں روایانِ اودھ اور ان مقربین و ممسکین کے تعمیر کردہ مقدس مقامات کا مجملاً تذکرہ ضروری ہے کیونکہ انھیں قدیم یادگاران نے لکھنؤ کی عزاداری کو برسہارا دیا تھا۔ اودھ کے دو ابتدائی فرمانرواں نے اپنا مستقر دلّی ہی کو بنائے رکھا تھا۔ شجاع لدولہ وہ پہلے نواب وزیر تھے جنھوں نے فیض آباد کو ترقی دی اور اپنا دار الحکومت بنایا۔ اُن کو عزائے حسین میں بہت انہماک تھا۔ ڈاکٹر اے۔ ایل شری واستو اپنی انگریزی تالیف تاریخ شجاع الدولہ جلد اوّل میں تحریر فرماتے ہیں کہ شجاع الدولہ ماہ اگست ۱۷۶۰ء میں انوپ شہر کے مقام پر خیمہ زن تھے اور عشرہ محرم آگیا تو ان ایام میں سے کسی ایک دن نواب وزیر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سیاہ ماتمی لباس پہنے، برہنہ سر اور برہنہ پا ہو کر اپنے اور اپنے رفیقوں کے ہاتھوں میں علم لیے ہوتے تھے۔ وہ سب غمِ حسین میں مرثیے پڑھتے اور ماتم کرتے ہوئے ایک جلوس کی شکل میں جارہے تھے۔ شہر فیض آباد میں گلاب واڑی کے اندر انھیں شجاع الدّولہ کا مقبرہ ہے جہاں ان کی قبر کے سرہانے ان کی تلوار اور کلاہ رکھی رہتی تھی اور اس باغ میں دنیا کے قریب قریب ہر قسم کے گلاب تھے جن کی نگرانی کے لیے بہترین انتظام تھا۔ ایک جانب شہ نشین پر امام واڑہ تھا، جہاں بڑے پیمانے پر مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ شجاع الدّولہ کی بیگم نے جو بہو بیگم کے نام سے موسوم تھیں۔ اپنے لیے شہر کے باہر ایک عالی شان مقبرہ بنوایا تھا۔ بیگم کا مزار تہ خانہ میں ہے ایک زمانہ میں اس پر بڑی دری اور ایرانی قالین بچھا رہتا تھا اور سرہانے کٹ گلاس کا بہت خوبصورت اور قیمتی مردنگ کا جوڑ رکھا رہتا تھا۔ تہہ خانے کی چھت پر شہ نشیں میں امام باڑہ تھا جہاں بڑے پیمانے پر مجلسیں ہوتی تھیں اور محرم کی ساتویں تاریخ کو مہندی جلوس بڑے دھوم دھام سے نکالا جاتا تھا جس کی زیارت کو دور دراز سے لوگ آیا کرتے تھے۔ مقبرہ کے ملحقہ ارضیات پر بہترین لیچی کے باغات تھے۔ راقم کو گلاب باڑی اور مقبرہ کی بہاریں دیکھنے کا شرف حاصل ہے اس لیے اب ان مقامات کا خیال

کر کے دل بے قابو ہو جاتا ہے۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ میں اپنے لیے پہلے ایک امام باڑہ محلہ ٹھاکر گنج میں بنوایا تھا جو تعمیر ہو جانے کے بعد اُن کو ناپسند ہوا۔ وہ امام باڑہ انھوں نے اپنے خواجہ سرا میاں الماس کو عنایت کر دیا تھا اور اب انھیں کے نام سے موسوم ہے۔ پھر انھوں نے دوسرا امام باڑہ تعمیر کرایا جو اپنی رفعت و عظمت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا 'بڑا امام باڑہ کے نام سے مشہور ہے اور اسی میں آصف الدولہ کی آخری خوابگاہ ہے۔ ایک زمانہ میں یہاں کی آرائش و زیبائش عدیم المثال تھی اور بہت قیمتی ساز و سامان موجود تھا۔ بہرحال اب بھی یہ ایک عظیم المرتبت شاہی یادگار ہے اور مراسم عزا کے سلسلہ میں اس کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسی عہد میں دو امام باڑے اور تعمیر ہوئے تھے جن میں ایک موسومہ کالا امام باڑہ محلہ پیر بخارا میں آصف الدولہ کی والدہ محترمہ بہو بیگم صاحب نے تعمیر کرایا تھا اور دوسرا محلہ ٹھاکر گنج میں وزیر خزانہ راجہ جھاؤ لال نے بنوایا تھا۔ جہاں اب سال میں ایک مخصوص تاریخ پر عشرہ منایا جاتا ہے۔ آصف الدولہ کے جانشین سعادت علی خاں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی لیکن ان کے بعد اُن کے قائم مقام غازی الدین حیدر نے عدیم المثال عمارت شبیہ روضۂ حضرت علی بنوائی تھی جہاں وہ اور ان کی بیگم مدفون ہیں۔ یہ عمارت شاہ نجف کے نام سے موسوم ہے اور اس کے وسیع رقبہ میں بہت خوبصورت پارک میں لکھنؤ کی عزاداری میں اس تعمیر کا اہم مقام ہے۔ غازی الدین حیدر کے جانشین نصیرالدین حیدر نے ڈالی گنج یار کے ایک طویل و عریض علاقہ میں شبیہ کربلا بنوائی تھی۔ وہ اسی کربلا میں مدفون ہوئے اور اس کا نظم و نسق شاہ نجف اور حسین امام کے مشترکہ ٹرسٹ کے تحت چلایا جا رہا ہے۔ نصیرالدین حیدر کے دور میں شیعیت کا زیادہ فروغ ہوا جس کے نتیجہ میں عزاداری سے بھی انہماک بڑھا۔ ایام عزا کی مدت روز اربعین یعنی ۲۰ صفر تک بڑھا دی گئی اور آنے والے فرمانوں میں متبرک عمارات کی تعمیرات میں بھی کافی اضافے ہوئے تھے۔

نصیرالدین حیدر کے جانشین محمد علی شاہ نے اپنی خوابگاہ کے لئے وہی امام باڑہ تعمیر کرایا تھا جو "چھوٹا امام باڑہ" کہلاتا ہے۔ یہ عمارت اپنے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش میں اپنی مثال آپ ہے۔ امام باڑہ کا ساز و سامان بھی قیمتی اور دیدہ زیب ہے اور اس کا انتظام بھی بڑی حد تک قابلِ اطمینان ہے۔ اخراجات کے لیے بادشاہ ابھی حیات ہی میں پورا پورا بندوبست کر گئے تھے۔ اسی سامان سے جو اس امام باڑہ کی تعمیر سے بچ گیا تھا عظیم اللہ خاں نے محلہ ٹھاکر گنج

میں ایک کربلا تعمیر کرادی تھی جو اب کربلائے عباس باغ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد علی شاہ کی ایک صاحب زادی نے اسی زمانہ میں ایک بلند و بالا امام باڑہ بنوایا تھا اور اس میں ایک ایسا ممبر رکھوایا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس سے زیادہ اونچا ممبر دنیا کے کسی کونے میں موجود نہیں تھا اور امام باڑہ کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ حسین آباد کے امام باڑہ سے بہ لحاظ تعمیر زیادہ خوب صورت ہے۔ یہ عمارت امام باڑہ مغل صاحب کے نام سے محلہ وزیر باغ میں موجود ہے۔
محمد علی شاہ کے اخلاف میں نواب سعید الدولہ نے تال کٹورہ کے قریب ایک کربلا بنوائی تھی اور ملکہ جہاں نے محلہ گولا گنج میں ایک وسیع امام باڑہ بنوایا تھا۔ کربلا بہر حال بہتر حالت میں ہے لیکن امام باڑہ کی زبوں حالی قابلِ عبرت ہے۔ اسی عہد میں محمد علی شاہ کے ایک مصاحب عظیم اللہ خاں نے ایک کربلا تال کٹورہ کے قریب اور ایک امام باڑہ حسین آباد کے نزدیک بنوایا تھا۔ محمد علی شاہ کے جانشین امجد علی شاہ نے سبطین آباد کا علاقہ قایم کر کے اسی میں ایک رفیع الشان امام باڑہ بنوایا تھا جہاں وہ مدفون ہیں لیکن اس بڑے علاقہ کا جو حشر ہوا وہ ایک خونچکاں داستان ہے جس کا نہ بیان کرنا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امجد علی شاہ کی بیگم نے محلہ عیش باغ سے متصل ایک کربلا تعمیر کرائی تھی جو کربلائے ملکہ جہاں کے نام سے موسوم ہوئی۔ کسی نہ کسی حال میں یہ کربلا اب تک برقرار ہے۔ واجد علی شاہ کے وزیر معتمد الدولہ نے ایک کربلا اور ایک امام باڑہ محلہ نرسی میں تعمیر کرایا تھا۔ دست بردِ زمانہ سے یہ عمارات موجود ہوتے ہوئے بھی اپنی اصل نوعیت کھو چکی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غدر کے بعد بعض انگریزوں نے مخالفانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہاں فری میسن لاج ہے۔ آخری تاجدارِ اودھ کو عزاداری سے بے پناہ شغف تھا لیکن اُن کی آخری خواب گاہ لکھنؤ سے ہزار ہا فرسخ دور مٹیا برج میں مقدر تھی۔ پھر بھی انھوں نے ایک عزاخانہ قیصر باغ میں بنوایا تھا اور اُس کا نام قصر البکا رکھا تھا۔ جو اب سفید بارہ دری کے نام سے مشہور ہے۔
ان شاہی عمارات کے علاوہ روسا و عمائدین نیز علما کے تعمیر کردہ امام باڑے بھی لکھنؤ میں اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ چنانچہ سبزی منڈی متصل وکٹوریہ اسٹریٹ کے عقب میں غفرآن مآب سید دل دار علی اور چوک میں سید تقی صاحب کے امام باڑے عظیم تاریخی حیثیت کے مالک ہیں۔ کٹرہ ابوتراب خاں میں نواب تجمل حسین خاں خلف خاں علامہ نواب تفضل حسین خاں کا امام باڑہ سیکڑوں برس پرانی عظمت کی یادگار ہے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ پر ناظم صاحب کا امام باڑہ اپنی جلالت قدر کا اب بھی مالک ہے۔ ناظم صاحب کا نامِ نامی آغا علی خاں تھا اور وہ دورِ شاہی میں منصبِ نظامت

پر فائز تھے۔ چاول والی گلی میں اکرام اللہ خاں کا امام باڑہ اپنی خستہ و خراب حالت کا ایک خاموش افسانہ ہے جہاں ایک زمانہ میں مرثیہ خوانی کی بڑی بڑی مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ مولوی گنج میں میاں داراب علی خاں اور گولا گنج میں داروغہ واجد علی کے امام باڑے عظمت پارینہ کی یادگاریں ہیں۔ ڈالی گنج میں نواب وزیر بیگم اور ترمنی گنج میں آغا ابو صاحب کے امام باڑے انتزاعِ سلطنت کی آخری بہار کے نمونے ہیں۔ دو جلیل القدر تاجر اپنی اپنی یادگاریں چھوڑ گئے تھے جو اب تک برقرار ہیں۔ ان میں ایک آغا باقر ایرانی النسل تھے جنھوں نے امام باڑہ غفران مآب سے متصل مکان بنانے کے لیے اراضی خریدی تھی۔ اُن کو خواب میں ایک نہایت متبرک عَلَم کی بشارت ہوئی جو زمین کھدوانے پر مل گیا۔ انھوں نے اُسی مقام پر امام باڑہ تعمیر کرایا اور وہ عَلَم وہیں نصب کر دیا۔ امام باڑہ انہیں کے نام سے موسوم ہے اور عقیدت مند ہر شب عاشور اُس عَلَم کی زیارت کرتے ہیں جو حقیقتاً ہیئت اور شکل میں اپنی آپ مثال ہے۔ دوسرے سوداگر کا نام بھی باقر تھا اور وہ عموماً باقر سوداگر ہی کہلاتے تھے اور شیشہ آلات کی تجارت کرتے تھے اُن کا تعمیر کردہ عظیم الشان امام باڑہ انھیں کے نام سے چوک کے قریب واقع ہے۔ ان امام باڑوں کے علاوہ متعدد مزاراتِ مقدسہ کی شبیہیں بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ مثلاً درگاہ حضرت عباس، اُسی سے متصل شبیہ نجف، محلہ کاظمین میں شبیہ کاظمین وغیرہ۔ کاظمین کی عمارت بہت قدیم ہے اور کہا جاتا ہے کہ برادران ہنود میں کسی کائستھ نے عقیدت مندی سے یہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔ سب سے زیادہ مرجعیت کربلائے تال کٹورہ کو حاصل تھی جہاں شیعہ اور سنّی، ہندو اور مسلمان سب ہی روز عاشورہ اور روز اربعین اپنے اپنے تعزیے دفن کرتے تھے اور عقیدت مندوں کا اژدہام لگا رہتا تھا۔

لکھنؤ کی قدیم معاشرت میں طوائفوں کو ایک مقام حاصل تھا چنانچہ اُن کے بھی بہت سے باڑے تھے جن میں چودھرائن کا چوک میں امام باڑہ بڑی شہرت کا مالک تھا۔ وہاں اب اصغر علی، محمد علی تاجر عطر کا دفتر اور شو روم ہے۔ اس کے علاوہ چاول والی گلی میں نجا اور اللہ بندی کے امام باڑے پل غلام حسین پر حیدری اور عبدالعزیز روڈ پر کنیز کے امام باڑے خواص و عوام کی توجہ کے مرکز تھے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ اس شہر میں اتنے امام باڑے تھے جن کی تعداد و تفصیل بتانا امر محال ہے ہر طبقہ کے لوگ کسی نہ کسی امام باڑے سے متمسک تھے اور بہتوں کے گھر میں انہی کے نام سے موسوم امام باڑہ تھا۔ اکثر و بیشتر امام باڑے اپنی نوعیت پر بھی باقی نہیں ہیں۔ بہر حال جو کچھ تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ شہر لکھنؤ کے باشندوں کو محرم اور عزاداری

سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ ان حالات کا سلسلہ بیسویں صدی کے اوائل تک برقرار تھا۔

محرم اور تعزیہ داری سے والہانہ شغف کا یہ عالم تھا کہ محرم ختم ہوتے ہی تعزیوں کے بعض صناع دوسرے محرم کے لیے کاروبار شروع کر دیتے تھے اور تعزیہ دار اپنے اپنے امام باڑوں کے لیے کچھ نہ کچھ نئی چیز یا چیزیں سال بھر خریدنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ چار پانچ ماہ قبل یہ انہماک بہت بڑھ جاتا تھا۔ اپنی اپنی حسبِ مقدرت نئی نئی وضع اور قطع کے نئے علم بنوائے جاتے تھے۔ علم کا اصل طرز پنجہ کی شکل کا تھا۔ لیکن فن کاروں اور صناعوں نے اتنی شکل کے علم بنا ڈالے تھے جن کی قسموں کی تعداد بتانا بھی محال ہے، نئے علموں کے ساتھ نئے ٹپکے بنوانا بھی ضروری تھا۔ ٹپکے عموماً تین یا دو درجوں کے ہوتے تھے اور ہر درجہ علیحدہ رنگ کا ہوتا تھا۔ ٹپکے عموماً گہرے رنگ کے کپڑے کے ہوتے تھے۔ روسا کے یہاں کارچوبی اور زربفتی ٹپکے اور طلائی یا نقرئی علم ہوتے تھے، متوسطین تانبے اور پیتل کے علم بنواتے اور ریشمی لچکے دار ٹپکے بنواتے تھے۔ سلمے اور ستارے کے خانہ ساز ٹپکے بہت دیدہ زیب ہوتے تھے اور بہت سے گھروں میں اُن کا رواج تھا۔ امام باڑوں کے متفرق ضروری سامان میں گلاب پاش اور اگر کی موٹی بتیوں کے لیے چھوٹی انگیٹھی کی ضرورت ہوتی تھی۔ امیروں کے یہاں نقرئی گنگا جمنی گلاب پاش اور چاندی کی انگیٹھی ہوتی تھی اور یہ دونوں چیزیں چاندی کی چھوٹی سینی میں رکھی رہتی تھیں۔ متوسط طبقہ والے مخصوص فرمائشیں کر کے اور وضع قطع کے بہتر ین نمونے پیش کر کے یہی ظروف پیتل یا تانبے کے بنواتے تھے۔ ہر امام باڑہ کا فرش ماہِ ذی الحجہ میں دھلوا دیا جاتا تھا اور سفیدی پھروائی جاتی تھی۔ امام باڑہ کا صاف ستھرا اور معطر رہنا بے حد ضروری تھا۔ قریب قریب ہر امام باڑہ ۲۸ ذی الحجہ تک سج جاتا اور دوسرے روز قبل غروب آفتاب تعزیے آجاتے تھے۔ انتیسویں تاریخ کو چاند نمودار نہ ہونے پر بھی مراسم عزا شروع ہو جاتے تھے۔

محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی سارا ماحول بدل جاتا تھا۔ عورتیں اور مرد سب ہی سیاہ پوش ہو جاتے یا سبز لباس پہنتے تھے۔ خواص و عوام سب کی مستورات چاند دیکھ کر فوراً تعزیہ خانے میں جا کر اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کرتی تھیں اور سب زیور اتار دیتی تھیں۔ یہ طریقہ کار سوگ نشین ہونے کی پہلی منزل تھی۔ بھر پور جوان اور تازہ بیاہی ہوئی عورتیں بھی زیورات اُتار دیتی اور چوڑیاں بڑھا دیتی تھیں۔ بعض روسا کے گھروں میں جوان عورتوں کو ننگے کان اور ننگے ہاتھ رہنا گراں گزرتا تھا۔ ان مستورات کو ہاتھوں میں کالے ڈورے میں چھوٹے موتیوں کے گنڈے

ہوئے لچھے اور ایسے ہی دُر کانوں میں پہن لینے کی اجازت رہتی تھی۔ طلائی اور نقرئی زیورات ایامِ سوگ نشین میں، جس کی مدت روزِ اربعین یعنی ۲۰ صفر کو ختم ہوتی تھی، پہننے کا قطعاً رواج نہیں تھا۔ پان کھانا بھی یک لخت ختم ہو جاتا تھا۔ مرد عام طور سے امام کے سوم یعنی ۱۲ محرم کے بعد پان کھانے لگتے تھے لیکن عورتیں مکمل طور سے چالیس دن تک سوگ رکھتی تھیں۔ پان کے بجائے کھوپرے یا سونف کا گوٹا استعمال ہوتا تھا۔ رئیسوں کے یہاں چکنی ڈلی کھائی جاتی تھی۔ محرم کے پہلے دس دنوں میں بعض خاندانوں کے یہاں بیماروں کا دوا علاج تک بند ہو جاتا تھا۔ ایسے مریض اپنے عقیدے کی طاقت سے شفایاب ہوتے تھے۔ اُن کو اگر پلنگ پر لٹانا ناگزیر ہوتا تو اُن کے لیے مخصوص طور پر پلنگ اُلٹا کر کے بچھا دیا جاتا تھا۔ صحت مند چالیس دن تک زمین کے فرش پر یا تختوں کے بستر پر سویا کرتے تھے۔ پلنگ اٹھ جاتے تھے اور مسہریاں ہٹا دی جاتی تھیں یا کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ باورچی خانوں میں مچھلی یا کسی اور ایسی چیز کے داخل ہونے کی ممانعت رہتی تھی جس کا مراسم خوشی سے کوئی ضمناً بھی تعلق ہو، اسی طرح کڑھائی چڑھنا یا کوئی چیز تلی جانا بھی ممنوع تھا۔ بعض خاندانوں میں بارہ دن تک نمک بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔ بزرگوں اور سن رسیدہ لوگوں کا کیا ذکر بارہ روز تک بچوں کو بھی ہنسنا ممنوع رہتا تھا۔ وہ سہواً ہنس دیتے تو بزرگ فی الفور ملامت کرتے تھے۔ مسرت کی تقریبات کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ چالیس دن تک مسّرت کا شائبہ بھی آنے نہیں پاتا تھا۔ اِن تمام واقعات و حالات کا دقیقہ سنجی سے جائزہ لیا جائے تو یہ صورتِ حال فوراً سمجھ میں آجاتی ہے کہ اُس زمانہ میں عزادارانِ حسینؑ واقعاتِ کربلا کو آپ بیتی سمجھ کر اس طرح سوگ رکھتے اور روتے تھے جیسے کوئی اپنے عزیزوں کو روتا اور اُن کا ماتم کرتا ہے۔ اُن کے لیے غم، احساسِ غم اور اظہارِ غم تینوں کیفیات کا طاری ہونا ضروری تھا اور اظہارِ غم میں وہ تمام رسم و رواج شامل تھے جو اپنے گھر کی کسی میّت کے بارے میں برتے جاتے تھے۔ چنانچہ جب روزِ عاشورہ گھروں سے دفن کرنے کے لیے تعزیے باہر نکالے جاتے تھے تو سر و پا برہنہ نوحہ پڑھتی اور ماتم کرتی ہوئی مستورات کے پیچھے ایک عورت لوٹے میں پانی بھرے چلتی اور امام باڑہ سے گھر کے صدر دروازہ تک پانی انڈیلتی جاتی تھی۔ یہی طریقہ اپنے گھر کی میت کے ساتھ برتا جاتا تھا۔

محرم کی پہلی تین تاریخوں میں مجالس کے علاوہ امام باڑوں کی آرایش و زیبایش، روشنی اور اُن کو معطر کرنے کی بھی فکر رہتی تھی۔ رئیسوں اور امیروں کے یہاں بڑے بڑے نہایت

رنگین وخوب صورت لیمپ مٹی کے تیل سے روشن کیے جاتے تھے اور جھاڑوں، ڈالوں اور شیشہ کی بنی ہوئی لالٹینوں میں رنگین اور سفید شمعیں جلائی جاتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی سبک اور خوب صورت انگیٹھیوں میں اگر کی موٹی موٹی بتیاں سلگائی جاتی تھیں اور ٹیکوں و ممبر وغیرہ پر شمامۃ العنبر کا عطر اچھی طرح مس کر دیا جاتا تھا۔ یہی عطر متوسط طبقہ کے لوگوں کے یہاں بھی استعمال ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنی اپنی حسب مقدرت بہتر سے بہتر روشنی کا بندوبست کرتے تھے. آرائش وزیبائش کے لیے دیواروں پر کتبے آویزاں کیے جاتے تھے۔ رئیسوں کے یہاں یہ کتبے قیمتی مخطوطے ہوتے تھے جن پر ائمہ کی منقبت میں اشعار یا آیات قرآنی خطِ نسخ و نستعلیق میں لکھے ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ تیسری تاریخ تک ہر عزادار اپنے معیار کے مطابق اور اپنی مقدرت کے بموجب اپنے گھر کے عزاخانہ کو آراستہ پیراستہ کر دیتا تھا اور حسن و جمال کے تمام لوازمات کی تکمیل حسب مراد کر لیتا تھا۔ شاہی امام باڑوں میں یہ جملہ انتظامات یکم محرم ہی کو مکمل ہو جاتے تھے اور اب بھی مکمل ہو جاتے ہیں۔

خواص و عوام کے امام باڑوں میں چوتھی لغایت چھٹی محرم کو مراسم عزا بجا لانے کے علاوہ بچوں کی منتیں پوری ہوتی تھیں اور اُن کے لیے مرادیں مانگی جاتی تھیں۔ عزاداری اور غمِ حسین میں آہ وزاری سے اتنی گرویدگی تھی کہ وہ لوگ بچوں کے حق میں دعائیں کرنے اور اُن کے طولِ عمر و ترقی درجات کے لیے مرادیں مانگنے میں بھی شہدائے کربلا کی یاد کو اپنا وسیلہ بناتے تھے۔ ان تاریخوں میں اپنے اپنے خاندانی دستور کے تحت کسی ایک روز بچوں کو امام باڑے میں گروین کیا جاتا تھا۔ منت کا ناڑہ گلے میں ڈالا جاتا اور منت کے کپڑے پہنائے جاتے تھے۔ یہ کپڑے بے حد سادہ، سستے اور کالے یا سبز رنگ کے ہوتے تھے۔ سبز رنگ کو ترجیح دی جاتی تھی کیوں کہ یہ رنگ آلِ رسول سے منسوب ہے۔ پانچویں محرم کو بچے درِ حسین کے فقیر بنائے جاتے تھے۔ گلے میں جھولی ڈال کر حاضرین سے بھیک مانگتے تھے۔ جو رقم وصول ہوتی غربا و مساکین میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ یہ رسم غالباً اس یاد دلانے کے لیے رائج تھی کہ حسین کے بچے ایک ایک دانہ خوراک اور ایک ایک قطرۂ آب سے محروم رکھے گئے تھے۔ اِن تمام رسموں میں سب سے زیادہ اسیر بنانے کی رسم تھی جو کہیں پانچویں اور کہیں چھٹی محرم کو انجام دی جاتی تھی۔ بچوں کے گلے میں طوق یا پیروں میں بیڑی اور کہیں طوق اور بیڑی دونوں ڈال کر اسیر بنایا جاتا تھا اور اسیری کی یہ علامت چہلم کے دن تک برقرار رکھی جاتی تھی۔ یہ منتیں ہر سال ہوتی تھیں اور آج کو بڑھانے کی مدت کا

تعین بچوں کی عمر کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ہر خاندان کا اپنا اپنا علیحدہ دستور تھا۔ کہیں بچے کے پانچ برس، کہیں دس برس، کہیں پندرہ برس اور کہیں اس سے بھی زیادہ عمر پا جانے کے بعد منت بڑھائی جاتی تھی۔ میرے ایک دوست جو کیننگ کالج میں میرے ہم درس تھے، اسیر بنتے تھے اور بی اے پاس کرنے کے بعد اُن کی منت بڑھائی گئی تھی۔ اب اِن منتوں اور مرادوں کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ لیکن پچاس برس قبل تک یہ تمام مراسم پوری توجہ کا مرکز تھے۔

انھیں مراسم میں ایک بڑی لطیف رسم بھی تھی جو آٹھویں محرم کو ادا ہوتی تھی۔ اُس روز دودھ اور شربت پر حضرت عباس کی نذر دلائی جاتی تھی۔ حضرت عباس میدان جنگ میں اپنی بھتیجی یعنی امام حسین کی پیاسی صاحب زادی کے لیے پانی لینے گئے تھے اور اُن کے ہمراہ مشک تھی۔ وہ پانی نہیں لاسکے اور شہید کر دیے گئے۔ انھیں کی یاد میں یہ رسم ادا ہوتی تھی۔ نذر دیا ہوا دودھ شربت ایک چھوٹی مشک میں بھر دیا جاتا تھا اور وہ مشک بچہ کے کاندھے پر رکھ کر اُس کو بہشتی بنایا جاتا تھا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کٹورہ رہتا تھا جس میں تھوڑا تھوڑا دودھ شربت انڈیل کر وہ حاضرین کو پلاتا تھا۔ یہ رسم بھی بچہ کی عمر میں مدت معینہ ختم ہو جانے پر بڑھا دی جاتی تھی۔ ہر رسم بڑھائی کے موقع پر مخصوص طور پر مجلس ہوتی اور تبرک فراخ دلی سے تقسیم کیا جاتا تھا۔

محرم کی ساتویں تاریخ قاسم ابن الحسن کی یاد کے لیے ہمیشہ مخصوص رہی ہے۔ قاسم کی عمر روزِ عاشورہ نو برس کی بتائی گئی ہے، وہ امام حسن کے بیٹے اور امام حسین کے بھتیجے تھے۔ بعض مستند روایات کے بموجب امام حسین نے اپنے بڑے بھائی کی وصیت پورا کرنے کے لیے اپنے بھتیجے کا عقد اپنی صاحب زادی سے شبِ عاشور کر دیا تھا۔ ان حالات میں اور جناب قاسم کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ساتویں محرم کو اُن کا غم بڑے زور و شور سے منایا جاتا تھا اور اُن کی عروسی کی یاد تازہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک بڑے ظروف یا ایک سے زیادہ سینیوں میں پسی ہوئی مہندی بھری جاتی تھی اور اُسی کے اوپر بڑی بڑی تو غیں روشن کی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی دودھ اور ملیدہ پر حضرت قاسم کی نذر ہوتی تھی۔ بعض خاندانوں میں اسی شب کو یا دن میں امام حسین کے گھوڑے ذوالجناح کی شبیہ بعد ختم مجلس امام باڑے میں پیش ہوتی تھی جس کے باعث گریہ و بکا میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ دودھ اور ملیدہ اس گھوڑے کو کھلایا جاتا اور اُسی برتن سے بعض لوگ عقیدتاً تھوڑا تھوڑا تبرک حاصل کر لیتے تھے۔ لگن میں جو دودھ ملیدہ بچ رہتا وہ اُسی شبیہ

ذوالجناح کے ہمراہ کر دیا جاتا تھا۔ حسین آباد مبارک پر مستقل طور پر ایک اعلیٰ درجہ کا گھوڑا پلا رہتا تھا اور اب بھی پلا ہے جس کو صرف شبیہ ذوالجناح بنانے کے کام میں لایا جاتا رہا ہے۔

ساتویں محرم کی طرح آٹھویں تاریخ بھی ایک ہی شہید کی یاد کے لیے ہمیشہ مخصوص رہی ہے۔ یہ شہید حضرت عباس علم بردار تھے۔ حضرت عباس امام حسین کے مختلف البطن چھوٹے بھائی تھے۔ آپ ہمیشہ امام حسین کے پروانہ وار شیدائی رہے تھے اور بے حد وفا شعار تھے۔ آپ کی شجاعت بھی ضرب المثل تھی۔ روزِ عاشورہ امام حسین نے اُن کو اپنی فوج کا علم دے کر سپہ سالارِ لشکر مقرر کر دیا تھا۔ میدانِ جنگ میں آپ کی روانگی بھی مخصوص طرز کی تھی۔ اپنی بھتیجی سے پانی لانے کا وعدہ کر کے اُس سے ایک مشک منگا کر اپنے علم میں باندھ لی تھی۔ لڑائی لڑتے ہوئے دریائے فرات تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور مشک میں پانی بھر لیا تھا۔ لیکن وہ پانی اہلِ حرم کے خیمہ تک نہیں پہنچ سکا۔ اور آپ کی شہادت دریا کے کنارے ہی واقع ہو گئی تھی۔ ان تمام واقعات کی یاد تازہ کرنے کے لیے حضرت عباس کے نام کا علم بھی مخصوص طرز کا ہوتا ہے۔ ہر امام باڑہ میں یہ علم سب سے علیحدہ اور تمام دوسرے علموں کے مقابلہ میں بلند تر ایک طویل چھڑ پر نصب رہتا ہے۔ چھڑ کے اوپر پھریرا منڈھا رہتا ہے اور علم میں پنجے کے ساتھ تیر سے چھیدی ہوئی ایک کپڑے کی بنی ہوئی مشک بھی آویزاں رہتی ہے۔ اس علم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ بڑے سے بڑے رئیس کے گھر میں یہ علم ہمیشہ تابے کا رہا ہے اور اس کا ٹپکا بھی برابر سادہ ہی بنتا رہا ہے لیکن اس علم کی عظمت کا احساس ہر عزادار کے دل میں ہیبت کی حد تک طاری رہا ہے۔ آٹھویں محرم کو دن گزر کے شام کے وقت ایک زمانہ میں بہت بڑے پیمانے پر حضرت عباس کی حاضری ہوتی تھی۔ بہترین بڑی بڑی نفیس شیر مالوں پر کباب مسالہ اور پنیر رکھ کر بڑی قابوں میں حضرت عباس کی نذر انھیں سے منسوب علم کے نیچے ہوا کرتی تھی۔ جو حاضری کہلاتی تھی۔ اسی شیر مال اور کباب کے بے شمار حصّے لوگوں کے گھروں پر دن ہی میں تقسیم ہو جایا کرتے تھے۔ رات کو آنے والے طہارت و عقیدت کے ساتھ علم کے نیچے حاضری چکھتے تھے۔ یہ حاضری ہر امام باڑہ میں آٹھویں محرم کو اب بھی ہوتی ہے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسم پوری کر دی جاتی ہے۔ خصوصیت و اہمیت ختم ہو گئی۔ لکھنؤ والوں نے شیر مال کو حضرت عباس کے نام سے کچھ ایسا منسلک کر دیا تھا کہ اُس روز بکثرت حصّے شیر مال ہی کے تقسیم ہوتے تھے۔ اصل شیر مال جو خوشبو، رنگ اور ذائقہ کی حامل تھی تقریباً پچاس برس سے مفقود ہے۔

نویں محرم کا دن گریہ و بکا کے لیے مخصوص تھا اور جب دن گزر کر رات آتی تو پرانے لکھنؤ میں اہل چل پچ جاتی تھی۔ ہر شیعہ کا گھر نو دن قبل ہی سے عزاخانہ رہتا تھا۔ اہل سنت والجماعت کے یہاں محرم کی چھٹی سے تعزیے آنے لگتے تھے، اہل ہنود بھی شب عاشور بکثرت تعزیہ دار ہو جاتے، وہ خود مرثیے پڑھتے یا پڑھواتے، ہندو اور مسلمان عورتیں جھنڈ بنا کر بیٹھتی تھیں اور بڑے درد انگیز لہجے میں "دہے" گاتی تھیں۔ عام مسلمانوں میں ڈھول اور تاشے بجانے کا دستور تھا۔ ماتمی دستوں کی طرح ڈھول تاشے بجانے والوں کے بھی دستے تھے۔ یہ لوگ تعزیوں کے آگے ڈھول تاشے بجا کر واقعۂ کربلا کی یاد تازہ کرتے تھے۔ ان آوازوں کے ساتھ سینہ زنی اور گریہ و بکا کی صدائیں زمین و آسمان کو متاثر کرتی تھیں۔ ہر گلی کوچہ میں رات بھر آمد و رفت رہتی تھی۔ بلا تفریقِ مذہب و ملت اور بلا امتیازِ مدارج و آئین ہر شخص کو امام باڑوں کی زیارت کی آزادی رہتی تھی۔ ہر امام باڑہ میں شب عاشور آرائش و زیبائش دوبالا ہو جاتی تھی اور روشنی کا اہتمام تکمیل تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ شاہی امام باڑوں میں آٹھویں اور نویں دونوں تاریخوں میں زبردست روشنی ہوتی تھی لیکن شب عاشور ہر شہری کو زیارت کے لیے اذنِ عام ہوتا تھا۔ ان امام باڑوں میں سونے چاندی کے علموں کی چمک کارچوبی اور زربفتی پٹکوں کی دمک اور بلور کی طرح شفّاف جھاڑوں اور فانوسوں سے چھنتی ہوئی روشنی اور ہر طرف بے پناہ روشنی کو دیکھ کر آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگتی تھی۔ اس شب میں خواص و عوام بھی اپنے اپنے عزاخانوں اور تعزیہ خانوں میں زیادہ سے زیادہ روشنی کا انتظام کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں برقی روشنی نہیں تھی لیکن اس سے بہتر طریقہ پر جھاڑ، فانوس، یک ڈالہ دو ڈلے، مردنگ، شمعدان اور شیشہ کے رنگ برنگ لیمپ اپنے حسین و خوب صورت گلوبوں سمیت روشن ہو کر تجلّی اور نور برساتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کافوری شمعوں اور رنگین چھوٹی بڑی طوغوں کی روشنی بہت بھلی لگتی تھی۔ (طوغیں بڑی بڑی رنگین شمعیں ہوتی تھیں جن پر روپہلی یا سنہری کاغذ کی پٹیاں خوب صورتی کے لیے لہریا انداز میں لگی ہوتی تھیں لیکن مخصوص موقعوں پر خوش نمائی اور رنگین روشنی کے لیے بھی استعمال ہوتی تھیں۔) لیکن اس تمام آرائش و زیبائش اور تجلّی و نورانیت کے باوجود کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر وہ شخص جو گھر سے باہر نکلتا تھا اپنے کسی عزیز و قریب کی میّت کو کاندھا دینے جا رہا تھا۔ اہالیانِ لکھنؤ بالعموم یہ سمجھا کرتے تھے کہ امام حسین پہلی محرم سے انھیں کے یہاں مہمان تھے اور اب اُن کو رخصت کرنے کا وقت آگیا تھا۔ شب عاشور اُن کے تصوّر میں شبِ رخصتِ امام تھی۔ اس لیے اُن کے نوحہ و بکا اور اُن کے ڈھول

تاشوں سے بھی ہائے ہائے ہائے امام کے تاثرات دلوں پر پیدا ہوتے تھے۔

روزِ عاشورہ طلوعِ آفتاب کے بعد ہی سے تعزیے اُٹھنے کی گھما گھمی شروع ہو جاتی تھی۔ جہاں سے تعزیہ نکلتا یہ معلوم ہوتا کہ بھرے گھر سے جنازہ نکل رہا ہے۔ اور اس جنازہ کو عزیز و اقارب دھوم سے اٹھانا چاہتے ہیں۔ مرنے کے بعد میت سے متعلق قریب قریب تمام ہندو اور مسلمان رسموں پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ اس عمل درآمد میں اجتماعی شان اور زیادہ اثر پیدا کر دیتی تھی۔ ہر تعزیہ دار اپنا تعزیہ اٹھانے کا وقت خود مقرر کرتا تھا۔ اور سارے انتظامات خود ہی کرتا تھا۔ عمالِ حکومت کو ان معاملات میں بہت کم دخل تھا۔ سب تعزیوں کے لیے نخاس تک پہنچ جانے کے بعد صرف ایک راستہ اور ایک قبرستان تھا۔ تال کٹورہ کی کربلا، جہاں سب تعزیے دفن ہوتے تھے، تعزیوں کے ساتھ ساتھ علیحدہ علیحدہ مجمع رہا کرتا تھا۔ یہ علیحدگی اپنے اپنے ذوق و مذاق کے تحت ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ کہیں نوحہ خوانی ہوتی تو کہیں سوزخوانی اور کہیں صرف ماتم ہوتا یا گریہ و بکا کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ زائرین و سامعین اپنے اپنے شوق کی آسودگی کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں منقسم نظر آتے تھے۔ اس بظاہر علیحدگی اور بباطن اشتراک میں اکھاڑے بھی چلتے تھے لیکن اُن کے ڈھول تاشوں کی آوازوں یا پھری گتکوں کی ورزشوں سے رونے والوں کے گریہ و بکا میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا اور نہ اُن سوگواروں نے ان مظاہروں کو خلافِ شرع قرار دے کر کبھی کوئی تعرض کیا۔

بہر حال لوگ جوق در جوق تعزیوں کی زیارت کرتے اور اچھے سے اچھے مرثیے اور نوحے سنتے تھے۔ اُس زمانہ کی نوحہ خوانی میں ترنم ضرور تھا لیکن موسیقی نہیں تھی۔ اسی طرح ماتم ہوتا تھا مگر نپے تلے ہاتھ چلتے تھے اور دیوڑھ ہوتی تھی۔ انھیں نوحہ خوانوں میں طوائفیں بھی تھیں جو اپنے اپنے تعزیوں کے ساتھ خود ہی خوانندگی کرتی تھیں۔ ایسے تعزیوں میں حیدر جان، بدرمنیر مہرمنیر (یہ دونوں بہنیں چودھرائن تھیں)، بتن، مغل جان، نجا وغیرہما کے تعزیے بڑی شہرت، عظمت اور قوت کے مالک تھے جن میں رؤسا، شرفا اور عوام شرکت کرتے تھے اور خاموش تماشائیوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اتنے بڑے اجتماع میں نہ لوگ ایک دوسرے سے بلا ضرورت گفتگو کرتے تھے اور نہ چہروں پر مسکراہٹ آتی تھی۔ شبِ عاشور کے جاگے سارا دن حزن و ملال میں گزارتے تھے۔ ان میں بیمار بھی فاقہ ضرور کرتے البتہ مجبوراً پانی پی لیتے تھے۔

ہندو تعزیہ داروں میں ایک عجیب قسم کی رسم رائج تھی۔ کچھ لوگ شبِ عاشور "پیک" بنتے تھے۔ ان کو کوئی "پائک" اور کوئی "نائک" کہتا تھا۔ اُن کا انتہائی نامانوس لباس ہوتا تھا۔ سر پر پگڑی مگر عام پگڑی سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ سر پر کپڑے کے تھان کو پیچ در پیچ لپیٹ کر اوپر ایک اونچی سی نوک نکال لیتے تھے۔ کمر میں پٹکا بندھا ہوتا تھا اور درجنوں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لٹکائے رہتے تھے جو ذرا سی حرکت میں ٹن ٹن بولنے لگتی تھیں۔ "پیک" کے ہاتھ میں مرچھل رہتی تھی اور یہ آدمی روزِ عاشورہ نکل پڑتا تھا اور برابر حرکت میں رہتا تھا۔ ہر وقت اِدھر سے اُدھر دوڑتا۔ اس تعزیہ سے اُس تعزیے کے قریب جاتا۔ اس مجمع سے مل کر دوسرے مجمع کے قریب ہو کر گزر جاتا۔ راہ دوڑ کر چلتا اور اگر کسی مقام پر ٹھہرتا تب بھی دونوں پاؤں کو برابر حرکت دیتا رہتا اور یہ حرکت بھی تیز تیز اور زور سے ہوتی تھی۔ یہ شخص نہ کسی سے بات کرتا اور نہ کسی نوحہ خوانی یا ماتم زنی میں کوئی حصہ لیتا تھا۔ اور نہ اُس کی زبان سے روزمرہ کی گفتگو کا کوئی کلمہ نکلتا تھا۔ وہ خاموش رہتا تھا لیکن اِدھر سے اُدھر جا کر ہر گوشہ، ہر مجمع اور ہر موقع و محل سے کہہ اُٹھتا تھا کہ "حسین کشتہ شد"۔ اس ایک فقرہ کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا فقرہ یا لفظ کسی "پیک" کی زبان سے نہیں سنا گیا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ شخص قاصد بن کر قتلِ حسین کی خبر مزارِ رسول، تربتِ علی، مرقدِ فاطمہ اور تمام دین دار انسانوں کے کانوں تک پہنچاتا تھا۔ "پیک" کس ذات یا کس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ تخمیناً پچاس برسوں سے یہ رواج بھی ختم ہو چکا ہے۔

شیعہ مسلمان عام طور سے کوئی دنیاوی کام روزِ عاشورہ نہیں کرتے تھے۔ دن بھر فاقہ کرتے، پیاسے رہتے اور ڈلی تمباکو تک نہیں کھاتے تھے۔ خاموشی کے ساتھ سر و پا برہنہ گھروں سے نکل کر اپنے تعزیوں کے ساتھ یا دوسرے تعزیوں کی رستہ میں زیارت کرتے ہوئے کربلا پہنچ جاتے تھے اور اعمالِ عاشورہ کر کے سارا وقت حزن و ملال میں صرف کرتے تھے۔ دوسرے شہری بھی سویرے ہی گھروں سے نکل آتے اور دن بھر تعزیوں کی زیارت کرتے تھے۔ صبح سے سہ پہر تک راستوں، سڑکوں اور گلیوں میں مجمع لگا رہتا تھا۔ کربلا میں خصوصیت کے ساتھ اژدھام ہوتا تھا۔ برادرانِ اہلِ سنت اور ہنود باقاعدہ فاقہ نہیں کرتے تھے لیکن دن بھر گھر واپس جانے کی کسی کو فرصت نہیں ملتی تھی۔ کربلا میں نیز راستوں پر اشیائے خوردنی کی دوکانیں لگ جاتی تھیں۔ ان دوکانوں نیز کربلا کے باہر میدانوں میں رؤسا و عمائدین کی چھولداریوں کی وجہ سے میلے کی شان ضرور پیدا ہو جاتی تھی۔ اور بعض غیر شیعہ حضرات نیز اُن کے ہمراہ چھوٹے بچے کچھ کھا کر پانی

پیتے تھے۔ عام مسلمان اور ہندو صاحبان روزِ عاشورہ کربلا میں پانی کی سبیلیں بھی رکھتے تھے لیکن روزِ عاشورہ زیادہ تر لوگ بالاعلان کھانے پینے سے اجتناب کرتے تھے۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد کربلا سے واپسی ہوتی تھی تاکہ عصر کے وقت تک سب تعزیہ دار اور سوگوار اپنے اپنے عزاخانوں اور گھروں تک پہنچ جائیں۔ عصر کے بعد یعنی غروب آفتاب سے دو تین گھنٹے قبل فاقہ شکنی کا وقت آجاتا ہے۔

عمائدین و شہزادگان اور جلیل المرتبت روسا روزِ عاشورہ باہر نہیں نکلتے تھے۔ وہ اپنی محل سراؤں میں کسی تنہائی کے مقام پر سارا دن گزارتے تھے البتہ فاقہ شکنی کے وقت اپنے اپنے امام باڑوں میں اپنے متعلقین و ملازمین کی فاقہ شکنی کراتے اور کھانا کھلاتے تھے۔ اُس زمانہ میں ہر کھانا خوش ذائقہ اور خوش رنگ پکتا تھا اور انواع و اقسام کی غذائیں موجود رہتی تھیں لیکن اُس دن یہ خیال ملحوظ رہتا تھا کہ غذائیں سادہ اور بے کیف ہوں، اس لیے رئیسوں کے دسترخوان پر صرف باقر خوانی، سالن کباب اور دال چاول پر اکتفا کی جاتی تھی۔ یہ خیال بہر حال رکھا جاتا تھا کہ رنگ و خوشبو کے لوازمات سے اُس روز کے کھانوں کو محروم رکھا جائے اور کوئی چیز دسترخوان پر شیرینی کی قسم سے نہ آنے پائے۔ جن مخصوص چیزوں پر امام کی نذر ہوتی وہ نانِ جویں اور ساگ نیز دودھ شربت ہوتی تھیں۔ نذر کی پلیٹ رئیس کے سامنے رکھی جاتی اور وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسروں کو تھوڑا تھوڑا تبرک پہلے چکھا دیتے تھے۔ پھر کھانا شروع ہوتا تھا۔ ممتاز اور مشہور امام باڑوں میں بھی سادہ پلاؤ سے فاقہ شکنی کرائی جاتی تھی۔ البتہ شرفا اور عوام کے گھروں میں "ست نجے" سے فاقہ توڑا جاتا تھا۔ یہ غذا سات قسم کے اجناس کو بھون کر تیار ہوتی تھی جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتی تھی کہ بعد قتلِ حسین خیموں میں آگ لگا دی گئی تھی اور اجناس کی قسم سے جو کچھ بھی تھا سب بھن گیا تھا۔ ست نجے کے ساتھ اصل غذا کھڑے مسور کی دال اور چاول ہوتے تھے بعض خاندانوں میں ماش کی دال اور چاول کا رواج تھا۔ یہی غذا اب تک رائج ہے اور باقی سب لوازمات دسترخوان اور فاقہ شکنی کے ختم ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ "ست نجا" اب بھی کہیں کہیں تیار ہوتا ہو۔

ستر برس قبل شہر لکھنؤ میں سوگ نشینی اور حزن و ملال کا زمانہ یکم محرم سے شروع ہو کر یومِ اربعین کو ختم ہو جاتا تھا۔ اس میعاد کی ابتدا حقیقی معنوں میں حسین آباد کی ضریح اُٹھنے کے وقت سے شروع ہوتی تھی اور کربلائے تال کٹورہ میں "کالا تعزیہ" پہنچ جانے پر ختم ہو جاتی تھی۔

آخر دور میں نواب پتن صاحب کا تعزیہ سب سے آخر میں پہنچے لگا تھا۔ اربعین کا دن گزر جانے کے بعد مستورات و بیگمات سوگ بڑھا دیتی تھیں۔ پلنگوں پر لیٹنا شروع ہو جاتا تھا اور باورچی خانوں میں کڑھائی چڑھنے لگتی تھی۔ مردوں اور عورتوں میں پان کھانا شروع ہو جاتا تھا۔ چہلم کے بعد پھر کوئی تعزیہ نہیں اُٹھتا تھا۔ البتہ ۸ ربیع الاول کو چُپ تعزیہ اُٹھتا تھا جو وکٹوریہ اسٹریٹ سے اُٹھ کر گول دروازہ، چوک، اکبری دروازہ، پل غلام حسین ہوتا ہوا روضہ کاظمین تک جاتا تھا۔ بہت بعد میں ایام عزا کی میعاد بڑھا کر ۸ ربیع الاول تک بڑھا دی گئی جو اب تک برقرار ہے لیکن تال کٹورہ کی کربلا اور روز اربعین کو جو مرجعیت اور تاریخی اہمیت حاصل تھی وہ حالات بدلنے کے بعد بھی برقرار رہی تھی اور اب بھی قابلِ لحاظ ہے۔ کیوں کہ عزاداری کے سلسلہ میں بلا تفریقِ مذہب و ملت خواص و عوام میں جو مرجعیت اور مقبولیت تال کٹورہ کی کربلا کو حاصل تھی وہ کبھی کسی دوسرے مقام کو میسر نہیں ہوئی۔

کربلائے تال کٹورہ میں اربعین کو جو اجتماع ہوتا تھا اُس کی نوعیت روزِ عاشورہ سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ اول تو یہ سوگ نشینی کا آخری دن ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس روز کوئی فاقہ سے نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے طرح طرح کے اہتمام بھی رہا کرتے تھے۔ نخاس سے کربلا تک شیعوں کے علاوہ برادرانِ ہنود و اسلام بہ کثرت سبیلیں رکھتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں شربت و برف اور بعض ذی حیثیت ہلکی چیزوں مثلاً نارنگی یا سنگترہ سے بھی سوگ نشینوں اور ماتم کرنے والوں کی تواضع کرتے تھے۔ ان تواضع کرنے والوں میں راجہ امام بخش کی دریا دلی عدیم المثال تھی۔ کربلا کے بہت پہلے ہی سے اشیا خورد و نوش کی دوکانیں لگی رہتی تھیں، جن کی تعداد کربلائے متصل سیکڑوں تک ہو جایا کرتی تھی۔ صدر پھاٹک کے ایک جانب بیرونی میدانوں میں مقتدر روسا و عمائدین اور ڈیرے دار طوائفوں کی چھولداریاں نصب ہوتی تھیں اور اُسی کے عین مقابل مقامی حکام بالا کے لیے خیمہ لگتا تھا جہاں بعض روسا اُن کی شربت وغیرہ سے خاطر کرتے تھے۔ اربعین کے دن بھی کربلا میں بے شمار علم اور تعزیے آتے تھے لیکن سینہ زنی اور مرثیہ خوانی عشرہ کے مقابلہ میں زیادہ جوش و خروش سے ہوتی تھی۔ مجمع کا اژدھام بھی اس روز شام تک لگا رہتا تھا۔ لوگ کشمیریوں کے علم اور دو مخصوص تعزیوں کے منتظر رہا کرتے تھے اور یہی علم و تعزیے آخر میں آتے تھے۔ علم بے حد متبرک، محترم اور مقبول سمجھا جاتا تھا، محلہ گولا گنج میں واقع مقبرۂ عالیہ سے اُٹھ کر چہلم کے دن کربلا آتا تھا۔ یہ علم اب بھی برقرار ہے لیکن اپنے پرانے

اقتدار و احترام کا مالک نہیں رہا۔ تعزیوں میں ایک گراں قدر یادگار نواب ممتاز الدولہ بہادر کی تھی۔ اُن کے صاحب زادے نواب باقر علی خاں متولی حسین آباد اس تعزیے کو شاہی جلوس ہمیت اٹھاتے تھے اور یہی صورتِ حال اس تعزیہ کی اہمیت کا باعث تھی۔ دوسرا اور سب سے زیادہ ممتاز، باشکوہ اور مرجع خاص و عام وہ تعزیہ تھا۔ جو نواب پٹّن صاحب کا تعزیہ کہلاتا تھا جس کا مفصل تذکرہ اپنے مقام پر کیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ موجودہ دور میں اس تعزیہ کی عظمت و جبروت کا تصوّر کرنا بھی ناممکن ہے۔ اس کی زیارت کو بہت دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے اور حقیقت امر تو یہ ہے کہ اس کے بند ہو جانے کے بعد لکھنؤ کے چہلم کی شان و شوکت اور آب و تاب ختم ہو گئی۔

اسی سلسلہ میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ روزِ عاشورہ اور روزِ اربعین تال کٹورہ کی کربلا میں جمِ غفیر لگے رہنے کے یہ معنی نہ تھے کہ شہر کے تمام امام باڑے سونے پڑے رہتے تھے یا یہ کہ دوسری کربلائیں بند رہتی تھیں۔ ایسا نہیں تھا۔ امام باڑوں میں اپنے اپنے وقت سے مجلسیں ہو جاتی تھیں اور عَلم یا تعزیے جو اٹھنا ہوتے اُٹھ جاتے پھر اُن کو حسبِ معمول بند کر دیا جاتا تھا۔ تعزیے کربلاؤں میں دفن ہوتے تھے۔ ہر کربلا اپنے تعمیر کرنے والے کے نام سے موسوم تھی۔ اُسی خاندان کے لوگ اپنے اپنے تعزیے روزِ عاشورہ اور روزِ اربعین اپنی کربلاؤں میں دفن کر دیتے تھے اور اُس کے بعد اجتماعی عزاداری میں شرکت کرنے کی غرض سے تال کٹورہ کی کربلا چلے جاتے تھے۔ روسا و عمائدین، شرفا و عوام سب کا بلا تفریقِ مذہب و ملّت اُسی کربلا میں مجمع ہوتا تھا۔ اہلِ سنت اور برادرانِ ہنود ان سب کے تعزیے صرف اسی کربلا میں آتے تھے۔ یہ خصوصیت اس کربلا کو کئی وجوہ کی بنا پر حاصل تھی۔ یہ مقدس مقام وکٹوریہ اسٹریٹ کے بالکل اختتام پر واقع تھا۔ اور ہماری پرانی آبادی کا بہت بڑا حصہ اسی سڑک کے دونوں جانب آباد تھا۔ اس طرح وکٹوریہ اسٹریٹ کی پوری مسافت طے کرنا عزاداروں کے لیے ترویجِ عزا کا بہترین وسیلہ تھا۔ دوسرے یہ کہ برادرانِ اہلِ سنت و ہنود کے پاس اپنے اپنے تعزیے دفن کرنے کے لیے کوئی مخصوص کربلا نہیں تھی۔ تال کٹورہ کی کربلا کا بانی کوئی بادشاہ نہیں تھا اور نہ یہ املاک کسی رئیس کی ملکیت تھی۔ عوام الناس میں کچھ لوگوں نے اس کربلا کی تعمیر کرائی تھی اور ابتدا ہی سے عوام کو تعزیے دفن کرنے اور اپنے عزیزوں کی تدفین کے لیے بھی آسانی اور آزادی حاصل تھی۔ رفتہ رفتہ روسا و معززینِ شہر میں بہت سے مرنے والے اسی کربلا میں دفن ہوتے تھے اور

اس مقام کو اتنی عظمت حاصل ہوگئی تھی کہ یہاں دفن کیا جانا باعثِ مغفرت سمجھا جانے لگا تھا
اِن مرحومین کے اعزا واقارب کو روزِ عاشورہ اور روزِ اربعین اپنے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ
پڑھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ اموات اور تعزیے دفن کرنے کے لیے وسیع اراضی کی ضرورت
ہوتی ہے۔ تال کٹورہ کی کربلا بہت بڑے رقبہ میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کا احاطہ اتنا وسیع
تھا اور ہے کہ لکھنؤ کا بڑے سے بڑا مجمع باہر سے آنے والے بے شمار افراد سمیت یہاں اکٹھا
ہوسکتا تھا اور ہوا۔

## (۲) تعزیے، شاہی اور عوامی

مراسم عزا میں تعزیہ داری کو بہت اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ تعزیہ ہندوستان
ہی میں معرض وجود میں آیا تھا اور اسی ملک میں اُس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے
کہ تیمور بادشاہ ہر محرم میں امام حسین کے مزار پر حاضر ہوکر سوگ نشین ہوتا تھا۔ ہندوستان پر
حملہ آور ہونے کے بعد دورانِ جنگ محرم کا چاند نمودار ہوا اور اُس کے لیے مرقدِ مبارک پر پہنچنا
ناممکن ہوگیا۔ تب اُس نے اپنے مشیرکاروں سے استصواب کیا اور اُن کی رائے پر عمل کرتے ہوئے
روضۂ مطہر کی شبیہ تیار کرائی اور اُسی کے حضور گریہ کناں ہوکر اپنی عقیدت مندی کو آسودہ کیا
تھا۔ تعزیہ داری کی بنیاد اس طرح قایم ہوئی تھی اور یہ بھی یقینی ہے کہ تیمور نے جو شبیہ تیار کرائی
تھی وہ روضۂ مبارک کی ہوبہو نقل رہی ہوگی لیکن لکھنؤ میں جو عہدِ قدیم کی تعزیہ داری تھی اُس
میں تعزیوں کی شکل بالکل مختلف ہوتی تھی۔ اُن تعزیوں کا بالائی حصہ یعنی قبہ مندر کے مماثل ہوتا
تھا اور نیچے کی منزل میں تربت کی شکل کا ایک علیحدہ سے نمونہ بناکر رکھ دیا جاتا تھا۔ قرین قیاس
یہ ہے کہ برادرانِ ہنود جب واقعۂ کربلا کی یاد منانے لگے تو انھوں نے اُسی طرز کے تعزیہ کو پہلے
پہل بنایا ہوگا اور وہی عام طور سے رائج ہوگیا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک ہندوؤں
اور مسلمانوں سب ہی کے تعزیے اسی شکل و شباہت کے ہوتے تھے لیکن شاہی عزاخانوں میں
امام حسین کے مزارِ مبارک کی شبیہ ہی رکھی جاتی تھی جس کو ضریح کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں۔
ضریح کا رواج شاہی دور میں پڑا تھا اور بہت سے عمائدین و روسا نے اُسی کی شبیہ بنوانا
اور امام باڑوں میں رکھنا اختیار کرلیا تھا لیکن پرانے زمانے میں شبیہ ضریح عموماً لکڑی کی بنتی
تھی، روسا کے یہاں چاندی کے پتّر چڑھا دیے جاتے تھے۔ اور یہ شبیہ مستقل طور پر امام باڑوں

کی زینت بنی رہتی تھی۔

ضریح بنانے کا خیال سب سے پہلے اودھ کے حکمرانوں کے دماغ میں پیدا ہوا تھا یا پہلے سے موجود تھا؟ راقم اس سوال کا جواب فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ ہر شاہی امام باڑہ میں ضریحیں رکھی ہوئی ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہر حکمران نے اپنے امام باڑہ میں ضریح رکھوائی تھی۔ یہ ضریحیں لکڑی کی بنی ہوتی ہیں اور اُن پر چاندی جڑی ہے لیکن ہر ضریح مرصّع ہے اور اُس کی صنعت میں فن کاری شامل ہے۔ ان لکڑی کی نقرئی ضریحوں کے علاوہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غازی الدین حیدر نے ولایت سے بلور کی ضریح بنوائی تھی اور واجد علی شاہ کے لیے کربلائے معلّٰے سے خاکِ پاک کی ایک ضریح ہدیتاً آئی تھی۔ اس ضریح کی بادشاہ کو خواب میں بشارت ہوئی تھی اور اُس کی آمد کی باضابطہ خبر ملنے پر بادشاہ معہ اہالیانِ دربار کے شہر کے باہر تک استقبال کے لیے گئے تھے۔ مرزا غالب نے یہ حالات ایک قصیدے میں نظم کیے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

مگر در خواب دادند آگہی سلطان عالم را
کہ سوئے شاہ از پیش شہنشاہ اِمغاں بینی
طریق پیشوایان وحی الہام است، خاصان را
بود خوابے کہ تعبیرش بہ بیداری ہماں بینی
حجابے درمیانِ بندۂ و حق نیست پندارم
در آنجا آشکار است انچہ ایں جا در نہاں بینی

ضریح مبارک کو مجتہد العصر والزماں نے بہ نفسِ نفیس خود وصول کر کے اپنے ہاتھوں پر بلند کیا تھا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

محیط داد و دیں سید محمد کز فرومندی
مرا ورا جہاں آگہی صاحبقراں بینی
زہر جزو ضریح اقدس و دست ہمایوش
کفِ رضوان و مفتاح در باغِ جناں بینی

اور ضریح اقدس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ؎

ضیائے زاں زیارت گاہ بر روئے زمین بارد
کہ خاک لکھنؤ را مردم چشم جہاں بینی

تعالی اللہ ضریح فرخ فرخندہ جا مے
کہ فرتاب فروغ فرخی از وے عیاں بینی

لیکن یہ سانحہ بہت دردناک ہے کہ اب نہ غازی الدین حیدر کی بلّور والی ضریح موجود ہے اور نہ خاک پاک کی شبیہہ۔ دونوں گراں قدر مصنوعات غدر کے زمانے میں غائب ہو گئے۔ بہر حال ضریح مبارک کی شبیہوں کا رواج دورِ شاہی میں پڑ گیا تھا اور بادشاہوں کی تاسّی کرتے ہوئے روسا وعمائدین کے عزاخانوں میں ایسی ہی شبیہیں رکھی جانے لگی تھیں لیکن وہ امام باڑوں کی مستقل زینت رہا کرتی تھیں۔ دفن کرنے کے لیے تعزیوں کا چلن بدستور برقرار رہا جو اب تک رائج ہے۔ البتہ رفتہ رفتہ پرانے تعزیوں کی شکل وصورت بدلی اور اُن میں کسی حد تک ضریح کی وضع قطع آ گئی۔ وہ روسا وعمائدین جو ضریح کی شبیہوں کے پرستار رہے اُن کے یہاں کاغذ کی ضریحیں رکھی جاتی اور وہی دفن کر دی جاتی تھی۔ ان میں کی بعض ضریحیں بہت قیمتی ہوتی تھیں۔ آخر دور میں چھوٹی مہارانی محمود آباد کے یہاں کی ضریحیں جو اقبال منزل کے امام باڑہ سے تعزیوں کے نام سے اٹھتی تھیں ہزاروں روپیہ کی قیمت کی بنوائی جاتی تھیں۔ ایسی بہترین ضریحیں محمود آباد اور بسواں وغیرہ میں تقریباً مہینوں کی مسلسل محنت کے بعد تیار ہوتی تھیں۔ لکھنؤ والوں نے بہر حال تعزیہ سازی ہی پر زیادہ توجہ کی اور بہترین قیمتی تعزیے بنا ڈالے تھے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں بہتر سے بہتر، نفیس سے نفیس اور قیمتی سے قیمتی تعزیے بنائے، رکھے اور دفن کیے جاتے تھے۔ اُن کی تعداد اور تفصیلات پیش کرنا محال ہے اس لیے کہ ہر مذہب وملت اور ہر طبقہ کے لوگ تعزیہ دار تھے اور اُن میں ہر طبقہ اور بڑی تعداد میں افراد اپنے ذوق وشوق کے پابند رہ کر تعزیے بناتے یا بنواتے تھے۔ چنانچہ پیشہ ور اہل سنت اور اہل ہنود اپنے اپنے پیشوں سے متعلق تعزیے تیار کرتے تھے۔ مثلاً شیرینی فروش شکر اور بتاشوں کے، بھڑبھونجے جو اور مٹر کے، درزی کتاوؤ کے، چکن ساز چکن کے، منہیار چوڑیوں کے، کمہار مٹی کے، نداف کھجور اور روئی کے اور نجار لکڑی کے نہایت دلفریب اور دیدہ زیب تعزیے تیار کرتے تھے۔ اسی طرح اور بھی پیشہ ور تھے جو اپنی اپنی پسند کے تعزیے بنواتے اور رکھتے تھے۔ بعض لوگوں نے کچھ اور اختراعات کر ڈالے تھے اور پیتل، رانگہ، میناکاری وغیرہ کے بہت خوب صورت تعزیے بنائے تھے۔ سب سے زیادہ تعداد اُن

رنگ برنگ تعزیوں کی ہوتی تھی جو اپنے حسن و جمال اور رنگینی میں اپنا جواب ہی نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً سیاہ، سرخ، سبز اور سفید رنگ کے تعزیے جو انھیں ناموں سے مشہور بھی تھے۔ یہ سب تعزیے چوتھی لغایتہ چھٹی محرم اپنی اپنی مقررہ تاریخ پر نکالے جاتے اور چوک بازار ہوتے ہوئے اپنے اپنے مقاموں پر لے جاکر رکھ دیے جاتے تھے۔ پھر عشرہ اور چہلم کے دن گشت کرائے جاتے تھے۔ انھیں میں سے بعض تعزیوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں جو بیسویں صدی کے اوائل تک بڑی شان و شوکت سے نکالے جاتے تھے۔

**رسال دار کا تعزیہ:** رسال دار عبدالکریم خاں کابل سے آئے تھے اور انگریزی فوج میں ملازمت کرلی تھی۔ چنانچہ جس فوج نے ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کو فتح کرلیا تھا اُسی میں وہ بھی شریک تھے۔ بیگم حضرت محل کی شکست کے بعد حکیم میر مہدی بھی برجیس قدر کے ہمراہ نیپال چلے گئے تھے۔ انگریزوں نے اُن کا مکان واقع محلہ چوپٹیاں ضبط کرکے رسال دار کو بخش دیا تھا وہ اسی مکان میں رہتے اور تعزیہ داری کرتے تھے۔ روزِ عاشورہ سب سے پہلے محمد علی شاہ کی ضریح حسین آباد سے اٹھتی تھی اور چوک پل غلام حسین وغیرہ ہوتی ہوئی کاظمین جاتی تھی۔ اُس کے بعد ہی شہر کا پہلا عوامی تعزیہ رسال دار کا نکلتا تھا۔ اُن کے یہاں محرم میں ہر روز مجلس بھی ہوتی تھی جس میں اُن کے ہم قوم کابلی بڑی دریادلی سے خمیری روٹیوں کے ساتھ سالن یا دال کی ہانڈیاں، تقسیم کرتے تھے۔ رسال دار اپنے تعزیہ کے ہمراہ برہنہ پا اور برہنہ سر ہوکر خود ہی بڑے دل گداز اور رقت خیز انداز میں تنہا مرثیہ پڑھتے تھے، اُس کے بعد اُن کی برادری کے لوگ زنجیروں سے ماتم کرتے تھے آغا عبدالکریم خاں پہلے شخص تھے جنھوں نے سب سے پہلے زنجیروں کا ماتم رائج کیا تھا۔ رسال دار نے ۱۹۰۶ء میں طویل عمر پاکر انتقال کیا تھا۔ اُس کے بعد اُن کی بیوہ چنا بیگم یہ تعزیہ اٹھاتی رہی تھیں اور سرائے معالی خاں کے رسال دار آغا محمد جان بالکل اسی طرز پر مرثیہ پڑھتے جو رسال دار عبدالکریم خاں کا انداز تھا۔ کچھ برسوں کے بعد جب شہر کے حالات بگڑے تو یہ تعزیہ بند ہوگیا۔

**لال تعزیے:** اس نام کے متعدد تعزیے تھے جن میں دو بڑی ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ پہلا تعزیہ بہت قدیمی تھا۔ کہا جاتا تھا کہ عہدِ شاہی میں یہ تعزیہ ایک ہندو ہرکارے نے رکھا تھا۔ اُس کے بعد کہاروں کے ہاتھ میں پہنچا۔ جمنا کہار پھر گومتی کہار اٹھاتے رہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ تعزیہ منشی سرجو پرشاد نگم اٹھاتے تھے اور اپنا تصنیف کردہ مرثیہ پڑھواتے تھے۔ بعد میں یہ تعزیہ رامجی مل ساکنہ محلہ احاطہ صورت سنگھ اٹھانے لگے تھے اور خود ہی مرثیہ پڑھتے تھے۔ ۱۹۰۶ء

میں شیعہ سنی اختلافات رونما ہوتے تھے، اُن سے متاثر ہو کر انھوں نے تعزیہ رکھنا بند کر دیا۔ تب میاں چھٹو ٹھیکہ دار ترکاری منڈی چوک نے جوہری محلہ میں یہ تعزیہ رکھنا شروع کر دیا تھا لیکن اُس کی شکل کسی قدر تبدیل کر دی تھی۔ پہلے اُس کے بنگلے کے چاروں گوشوں کو پریاں سنبھالے رہتی تھیں جب مسلمانوں کے ہاتھ میں یہ تعزیہ آیا تو پریاں نکال دی گئی تھیں۔ میاں چھٹو اپنے تعزیہ کے ساتھ خود ہی نوحہ خوانی کرتے تھے۔ کچھ ہی مدت کے بعد حالات نے اُن کو بدل کر دیا اور تعزیہ بند ہو گیا۔

دوسرا امتیاز تعزیہ جو لال تعزیے کے نام سے مشہور تھا۔ کسی محلہ سے اُٹھ کر نخاس ہوتا ہوا تال کٹورہ کی کربلا جاتا تھا۔ اس تعزیہ کے ہمراہ راجہ مہرا کے خاندان کے ایک فرد لالہ ہر پرشاد مرثیے پڑھتے تھے۔ اُن کی آواز لہراتی ہوئی دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ صرف دو مرثیے پڑھتے تھے۔ ایک کا مطلع تھا ع

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے

اور دوسرے کا مطلع تھا ع

یارب کسی کا باغِ تمنا خزاں نہ ہو

یہ تعزیہ بھی تقریباً ستر برس قبل بند ہو گیا تھا۔

**چھلبداروں کا تعزیہ:** چھلبداروں کا فرقہ بھی اب یک لخت معدوم ہے۔ تقریباً ساٹھ پینسٹھ برس قبل تک اس فرقہ کے افراد معقول تعداد میں نظر آتے تھے۔ ان کی وضع قطع یہ تھی کہ سر پر ایک شملہ سا پگڑی پہنتے تھے جس کے بالائی حصہ پر ایک عجیب طرز سے سیاہ فیتہ ٹنکا ہوتا تھا۔ ہاتھوں میں ایک خنجری رہا کرتی تھی اور ایک لمبا جھولا کاندھے سے لٹکا رہتا تھا۔ گا بجا کر کسبِ معاش کرتے تھے۔ محرم کے زمانہ میں عزاداری کرتے تھے اور روزِ عاشورہ جھاؤ لوٹ کی ایک خوش نما ضریح نکالتے تھے اور خود ہی نوحہ پڑھتے تھے۔ یہ لوگ کچھ اتنے پُر درد اور ایسے المناک لہجہ میں نوحہ پڑھتے تھے کہ اُن کو سن کر متاثر نہ ہونا اور آب دیدہ نہ ہو جانا محال تھا۔ اس تعزیہ میں بڑا مجمع لگا رہتا تھا اور بعض قدر دان چھلبداروں کی زرِ نقد سے خاطر بھی کرتے تھے۔

**سفید تعزیے:** شہر میں بے شمار سفید تعزیے نکلتے تھے۔ جن میں بہت سے دلفریب اور دیدہ زیب ہوتے تھے لیکن دو تعزیے اپنا جواب ہی نہیں رکھتے تھے۔ ایک پاٹا نالہ پر بھندن نامی مسلمان دائی رکھتی تھی اور دوسرا بھورن ٹولہ متصل پھول والی گلی میں گنیشیا دائی کا تھا۔ ان دونوں تعزیوں کے تختوں اور مونڈھوں پر مختلف رنگوں کے تال میل سے ابرک کے پتر پر نہایت دلفریب

قلم کاری ہوتی تھی۔ جورات کو جگمگا کر آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی تھی۔ سفید بنگلے انڈوں کے مانند چمکتے اور مونڈھوں کے جوڑ بگلے کے پروں کی طرح سفید ہوتے تھے۔ بنگلوں کی جھالریں بھی نہایت دل کش اور دیدہ زیب ہوتی تھیں۔ بیسویں صدی کی دوسری دھائی کے دوران یہ دونوں تعزیے بھی بند ہو گئے تھے۔

**پیتل وغیرہ کے تعزیے:** پیتل کا تعزیہ امین آباد کی طرف سے اٹھ کر آتا تھا۔ اس کا بنگلہ نہایت خوش نما کرخی ہوتا تھا اور نیچے کے تخت میں روکار کی جانب امام باڑہ آصفی کے رومی دروازہ کی ہو بہو نقل بنی ہوتی تھی۔ اسی طرح لکڑی، شکر اور مٹی کے تعزیوں میں بھی رومی دروازہ کی نقل بنائی جاتی تھی۔ ادبار آیا تو یہ تمام صنعت گری بھی ختم ہو گئی۔

**چٹائی کے تعزیے:** چٹائی والے اپنے تعزیے کھجور کی پتیوں اور رنگ برنگ تاگوں سے بڑی صنعت گری سے بناتے تھے۔ طرح طرح کی چٹائیاں بنانے میں یہ فن کار اپنی اپنی دستکاری اور استادی کے جوہر دکھاتے تھے پھر انھیں چٹائیوں سے تعزیے بنتے تھے۔ ایسے تعزیوں میں حیدر گنج کے محمد بخش، سرائے معالی خاں کے رجب، پنبیس والی گلی کے رمضانی اور محلہ چوپٹیاں کے سکونت کے تعزیے بہت خوش نما ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ چاول والی گلی میں واقع امام باڑہ اکرام اللہ خاں کے پھاٹک میں خدا بخش اپنا تعزیہ رکھتے تھے۔ یہ تعزیہ مقابلتاً قد و قامت میں سب سے بڑا ہوتا اور اس کی چھتری میں نہایت خوش نما براق بنا ہوتا تھا۔ سکونت ساکنہ محلہ چوپٹیاں چھوٹے قد کا منحنی سا انسان تھا اور اسی کے قد و قامت کی مناسبت سے اس کا تعزیہ بھی منجھولا مگر بہت جاذب نظر ہوتا تھا۔ نویں محرم کو رات بھر اس تعزیہ خانے میں ایک ڈفالی مرثیہ پڑھا کرتا تھا۔ جن میں ہر سال یہ مرثیہ ضرور ہوتا تھا۔

جب حضرت علی اکبر میداں کو لگے جانے

اور اس کو سننے کے لیے ساری رات اتنا جم غفیر لگا رہتا تھا کہ راہ گیروں کے لیے اس سڑک سے گزر جانا دشوار ہوتا تھا۔

**مومی ضریح:** ڈالی گنج میں ایک فن کار کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ موم کو اس طرح گداز کر کے قلب ماہیت کر دیتا تھا کہ وہ سفید ہو جاتا تھا اور اس میں یہ صفت پیدا ہو جاتی تھی کہ موسم گرما کی شدت کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اسی فن کار سے محمد علی شاہ نے اپنی ضریح بنائی تھی جس کے کاغذ پر موم سے دل کش نقش و نگار اور گل بوٹے ہوتے تھے۔ اسی فن کار نے

اپنے لیے بھی ایک ضریح بنائی تھی جو قد و قامت میں چھوٹی تھی لیکن تمام صنعت کاریاں شاہی ضریح کی ایسی تھیں۔ یہ مومی ضریح نصف صدی قبل ہی ختم ہو گئی تھی لیکن حسین آباد کی ضریح برقرار ہے۔ صنعت کاری کا علم سینہ بہ سینہ چلتا رہا اور حسین آباد کی ضریح ہر سال اُسی پرانے فن کار کی اولاد کے حوالے رہی۔ یہ ضریح ہر سال بنتی اور روزِ عاشورہ دفن کر دی جاتی ہے لیکن اس طرف دس پندرہ برس سے وہی پرانی ضریح اٹھتی ہے اور پھر واپس لاکر امام باڑہ میں رکھ دی جاتی ہے۔ اُس کے درجہ علیحدہ علیحدہ ہیں، تلے اوپر رکھ دیے جاتے ہیں۔ پندرہ برس قبل اس کی تیاری پر تین سو روپیہ صرف ہوتا تھا، اب تین ہزار روپے میں بھی تیار نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فن کاری بھی ختم ہو گئی ہو۔

**چُوب تعزیے:** جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ تعزیے دو رنگے ہوتے تھا۔ غالباً صرف تین ایسے تعزیے بنتے تھے جن میں سب سے زیادہ پرانا تعزیہ محلہ راجہ بازار میں سرفراز علی کے نام سے موسوم تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تعزیہ محمد علی شاہ کے عہد میں تیار ہوا تھا۔ سرفراز علی اپنے وقت میں خود اپنے ہاتھ سے یہ تعزیہ بناتے تھے۔ دوسرا تعزیہ محلہ ٹاٹ پٹی میں غلام علی رنگ ساز کا تھا جو میناکار ہوتا تھا۔ یہ دونوں تعزیے تقریباً ستر برس قبل بند ہو گئے تھے لیکن تیسرا گپّے سبزی فروش کا تعزیہ کچھ اور مدّت تک برقرار رہا تھا۔ یہ تعزیہ حسین آباد کی پشت پر رکھا جاتا تھا اور اپنی آپ مثال تھا۔ بڑے قد کا بہت گٹھا ہوا، لمبائی میں نصف سرخ اور نصف سبز ہوتا تھا۔ اس کا بنگلہ کمرخی ہوتا تھا اور پورے تعزیے میں انتہائی خوب صورت سُنہری میناکاری ہوتی تھی۔ شب کی روشنی میں اس کا سُنہری پُرپتن کام کندن کی طرح جگمگا اٹھتا تھا۔ اُس تعزیے کو دفن کرنے کے بعد ہی دوسرے تعزیے کا ڈھانچہ بنانا شروع کر دیا جاتا تھا اور قریب قریب پورا سال اس کی تیاری میں صرف ہو جاتا تھا۔ اُس ارزانی کے زمانے میں بھی تقریباً پانچ سو روپے کی لاگت سے یہ تعزیہ تیار ہوتا تھا۔ تقریباً ساٹھ برس قبل یہ تعزیہ بھی بند ہو گیا تھا۔

**روئی کے تعزیے:** ایسے دو تعزیے بہت مشہور تھے۔ جن میں ایک سبزی منڈی چوک میں میاں سلارو اور دوسرا سعادت گنج میں میاں رجب رکھتے تھے۔ میاں سلارو کے انتقال کے بعد اُن کے لڑکے مولا بخش نے یہ تعزیہ برقرار رکھا تھا۔ یہ تعزیے مختلف رنگوں میں رنگی ہوئی روئی سے بڑی مشقت اور فن کاری سے تیار ہوتے تھے۔ بنگلے میں رنگارنگ لہردار پٹیاں بڑی خوب صورتی سے لگائی جاتی تھیں۔ ان تعزیوں میں سب سے بڑا کمال یہ دکھایا

جاتا تھا کہ کپاس کے نقلی پودوں کو، جو اپنی وضع قطع میں بالکل اصلی پودوں سے مشابہ ہوتے تھے، تخت کے چاروں گوشوں پر بہ طور گلدستہ آرائش کے لیے لگا دیا جاتا تھا۔ جو تعزیوں کی زیب و زینت کو دوبالا کر دیتے تھے۔

**چوڑیوں کا تعزیہ:** صنعتی حیثیت سے یہ تعزیہ قابلِ تعریف اور بہت دل فریب تھا۔ پاٹا نالہ پر رہنے والے ایک شخص حکیم نامی یہ تعزیہ بناتے اور رکھتے تھے۔ تعزیے کے لیے مختلف رنگ اور وضع کی شیشے کی چوڑیاں پہلے تیار کر لیتے تھے اور جو چوڑی جس جگہ پر زیب دیتی تھی اُس کو وہیں پر لگا دیتے تھے۔ تعزیے کے سہرے کے لیے بھی شیشہ کی خوش نما کڑیاں بناتے تھے۔ حکیم کے بعد اُن کے لڑکے گینڈو اور رزاق نے وضعداری برقرار رکھی تھی۔ پھر تعزیہ داری ختم کر دی۔

**نوگزا تعزیہ:** یہ تعزیہ ضریح کی شکل کا ہوتا تھا۔ اس کو کئی حصوں میں علیحدہ علیحدہ بنایا جاتا تھا۔ نویں محرم کو سہ پہر کے وقت موے کی مسجد کے قریب محلہ پاٹا نالہ میں ایک کھلے مقام پر سب حصے تلے اوپر رکھ کر تعزیہ کی شکل میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اس تعزیے کے بانی مسلمان کہار تھے جو یومِ عاشورہ ڈھول تاشے کے ساتھ اپنا تعزیہ دفن کرنے کے لیے کربلائے تال کٹورہ لے جاتے تھے۔ چوں کہ یہ تعزیہ نو گز بلند ہوتا تھا اس لیے دوسرے تعزیوں کے مقابلہ میں اونچا نظر آتا تھا۔

**مٹی کا تعزیہ اور چوپٹیوں کا بڈھا:** انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے کچھ ہی مدت بعد محلہ چوپٹیاں میں کچے پل کے قریب ایک کمہار نامی ٹیکارام نے مٹی کا ایک تعزیہ تیار کیا تھا۔ جو شکل و صورت میں ضریح سے مشابہ تھا۔ یہ تعزیہ ٹوٹ کا تھا جس کا ہر حصہ علیحدہ ہو جاتا تھا اور اُس کی بناوٹ میں روغنی مسالہ استعمال ہوا تھا جس کے سبب سے وہ ضریح بہت خوش نما معلوم ہوتی تھی۔ وہ کمہار ہر سال عشرہ محرم میں ضریح رکھتا اور بعد میں اُس کے حصے علیحدہ کر کے محفوظ کر لیتا تھا جو دوسرے سال محرم میں جوڑ کر تعزیہ داری کا مقصد پورا کرتے تھے لیکن اس کمہار نے اس ضریح کے ساتھ ایک پورے قد کا بیٹھا ہوا بڈھا بھی بنا ڈالا تھا جس کی صنعت گری اپنی آپ مثال تھی۔ رگ رگ اور تمام جوڑ بند سے ضعیفی کے تمام آثار نمایاں تھے۔ اس بڈھے کو دیکھ کر ہر شخص دنگ رہ جاتا تھا۔ چوپٹیوں کا یہ بڈھا مشہور ہوا تو لوگ ضریح کی زیارت کو بھی آنے لگے۔ ٹیکارام کے بعد بعد اُس کے لڑکے پھر پوتے اور اب غالباً پر پوتے

وضعداری کو برقرار رکھے ہیں۔ لیکن فن کاریوں کے قدر شناس نہیں رہے۔

**کالا تعزیہ:** عہدِ امجد علی شاہ میں یہ تعزیہ گرزماروں نے رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور انھیں کے نام سے ایک مدت تک منسوب رہا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ تعزیہ حسن نامی ایک انگریز کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ محلہ باگ ٹولہ متصل پھول والی گلی میں رہتے تھے اور اپنے مکان ہی میں تعزیہ داری کرتے تھے۔ اُن کے بعد گول دروازہ میں بقر عیدی سبزی فروش نے اس تعزیہ کو رکھنا شروع کر دیا تھا جس کا سلسلہ چند برسوں تک جاری رہا تھا پھر عام حالات کے تحت ختم ہو گیا۔ اس تعزیہ کو ایک تاریخی اہمیت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے تعزیہ رکھنے والوں کی اعانت کرنا چاہی تھی لیکن انھوں نے منظور نہیں کی اور صرف اس حق کی خواستگاری کی کہ اُن کے تعزیے کے پیچھے کوئی دوسرا تعزیہ نہ ہوا کرے، دربار شاہی میں یہ گزارش قبول ہوئی اور اُس کے بعد سے کالے تعزیے کے پیچھے کوئی دوسرا تعزیہ نہیں نکلا۔ اس تعزیہ کو دیکھنے کے بعد لوگ سمجھ لیتے تھے کہ اب اور کوئی تعزیہ نہیں آئے گا۔

مندرجہ بالا سب تعزیے اور اُن کے علاوہ بے شمار عوامی تعزیے روزِ عاشورہ اور بروز چہلم تال کٹورہ کی کربلا جاتے تھے۔ دفن ہونے والے تعزیے دفن کر دیے جاتے تھے لیکن مستقل تعزیے اور ضریحیں واپس ہو جاتی تھیں۔ تعزیہ داروں میں بھی بہت سے لوگ، چالیس روز تک اپنے امام باڑوں میں تعزیے رکھتے تھے اور چہلم کے دن اٹھاتے تھے۔ اس طرح کربلا میں دونوں دن مصروفیت کے ہوتے تھے۔ شاہی امام باڑوں میں بھی مستقل ضریحوں کے ساتھ کاغذ کے تعزیے رکھے جاتے تھے لیکن اُن کو دفن کرنے کے لیے علیحدہ بندوبست رکھا گیا تھا جو اب تک برقرار ہے۔ شاہی امام باڑوں کے تعزیے صرف روزِ عاشورہ اٹھتے اور دفن کر دیے جاتے تھے۔ شاہانِ اودھ صرف دس روز تعزیہ داری کرتے تھے۔ اُس کے بعد مجلسیں ہوتی تھیں۔ کوئی محرّمی جلوس نہیں نکلتا تھا۔ وہی دستور اب تک چلا آتا ہے۔ شاہ نجف کے تعزیے دریا پار والی ملکہ آفاق کی کربلا میں دفن ہوتے تھے۔ ملکہ آفاق محمد علی شاہ کی بیگم تھیں اُنھوں نے دریا پار کربلا بنوائی تھی اسی میں امام باڑہ، روضہ امام موسیٰ کاظم اور اُس غار کی بھی شبیہ ہے جہاں شیعوں کے عقیدہ کے مطابق بارہویں امام نے غیبت اختیار کی تھی۔ امام باڑہ آصفی کے تعزیے علی الصباح حسین آباد کے امام باڑہ میں منتقل کر دیے جاتے تھے جہاں سے وہ اُس امام باڑہ کی مومی ضریح اور تعزیوں کے ساتھ روضۂ کاظمین میں دفن کیے جاتے تھے۔ امام باڑہ آصفی کے تعزیوں

کے سلسلہ میں ایک تاریخی روایت قابلِ ذکر ہے۔ کہا جاتا تھا کہ آصف الدولہ نے جب اس امام باڑہ کی تعمیر کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے جائے وقوع کے ایک گوشہ میں ایک ضعیفہ کا مکان تھا جس کو حاصل کرنا بہت ضروری قرار پایا چنانچہ خریداری کی تجویز اُس عورت کے سامنے پیش کی گئی مگر اُس نے بیع کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ اس شرط سے اُس نے وہ اراضی حاضر کر دی کہ جب تک امام باڑہ قایم رہے گا اُس کے نام کا بھی ایک تعزیہ ہر محرم میں رکھا جائے گا۔ وہ شرط منظور ہوئی اور وہ تعزیہ اب تک اُسی مقام پر رکھا جاتا ہے جہاں اُس کا گھر تھا، یہ تعزیہ اب بھی عوام میں بڑھیا کے تعزیے کے نام سے موسوم ہے۔ شاہی تعزیوں کے ہمراہ جانب مغرب رکھا جاتا ہے اور انھیں کے ہمراہ دفن کر دیا جاتا ہے۔ شاہی تعزیوں کے اُٹھ جانے کے بعد عوامی تعزیوں کے اٹھنے کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو سہ پہر تک جاری رہتا تھا۔ کربلائے تال کٹورہ میں ان دو مخصوص دنوں میں مجمع کی کثرت اور اُس کثرت کے باعث گھما گھمی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اتنے بڑے جم غفیر میں مقصد کی یکسانیت اور تنوع کے باوجود یگانگت ایک ایسا سماں پیدا کر دیتی تھی جس کو الفاظ میں بیان کرنا بہت دشوار بلکہ محال ہے۔

## (۳) جلوس ہائے محرم و چہلم

قدیم لکھنؤ میں بکثرت جلوس عشرۂ محرم اور چہلم کے دن نکلا کرتے تھے۔ درمیانی مدت میں کوئی قابلِ ذکر جلوس نہیں نکلتا تھا۔ شیعہ مسلمانوں کے تعزیے روزِ عاشورہ اور روزِ چہلم دفن ہوتے تھے۔ اُن کے یہاں محرم کے پہلے دس دنوں میں بھی مختلف جلوس نکالے جاتے اور تعزیوں کے جلوس بعض بڑی شان و شوکت سے متذکرہ بالا دنوں میں نکلتے تھے۔ تعزیوں کے ساتھ امام حسین کے گھوڑے ذوالجناح یعنی دُل دُل کی شبیہ ہوتی، علم ہوتے اور بعض بڑے جلوسوں میں شبیہ تابوت بھی ہوتی تھی۔ شبیہ تابوت مختلف امام باڑوں میں آٹھویں اور نویں محرم کو بھی اٹھائی جاتی تھی۔ سید تقی صاحب کے امام باڑہ میں ہمیشہ اور بعد میں غفران مآب کے امام باڑے میں بھی اونٹوں پر عماریوں کی شبیہیں بھی نکلتی تھیں، جو کربلا میں آلِ رسول کی اسیری اور اُن کے بازاروں میں سر برہنہ گھمائے جانے کی یاد تازہ کرنے کے لیے نکالی جاتی تھیں۔ خالص علم کے جلوس بھی نکلتے تھے۔ یہ علم حاتمی الحسن اٹھاتی تھیں لیکن اُس وقت اُن کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہ تھی۔ ایک علم کو خواص و عوام سب کی مرجعیت حاصل تھی۔ یہ

علَم بہت زیادہ مقبول و محترم سمجھا جاتا تھا۔ محلہ گولا گنج میں واقع مقبرہ عالیہ سے اٹھتا تھا۔ اس مقبرہ کے باشندے کشمیری النسل تھے اور یہ لوگ خود ہی یہ علَم اٹھاتے تھے، خود ہی فارسی میں نوحے پڑھتے اور ایرانی طرز پر ماتم کرتے تھے۔ روزِ عاشورہ یہ علَم کربلائے ملکہ جہاں میں جاتا تھا لیکن چہلم کے دن سارا مجمع اس علَم کا مشتاق رہتا تھا۔ اُس زمانہ میں مقبرہ کے بزرگ رضا حسین مرحوم، محمد عسکری مرحوم، نظیر حسین مرحوم وغیرہم بقیدِ حیات تھے اور شہر میں اعزاز کے مالک تھے۔ ان لوگوں کا ماتم پڑھنا سننا اور سروسینہ کوبی میں شرکت کرنے کی ایک دنیا مشتاق ہوتی تھی۔ یہ علَم اب بھی موجود ہے لیکن اس کا حالِ زار اب ایک داستانِ عبرت ہے۔ اس جلیل القدر علَم کے علاوہ بعض فن کار علَم اٹھانے میں کرشمہ سازیاں دکھاتے تھے۔ یہ صاحبان جن میں ایک بزرگ کا نام غالباً نواب مرزا تھا ایک اتنی بڑی چھڑ لے کر نکلتے تھے جس پر بندھا ہوا علَم نیچے والے لوگوں میں بہت کم دیکھ سکتے تھے۔ وہ چھڑ اتنی اونچی ہوتی تھی جس کو اُن کے علاوہ اور کوئی نہ اٹھا سکتا تھا اور نہ سنبھال سکتا تھا۔ انھوں نے اُس کو اُٹھانے میں طرح طرح کی فن کاریاں نکال لی تھیں۔ کبھی اُس چھڑ کو کاندھے پر روک لیتے کبھی اپنے منہ کے نیچے والے جبڑے کے دانتوں پر سنبھال لیتے تھے۔ یہ فن کاری انھیں کے دم سے تھی اور اُن کے بعد ختم ہو گئی۔

برادرانِ اہلِ سنت اور برادرانِ اہلِ ہنود عشرہ محرم کے مختلف دنوں میں اپنے اپنے یہاں تعزیے رکھتے تھے، ہر تعزیہ اپنے مقام پر رکھنے کے قبل بازار گشت کرایا جاتا تھا۔ شبِ عاشور تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان میں سے بکثرت تعزیوں کے ساتھ نوحہ خوانی ہوتی تھی لیکن بعض کے ساتھ، ڈھول تاشے بجائے جاتے تھے۔ ان مظاہروں میں کوئی جذبۂ خوشی و مسرت کا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں روزِ عاشورہ کی جنگ کی یاد تازہ کرتے تھے۔ شبِ عاشور رات بھر تعزیوں کے سامنے ڈھول تاشے بجایا کرتے تھے۔ بعض مقامات پر اکھاڑے نکالے جاتے تھے۔ اکھاڑے ہوں یا ڈھول تاشے یہ تمام ورزشیں کرنے والے جتھے بنا کے نکلتے اور بڑے خلوص و انہماک سے اپنے اپنے عقائد کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شبِ عاشور، روزِ عاشورہ اور شبِ اربعین و روزِ اربعین ان پُرجوش مظاہروں کی وجہ سے بڑی چہل پہل اور رونق رہا کرتی تھی۔ اسی مقام پر اس امر کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں برادرانِ اہلِ سنت کے ایسے مظاہرے شیعہ مسلمانوں کے لیے دل آزار نہیں ہوتے تھے۔ گریہ کناں تعزیہ داروں کے پہلو بہ پہلو اکھاڑے کے دستے گزر جاتے اور سب یہی سمجھتے تھے کہ دوسرے بھی اپنے اپنے طرز پر واقعۂ کربلا کی یاد منا رہے ہیں۔ ڈھول تاشوں کے سبب سے

کبھی کسی کو یہ شکایت نہیں ہوئی کہ عزاداری کا وقار مجروح ہوتا تھا۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ اُس زمانہ کے لوگ اتنی تنگ نظری سے حالات کا جائزہ لینے کے خوگر ہی نہیں تھے۔ وہ دورِ شاہی میں سو برس سے زیادہ مدّت تک اسی رواداری اور پاس داری کے عادی ہو چکے تھے۔ اور اخوت یگبت کے جذبات اُن کے خصائل میں پیوست تھے اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک سامراجی طاقت کی لڑاؤ اور حکومت کرو والی پالیسی پوری طرح حاوی نہیں ہوئی تھی۔

ایام عزا میں توسیع دے کر اس مدّت کو آٹھویں ربیع الاول تک جب بڑھایا گیا تو فطری طور پر تعزیوں کے جلوسوں میں بھی اضافے ہوئے اور کچھ تعزیے دوسرے متفرق دنوں میں بھی اٹھنے لگے۔ ان میں سے بعض تعزیے بڑے اہتمام سے اٹھتے تھے اور اُن میں کثیر اجتماعات ہوتے تھے۔ بہت سے تعزیہ دار ایسے تھے۔ جو مدتوں پہلے سے اور کچھ مسلسل سال بھر تک عزیزوں، دوستوں، ملاقاتیوں اور روسا۔ وعمائدین کے گھروں پر جاکر تعزیوں میں شرکت کی استدعا کرتے اور وعدے لیا کرتے تھے۔ کچھ لکھنؤ کی وضعداری کا تقاضا اور کچھ وعدوں کے ایفا کا پاس ولحاظ، جس کے سبب سے ایسے تعزیے بڑی دھوم سے اٹھا کرتے تھے۔ انھیں لوگوں میں ایک بزرگ نواب علی مرحوم دوشالہ فروش تھے جن کے تعزیے میں اتنا مجمع ہوتا تھا کہ دین دیال روڈ سے سواری گزرنا تو درکنار پیدل بھی اِدھر سے اُدھر گزرجانا دشوار ہوتا تھا۔ یہی عالم تحسین گنج کے منے نواب صاحب اور کشمیری محلہ میں ڈیوڑھی رفیق الدولہ کے تعزیوں کا بھی رہا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک شہدے کا بھی تعزیہ تھا جس میں شرکت کے لیے وہ مجلس میں دست بستہ خواستگاری کرتا تھا۔ وہ ایک مختصر تقریر کر کے کالی اچکن میں شریک ہونے کی استدعا کرتا اور آخر میں یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ "ملا آئیے گا ضرور"۔ ایسے جلوسوں میں زبردست اجتماعات شخصی وقار اور ہر دلعزیزی یا انفرادی جدّوجہد اور منّت وسماجت کی بنا پر ہوتے تھے۔ ایسے تمام تعزیوں کی تفصیلات پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ مخصوص تعزیوں کے تذکرے اپنے مقام پر ہو چکے اب صرف انھیں جلوسوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اپنی جگہ پر مقتدر وممتاز تھے۔

محرم کے جلوسوں میں سب سے پہلا اور اہم جلوس حسین آباد مبارک کی ضریح قابل ذکر ہے۔ یہ ضریح اب بھی بڑے تزک واحتشام سے اٹھتی ہے لیکن ستر برس قبل اس کا وقار دیدنی تھا۔ آخری تاجدارِ اودھ کی یاد دلوں پر پوری طاقت کے ساتھ کارفرما تھی۔ فرقہ واریت، عصبیت اور تنگ نظری سے لکھنؤ والوں کے مزاج و دماغ پاک وصاف تھے۔ اس ضریح کی زیارت کو پورا شہر اُمنڈ آتا تھا۔

ضریح اُٹھتے وقت مقامی حکّام بھی مودبانہ حاضری دیتے تھے، ارزانی کا زمانہ تھا اور اُس دور کے متولیانِ حسین آباد کو پورا شاہانہ تزک و اہتمام برقرار رکھنے کی فکر رہتی تھی۔ یہ ضریح نہ تھی بلکہ محرم کی آمد کا اعلان کرنے کے لیے ایک نقیب کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ مومی ضریح معہ ایک دوسرے کاغذی تعزیہ کے امام باڑہ آصفی سے اٹھ کر گول دروازہ کے سامنے والی سڑک ہوتی ہوئی حسین آباد پہنچ جاتی تو سارا شہر تعزیہ داری میں غرق ہو جاتا تھا۔ کہیں گریہ و بکا، کہیں ماتم و سینہ کوبی، کہیں نوحے اور مرثیے کی آوازیں تو کہیں ڈھول تاشوں پر ضربیں زمین و آسمان کو متاثر کر دیتی تھیں۔ غم و الم کی یاد اس طرح تازہ ہوتی تھی کہ سارا شہر گھما گھمی کی گونجوں میں ڈوب جاتا تھا۔ ضریح مبارک کے جلوس میں شرکت بجائے خود ایک عجیب تاثر دل و دماغ پر طاری کر دیتی تھی۔ جلوس کی طوالت اُس کے لوازمات، شرکا میں سنجیدگی کا مظاہرہ یہ تمام حالات تفصیل طلب ہیں جن کو پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس جلوس میں سب سے آگے طغرا نما جھنڈوں پر اعلان ہوتا تھا "جلوس ضریح مبارک حسین آباد" اُس کے پیچھے ہاتھی پر نوبت خانہ ہوتا تھا جس میں ماتمی اور غمگین دھن میں شہنائی بجتی رہتی تھی۔ پھر سبیل رہتی تھی جہاں سے زائرین کو دودھ شربت پلایا جاتا تھا، اس کے بعد چاندی کے ماہی مراتب نکلتے تھے۔ کم سے کم پچیس ہاتھیوں پر ایک ایک عدد رہتا تھا جس میں سے چاند، سورج، تارہ، تاج، شیر دہان، سیف اور مچھلی کے نام اور صورتیں راقم کو اب بھی یاد ہیں۔ اس بڑے جلوس میں پولیس اور عوامی سب ملا کر کم سے کم آٹھ بینڈ ضرور ہوتے تھے۔ ہر دو بینڈ کے درمیان جھنڈی بردار قطار در قطار راستہ طے کرتے تھے۔ جھنڈیاں نہایت خوب صورت چمکے دار سبز، سرخ اور سفید رنگ کی ہوتی تھیں۔ اُس کے بعد سوز خوانوں اور سننے والوں کا مجمع ہوتا تھا سوز خواں حضرت عباس کے علم کے سامنے مرثیہ پڑھتے تھے۔ یہ علم بڑی چھڑ پر نصب ہوتا جس میں کار چوبی پٹکا لٹکا رہتا تھا اور کار چوبی مشک حمائل رہتی تھی۔ اس علم کے دونوں جانب چاندی منڈھے ہوئے جر بدے رہتے تھے جن میں بلم، برچھی اور سیف آویزاں ہوتے تھے۔ علم کے پیچھے اور ایک گراں قدر کار چوبی چھتر کے نیچے امام حسین کے گھوڑے کی شبیہ یعنی دُل دُل رہتا تھا جس کی پشت پر سرخ دھبوں دار چادر رہتی جو امام کے زخموں کی یاد تازہ کرتی تھی۔ یہ گھوڑا اسی مقصد کے لیے حسین آباد میں مستقل طور پر پلا رہتا تھا اور شبیہ تیار کرتے وقت اُس کو چاندی کے گنگا جمنی زیورات مثلاً کنٹھا، ہیکل، سینہ بند، پاکھر اور دمچی وغیرہ سے سجا دیا جاتا تھا اور زین فرس پر سلیقے سے

تلوار، زرہ، ڈھال اور تیر و کمان لگا دیے جاتے تھے۔ دل دل کے پیچھے زربفت کے ممگیرہ کے نیچے شبیہ تابوت ہوتی تھی۔ ممگیرہ کی چوبی چھڑوں پر چاندی منڈھی ہوتی اور تابوت کی پوشش پر مرصع کلغی دار کار چوبی شملہ رکھا رہتا تھا۔ آخر میں ضریح مبارک ہوتی تھی۔ یہ جلوس امام باڑہ آصفی سے حسین آباد تک کا راستہ جس کو کسی طرح بھی طویل مسافت نہیں کہا جا سکتا گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔

روزِ عاشورہ یعنی دسویں محرم کو یہ ضریح امام باڑہ حسین آباد سے اٹھائی جاتی تھی اور روضۂ کاظمین میں لے جا کر دفن کر دی جاتی تھی۔ یا اگر مصلحت ہوتی تو اس کو واپس لے آتے اور ساتھ والا کاغذ کا تعزیہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ اس موقع پر بھی یہ ضریح شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ اٹھائی جاتی تھی۔ متذکرہ بالا تمام لوازمات برقرار رکھے جاتے تھے اور ان میں اونٹوں پر ہودج اور کالی کالی عماریوں کا اضافہ کر دیا جاتا تھا یہ اس لیے ہوتا تھا کیوں کہ شہادتِ امام کے بعد اہلِ حرم کو اسیر کر کے شہر شہر گھما کر دمشق لے جا کے دربارِ یزید میں پیش کیا گیا تھا۔ تعزیہ دفن کرنے کے بعد بلا تفریقِ مذہب و ملت غربا و مساکین کو امام کے نام پر خیرات بخشی جاتی تھی جس کی مجموعی رقم کسی طرح بھی دو ہزار روپے سے کم نہیں ہوتی تھی۔ جو ریزگاریوں کی شکل میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ بعض خوش حال لوگ بھی تبرکاً اس خیرات سے پیسہ دھیلا حاصل کر لیتے تھے۔ روزِ عاشورہ کے بعد پھر کوئی جلوس کسی شاہی امام باڑہ سے باہر نہیں نکلتا تھا کیوں کہ شاہانِ اودھ صرف دس دن محرم کی یاد میں جلوس نکالنے کے قائل تھے۔ دوسری غم کی تاریخوں میں مثلاً روزِ اربعین اور حضرت علی کی شہادت کے موقع پر اکیسویں ماہ رمضان کو یا شبیہ تابوت اٹھائے جاتے تھے لیکن اُن کو امام باڑوں کی حدود ہی میں گشت کرا کے بڑھا دیا جاتا تھا۔ البتہ ایک تیسرا جلوس منہدی کا تھا جو قابلِ ذکر ہے۔ یہ ساتویں محرم کو حضرت قاسم بن حسن کی یاد میں پہلے بھی اٹھایا جاتا تھا اور اب بھی اٹھتا ہے۔

روزِ عاشورہ کربلا میں امام حسین اور اُن کے بہتر اعزا و رفقا کی شہادت صرف چند گھنٹوں کے اندر واقع ہوئی تھی لیکن لکھنؤ میں مخصوص ترین عزیزوں کا غم تازہ کرنے کے لیے محرم کے پہلے دس دنوں میں بعض دن کسی خاص شہید سے وابستہ کر دیے گئے تھے چنانچہ آٹھویں محرم حضرت عباس اور ساتویں محرم حضرت قاسم سے منسوب کر لی گئی۔ حضرت قاسم کے بارے میں بعض مقتدر راویوں کا بیان تھا کہ امام حسین نے اپنے بڑے بھائی امام حسن کی وصیت پوری کرنے کے لیے قاسم کا عقد

اپنی صاحب زادی سے شبِ عاشور کر دیا تھا۔ قاسم کا سن بہت کم تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ سنِ بلوغ تک نہیں پہنچے تھے۔ اس لیے یہ کتخدائی ملتوی رہی تھی۔ چوں کہ دوسرے ہی روز اُن کی اور سب کی شہادت یقینی تھی اس لیے امام نے شبِ عاشور شادی کی رسم ادا کر کے بھائی کی وصیت پوری کر دی تھی۔ اس واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لیے منہدی اٹھانے کی رسم ایجاد کی گئی۔ شادی کے سلسلے میں منہدی خالص ہندوستانی رواج تھا۔ آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم نے اس کو واقعۂ کربلا میں شامل کر کے مسرت اور غم کا ایک ملا جلا مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ چنانچہ شاہانِ اودھ کے دور میں منہدی کا جلوس بالکل اسی طرح اٹھا کرتا تھا جس کی بالاجمال صورت یہ تھی۔

منہدی کا جلوس شاہی تزک و احتشام سے اس طرح اٹھتا تھا کہ آگے آگے ہاتھی، اونٹ اور گھوڑوں کی قطاریں ہوتی تھیں، جن کو امام باڑہ کے باہر ہی روک دیا جاتا تھا۔ البتہ سپاہی جلوس بردار یعنی ماہی مراتب اور دوسرے ساز و سامان آرایش کے اٹھانے والے بینڈ باجے والے صحنِ امام باڑہ میں بائیں جانب پرا جما کے کھڑے ہو جاتے تھے اور بیچ میں راستہ بنا دیتے تھے۔ جو سامان اندر داخل ہوتا اُس میں پہلے نقرئی کشتیوں میں مٹھائیاں، میوے خشک اور پھولوں کے ہار ہوتے تھے۔ پھر کچھ زرق برق لباس پہنے ہوئے ملازمین سروں پر مسہری اور کچھ لوگ ہاتھوں میں گل دستے لیے ہوئے آتے تھے جن کے پیچھے دُلہن کی نقرئی پالکی ہوتی تھی، جس پر سے روپے اور چاندی کے دوسرے سکّے نچھاور ہوتے جاتے اور ساتھ ہی چمک دار وردیوں والے مشعلچی قمقموں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے ہوئے آگے بڑھتے جن کے ہمراہ قرنا اور نفیری بجانے والوں کی چوکیاں ہوتی تھی۔ ابھی یہ جلوس امام باڑہ میں ٹھکانے بھی لگنے نہیں پاتا تھا کہ عزاداروں کی ایک جماعت ماتمی لباس پہنے، سر جھکائے اور غمگین و اُداس پیچھے پیچھے آ جاتی جس کے ہمراہ حضرت قاسم کا تابوت کچھ لوگ کندھوں پر اُٹھائے ہوئے اور کچھ لوگ ماتم کرتے جاتے۔ اسی تابوت کے ساتھ چتر زری کے نیچے گھوڑا ہوتا تھا جس پر حضرت قاسم کا زرتار عمامہ، کمان، خنجر اور تیروں سے بھرا ترکش رکھا رہتا تھا۔ یہ گھوڑا جب صحن میں داخل ہوجاتا تو اس پر سے چاندی اور سونے کے پھول نچھاور کیے جاتے تھے جن کو غربا و مساکین لوٹ لیا کرتے تھے۔ آخر میں مجلسِ عزا منعقد ہوتی تھی۔

انتزاعِ سلطنت کے بعد ان تمام شاہی طرز کے لوازمات کو برقرار رکھنا ممکن ہی نہیں

ہوسکتا تھا۔ لہٰذا جلوس کے انداز بھی بدل گئے لیکن شادی و غم کا توام مظاہرہ برقرار رہا اور ہے۔ جلوسِ غم کے ہمراہ منہدی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ بڑے بڑے ظروف میں منہدی اور اُس پر توغین اور ساتھ ساتھ بڑی بڑی مشعلیں روشن رہتی ہیں۔ گزشتہ ایک صدی سے یہ منہدی کا جلوس امام باڑہ آصفی سے اُٹھ کر امام باڑہ حسین آباد جاتا ہے۔ رات کو گیارہ بجے کے بعد منہدی اُٹھتی ہے اور رومی دروازے سے نکل کر سیدھے راستے حسین آباد پہنچا دی جاتی ہے۔ مومی ضریح سے متعلق جس ساز و سامان کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ سب اس جلوس میں بھی شامل ہوتا ہے۔ البتہ کوئی ضریح یا تعزیہ ساتھ نہیں ہوتا۔ تغیرِ حالات، گرانی اور رنگِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ امر بہرحال قابلِ استعجاب نہیں ہے کہ اس شاہی جلوسِ منہدی پر جو رونق ستر برس قبل تھی وہ اب نظر نہیں آتی۔ پھر بھی محمد علی شاہ کی عاقبت بینی اور حُسنِ انتظام و تدبر کی قدردانی کرنا پڑتی ہے کہ ہماری پرانی روایات اب تک برقرار ہیں۔

شاہی جلوس منہدی کے علاوہ ایسے عوامی جلوس بھی نکلتے تھے اور اب بھی نکلتے ہیں لیکن اُن کی تعداد ہمیشہ دو جلوسوں تک محدود رہی ہے۔ ایک منہدی کا جلوس نخاس کے بھانڈ اٹھاتے تھے اور اٹھاتے ہیں۔ اس طبقہ کے لوگ اسی محلہ میں آباد رہے ہیں اور وکٹوریہ اسٹریٹ کے دونوں جانب اس محلہ میں اُن کی سکونت تھی۔ اب اُن کا فن بھی معدوم ہے اور اُن کی صورتیں بھی چند ہی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی منہدی بہت سادہ طرز پر اٹھاتے تھے۔ یہ جلوس جو صرف نوحہ پڑھنے والوں اور گریہ و بکا کرنے والے مجمع پر مشتمل ہوتا تھا۔ منہدی لے کر نخاس سے رات کو شاہی منہدی کے بعد وکٹوریہ اسٹریٹ ہوتا ہوا آغا باقر کے امام باڑہ جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ کوئی نمایش و آرایش کا سامان نہیں ہوتا تھا لیکن دیکھنے والوں کو بہت متاثر کرتا تھا۔ مرثیے بہت اچھے لحن لیکن دل گداز انداز میں پڑھے جاتے تھے۔ دوسرا جلوس ساتویں محرم کو قبل غروبِ آفتاب رانی شہنشاہ بیگم کی محل سرا موسومہ افضل محل کے متصل وکٹوریہ اسٹریٹ سے اٹھتا تھا۔ یہ منہدی داروغہ واجد علی کے نام سے اب تک موسوم ہے۔

داروغہ واجد علی ابتداً واجد علی شاہ کی ایک محل سلطان جہاں کے یہاں داروغہ کے منصب پر فائز تھے۔ محلہ گولا گنج کی اُس گلی میں جو اب داروغہ برکت لین کے نام سے مشتہر ہے، رہتے تھے اور شہر کے متعدد محلوں میں کثیر املاک کے مالک تھے۔ انھیں کے مکان مسکونہ کے قریب ایک امام باڑہ تھا جو اب تک اپنی پرانی جگہ پر موجود ہے اور داروغہ واجد علی کے امام باڑہ سے موسوم ہے۔

سلطان جہاں نے یہ امام باڑہ بنوایا تھا اور کثیر جائداد کے ساتھ وقف کر دیا تھا۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے انھوں نے داروغہ واجد علی کو نسلاً بعد نسلٍ متولی مقرر کر دیا تھا۔ اغراضِ وقف میں ساتویں محرم کی مہندی بھی شامل تھی۔ بہر حال وہ مہندی تقریباً سو برس سے زیادہ کی مدت سے داروغہ واجد علی ہی کے نام سے منسوب ہے۔ اور عوامی جلوسوں میں ہمیشہ اقتدار کی مالک رہی ہے۔ ستر برس قبل بہت بڑا جلوس نکلتا تھا جس کا کچھ سامان حسین آباد مبارک سے عاریتاً آتا تھا۔ ماہی مراتب کے غالباً آٹھ عدد خود اسی امام باڑہ کی ملکیت تھے اور جلوس کا بیشتر ساز و سامان بھی اسی وقف کا تھا۔ عندالضرورت کچھ اشیا کرایہ پر حاصل کر لی جاتی تھیں۔ ایک زمانہ میں ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کی لمبی قطار ہوتی تھی اور سیکڑوں جھنڈی بردار جلوس میں ہوتے تھے۔ کئی کئی بینڈ باجے بھی کرایہ پر آجاتے تھے۔ یہ جلوس قریب غروبِ آفتاب روانہ ہو کر رات کے نو بجے کے قریب تقریباً کئی گھنٹوں میں وکٹوریہ اسٹریٹ، پاٹانالہ اور محلہ وزیر گنج کی مسافت طے کر کے داروغہ صاحب کے امام باڑہ پہنچتا تھا جہاں آدھی رات تک مجلس، ماتم اور نوحہ خوانی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس مہندی کی زیارت کے لیے ازابتدا تا انتہا آدمیوں کا اژدھام لگا رہتا تھا بالخصوص امام باڑہ کے قریب تک کرسچین کالج کے چوراہے سے زمینوں پر تل رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ اس مہندی کی بہر حال وضعداریاں بڑی حد تک اب بھی برقرار ہیں۔

عشرۂ محرم کے بعد چہلم تک کوئی جلوس قابلِ ذکر نہیں اٹھتا تھا۔ البتہ چہلم کے دن تال کٹورہ میں اور پوری وکٹوریہ اسٹریٹ پر جو میلوں لمبی ہے آدمیوں کا ہجوم، اُن میں جوش و انہماک، تعزیوں کی جاذبیت اور مرجعیت، مرثیہ اور نوحہ خوانوں کی آوازوں کا گداز، ہر جانب ایک گھما گھمی، خواص و عوام میں بلا تفریقِ مذہب و ملت جذباتی ہم آہنگی، یہ تمام حالات و کیفیات دیکھنے سمجھنے اور محسوس کرنے کے قابل تھے، اُن کا ہر مکمل تذکرہ محال ہے۔ بہر حال کربلا میں چہلم کے دن مقبرہ کے علم علاوہ دو جلوس ایسے آتے تھے جن کی زیارت کے لیے ہزاروں آدمی بے قرار رہا کرتے تھے۔ اِن میں ایک نواب ممتاز الدولہ بہادر کے تعزیہ کا جلوس ہوتا تھا۔ جس کو راقم کے اوائل شباب میں اُن کے صاحب زادے نواب باقر علی خاں اٹھاتے تھے۔ نواب صاحب حسین آباد مبارک کے متولی بھی تھے، اُن کا تعزیہ بڑے تزک و احتشام سے اٹھتا جس میں شاہی جلوس بھی شامل رہتا تھا۔ اُس وقت تک لکھنؤ والے شاہانِ اودھ کے پرستار تھے۔ چہلم کے دن کوئی شاہی

جلوس نہیں اٹھتا تھا اس لیے اس تعزیہ میں شاہی شان وشکوہ دیکھ کر لوگوں کو بڑی آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ یہ تعزیہ نواب باقر علی خاں کی وفات کے بعد پھر نہیں اٹھ سکا۔ دوسرا جلوس شہر کے سب سے زیادہ گراں قدر تعزیہ کا تھا جو نواب پتّن صاحب کے نام سے موسوم تھا۔ شہر کے باہر سے بکثرت لوگ دور دراز کی مسافتیں طے کر کے اس تعزیہ کی زیارت کو آیا کرتے تھے جس کے اقتدار و وقار کا اب تصوّر بھی ناممکن ہے۔

نواب پتّن صاحب کسی مرد کا نام نہیں تھا۔ وہ حقیقتاً نواب پتّن صاحبہ تھیں جو راقم کے عم محترم نواب غلام حسین خاں کی بیگم صاحبہ اور پرنس سعید الدولہ کی صاحب زادی تھیں۔ اس تعزیہ کے بانی سعید الدولہ تھے اور اُن کے بعد اُن کی صاحب زادی اٹھاتی رہی تھیں۔ عم محترم کے عقدِ مناکحت میں آنے کے بعد اس تعزیے کے جلوس کو چار چاند لگ گئے تھے۔ نواب غلام حسین ان مرحوم باوجود گوشہ نشینی کے بلند پایہ ارباب اقتدار بالخصوص فوجی محکمہ کے اعلیٰ افسران میں بڑے رسوخ و وقار کے مالک تھے۔ اُن کے انھیں اثرات کی بدولت اس تعزیہ کے جلوس میں پولیس اور فوج کے پیادے اور سوار کثیر تعداد میں نیز پولیس اور فوج کے متعدد بینڈ شامل ہوتے تھے۔ نواب صاحب بڑے شاہ خرچ اور دریا دل بزرگ تھے۔ جلوس کی تمام ضروریات مثلاً ماہی مراتب، جھنڈیاں، جھنڈے برداروں کی وردیاں وغیرہ وغیرہ گھری میں فراہم رہتے اور ہر سال اپنے جمالیاتی ذوق کی آسودگی کے لیے اُن میں کچھ نہ کچھ ترمیمات اور اضافے کرتے رہتے تھے۔ خوش سلیقگی کا یہ عالم تھا کہ اتنے بڑے جلوس میں، جس کا نشان کٹا باتھی نخاس پہنچتا تو اسی وقت تعزیہ گولا گنج کے چوراہے سے اُٹھتا تھا، کبھی کوئی بے ربطی یا بدنظمی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نواب صاحب مرحوم اتنے ہر دلعزیز تھے کہ محلے کے تمام لوگ اور دوسرے محلے والے بھی اس تعزیہ میں انتظام و خدمت کے لیے اپنے کو پیش کر دیا کرتے تھے۔ اس تعزیہ کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ شہر کے مقتدر ترین افراد جن میں بابو بشیشر ناتھ سریواستو چیف جج، پنڈت جگت نرائن مُلّا، پنڈت مہاراج نرائن چکبست وغیرہم کے نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس تعزیہ میں گولا گنج سے نخاس کے چوراہے تک سر برہنہ شرکت کرتے تھے۔ وہاں سے اپنی اپنی گاڑیوں پر واپس ہوا کرتے تھے۔ نواب صاحب مرحوم گھر سے نکل کر دس گز زمین کبھی پیدل طے نہیں کرتے تھے لیکن سال میں یہی ایک دن ایسا ہوتا تھا جب وہ اپنے محل واقع گولا گنج سے کربلائے تال کٹورہ تک کی کئی میل والی مسافت پا پیادہ تعزیہ کے ہمراہ طے کرتے تھے اور تعزیہ دفن ہونے کے بعد اپنی فینس میں واپس آتے تھے

اُن کے ۱۹۳۰ء میں انتقال کے بعد خاندان بھر میں کوئی بھی اتنے اقتدار و رسوخ کا مالک باقی نہیں تھا جو اس گراں قدر تعزیہ کی ذمہ داری قبول کر سکتا۔ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اس تعزیہ کے بند ہونے کے بعد لکھنؤ کے جلوس کی بہار خزاں ہو گئی۔

ایامِ عزا کی مدت میں جب اٹھارہ دنوں کی مزید توسیع کر دی گئی تو اس زمانہ کے دو تعزیے بڑی شہرت کے مالک تھے۔ جن میں ایک چھوٹی مہارانی محمود آباد کا تعزیہ اور دوسرا چُپ تعزیہ تھا۔ اول الذکر جلوس ماہِ صفر کی چوبیسویں تاریخ کو نکلتا تھا اور چپ تعزیہ آٹھویں ربیع الاول کو اٹھتا تھا جس کے بعد عزاداری کی معینہ سالانہ میعاد مختتم ہو جاتی تھی۔ چھوٹی مہارانی کا تعزیہ لکھنؤ کی فصلِ بہار کے آخری دور میں اٹھا تھا لیکن مقابلتاً بہت قلیل مدت میں بادِ مخالف کے جھونکوں نے اُس کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والیٔ محمود آباد نے، جن کی ذاتِ گرامی محتاجِ تعارف نہیں ہے اور جو اپنے دور میں زبردست اقتدار و وقار کے مالک تھے۔ اپنی چھوٹی مہارانی کی قدر شناسی میں اُن کے لیے ممتاز الدولہ کا وسیع و عریض علاقہ واقعہ وزیر گنج خرید کر اُسی رقبہ میں اقبال منزل نامی محل غالباً ۱۹۲۳ء تا ۲۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اسی محل میں امام باڑہ بھی تھا۔ مہاراجہ مرحوم کی عزاداری سے گہرا شغف تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اور اپنی موجودگی میں ہر سال اٹھائیسویں اور انتیسویں ذی الحجہ کو یہ امام باڑہ سجاتے اور سجواتے تھے۔ سونے اور اور چاندی کے قیمتی علم جو فن کاری کے بہترین شاہ کار ہوتے نصب ہوتے تھے اور اُن میں کار چوبی اور زر بفتی دیدہ زیب اور دلفریب ٹپکے آویزاں ہوتے تھے۔ محمود آباد سے بڑی محنت و جانفشانی سے بہت خوب صورت اور گراں تعزیے بن کر آتے تھے جو ۲۹ ذی الحجہ کو امام باڑہ میں رکھے جاتے اور ماہِ صفر کی چوبیسویں تاریخ کو بڑے تزک و احتشام سے اٹھائے جاتے تھے۔ دولت و ثروت کے اس زرّین نظارہ کے لیے بڑے بڑے انبوہ سڑکوں پر لگ جاتے تھے۔ یہ تعزیے اقبال منزل سے اٹھ کر کربلائے تال کٹورہ جاتے تھے۔ مہاراجہ کے ۱۹۳۱ء میں انتقال کے بعد دورِ انحطاط شروع ہو گیا تھا جس کے کچھ برسوں کے بعد ہی اس جلوس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

چُپ تعزیہ ایامِ عزا میں توسیع ہونے سے قبل ہی معرضِ وجود میں آگیا تھا۔ اور ہمیشہ آٹھویں ربیع الاول کو اٹھتا رہا تھا۔ البتہ اس توسیع کے بعد اس تعزیہ میں اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اس تعزیہ کے بانی نواب احمد علی خان تھے۔ اُن کے بعد اُن کے صاحب زادے نواب اخّن صاحب بڑے جوش و خلوص سے اُٹھاتے تھے۔ تعزیہ اٹھنے سے قبل ایک مخصوص عشرہ ہوتا تھا جس کی افادیت اپنی آپ

مثال تھی۔ راقم کو نواب اعزن صاحب کی خدمت میں بے تکلفانہ نیاز حاصل تھا اور یہ عشرہ راقم کے استاد مرحوم مولانا سید محمد رضا پڑھا کرتے تھے، اس لیے ذاتی علم کی بنا پر یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ ویسی مجلسیں پھر کبھی سننے میں نہیں آئیں جو علم واخلاق کی بہترین درسگاہ ہوتی تھیں یہ تعزیہ نمازِ صبح کے وقت وکٹوریہ اسٹریٹ سے اٹھ کر گول دروازہ، چوک اور پل غلام حسین ہوتا ہوا روضۂ کاظمین جاتا تھا اور دو زبردست خصوصیات کا حامل تھا جو اسی تعزیہ کے ساتھ مخصوص تھیں۔ ایک تو یہ کہ اتنا بڑا روسا وعمائدین شہر کا اجتماع کسی دوسری جگہ نہیں ہوتا تھا جو اس عزیہ میں ہمیشہ نظر آتا تھا۔ جاڑے کا موسم ہوتا تو جامہ واروں اور مہربانوں کی چمک دمک اور اُن کی گلکاریاں دل ودماغ کو باغ وبہار بنا دیتی تھیں۔ گرمیوں کے زمانہ میں شربتی اور جامدانی کی سادگی ولطافت مزا دے جاتی تھی۔ انگرکھوں کی ہر مکھی بوٹی اتنی بجی سجائی ہوتی تھی کہ نظر پڑ کر واپسی کا نام نہیں لیتی تھی مختصر یہ کہ لکھنؤ کی نزاکت ولطافت اور حسن وجمال کے بیش بہا نمونے کثرت سے اسی ایک موقع پر آنکھوں کے آگے ضو فگن ہو جایا کرتے تھے۔ دوسری خصوصیت اس تعزیہ کی یہ تھی کہ یہاں مرثیہ خوانی، نوحہ خوانی یا سینہ زنی وغیرہ کچھ نہیں ہوتی تھی۔ تعزیہ کا جلوس خاموشی کے ساتھ گزرتا جاتا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک نقیب سواری کا ایک مصرع باواز بلند پڑھ دیتا جو سامعین کے دلوں کو برما کر اُن کو گریہ وزاری پر آمادہ کر دیتا تھا۔ اس تعزیہ کا جلوس بھی مختصر اور سادہ ہوتا تھا۔ آگے آگے نشان کا ہاتھی اور اُس کے پیچھے بے پناہ مجمع پھر حسین آباد مبارک کا مختصر جلوس اور شبیہ ذوالجناح اور تعزیہ ہوتا تھا، عقب میں مجلس ہوتی تھیں۔ مجمع اور ذوالجناح کے درمیان نقیب سواری کا مصرع پڑھتا تھا۔ مجمع کا بہر حال یہ عالم ہوتا تھا کہ گول دروازہ سے اکبری دروازہ کی مسافت گھنٹوں میں طے ہوتی تھی۔ چپ تعزیہ اب بھی باقی ہے مگر پرانی روایات پچاس برس قبل ہی سے مفقود ہیں۔ اُس زمانہ میں یہ آخری ماتمی جلوس ہوتا تھا جس کی خاموشی اور سکوت پر غوغائے ماتم چھایا رہتا تھا۔

## (۴) مجالس وخواندگی

ماہِ محرم کے پہلے بارہ دنوں میں بے شمار مجلسیں ہوتی تھیں لیکن خواندگی بہت مختصر ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں ہر شیعہ کے گھر میں اور بکثرت اہل سنت وہنود کے یہاں بھی مجالس ہوتی تھیں۔ ان مجلسوں کو دورہ کی مجلسیں کہتے تھے کیوں کہ ایک گھر سے نکل کر دوسرے متصل گھر میں شرکتِ مجلس

ممکن ہوتی تھی۔ ایک ہی محلہ میں یہ سلسلہ شبانہ روز چلتا تھا۔ یہ مجلسیں وقت کی پابندی سے شروع ہوتی تھیں اور ہر عزادار اپنے ہمسایہ کے وقت کا احترام کرتا تھا۔ ہر گھر میں عموماً ایک ہی ذاکر ہر روز ذاکری کرتا تھا اور بعض پڑھنے والے ایک ہی دن میں کئی کئی مجلسیں پڑھتے تھے۔ ان مختصر مجالس میں پہلے چند منٹ کے لیے سوزخوانی ہونا قریب قریب ہر جگہ ضروری تھا۔ اُس کے بعد کہیں چند بند مرثیے کے پڑھ دیے جاتے اور مجلس ختم ہو جاتی تھی۔ اور کہیں حدیث خوانی آج سے بہت مختلف طرز میں ہوتی تھی۔ ذاکر ممبر پر کتاب کھول کر پہلے عربی کی عبارت پڑھتے پھر اُس کا لفظی ترجمہ اُردو میں کر دیتے تھے۔ جگہ جگہ فارسی اشعار سے ربط بھی قایم کر لیتے تھے۔ ہر گھر میں ایک ہی مستقل ذاکر ہوتا تھا اس لیے اُس کے پڑھنے کی مجالس میں تسلسل برقرار رہتا تھا۔ اُس زمانہ میں لوگوں کو عربی اور فارسی زبانوں سے بہت واقفیت تھی۔ لہٰذا ذاکر کی زبان سے عربی فقرے یا فارسی اشعار سُن کر اُن کے معنی سمجھ لینے میں کسی کو کوئی زحمت نہیں ہوتی تھی۔ حدیث خوانوں میں ملا مقبلؔ کا کلام بہت رائج تھا۔ مقبلؔ نے "روایت ست" سے شروع کر کے متعدد اشعار کی نظمیں کہی تھیں جن کو مقبلؔ کے مرثیے کہا جاتا تھا۔ حسبِ ذیل روایت نویں محرم کی مجلسوں میں متعدد مقامات پر پڑھی جاتی تھی ؎

روایت ست کہ چوں تنگ شد برا و میدان
فتاد از حرکت ذوالجناح واز جولان

نہ سید الشہدا، ہر جدال طاقت داشت
نہ ذوالجناح دگر تابِ استقامت داشت

کشید پا ز رکاب آں خلاصۂ ایجاد
مثالِ پرتوِ خورشید بر زمیں اُفتاد

بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں اُفتاد
اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں اُفتاد

اس سیدھی سادی حدیث خوانی سے قبل اور شاہی امام باڑوں بالخصوص حسین آباد میں اُسی دوران واقعہ خوانی کا رواج تھا۔ اُس کا اسلوب یہ تھا کہ ایک ذاکر ممبر پر ہوتا تھا اور دو صاحبان ممبر کے دائیں اور بائیں جانب بیٹھتے تھے۔ ممبر والا ذاکر عام طور سے فارسی میں ذاکری کرتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد وہ رُک جاتا اور نیچے کے دونوں ذاکر اردو میں پہلے ذاکر کی تقریر کی مناسبت سے نوحہ پڑھتے تھے۔ یہ طرزِ خواندگی میرے ہوش سنبھالنے تک ختم ہو گیا

تھا اور اس کے بجائے سیدھی سادی حدیث خوانی ہی برقرار رہ گئی تھی جو رفتہ رفتہ ایک نئے طرز میں مبدل ہوگئی اور بہت جلد مقبول ہوگئی۔ اس کا ڈھنگ یہ تھا کہ ذاکر قال قال رسول اللہ سے اپنی تقریر شروع کرتا اور کوئی حدیث سنا کر فضائل اہلِ بیت سے ربط دے کر مصائب جوڑ دیتا تھا۔ اس ذاکری کے لیے پہلے سے مجلسیں لکھ لی جاتی تھیں اور کتاب کے سہارے خواندگی ہوتی تھی۔ اس ذاکری میں آواز کا چڑھاؤ اُتار، فنِ خطابت کا استعمال، مسجع اور مقفّی عبارت آرائی اور لحن میں بکثرت فارسی اشعار پڑھنا بے حد ضروری تھا۔ اس مخصوص طرزِ خواندگی میں شمس العلماء مولانا سید ابن حسن کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے ایک زمانہ میں یادگار مجلسیں آہنی پھاٹک واقعہ پاٹا نالہ میں میرِ مہدی حسین مرحوم کے یہاں پڑھی تھیں۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بھی معقول تھی جن میں مرزا محمد اصغر مرحوم اور راقم کے خال محترم حکیم قاسم حسین بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ان صاحبان کے علاوہ اس طرزِ ذاکری میں دیگر حضرات کو بھی کمال حاصل تھا جن میں قاری علی محمد اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور خود اُن کے شاگردوں میں بھی بہت سے اچھے پڑھنے والے گزرے تھے۔ یہی طرزِ ذاکری برادرانِ اہلِ سنت اور اہلِ ہنود کے یہاں بھی مقبول تھا۔ اُن کی مجلسوں میں بھی حدیث خوانی ہوتی تھی یا شہادت نامے پڑھے جاتے تھے۔

ان مختصر مجالس کے علاوہ عشرۂ محرم میں صرف دو بڑی مجلسیں شہر بھر میں ہوتی تھیں، ایک سید تقی صاحب کے امام باڑہ عقب مسجد تحسین علی خاں واقع چوک میں ہوتی تھی اور دوسری امام باڑہ غفران مآب میں۔ ان دونوں مقامات پر خواندگی کا منصب اسی ایک خانوادۂ غفران مآب سے مخصوص رہا ہے۔ یہ دونوں مجلسیں قدیم ترین ہیں اور دورِ حاضر میں اوّل الذکر مقام پر سید العلماء مولانا سید علی نقی اور دوسرے امام باڑہ میں مولانا کلب عابد ذاکری فرماتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ایک اور بڑی مجلس کا اضافہ ہوا تھا۔ جس کے بانی سید محمد اصغر مرحوم تھے اور اُن کے انتقال کے بعد مرزا بہادر مرزا محمد جعفر علی خاں نے اس مجلس کے انعقاد کی ذمہ داری قبول فرمائی تھی ابتداً یہ مجلس شیخ علی عباس مرحوم کے مکان پر منعقد ہوتی تھی لیکن سید محمد اصغر مرحوم کے انتقال کے بعد نواب افضل حسین خاں کے باغ واقع کٹرہ ابو تراب خاں میں منتقل ہوگئی تھی۔ یہ مجلسیں بہت شاندار ہوتی تھیں۔ ہر مذہب و ملت کے افراد شرکت کرتے تھے اور مولانا سید سبط حسن مرحوم پڑھا کرتے تھے۔ مولانائے مرحوم رام پور میں عشرہ پڑھتے تھے لیکن ہر روز صبح کو لکھنؤ آجاتے تھے اور یہاں دوپہر کو مجلس پڑھ کر فوراً واپس چلے جاتے تھے، انھیں کے انتقال کے بعد ۱۹۳۰ء میں

یہ مجلس بھی ختم ہو گئی تھی۔

گزشتہ لکھنؤ میں حدیث خوانی کی بڑی بڑی مجلسیں عشرہ محرم کے بعد ہوتی تھیں اور اُن کا سلسلہ آٹھویں ربیع الاول تک جاری رہتا تھا۔ اُن میں بلند پایہ ذاکرین دیر تک خواندگی کرتے اور سامعین سکون واطمینان سے شرکت کرتے تھے۔ بعض روسا وعمائدین کے یہاں اسی زمانہ میں مخصوص عشرے ہوتے تھے اور یادگار مجلسیں ہوتی تھیں جن میں عالمانہ طرز کی خواندگی ہوتی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں حدیث خوانی عالمانہ اور فاضلانہ رنگ میں بلند پایہ ذاکری کی منزل تک پہنچ گئی تھی۔ اُس زمانہ میں علم وادب کا ذوق شباب پر تھا لہٰذا وقت کے تقاضوں نے دو جلیل القدر ذاکرین کو مولانا سید سبط حسن اور مولانا سید محمد رضا کی شخصیتوں میں پیدا کر دیا تھا جن کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا مثل ونظیر نہ پہلے تھا اور نہ اب تک کوئی پیدا ہوا ہے۔ یہ دونوں ہستیاں آسمانِ ذاکری پر آفتاب وماہتاب کی طرح چمک کر بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں عروج تک پہنچ گئی تھیں۔ اُس کے بعد یکے بعد دیگرے غروب ہو گئیں۔ مولانا سبط حسن لکھنؤ کے رہنے والے اور صنفِ علما سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اُن کا طرز اور اُن کے طور طریقے مولویانہ تھے۔ مولانا محمد رضا زبردست اور مستند عالم ہوتے ہوئے بھی اپنے رہن سہن، افتادِ مزاج اور تمام ظاہری اطوار میں صنفِ علما سے یک لخت غیر متعلق نظر آتے تھے۔ ایک خالص دیہاتی ہوتے ہوئے اُن میں لکھنؤ کی آن بان اور مزاج میں رئیسانہ شان تھی۔ اُن کا انتقال عین اُس وقت ہوا جب اُن کی ذاکری شباب پر تھی۔ پبلک لائف سے ہمیشہ مستغنی رہے اس لیے اُن کی زندگی کے حالات منظرِ عام پر بھی نہیں آسکے۔ راقم کو اُن کے ارشد تلامذہ میں ہونے کا شرف حاصل تھا اس لیے اُن کے حالات کسی قدر تفصیل سے پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا سید محمد رضا مرحوم موضع تمس پور ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ تھوڑی زمینداری بھی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وثیقہ اسکول فیض آباد میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے جہاں اُن کا نام سن کر متعدد صوبجات سے حصولِ علم کے لیے جوق درجوق طلابِ علم آیا کرتے تھے۔ کچھ ہی برسوں کے بعد اُن کو سلطان المدارس لکھنؤ میں معقولات کی پروفیسری پیش ہوئی اور وہ یہاں چلے آئے۔ اُس زمانہ میں بڑے بڑے جید علما وفضلا موجود تھے۔ اُن کی صفوں میں انھوں نے ایک بلند مقام حاصل کیا۔ لیکن کبھی کوئی مولویانہ طرز یا لباس اختیار نہیں کیا۔

صنفِ علما میں وہ پہلے اور آخری شخص تھے جنھوں نے کبھی ہاتھ نہیں چوموائے۔ نماز جماعت نہیں پڑھائی اور نہ عبا و قبا سے اپنے نورانی چہرہ اور پاکیزہ جسم کو کبھی آلودہ کیا۔ دوپلّی سیدھی ٹوپی، شیروانی، ڈھیلا پائجامہ، جراب اور پمپ جوتا پہن کر شرفائے لکھنؤ کی طرح ساری عمر گزاری تھی۔ درس و تدریس اُن کا مشغلہ اور تفریحات میں گھڑی سازی کا صرف ایک شوق تھا طبیعت میں کوٹ کوٹ کے نفاست بھری ہوئی تھی۔ بے حد صاف ستھرے رہتے تھے اور ظاہر و باطن ہمیشہ پاک تھا۔ لذیذ اور مرغن غذاؤں کے کبھی دلدادہ نہیں ہوئے۔ لیکن تواضع کرنے میں بہت اولوالعزم تھے۔ اُن کے شاگردوں میں راقم کے علاوہ حکیم باقر رضا لکھنوی، اعجاز حسین جعفری مظفر پوری اور بعض دوسرے گستاخ طلبا آئے دن "کچھ عمدہ چیز" کھلوانے کی فرمایش کیا کرتے تھے۔ وہ ہماری خاطر خواہ تواضع فرماتے۔ ہم لوگ مزے لے لے کر اپنی مطلوب و مرغوب اشیا خوب جی بھر کے کھاتے اور وہ صرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے۔

خواندگی کے سلسلہ میں اُن کا طرزِ بیان خود انھیں کا مخصوص طرز تھا۔ معانی و مطالب کا سمندر لہریں مارتا تھا جہاں عقلیت سے زیادہ اور روایات سے کم بحث ہوتی تھی۔ موضوعات میں وحدت واجب الوجود، نبوت و امامت اور اخلاقیات پر زیادہ توجہ فرماتے تھے۔ اُن کی مجالس میں بکثرت غیر شیعہ حضرات شرکت کرتے تھے لیکن اُن کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا نہیں نکلا جو دوسروں کے لیے دل آزار ہوتا۔ معنویت اور مضامین کی فراوانی کے ساتھ احادیث و روایات کی صحت پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ روایات کو پرکھنے میں علم الرجال سے زیادہ عقلی دلائل کے قائل تھے۔ مصائب بہت کم پڑھتے تھے، کسی شہید کی شہادت کبھی نہیں پڑھی، مقامِ فضائل میں مآلِ مجلس حاصل کر لینا اُن کے کمال میں داخل تھا۔ خواندگی کا معاوضہ کسی شکل میں بھی طلب کرنا اُن کے نزدیک گناہِ عظیم تھا۔ رقم پیش کرنا تو درکنار اُس کا تذکرہ بھی اُن کو برہم کر دیتا تھا اور وہ مجلس پڑھنے ہی سے انکار کر دیتے تھے۔ ایسی متعدد مثالیں راقم کے حافظہ میں اب تک تازہ ہیں جب کہ انھوں نے فیس پیش کرنے والے کے یہاں ہزارہا منت و سماجت اور بلند پایہ سفارشات کے بعد بھی مجلس نہیں پڑھی تھی۔ یا اسی طرح ایک بزرگ کے بالعوض دعوت نقد رقم پیش کرنے پر مجلس پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور مولانا ناصر حسین اور مولانا سید محمد باقر کے ایسے جلیل القدر مجتہدین کی سفارش پر اُن رئیس کی خطا بخشی کی تھی۔ پھر بھی خواندگی اُن کی معقول آمدنی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ اُن کے معتقدین مجلس پڑھنے کے بعد اور اُن کی روانگی کے وقت اُن کا بکس کھول کر خود اپنے ہاتھ سے

زادِ راہ کے نام پر کچھ رقم رکھ دیا کرتے تھے جس کی تعداد کا علم مولانا کو واپسی پر ہو جاتا تھا۔

مولانا سید سبط حسن مرحوم جید عالم اور زبردست ادیب تھے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی اُردو بولتے تھے۔ محاورات پر عبور اور اُن کے استعمال پر پورا پورا قابو تھا۔ الفاظ کے بادشاہ تھے اور اُن کی زبان کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی تھی۔ فنِ خطابت کے ماہر ہی نہیں بلکہ اس کمال پر عدیم المثال قدرت رکھتے تھے۔ یہ انھیں کا معجزہ تھا کہ بڑی سے بڑی مجلس کو جس مقام پر چاہتے ہنسا دیتے تھے اور جہاں چاہتے، جتنا چاہتے رُلا دیتے تھے۔ عشرہ محرم میں ابتداءً صرف ایک مجلس لکھنؤ میں پڑھتے تھے مگر بعد میں امام باڑہ اقبال منزل میں مہارانی محمود آباد کے یہاں بھی رات کے وقت ذاکری فرمانے لگے تھے۔ لکھنؤ کی تہذیب و اخلاق اور شرافت و رافت کا مجسمہ تھے اور وضعداریاں نباہنے میں بہت کم لوگ اُن کے مماثل تھے۔ انھیں خصائلِ حمیدہ اور اطوارِ پسندیدہ کی بدولت رئیسوں کے درباروں میں ایک کا ایک مقام تھا اور حیدرآباد و رامپور کی ایسی خود مختار ریاستوں میں اُن کی قدردانی ہوتی تھی۔ مولانا سید محمد رضا مرحوم کی وفات کے تقریباً دس برس کے بعد مولانا سیّد سبط حسن نے انتقال فرمایا تھا۔ اس کے بعد سے رفتہ رفتہ مجالس محرم میں اکثر و بیشتر اجتماعات مناظرہ بازی کا ایسا اکھاڑہ بنے کہ تبلیغ دین کا مقصد ہی فوت ہو گیا اور خواندگی ذاکروں کے لیے کسبِ معاش کا وسیلہ بن گئی۔

اسی خواندگی کے ذیل میں سوز خوانی اور نوحہ خوانی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ پہلے سوز خوانی بہت مقبول اور مرغوب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس طرزِ خواندگی میں بڑے بڑے فن کار پیدا ہوئے تھے جو لَے اور سُر کا لحاظ کرتے ہوئے بھی سوز خوانی کو موسیقی سے علیحدہ رکھنے کے قائل تھے قدردانوں کے اٹھ جانے کے بعد فن کاری نے بھی دم توڑ دیا۔ کہنے کو سوز خوانی اب بھی ہوتی ہے لیکن نادر صاحب اور منجھو صاحب کے ایسے باکمال پیدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح نوحہ اور نوحہ خوانی دونوں میں پرانا چلن بالکل ختم ہو گیا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نوحہ خوانی کی دنیا بالکل بدل گئی ہے۔ اول تو عہدِ قدیم میں اتنی انجمنیں نہیں تھیں جتنی کہ آج ہیں۔ جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دے رہا ہے پہلے صرف پانچ یا چھ انجمنیں تھیں جن کو ماتمی دستے کہتے تھے۔ اُن کے نام یہ تھے۔ (۱) نواب مرزا کا دستہ جو غالباً سب سے زیادہ پرانی تنظیم تھی (۲) شیدیوں کا دستہ (۳) لال بیگیوں کا دستہ (۴) انجمن پنجتنی (۵) انجمن عباسیہ اور (۶) کشمیریوں کا علم۔ یہ ماتمی دستے صرف نوحے پڑھتے تھے جو مسلسل نظمیں ہوتی تھیں اور ہر نظم کسی ایک شہید سے متعلق تھی۔ یہ نوحے

ایامِ عزا میں ہر شہید کے نام پر مخصوص دنوں میں اور روزِ عاشورہ پڑھے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ سینہ زنی میں لے اور دُھن کا اضافہ ہوا اور نوحوں کے بجائے ماتم پڑھے جانے لگے یہاں تک کہ پرانے طرز کے نوحے اب کہیں سنائی نہیں دیتے۔ لیکن یہ نئی طرز غیر شیعہ تعزیہ داروں کے یہاں کبھی رائج نہیں ہوئی۔ اُن کے یہاں جب تک تعزیہ داری ہوتی رہی تھی، پرانے طرز کے نوحے ہی مقبول تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ مثلاً چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

قبرِ اصغر پہ کہتی تھی مادر، گھر چلو شام ہوتی ہے اصغر

خاک پر نیند آئے گی کیوں کر، گھر چلو شام ہوتی ہے اصغر

رات اندھیری ہے، سونا یہ بن ہے، یاں مسافر کو رنج و محن ہے

کیوں لگایا یہاں تم نے بستر، گھر چلو شام ہوتی ہے اصغر



کہا سکینہ سے ماں نے واری، خدا کو مانو نہ رو و پیاری

کھڑے ہیں زنداں کے در پہ ناری، خدا کو مانو نہ رو و پیاری

بلا کے اب اُن کو کون لائے، قریب اگر ہوں تو کوئی جائے

نکل گئی منزلوں سواری، خدا کو مانو نہ رو و پیاری

پہلے دو اشعار امام حسین کے شش ماہے بچہ کے حال میں ہیں جو اپنے باپ کے ہاتھوں پر شہید ہو گیا تھا۔ غم زدہ مادر اپنے نونہال کو یاد کر کے اُس کی قبر پر بین کر رہی ہے۔ آخر الذکر دونوں اشعار امام کی صاحب زادی سکینہ سے متعلق ہیں۔ وہ بچی حالتِ اسیری میں اپنے باپ کو یاد کر کے زندانِ شام میں روتی ہے۔ اور دُکھ رسیدہ ماں تسکین دیتی اور اُس کو چپ کرنے کی طرح طرح سے کوشش کرتی ہے۔ آخری شعر ایک دل دوز مرثیہ ہے جو سننے والے کے کلیجے کو برما دیتا ہے۔ یہی مقصد نوحہ کا ہونا چاہیے جو موجودہ طرز سے پورا نہیں ہوتا۔ ان نوحوں کی یہ بھی ایک اہم خصوصیت تھی کہ عورت کی زبان سے کہے جاتے تھے اور یہ کوشش رہتی تھی کہ فارسی اضافتوں کا استعمال نہ ہو، زبان سادہ ہوں اور الفاظ پُر درد ہوں۔

اسی طرح نوحہ خوانی بھی ایک فن تھا جو یک لخت بُھلا دیا گیا ہے۔ نوحہ خواں مرد ہوں یا عورتیں، اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ اُن کا لہجہ پُر درد اور اُن کی آواز میں گداز ہو۔ ترنم کے بجائے تاثر پیدا کرنا اُن کے پیش نظر رہتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ ہر نوحہ موقع و محل کی مناسبت

سے پڑھتے تھے۔ ان دونوں خصوصیات کی بنا پر سننے والوں کے دلوں پر کیفیت طاری ہو جانا فطری طور پر یقینی تھا۔ راقم اپنے ایک تجربہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اُس زمانہ میں مہاراجہ محمود آباد کے یہاں سکریٹری کے عہدہ پر مامور تھا۔ شب عاشور اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد امام باڑہ اقبال منزل سے گھر واپس ہو رہا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور مسافت جلد از جلد طے کرنے کے لیے گلیوں سے تیز تیز گزر رہا تھا۔ ناگہاں ایک گھر سے نوحہ کی آواز بلند ہوئی اُس مکان تک پہنچتے ہی نوحہ کا یہ مصرعہ گوش گزار ہوا۔

زینب شبِ عاشور دعا کرتی تھیں رو کر، یارب نہ سحر ہو

شب عاشور وہ رات تھی جب آل رسول پر چارہ و تدبیر کی تمام راہیں بند ہو چکی تھیں۔ آنے والے دن میں سب مرد شہید ہونے والے تھے اور سب عورتیں اسیر ہونے والی تھیں۔ یہ انجام پیش نظر تھا اور یہ بھی سب سمجھتے تھے کہ سروں پر منڈلاتی ہوئی مصیبت دور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے امام حسین کی پیاری بہن صرف یہی دعا کر سکتی تھیں کہ وہ رات ختم نہ ہو اور آنے والی آفت ٹلی رہے۔ ان حالات کے پیش نظر اُسی ہیبت ناک رات کو جب ایک محترمہ نے پچھلے پہر اپنے پُر درد لہجہ اور بھرّائی ہوئی آواز میں جب یہ مصرعہ پڑھا کہ

زینب شبِ عاشور دعا کرتی تھیں رو کر، یارب نہ سحر ہو

تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ گویا ارض و سما کی سانس رُک گئی تھی اور اس مقام پر غالباً کوئی ایسا نہیں تھا جس کی آنکھیں نہ ڈبڈبا گئی ہوں۔

## (۵) تقسیم تبرّک

مجالس میں خواندگی کے علاوہ حصص تقسیم کرنے کو بھی بڑی اہمیت تھی۔ عشرۂ محرم کی دورہ والی مجلسوں میں عام لوگوں کے یہاں عموماً شیرینی تقسیم ہوتی تھی۔ مجالس کے ان حصوں کو تبرک کہا جاتا تھا اور اُن کو حقیقتاً متبرک سمجھتے بھی تھے۔ شیرینی کے یہ چھوٹے چھوٹے حصے جو عوام کے یہاں تقسیم ہوتے تھے شرکا مجالس میں مسلمان اور غیر مسلمان سب ہی بڑے خلوص و احترام سے حاصل کرتے اور بوسے دے کر آنکھوں سے لگا لیتے تھے۔ روسا اور خوش حال حضرات عشرۂ محرم میں بھی روٹی سالن، روٹی دال یا کھچڑا تقسیم کرتے تھے۔ انھیں میں بعض محترم ہستیاں اپنے یہاں کی تقسیم کا خود ہی انتظام کرتے تھے یہاں تک کہ پخت و پز کی بھی نگرانی کرتے تھے۔ راقم کے عزیز دوست

مرزا محمد اصغر مرحوم ساکن جوہری محلہ رات بھر جاگ کے روٹی سالن اور کبھی روٹی اور چنے کی دال اپنی نگرانی میں پکواتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ اُن کے یہاں اسی عشرۂ محرم میں کھچڑا بھی تقسیم ہوتا تھا۔ شہر لکھنؤ میں پلاؤ ہر شادی و غمی کے موقع پر ضرور کھلایا جاتا تھا۔ مجلسوں میں بھی پلاؤ تقسیم ہوتا تھا۔ صاحب عالم حکیم سید محمد قاسم کے یہاں کا پلاؤ جو عام مجلس میں شرکا کو تقسیم ہوتا تھا بہت عمدہ، نفیس اور خوش ذائقہ ہوتا تھا۔ مرحوم کے یہاں عشرۂ محرم کی روزانہ مجالس کے علاوہ ایام عزا میں بکثرت مجالس منعقد ہوتی تھیں جن میں مٹھائیوں سے لے کر شیر مال و کباب اور روٹی سالن تک کے حصّے تقسیم ہوتے تھے اور ہر حصہ بہتر سے بہتر ہوتا تھا۔ محرم کے پہلے بارہ دنوں میں سب سے بڑا حصہ آٹھویں محرم کو روسا وعمایدین کے یہاں نفیس و لذیذ شیر مالوں کا تقسیم ہوتا تھا۔ شرکا مجلس کو ایک ایک چھوٹی شیر مال جو سیر میں آٹھ کے وزن والی ہوتی تھی پیش کی جاتی تھی اور بڑی بڑی شیر مالوں کا جوڑ عمائدین و روسا شہر نیز عزیزوں اور دوستوں کے یہاں بھیجا جاتا تھا۔ ایسے حصوں کے لیے عام طور سے ڈیڑھ سیر وزن میں شیر مال کا ایک جوڑ تیار کرایا جاتا تھا۔ بعض عمائدین عام مجلسوں میں بھی نفیس اور وزنی شیر مالیں تقسیم کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا سید محمد نصیر، راجہ صاحب مٹھوارہ، حکیم صاحب عالم اور خصوصیت کے ساتھ مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ مرزا بہادر کے یہاں کی مجلسیں اُن کے جد بزرگوار ناظم صاحب کے امام باڑہ میں ہوتی تھیں۔ آٹھویں محرم کو اس امام باڑہ میں اندر اور باہر یہاں تک کہ صدر دروازہ تک جو فاصلہ پر واقع ہے تل رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھیں۔ مرزا بہادر صدر دروازہ پر کھڑے ہو کر بہ نفس نفیس خود حصہ بانٹتے تھے جس کا سلسلہ کبھی کبھی صبح تک جاری رہتا تھا۔ حسین آباد اور شاہ نجف کے حصّے ایک زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان دونوں امام باڑوں میں دوسری محرم سے نویں محرم تک مقررہ تاریخوں میں پلاؤ یا روٹی سالن بہت عمدہ تیار کیا ہوا تقسیم ہوتا تھا۔ ان دونوں امام باڑوں میں ہر روز انبوہ کثیر لگا رہتا تھا۔ بکثرت غربا و مساکین کے لیے یہ مجلسیں بڑی نعمت تھیں۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ شرکت کرتے اور بڑے ذوق و شوق سے حصّے حاصل کرتے تھے۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ یہ بڑے بڑے حصے بھی تبرک سمجھے جاتے تھے اور خواص و عوام اُن کو حاصل کرتے تھے۔ اژدہام میں اگر کوئی شریک مجلس تقسیم کرنے والے کی نظر سے محروم رہ جاتا تو وہ خود بڑھ کر حصہ کا طالب ہوتا تھا۔ شیرینی والی تقسیم بھی ہر گھر میں بہتات سے ہوتی تھی۔ دورہ کی مجلسوں میں

شریک ہونے والے غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ ان حصوں کو جو وہ دن بھر مجلسوں میں شرکت کر کے جمع کرتے تھے اپنے گھر میں کسی مٹی کے برتن میں بھر کر محفوظ کرا لیتے تھے اور بارہ محرم کے بعد اُن کی مستورات اس ملی جلی مٹھائی کو سکھا اور پیس کر گھی شامل کر کے بہت لذیذ حلوا تیار کر لیتی تھیں جو کچھ دنوں تک کام آتا تھا۔

روزِ عاشورہ شیعہ صاحبان عام طور سے فاقہ کرتے تھے یہاں تک کہ پانی بھی نہیں پیتے تھے اس لیے اُن کے سامنے حصہ باٹنے یا کوئی حصہ قبول کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ان میں بکثرت لوگ کربلا میں شبیہ مزار پر حاضری چڑھاتے تھے۔ جو عموماً شیر مالوں کی ہوتی تھی۔ روسا میں بعض لوگ چالیس شیر مالوں تک کی حاضری چڑھاتے تھے، ہر حاضری میں سے تقریباً نصف عدد شیر مالیں مزار کا مجاور رکھ لیتا اور باقی واپس کر دیتا تھا۔ حاضریوں سے جمع کردہ شیر مالیں فروخت کر دی جاتی تھیں اور حاصل کردہ رقم مزار کے سرمایہ میں شامل کر دی جاتی تھی۔ چڑھاوا چڑھانے والے واپس کردہ شیر مالوں کو بڑی حفاظت و احترام سے گھر لے جاتے اور اپنے اہل و عیال میں تبرک تقسیم کر دیتے تھے۔ شیعہ صاحبان کے علاوہ برادرانِ اہلِ سنت و ہنود اس روز تعزیہ داروں کی خدمت کرنا باعثِ ثواب اور موجبِ فلاح و نجات سمجھتے تھے۔ بعض تعزیہ داران اپنے تعزیوں کے ساتھ ہی لنگر تقسیم کرتے جاتے تھے۔ اُن سے زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو سبیلیں رکھتے اور نخاس کے چوراہے سے لے کر تال کٹورہ کی کربلا کے پھاٹک تک عزاداروں کی تواضع کرتے تھے۔ یوں تو ایسے قدر شناس لوگوں میں راجہ امام بخش کا نام نامی سرِ فہرست ہے لیکن ناحق شناسی ہو گی اگر اشرف آباد اور ملحقہ علاقوں میں بسنے والے بے شمار ہندو بھائیوں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ یہ صاحبان جگہ جگہ شربت جاڑوں میں چائے اور ہلکی پھلکی مفرح غذاؤں مثلاً نارنگی، سنگترہ کا بڑی دریا دلی سے بندوبست کرتے اور تعزیہ داروں کو تقسیم کرتے تھے۔ ان کو نہ ستائش کی ضرورت تھی اور نہ نام و نمود کی خواہش بلکہ ان میں سے بیشتر ایسے صاحبان تھے جن کے نام تک تعزیہ داروں کو کبھی معلوم نہیں ہو سکے۔

برادرانِ اہلِ سنت میں جو لوگ تعزیہ دار تھے وہ اپنے یہاں شیعوں کی طرح مجالس منعقد کرتے تھے بعض کے یہاں انیس و دبیر کے مرثیے پڑھے جاتے تھے اور مرثیہ خواں عموماً شیعہ ہی ہوتے تھے۔ اکثریت ایسے تعزیہ داروں کی تھی جو اپنے یہاں ہر روز شہادت نامے پڑھواتے تھے۔ ان مجالس کے بعد شرکا کو حصے تقسیم ہوتے تھے۔ یہ حصے بھی عموماً مٹھائیوں کے ہوتے تھے جن کو تبرک کی طرح تقسیم کیا جاتا اور تبرک ہی کہا جاتا تھا۔ بکثرت سنی مسلمانوں کے یہاں ساتویں اور بعض کے یہاں

نویں محرم کو بڑے تکلف سے کھچڑا پکتا تھا جس پر شہدائے کربلا بالخصوص امام حسین کی نذر دلائی جاتی تھی۔ یہ کھچڑا عزیزوں، دوستوں اور ملاقاتیوں کو ثواباً تقسیم ہوتا تھا۔ محلہ گولا گنج کے ایک بزرگ حاجی مخدوم بخش جو تاجرِ غلّہ تھے بہت ہی لذیذ، نفیس اور خوشبودار کھچڑا پکواتے اور محلے کے ہر گھر میں حصّہ بھیجتے تھے۔ روزِ عاشورہ امام کے نام پر خیرات بانٹنے کا بڑا چلن تھا۔ بہت سے تعزیہ دار اپنے تعزیوں کے ہمراہ کثیر تعداد میں اشیائے خورد و نوش لے جاتے تھے اور راستہ بھر دوسرے تعزیہ داروں اور نوحہ پڑھنے والوں کی تواضع کرتے تھے۔ نوحہ اور مرثیہ پڑھنے والوں میں معقول تعداد غیر شیعہ حضرات کی تھی۔ روزِ عاشورہ امام کے نام پر بندگانِ خدا کی خدمت کرنے کا جذبہ شدّت کے ساتھ ابھر آتا تھا۔ ایک ترکاری فروش اپنے تعزیہ کے ہمراہ ترکاریوں سے لدا ہوا ٹھیلا لے کر چلتا اور راستہ بھر ترکاریاں تقسیم کرتا تھا۔ ایک بار ٹھیلا راستہ ہی میں خالی ہوگیا تو اُس نے دوبارہ گھر بھیج کر ٹھیلا بھر ترکاریاں منگائی تھیں۔ بعض خوش حال کاروباری لوگ لنگر تقسیم کرتے تھے۔ یہی اصطلاح اُن کی زبانوں پر رائج تھی۔ یہ لوگ اونٹوں پر لدی ہوئی خمیری روٹیاں یا اسی قسم کی کوئی دوسری بھاری خوراک اپنے ہمراہ لے کر کربلا جاتے اور راستے میں زائرین کو تقسیم کرتے تھے۔ عقیدتاً تقسیم کرنے والا اور لنگر میں حصّہ پانے والا دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے کو مثاب سمجھتے تھے۔ محلہ چوپٹیاں کے رہنے والے میاں جان محمد، جو غلّہ کے تاجر تھے، بڑے پُرخلوص تعزیہ دار تھے وہ اپنے تعزیہ کے ہمراہ اونٹ پر لدی ہوئی شیرمالیں دونوں ہاتھوں سے دونوں طرف لٹاتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ حقیقتِ امر یہ ہے کہ شہر لکھنؤ میں ہندو ہوں یا مسلمان، شیعہ رہے ہوں یا سنّی، سب ہی امام حسین اور تعزیہ داری سے خلوص و عقیدت رکھتے تھے۔

عشرۂ محرم کے بعد بڑی مجلسوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ پہلے اربعین تک لیکن بعد میں آٹھویں ربیع الاول تک جاری رہتا تھا۔ روسا و عمائدین کے یہاں بڑی بڑی سالانہ مجلسیں اور بعض کے یہاں مخصوص عشرے ہوتے تھے۔ جن میں ممتاز و مقتدر ذاکرین خواندگی کرتے تھے۔ ان سب مجلسوں میں بڑے بڑے حصے بڑی دریادلی سے تقسیم ہوتے تھے۔ روٹی سالن، روٹی دال، پلاؤ، زردہ، مزعفر، حلیم وغیرہ کی تقسیم کے لیے بات تھی۔ لیکن کبھی کبھی ایک سے زیادہ اشیائے خوردنی ایک ساتھ تقسیم ہوجاتی تھیں، بڑی مجلسوں میں بہت بڑی تقسیم کے لیے "لنگر بٹنے" کی اصطلاح رائج تھی۔ بسا اوقات مجمع کی کثرت کے سبب سے تقسیم حصص دشوار ہوجاتی تھی۔ اور اژدہام بے قابو ہوکر حصوں پر ٹوٹ پڑتا تھا اور "لنگر لٹ جاتا" تھا۔ لنگر لٹ جانے کو

باعثِ برکت سمجھا جاتا تھا اور بانیٔ مجلس اپنی خوش بختی پر دوسروں کے آگے فخر و مباہات کرتا تھا۔ ایسی بڑی مجلسیں کہیں نہ کہیں بالضرور اور بعض اوقات کئی کئی ہر روز ہوا کرتی تھیں جن کی بدولت غربا کو بڑا سہارا رہتا تھا۔ نادار لوگوں کی طبقاتی دور میں کمی نہیں تھی۔ ایسے مفلوک الحال اپنے دو چار بچوں سمیت ہر روز ایک یا اُس سے زائد مجلسوں میں شرکت کر کے اتنی خوراک حاصل کر لیتے تھے کہ اُن کے سب گھر والے دونوں وقت اچھی غذا کھا کر آسودگی حاصل کر لیتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ مغربی اور وسطی لکھنؤ کے بے شمار گھروں میں دو ماہ تک چولھا جلانے اور کھانا پکانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ یہی بڑے بڑے حصے بڑی تعداد اور بڑی مقدار میں روسا و عمائدین اپنے عزیزوں، دوستوں اور رئیسوں کے یہاں بھی بڑے اہتمام سے بھجوایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تقسیم کردہ حصہ میں مخصوص دوسری غذاؤں کے اضافے کر کے بھجوایا جاتا تھا۔ ایسے مخصوص حصہ کو "تورہ" کہتے تھے اور جس رئیس کی جتنی زیادہ استطاعت و منزلت ہوتی تھی اتنا ہی عظیم المرتبت "تورہ" اُس کے یہاں سے بھیجا جاتا تھا۔ یہ اہتمام سالانہ مجلس کے موقع پر ضرور ہوا کرتا تھا۔ ہر رئیس کے یہاں عشرۂ محرم کی مجلسوں اور ایامِ عزا میں بہت سی دوسری چھوٹی چھوٹی مجلسوں کے علاوہ ایک سالانہ مجلس ضرور ہوتی تھی۔ اس مجلس کے لیے سال میں ایک مخصوص دن جو ایامِ عزا کے دوران ہوتا مقرر رہتا تھا۔ اس مجلس میں اپنے مرغوب ترین ذاکر سے خواندگی کرائی جاتی تھی اور بہتر سے بہتر حصہ فراخی و عالی حوصلگی سے تقسیم کرنے کی فکر رہتی تھی۔ راقم کو ایک ایسا ہی حصہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ محلہ ترمنی گنج میں نواب آغا ابو صاحب بڑی گراں قدر شخصیت کے مالک تھے۔ دولت و ثروت میں ممتاز تھے، صاحبِ رسوخ و اقتدار تھے اور بڑے دریا دل رئیس تھے۔ اُن کے یہاں کے حصے اپنی آپ مثال تھے۔ ایک بار ایک حصہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ ایک بڑے خوان پر رنگین خوان پوش اور بہت خوب صورت کسنا تھا۔ اُس کے اندر خمیری روٹیاں، تافتان اور شیرمال کے جوڑ کے ساتھ کباب، قورمہ، قیمہ، تلے ہوئے بنڈے کا سالن، پلاؤ، مزعفر، زردہ کھیر اور کچھ مزید غذائیں بھی تھیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس روز مجلس میں روٹی اور بنڈے کا سالن عام طور سے تقسیم ہوا تھا اور چوں کہ وہ سالانہ مجلس تھی اس لیے دوسری غذائیں شامل کر کے تورے بندی ہوتی تھی اور یہ تورے مخصوص لوگوں کو بھیجے گئے تھے۔ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ ہر غذا مقدار کے اعتبار سے بہتات میں تھی اور وہ کھانا مجموعی طور پر اتنا زیادہ تھا کہ گھر بھر کے کھا لینے کے بعد بھی دوسروں کو تقسیم کر دینا پڑا تھا۔ روسا لکھنؤ کو یہ فکر بھی دامن گیر

رہتی تھی کہ محض وقیع اور قیمتی حصّے تقسیم نہ ہوں بلکہ جو حصہ بھی کہیں بھیجا جائے وہ سیر چشمی کے ساتھ روانہ ہو اور جو غذا بھی کسی کو پیش کی جائے وہ بہتر سے بہتر اہتمام اور لوازمات سے تیار کردہ ہو۔ اسی جذبہ کے تحت اُس زمانہ میں روسا وعمائدین کے درمیان مقابلے ہو جایا کرتے تھے۔ مجلسوں کے حصّے بھی وضعداری کے تحت تیار اور تقسیم ہوتے تھے مثلاً یہ کہ کسی رئیس کے یہاں سالانہ مجلس میں ایک بار روٹی اور بنڈے کا سالن تقسیم ہو گیا تو ہر سال اُسی موقع پر وہی حصہ بانٹا جاتا تھا۔ کسی رئیس نے اگر کبھی کسی موقع پر اپنے یہاں دوسرے رئیس کی مخصوص چیز اُس سے بہتر تیار کرا کے تقسیم کرا دی تو ثانی الذکر کے لیے لازم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے سال اپنی سالانہ مجلس میں اپنی کمی کی تلافی کر دے۔ چنانچہ شیخ علی عباس کے یہاں انتہائی نفیس وخوشبودار کھیر کے بڑے بڑے پیالے تقسیم ہوتے تھے، اُن کو زندگی بھر یہی فکر رہی کہ کھیر کی نفاست ولذّت میں انھیں کا پلّہ ہمیشہ بھاری رہا۔ اور وہ اس جذبہ کو آسودہ کرنے میں ناکامیاب نہیں رہے۔ اگر کبھی کوئی نقص آجاتا تو دوسرے سال کی سالانہ مجلس میں بدرجۂ اتم تلافی ہو جاتی تھی۔ اسی طرح عم محترم نواب غلام حسین خاں اپنی بیگم نواب پتّی صاحبہ کا تعزیہ اٹھانے کے قبل بڑی بڑی ہانڈیوں میں بہترین برفی کے لاتعداد حصے شہر بھر میں تقسیم کراتے تھے اور یہ فکر رہتی تھی کہ اُن کی برفی کسی دوسرے کے یہاں کی برفی سے پست نہ ہونے پائے اُن کی طبیعت میں نفاست ولطافت کے ساتھ ایجادات واختراعات کی بھی بڑی صلاحیت تھی اس لیے وہ ہر سال اپنی حکمتِ عملی سے ایک جدید طرز کی برفی تیار کرا لیتے تھے جو دوسروں کے لیے آسان نہ تھا۔ چنانچہ ہمیشہ یہی کہا گیا کہ اُن سے بہتر برفی کبھی کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ دورِ حاضر میں پرانے رئیسوں کے ان عادات واطوار کو اُن کے تعیش دماغی اور فضول خرچی پر محمول کیا جائے گا جو بڑی حد تک صحیح ودرست ہے لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ اسی کی بدولت بے شمار غریبوں کے پیٹ پل جاتے تھے، بہت سے فن کاروں کو روزی فراہم ہو جاتی تھی اور نئی نئی ایجادیں فراہم کرنے کے لیے ہنرمندوں کے لیے ایک وسیع میدان حاصل تھا۔

مسلمانوں میں خواہ شیعہ ہوں یا سُنّی، ماہ شعبان کی شب پانزدہم بہت محترم اور بابرکت رات مانی جاتی ہے۔ سب کا بین الفریقین یہ عقیدہ ہے کہ اس رات کو رحمتِ باری تعالیٰ کا نزول ہوتا ہے اور بندوں کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ چنانچہ متقی اور پرہیزگار مسلمان اس رات کو شب بیداری کرتے، تلاوت کلام پاک فرماتے اور اپنے نیز اپنے بزرگوں اور عزیز و

اقارب کے حق میں مرنے والوں کی مغفرت اور زندہ لوگوں کی فلاح و وسعتِ رزق کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ پاکباز مسلمانوں کے یہاں اس شب کو مناجات اور التجا کے علاوہ اور کوئی دنیاوی کاروبار نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ دوسرے روز یعنی پندرہویں شعبان کو روزہ بھی رکھتے تھے۔ شیعہ مسلمانوں کے نزدیک اس رات کی اہمیت اس لیے اور زیادہ تھی کیوں کہ اسی شب کو بارہویں امام کی ولادت ہوئی تھی۔ اودھ کے حکمران عقیدتاً شیعہ تھے اس لیے شیعہ مسلمانوں کا وقار بھی مقابلتاً زیادہ تھا۔ اس فرقہ نے اپنے معتقدات کے تحت اپنے مذہبی روایات میں طرح طرح دلچسپ کے عنوانات شامل کر لیے تھے۔ جو بیسویں صدی کے اوائل تک پوری طرح برقرار تھے۔ دریا کے کنارے والے مراسم تفریح و تعیش میں پورا شہر شریک رہتا تھا۔

لکھنؤ کے شیعہ مسلمان ہمیشہ سے اثنا عشری رہے ہیں۔ اُن کے مذہبی عقیدے کے تحت ختمِ نبوت کے بعد سلسلۂ امامت شروع ہوتا ہے اور آلِ رسول میں یکے بعد دیگرے بارہ بزرگواروں کی امامت کے یہ لوگ قائل ہیں۔ ان بارہ اماموں کا عام مسلمان احترام کرتے ہیں، شیعہ صاحبان منصبِ امامت میں ہر ایک کو معصوم اور واجب الاحترام جانتے ہیں البتہ پہلے امام علی مرتضیٰ کی عظمت، تیسرے امام یعنی امام حسین کی محبت اور آخری امام کے احترام کا جذبہ ہمیشہ شیعوں میں واضح اور نمایاں رہا ہے، چنانچہ تعزیہ داری کا کلچر تیسرے امام کی محبت میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پہلے امام کی تاریخِ ولادت یعنی تیرہویں رجب کو گھر گھر چراغاں ہوتا تھا۔ سڑکوں پر آرائش و روشنی ہوتی تھی اور مسجد تحسین علی خاں واقع چوک میں عالیشان محفل میلاد منعقد ہوتی تھی۔ اور نیمۂ شعبان کا جشن منانے کے لیے دریائے گومتی کا وہ کنارا جو پرانے لوہے والے پل سے متصل تھا مخصوص تھا۔ شیعوں کے عقیدے کے مطابق بارہویں امام زندہ ہیں، قیامت کے قبل ظہور فرمائیں گے اور چوں کہ وہ زندہ ہیں لہٰذا اپنے حاجت مندوں کی مشکلات بھی آسان کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی شبِ ولادت قبل نمازِ صبح یا فی الفور بعد نماز شیعہ صاحبان امام کی خدمت میں اپنی عرضیاں آٹے یا مٹی میں ملوث کر کے روانہ کرتے ہیں۔ یہ روانگی ملفوف عریضوں کو دریا میں غرق کرنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ روانگی کے قبل ایک بزرگ کو یاد کر کے اور مخاطب کر کے عریضہ دریا میں ڈالا جاتا ہے۔ عقیدہ ہے کہ وہ بزرگ امام کے ایلچی ہیں جو عریضوں کو جمع کر کے امام کی خدمت میں حاضر کر دیتے ہیں۔ ان تمام عقائد پر اظہارِ خیال کرنا ہمارے دائرہ تحریر سے باہر ہے، ان کا تذکرہ صرف اس لیے کیا گیا تھا کہ دریا کے کنارے اس اجتماع کے وجوہ سامنے

آجائیں اور نیمہ شعبان کے سلسلہ میں دریا کنارے تقریبات منعقد کرانے کا منشا واضح ہوجائے۔

عہدِ قدیم کی ان تقریبات میں بڑی جاذبیت اور ایک طرح کی رومانیت بھی تھی۔ دریا کنارے شام ہی سے میلہ لگنا شروع ہوجاتا تھا۔ اشیائے خورد و نوش کی دوکانیں لگی رہتی تھیں اور بہت جلد سارا میدان انبوہِ کثیر سے مملو ہوجاتا تھا جن میں عقیدت مند اور تماشائی بلا تفریق مذہب و ملت سب ہی شامل ہوتے تھے۔ سرِ شام سے پٹاخوں کا داغنا شروع ہوجاتا تھا۔ من چلے نوجوان لوہے کی نالیوں میں بارود بھر کر پتھر پر پٹکتے جن سے کبھی کبھی بھاری بم پھٹنے کی آواز آتی تھی۔ لوگ اِدھر سے اُدھر سیر و تفریح کرتے، آپس میں ہنسی مذاق کرتے اور وقتاً فوقتاً کوئی چیز خرید کر کھا بھی لیتے۔ بڑی چہل پہل رہتی تھی اور آتش بازی کی دھوم میں نمازِ صبح کے وقت تک مچا کرتی تھیں۔ نمازِ صبح کے اوّل وقت پٹاخوں کی آوازیں بند ہوجاتی تھیں۔ میدان میں نماز ہوتی اور اُس کے بعد ہر شخص بجرا آنے کے ذوق میں دریا کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا۔ یہ بجرا حسین آباد اور مفتی گنج کے بعض لوگ ابتدا" نکالتے تھے۔ پکے پل کے قریب ایک بڑی ناوٗ آراستہ و پیراستہ کی جاتی تھی۔ جس کی نفاست اور رنگینی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اپنے مقام سے حرکت کرکے جب یہ ناوٗ سابق لوہے والے پُل کی طرف بڑھتی تھی تو دور سے اس کا سماں دیکھ کر طبیعت میں فرحت و انبساط کا جذبہ موجیں مارنے لگتا تھا۔ اس ناوٗ پر متعدد کونڈوں میں انتہائی نفیس و لذیذ حلوا بھرا ہوتا تھا اور اُس کے اوپر لگے ہوئے چاندی کے ورق بجرے کی روشنی میں بڑے دیدہ زیب ہوتے تھے۔ ناوٗ پر سوار لوگ اس حلوے سے لوگوں کی تواضع کرتے تھے، جس کے حصول کے لیے پانی میں تیر کر یا کسی چھوٹی کشتی پر سوار ہوکر جانا پڑتا تھا۔ یہ تمام مناظر بے حد دل کش اور دلفریب تھے۔ طلوعِ آفتاب کے وقت تک حلوا ختم ہوجاتا تھا اور بجرے پر اُداسی چھا جاتی تھی۔ مجمع بھی منتشر ہونے لگتا تھا۔ دریا کے کنارے صبح ہوتے تقاریب کا اختتام بھی دلوں کو پژمردہ نہیں کرتا تھا اور سب ہنستے بولتے واپس ہوجاتے تھے۔

## دسواں باب

# فن کاریاں اور صنعت کاریاں

(۱) چکن اور کامدانی
(۲) کارچوبی اور سلمی ستارے کا کام
(۳) طلائی اور نقرئی زیورات
(۴) پیتل اور تانبے کے ظروف
(۵) مٹی کے برتن اور کھلونے
(۶) دیگر ایجادات و اختراعات

# (۱) چکن اور کامدانی

چکن شہر لکھنؤ کی وہ قدیم ترین صنعت کاری ہے جو دست بُردِ زمانہ سے محفوظ ہی نہیں رہی بلکہ ہر اعتبار سے برابر ترقی کرتی گئی ہے اور اس کی شہرت اب ملک کے باہر دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ جن ملکوں میں گرمی کے موسم اور اس موسم کے ہلکے کپڑوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا وہاں بھی چکن کے کپڑوں کو پسند کیا جاتا اور خریدا جاتا ہے۔ ابتداً اس صنعت گری کو اس شہر کے خواص و عوام کی سرپرستی حاصل تھی۔ انھیں کی قدر دانیوں نے فن کاروں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ زمانہ ارزانی کا تھا۔ ڈیڑھ دو روپیہ میں چکن کا کرتا مل جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہی نرخ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ انیسویں صدی میں اور بھی سستا کرتا ملتا ہو۔ بہر حال اس فن کی نزاکت اور نفاست کی بدولت چکن کے ملبوسات بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اور ارزانی کے باعث کم حیثیت شرفا و عوام بھی اُن کے دل دادہ تھے۔ رفتہ رفتہ گرانی کا زمانہ آیا تب بھی چکن کی ہر دلعزیزی میں فرق نہیں آیا کیوں کہ اس کے قدر دانوں کا دائرہ برابر وسیع ہوتا رہا تھا یہاں تک کہ اب تجارتی نقطۂ نظر سے اس فن کاری کو سرکار کی سرپرستی حاصل ہے اور یہاں کے مصنوعات دور دور فروخت ہوتے ہیں۔

چکن کے نام کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ساٹھ ستر برس قبل تک متعدد دلچسپ روایات مشہور تھیں جن کی افسانوی حیثیت سے زیادہ کوئی وقعت نہیں تھی۔ اسی طرح اس کی تخلیق کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جاتا تھا لیکن قرین قیاس یہی قول ہے کہ جامدانی کو دیکھ کر چکن کا تخیل اُجاگر ہوا تھا۔ قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد جامدانی کا معدن تھا۔ وہاں سے بہترین جامدانی کے تھان اچھی سے اچھی وضع قطع کے بن کر آتے تھے۔ روسا و عمائدین اور خوش حال شرفا اُن کی اچکنیں اور انگرکھے بنواتے تھے۔ ایک تھان میں ایک اچکن یا ایک انگرکھا تیار ہو جاتا تھا۔ باوجود ارزانی کے جامدانی کے تھان عوام کی دسترس سے باہر تھے۔ لیکن ہر خاص و عام کے لیے جاذبِ نظر ہوتے تھے۔ لکھنؤ کی قدیم معاشرت میں امیر و غریب سب ہی کو مطمئن اور آسودہ رکھنے کا جوہر ہمیشہ موجود رہا تھا۔ اسی عنصر نے فن کاروں میں چکن کا تخیل اُجاگر کیا اور تہذیب

پر ایسی ایسی گل کاریاں عمل میں آگئیں جن کو دیکھ اور پہن کر رئیس و غریب سب ہی خوش ہو گئے۔ جامدانی کا کپڑا مع اپنی صنعت کاریوں کے انتہائی نرم و نازک اور باریک و مہین دھاگے سے تیار ہوتا تھا۔ یہ دھاگا ولایت سے آتا تھا۔ اس کا آنا بند ہو گیا تو جامدانی کی صنعت اس طرح ختم ہوئی کہ زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے پر بھی غالباً اب جامدانی کا تھان نہیں ملے گا۔ لیکن چکن بنانے کا دھاگا پہلے بھی اسی ملک میں تیار ہو سکتا تھا اور اب بھی تیار ہوتا ہے، البتہ پہلے وہ بھی ولایت سے آتا تھا اور سستا تھا۔ اب دیسی دھاگا مقابلتاً بہت گراں ہے۔ دوسری خصوصیت چکن کی یہ ہے کہ یہ کام تنزیب پر بنایا جاتا ہے، چکن ساز کو کپڑا تیار کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑتی۔ اُس کو سلا ہوا کپڑا فراہم کر دیا جاتا ہے یا وہ خود ایسے کپڑے خرید کر چکن کا کام تیار کرتا ہے۔ پرانے زمانہ میں تنزیب بھی بہت باریک آتی تھی۔ ویسی تنزیب اب کہیں دکھائی نہیں دیتی لیکن چکن کے کام نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ موٹی تنزیب تو درکنار مقابلتاً دبیز کپڑوں مثلاً ارگنڈی وغیرہ پر بھی چکن کا اچھا کام تیار کر لیا جاتا ہے۔

چکن بنانے یعنی کاڑھنے کی ایجاد غریب شرفا کے طبقہ میں ہوئی تھی۔ اس روایت کے ثبوت میں یہی صورت حال کافی ہے کہ عہدِ قدیم سے یہ کاروبار لکھنؤ کی پرانی آبادی میں ہوتا آیا ہے۔ بہترین چکن بنانے والے کشمیری محلہ بالخصوص متصل درگاہ حضرت عباس، مفتی گنج، احاطہ مرزا علی خاں، حسین آباد اور انھیں محلّوں کے قرب و جوار یعنی محمود نگر وغیرہ میں پیدا ہوئے تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ بعض خاندانوں میں یہ کام سو برس بلکہ اُس سے بھی زیادہ مدّت سے مسلسل جاری ہے۔ مثلاً عہدِ واجد علی شاہ میں ایک بزرگ میاں جی بہت بلند پایہ چکن ساز تھے۔ اُن کے خاندان میں ذاکر حسین اور کاظم حسین کے ایسے ہنرمند پیدا ہوئے تھے، کاظم حسین شاعر بھی تھے اور گردوں تخلص کرتے تھے۔ انھیں کے عزیزوں میں امیر حسین چکن ساز بھی تھے جو بہت مشہور صنّاع تھے۔ یہ کاروبار اس خاندان میں اب تک جاری ہے۔ محلہ مفتی گنج میں پتن صاحب، شمشاد صاحب اور دولہا صاحب مرحوم بڑے ہنرمند فن کار تھے اور آج بھی بابو صاحب کا شمار بہترین کاریگروں میں ہے۔ کشمیری محلہ کی قربت میں محمود نگر واقع ہے۔ یہاں بھی چکن بنانے کا کام رائج ہو گیا تھا۔ اس محلہ میں شمشاد علی خاں اور اُن کے بعد محمد عثمان بڑی شہرت کے مالک ہوئے تھے لیکن یہ تمام مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں کیوں کہ اصل صنّاعی ہمیشہ پردوں میں رہنے والی مستورات کے ہاتھ میں رہی ہے اور اب بھی ہے۔ چکن سازی حقیقتاً صنفِ نازک ہی کا کام ہے کیوں کہ یہ ایک لطیف و نازک صنعت ہے جس کو عورتوں ہی سے فطری لگاؤ ہوتا ہے اس کے علاوہ عورتوں کو اجرت بھی کم دینا پڑتی ہے اور اب بھی کم

دینا پڑتی ہے۔ اس لیے کاروباری لوگ یہ کام زیادہ تر عورتوں سے کرواتے ہیں۔ ابتداً چکن سازی کم حیثیت شرفائے لکھنؤ کے لیے حصولِ معاش میں بھی ایک گراں قدر وسیلہ تھی۔

چکن سازی جب معرض وجود میں آئی تھی تو چکن سازوں کے سامنے صرف جامدانی کی وضعوں کے نمونے تھے جن میں بعض کا مقابلتاً موٹے کپڑے پر موٹے دھاگے سے نقل کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ اس لیے نئی نئی وضعوں کا ایجاد کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس ضرورت کی فراہمی روسا وعمائدین خود اپنی پسند سے یا اپنے مصاحبین و مقربین کے مشوروں سے کیا کرتے تھے اور انھیں کی مرضی کے مطابق چکن ساز کام بنا کر پیش کر دیتے تھے۔ اس طرح بہت سی شکلیں اور طرزیں معرض وجود میں آ گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ ایک طبقہ آرٹسٹ کا پیدا ہو گیا، جنھوں نے وضعیں اور طرزیں بنا بنا کر چکن سازوں کو فراہم کی تھیں۔ اب روسا وعمائدین باقی نہیں رہے اور نہ اُن کے مزاج داں باقی رہ گئے ہیں اس لیے چکن سازی کا سارا کاروبار آرٹ بنانے والوں ہی کے تیار کردہ طرزوں پر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی فرمائشیں بھی ہوتی ہیں لیکن زیادہ تر نمونے آرٹسٹ ہی تیار کرتے ہیں اس فرمائشی چکن سازی کے علاوہ کثرت کار پہلے بھی بازاری تھی اور اب بھی ہے۔ اس بازاری چکن سازی میں چکن سازوں کو خریداروں کے ذوق اور اُن کی مالی حالت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا تھا، کہ ساٹھ ستر برس قبل بازار میں فروخت ہونے والے کرتوں میں بہتات سے کام بنا ہوتا تھا۔ سامنے ایک بڑا چوڑا ہار، آستینوں کے مونڈھوں پر جالی دار کٹاؤ ضرور ہوتا تھا۔ بہت سے کرتوں میں آگے کے دامن پر دونوں جانب پھول یا کیریاں بنی رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ شوق گھٹا یا گرانی نے گھٹایا اور اب ایک معیاری چکن کے کرتے میں آستینوں کے مونڈھوں اور آگے کے چاک کے دونوں جانب چکن کا کام بنا ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ ہار پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ انتہائی دیدہ زیب اور نفیس گلو بند بھی ختم ہو گیا جو پرانے زمانے میں کرتوں کے گلوں پر بنا ہوتا تھا۔

چکن کا کام ملبوسات کے علاوہ متفرق ساز و سامانِ آرایش پر بھی بنوایا جاتا تھا۔ ملبوسات میں مردوں کی ٹوپیاں، کرتے اور اچکنیں اس کام کے لیے مخصوص تھے۔ راقم نے کبھی کوئی چکن کا انگرکھا کسی رئیس کو پہنے نہیں دیکھا۔ اس کے لیے جامدانی ہی مخصوص تھی۔ عورتیں چکن کا کام شلوکوں ہی پر بنواتی تھیں۔ چکن کے کام کے دوپٹے شاید ہی کہیں اور کبھی اوڑھے گئے ہوں لیکن جب شادیاں پہننے کا رواج ہوا تو اس لباس میں اب تک بے شمار

ایجادات واختراعات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اس کثرتِ کار کی بدولت چکن سازی کے طرز میں بھی سہولتیں فراہم کر لی گئی ہیں۔ ابتداً جو نمونے چکن سازوں کو دیے جاتے تھے، اُن کے لکڑی پر بلاک تیار کرائے جاتے تھے جن کو سانچے کہتے تھے اور ان کے چرنوں کو کپڑے پر اُتار کر چکن سازی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ فن کاری بڑھی تو نمونے کاغذ پر تیار ہونے لگے اور اُس کاغذ کو ملبوس پر رکھ کر البیوں سے چھید کر کے اور تیار کردہ مسالہ مل کر پورا نقشہ کپڑوں پر چھان کر اُتارا جانے لگا اور اسی نقشہ پر چکن کا کام بنایا جانے لگا تھا، کم و بیش یہی طرز اب بھی رائج ہے۔

نمونوں کے مطابق چکن سازی کا کام بھی مختلف اور متعدد طرزوں سے ہوتا ہے۔ ہر شکل اور ہر صورت اپنے اپنے مخصوص طرز پر تیار کی جاتی ہے تاکہ اپنی اصل وضع برقرار رہے۔ ان میں سے ہر طرز کا علیحدہ علیحدہ نام بھی تھا۔ بہت پرانی طرزوں میں جو اب تک رائج ہیں بخیہ، اُلٹی بخیہ، جالی، مرّی، ہتکٹی، ست خانی، پھندا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ جدید مذاق نے اور بہت سی طرزوں کو جنم دیا ہوگا جن کے نام اس لیے نہیں ہیں کہ نام رکھنے کا ذوق باقی نہیں رہا۔

چکن کے ذیل میں کامدانی کا ذکر آتا ہے۔ کامدانی زردوزی سے بھی قریب ہے لیکن طرزِ صنعت گری کے لحاظ سے اس کو چکن سے زیادہ قربت ہے۔ کامدانی کو روسا و عمائدین کے یہاں مقیش کہتے تھے کیوں کہ اس میں روپہلی اور سنہریں بہاریں ہوتی تھیں۔ صنعت گروں کی زبان پر لفظ بادلہ رائج تھا۔ بادلہ کے معنی تھے تار، خواہ وہ چاندی کا ہو یا چاندی پر سونا چڑھا ہو۔ کامدانی کا کام انھیں تاروں سے بنتا تھا۔ اس لیے اس کو بھی بادلہ کہتے تھے۔ سونے کے تار نرم و نازک ہونے کی وجہ سے کارآمد نہیں ہوتے اس لیے چاندی کے سونا چڑھے ہوئے تاروں کو سونے کے تار کہا کرتے تھے اور عند الضرورت انھیں سے کام بناتے تھے۔ مردانے ملبوسات میں ٹوپیوں اور کرتوں پر کامدانی بنا کرتی تھی۔ اور عورتیں کامدانی کے شلوکے اور دوپٹے استعمال کرتی تھیں۔ اصل کامدانی وہی تھی جس میں کپڑوں پر روپہلی یا سنہری بندکیاں دور دور ڈال دی جاتی تھیں ان بندکیوں کو دانہ فردی کہا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان بندکیوں کے ڈالنے میں وضعیں اور قطعیں ایجاد کر لی گئی تھیں۔ ہر مخصوص وضع میں بندکیاں اس طرح ڈالی جاتی تھیں کہ کوئی خاص شکل یا شباہت رونما ہو جائے۔ ان وضعوں میں ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ نام رکھ لیے گئے تھے۔ بعض ناموں کی مناسبت شکل و شباہت سے تھی لیکن بعض نام شاعرانہ انداز میں رکھ لیے گئے تھے۔ چند

رنگتیں جو ساٹھ ستر برس قبل بہت مرغوب تھیں۔ سلیمی، بادلی، اودیہ، پٹ، ستخانی، کرن دھنڈا کرن۔ چھپٹا کرن) جالی، سات میل رنگ، چاند، ناخونی وغیرہ وغیرہ کہلاتی تھیں بعض وضعوں میں کچّا اور پکّا دونوں طرح کا کام ہوتا تھا۔

ساری کے رائج ہونے کے بعد کامدانی کے کام میں بھی بہت اضافہ ہوگیا۔ کرتوں اور دوپٹوں کے مقابلہ میں ساری کے کناروں نیز متن میں نئی نئی وضعیں نکال دینا مقابلتاً آسان تھا۔ اس لیے ساریوں میں طرح طرح سے کامدانی بنی اور اب بھی بنتی ہے لیکن پرانے زمانہ میں صفائی اور سادگی کا جو مذاق تھا وہ باقی نہیں رہا۔ اب بندکیاں عموماً سستے قسم کے تاروں سے ڈالی جاتی ہیں اور پرانے زمانے میں جو پکّا کام ہوتا تھا وہ گرانی کے سبب سے بہت کم ہوگیا ہے۔ پھر بھی کامدانی کی ساریاں بہت دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ چکن بنانے والے کامدانی کا بھی کام کرتے ہیں۔ ان صنعت گروں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں بندکیاں جلد ڈال لیتی ہیں اور اُن کی اجرت بھی کم ہوتی ہے، پرانے زمانے میں مردوں میں کامدانی بنا ہوا لباس بہت مرغوب تھا لیکن اب بہت کم ہوگیا ہے، کم سے کم کامدانی کی ٹوپی کسی کے سر پر نظر نہیں آتی اور کامدانی کا کرتا پہننے والے بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ صنعت گری صرف صنفِ نازک کی منظورِ نظر ہے۔ پھر بھی چکن کی طرح اس کی بھی تجارت بیرونی ممالک میں ہوتی ہے۔

## (۲) کارچوبی اور سلمیٰ ستارے کا کام

کارچوب اُس لکڑی کے ڈھانچے کو کہتے ہیں جو مختلف صورتوں کا چوکھٹے سا تیار ہوتا اور لکڑیوں کے سہارے کسی وسیع کمرے یا ہال میں فرش پر کھڑا کر دیا جاتا ہے جس کپڑے پر کام بنایا جاتا ہے اُس کو اسی ڈھانچے یا چوکھٹے میں اچھی طرح کس دیتے ہیں تاکہ کام بنانے میں وہ کپڑا اپنی جگہ پر قایم رہے۔ جو کام اس لکڑے کے ڈھانچے میں کسے ہوئے کپڑے پر بنایا جاتا ہے اُسے کارچوبی کام کہتے ہیں۔ کارچوبی کام پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے اور اس کی ہمیشہ سے دو قسمیں رہی ہیں۔ ایک کو آری کا کام اور دوسرے کو زردوزی کام کہتے ہیں۔ زردوزی کام کی وجہ تسمیہ نام ہی سے ظاہر ہے۔ اس میں سونے کے سامان اور سنہری اشیا کا مصرف ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ زردوزی کام قیمتی بھی ہوتا ہے۔ البتہ آری کے کام کی وجہ تسمیہ میں کئی روایتیں ہیں جن میں دو

قرینِ قیاس ہیں، ایک تو یہ کہ اس کام کی کشیدہ کاری میں آری کی طرح محرابیں اور دندانے زیادہ ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس کام کی سوئی قروشیا کی طرح کی ہوتی ہے جو کام بنانے والے خود ہی تیار کرتے ہیں اور اُس کے استعمال کا طرز زردوزی کی سوئی کے استعمال سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ابتداً اُس مخصوص سوئی اور اُس کے طرزِ استعمال کو لوگوں نے آری سے مشابہت دے کر اس طرز کے کام کو آری کا کام ہی کہنا شروع کر دیا۔

آری کے کام میں عموماً کسب یعنی کلابتو، ریشم اور ستارے وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ کام عام طور سے چھپائی پر ہوتا ہے، عہدِ قدیم میں نمونوں کے چربے لکڑی پر تیار ہوتے تھے اور انھیں کو کپڑے پر سفید رنگ میں چھاپ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ لکڑی کے چھاپوں کا دستور کم ہوتے ہوتے برائے نام رہ گیا ہے اور اب یہ نمونے کاغذ پر تیار ہوتے اور انھیں کا چربہ کپڑے پر اُتار لیتے ہیں۔ ہر اعتبار سے آری کا کام سستا ہے اور آسان بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس طرز پر تیار کردہ ملبوسات عوام و خواص سب ہی استعمال کرتے تھے۔ یہ ملبوسات مردوں کے برائے نام اور عورتوں کے زیادہ ہوتے تھے۔ روسا کے یہاں آری کا کام بھی قیمتی بنوایا جاتا تھا۔ موقع و محل سے موتی بھی ٹانک دیے جاتے تھے اور اُن کے یہاں کی وضعیں اور قطعیں زیادہ تر خود انھیں کی پسند سے تیار ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آری کے طرز پر تیار کردہ کپڑوں میں تنوع ہوتا تھا لیکن پھر بھی جو کپڑے اس طرز پر تیار ہوتے تھے اُن میں دوپٹے، پائجامے، غرارے، ازاریں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس طرز کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ غریب عوام کی عورتیں بھی چھپی ہوئی صدری اور اپنے انگوں پر آری کا کام بنوالیتی تھیں۔ ساری کا رواج ہونے کے بعد اس کام میں بہت فروغ ہوا اور اب بے شمار ساریاں اسی طرز پر بنوائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ بیرونی ممالک میں بھی اُن کو پسندیدگی حاصل ہے۔ اس مرجعیت کی بدولت طرح طرح کی وضعیں ایجاد ہوگئی ہیں۔ پہلے کپڑوں کے حاشیوں یا پس پشت صرف کیریاں یا پھول نظر آتے تھے لیکن اب بے شمار نقش و نگار معرضِ وجود میں آگئے ہیں

زردوزی کا کام بھاری، قیمتی اور بہت زرق برق ہوتا تھا اور اُس کی بے شمار وضعیں تھیں۔ اس کام کے لیے ہمیشہ سے وضع سازوں کی ضرورت رہی ہے، آج بھی ڈزائن بنانے والے آرٹسٹ بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ پرانے زمانے میں جتنے بڑے بڑے محل اور عالیشان ڈیوڑھیاں تھیں، اُن سب میں علیحدہ علیحدہ وضعیں تیار ہوتی تھیں۔ روسا و عمائدین کی مسندیں

شامیانے، اُن کے اور اُن کی بیگمات کی فینسوں کے جھٹکے، ہاتھیوں کی جھولیں، کہاروں، سائیسوں اور دوسرے اعلیٰ ملازمین کی وردیاں، ان سب کے اوپر کچھ نہ کچھ کارچوبی کام ضروری تھا اور ہر محل اور ہر ڈیوڑھی کی اپنی خاص پسند سے یہ کام بنوایا جاتا تھا۔ زردوزی کے کام میں بے انتہا تنوع پیدا ہو گیا تھا اور زردوزوں کے مزاج میں بھی ایجادات و اختراعات کے جوہر پیدا ہو گئے تھے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ لکھنؤ کی زردوزی کو صرف دولت و ثروت کی وجہ سے شہرت حاصل تھی بلکہ اُس کی ہر دلعزیزی میں بہت کچھ دخل یہاں کی صنعت آفرینیوں کو تھا اور اس صنعت گری میں فن کاروں سے زیادہ روسا وعمائدین کے مزاجوں اور طبیعتوں میں لطافت و نفاست کا بہت بڑا حصہ تھا۔ فن کے انھیں پرستاروں نے صنعت گروں کی حوصلہ افزائی کی اور لکڑی کے چھاپے بنانے والوں کو بھی ہنرمندی سکھائی تھی۔ دورِ حاضر میں جب کہ ڈیزائن اور آرٹ نے بڑی بڑی ترقیاں کر لی ہیں پھر بھی ہماری بعض پرانی وضعوں کا نہ کوئی بدل بن سکا ہے اور نہ اُن پر کوئی نئی اصلاح ہوئی ہے۔ اس ذیل میں ماہی پشت وضع کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو اب تک اپنی پرانی وضع قطع پر برقرار ہے اور بہت مرغوب ہے۔

زردوزی کا کام ابتدا مخمل پر بنتا تھا جس کو شہنول کہتے تھے۔ اسی مخمل کے شہانی جوڑے اور دوسرے قیمتی ملبوس تیار ہوتے تھے اور اُن پر موقع و محل کے لحاظ سے ہلکا یا بھاری یا بہت بھاری زردوزی کام بنوایا جاتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں استعمال کے لیے ریشمی کپڑوں پر کام بنتا تھا۔ لیکن یہ زردوزی وزن میں بھاری نہیں ہوتی تھی۔ بعض روسا پورے تن پر کام بھی نہیں بنواتے تھے اور اُس کے عوض حاشیوں اور آستینوں پر کشیدہ کاری کے عنوان سے ہلکا زردوزی کام بنواتے تھے۔ شادی بیاہ اور دوسرے خوشی کے تقریبات میں گھر بھر کے کپڑوں پر زردوزی کام بننا ضروری تھا لیکن عام دنوں میں بھی روسا قیمتی لباس پہنتے تھے۔ بیگمات کے لباس میں دوپٹوں، پائجاموں اور جامے کے شلوکوں پر زردوزی ہونا تقریباً ضروری تھا مردانے کپڑوں میں بھی بہت کچھ کارچوبی لباس ہوتا تھا یہاں تک کہ رئیسوں کے مخملی جوتے بھی کارچوبی ہوتے تھے جن میں منقش لازمی ہوتا تھا اور بعض کے یہاں موتی بھی ٹکے رہتے تھے۔ یہ کارچوبی ملبوسات اور جوتے بھی ایک مدت کے بعد دل سے اُتر جاتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ گھس پس کے اُتر گئے اور اُس کے بعد حسب منشا ملازمین کو تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ یہ لوگ اُن کپڑوں وغیرہ کو کچھ مدت تک استعمال کرتے اور جب اُن کی نظر میں بھی بے کار ہو جاتے تو اُن کو جلا کر چاندی اور سونا نکال لیتے تھے۔ چھوٹے درجے کے ملازمین کو

اِن کپڑوں سے بھی اچھی آمدنی ہوجاتی تھی۔ دورِ حاضر میں نہ ویسے ملبوس تیار ہوتے ہیں اور نہ اُن کے گھِس پِس کے اُترنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ زردوزی کا زیادہ تر کام ریشمی اور اسی طرح کی دوسری قیمتی ساریوں پر بنتا ہے، چوں کہ یہی مذاقِ زمانہ ہے۔ مال مسالے کے اعتبار سے بھی پہلی سی بھاری ساریاں نہیں تیار ہوتی ہیں جس کا سب سے بڑا سبب گرانی ہے، دوسرے یہ کہ ظاہری چمک دمک سستی قسم کی چیزوں سے بھی پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا قیمتی سامان نہیں لگایا جاتا۔

زردوزی کا کام بنانے کے لیے پہلی اور سب سے زیادہ اہم ضرورت سنہری تاروں کی ہوتی ہے۔ اولاً چاندی کے بہت مہین، اور باریک تار بنائے جاتے ہیں پھر اُن پر سونا چڑھایا جاتا ہے۔ سونا چڑھائے بغیر سفید تار بھی جگہ جگہ لگا دیے جاتے ہیں۔ سنہری تار سادے اور گھونگر کی طرح مڑے ہوئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان مڑے ہوئے تاروں میں زیادہ چمک نہیں ہوتی تھی لیکن بھاری کام میں زیادہ استعمال انھیں تاروں کا ہوتا تھا۔ چمک کی ضرورت دوسری چیزوں سے پوری ہوتی تھی اور کچھ کام چاندی کے خالص تاروں کی آمیزش سے بھی نکل جاتا تھا۔ اِن سنہری تاروں کے علاوہ زردوزی کے سامان میں سلمیٰ، ستارہ، موتی اور ریشم کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ سارا کام ریشم ہی سے تیار ہوتا تھا۔ کہیں کچّا اور کہیں پکّا ریشم استعمال ہوتا تھا۔ پھولوں کی ساخت میں سلمے ستارے اور موتی کے ساتھ پکّا ریشم ضروری تھا۔ بعض مخصوص فرمائشات میں گوٹا بھی شامل کیا جاتا تھا۔ الٹی بخیہ کا کام بنانے میں ایک مخصوص قسم کا تیار کردہ ریشم درکار ہوتا تھا جس کو "شنڈو" کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالات بدلے تو موتیوں کی جگہ پوت استعمال ہونے لگی تھی جن کو چھوٹے موتی کہتے تھے اور اعلیٰ درجے کے تیار کردہ ریشم کے بجائے ایک خاص قسم کی گھاس کاریگروں نے پسند کر لی تھی جس کو جاپانی گھاس کہتے تھے اور جس کو ہر رنگ میں رنگ لینا آسان تھا۔ پوت کے علاوہ ظاہری چمک دمک کے لیے تقریباً ساٹھ برس قبل ایک چیز اور رائج ہو گئی تھی جس کو کٹ دانہ کہتے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے دانے شیشہ کے ترشے ہوئے تھے جنھوں نے پرانے رئیسوں کے پسندیدہ یاقوت، پکھراج اور زمرد کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی جگہ حاصل کر لی تھی۔

چکن کی طرح زردوزی کا کام بنوانے کے لیے بھی پہلے نمونے تیار ہوتے تھے۔ چوں کہ یہ کام قیمتی ہوتا تھا اور بہت بڑی صنعت سمجھا جاتا تھا اس لیے زردوزی سے صرف صاحبانِ دولت و ثروت کو واسطہ رہتا تھا۔ یہ لوگ خود نمونے تیار کرتے یا اپنے زردوزوں سے نمونے

حاصل کرکے پسند کرلیا کرتے تھے۔ انھیں نمونوں کے پہلے لکڑی کے چھاپے تیار ہوتے تھے جن کو مخمل پر چھاپ لیا جاتا تھا۔ بعد میں ایک مخصوص کاغذ پر پھول وغیرہ بنا کے سوئیوں سے چھید کر کے کپڑے پر عکس اُتار لیتے تھے۔ اسی عکس پر زردوزی کا کام بنتا تھا۔ کاریگروں کی صناعی کا امتحان خطوط کی صحت و باہم دگر ربط اور خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت سے ہوتا تھا یعنی یہ کہ خطوط لازمی طور پر ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے تھے۔ بعض مطول ہوتے تو بعض مدور، ان دونوں میں اس طرح ربط پیدا کرنا کہ جاذبِ نظر ہو جائیں صنعت گری کہلاتی تھی۔ اسی طرح پھولوں کے درمیانی حصہ میں پہلے خلا چھوڑ دیا جاتا تھا پھر اُس کو سلمے سے پُر کر دیتے تھے۔ یہ کام بھی مشکل تھا اگر برائے نام بھی کسی طرف خلا رہ جاتا تو بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔ زردوزی کا کام اب بھی ہوتا ہے لیکن اول تو کلابتو ہی اصلی نہیں ہوتا۔ ریشم اتنا اچھا نہیں بنتا، موتیوں اور دیگر قیمتی چیزوں کی جگہ مصنوعی اشیا نے حاصل کر لی ہے لیکن دقیق نظریں جو عیوب پر فوراً پڑ جاتی تھیں، اب بالکل مفقود ہیں اس لیے جو کچھ ہے وہ اچھا ہی ہے۔ البتہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وضعوں میں جتنی بہتات ہے وہ پہلے نہیں تھی۔ اس کے علاوہ انھیں وضعوں کی زیادتی کے سبب سے کشیدہ کاری کے فن میں بہت وسعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ پہلے کشیدہ کاری صرف چکن کے کام کے ساتھ وابستہ تھی لیکن اب اس کا مقام زردوزی میں ہو گیا ہے۔ چکن میں کشیدہ کاری کے بہت کم نمونے نظر آتے ہیں اور اُن میں بھی زیادہ تر زردوزی سے نقل کردہ ہیں۔

اسی مقام پر ایک مخصوص صنعت گری کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے جو زردوزی کے ذیل میں آتی تھی اور اس فن میں روسا کے گھر کی مغلانیوں نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایسا چھوٹا موٹا کام استعمال کی معمولی اور ساری چیزوں پر بھی بنایا جاتا تھا لیکن قابلِ ذکر اور گراں قدر کام امام باڑوں کے پٹکوں پر ہوتا تھا۔ اس کام میں پھول پتوں کے بجائے دعاؤں اور زیارتوں کی کتابت سلمے سے ہوتی تھی۔ یوں تو ایک ایک پٹکا متعدد مقامات پر آویزاں ہوتا تھا لیکن قابلِ دید ممبر کے پٹکوں کا جوڑ ہوتا تھا۔ جو معدودے چند رئیسوں کے یہاں دیکھا گیا تھا۔ ہر ممبر پر دونوں جانب ایک ایک علم اور ایک ایک پٹکا نصب رہتا ہے۔ یہ پٹکے عموماً ایک لال اور ایک سبز رنگ کے ہوتے ہیں۔ انھیں پٹکوں پر سلمے سے خطاطی بے انتہا خوبصورت اور گراں قدر فن تھا۔ ساٹن کے پٹکوں میں ہر جانب چوڑا اصلی سنہری لچکا ٹانکا جاتا تھا۔ پھر

اوپر کا وہ حصہ جوڑ موڑ کر علم میں باندھا جاتا ہے سادہ چھوڑ کر پٹکوں کی لمبائی کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے اور چوڑے پچکے کے منقسمے بنا کر تین درجے قایم کر دیے جاتے تھے۔ دونوں پٹکوں کے ان چھے درجوں میں ایک مسلسل عبارت لکھی جاتی تھی۔ اس ضرورت کی بہترین فراہمی زیارتِ عاشورہ کر دیتی تھی۔ دونوں پٹکوں کے ان چھے درجات میں خط نسخ کے کسی ماہر سے پوری زیارتِ عاشورہ اس طرح لکھوائی جاتی تھی کہ داہنی جانب کے پٹکہ میں پہلی سطر سے شروع ہو کر بائیں پٹکہ کی آخری سطر پر جو بالکل نیچے ہوتی تھی عبارت ختم ہو جائے۔ بین السطور کا برابر اور حروف و الفاظ کا یکساں رہنا ضروری ہوتا تھا۔ تاکہ دور سے دیکھنے والے کو بیربطی یا الفاظ کے قد و قامت میں کمی بیشی کا کوئی عیب نظر نہ آئے۔ عموماً یہ ہوتا تھا کہ کاتب کو برابر کتابت کرنا پڑتی تھی کیوں کہ ایک درجہ پر کام بن جانے تک دوسرے درجہ کی کتابت ماند پڑ جایا کرتی تھی اور کاتب کو دھندلے الفاظ ہی پر دوبارہ لکھنا پڑتا تھا۔ کتابت رنگین پنسل سے یا رنگین مخصوص روشنائی سے ہوتی تھی۔ لال پٹکے پر سبز رنگ کی پنسل یا روشنائی اور سبز رنگ کے پٹکے پر لال پنسل یا روشنائی سے لکھا جاتا تھا۔ مغلانیاں سلمے کے چھوٹے چھوٹے اور بعض بہت چھوٹے ٹکڑے تیز اور نازک قینچی سے کاٹ لیتی تھیں پھر انھیں ٹکڑوں کو مہین سوئی میں پرو کر لکھی ہوئی عبارت پر سلمہ چڑھا دیتی تھیں۔ اس کاریگری میں ایک خاص قسم کا مہین اور مضبوط ریشم کا ڈورا استعمال ہوتا تھا جس کو خیاطہ کہتے تھے۔ سلمہ کی حروف اور الفاظ پر یہ کتابت بہت نازک اور مشکل کام تھا۔ ف اور ق کے ایسے حروف کے سر بنانا، ج، ح کے پیٹ خمیدہ کرنا اور الفاظ کے نیچے عربی طرز میں نقطے قایم کرنا بڑی دیدہ ریزی کا کام تھا۔ راقم کے علم و یقین میں یہ فن اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اول تو خطِ نسخ کے بلند پایہ اور ہنرمند کاتب ہی باقی نہیں رہے، دوسرے یہ کہ اس تحریر پر سلمہ چڑھانے والی میں بھی اتنی علمی استعداد ضروری تھی تاکہ وہ عند الضرورت کتاب میں مندرجہ عبارت دیکھ اور سمجھ کر صحت کا خیال رکھ سکے۔ بہر حال اسی قسم کے پٹکوں کا ایک جوڑا راقم کے یہاں منزو کر کا دری میں اب تک موجود ہے جو یقیناً ستر برس سے قبل ہی تیار کرایا گیا ہو گا مگر اُس کی آب و تاب بڑی حد تک برقرار ہے۔

## (۳) طلائی اور نقرئی زیورات

ارزانی و فارغ البالی کے دور میں آرایش و زیبایش کا ذوق و شوق مردوں اور عورتوں

میں یکساں طور پر تھا، البتہ مظاہروں کی نوعیت مختلف ہوتی تھی۔ قدیم لکھنؤ میں آرائش و زیبائش کے متعدد طور طریقے مشترک بھی تھے۔ مثلاً یہ کہ عطر کا ذوق قریب قریب ہر شہری کو تھا جس کے سبب سے یہاں کے در و دیوار ہمہ وقت خوشبوؤں میں بسے رہتے تھے۔ عطر کے علاوہ آنکھوں میں سرمہ اور دانتوں میں مسی لگانا بھی عام رواج تھا۔ اُن لوگوں کے نزدیک سرمہ مقوی بصر تھا اور مسی دانتوں کو جلا دینے کے لیے کارآمد سمجھی جاتی تھی۔ مہندی لگانے کا شوق بھی مردوں اور عورتوں میں مشترک تھا۔ طرز ضرور مختلف تھا لیکن مہندی سب ہی ہاتھوں اور پیروں میں لگاتے تھے۔ ضعیف العمر اپنے سر کے سفید بالوں کو مہندی ہی سے خضاب کرتے تھے۔ بعض عورتیں بھی اس شوق میں مردوں کی نقل کیا کرتی تھیں۔ زیورات کا استعمال عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن مرد بھی پیروں کی انگلیوں میں اپنی حسب مقدرت سونے یا چاندی کے چھلے پہنتے تھے اور یہ عقیدہ تھا کہ اُن کے استعمال سے آنکھوں کی بصارت کو تقویت پہنچتی تھی۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں نہ صرف روسا و عمائدین بلکہ خواص و عوام سب ہی پہنتے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں متعدد انگوٹھیاں رہا کرتی تھیں۔ روسا و عمائدین کے ہاتھوں میں بڑی بیش قیمت سونے کی جڑاؤ انگوٹھیاں ہوتی تھیں۔ شرفا بھی چاندی کی جڑاؤ انگوٹھیاں جن پر قیمتی نگینے جڑے ہوتے تھے پہنا کرتے تھے۔ شرع اسلام میں مردوں کے لیے سونے اور چاندی کا استعمال ممنوع ہے۔ اس لیے روسا و عمائدین ہاتھوں سے انگوٹھیاں اتار کے نماز پڑھتے تھے۔ اسی طرح چاندی کے ظروف بھی جو شرعاً ممنوع تھے روسا و عمائدین کے یہاں کثرت سے اور عام طور پر استعمال ہوتے تھے۔ لیکن کوئی متشرع بزرگ آجاتا تو اُس کے ساتھ احتیاط برتی جاتی تھی مثلاً یہ کہ پان پیش کرنا ہو تو چاندی کے خاصدان سے گلوریاں نکال کر معذرت کے ساتھ ہاتھ سے پیش کر دیا جاتا تھا۔

چاندی کے ظروف کا استعمال بھی مردوں اور عورتوں میں مشترک تھا۔ محل کے اندر بیگم صاحبہ کا پاندان چاندی کا ہوتا تو رئیس کا پاندان بھی چاندی کی ڈبیہ میں بن کر آتے تھے۔ چاندی کے اگالدان، طشت، گلاس، تشتریاں وغیرہ عام طور سے ہر صاحب حیثیت گھر میں موجود رہا کرتے تھے۔ رئیسوں کے یہاں متعدد پنکھیاں اور مرچھلیں مستعمل رہا کرتی تھیں۔ ان کی ڈنڈیوں پر چاندی چڑھی رہتی تھی۔ شرفا ہوا خوری کے لیے ہاتھ میں مضبوط لکڑی لے کر نکلتے تھے۔ ان لکڑیوں کی موٹ چاندی کی ہوتی یا اُس پر چاندی چڑھی ہوتی تھی۔ روسا کے یہاں مخصوص کمروں میں

قلمی یا چھپی ہوئی تصویریں دیواروں میں نصب رہتی تھیں۔ اِن تصویروں کے فریموں پر چاندی چڑھی رہتی تھی۔ بعض عمائدین کے یہاں پورا چوکھٹا چاندی کا بنا ہوتا تھا۔ روسا و شرفا کے یہاں اُن کے حقوں کی مہنال چاندی کی ہوتی تھی اور چاندی کی زنجیر کے سہارے نیچے میں لگی رہتی تھی اسی طرح کنکوا اُڑانے کی چرخیوں پر چاندی کے پتر اور رئیسوں کے مخملی جوتوں میں چاندی کے تکلس اور مقیش لگے رہتے تھے۔ امام باڑوں میں چاندی اور سونے کے علم لگے رہتے تھے اور متفرق سامان مثلاً کشتی، گلاب پاش اور اگردان سب چاندی کے ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں سونا اور چاندی کے دام اتنے کم تھے کہ کم حیثیت لوگ بھی سونے اور چاندی کے زیورات و اشیا خریدنے میں زیادہ زحمت محسوس نہیں کرتے تھے۔ روسا کے یہاں بہر حال ان دھاتوں کا استعمال بہتات کے ساتھ تھا۔ کم حیثیت لوگوں کے یہاں بھی سونے کے دو چار عدد اور چاندی کے متعدد اشیا برابر فراہم رہتے تھے۔

زیورات بھی خواص و عوام کے یہاں ایک ہی طرز اور ایک ہی نام کے مستعمل تھے۔ البتہ خوش حال لوگوں کے یہاں زیورات کی تعداد فراوانی کے ساتھ رہتی تھی یعنی یہ کہ ایک ہی عضوِ جسم پر پہننے کے کئی کئی طرح کے گہنے ہوتے تھے۔ کم حیثیت والے گھروں میں چاندی کے زیادہ اور سونے کے زیور کم تعداد میں رہتے تھے۔ سونے کے زیورات بہر حال ہر جگہ خالص طلائی اور ساخت میں ٹھوس ہوتے تھے۔ گنتی کے چند زیور جو زیادہ وزنی ہوتے تھے اندر سے خالی ہوتے تھے، اُن میں لاکھ بھر دی جاتی تھی۔ جواہرات کے استعمال کا ہر ایک کو ذوق تھا اور ہر شخص اپنے حسبِ مقدرت کچھ نہ کچھ جڑاؤ سامان ضرور رکھتا تھا۔ مردوں کے ہاتھوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں اور عورتوں کے پاس ایسی قیمتی انگوٹھی یا انگوٹھیوں کے علاوہ دو ایک اور جڑاؤ عدد ہونا ضروری تھا۔ روسا و عمائدین کی بیگمات ہر زیور جڑاؤ استعمال کرتی تھیں۔ گھروں میں بھی ہلکا جڑاؤ زیور پہنا جاتا تھا۔ البتہ اگر کبھی کوئی مخصوص وضع قطع کا فرمایشی سادہ زیور تیار کرایا جاتا تھا تو اُس کو کچھ مدت تک شوق پورا کرنے کے لیے گھر میں بیگم پہن لیا کرتی تھیں۔ لیکن امیروں کی بیگمات نے چاندی کے زیور کبھی استعمال نہیں کیے۔ چاندی کا استعمال صرف ظروف کے لیے مخصوص تھا۔ اب اسی مقام پر اُن تمام زیورات کی تفصیل پیش کی جاتی ہے جو اُس زمانہ میں رائج تھے اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ بلند پایہ بیگمات کے جواہر خانوں میں یہ تمام زیورات فراہم رہتے تھے اور ان میں کا قریب قریب ہر عدد جڑاؤ ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ بعض عمائدین کے یہاں ہیرا،

زمرد، یاقوت، پکھراج اور موتی کے پورے پورے سیٹ تھے جو سارے جسم کی آرائش و زیبائش کو دو بالا کر دیتے تھے۔

پیروں کی انگلیوں میں چھلے اور بچھیا اور پیروں میں پھاگل، کڑے، چھڑے یعنی لچھے، جھانجھ، بیڑیاں، توڑے، پازیب، پری جھپک، جھانوریاں، چاند تارے اور رام جھول پہنے جاتے تھے۔ کم سن لڑکیوں کے پیر میں گھنگرو پہناتے تھے۔ اس مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ بعض ہندو اور مسلمان بڑے گھرانوں میں سونے کے زیورات پیروں میں پہننے کا رواج نہیں تھا۔ ایسے امرا و روسا کی مستورات یہ زیورات نئی نئی وضعیں اور طرحیں نکال کے چاندی کے بنوا کر استعمال کرتی تھیں۔ کمر میں کردھنی تہنی جاتی تھی جو عموماً سونے کی بڑی زنجیر ہوا کرتی تھی۔ بعض بیگمات اپنے جواہر خانوں اور توشک خانوں کی کنجیوں کا گچھا نقرئی خوش نما زنجیر میں اسی کردھنی کے ساتھ آویزاں کر لیتی تھیں۔ اس طرح یہ کنجیاں، نقرئی زنجیر اور طلائی کردھنی کے ساتھ شامل ہو کر ایک اور زیور کا اضافہ بن جاتی تھیں۔

سر و گردن کی زیبائش میں ایسے زیورات ہوتے تھے جن میں وزن کم اور چمک دمک پوری طرح موجود ہو، چنانچہ سر کے لیے سنگار پٹی، چھپکا، ٹیکا، بینا اور جھومر استعمال ہوتے تھے اور گردن میں طوق، گلوبند، چاند، ہنسلی، تختیاں و ڈھولنا، جگنو، چمپا کلی، تلسی مالا، مٹر مالا اور چندن ہار پہنے جاتے تھے۔ مختلف قسم کے ہار سینہ کو بھی ڈھک لیتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ قیمتی، دیدہ زیب اور گراں قدر موتی کا ہار ہوتا تھا جس کے لیے اچھے اور سڈول موتی تلاش کرنے میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ بعض شہزادگان کی بیگمات دُرِ غلطاں کے ہار پہن کر تقریبات میں جب آجاتی تھیں تو ساری محفل کی نظریں انھیں کی طرف اُٹھ جاتی تھیں اور مظاہرہ سے کسی کو سیری نہیں نہیں ہوتی تھی۔ دُرِ غلطاں بے انتہا بیش قیمت موتی ہوتا تھا جس کا ایک ایک دانہ ہزاروں روپیہ کو خریدا جاتا تھا۔ اس کی صفت یہ تھی کہ چمک دمک میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اور اتنا سڈول ہوتا تھا کہ کسی مسطح جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا تھا اور برابر حرکت میں رہتا تھا۔ راقم کو اپنے خاندان کا ایک واقعہ یاد ہے کہ دُرِ غلطاں کا ایک جوڑ وقت پڑنے پر علیحدہ کرنا پڑا تو اس کو بمبئی جا کر پچھتر ہزار روپیہ پر فروخت کیا گیا تھا۔

چہرہ پر ناک اور کان ایسے نمایاں اعضائے جسمانی ہیں جن کی آرائش و زیبائش عورت کے حسن و جمال میں چار چاند لگا دیتی ہیں۔ بہت پرانے زمانے میں ان دونوں اعضا کو آراستہ کرنے کی

قدیم انداز پر فکر کی گئی تھی۔ چنانچہ کان کے لیے "کان چین" ایجاد ہوئی تھی۔ پورے پورے طلائی کان اصلی اور خداداد عضو پر چڑھا لیے جاتے تھے اور انھیں مصنوعی کانوں میں پتے بالیاں وغیرہ پڑی رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وزن بہت سی مستورات کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ یہ مثل رائج ہو گئی تھی کہ "بھاڑ میں جائے ایسا سونا جس سے ٹوٹیں کان"۔ بالآخر کان چھدوانے اور اسی میں زیورات پہننے کا طریقہ رائج ہوا۔ رفتہ رفتہ کان کے زیورات میں پتے بالیاں، بجلیاں اُتراج، انتیاں، کرن پھول، بندے اور گوشوارے معرضِ وجود میں آ گئے۔ ناک کے نتھنوں میں دونوں جانب زیور پہننے کا کبھی کسی کو خیال نہیں آیا۔ غالباً ایسا کرنے کا مقصد زیبائش کے منافی ہوتا۔ بہرحال دونوں نتھنوں کے درمیانی پردے اور بائیں جانب ناک میں چھید بنوائے گئے۔ ناک میں نیچے کی جانب لبوں پر بلاق پہنا جاتا تھا۔ جو حقیقتاً عورت کے حسن و جمال کو دوبالا کر دیتا تھا بالخصوص وہ بلاق جس میں دو موتی اور درمیان میں یاقوت کی مُرّی لگی ہوتی تھی مُرّی کو چُنّی بھی کہتے تھے۔ ناک کے زیور میں کیل، نتھنی اور نتھ داخل ہیں۔ کیل پر عموماً ایک نگ ہوتا تھا۔ وہ کیل جس پر ہیرے یا زمرد کا بڑا نگ جڑا ہوتا تھا، پوری محفل کو جگمگا دیتی تھی۔ نتھنی بن بیاہی لڑکیاں پہنتی تھیں۔ شادی کے بعد نتھ کا استعمال ہوتا تھا۔ نتھ کو تمام زیورات میں یہ خصوصیت حاصل تھی اور اب بھی ہے کہ وہ عورت کے سہاگ کی علامت تھی۔ شادی کے وقت دولہا کے والدین من جملہ دیگر زیورات و اشیا کے دُلہن کے لیے نتھ اور ٹیکا بھی بھیجتے ہیں۔ اسی نتھ اور ٹیکے کو پہنا کر نکاح کی رسم ادا ہوتی ہے۔ بعض روسا کے یہاں یہ دستور تھا کہ والدین اپنی رقم سے نتھ نہیں بھیجتے تھے۔ اُن کے اعزا نتھ بنوا کر چڑھاوے کے زیورات میں شامل کر دیا کرتے تھے اور وہی نتھ اُن کی جانب سے منہ دکھائی کی رقم کا بدل بن جاتی تھی۔ نتھ میں بظاہر صرف دو موتی اور ایک مُرّی ہوتی تھی۔ لیکن نتھ کے موتی بہتر سے بہتر قسم اور شکل کے ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے یہ زیور بہت قیمتی ہو جاتا تھا۔

پیروں کی طرح ہاتھوں میں بھی مقابلتاً بھاری زیور پہنے جاتے تھے۔ نیچے کے جسم میں جس طرح پیروں کی انگلیوں، پنڈلیوں اور کمر کو آراستہ کیا جاتا تھا اُسی ربط سے ہاتھوں کی انگلیوں، کلائیوں اور بازوؤں کو بھی زیورات سے پیراستہ رکھا جاتا تھا۔ ہاتھوں کے ایک انگوٹھے میں آرسی پہنی جاتی تھی۔ جس کو ایک بڑی انگوٹھی کہنا زیادہ مناسب ہوگا البتہ اس بڑی انگوٹھی پر نگینہ کے بجائے ایک چھوٹا سا آئینہ جڑا ہوتا تھا جو بناؤ سنگار کے ساتھ

خود بینی و خود نمائی کا بھی وسیلہ بن جاتا تھا۔ آرسی کے علاوہ دونوں ہاتھوں کی تین تین انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنی جاتی تھیں۔ صرف بیچ کی انگلی خالی رہتی تھی اور چھوٹی انگلیوں میں انگوٹھیوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی تھی۔ یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ہر ہاتھ میں سات سات انگوٹھیاں ضرور رہیں۔ روسا و عمائدین کی بیگمات انگوٹھیوں کے درمیان سونے کے چھلّے بھی پہنتی تھیں۔ اس طریقۂ کار کی وجہ سے انگوٹھیوں کے نگینوں میں اور زیادہ جلا نظر آتی تھی۔ کلائیوں میں چوڑیاں، کڑے، کنگن، جہانگیریاں، پٹریاں، پہونچیاں، دست بند، شوق بند، ثمرنین، جو ہے دنیاں اور گجرے پہنے جاتے تھے۔ گجرے صرف موتیوں کے بنتے تھے اور ان کی صناعی میں چھوٹے اور بڑے موتیوں کا تناسب کے ساتھ الحاق کرنا کمال سمجھا جاتا تھا۔ کلائیوں کے ان زیورات کے علاوہ بازوؤں پر پہننے کے لیے جوشن، نونگے، نورتن، مٹھیاں اور بکّہ زیورات تھے۔ بکّہ عام طور سے یاقوت کے بڑے نگ سے بنتا تھا اور جہاں تک راقم کو یاد آتا ہے ایک ہی بازو پر بکّہ باندھا جاتا تھا۔ جڑاؤ ہونے کے اعتبار سے نورتن ان میں سب سے زیادہ قیمتی زیور ہوتا تھا جس میں قیمتی سے قیمتی نو نگینے جڑے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ہاتھ، گلے، سر اور پیر کے یہ تمام زیورات بیک وقت پہنے نہیں جا سکتے تھے۔ زیورات کے استعمال کا ایک اسلوب تھا اور یہ اسلوب انفرادی ذوق و شوق پر منحصر ہوتا تھا لیکن پھر بھی کچھ طریقے ایسے تھے جن کی پابندی ہر رئیس کے گھر میں ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ گھروں میں عموماً سادے خوش وضع زیور پہنے جاتے تھے جو جڑاؤ چیزیں روزمرہ کے استعمال میں رہتی تھیں، وہ بھی عام طور سے ہلکی ہوتی تھیں جیسے کہ چند انگوٹھیاں یا جڑاؤ چوڑیاں وغیرہ۔ سر اور پیر نیز بازو کا کوئی زیور محلوں کے اندر نہیں پہنا جاتا تھا۔ تقریبات میں شرکت کے موقع پر زیورات کے بکس کھلتے تھے اور جتنے موقعوں پر شرکت مدنظر ہوتی ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ ملبوس اور علیحدہ علیحدہ زیورات نکال لیے جاتے تھے۔ زیورات نیز کپڑوں کے سلسلہ میں تقریب کے بانی، وہاں شرکت کرنے والوں کی حیثیت کا خصوصیت سے خیال رکھا جاتا تھا۔ سب سے بڑا اور اہم جذبہ یہ کارفرما رہتا تھا کہ دوسروں کی نظر میں اپنی حیثیت بلند نہ ہو تو پست بھی نہ ہونے پائے۔ جن تقاریب میں یہ سمجھ کر شرکت کی جاتی تھی کہ اپنے سے بڑے گھر میں جانا ہے وہاں بھی اپنی نمود برقرار رکھنے کا خیال رکھا جاتا تھا۔ زیور ہلکا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ قیمتی لباس زیب تن کیا جاتا تھا۔ چھوٹے بڑے کی تفریق کے اس لحاظ کے علاوہ بعض اصول ایسے تھے جن پر سب

محلات کار بند رہتے تھے۔ بیگمات کو موسم کا بہت خیال رہتا تھا۔ شدید گرمی ہو سخت جاڑا۔ برسات کی فصل ہو یا گرمی و سردی کا معتدل زمانہ، ان تمام حالات و کیفیات پر نظر رکھ کر زیورات استعمال ہوتے تھے۔ گرمیوں میں ہلکے رنگ کے کپڑے پہنے جاتے اور وہی زیور پسند کیا جاتا۔ جس کے جڑاؤ نگینوں میں ملبوس سے مناسبت ہوتی تھی۔ جاڑوں کے موسم میں بھاری کپڑے بھاری زیور اور شوخ رنگ کے جواہر استعمال ہوتے تھے۔ ہیرا، زمرد اور موتی کے جڑاؤ زیورات ہر موسم میں قابلِ قبول ہوتے تھے۔ شانِ ریاست میں ایک قابلِ لحاظ خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ جتنے زیور پہنے جائیں اُن سب میں ایک ہی قیمتی پتھر نمایاں رہے مثلاً یہ کہ ہاتھ، گلے اور پیر میں، ہیرا ہو تو ہیرے ہی کے سب جڑاؤ زیورات پہنے جائیں اور اگر کسی دوسرے پتھر والے زیور کا جوڑ ہو تو دونوں کے رنگ میں مناسبت ہو مثلاً یہ کہ نیلم کے ساتھ صرف موتی یا ہیرے کا جوڑ لگایا جاتا تھا۔ زیورات پہننے میں بھی بڑے اور اونچے گھرانوں کی بیگمات سختی کے ساتھ یہ خیال رکھتی تھیں کہ زیور کی ڈوریاں بدن پر چسپ نہ ہوں اور ہر زیور اس طرح بنوایا جاتا تھا کہ جسم پر ڈھیلا رہے۔ اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ بڑی بڑی تقریبات میں جہاں عورتوں کا ہجوم لگ جایا کرتا تھا، کسی نہ کسی رئیس کی بیگم کا کوئی نہ کوئی قیمتی زیور ضرور ضائع ہو جاتا تھا۔ جس کو تلاش کرنے کی فکر اُس تقریب کے اختتام تک جاری رہتی تھی۔ اس کے بعد پھر اُس کا بدل بجنسہٖ ویسا ہی بنوا لینا ملحوظ رہتا تھا اور یہ خواہش بھی بہت جلد پوری ہو جاتی تھی۔

روسا و عمائدین کے بلند پایہ مذاق اور اُن کی طبیعتوں میں لطافت و نزاکت کی بدولت لکھنؤ کے سُنار بھی بڑے فن کار اور صنّاع تھے۔ ہر بڑے گھر سے کوئی نہ کوئی سنار وابستہ رہتا تھا۔ اس طبقہ میں تقسیم کار کا اصول رائج تھا۔ بعض لوگ صرف سنار تھے اور سونے کے زیورات سادے سادے بناتے تھے۔ انھیں سادہ زیورات میں بہتر سے بہتر حسین و جمیل وضعیں نکالی جاتی تھیں لیکن یہ لوگ عام طور سے نگینے نہیں جڑتے تھے۔ جڑاؤ زیورات بنانے والا دوسرا طبقہ تھا جس کو سادے کار کہتے تھے۔ ان لوگوں کو رنگ سے رنگ ملانے اور پتھر سے پتھر جوڑنے میں بڑا سلیقہ تھا۔ دار الشفا کے سامنے ایک معمر سادہ کار رہتے تھے جو اپنی فن کاری میں عدیم المثال سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے راقم کی اہلیہ مرحومہ کے لیے ایک ایسی انگوٹھی تیار کی تھی جس میں ایک پتھر میں جوف کر کے سونے کے مہین تار سے اُس کے اوپر ہیرے کا نگینہ جڑ دیا

تھا۔ دور سے دیکھنے میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ لال پتھر سے سفید نگینہ معرضِ ظہور میں آگیا ہے۔ معمولی سناروں کو چاندی میں سونا ملا کر گنگا جمنی کام بنانے کا جتنا اچھا سلیقہ تھا ویسا ہی پتھر میں پتھر ملا کے زیور بنا دینے میں سادہ کاروں کو کمال حاصل تھا۔ اس زمانہ میں ایک انگوٹھی میں چھوٹے چھوٹے پانچ سات سے لے کر نو نگینوں تک کے جڑوانے کا بہت رواج تھا۔ سادہ کار اس خوبی کے ساتھ ایسی انگوٹھیاں تیار کرتے تھے جن میں پانچ سات نگینے مناسب مقام پر ہوتے یا آٹھ نگینے ارد گرد اور ایک مقابلتاً بڑا درمیان میں ہوتا تھا، یہ سب بے حد خوب صورتی اور مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوتے تھے۔ کسی نگینہ کا ڈھیلا ہو کر گر جانا بہت بڑا عیب تھا۔ نگینوں کو دبانے کے لیے جو کانٹے اُبھارے جاتے تھے وہ انگلیوں کی طرح پتھر کو دبائے رکھتے تھے۔ ان کانٹوں کا گھس جانا بھی آسان نہ ہوتا تھا۔ برسوں کے بعد یہ صورت پیدا ہوتی تھی جس کی اصلاح کے لیے فی الفور توجہ کر لی جاتی تھی۔ زیورات کے جواہرات بھی زیادہ تر شہر ہی میں تیار ہوتے تھے۔ پتھروں کی کھڑیں مختلف مقامات سے آتی تھیں۔ مثلاً نیلم کی کھڑ کشمیر سے، زمرد کی کھڑ پنّا سے اور یاقوت وغیرہ کی لنکا سے آتی تھی۔ انھیں کھڑوں کو نگینہ ساز تراش کے زیورات کے لیے مختلف اوزان اور جسامت کے نگینے بناتے تھے۔ اس طرح متوسط طبقہ کے بس میں بھی اُن کی خریداری ہوتی تھی۔ البتہ "رنگ ڈھنگ سنگ" کی خوبیوں کے لحاظ سے نگینوں کی قیمتیں بالا سے بالاتر ہوتی تھیں۔ بیرونِ جات سے آتے ہوئے دُرِ شاہوار، دُرِ غلطاں، یاقوت رمانی، عقیق یمنی، فیروزہ نیشاپوری وغیرہ کی خریداری صرف روسا و امرا تک محدود رہتی تھی۔ پرانے لکھنؤ میں دیسی اور بدیسی جواہرات کی بڑی کھپت ہو جاتی تھی۔ پھر بھی کچھ مال بچ رہتا تھا جو دوسرے مقامات پر فروخت ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ نگینہ سازی کا ہنر ختم ہو گیا اور جو باقی رہ گیا ہے وہ صرف کہنے کو ہے۔ اب شہر والے قیمتی جڑاؤ زیورات کے خوگر بھی نہیں ہیں۔ سادے زیورات بھی عنقا ہیں، سادہ کاری کا فن مفقود ہے۔ پرانے رئیسوں پر زوال آنے کے بعد یہ نقصان بھی جھیلنا پڑا کہ فن کاری اور صناعی کے کمالات بھی لکھنؤ سے رخصت ہو گئے۔

## (۴) پیتل اور تانبے کے ظروف

شہر لکھنؤ کی آبادکاری میں محلہ یحییٰ گنج کو بڑی قدامت حاصل ہے۔ یہ محلہ اُسی زمانہ میں

آباد ہوا تھا۔ جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا دار السلطنت بنایا تھا۔ وہ خود دولت خانہ آصفی میں قیام فرماتے تھے اور اُس زمانہ میں شاہی اصطبل محلہ یحییٰ گنج میں قایم ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ علاقہ پوری طرح آباد ہو گیا۔ اصطبل بھی دوسری جگہ منتقل ہو گیا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس محلہ کے باشندوں میں تانبے کے برتن بنانے والے صنّاع بھی کثرت سے تھے اس لیے اسی مقام پر ایسے برتنوں کی بازار قایم ہو گئی جو اب تک برقرار ہے۔ تانبے کے علاوہ دوسری دھاتوں پیتل، لوہا وغیرہ کے برتن بھی اسی محلہ میں بنتے اور فروخت ہوتے رہے ہیں۔ ان برتنوں کا شہر میں واحد بازار ہوتے ہوئے پرانے زمانہ میں یہاں بہت چہل پہل رہتی تھی۔ دوکانیں سجی بجائی اور ظروف سلیقے سے لگے اور جھل جھل کرتے ہوئے بڑا دلفریب نظارہ پیش کرتے تھے۔ تانبے کے منقش اور مینا کار ظروف نیز تانبے پر طلا کاری کے اعلیٰ نمونے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ دن بھر بازار گرم رہتا تھا اور دور دور سے لوگ آ کر ہمارے شہر کے ان مصنوعات کو بڑے ذوق و شوق سے خرید لے جاتے تھے۔ اُس زمانہ میں پان کھانے کا اتنا زیادہ رواج تھا کہ ہر خاص و عام اپنی جیب میں پان کی ڈبیہ رکھتا تھا۔ یہ ڈبیاں تانبے کی بنتی تھیں — نہایت سبک، سجل، خوش وضع، خوش قطع اور مختلف طرز کی ہوا کرتی تھیں۔ ان پرانے فن کاروں میں یہ کمال تھا کہ انھوں نے صرف ایک پان کی ڈبیہ کے بے شمار اور لاتعداد نمونے بنا کر پیش کر دیے تھے۔

یحییٰ گنج کے بازار میں اس وقت بھی سب سے زیادہ پرانی دوکان موسومہ کنہیا لال پراگ داس برقرار ہے جو ۱۸۸۰ء میں قایم ہوئی تھی۔ مالکان دوکان کے بزرگ ابتداءً چاندی کا سامان بناتے تھے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں ہر صنعت و حرفت کے لیے علیحدہ علیحدہ بازار مخصوص تھے۔ چاندی سونے کا کاروبار چوک صرّافہ میں ہوتا تھا اس لیے محلہ یحییٰ گنج میں یہ کام چلائے نہ چلا اور اُن لوگوں نے تانبے پر توجہ کر کے تانبے کی صنعتوں کو آسمان تک بلند کر دیا تھا۔ پراگ داس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن کنہیا لال سے راقم کی اچھی خاصی ملاقات تھی اور مرحوم مہاراجہ بہادر والی محمود آباد کے محل موسومہ اقبال منزل کی آرایش و زیبایش کے سلسلہ میں اُن سے متعدد بار کام پڑا تھا۔ کنہیا لال انتہائی شریف و نیک انسان تھے۔ اُن کا طرزِ زندگی سادہ تھا اور معاملات میں دیانت داری اُن کا شعار تھا۔ سب سے پہلی بار جب میری اُن سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ دھوتی پر انگرکھا

پہنتے تھے اور سر پر پگڑی باندھتے تھے۔ لاکھوں روپے کا کاروبار میری وساطت سے اُن کی دوکان پر بنا تھا۔ مجھے اُس زمانہ تک اشیا کی قیمتیں پرکھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ میرے امکان میں یہ طریقۂ کار تھا کہ ہر دوکان پر جاکر بھاؤ دریافت کرتا لیکن میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کنھیا لال پراگ داس کے بل پاس کرنے میں کبھی غلطی نہیں کی جس کی توثیق شیخ علی حسن منیجر سہالی اسٹیٹ کا ایسا جہاں دیدہ بزرگ کر دیا کرتا تھا اور یہ سب کاروبار میں صرف کنھیا لال کے اعتبار پر چلتا رہا تھا۔ میری اُن سے جب زیادہ ملاقات بڑھ گئی تھی تو انھوں نے مجھے پیتل کا بڑا اور بھاری لوٹا تحفتاً پیش کیا تھا جس کی یاد آج تک دل کو تڑپاتی ہے۔ برسوں کے بعد وہ لوٹا چوری ہو گیا تھا اور اُس کے بعد سے اب تک یعنی گزشتہ اڑتالیس برس میں ویسا لوٹا نہ میں خرید سکا اور نہ میں نے کہیں دیکھا۔ اُس کی صفت یہ تھی کہ اُس کا موگھڑ، اُس کے نیچے والا ٹکانے کا گھیرا اور اُس کی ٹونٹی، یہ تمام حصے ایک ہی ظرف کا جزو تھے۔ کوئی حصہ علیحدہ سے جڑا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ پورا لوٹا ایک ساتھ ڈھلا ہوا تھا۔ قدیم لکھنؤ میں ڈھلائی کا کام حیرت خیز کامیابی کے ساتھ ہوا کرتا تھا لیکن اس مخصوص لوٹے کی یہ صنعت اپنی آپ مثال تھی۔

اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ اس مخصوص لوٹے کی صناعی قریب قریب اُسی زمانہ میں ہوتی تھی جب پیتل کے برتن بنانے کا نیا رواج شروع ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک تمام ظروف اور اشیا تانبے کے بنتے تھے۔ پیتل سے کیوں اجتناب تھا اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی جا سکتی۔ البتہ ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔ مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کے یہاں ایک بار یہی سوال کسی نے کیا تھا۔ کہ روزمرہ کے استعمال والے برتن آخر پیتل کے کیوں نہیں بنتے تو فی الفور کسی دوسرے نے یہ جواب دیا تھا کہ " ویسے ہی برتن درکار ہوں تو پھر سونے کے کیوں نہ بنوا لیے جائیں، تانبا شامل کر کے اُس سے بہتر بن جائیں گے۔" اس جواب سے اُس زمانے میں سونے کی ارزانی کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پیتل پر تانبے کو لوگ ترجیح دیتے تھے۔ پھر بھی یہاں یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ ڈھلائی کا کام اتنا زیادہ ترقی پر تھا کہ جب پیتل کے برتن بنانے کا چلن شروع ہوا تو کاریگروں نے اسی دھات کو ڈھال کر بہترین لوٹا بنا ڈالا تھا۔ جو صنعت و حرفت نیز اپنے حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ تانبے کے ظروف اور اشیا پر اتنے کمالات کا مظاہرہ کیا گیا تھا

جن کی تفصیلات پیش کرنا بھی محال ہے۔ من جملہ ان کمالات کے ڈھلائی، نقاشی، میناکاری قابلِ ذکر ہیں۔ نقاشی کے نتیجہ میں میناکاری معرضِ وجود میں آئی تھی اور میناکاری کی زیب و زینت دوبالا کرنے کے لیے تانبے پر سونے کا پانی اس طرح چڑھایا جاتا تھا کہ بسا اوقات تانبے پر سونے کا گمان ہونے لگتا تھا جس کو پرکھنے کے لیے زیور یا ظرف کو گلا کر معائنہ ضروری قرار پاجاتا تھا۔

نقاشی بہت نازک اور لطیف کام ہے۔ تانبے کی مصنوعات پر مختلف قسم کے ڈیزائن کندہ کیے جاتے تھے۔ اُس زمانہ میں لوگوں کو مناظرِ قدرت بالخصوص باغات سے زیادہ دلچسپی تھی اس لیے ان نقوش میں پھولوں، پتیوں، بیلوں کی عکاسی زیادہ ہوتی تھی۔ نقاشی کے بعد مصنوعات پر جلا ہوتی تھی جس کو قلعی کہتے تھے۔ اُس کے بعد یہ ظروف بے حد دل کش اور دیدہ فریب نظر آتے تھے۔ قلعی عموماً رانگہ کے پانی سے ہوتی تھی لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پرانی قلعی کی جلا اب کیوں نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ رانگہ وہی ہے اور قلعی کرنے کے طرز بھی بدستور قایم ہے۔ بہرحال لکھنؤ کے رؤسا ان منقش اور مجلّا مصنوعات پر اکتفا نہیں کرسکے۔ اُن کے جمالیاتی ذوق نے میناکاری پر توجہ کی۔ میناکاری کی ابتدا کہاں اور کب ہوئی تھی اس موضوع سے قطعِ نظر ہم کو صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ تانبے کے منقش مصنوعات پر لکھنؤ میں بہت نفیس میناکاری کی گئی۔ کچھ مسالے کسی حکمتِ عملی سے رنگ دے کر تیار کیے جاتے تھے۔ عموماً گہرا سرخ یا نیلا رنگ پسند کیا جاتا تھا، یہ مسالے شمع کی صورت میں گول اور لمبے ہوتے تھے۔ صنّاع اُن کو ہاتھ میں لے کر نقوش کی گہرائیوں پر اس طرح دباتے اور رگڑتے تھے کہ مسالے پوری طرح ساری خلا کو بھر دیتے اور سطح برابر ہوجاتی تھی۔ چمکتی ہوئی سفیدی میں یہ روشن رنگینی بہت زیادہ خوب صورت اور پائندہ ہوتی تھی عمائدین کی شانِ ریاست نے اور آگے قدم بڑھایا تو ان تانبے کی مصنوعات پر سونے کی جلا بھی ہونے لگی۔ اور یہ تمام چیزیں سونے کی معلوم ہوتی تھیں۔ میناکاری کا کام چاندی اور سونے کی اشیا پر بھی بہت عمدہ بنتا تھا۔ لیکن اب یک لخت مفقود ہے۔ نقاشی کی صنعت برقرار ہے لیکن پہلی سی لطافت و نزاکت معدوم ہے اور بدلے ہوئے زمانہ میں لوگوں کے بدلے ہوئے مذاق نے ڈیزائنوں کے ذوق کو بھی متاثر کردیا ہے۔

میناکاری کے ہم پلّہ ایک اور صنعت تھی جس کو گنگا جمنی کہتے تھے۔ یہ کام تیاری کے

بعد بہت دل فریب اور نظر فروز ہوتا تھا۔ گنگا جمنی طرز میں روپہلی اور سنہری صناعی پہلو بہ پہلو بالا اتصال ہوتی ہے۔ یہ طرز زردوزی کے کام میں بھی رائج رہی ہے۔ پہلے چاندی اور سونے کے اصلی تاروں سے یہ کام بنایا جاتا تھا لیکن اب ہمارے کاریگر روپہلی اور سنہری ساز و سامان پر قناعت کرتے ہیں۔ ظروف اور اشیا پر گنگا جمنی کام بنانا بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لیے تجربے، ذہانت اور فن کارانہ صلاحیت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جہاں تک قیاس کیا جاسکتا ہے ظروف پر گنگا جمنی کام بنانے کے لیے سونے اور چاندی کا گہرا پانی چڑھانے کی حاجت تھی تاکہ ملمع دیر پا رہے۔ گنگا جمنی کام جتنا خوب صورت ہوتا ہے اتنا ہی ملمع جھڑ جانے کے بعد بدشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس صنعت کاری میں اخراجات بھی زیادہ درکار ہوتے تھے۔ گنگا جمنی کام کی وضعیں بے شمار تھیں کیوں کہ اُن میں بہت سی روسا کی خود ساختہ ہوتی تھیں لیکن راقم کے مشاہدات میں تین طرزیں بہت خوش نما ہوتی تھیں۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ قریب قریب یا کچھ فاصلے سے کم چوڑی لکیریں اس طرح بناتے تھے کہ سورج کی روشنی میں روپہلی اور سنہری رنگ ایک دوسرے کی قربت میں دیدہ زیب نظر آئیں۔ یہ کام عموماً بڑے نمائشی ظروف پر بنایا جاتا تھا۔ دوسرا طرز لہریا تھا جس میں ٹیڑھی لکیریں قریب قریب بنادی جاتی تھیں۔ ان میں بھی روپہلی اور سنہری رنگ کا اتصال حسن پیدا کر دیتا تھا۔ یہ کام بھی بڑی اشیا پر بنتا تھا۔ سب سے زیادہ دلفریب کام وہ ہوتا تھا جس میں اُبھرے ہوئے چاندی اور سونے کے دندانے بہار دکھاتے تھے۔ تانبے کے لوٹوں پر عموماً اُن کے مدور بیچ کے حصہ پر یہ کام بنایا جاتا تھا۔ ان میں بعض اتنی فن کارانہ نمود کے مالک تھے کہ جی چاہتا تھا ان کو دیکھا کیجیے۔ ان تمام وضعوں کے بنانے کا طریقہ ایک ہی تھا۔ فرق صرف یہ ہوتا تھا کہ بعض نقوش اُبھرے اور بعض قریب قریب مسطح ہوتے تھے۔

مسطح نقوش پر چاندی یا سونا چڑھانا دیدہ ریزی کا کام ضرور تھا لیکن اُبھرے ہوئے دندانوں میں ملمع سازی کے فاصلے اس طرح برقرار رکھنا کہ اُن کی خوب صورتی پر زوال نہ آنے پائے مشکل کام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گنگا جمنی کام کی وضع بنانے کے لیے پہلے ایک تجربہ کار اور با مذاق فن کار کی ضرورت ہوتی تھی جو نمونہ تیار کرتا تھا۔ اُس کے بعد نقاش تیار شدہ ظرف پر اُس نمونہ کی نقل کندہ کرتا تھا۔ آخر میں اُس صناع کی باری آتی تھی جو گنگا جمنی طرز کا ملمع چڑھانے کی مہارت رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان تینوں فنون کے جاننے والے بھی گنج

ہی میں رہتے تھے۔ اور یہ صناع ایک دوسرے سے اشتراک کر کے بہت جلد کام تیار کر دیتے تھے۔ لیکن قدر دانوں کے اُٹھ جانے کے بعد تمام پرانے صناع و فن کار بھی ختم ہو گئے۔ بیجی اگنج اب بھی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ تانبے اور پیتل کے ظروف اب بھی دستیاب ہوتے ہیں لیکن گنگا جمنی کام کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہی رہتی تھیں۔

راقم کو معدنیات کے بارے میں کوئی سائنسی معلومات حاصل نہیں ہیں اور نہ کسی ایک دھات کے بھی کیمیائی تراکیب سے واقفیت ہے۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ تانبا ایک مخصوص انضمام و اختلاط کی خصوصیات کا حامل ہے۔ تانبے کو بڑی آسانی کے ساتھ سونے اور چاندی میں مخلوط کیا جاتا تھا۔ تانبے کے اوپر سونے اور چاندی کا کام گنگا جمنی کہلاتا تھا۔ تانبے کے ظروف اور بڑی بڑی جسامت کی اشیا پر چاندی کا ملمع کر کے یا چاندی کے پتر چڑھا کر اس طرح شکل و صورت پیش کی جاتی تھی کہ اُن کو چاندی ہی کی چیزیں کہنا پڑتا تھا۔ اس قسم کی چیزوں میں مندروں اور عالیشان عمارتوں کے کلس اور گمزیوں، ہاتھی کے ہودج، روسا کے بیٹھنے کی کرسیوں اور چھتر نیز بہت سے دوسرے آرائش و زیبایش کے سامانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ پرانے زمانے کی ان اشیا میں بہت کچھ ساز و سامان مختلف مقامات پر اب تک محفوظ ہے۔ اُن کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ چیزیں سیدھی سادی نہیں بنتی تھیں بلکہ موقع اور محل کی مناسبت سے اُن میں وضعیں بھی تراشی جاتی تھیں۔ شیین آباد مبارک کی شاہی طرز والی چاندی کی کرسی اور برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کی تعلقہ داران والی چاندی والی کرسی میں امتیاز نظر آتا ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ اور امتیاز مدارج برتنے کا سلیقہ بیجی اگنج کے پرانے فن کاروں کو حاصل تھا۔ زیبایش و آرائش کی بہت سی چیزیں اب اس طرح عنقا ہیں جن کے غالباً نام تک عام لوگوں کے حافظے میں باقی نہیں رہی اسی قسم کی ایک تخلیق تھی جس کو سورج مکھی کہتے تھے۔ تانبے کا ایک بڑا طباق ہوتا تھا جس پر سورج کی کرنیں نقش ہوتی تھیں۔ عالیشان عمارتوں کے گنبدوں کے خلا میں نیچے کی طرف اس طباق کو نصب کر دیا جاتا تھا۔ اُس پر نظر کیجیے تو طلوع آفتاب کا سماں آنکھوں میں جلوہ گر ہو جاتا تھا۔ یہ تمام چیزیں گرانی نیز لوگوں کا مذاق بدل جانے کی بدولت فنا ہو گئیں۔

کنہیا لال پراگ داس کی تقریباً سو برس پرانی دوکان اب بھی موجود ہے لیکن وہاں تانبے کے گراں قدر اور جاذب نظر مصنوعات کے بجائے جدید طرز کے اسٹیل کا سامان بہتات

کے ساتھ ملتا ہے۔

خانگی ضروریات سے متعلق روزمرّہ کی استعمال والی اشیا میں بھی اب نمایاں فرق آگیا ہے۔ پہلی سی کوئی چیز اپنی پرانی جسامت پر اور اپنے قدیم وزن میں اب بازار میں دستیاب نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ بھی گرانی اور مزاجوں کا بدل جانا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد بڑے عالی حوصلہ اور فراخ دل تھے۔ اُن کو بڑی بڑی دیگوں بڑے بڑے پتیلوں اور اُسی تناسب سے ہر دوسری ضروری چیز درکار تھی۔ گھر کے باورچی خانے کے لیے بھی چھوٹی سے چھوٹی دیگ یا پتیلا ایسا مطلوب تھا جس میں دس سیر پلاؤ اور پانچ سیر گوشت کا قورمہ پک سکے۔ لیکن اب ہم کو اپنی خانگی ضرورت کے لیے سیر بھر گوشت کے سالن کی پتیلی کافی ہوتی ہے۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر بازار میں ظروف بنتے اور فروخت ہوتے ہیں۔ جسامت اور وزن میں متناسب کمی کے سبب سے موجودہ دور کے برتن بہت جلد اس لیے بے کار ہو جاتے ہیں کہ اُن کے ہلکے پیندے گھس کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ ایسا یاد آرہا ہے جو پرانے اور نئے طرز کے برتنوں کی ہیئت اور اُن میں نمایاں فرق کی وضاحت کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ محلہ جوہری محلہ کے ایک سید زادے اپنی کتخدائی کے بعد اپنے دوسرے عزیزوں سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے علیحدہ مکان حاصل کر کے اپنی خانہ داری کے انتظامات کیے تو باورچی خانہ کے لیے برتنوں کی شدید ضرورت ایک مرحلہ بن گئی۔ حاضر الوقت سرمایہ دوسری اہم ضرورتوں کی فراہمی کے بعد ناکافی ہوا۔ اُن کے پاس من جملہ دیگر جائداد منقولہ کے جو اُن کو ترکہ میں ملا تھا، ایک تانبے کی بڑی دیگ تھی جس کو انھوں نے بے کار چیز سمجھ کر ناقدری سے ڈال رکھا تھا، دوستوں کے مشورہ سے اُس کو فروخت کر کے باورچی خانہ کا سامان خرید لینا قرار پایا۔ چنانچہ وہ دیگ پرانے تانبے کے بھاؤ فروخت ہوئی اور جو معاوضہ ملا اُس میں تین یا چار چھوٹی اور بڑی پتیلیاں، ایک تسلہ، ایک سینی اور دو دو چمچے اور کفگیریں علاوہ بعض دیگر متفرق چیزوں کے خریدی گئیں۔ اس خریداری کے بعد بھی چند روپے اُن کی جیب میں باقی تھے۔ وہ بہت خوش خوش واپس آئے لیکن کچھ ہی مدّت کے بعد ان نئے تانبے کے برتنوں پر قلعی کی ضرورت ہوتی اور یہ ضرورت برابر ہوتی رہی یہاں تک کہ دو ہی تین برسوں کے بعد پتیلیوں کے پیندوں نے جواب دے دیا۔ وہ دیگ تقریباً پچاس برس پرانی تھی اور اپنے اصل استحکام اور خوب صورتی پر برقرار تھی۔ اس نقص میں کاری گروں اور دوکانداروں کا

اتنا قصور نہیں تھا جتنا خود ہمارے ذوق، باق کے فتور کو دخل تھا۔ موجودہ دور میں لوگ ہلکے اور سستے برتنوں کے دلدادہ ہیں اور یہی تقاضا روزافزوں گرانی کا ہے۔

## (۵) مٹی کے برتن اور کھلونے

لکھنؤ کے بے شمار تخلیقات و مصنوعات اتنے گراں قدر اور گراں بہا تھے جن کی مثال دنیا کے کسی کونے میں نہیں ملتی تھی۔ انھیں عدیم المثال فن کاریوں میں ہمارے یہاں کے وہ برتن اور کھلونے بھی تھے جن کو ہمارے شہر کے کمہار مٹی سے بنا کر اس حسن و جمال کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ جمالیاتی ذوق رکھنے والے اُن پر زر و جواہر نچھاور کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے، نہیں کہا جا سکتا کہ اُس صنّاعی میں خاکِ پاک لکھنؤ کی برکتیں شامل تھیں یا یہ کہ اُن تخلیقات میں ماورائے فطرت انسانی کوئی کارساز ذہن کام کرتا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا ایسا تھا کہ اُس دولتِ بیدار کے لٹ جانے کے بعد آج ہم جتنا بھی خون کے آنسو بہائیں وہ کم ہوگا۔ دولت ایک ہاتھ سے نکل کر دوسری جگہ چلی جاتی ہے، آج کا فقیر کل امیر ہو جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے دولت جا کر پھر پلٹ آئے لیکن صنعت و حرفت کا وہ بیش بہا خزانہ جو ہم سے جدا ہو گیا کسی دوسرے ہاتھوں میں بھی نظر نہیں آتا اور نہ کوئی ایسی توقع ہے کہ کسی مستقبل بعید میں بھی ہم اس سے پھر بہرہ مند ہو سکیں گے۔ حکومتِ وقت کھلونے بنانے والوں کی سرپرستی ضرور کر رہی ہے۔ لیکن پرانی دلفریب اور نظر افروز جادوگری کا شمہ بھر بھی کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ مٹی کے جو اور جیسے کھلونے بنتے تھے اُن کی پرچھائیں تک ناپید ہے اور مٹی کے جو اور جیسے کارآمد اور فرحت افزا برتن اکبری دروازہ میں ہمہ وقت مل جایا کرتے تھے اب خواب و خیال ہیں۔

اکبری دروازہ سلطنتِ اودھ کے باضابطہ قیام کے بہت پہلے معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ یہ دروازہ اکبر بادشاہ کے نام پر انھیں کے دورِ اقتدار کے آخری زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔ عہدِ آصفی میں جب چوک بازار پر از سرِ نو بہار آئی تو اکبری دروازہ کی زینت بھی دوبالا ہو گئی۔ پرانے لوگ کہا کرتے تھے کہ اُسی زمانہ سے اکبری دروازہ کی اندرونی وسیع و عریض دو طرفہ دوکانوں میں مٹی سے تیار کردہ اشیا کی دوکانیں قایم ہو چکی تھیں۔ روسا و امرا کی سرپرستی میں انھیں چیزوں میں جدّتیں اور نزاکتیں پیدا ہوئیں۔ فن کار اور صناع بہتر سے بہتر چیزیں اپنی اپنی قیام گاہوں پر تیار کرتے تھے لیکن اُن کی فروخت اور نمایش کے لیے اکبری دروازہ ہی کی دوکانیں تھیں

فرمایش کرنے والے یہیں آکر فرمائشیں کرتے اور مطلوبہ چیزیں حاصل کر لیتے تھے۔ روسا و عمائدین کے یہاں سے بھی ہدایات انھیں دوکانداروں کو موصول ہوتے تھے اور یہی لوگ وقت پر محل سراؤں میں جاکر سامان پہنچا دیتے تھے۔ بیگمات بھی اپنی تجویز کردہ وضع قطع کے برتن وغیرہ بنواتی تھیں اور یہ سامان ڈیوڑھی پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ بعض کسگرنیوں کو محلسراؤں میں داخل ہونے کی بھی اجازت تھی لیکن یہ نوبت برسوں کی خریداری اور فروخت کرنے والی عورت کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد آتی تھی۔ روسا کی نازک مزاجیوں کی بدولت مٹی کے برتنوں میں بھی موسم، شادی و غمی کی تقاریب اور استعمال کے موقع و محل کے لحاظ سے فرق ہوتا تھا۔ اسی امتیاز کی بدولت مٹی کے برتنوں میں وضعوں اور قطعوں کی اتنی بہتات ہوگئی تھی کہ دوکانیں نمونوں کی نمایش گاہ نظر آتی تھیں۔ برتنوں میں مستعمل اشیا کی مقدار کے اعتبار سے علیحدہ تنوع تھا لیکن اُس سے زیادہ قابل لحاظ وہ امتیاز تھا جو محل استعمال کی بنا پر پیدا کر دیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر لے لیجیے، مٹی کی رکابیاں جن میں غذائیں لگائی جاتی تھیں تین قسموں پر مشتمل تھی جس کو سادی، لاکھی اور روغنی کہتے تھے۔

مٹی کی یہ رکابیاں انتہائی صاف، ستھری اور سڈول ہوتی تھیں جن پر نام کو بھی گرد و غبار کا کوئی ذرہ نظر نہیں آتا تھا۔ استعمال کے قبل اُن کو دھلوا لینا بہر حال ضروری تھا اور خشک ہونے کے بعد کام میں لائی جاتی تھیں۔ سادی رکابیوں کے خشک ہونے میں کچھ دیر لگتی تھی اور اُن میں خشک چیزیں ہی استعمال ہوتی تھیں مثلاً میوہ جات، فواکہات، مٹھائی وغیرہ۔ انھیں سادہ رکابیوں پر خوب صورت رنگین کاغذ کے گردے جن میں پھول وغیرہ کٹے ہوتے تھے بچھا کر خوردنی اشیا سلیقہ سے رکھ دی جاتی تھیں اور ایک خوان میں ایسی پانچ یا سات رکابیاں لگا کے کسنے میں باندھ کر دوستوں، عزیزوں یا جہاں بھی بھیجنا ہوتی تھیں بھیجی جاتی تھیں۔ خوان کے کسنے کے ڈورے رنگین اور خوب صورت ہوتے تھے۔ مجلسوں کے حصے بھی لوگوں کے گھروں پر اسی طرح بھیجے جاتے تھے۔ فرق اتنا ہوتا تھا کہ ایک یا دو رکابی فی حصہ جاتی تھی، ایک ہی خوان میں کئی کئی جگہ کے حصے ہوتے تھے اور ان رکابیوں پر خوب صورت، رنگین اور پھول دار کاغذ نہیں بچھاتے جاتے تھے۔ کسنے کے نیچے رکابیوں پر خوان پوش ڈھکا رہتا تھا۔ روغنی رکابیاں بھی ایسے ہی مصرف میں آتی تھیں۔ اُن کا رنگ سنہری ہوتا تھا اور اُن میں یہ صفت ہوتی تھی کہ گھی کا کوئی قطرہ اُن میں جذب نہیں ہوتا تھا۔

تیار شدہ غذائیں مثلاً پراٹھے، پلاؤ، کباب، متنجن، زردہ وغیرہ انھیں روغنی رکابیوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اسی طرح کی ہانڈیاں اور چھوٹے چھوٹے پیالے بھی ہوتے تھے۔ ہانڈیوں میں سالن ہوتا اور پیالیوں میں کھیر، یاقوتی وغیرہ ہوتی تھی۔ روغنی برتنوں کا استعمال ہی اسی لیے ہوتا تھا کہ غذاؤں کا رنگ روغن اپنی اصلی حالت پر برقرار رہے۔ جاڑوں کے موسم میں اگر کچھ غذائیں ٹھنڈی ہوکر جم جائیں تو اُن کو علیحدہ کر کے گرم کیا جاسکے لاکھی رکابیوں اور پیالوں وغیرہ کا رنگ سیاہی مائل ہوتا تھا۔ اُن میں شاذ و نادر ہی حصّے تقسیم ہوتے تھے کیوں کہ غمی کی تقریب کے حصّے عزیزوں اور دوستوں کے گھر بھیجنے کا رواج نہیں تھا۔ البتہ جو لوگ میت میں شریک ہوکر تکفین و تدفین کے بعد عزیزداری یا کسی دوسری خصوصیت کی بنا پر سوگواروں کے پاس تعزیت بجالانے کے لیے واپس آجاتے تھے اور اور کھانے کے وقت تک ٹھہرتے تھے اُن کو روسا و عمائدین کے یہاں کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اس کھانے میں اُن مخصوص غذاؤں کے علاوہ جو خوشی کی تقاریب کے ساتھ مخصوص تھیں مثلاً مرغ و ماہی، پکوان، متنجن وغیرہ اور سب وہی کھانے ہوتے تھے جو امیروں کے روزمرّہ میں داخل تھے۔ میت کے سوگوار قریبی عزیز اس کھانے میں شرکت نہیں کرتے تھے لیکن مقربین، مصاحبین اور اعلیٰ ملازمین اُن کی نیابت کرتے تھے۔ دسترخوان حسبِ دستور بچھتا تھا لیکن سب کھانے انھیں لاکھی مٹّی کے برتنوں میں کھلایا جاتا تھا جو کھانے کے بعد بے کار ہوجاتے تھے اور باہر پھینک دیے جاتے تھے۔

روغنی اور لاکھی رکابیوں کے علاوہ بعض مصنوعات خوش سماتی کے علاوہ بے حد نازک اور لطیف بھی ہوتے تھے، اِن برتنوں کو کاغذی کہتے تھے۔ مٹّی کے تمام سادے برتن سوندھے پن کے مالک تھے لیکن کاغذی چیزوں میں رکھا ہوا پانی وغیرہ بہت زیادہ سوندھا اور خنک ہوتا تھا۔ کاغذی صراحیوں میں بھرا ہوا پانی موسمِ گرما میں بڑی نعمت ہوتا تھا۔ برف کا جب وجود نہیں تھا اُس زمانے میں کاغذی صراحیوں کا پانی کاغذی آبخوروں میں انڈیل کے پی لینا روح میں بالیدگی اور جسم و جان میں خنکی بخشتا تھا اِس پانی کی خوشبو خود اپنی جگہ پر ایک بڑی نعمت تھی۔ کاغذی آبخورے بھی دو طرح کے ہوتے تھے۔ اُن میں کی ایک قسم چھوٹے، نازک اور لطیف رنگ کے آبخوروں کی تھی جو کو صراحی کے قریب رکھ دیتے یا اوپر ڈھک دیتے تھے۔ دوسری قسم بڑے آبخوروں کی تھی جو جسامت میں بڑے اور وزن

میں مقابلتاً بہت بھاری ہوتے تھے کہا جاتا تھا کہ جس مٹی سے یہ آبخورے بنائے جاتے تھے اُس میں بالو کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ اُن کا رنگ ہلکا سنہری اور اُن کے بیرونی حصہ پر ذرّے چمکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان آبخوروں میں ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی بھر کر رکھ دیا جاتا تھا۔ دوپہر کے قبل یہ آبخورے بھر کر کمرہ کے کسی گوشہ میں رکھ دیے جاتے تھے جہاں ہوا کا کافی زور ہوتا تھا۔ روسا دوپہر کو سو کر اُٹھنے کے بعد جب پیاس محسوس کرتے تو انھیں آبخوروں کا پانی پیتے تھے۔ یہ پانی اور زیادہ خنک اور سوندھا ہوتا تھا۔ آبخوروں کی جسامت بڑی ہوتی تھی۔ اس لیے پانی کی مقدار بھی زیادہ فراہم رہتی تھی۔ حقیقت امر یہ ہے کہ لکھنؤ والوں کے لیے یہ صراحیاں اور آبخورے ایک ایسی نعمت تھے جن کا کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کم قیمت ہونے کی وجہ سے یہ برتن خواص و عوام سب ہی کے دسترس میں تھے۔

کاغذی اشیا اور گھریلو ضرورتوں کے علاوہ بازاری سامان میں بھی کام آتے تھے۔ مثلاً یہ کہ فالودے والے بڑے کاغذی پیالوں میں شربت پیش کرتے تھے۔ کھیر والے کاغذی پیالوں میں کھیر بیچتے تھے، اناناس کا مزعفر کاغذی روغنی پلیٹوں میں گھرے جانے والوں کے ہاتھ فروخت ہوتا تھا۔ بعض مٹھائیاں جن میں برفی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، کاغذی ہانڈیوں میں خریدی جاتی تھیں تاکہ سوندھے پن میں اضافہ ہو جائے۔ لیکن کاغذی آبخوروں کا بھرپور لطف بالائی کی برف میں ملتا تھا جو انھیں برتنوں میں جمائی جاتی تھی۔ کاغذی آبخوروں میں میٹھا دودھ بھر کے کاغذی ڈھکنے کو گندھے ہوئے آٹے سے گل حکمت کر دیا جاتا تھا اور یہ آبخورے ایک بڑی مشکی میں رائج طریقہ پر رکھ کر میٹھے اور خوب اچھی طرح پکے ہوتے دودھ کی برف جمائی جاتی تھی جس کی لذت میں کورے آبخوروں کی خوشبو سے چار چاند لگ جاتے تھے۔ لکھنؤ والوں کے لطافتِ مزاج کی انتہا اسی منزل پر نہیں ہوتی تھی۔ آبخوروں ہی سے کچھ لوگ برف نکال نکال کے کھاتے تھے لیکن نفیس طبیعت والے اُس برف کو کوری کاغذی رکابیوں میں نکلواتے اور کورے کورے مٹی کے کاغذی چمچوں سے کھاتے تھے۔ اس طرح لطافتوں میں اضافوں پر اضافے ہوتے اور برف کھانے والے نہ صرف کام و دہن بلکہ مشام کو بھی آسودہ کر دیتے تھے۔ مٹی کے برتن بنانے والے فن کاروں میں یہ کمال تھا کہ وہ نہ صرف ہر چھوٹی بڑی ضرورت بلکہ موقع و محل کے استعمال کی ہر چیز ہنرمندی سے تیار کر دیتے تھے۔ آبخورے، پیالے، رکابیاں وغیرہ بنانا تو

بظاہر ضروری تھا لیکن اُن کی نظر چمچوں کی وضع قطع پر بھی رہتی تھی۔ برف کھانے کے چمچے کھیر کھانے کے چمچوں سے مختلف ہوتے تھے اور اناناس کا مزعفر بیچنے والا تیسرے طرز کے چمچے اپنے خریداروں کو حاضر کرتا تھا۔ ان تمام اقسام کے چمچوں کی شکل و صورت علیحدہ علیحدہ اور فی زمانہ رائج چمچوں سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ کوئی گہرا تو کوئی چھچلا بلکہ چپٹا ہوتا تھا اور ہر ایک کا مینڈل کافی بڑا ہوتا تھا تاکہ استعمال کرنے میں ٹوٹ نہ سکے۔

مٹی کے کاغذی برتنوں کے ذیل میں دو چیزیں اور قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو پان رکھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی ہنڈیاں تیار کی جاتی تھیں جو بہت خوب صورت ہوتی تھیں۔ روسا کے یہاں ان ہنڈیوں اور اُن کے ڈھکنوں پر لچکے اور شالباف کا غلاف چڑھا رہتا تھا۔ ڈھکنے کے بالائی حصہ کی نوک پر مقیش ٹکا ہوتا تھا۔ ہانڈیوں میں سرخ رنگ کے تر کپڑے میں پانوں کی گلوریاں رکھی رہتی تھیں۔ یہ انتظامات گرمیوں کے موسم میں رہتے تھے اور بہت لطف دیتے تھے۔ پان بجائے خود لذیذ ہوتے تھے۔ اس انتظام سے اُن میں تری اور خوشبو کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ ہر رئیس کے یہاں ایسی ایسی کئی ہنڈیاں پانوں سے بھری ہوئی دن بھر حاضر رہتی تھیں۔ رات کے استعمال میں ان ہنڈیوں کے پان پسند نہیں کیے جاتے تھے اس لیے کہ اُس وقت دن بھر کی تپش کے بعد ان ہنڈیوں کی خنکی زائل ہو جاتی تھی۔ دوسری لطیف و نازک اور خوش نما چیز حقّوں کے کاغذی پیندے تھے۔ یہ پیندے قدو قامت میں چھوٹے ہوتے تھے۔ اور صرف اُن حقوق کے کام آتے تھے جن کو قدریہ یا چلمی کہا جاتا تھا۔ اُن کے نیچے چھوٹے اور بہت نرم و نازک ہوتے تھے۔ اُن میں ٹین کی چھوٹی چھوٹی نازک قلفیاں لگی ہوتی تھیں۔ ان حقوں کے نیچوں کو رات بھر عطر خس میں بسایا جاتا تھا اور صبح کو بہت خوشبو دار دو رسہ تمباکو سے بھر کر پیا جاتا تھا۔ کاغذی پیندوں کا سوندھا پن بسے ہوئے نیچوں سے گزرتے ہوئے دھوئیں کو اور لطیف بنا دیتا تھا حقہ پینے والے شام کے وقت انھیں نیچوں پر خوشبو دار پھولوں کے ہار لپیٹ کر اپنی تمباکو کشی میں کیفیتِ نشہ دوبالا پیدا کر لیتے تھے۔

حسن و جمال، آب و تاب اور دلفریبی میں کاغذی برتنوں سے مقابلتاً بہت زیادہ گراں قدر مٹّی کے کھلونے ہوتے تھے جن کا بیان اور جن کی تعریف زبان و بیان میں ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ اُن کی دل کشی اُن کو دیکھ کر صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ کھلونے منفرد

ہوتے تھے اور انھیں میں اجتماعی شان سے کھلونوں کے سٹ بھی تیار کیے جاتے تھے۔ منفرد کھلونوں میں ممتاز اور مانوس جانوروں کے مجسمے بناتے تھے جو اعضا و جوارح نیز تمام جسمانی ساخت کے لحاظ سے ہو بہو اصل کے مطابق ہوتے تھے۔ جانوروں کے فطری رنگ اور اُن کے جبلی عادات و اطوار کے مظاہروں کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ ہاتھی بنایا جاتا تو اُس کو اسی کی عادت کے مطابق سونڈ گھمائے دکھایا جاتا تھا۔ گائے بنتی تو بالکل معصومیت کی شکل ہوتی اور اُس کو بچے کو دودھ پلانے پر آمادہ دکھایا جاتا تھا۔ شیر کا کھلونا ہوتا تو غیظ و غضب آلود چہرہ بنانا ضروری تھا۔ یہی حالت تمام دوسرے کھلونوں کی تھی۔ فن کاروں کو نقل مطابق اصل بنانے میں پورا پورا کمال حاصل تھا۔ یہی خوبی پھلوں، ترکاریوں اور میووں کے بنانے میں بھی تھی۔ جو پھل، ترکاری یا میوہ بنتا اُس کا رنگ اور شبیہ اصل کے مانند ہوتی تھی۔ انار بناتے تو اُس کو درمیان سے کاٹ کر اُس کے دانے ضرور دکھائے جاتے تھے۔ یہ دانے فطری ترتیب میں ہوتے اور اس سے زیادہ یہ کمال تھا کہ بیدانہ انار کے دانے اصلی رنگ میں اور قندھاری انار کے دانے اُنھیں کے اصلی روپ میں دکھاتے جاتے تھے۔ کھلونوں کے سٹ منفردات سے بڑھ کر جاذبِ نظر تھے۔ طوائف کے مجرے کا طائفہ بنتا تو اُس میں پیشواز پہنے آمادہ بہ رقص طوائف کے ہمراہ اُس کے تمام سازندوں کا اُن کی اصل وضع قطع میں اور اپنے حسبِ رواج طرز پر کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے دکھانا ضروری تھا۔ یہی عالم بھانڈوں کے مجرے کا بھی دکھایا جاتا تھا۔ یہ دونوں سٹ متعدد اعداد پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ دو دو تین تین کھلونوں کے بھی سٹ ہوتے تھے مثلاً مہتروں کے، بہشتیوں کے، روسا و عمائدین کے دربانوں اور عصا برداروں کے وغیرہ وغیرہ۔ انسانوں کی ان تصویروں کے علاوہ بہت نفیس وہ کشتیاں اور رکابیاں ہوتی تھیں جن میں ترکاریاں اور خشک و تر میوے سجے رہتے تھے۔ اس ترتیب میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ ہر رکابی یا کشتی میں ایک ہی فصل کی پیداوار ہو۔ جاڑے کے موسم کی ترکاریوں میں گرمی کے فصل والی کوئی ترکاری نہیں ہوتی تھی اور نہ خشک میووں میں تازہ پھلوں کو شامل کرنا جائز سمجھا جاتا تھا۔ انھیں کھلونوں سے اکبری دروازے کی دو طرفہ بڑی بڑی اور اونچی اونچی دوکانیں سجی رہتی تھیں۔ ان دوکانوں میں سیڑھیاں بنی تھیں اور ہر سیڑھی پر اس سلیقہ سے کھلونے آراستہ رہتے تھے کہ آنکھوں کو دور ہی سے بھلے لگتے اور اُن کی طرف از خود قدم بڑھنے لگتے تھے۔ آج کی دنیا باور کرے، یا نہ کرے

لیکن حقیقت یہ تھی کہ آپ آگے بڑھ کر کھلونوں کے قریب پہنچ جاتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر انسانی مجسمہ لب کشائی پر آمادہ ہے اور آپ کا دل بھی اُس سے مائل بہ گفتگو ہے۔ بناوٹ کا طرز یہ تھا کہ ہر میوہ کو دیکھ کر اٹھا لینے اور بے ساختہ منہ میں رکھ لینے کو دل چاہتا تھا۔ مجروں کی تصویر کشی کو دیکھ کر دل بے تاب ہو جاتا تھا کہ کاش یہ تصویریں بولنے اور حرکت کرنے لگیں۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جوش ملیح آبادی نے جو اُس زمانہ میں چوک کی سیر و تفریح کے لیے میرے ہمراہ رہتے تھے، مشک لیے ہوئے بہشتی کے کھلونے کو دیکھ کر بے ساختہ فرمایا تھا کہ "ہاتھ نہ لگائیے گا کہیں مشک کا دھانا کھل کر پانی نہ بہنے لگے"۔ قلم اینجا رسید و سر بشکست۔ لہٰذا صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ یہ تمام فن کاریاں لکھنؤ کی سرزمین سے اُبھری تھیں اور اُسی کی خاک کا پیوند ہو گئیں۔

## (۶) دیگر ایجادات و اختراعات

مشرقی تہذیب و تمدّن کا آخری اور حسین ترین نمونہ وہ لکھنؤ تھا جس کو فرمانروایان اودھ کی سرپرستی میں پھولنے پھلنے کا موقع ملا تھا، جہاں سو برس تک باوجود سیاسی بدحالی کے ثقافتی روایات برقرار رکھی گئی تھیں اور جو علم و ادب سے مالا مال اور جمالیاتی ذوق میں اپنا مثل و نظیر نہیں رکھتا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھنؤ کا عروج اور دلّی کا زوال تقریباً ایک ہی وقت میں ہوا تھا۔ اودھ کا دار السلطنت ابھی فیض آباد ہی تھا کہ دولت اور معاش کی فراوانی کے سبب سے ڈھاکہ، بنگال، گجرات، مالوہ، حیدر آباد، دکّن، لاہور، پشاور، کابل، کشمیر اور ملتان سے علما، ادیب، اطبا، اہلِ حرفت، سپاہی، رقّاص و موسیقار اور اسی قبیل کے فن کار وہاں پہنچ کر آ گئے تھے۔ ان فن کاروں کی بدولت شجاع الدولہ کے نو سالہ عہد میں فیض آباد کی تہذیبی اور تمدنی زندگی معراجِ کمال پر پہنچ گئی تھی۔ پھر اُن کے صاحبزادے آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو دار السلطنت قرار دیا تو تہذیب و تمدّن کی یہ بیش بہا مسند بالکل اپنی اصلی حالت میں یہاں منتقل ہو گئی۔ اب دلّی پر اور زوال آیا اور وہاں کا قریب قریب سارا ثقافتی سرمایہ لکھنؤ چلا آیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھنؤ نے جو کچھ پایا اُس کو بجنسہٖ اسی طرح قبول و منظور نہیں کیا بلکہ اپنے مزاج و مذاق کی کسوٹی پر پرکھ کے اصلی حالت میں یا حسبِ منشا تغیّر و تبدل کر کے اپنایا۔ ردّ و قبول کا

یہ عمل پورے انہماک کے ساتھ آصف الدولہ کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا۔

آصف الدولہ کے عہد ہی سے سیاسی زوال شروع ہو گیا تھا اور مادی وسائل کمزور ہونے لگے تھے۔ لیکن لکھنؤ بستا جارہا تھا۔ اُس کی تہذیب و تمدن کو ایسا فروغ ہوا جو اپنی آپ مثال تھا۔ ہر طرف چہل پہل، خوش حالی اور رونق نظر آتی تھی۔ بازار گرم رہتے اور مجلسی ادارے ترقی پذیر تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر اس دور کے حالات سے متعلق رقم طراز ہیں۔ ”شہر ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان ہی نہیں شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرایش و خوش حالی میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا اور چند ہی روز کے اندر ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہاں جمع کر لی تھی۔“ اس ترقّی پزیری کی بدولت اس شہر کا ماحول ایک منفرد رنگ اور چمک دار رنگ اختیار کر گیا تھا۔ ایسا ہونا ہی ناگزیر تھا کیوں کہ مجموعی حیثیت سے اودھ کی تہذیب ہندوستان کی اُس عظیم تہذیب کا عکس تھی جس نے دلّی میں کبھی عروج پایا تھا اور اب وہی قدیم تہذیب مقامی معاشرتی اور نفسیاتی اثرات کی وجہ سے نکھر گئی تھی۔ یہ نکھار صرف اس وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ لکھنؤ والوں نے ہر اُس چیز کو جو دلّی والے اپنے ساتھ لائے من و عن قبول نہیں کیا بلکہ اپنے مذاق اور مزاج کے سانچے میں ڈھال کر سنوار دیا۔ اُن کے مذاق و مزاج میں جمالیاتی ذوق پورے طرح اُبھر چکا تھا اور جدّت طرازی اُن کا شعار بن چکا تھا۔ اس لیے جو چیز اُن کو پسند آئی اُس میں بھی انھوں نے ایجادات و اختراعات کر ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کی تہذیب میں باوجود بنیادی یگانگت کے اتنا شدید ظاہری فرق نمودار ہوا جس نے ہماری معاشرت کو انفرادیت کا شرف بخش دیا تھا۔

لکھنؤ نے دلّی کی تہذیب میں کتنے ایجادات و اختراعات کیے ان سب کی تفصیل پیش کرنا امرِ محال ہے کیوں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس عمل کی کار فرمائی ہوئی تھی لیکن بالاختصار لباس و طعام اور زبان کے بارے میں حالات بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ دلّی والے زوالِ سلطنت [illegible] کے وقت سر پر پگڑی، بدن میں نیمہ جامہ، ٹانگوں میں ٹخنوں سے اوپر تنگ [illegible] پاؤں میں اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا اور کمر میں جامہ کے

اور پر ٹپکا استعمال کرتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے پگڑی کو سر کا بوجھ، نیمہ جامہ کو نیم عریانی، آنگے پائجامے کو علامت برہنگی، کفش کو علما کی زیر پائیاں اور کمر میں جامہ کو مد فضول قرار دیا۔ انھوں نے ہر لباس میں قطع و برید کر کے اپنے لیے سر سے پاؤں تک ایک علیحدہ لباس بنا لیا۔ دلّی کے آخری دور میں انگرکھا رائج ہو چکا تھا۔ انگرکھے کی ایجاد بالابر سے جو ایرانی طرز کا لباس تھا عمل میں آئی تھی۔ انگرکھے کو لکھنؤ والوں نے قبول ضرور کیا لیکن اُس میں چستی اور خوش وضعگی کو شامل کر کے ایک انتہائی حسین و جمیل پوشاک بنا دیا تھا۔ دلّی میں بھی لباس کے طرز اور قطع و برید میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی تھیں، لکھنؤ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بالابر کے بجائے چپکن پھر اچکن بنی اور بالآخر بیسویں صدی کے اوائل میں حیدر آباد کی ایجاد شیروانی قبول کر لی گئی جو اب تک رائج ہے کیوں کہ تنوع کا ذوق بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے۔

غذاؤں میں بھی اسی طرح زبردست ترمیم و تنسیخ ہوئی جس کی وجہ بھی وہی تھی جو لباس کے سلسلہ میں کارفرما تھی یعنی یہ کہ دلّی والوں کا ماخذ ساسانی کلچر تھا لیکن اودھ کے فرمانروا ایرانی النسل تھے انھوں نے مقامی تہذیب یعنی ہندو کلچر میں اصفہانی اور شیرازی رنگ شامل کر کے ایک ایسی معاشرت کو پروان چڑھایا جس کو ہم خالص لکھنؤ کلچر کہنے پر مجبور ہیں۔ دلّی کی تہذیب پر بھی قدیم ہندو تہذیب کا عکس پڑا تھا لیکن وہاں یہ صورتِ حال کبھی رونما نہیں ہوئی کہ دربار میں ہولی کھیلی گئی ہو اور بسنت منایا گیا ہو۔ دلّی کے حکمرانوں نے بھی عیش پرستی میں کمی نہیں کی لیکن طوائف کو کبھی وہ مرتبہ نہیں ملا جو لکھنؤ میں حاصل ہوا اور یہ مرتبت صرف اس لیے طوائف کو مرحمت ہوئی کیوں کہ یہاں کے باشندوں نے رومانی ذوق ہندو تہذیب سے سیکھا تھا۔ غذاؤں کے سلسلہ میں ہندو مذاق لکھنؤ والوں کو متاثر نہیں کر سکا۔ اس لیے کہ فرمانروا بہر حال مسلمان تھے لیکن انھوں نے دلّی والوں سے علیحدہ ہو کر ایرانی ذائقہ کے تحت اپنی غذاؤں میں ایجادات و اختراعات کیے۔ جو کھانے دلّی سے سیکھے اُن کو بھی اپنا نیا رنگ اور نیا ذائقہ دے کر اپنے کام و دہن کی آسودگی کے لیے اپنا لیا۔ دلّی والوں کے لیے کچّی بریانی بہترین نعمت تھی، لکھنؤ والوں نے اُس میں مال مسالے شامل کر کے پلاؤ تیار کیا پھر اُس پلاؤ میں بھی متعدد قسمیں پیدا کر کے وہ تنوع بخشا جس کی مثال ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی طرح ہر غذا میں کچھ نہ کچھ فرق پیدا کر دیا گیا تھا اور وہی ہمارا مخصوص لکھنوی طرز تھا۔

زبان کے بارے میں بھی لکھنؤ کو ایک گراں قدر شرف حاصل ہے۔ اُردو زبان دلّی میں اپنا عہدِ طفولیت طے کر کے جوان ہوئی تو اُس نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس شہر نے اس زبان کی جوانی کو ایسا نکھارا کہ اُس کی رعنائی و برنائی نے سارے ملک کی نظریں اپنی طرف جذب کر لیں۔ اُردو کی خدمت کے لیے دلّی کو یقیناً مرتبہ حاصل ہے اور دلّی کا زبان کے سلسلہ میں اپنا ایک خاص مکتبِ خیال تھا لیکن لکھنؤ نے اُردو کو اس طرح اپنایا کہ دبستانِ لکھنؤ کے نام سے اُس کو ایک علیحدہ اور بلند مقام حاصل ہوا۔ اردو شاعری نے اسی دبستان میں طرح طرح کے رنگ بدلے اور عروج و زوال کے مدارج سے گزر کر نشاۃ ثانیہ کے کمال تک پہنچی تھی۔ ابتدا میں میر و سودا کی دل کھول کر قدر دانی ہوتی تھی پھر شعر و سخن کا چرچا بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دورِ واجد علی شاہ میں اتنے شاعر موجود تھے کہ بقول عبدالحلیم شرر "اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کیے جاتے تو اُن کی تعداد لکھنؤ کے شاعروں سے نہ بڑھ سکتی"۔ اور یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ دربار کی عیش پرستی سے متاثر اگر ایک طرف میر اور سودا کا طرزِ تقویم پارینہ بن گیا تھا اور رند و صبا کا رندانہ کلام زبان زد تھا اور نواب مرزا شوق کی مثنویاں جن میں جنسی رجحانات کی بے جان نجس ترجمانی تھی پسند کی جانے لگی تھیں تو دوسری طرف لکھنؤ ہی میں ناسخ نے زبان کو جلا دی اور آتش نے بلندیٔ خیالات کے نادر المثال نمونے پیش کیے تھے۔ انتزاعِ سلطنت کا زوال پزیر ماحول کچھ مدّت تک شانہ و کاکل اور وصال و ہجر کی داستانوں کو ضرور برقرار رکھے رہا تھا۔ لیکن آخر میں اسی شہر میں دائرۂ ادبیہ کی بنیاد پڑی اور اُردو شاعری کو وہ فروغ حاصل ہوا جو اس زبان کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ زبان کے سلسلہ میں انجمن معیارِ ادب اور انجمن معراج ادب وغیرہ کے کارنامے اردو ادب میں ایجادات و اختراعات کی بہترین مثالیں ہیں۔ دائرہ ادبیہ کی بنیاد انیسویں صدی کے اواخر میں پڑی تھی جس کے زوح رواں مولانا صفی مرحوم تھے اور انھیں کی سرکردگی میں ایک کثیر تعداد مصلحین زبان اُردو کی پیدا ہو گئی تھی۔ مشاعروں کی بہاریں ۱۹۳۰ء میں ختم ہو گئی تھیں لیکن جو روایات اُن بزرگوں نے قایم کی تھیں وہ برقرار ہیں مسند ہیں اور گراں قدر ہیں۔ جدید طرز اور نئے رجحانات کی مقبولیت کتنی ہی بڑھتی رہے اور بڑھ جائے لیکن ہماری پرانی کلاسیکل شاعری کی عظمت برقرار رہے گی۔

لکھنؤ کے ایجادات واختراعات کا عمل صرف انھیں چیزوں تک محدود نہیں تھا جو اس شہر کو دلّی سے ملی تھیں۔ ایک طویل فہرست ایسی بھی پیش کی جاسکتی ہے جس میں ہر چیز نئی ہوگی اور جس کی تخلیق کا سہرا لکھنؤ ہی کے سر تھا۔ شعروسخن کے تذکرہ ہی میں مرثیہ کا مقام ہے۔ وہ مرثیہ جو اپنے موجودہ رنگ میں اس وقت ہمارے پاس ہے، لکھنؤ کی خالص ایجاد ہے۔ مرثیے پہلے بھی کہے جاتے تھے لیکن بینوں میں، چار چار مصرعوں میں یا نظم کی شکل میں کہے جاتے تھے۔ مسدس کی شکل میں بھی جعفر علی فصیح وغیرہم کے مرثیے موجود تھے لیکن مرثیہ میں باغ وبہار، موسم کی کیفیت، رزم وبزم، تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف، لڑائی کا طرز، سراپا نگاری، مرثیہ کے ہیرو کا سراپا، اُس کی اہلِ حرم سے رخصت اور اُس کی شہادت پر عورتوں کے بین، یہ تمام مقام اُن ایجادات میں آتے ہیں جن کا شرف لکھنؤ کو حاصل ہے۔ انیس نے ان تمام مقامات کو کچھ اس طرح نظم کرکے پیش کیا تھا جس کی نظیر اب تک مفقود ہے۔ دبیر نے علمی قابلیت کو مرثیہ میں شامل کرکے ایسے ادبی شاہ کار جمع کر دیے تھے جن کو ہم بلاغت کی جان کہنے پر مجبور ہیں۔ اسی کے ساتھ مرثیہ پڑھنے کا طرز بھی لکھنؤ ہی نے ایجاد کیا پہلے سیدھے سادا مرثیہ رُلانے کے لیے پڑھا جاتا تھا۔ مجلس میں آہ کے علاوہ واہ کا نام بھی نہیں تھا۔ انیس نے ایک نیا طرز پیش کرکے مجلس مرثیہ خوانی کو ایک نیا روپ مرحمت کر دیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ مرثیہ نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ اپنی آواز کے چڑھاؤ اُتار اور اپنے چشم وابرو کے اشاروں سے جادو کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ مرثیہ گوئی اور فنِ مرثیہ خوانی دونوں ہی کی تخلیق کا شرف لکھنؤ کو حاصل تھا۔

فنون لطیفہ میں شاعری کے علاوہ رقص وموسیقی اور خطاطی ومصوّری بھی شامل ہیں۔ رقص وموسیقی کو حکمرانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ شوری وغیرہم اسی سرزمین سے پیدا ہوئے جنھوں نے راگنیوں میں بڑی بڑی دلفریب ایجادیں کیں اور نئے نئے طرز نکالے۔ واجد علی شاہ بذاتِ خود رقص وموسیقی میں کمال رکھتے تھے۔ رہس یعنی ڈراما خود انھیں کی ایجاد تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک روسا وعمائدین رقص وموسیقی کے دل دادہ ہی نہیں بلکہ ان فنوں میں کافی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ مصوری میں بھی اچھے اچھے فن کار تھے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اس فن میں کیا کیا اختراعات کیے تھے۔ البتہ خطاطی میں خطِ معکوس لکھنؤ ہی کی ایجاد ہے۔ اس کے علاوہ ناخن سے لکھنے اور تصویر بنانے نیز

چاول کے دانے اور چنے کی دال پر بڑی بڑی عبارتیں لکھنے کی ایجاد بھی لکھنؤ ہی میں ہوئی تھی۔ راقم نے چاول کے دانے پر پورا سورۂ قل ھو اللہ لکھا ہوا دیکھا تھا۔ جس کو صرف خوردبین کے ذریعہ سے پڑھا جا سکا۔ بہت صاف اور خوشخط لکھا ہوا تھا لیکن اتنا نہیں تھا کہ بغیر سہارے کے پڑھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

اسی طرح لباس و طعام میں بھی ایجادیں ہوئی تھیں۔ لباس میں چپکن، اچکن، پائجامہ گھٹنا، دوپلی، کشتی نما اور گول ٹوپیاں، زنانے ملبوس میں بڑے پائنچوں کا پائجامہ اور انگیا کرتی اسی شہر کے ایجادات تھے۔ ان کے علاوہ مری تیجی کے کام کی دوپلی ٹوپیاں کرتے انگرکھے نیز لحاف اور رضائی کی فردیں لکھنؤ ہی میں سب سے پہلے تیار ہو کر رائج ہوئی تھیں۔ یہ تمام چیزیں لکھنؤ کا مخصوص لباس تھیں جن کے لکھنؤ والے دل دادہ تھے۔ ان میں بیشتر اب تک پسندیدگی کے ساتھ استعمال ہوتی تھیں۔ طعام پر بھی فطری طور سے پوری توجہ تھی۔ غذاؤں میں آب و رنگ اور اُن کا خوش ذائقہ اور خوش رائحہ ہونا ضروری تھا، اس لیے پخت و پز کے طریقوں میں بے شمار جدت آرائیاں ہوئی تھیں۔ ان ایجادات کا یہ عالم تھا کہ ہر رئیس کے دسترخوان سے کوئی نہ کوئی غذا وابستہ ہو گئی تھی اور اُس کا مثالاً ذکر ہوتا تھا۔ ان خوبیوں کے علاوہ بعض غذائیں ایسی تھیں جن کو ایجاد کرنے کا شرف لکھنؤ ہی کو تھا۔ اُن کے نام اور صورت اور ذائقہ سے دنیا ناآشنا تھی۔ مثال کے طور پر شیرمال، باقرخانی مختلف قسم کے نان روٹیوں کے ذیل میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ تیار شدہ کھانوں میں شب دیگ خاص لکھنؤ کی ایجاد تھی جس کو پکوانے پر بڑی بڑی ریاضتیں ہوتی تھیں۔ کہنے کو یہ غذا شلغم کی ترکاری سے پکتی تھی لیکن طرح طرح کے مسالوں اور بہتر سے بہتر گوشت میں رات بھر پکنا، اس غذا کی منزلت کو دوبالا کر دیتا تھا۔ بازار کے اشیا میں جو پکوان کی حیثیت رکھتی تھیں شہال اور شاخیں بھی لکھنؤ کی ایجاد تھیں اور مٹھائیوں کی صنف میں لذیذ ترین شیرینی یعنی امرتیاں لکھنؤ ہی میں سب سے پہلے معرضِ وجود میں آئی تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل تک لکھنؤ کے بازار میں بہترین اور بڑی بڑی امرتیاں بنتی اور فروخت ہوتی تھیں۔ ایک ایک امرتی ایک متوسط قد کی رکابی کو ڈھک لیتی تھی۔

لکھنؤ کی مٹھائیوں کے سلسلہ میں ایک امر خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ یہاں کی گھٹیاں ہمیشہ مشہور رہی ہیں اور اب تک اُن کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ دور دور

سے لوگ آتے اور گھٹیاں خرید کر لے جاتے ہیں۔ بعض مقامات سے فرمائشیں کر کر کے لوگ یہ مٹھائی منگاتے ہیں لیکن لکھنؤ کے امرا و شرفا کو اس شیریں غذا سے کبھی کوئی خاص رغبت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اُن کے بچے بھی یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ "چپ چپ کرتی ہے" اور اس کو دانت کے نیچے دبانا گوارا نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ناپسندیدگی یہاں کے لوگوں میں لطافت و نزاکتِ مزاج کا نتیجہ ہو۔

آرائش و زیبائش کی اشیا اور متفرق استعمالی چیزوں میں اتنے زیادہ ایجادات ہوئے تھے کہ اُن کی فہرست پیش کرنا بھی محال ہے۔ مثال کے طور پر حقہ میں مدریا اور جلیبی عطر میں حنا اور شمامۃ العنبر۔ ہاروں میں سنہرے اور پیلے تار والے، گوٹے اور زردوزی والے نیز بھونوں کا سارا گہنا، پوپ کے گہنے، شہائی چوڑیاں، دانے دار اور قوام کا تمباکو، لکڑی کے چھاپے، سینگ کی کنگھیاں وغیرہ وغیرہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں کی بیشتر چیزیں اب تک بنتی اور استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن عام حالات کے تحت ہر چیز پہلی سی گراں قدر نہیں رہی۔ بعض اشیا تو صرف نام گنانے کو باقی رہ گئی ہیں۔ اُن کی ہیئت و نوعیت بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم الثبوت ہے کہ لکھنؤ نے ہر شعبۂ حیات سے متعلق چیزوں کو اصلاح ایجاد اور اختراع کا حسین لباس پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

## آم

لکھنؤ والوں کے ایجادات و اختراعات کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آم کی ترقی کے حالات نہ پیش کر دیے جائیں۔ آم ہندوستان کا بہترین اور مایۂ ناز پھل ہے، پھل بھی ہے اور میوہ بھی۔ میوہ بھی ایسا جس کو ہم فواکہات میں شمار کر سکتے ہیں فطری طور پر لکھنؤ والوں نے توجہ کی اور اس کی لذت اور رنگ و بو کو آسمان تک پہنچا دیا۔ شہر سے تقریباً چودہ میل کے فاصلے پر قصبۂ ملیح آباد ہے وہاں کی سرزمین اس پھل کو راس آئی اور وہاں کی بیشتر آبادی نے آم کے باغات ہی کو اپنے لیے ذریعۂ معاش بنا لیا۔ آج ملیح آباد میں اتنے اقسام کے آم پیدا ہوتے ہیں جن کے نام اور تفصیلات پیش کرنا بہت دشوار ہے اور اس ساری ترقی کے لیے ملیح آباد والوں کا مزاج و ذوق ہماری قدر دانی کا مستحق

ہے۔ انھوں نے ایسے آم بھی پیدا کیے جن کے لیے یہاں کی زمین سازگار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً بمبئی اور لنگڑا۔ بمبئی آم فصل کی سب سے پہلی پیداوار ہے۔ کہا جاتا تھا کہ ابتداءً بمبئی سے آتا تھا لیکن راقم کو بمبئی سے درآمد کردہ آم کا کوئی تجربہ یاد نہیں آتا اور میرے کام و دہان ملیح آبادی بمبئی آم کے آشنا ہیں۔ لنگڑا یقیناً بنارس سے آتا تھا اور خوشبو نیز ذائقہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تاجر اور شرفا میں بھی کچھ لوگ لنگڑا آم کا پارسل وصول کرنے کے لیے پنجاب میل کا اسٹیشن پر انتظار کرتے تھے۔ بمبئی آم کی طرح لنگڑا بھی بہت نازک ہوتا تھا اس لیے اس کو جلد استعمال کر لینے کی فکر رہتی تھی۔ بنارس سے صبح کو روانہ ہوتا اور دوپہر کو لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر وصول ہو کر تقسیم ہو جاتا تھا۔ ظریف مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

آتا ہے دوپہر میں بنارس سے لکھنؤ
کیا تیز رو ہے آم وہ لنگڑا کہیں جسے

لیکن ملیح آباد کے ساختہ اور پرداختہ آموں نے اصلی بمبئی اور لنگڑا آموں کی یاد فراموش کرا دی ہے۔ یہ اقسام بھی بہرحال ملیح آباد میں پائے جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں یہ روایت مشہور تھی کہ اعلیٰ درجہ کے قلمی آموں کا اصل مخزن و معدن مرشد آباد تھا اور لکھنؤ والوں نے اُن کی نسلیں اُسی مقام سے حاصل کی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ مرشد آباد میں بہت نفیس و لذیذ آم پیدا ہوتے تھے۔ مجھ کو خود ہز ہائی نس نواب بہادر مرشد آباد کی کوٹھی واقع ۸۵، پارک روڈ میں انھیں کی میز پر آم کھانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ متعدد قابوں میں علیحدہ علیحدہ اقسام کے آم نہایت سلیقہ اور خوب صورتی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اور ہر قاب کے آموں کو کاٹنے کے لیے علیحدہ علیحدہ وضع قطع کے چاقو موجود تھے۔ ملیح آباد کی دعوتوں میں یہ نفاست و نزاکت تو نہیں دیکھی لیکن آموں کی خوشبو، رنگ اور ذائقہ کسی طرح بھی مرشد آباد کے آموں سے کمتر نہیں تھا اور نہ اب اُس میں کوئی کمی آئی ہے۔ اسی طرح یہ روایت بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ اچھے آموں کی نسلیں مرشد آباد سے حاصل کی گئی تھیں۔ کیوں کہ ملیح آباد کا بہترین آم جو دور دور مشہور ہے اور عام طور سے اپنی نفاست، نزاکت اور ذائقہ کے لیے مرغوب ہے، دسہری کے نام سے موسوم ہے۔ میرے علم و یقین میں یہ آم لکھنؤ کی مخصوص پیداوار ہے۔ شہر سے آٹھ میل کے فاصلہ پر کاکوری نام کا

بہت مشہور و ممتاز قصبہ ہے۔ وہاں ایک گاؤں دسہری کے نام سے اور اس گاؤں میں آم کا ایک درخت دسہری کے نام کا مشہور تھا۔ اس درخت کی ایک شاخ جو بجائے خود ایک درخت ہے اب بھی موجود ہے۔ اس درخت میں بکثرت آم پھلتے اور دسہری کے نام سے مشہور تھے۔ اس گاؤں کے مالک ہر سال پانچ عدد پھل میرے کرم فرما سید محمد حسین ایڈووکیٹ کو تحفتاً بھیجتے تھے۔ جن میں ہر ایک تخمیناً چھ یا سات انچ لمبا اور کافی وزنی ہوتا تھا۔ اُس کا ذائقہ ہماری موجودہ دسہری کے مماثل تھا جس کو چکھنے کا شرف متعدد بار مجھے حاصل ہوا تھا۔ ملیح آباد والوں نے اسی درخت میں قلم بندی کر کے موجودہ دسہری کو فروغ دیا ہے۔

ملیح آباد کا دوسرا گراں قدر آم چوسایا کھجری کہلاتا ہے۔ یہ آخر فصل میں اپنی بہار دکھاتا اور ذائقہ چکھاتا ہے۔ دسہری کے مقابلہ میں بھاری اور ثقیل ہوتا ہے لیکن نفاست اور ذائقہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہ آم بنگال اور بہار دونوں مقامات پر ہوتا ہے۔ بہار میں اس کا نام مالدہ ہے اور بنگال میں ثمر بہشت لیکن ملیح آباد میں ثمر بہشت اور مالدہ علیحدہ علیحدہ اقسام ہیں۔ بہار کا مالدہ ہماری کھجری سے خوشبو اور ذائقہ میں قریب تر ہے لیکن ملیح آباد کی کھجری کو یقیناً بہار کے مالدہ پر افضلیت حاصل ہے۔ ملیح آباد کا مالدہ غریب پرور پھل ہے جس کو کم حیثیت لوگ پیٹ بھرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہی عالم اُس آم کا بھی ہے جس کو فجری کہتے ہیں لیکن یہ آم روسا و شرفا میں پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ روسا و عمائدین تخمی آم بہت کم نوش کرتے تھے البتہ ایسے اقسام مرغوب ہوتے تھے جو کسی نہ کسی نہج سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان اقسام میں لکھنوا سفیدہ بہت پسندیدہ رہا ہے۔ یہ قسم بھی ملیح آباد والوں کی ساختہ و پرداختہ ہے اس آم کو تخمی اور قلمی دونوں اقسام کے آم کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ملیح آباد کے آموں کے اقسام اور اُن کی تفصیلات پیش کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس قصبہ میں بڑی محنت و مشقت کے ساتھ قلمیں لگائی گئی ہیں اور آم کی پیداوار کو انتہائی ہوش مندی کے ساتھ فروغ دیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اسی صدی میں ہوا ہے اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ملیح آباد اور قرب و جوار کے اراضیات یعنی کاکوری سے رحیم آباد تک آم کی پیداوار کے لیے بہت سازگار ہیں۔ یہاں تخمی آم بھی بہتر سے بہتر پیدا ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف ایک قسم کا تذکرہ مثالاً پیش کیا جاتا ہے، اس آم کو گلاس کہتے تھے۔ یہ نام غالباً

اسم بامسمیٰ تھا۔ پھل کے اوپر سے گھنڈی دور کرکے اُس کے اندر کا شربت بالکل اُسی طرح منہ میں انڈیلا جاسکتا تھا جیسے کہ کوئی گلاس کا شربت ایک مرتبہ پی جائے۔ ملیح آباد کے ایک رئیس عبدالحمید خاں کے باغ میں گلاس کا درخت تھا جو خوب پھلتا تھا۔ یہ باغ اُن کے گاؤں میں تھا جو جو کاکوری اور ملیح آباد کے درمیان واقع تھا۔ عبدالحمید خاں کے بعد اُن کے صاحب زادے ابوسعید اور آفاق احمد مالک ہوئے تھے۔ یہ دونوں بھائی وکالت کا پیشہ کرتے تھے۔ اُن سے میرے تعلقات دوستانہ تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد دونوں بھائی پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد سے پھر گلاس کا ذائقہ میرے کام و دہن کو نصیب نہیں ہوا۔ اور نہ یہ معلوم ہے کہ اُس باغ کا کیا حشر ہوا۔ گلاس کے درخت بھی معدودے چند تھے۔ جب کوئی قدردان باقی نہیں رہا تو وہ بھی ختم ہوگئے ہوں گے۔

ملیح آباد میں آموں پر ریاض اور اُن کی کاشت میں ٹیکنیکل مشقت تجارتی نقطۂ نظر سے بھی ہوتی تھی۔ اور روسا کے ذوق و شوق کو بھی اس بارے میں بہت دخل تھا۔ بیسویں صدی کے قبل سے تجارتی مذاق پیدا ہوگیا تھا جو غالباً ۱۹۰۰ء میں حلیم نرسری قایم ہوئی تھی جو آج تک برقرار ہے اور بڑی شہرت کی مالک ہوئی۔ اس نرسری نے مقابلہ میں بہت سے انعامات بھی حاصل کیے ہیں۔ اس نرسری کے علاوہ اور بھی تجارتی مراکز ہیں جو بڑی وقعت کے مالک ہیں۔ آم کے باغ میں بور آنے کے بعد ہی فصل فروخت کردی جاتی ہے۔ خریدنے والے حفاظت کرکے اور آم تیاری پر بازار میں فروخت کرتے ہیں۔ انھیں نرسری گاہوں میں آم کے درختوں کو بیماریوں اور دوسری بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے سامان فراہم رہتے ہیں۔ آم کا درخت نہایت حسّاس ہوتا ہے اور بہت جلد تاثر قبول کرلیتا ہے۔ ملیح آباد والے کہتے ہیں کہ آسمان پر زیادہ تیز چمک اور زیادہ زور سے کڑک ہونے سے بھی درخت سہم جاتے ہیں اور فصل کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ آسمانی بلاؤں کے علاوہ بہت سے جراثیم بھی ان درختوں کے دشمن ہوگئے ہیں۔ اُن کے تدارک اور تحفّظ کے لیے بڑی بڑی کوششیں کی گئی ہیں اور کی جاتی ہیں۔ تجارتی اصول سے ہر تاجر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ پیداوار کو وسیع سے وسیع تر بنائے چنانچہ نرسری والوں کی اس سلسلہ میں بھی کارگزاریاں برابر ہوتی رہتی ہیں اور اس علم میں بھی فروغ ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف آم بلکہ آموں کی قلمیں بھی تیار کرکے فروخت کرتے ہیں۔

ملیح آباد والوں کی یہ بھی ایک خصوصیت رہی ہے کہ وہ بازار میں فروخت کے لیے صرف وہی اقسام بھیجتے رہے ہیں جو معروف اور مقبول ہیں مثلاً سفیدہ ، دسہری ، کھجری ، لنگڑا وغیرہ ایسے اقسام جن کی نسل دوسری جگہ سے حاصل کر کے خود انھیں کے ساختہ پرداختہ ہیں فروخت نہیں کرتے اور صرف اپنے ذاتی استعمال یا تواضع کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ مثلاً سرخ بربا ، کچا میٹھا ، حسن آرا وغیرہ جن کے نام تک غیر معروف ہیں۔

روسا آم کھانے ، کھلانے اور اپنی تفریح کے لیے بھی آم کے باغات لگاتے تھے۔ ملیح آباد میں کئی جلیل القدر تعلق دار تھے۔ سب سے ممتاز ہستی نواب محمد علی خاں مرحوم کی تھی۔ دوسرے بزرگ نواب محمد یوسف خاں اور تیسری گراں قدر شخصیت بشیر احمد خاں کی تھی۔ ان تینوں خانوادوں میں باہم دگر عزیز داریاں بھی تھیں اور یہ سب بڑی عظمت و عزت کے مالک اور تعلقہ دار تھے۔ ان کے محلوں میں ہر سال آم کی فصل میں متعدد بار دعوتیں ہوتی تھیں جن میں ایک دعوت ایسی ہوتی تھی کہ میلہ لگ جاتا تھا۔ راقم کے تعلقات ان تینوں بزرگ ہستیوں سے تھے۔ نواب محمد علی خاں کا عالیشان محل نادان محل روڈ پر لکھنؤ میں بھی تھا۔ میں اُن کو بزرگ سمجھتا تھا اور اُن کے صاحب زادے حامد علی خاں مرحوم سے دوستانہ روابط تھے۔ اُن کے باغات کے آم ملیح آباد اور لکھنؤ دونوں مقامات پر بے شمار مرتبہ کھائے اور ہر بار کوئی نہ کوئی نئی لذت حاصل کی تھی۔ نواب محمد یوسف خاں کو آم کی کاشت اور فصل پیدا کرنے میں بذات خود بھی دخل تھا۔ اُن کے یہاں دعوتوں میں تکلّف کو زیادہ دخل ہوتا تھا اور بڑے تزک و احتشام سے آم کھلائے جاتے تھے۔ بشیر احمد خاں کے صاحب زادے جوشؔ ملیح آبادی ہیں جن سے طالب علمی کے زمانہ سے میرے دوستانہ روابط قایم ہو چکے تھے۔ بے انتہا بے تکلفی تھی، اس لیے یہ دعوتیں کبھی نہ بھولیں گی اور ہمیشہ یاد رہیں گی۔

جوشؔ ملیح آبادی کا آبائی مکان قصبہ میں آبادی کے اندر تھا مگر انھوں نے اپنی سکونت کے لیے ملیح آباد ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک انتہائی خوش نما اور مرتفع کوٹھی بنوائی تھی جس کا نام قصرِ سحر رکھا تھا۔ حیدر آباد کی ملازمت سے قبل نیز بعد میں جب وہ آیا کرتے تھے اسی کوٹھی میں صحبتیں گرم ہوتی تھیں۔ اُن کے مستقل رفیقوں میں رئیس احمد خاں ، ابرار احمد خاں ، مصطفے علی خاں وغیرہم کے علاوہ جو سب ملیح آبادی تھے لکھنؤ سے بھی اُن کے احباب جایا کرتے تھے جن میں راقم کے علاوہ مجازؔ ، امیدؔ ، حکیم مخمورؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ دوپہر کے

وقت آموں کی دعوت رہتی تھی۔ ملیح آباد کے بہترین آم کھائے اور کھلائے جاتے تھے۔ اس نشست میں حاضرین چہلیں کرتے اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے جاتے تھے جس میں زبان وادب کے بہترین نمونے سامنے آیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی رفیع احمد خاں آجاتے تو محسنات کا باب اس طرح وا ہوتا کہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ اُن کا اس طرز کا کلام اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اُن کے اشعار کا برجستہ اُسی رنگ میں جواب صرف جوشؔ دے سکتے تھے۔ شام تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ غروبِ آفتاب کے بعد شعر و نغمہ اور شراب و کباب کی باری آتی تھی کبھی جوشؔ اپنا کلام خود سناتے تو کبھی انھیں کا کلام اُن کے چھوٹے بھائی رئیس احمد اپنی فن کارانہ نغمگی میں سنایا کرتے تھے۔ وہ خوش گلو بھی تھے اور موسیقی میں فنّی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ وہ صحبتیں صرف آم کی دعوت نہیں ہوتی تھیں بلکہ آم کی پارٹی کے نام سے سب احباب جمع ہوتے اور ہوشیاریوں نیز سرمستیوں کے تمام لطف اٹھاتے تھے۔ وہ محفلیں اور وہاں کی رنگینیاں جب یاد آتی ہیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اور آم کھانے کا لطف تو اب برسہا برس سے ختم ہو چکا ہے کیوں کہ آم کھانے اور کھلانے کا ادبِ محفل بھی مفقود ہے۔

## گیارہواں باب

# محلوں میں زندگی

(۱) خانگی ماحول
(۲) انتظامِ خانہ داری
(۳) رہن سہن
(۴) بیگمات کا ذوق و شوق
(۵) ملازماؤں کا عملہ
(۶) زچّہ خانہ
(۷) تعلیم و تربیتِ اطفال

# (۱) خانگی ماحول

رؤسا و عمائدین کی محلسراؤں کا خانگی ماحول بیان کرنے سے قبل یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ راقم کو ہر رئیس کے زنان خانے میں داخل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ماحول کے تذکرہ میں رہائش گاہوں اور اندرونِ محل کے مکانات کی ساخت کا کچھ نہ کچھ تفصیلات بیان کرنا بھی ضروری ہیں۔ املاک تعمیرات میں بعض وجوہ سے یکسانیت نہیں تھی مثلاً یہ کہ نوابانِ شیش محل اس علاقہ میں رہتے تھے جو دولت خانۂ آصفی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض عمارت کے تفصیلات بیان کرنا نہ مناسب ہوگا نہ سہل۔ نواب سلیمان قدر بہادر بہت بڑی جائداد کے مالک تھے۔ اُن کی ڈیوڑھی کا رقبہ بھی بہت تھا لیکن بیرونی نشست کے لیے صرف ایک وسیع ہال تھا اور ان کا سارا محل زنان خانہ تک ہی محدود تھا۔ ان حالات میں صرف انھیں رؤسا کی محل سراؤں کے وہی حالات پیش کیے جاتے ہیں جن کو قریب سے دیکھنے کا راقم کو شرف تھا۔ مزید برآں جو حالات درج کیے جاتے ہیں انھیں سے دوسری ڈیوڑھیوں کے ماحول کا اندازہ بھی ہو جائے گا کیونکہ رؤسا و امرا کی معاشرت، طرزِ رہائش اور ذوقِ رہائش میں بڑی حد تک مماثلت تھی ان کے محل اور محل سرائیں بھی قریب قریب مقررہ اصولوں کے تحت تعمیر تھے۔ وسعتوں اور روکاروں میں نمایاں فرق تھا جس کو اس تذکرہ میں نظر انداز کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہر رئیس کی مردانی نشست گاہ اور زنانی محل سرا کے درمیان معقول فاصلہ ہوتا تھا۔ زنانی محل سرا کے ہر طرف بلند دیواریں ہوتی تھیں اور صرف ایک آمد و رفت کا دروازہ ہوتا تھا۔ اس ڈیوڑھی پر زیادہ ملازمین تعینات نہیں رہتے تھے۔ صرف انھیں آدمیوں کو دروازہ پر مامور کیا جاتا تھا جن کی بیویاں، لڑکیاں یا کسی اور رشتہ سے عزیز عورتیں اندر ملازم ہوتی تھیں یا ایسے آدمی تعینات کیے جاتے تھے جو رئیس کی نظر میں ہر طرح معتمد اور معتبر ہوتے تھے۔ زنانی محل سرا میں ہر عورت کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف وہی سودا بیچنے والیاں یا دوسری قسم کی عورتیں جن کو اجازت ہوتی اندر جا سکتی تھیں۔ بیرونی عورتوں کی

باز پرس رئیس کے صدر دروازہ ہی پر ہو جاتی تھی اور دوسری بار پانچ زنانی ڈیوڑھی پر ہوتی تھی۔کسی دوسرے رئیس کی بیگم یا خود آپ کسی کے عزیز کی فرستادہ عورت کو اندر جانے کی اجازت دینے کے قبل بیگم صاحبہ یا اُن کی جانب سے کسی ذمہ دار عورت سے استفسار کر لینا ضروری تھا۔پردہ داری میں شدّت کا یہ عالم تھا کہ اندر رہنے والی ماماؤں اور کنیزوں کو بھی بلا ضرورت ڈیوڑھی میں جانے کی ممانعت رہتی تھی اور کوئی ملازمہ غیر مرد سے ڈیوڑھی میں بلا کسی کام کے ہم کلام نہیں ہو سکتی تھی۔تہذیب و شائستگی اس حد تک ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ جوان جوان عورتیں جو کنیزی میں تھیں یا بیگم کے منہ چڑھی ہوتیں آپس میں ہنسی مذاق کرتی تھیں تو ان کے قہقہوں یا چیخنے کی آوازیں بھی ڈیوڑھی کے باہر نہیں آسکتی تھیں۔ڈیوڑھی کے بیرونی احاطہ میں داخل ہونے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے سامنے والی دیوار کے پیچھے ایک معقول تعداد میں آبادی ہے جس میں سب برابر ہنسا بولا کرتے تھے، آپس میں چہلیں بھی ہوتی ہیں اور ایک محفل گرم رہتی ہے۔

زنانی ڈیوڑھی کے دروازہ پر ہر وقت جاجم کا روئی دار موٹا پردہ پڑا رہتا تھا۔جس طرح باہر کسی نہ کسی ملازم کی موجودگی ضروری ہوتی تھی اسی طرح ایک نہ ایک ماما یا پہری دروازہ پر اندر کی جانب حاضر رہتی تھی اس کو محلدار کہتے تھے۔پردہ ہٹا کے اندر داخل ہونے پر صاف ستھرا زنان خانہ کا صحن ہوتا تھا۔اس صحن کا ہر وقت بالکل شفاف اور ہر قسم کی آلائش و گندگی سے پاک رہنا بے حد ضروری ہوتا تھا۔صحن کے چاروں کونوں سے متصل اور وسط صحن میں خوبصورت کھڑا دی ہوئی دھنیوں میں شیشہ کی لالٹینیں نصب ہوتی تھیں جس میں اُسی زمانے کی وضع کے چھوٹے چھوٹے لیمپ مٹی کے تیل سے جلائے جاتے تھے۔گرمیوں کے موسم میں روزانہ شام کو چھڑکاؤ ہونا ضروری تھا۔اسی صحن میں کسی مناسب مقام پر تختوں کا چوکا لگا رہتا تھا۔تختوں کے پاؤں کے نیچے رنگین ترشے ہوئے پتھر لگے رہتے تھے۔شام کے وقت غروبِ آفتاب سے پہلے اِن تختوں پر فرش بچھا دیا جاتا۔عموماً دریاں ہوتی تھیں جن پر انتہائی صاف شفاف چاندنی بچھتی تھی۔ایک جانب دیدہ زیب قالین مسند کے طور پر بچھا دیا جاتا اور اس سے متصل لکڑی کے اوٹ کے سہارے گاؤ لگا کر دونوں جانب تکیاں رکھ دی جاتی تھیں۔محل کی ملکہ کے لیے یہی بیٹھنے کی جگہ ہوتی تھی۔فرش کے چاروں طرف سنگ مرمر کے میز فرش پر رکھ دیے جاتے تھے تاکہ ہوا کی زد سے فرش اُڑنا تو درکنار

شکن بھی نہ پڑے۔

صحن کے ایک جانب عموماً سمتِ مغرب عالیشان کمرے اور دالان ہوتے تھے۔ انھیں میں ایک بڑا کمرہ بیگم کے نواب کی خوابگاہ ہوتا تھا۔ یوں تو ہر کمرہ بہت زیادہ صاف اور سجل ہوتا تھا لیکن اس کمرے کی زیب وزینت ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ کسی دروازہ یا دیوار پر کسی ہلکے سے ہلکے بدنما داغ کا شائبہ بھی نہیں آنے پاتا تھا۔ فرش بھی ہر وقت چندن رہتا تھا۔ چھت میں چھت گیری رہتی جس کی خوشنما جھالر چاروں طرف لٹکتی رہتی تھی۔ اس زمانے تک تصویریں آویزاں کرنے کا رؤسا کو بہت کم ذوق تھا لیکن یہ لوگ مخطوطات کے دلدادہ تھے۔ خوشنویسوں سے کتبے لکھواتے یا پھول کی پتیوں کے نقش ونگار تیار کرا کے فریموں میں دیواروں پر لگا دیتے تھے۔ طاقوں کی زینت کے لیے چھوٹے بڑے رنگین کاغذ کے گلدستے بنوائے جاتے تھے۔ خوابگاہ میں بھی تختوں کا چوکا اور نواڑ کے پلنگ لگے رہتے تھے۔ ان پلنگوں کے پائے رنگین روغنی پھولدار ہوتے تھے جن کے نیچے سنگِ مرمر کے تراشے ہوئے ٹکڑے لگا دیے جاتے تھے۔ پلنگ کا فرش خوب اچھی طرح صاف کیا ہوا ہوتا اور چاروں پاؤں میں ریشمی رنگین ڈوریوں سے بندھا ہوا رہتا۔ بیگم کے پلنگ پر دولمبے یعنی پلنگ کی چوڑائی کے قریب قریب برابر تکیے رکھے رہتے تھے۔ تکیے مثال ماقب کے ہوتے اور اُن پر تنزیب یا مہین نین سکھ کا غلاف ہوتا تھا جن سے مثالیاف کی سُرخی برابر جھلکا کرتی تھی۔ نواب کے پلنگ پر سرہانے کے دو تکیوں کے علاوہ پہلوؤں میں دو گول تکیاں بھی رہتی تھیں جن کو رانوں میں دبا لیا جاتا تھا۔ بعض رئیس بہت چھوٹے چھوٹے گول تکیے اپنے رخساروں کے نیچے بھی استعمال کرتے تھے۔ پلنگ کے پائینتی موسم کے لحاظ سے ریشمی لحاف یا رضائی یا چادر لگی رہتی تھی۔ آرام کے وقت کے علاوہ پلنگوں پر رنگین پلنگ پوش پڑا رہتا تھا۔ بعض امرا کے پلنگ زمین پر نہیں بچھتے تھے بلکہ تختوں کے چوکوں پر بچھائے جاتے تھے۔ ان پلنگوں کے پائے بہت نیچے ہوتے تھے اور اُن کو اونچا کرنے کے لیے کوئی سہارا بھی نہ دیا جاتا تھا۔ تختوں سے ان کی بلندی بہ مشکل ہاتھ بھر کی ہوتی تھی۔ جن کمروں میں یہ انتظام رہتا تھا وہاں تختوں کا چوکا بجائے چار کے آٹھ تختوں کا ہوتا تھا۔ اسی پر بیٹھنے اور لگے ہوئے پلنگ پر آرام کرنے کا دستور تھا۔ نیز یہ کہ ایسے انتظام میں دو پلنگ برابر برابر نہیں بچھتے تھے بلکہ دونوں کے سرہانے ایک دوسرے سے متصل رہتے تھے۔

اسی خوابگاہ سے متصل دوسرا ایسا ہی ایک کمرہ بچوں کی رہائش کے لیے ہوتا تھا۔

اس کمرہ میں کسی نہ کسی طاق پر بصد ہزار احترام قرآن مجید رکھا رہتا تھا اور دیواروں پر جو مخطوطے آویزاں ہوتے ان میں "نادِ علی" اور "لی خمسة" کی موجودگی ضروری ہوتی تھی۔ متعدد نواڑ کے پلنگ بچھے رہتے اور بہت کم سن بچوں کے پہلو میں ان کی انّا یا کھلائی کا رات کو سونا ضروری ہوتا تھا۔ ایک بڑا وسطی کمرہ نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرہ میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں تختوں کا بڑا چوکا اور اس پر سببِ مذکور ہر وقت فرش بچھا رہتا تھا۔ بیگم کا بڑا سا چاندی کا پاندان اسی کمرہ کی زینت رہا کرتا تھا لیکن بیگم صاحبہ اپنے ہاتھ سے بہت خاص موقعوں پر پان بناتی تھیں اور یہ موقع بھی زیادہ تر نواب کی خوشنودی کے لیے آیا کرتے تھے۔

ان کمروں کے علاوہ متعدد اور کمرے بھی ہوتے تھے جن میں اعزا مقیم رہتے یا مہمانوں کے استعمال میں آتے۔ ان تمام کمروں کا ایک ہی قطار میں ہونا لازمی نہیں تھا بلکہ زیادہ تر ایک قطار میں نہیں ہوتے تھے لیکن ہر کمرہ کے پیچھے ایک کوٹھری اور سامنے سائبان ضروری تھا۔ کوٹھریوں میں فرش فروش، سامان آرائش و نمائش، ظروف ہر قسم کے اور دوسری گرہستی کی چیزیں بھری رہتی تھیں۔ خوابگاہ کے پیچھے والی کوٹھری میں بیگم صاحبہ کا توشک خانہ، ان کے زیورات کے بکس اور انھیں کی ضرورت کی دوسری چیزیں رہتی تھیں۔ لڑکوں کے کمرے کی کوٹھی میں انھیں کا سامان رہتا تھا جس کی کنجی کسی کھلائی یا انّا کے پاس رہتی تھی۔ باقی تمام کوٹھریوں کی کنجیاں بیگم صاحبہ کے کنجیوں والے گچھے میں پڑی رہتی تھیں۔ سائبان کے آگے اور اولتیوں کے نیچے جاجم کے روئی دار پردے ضرور رہتے تھے جو ہر وقت لپیٹے اور بندھے رہتے تھے۔ عند الضرورت کھول کر گرا دیے جاتے تھے۔

ان تعمیرات سے متصل اور دونوں جانب تین تین چھوٹے کمرے ہوتے تھے جن میں دونوں طرف ایک آبدار خانہ، دوسرا حمام اور تیسرا بیت الخلا کہلاتا تھا۔ خوابگاہ سے متصل والے آبدار خانہ میں گھڑونچیوں پر پانی سے بھرے اور جھجروں سے ڈھکے گھڑے رکھے رہتے تھے۔ انھیں کے نزدیک مناسب جگہ پر تانبے کے قلعی دار جھل جھلاتے ہوئے کٹورے اور نواب نیز بیگم صاحبہ کے مخصوص استعمال کے لیے چاندی کے کٹورے اور گلاس بھی موجود رہتے تھے۔ ایک چوکی پر سات تانبے کے چمکدار لوٹوں میں ہر وقت پانی بھرا رہتا اور لوٹے ڈھکے رہتے تھے۔ قریب ہی بڑی بڑی تانبے کی بیسن دانیوں میں بیسن بھرا رکھا رہتا تھا۔ کسی اوٹ پر بڑے بڑے رومال ٹنگے رہتے تھے۔ حمام میں متعدد آب گرمے اور گنگرے رہتے جن میں ہر وقت پانی بھرا رہتا تھا۔ موسمِ سرما میں گرم کر دیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں صابن کا نام بھی کسی

کو معلوم نہیں تھا اور نہانے میں بھی بیسن استعمال ہوتا تھا۔ حمام میں متعدد چھوٹی چھوٹی لنگیاں فراہم رہتی تھیں کیونکہ بند حمام میں بھی پورا جسم ننگا رکھ کر نہانا معیوب تھا۔ بیت الخلا میں بھی ہر وقت صفائی کا انتظام رہتا تھا۔ بیگم صاحبہ کے لیے شالبافت کا گدا جڑی پائخانے کی چوکی لگی رہتی تھی۔ درمیانی خلا کے نیچے ایک گھاس سے بھرا ہوا طشت لگا رہتا تھا اور طہارت کے لیے دوسرا ظرف متصل رکھا رہتا تھا۔ ایک کونے میں بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کھڈیاں بنادی جاتی تھیں۔ دوسری جانب کے تینوں کمروں کا بھی یہی طرز رہتا تھا البتہ لوازمات میں نمایاں کمی ہوتی تھی۔ ان دوطرفہ کمروں کے آگے بھی سائبان ہوتا تھا اور اس کے لحاظ سے بنتا تھا کہ موسم برسات میں جو لوگ کمروں سے یہاں آئیں اُن کو زحمت نہ ہو۔ بعض رئیسوں کے یہاں آبدار خانہ، حمام اور بیت الخلا کے عقب میں بھی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہوتی تھیں۔ تعمیرات میں مناسبت ہر ایک تعمیر کا دوسری جانب ویسا ہی جواب بنادینا ضروریاتِ زیبائش میں داخل تھا۔ اسی مقام پر یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ نواب کو محل کے اندر والے اِن حاجت روائی والے کمروں نیز خوابگاہ کے عقب کے توشک خانہ یا کسی بھی دوسرے کمرے یا کوٹھری سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے لیے ان تمام ضروریات کے سامان باہر ہی ان کی نشست گاہ سے متصل رہا کرتے تھے۔

صحن کے دوسری جانب بڑے بڑے دالان کمرہ نما صحنچیاں متصل کوٹھریاں اور سائبان ہوتے تھے لیکن ان سب کی چھتیں کھپریلوں کی ہوتی تھیں۔ بہت خوشنما اور مضبوط کھپرے استعمال ہوتے تھے اور ہر سال برسات سے قبل مرمّت کرادی جاتی تھی۔ بڑے بڑے دالانوں میں ملازمہ کنیزیں اور مامائیں رہتی تھیں لیکن اس طرح کہ ایک بڑا دالان کنیزوں کے لیے مخصوص ہوتے تو دوسرے ماماؤں کے لیے۔ صحنچیوں میں علیحدہ علیحدہ مغلانی، استانی بچّوں سے متعلق عملے کی رہائش گاہیں مقرر رہتی تھیں۔ بہت دور ایک سمت باورچیخانہ ہوتا تھا جس کے عقب میں جنس وغیرہ کی بڑی کوٹھری ہوتی تھی اور باورچی خانہ سے متصل دالان میں کھانا پکانے والی اور اس کی مددگار عورتیں رہا کرتی تھیں باورچی خانہ کے ایک جانب لیکن صحن کی طرف پُشت کرتے ہوئے ایک سائبان میں برتن وغیرہ دھونے اور صاف کرنے کا بندوبست رہتا تھا جس میں فراوانی کے ساتھ پانی فراہم رہتا اور ایک عملہ اسی کام پر مامور رہتا تھا۔ ان تمام تعمیرات کے پیچھے اور محل سرائے کے آخری کونے پر کئی پائخانے ایک دوسرے سے متصل بنے رہتے تھے جو ملازماؤں وغیرہ کے استعمال میں آتے تھے۔ ایک

مہترانی مستقل طور سے ملازم رہتی تھی جو سرکاری بیت الخلا کے دونوں جانب کمروں کو صاف کر کے ان پائخانوں کی طرف متوجہ ہوتی لیکن ہر ایسے غلیظ مقام کا پاک وصاف رہنا ہمہ وقت ضروری تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ صحن اور کمروں کی صفائی کبھی کسی ایک عورت سے متعلق نہیں رہتی تھی۔ بیگم صاحبہ اور دوسرے مخصوص کمروں کی صفائی کے لیے علیحدہ ایک عورت تعینات رہتی تھی جو خانگی عملہ کا ایک فرد ہوتی تھی۔ ملازماؤں کی رہائش گاہوں کی صفائی خود انھیں عورتوں کے ذمہ رہتی تھی۔ جو وہاں اقامت گزیں ہوتی تھیں۔ صحن کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ایک جاروب کش علیحدہ رہتی تھی جو دونوں وقت آکر صفائی کر جاتی تھی لیکن اس کا شمار بھی مستقل عملہ میں تھا۔ اس کو عندالضرورت تیسری یا چوتھی بار بھی طلب کر لیا جاتا تھا۔ یہ دالان، صحنچیاں اور کوٹھریاں وغیرہ بھی متصل ضرور ہوتے لیکن ایک قطار میں نہیں بنائے جاتے تھے۔ طرز تعمیر میں جاذب نظر ہونا ضروری تھا۔ رؤسا وعمائدین کا جمالیاتی ذوق بہت بلند تھا۔ اُن کی محل سرا میں نوکروں کے لیے کوارٹر بھی اس طرح بنوائے جاتے تھے کہ دیکھنے والوں کے دل خوش ہو جائیں۔ مطلب برآری کے ساتھ خوشنمائی اور دل فریبی بھی ضروری تھی۔ اسی لیے ملازم عورتوں کی قیامگاہوں پر کڑی نظر بھی رکھی جاتی تھی تاکہ صاف اور ستھرے پن میں کمی واقع نہ ہو۔

عمارات کے اس جانب جدھر بیگم صاحبہ کی رہائش ہوتی تھی عموماً سنجیدگی برستی تھی۔ بچے پوری آزادی کے ساتھ دوسری سمت کھیلتے، کھپریل کے سائبانوں میں شوخیاں کرتے اور دن میں دو چار مرتبہ ماں کے پاس چلے جاتے اور باتیں کر کے یا شرارت کر کے زندگی کے آثار پیدا کرتے تھے۔ لیکن شور وغوغا کبھی کبھی اس حلقہ میں مچ جاتا تھا جہاں ملازماؤں کی کثرت جمع رہتی تھی۔ فرائض کی ادائیگی کے وقت ہر ایک اپنے کام پر لگی رہتی لیکن فراغت کے وقت آپس میں چہلیں ہوتیں اور کبھی کبھی ہنگامہ مچ جاتا تھا۔ بیگم صاحبہ باہر تشریف لاتیں اور بلند آواز سے فرماتیں "نگوڑیوں! تم نے سونا اجیرن کر دیا" یا یہ کہ "شفتلو! کان کے پردے پھٹ گئے اب تو چپ ہو جاؤ" وغیرہ وغیرہ۔ بیگم صاحبہ زیادہ تر عزیزوں سے باتیں کرتیں اور باہمدگر طنز ومزاح بھی ہو جاتا تھا لیکن زبان وبیان تہذیب کے دائرے میں رہتا تھا۔ اپنی مقربانِ خاص عورتوں سے جو ایسے منصبوں پر فائز ہوتی تھیں جن میں حضوری ضروری تھی، وہ نہایت نرم ونازک لہجے میں بات کرتی تھیں۔ بیگمات کو غصہ بہت کم آتا

تھا لیکن جب آجاتا تو پورا محل تھرا جاتا تھا۔ اعزا و اقارب بھی کانپ اٹھتے تھے۔ اس ماحول میں سب سے بڑی اور پسندیدہ دلچسپی کہانیاں کہنا اور سننا تھی جو ملازم عورتیں خوش گفتار ہوتیں اور کہانیاں کہنے میں مشاق ہوتی تھیں ان کی ہر سمت بڑی قدر دانی ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت خانگی ماحول کی یہ تھی کہ ہر فرد قریب قریب ہر وقت رات کو سوتے وقت تک مصروف رہتی تھی اور کسی کو اتنا موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ وہ کوئی فساد کر سکے یا کوئی بڑا ہنگامہ برپا کر سکے۔ چپقلش ضرور کبھی مچ جاتی تھی لیکن رؤسا کے محلوں میں فتنہ و فساد یا لڑائی جھگڑے کا کوئی گزر نہیں ہوتا تھا۔

## (۲) انتظامِ خانہ داری

ایک ایسے محل کی خانہ داری کا انتظام جس میں بے شمار آدمیوں کو کھانا فراہم کیا جائے۔ سہل کام نہیں ہوتا ہے۔ نواب کا باورچی خانہ باہر ہوتا تھا، وہ کبھی کبھی دونوں وقت باہر ہی کھانا نوش فرماتے تھے لیکن ایک یا دو کھانے زنانے باورچی خانے سے باہر کے دسترخوان پر جانا بھی ضروری ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی طے شدہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ یقیناً باہر ہی خاصہ نوش فرمائیں گے۔ مزاج میں آجاتا تو دفعتاً گھر ہی میں بیگم کے ہمراہ دسترخوان پر شریکِ طعام ہو جاتے تھے۔ باہر کی مخصوص غذائیں اندر آجاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ناشتہ بالعموم گھر ہی میں ہوتا تھا۔ اس لیے کھانا پکانے والی عورت کو نواب کے مزاج و ذوق کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ دسترخوان پر کس وقت کون کون غذائیں فراہم کی جائیں اس کا فیصلہ باورچی خانہ کی ذمہ دار عورت ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ نواب صاحب یا بیگم صاحبہ عموماً کوئی تجویز پیش نہیں کرتے تھے۔ دورانِ طعام جو باتیں ہوتی تھیں انھیں سے متعلقہ ذمہ دار عورت ان کا منشا اخذ کر لیتی تھی۔ یہ منشا ظاہر نہ ہوتا تو مؤدبانہ کوئی فقرہ یا بات کہہ کر مرضی کا حال جان لیتی تھی۔ مخصوص دعوتوں کے وقت کھانوں کی مقدار و تعداد کا بیگم صاحبہ تعین فرما دیتی تھیں۔ عند الضرورت نواب کا مشورہ خود ہی حاصل کر لیتی تھیں۔

روسا و امرا کی طرح اور بیسا اوقات اُن سے بھی زیادہ ان کی بیگمات فیاض اور کنبہ پرور ہوتی تھیں۔ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ تعداد ایسے غریب اعزا کی ہوتی تھی جو لاوارث ہو کر گرفتارِ بلا ہوتی تھیں۔ ان کی کفالت اور خاطر داری بیگم صاحبہ بڑے ذوق و شوق سے فرماتی تھیں اور اُن کے خاندانی وقار کو بھی ملحوظ رکھتی تھیں۔ انھیں اعزا میں سے کسی کو یا پھر کسی مقرب ملازمہ کو باورچی خانے کی پوری ذمہ داری حوالہ رہتی تھی۔ جنس کی کوٹھری کی کنجی بھی انھیں مسماۃ کے پاس رہتی اور متفرق اخراجات کے لیے رقوم بھی حوالہ رہتی تھیں۔ ان مسماۃ کے لیے اتنا پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا کہ وہ روزمرہ کے اخراجات

کا حساب ایک رجسٹر پر لکھ لیا کریں۔ ان حسابات کے جانچ کا کوئی وقت معین نہیں تھا۔ بیگم صاحبہ کا جب دل چاہتا چوتھے پانچویں دن یا ہفتے بھر کے بعد معائنہ فرمالیتی تھیں لیکن حسابات کی جانچ صرف اس قدر ہوتی تھی کہ مدات خرچ کی میزان صحیح ہے یا نہیں۔ جنس کی کوٹھری میں جو سامان آکر رکھ دیا جاتا اس کا جائزہ کبھی نہیں لیا جاتا تھا۔ باورچی خانہ کا انچارج سرکاری میر منشی کو سامان ختم ہونے کی اطلاع دیتی تھیں لیکن اس طرح کہ کچھ قبل ہی وہ سامان پھر آجائے۔ باورچی خانہ کی ذمہ داری مسماۃ ہر روز تین بار کوٹھری کھلوا کے اپنے سامنے پکانے والی کو ضروری اشیا تلوا کے حوالہ کر دیتی تھیں۔ جو غذائیں پکنا ہوتی تھیں بروقت بتا دیا کرتی تھیں۔ رات کو صبح کے ناشتہ کا اور صبح و شام دونوں وقت کی غذاؤں کا سامان پکانے والی کو دیا جاتا تھا۔ ناشتہ میں چائے پینے کا عام دستور نہیں تھا۔ جو روسا چائے پینے لگے تھے ان کے لیے ایسے انتظامات باہر ہی رہا کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ کو موسم سرما میں گاہ گاہی چائے پلانا ہوتی تو باہر ہی سے بن کر اندر چلی جاتی تھی۔

ایک وقت میں چولھوں پر کتنی پتیلیاں چڑھائی جاتی تھیں اس کا اندازہ اس تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے کہ کم سے کم دو خاصگی ہانڈیاں نواب اور بیگم صاحبہ نیز اُن کی اولاد کیلئے پکتی تھیں۔ خاصگی سے مراد صرف مرغ و ماہی اور دوسری نفیس و لذیذ غذائیں نہیں تھیں بلکہ ہر غذا خاص مال مسالے کے امتزاج اور اہتمام سے پکانے کی بدولت خاصگی ہو جاتی اور کہلاتی تھی۔ مثلاً پتیلی کے کباب سادے پکتے تھے لیکن ان میں انڈے اور میوہ شامل کر کے اُن کو خاصگی بنا دیا جاتا تھا۔ پلاؤ دونوں وقت پکتا تھا لیکن جو گوشتہ پلاؤ یا کوئی اور طرز کا پلاؤ خاصگی کہلاتا تھا۔ یہی طرز ہر غذا کے ساتھ اختیار کر کے اس کو خاصگی کہتے تھے۔ ان خاصگی کھانوں کے علاوہ کم سے کم تین چار سالن دونوں وقت پکتے تھے جن میں کباب یا قیمہ، سادہ گوشت اور ایک ترکاری دار سالن ہوتا تھا۔ یہ کھانے اعزا و اقربا اور ملازماؤں کے لیے پکتے تھے۔ ملازماؤں کو چاول دال اور روٹی کے ہمراہ کم سے کم ایک سالن ضرور دیا جاتا تھا۔ لہٰذا اس سالن کی مقدار بہت ہو جاتی تھی۔ چاول سادے اور نمکین جس کو پلاؤ کہتے ہیں دونوں وقت ہوتے اور دال اس مقدار میں پکائی جاتی تھی کہ جس کا جتنا جی چاہے شوق سے کھالے۔ رومالی چپاتیاں، پوریاں یا پراٹھے بھی دونوں وقت پکتے تھے۔ ان کے پکانے کے لیے ایک علیحدہ ہنرمند عورت رکھی جاتی تھی۔ شیریں غذائیں پکانا بھی عموماً اسی عورت کے سپرد ہوتا تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے

کہ بیگمات خود بھی بہت اچھا کھانا پکانا جانتی تھیں۔ اُن کو بچپن ہی میں کھانا پکانا بھی سِکھا دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی مخصوص غذا وہ بھی پکا لیتی تھیں لیکن وہ سائبان میں بیٹھ کر مخصوص طرز کے لکڑیاں جلانے والے چھوٹے چولھے پر پکاتی تھیں۔ یہ چولھے انگیٹھی نما ہوتے تھے جن میں کوئلوں کے بجائے لکڑی ہی جلتی تھی۔ کھانا پکانے کے تمام صاف و شفّاف ظروف اور تیار مال مسالہ نیز ضروری سامان اسی سائبان میں فراہم کر دیا جاتا تھا۔ بیگم صاحبہ کا پکایا ہوا کھانا نہ صرف لذیذ ہوتا بلکہ شوق و احترام سے کھایا جاتا تھا۔ تمام اعزا و اقربا نیز مقربِ خواصین حصّہ پانے کے متمنّی رہتی تھیں۔

انتظامِ خانہ داری میں دسترخوان بچھانا اور کھانا کھلانا بھی شامل ہوتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ رئیسوں کے کھانا کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کھانا کھانے کے وقت کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ "غریبوں کو جب مل جائے اور رئیسوں کا جب دسترخوان بچھ جائے وہی کھانے کا وقت ہوا" امرا و روسا اپنے تفریحات میں کھوئے رہتے تھے، دفعتاً جب بھوک کا غلبہ ہوتا دسترخوان بچھنے کا حکم صادر ہو جاتا تھا۔ البتہ بیگمات منتظر رہا کرتی تھیں کہ باہر دسترخوان بچھنا ہو تو بچھ جائے اس کے بعد اُن کے دسترخوان کا بندو بست ہوتا تھا۔ باورچی خانہ کی نگراں مسمّاۃ یا اُن کی جانب سے اسی حیثیت کی کوئی عورت جا کر کھانا پکواتی تھی، کھانا پکانے والی عورتوں کا فرض ہوتا تھا کہ ہر چیز گرم رکھیں۔ کھانا کھانے والوں کے لیے علیحدہ علیحدہ برتنوں میں ہر غذا نکالی جاتی اور اُن چینی کے خوش رنگ اور خوش وضع برتنوں کو تانبے کے ڈھکنوں سے ڈھاک کر خوانوں میں لگا دیا جاتا تھا۔ پھر کنیزیں ان خوانوں کو لے جا کر پلیٹوں اور پیالوں کو دسترخوان پر لگا دیتی تھیں۔ نواب گھر میں کھانا کھاتے تو دسترخوان خوابگاہ والے کمرے کے چوکوں پر بچھتا تھا اور بیگم شریکِ طعام ہوتی تھیں۔ وہ اگر خاصہ باہر نوش فرماتے تو یہ دسترخوان وسطی کمرہ میں بچھتا تھا اور اعزا و اقارب شریکِ طعام ہوتے تھے۔ بچّوں کے لیے آزادی رہتی تھی وہ جس وقت چاہیں کھانا کھا لیتے تھے اور ان کو کھانا کھلانے کا فریضہ انھیں کی متعلقہ ملازماؤں کے ذمّہ رہتا تھا۔ فراغتِ طعام کے بعد نواب اور ان کی بیگم کے ہاتھ اسی کمرے میں دُھلائے جاتے تھے جہاں دسترخوان بچھتا تھا اور اس کے فوراً گلوریوں سے بھرا ہوا چاندی کا خاصدان پیش کر دیا جاتا تھا۔

دعوتوں اور ضیافتوں کے مواقع پر محل کے اندر گھما گھمی بہت بڑھ جاتی تھی ۔جتنی بڑی ضیافت ہوتی اسی نسبت سے انتظامات پہلے سے شروع ہو جاتے تھے ۔تقریبات کے سلسلے میں ہفتوں قبل سے سائبانوں کی آرائش ،کمروں کی زیبائش کی فکر اور باورچی خانے میں گرما گرمی رہتی تھی ۔ مردوں اور عورتوں کا ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا دستور نہیں تھا س لیے صرف زنانی دعوت کا بندوبست ہوتا تھا پھر بھی بہت سی غذائیں مردانے باورچی خانہ سے پک کر اندر آتی تھیں ۔ اندر کی ذمہ دار عورتوں نیز ملازماؤں کے حوالے بڑا کام دسترخوان لگانے اور کھانا کھلانے کا ہوتا تھا ۔ مہمانوں کو نشست کا انتظام ایک بڑا مرحلہ ہوتا تھا ۔ گھر کی ملکہ جہاں تشریف فرما ہوتی تھیں ہر مہمان وہاں بیٹھنا چاہتا تھا ۔ظاہر ہے کہ برابر کی حیثیت والی بیگمات کو قربت حاصل کرنا سہل ہوتا تھا لیکن دوسری مہمان عورتیں صرف دور کے جلوے کی حقدار رہتی تھیں ۔ ان مواقع پر مدعو کرنے میں امیر و غریب کا امتیاز نہیں کیا جاتا تھا اور کم حیثیت بڑے درباروں میں حاضری دینے کے لیے باعثِ مفاخرت سمجھتے تھے اس لیے رئیسوں کے یہاں تقریبات میں شرکت اور دعوتوں میں دسترخوانوں پر باریابی عزت افزائی سمجھی جاتی تھی ۔ لہٰذا بڑی بڑی ضیافتوں میں ملازم عورتوں پر کام کا بڑا بوجھ پڑ جاتا تھا جس کو وہ سلیقہ مندی سے نبھا لیتی تھیں ۔ یہ سلیقہ مندی اس تعلیم سے حاصل ہوتی تھی جو بیگمات کے ساتھ رہنے والی غریب مگر بلند گھرانے کی عورتیں اُن کو یاد کرتی تھیں ۔

توشک خانے کی کنجی بیگم کے پاس رہتی تھی اور دن میں کم سے کم دو بار یہ کمرہ کھلتا بھی تھا اور کبھی کبھی کھلا ہی پڑا رہتا تھا لیکن بیگم صاحبہ بذاتِ خود بہت کم اندر قدم رکھتی تھیں البتہ اُن کو یہ یاد رہتا تھا کہ اُن کے استعمال اور مخصوص ملبوسات کہاں کہاں رکھے ہیں ، پسندیدہ لباس کس بکس یا الماری میں ہے ، کون کون کپڑا اتنا پرانا رہ گیا ہے کہ اُن کے استعمال کے قابل نہیں رہا ۔ اِن تمام باتوں پر ان کی نظر رہتی تھی ۔ مردانے توشک خانے کی طرح گھر میں اس خدمت پر کوئی مخصوص ملازمہ تعینات نہیں ہوتی تھی ۔ کپڑے بدلنے کے وقت جو کنیز یا خواص موجود ہوتی اُسی کو مناسب ہدایات اور اشارے دے کر حسبِ ضرورت لباس نکلوا لیا جاتا تھا اور یہ امر کہ وہ خواص یا کنیز حسبِ مرضی خدمت انجام دے صرف اسی عورت کی ہنر مندی پر منحصر ہوتا تھا ۔ حقیقتِ امر تو یہ ہے کہ گھر کے اندر قریب قریب سب ہی ملازم عورتیں سلیقہ شعار ہوتی

تھیں۔ ان کا تعلق غریب گھرانوں سے ہوتا تھا لیکن لکھنؤ کی شائستگی سے امیر و غریب سب ہی متاثر تھے۔ ان ملازماؤں میں وقت ملازمت اگر کوئی کمی ہوتی تو وہ محل کا ماحول درست کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جس ملازمہ کو سرکار سے جتنی زیادہ قربت ہوتی وہ اتنی ہی زیادہ مزاج داں ہو کر سلیقہ شعار ہو جاتی تھی۔ زیورات کے لیے یہ دستور تھا کہ عند الضرورت جو صندوقچہ درکار ہوتا وہ بند حالت میں حاضر کر دیا جاتا تھا۔ زیورات کے متعدد بکس ہوتے تھے۔ موتیوں کے زیور مخصوص طرز پر رکھے جاتے تھے اور اُن کے لیے علیحدہ ایک چھوٹا بکس رہا کرتا تھا۔ اسی طرح سادے اور جڑاؤ زیورات علیحدہ علیحدہ رکھے جاتے تھے۔ بعض زیورات مثلاً ہار، چھلا، ٹیکا وغیرہ علیحدہ علیحدہ مخملی ڈبیوں میں محفوظ ہوتے اس لیے اُن کے رکھنے کے لیے مقابلتاً بڑے بکسوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ صندوقچیاں اور بکس عموماً لکڑی کے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بہت عمدہ اور مضبوط لکڑی کے بکس فیض آباد سے بن کر آتے تھے۔ زیورات رکھنے کے بکس دیکھنے میں زیادہ بڑے نہیں ہوتے تھے لیکن ہاتھوں میں اٹھانے پر دورِ حاضر کے اسی لمبائی چوڑائی والے لوہے کے صندوقچوں سے مقابلتاً بہت بھاری ہوتے تھے۔ حیرت خیز بات یہ تھی کہ نمی میں رکھ دیجیے تب بھی دیمک سے محفوظ رہتے تھے اور سڑنے یا گلنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ راقم کے پاس اب تک اپنے بزرگوں کی یادگار ایک ایسا ہی چھوٹا بکس موجود ہے جو کئی سیر وزن کا ہے حالانکہ سیدھا سادہ بغیر خانوں کا ایک چھوٹا سا بکس ہے اور اس کی عمر یقینی طور پر سو برس سے کہیں زیادہ ہے۔

بچوں کا توشک خانہ اور اُن کے کپڑے اُن ملازم عورتوں کے حوالے رہتے تھے جو علیحدہ ان پر نوکر رکھی جاتی تھیں۔ بچوں کی نگہداشت، ان کو صاف ستھرا رکھنے اور اُن کے روزانہ کپڑے بدلوانے کا فریضہ بھی انھیں عورتوں کے ذمہ رہتا تھا۔ صبح کو ناشتہ کے بعد جب بچے باری باری اپنی والدہ محترمہ کو آداب بجا لانے جاتے تو وہ صورت دیکھ کر صحت کا اور کپڑوں پر نظر ڈال کر صفائی کا جائزہ لیتی تھیں۔ خفیف سے خفیف نقص پر یا کسی معمولی سے معمولی خرابیٔ صحت کی علامتوں پر ملازمہ سے محاسبہ ہوتا تھا اور فی الفور تدارک کا انتظام کرنے کے لیے ہدایات جاری ہو جاتے تھے۔ بچوں کو ملازمائیں اپنی اپنی نظرِ انتخاب سے پسند کر کے کپڑے پہناتی تھیں۔ یہ کپڑے نفیس اور عمدہ ہوتے ہی تھے لیکن بسا اوقات کرتے اور پائجامے یا کرتے اور ٹوپی کے رنگوں میں نامناسبت پر بیگم صاحبہ اعتراض فرما دیتی تھیں جس کی اصلاح فی الفور انھیں کے روبرو کر دی جاتی تھی۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے لیے ملبوس ہر

سال دو مرتبہ تیار ہوتے تھے۔ انھیں کے ساتھ بچوں کے کپڑوں کے لیے بھی جملہ ضروریات فراہم ہو جاتی تھیں اور ان کے کپڑے بھی تیار ہو جاتے تھے۔ جو پرانے کپڑے علیحدہ کیے جاتے اور ان کی تعداد معقول بھی ہوتی تھی، سب کے سب متعلقہ ملازمہ کو مرحمت ہو جاتے تھے۔ زنانے اور بچوں کے کپڑے محل کے اندر ہی سیے جاتے تھے۔ سلائی کے دوران یا بعد میں بھی جامہ کے درست و چست ہونے کا جائزہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ فی الفور توشک خانہ میں محفوظ کر دیے جاتے تھے۔ مناسب وقت پر اور مبارک دن کو جب نیا کپڑا پہنایا جاتا تو بیگم صاحبہ ملاحظ فرما کر اس کے درست یا ناقص ہونے کا فیصلہ فرماتی تھیں۔ زردوزی یا بہت قیمتی لباس کے علاوہ معمولی دنوں کا نیا جامہ اگر ناپسند ہوتا تو فوراً اتروا کر کسی کو بخش دیا جاتا تھا۔ اولاد کے سلسلے میں یہی طرزِ عمل اُن کی شادیوں کے وقت تک برقرار رہتا تھا۔ یعنی یہ کہ اُن کے طعام ولباس کی پوری پوری نگہداشت ان کی مخصوص ملازماؤں کے حوالہ رہتی تھی اور یہ عورتیں بھی بچوں کے ساتھ محبت و رفاقت میں کوئی کمی نہیں کرتی تھیں بلکہ اُن پر جان دینے کو ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ تاریخوں کے سعد و نحس ہونے اور سیاروں کی رفتار سے متاثر ہونے کے سب رئیس قائل تھے اور ہر کام اسی اصول کے تحت شروع کرتے تھے۔ لیکن اولاد کے سلسلہ میں ان عقائد پر بہت سختی کے ساتھ کاربند رہنا ضروری تھا۔ ملازمائیں قمری مہینوں کی تاریخیں یاد رکھتی تھیں اور ان کی سعادت و نحوست کا لحاظ رکھتی تھیں۔

لباس و طعام کی طرح دوسرے امورِ خانہ داری میں بھی ذمہ داریاں ملازماؤں میں منقسم رہتی تھیں جو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اپنے فرائض سے بہتر سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ مشورت کی ضرورت ہوتی تو پہلے اپنی برادری ہی میں دوسری ملازماؤں سے دریافت کر لیتی تھیں اور بعد میں اطمینان نہ ہوتا تو بیگم صاحبہ کے اعزا و اقربا میں جن سے بھی گستاخ ہوتی تھیں رہنمائی حاصل کر لیتی تھیں۔ بیگم صاحبہ سے براہِ راست کوئی بات از خود دریافت کرنا بدتہذیبی بھی تھی اور ایسا کرنے کی کسی کو ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ پھر بھی بیگم صاحبہ کی شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ بیک وقت اُن کا خوف بھی طاری رہتا اور انھیں کی رفاقت کا سب دم بھرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نوکری سے برطرف ہو جانے کا خطرہ درپیش رہتا ہوگا لیکن اسی کے ساتھ یہ صورتِ حال بھی تھی کہ برطرفی کا فیصلہ بڑی دیر میں اور بڑی مشکل سے ہوتا تھا اس لیے اس خوف کی وجہ اپنی مالکہ کی عظمت میں مضمر

تھی - رفاقت اس لیے تھی کہ بیگم صاحبہ ملازماؤں پر ہمیشہ شفقت فرماتی رہتی تھیں - اس کا یہ مصرع کہ "جن کے رتبہ ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے" زبان زد تھا - ہر رئیس کو باہر اور ہر بیگم کو اندر اپنی بزرگی کا احساس تھا اور اس بزرگی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ شدت کے قائل نہیں تھے بلکہ نرمی کا سلوک اپنا شعار بنائے رکھتے تھے - اس نرمی اور حسنِ سلوک کی بدولت اُن کے اسٹاف میں بہت بڑی اکثریت اُن کی مرضی اور خوشنودی کی ہمہ وقت تجسس رہتی تھی - یہی وجہ تھی کہ بیگم صاحبہ اپنے کمرے یا نشست گاہ والے کمرہ میں تشریف فرما رہتی تھیں لیکن محل کا سارا انتظامِ خانہ داری اُن کی مرضی اور پسند کے مطابق جاری رہتا تھا - اپنے مالک کی عزت اور اس کا وقار برقرار رکھنے کا جذبہ ہر ملازمہ میں ہر وقت کارفرما رہا کرتا تھا - ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فکر رہتی تھی کہ کوئی کام ایسا نہ ہو جو مالکہ کی ناخوشنودی کا باعث بن سکے - لہٰذا یہ کہنا حرف بہ حرف صحیح ہوگا کہ سارا انتظام خانہ داری ملازماؤں کی وفاشعاری اور ہنرمندی کے بل بوتے پر چلتا تھا -

## (۳) رہن سہن

بیگمات کے رہن سہن کا تذکرہ پیش کرنے سے قبل یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُن کا دن چاشت کے وقت شروع ہوتا تھا اور شب کو خوابگاہ میں آرام کرنے کے لیے دو پہر رات کے پہلے کبھی موقع نہیں ملتا تھا - معاشرے نے اُن کے اوپر یہ فریضہ عائد کر رکھا تھا کہ جب تک نواب گھر میں خاصہ نوش کرنے نہ آجائیں یا یہ کہ ان کا دسترخوان باہر بچھ جانے کی خبر نہ آجائے بیگم کا دسترخوان بھی نہیں بچھ سکتا تھا - اسی طرح جب تک نواب خوابگاہ میں رونق افروز نہ ہوں یا یہ کہ اُن کے باہر ہی آرام فرما ہونے کی خبر نہ آجائے بیگم بھی فرشِ خواب پر قدم نہیں رکھتی تھیں - ظاہر ہے کہ اُن کو کتنی صعوبت کا سامنا رہتا ہوگا - آج کے لوگ یہی خیال قائم کر سکتے ہیں اور یقیناً بہت سی بیگمات نے عہدِ قدیم میں ان تکلیفوں کو بادلِ ناخواستہ جھیلا ہوگا لیکن بکثرت مثالیں اس کے برخلاف بھی ملتی تھیں - راقم کو اپنے خاندان والوں نیز مرزا بہادر مرزا صادق علیخاں کے خانوادہ کا ذاتی طور سے علم ہے جہاں بیگمات ان مصائب کو مصائب ہی نہیں سمجھتی تھیں بلکہ ایسے حالات کو جزوِ زندگی قرار دیے ہوئے تھیں - اوّل تو انھوں نے اس دنیا میں آنکھ کھول کر گھروں میں یہی حالات دیکھے تھے اور شادی

کے قبل ہی سے وہ ان ناپسندیدہ طریقوں کی خوگر ہو چکی تھیں دوسرے یہ کہ لڑکیوں کو مذہبی تعلیم زیادہ متاثر کر دیتی تھی۔ وہ ہر موقع اور محل پر اسلامی احکام کا احترام کرتی تھیں۔ اُن کے نزدیک شوہر کی اطاعت فرض تھی اور اس فرض کی ادائی میں اس کی دلجوئی و خوشنودی ملحوظ رکھنا بھی لازمی سمجھتی تھیں۔ مرد ان کی حق تلفی کرتے تھے لیکن وہ صابر و شاکر ہی رہتی تھیں۔ راقم کے علم و یقین میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے جہاں رئیس کی طوائف بازی یا اس کے بیوی کو چھوڑ کر زن بازاری کے ہمراہ باہر سو رہنے پر کبھی ایک بار بھی لڑائی تو درکنار شکر رنجی ہوئی ہو۔ بیگمات کو محل کے اندر حکمرانی کرنے کے جو اختیارات حاصل تھے وہ اسی کو اپنے لیے کافی سمجھتی تھیں اور اپنی عظمت و عصمت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی اپنی عمریں گزار گئیں۔

اس طرز زندگی کے تحت بیگمات کا طلوع آفتاب کے بہت دیر بعد تک سوتے رہنا ہی فطرت کا تقاضا تھا۔ بیگمات عموماً اپنی خوابگاہ کے کمرہ ہی میں آرام فرماتی تھیں۔ موسم گرما میں رات بھر باری باری مہریاں کمرہ کے باہر بیٹھ کر فراشی پنکھے کی ڈوریاں گھسیٹا کرتی تھیں۔ انتہائی خوبصورت جھالردار فراشی پنکھا جس کی لکڑی پر شالباف یا کسی دوسرے رنگین کپڑے کا غلاف ہوتا، چھت میں لٹکا رہتا تھا۔ پنکھا کھینچنے والی مہری اتنی وفاداری سے پنکھا کھینچتی تھی کہ لمحہ بھر کے لیے بھی ہاتھ رکنے نہیں پاتا تھا۔ چار گھنٹے کے بعد اس کی باری ختم ہو جاتی اور دوسری مہری اس کی جگہ لیتی تھی۔ بیگم صاحبہ کبھی کبھی محل کے وسطی صحن میں آرام فرماتی تھیں تو مہریاں منتظر رہتی تھیں کہ کب وہ کمرہ کے اندر جائیں اور وہ پنکھے کی ڈوری سنبھال لیں۔ زیادہ تر بیگمات نماز پڑھنے کی پابند تھیں۔ وہ بھی وقتِ نماز بیدار ہو کر فریضۂ سحری ادا کرنے کے بعد فوراً بستر پر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتیں اور وقت چاشت بیدار ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد ناشتہ کا وقت آجاتا تھا۔ اس وقت نواب کی موجودگی بالعموم ہوا کرتی تھی۔ مردانے میں شاذ و نادر ناشتہ کرتے تھے۔ ناشتہ کے لیے دسترخوان خوابگاہ والے کمرہ ہی بچھتا تھا۔ کنیزیں اور ماماائیں اہتمام و التزام کے ساتھ روزانہ غذائیں پیش کرتی تھیں اور نواب اپنی بیگم کے ہمراہ نوش فرماتے تھے۔ اس زمانے کا ناشتہ اچھی خاصی غذا ہوتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ رئیسوں کے دسترخوان دوپہر دن کو یا دوپہر ڈھلنے کے بعد بچھا کرتے تھے۔ ناشتہ کرنے میں کافی وقت صرف ہوتا تھا اور اس کے بعد ہی نواب کی مردانہ نشست اور بیگم کی خانگی روزمرہ

کا کاروبار شروع ہوتا تھا۔ اس کاروبار کی تفصیل بہت مختصر بیان میں ختم کی جاسکتی ہے لیکن عملاً اس کا اتنا پھیلاؤ تھا کہ رات گئے تک سلسلہ جاری رہتا اور عدیم الفرصتی کی شکایتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

لکھنؤ کی بیگمات اس زمانہ کے معیار کے مطابق تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔ قرآن و حدیث پر عبور ہوتا تھا۔ بعض علم تفسیر سے بھی کچھ نہ کچھ باخبر ہوتی تھیں۔ فارسی کی اچھی خاصی لیاقت ہوتی تھی۔ حافظ و سعدی کے کلام پر نظر ہوتی اور گلستان بوستان ورد ہوتی تھی۔ اردو بہر حال گھر کی زبان تھی اور بیگمات کی زبان ہی کو اردو کی ٹکسالی زبان کہا جاتا تھا۔ عزیز لکھنوی مرحوم نے راقم کے خاندان کی بیگمات کو جو خان علامہ نواب تفضّل حسین خان کے اخلاق میں تھیں "ثقات" کا لقب مرحمت ہوتا تھا۔ کتب بینی اور طلبِ علم کا یہ ذوق تاحیات برقرار رہتا تھا چنانچہ ناشتہ کے بعد دوپہر تک یہی شغلہ برابر جاری رہتا تھا۔ اخبارات بہت کم شائع ہوتے تھے اور اردو اخبارات کے ایسے جو اخبار نکلتے تھے اُن سے بھی بیگمات کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شہر میں معمولی جھگڑے فساد کی اُڑتی اُڑاتی کوئی خبر آجاتی تو بیگم گھنٹوں تک خفقان میں مبتلا رہتی تھیں۔ اُن کے لیے قصوں اور کہانیوں کی کتابیں نیز شعرا کے دیوان وغیرہ دلچسپی اور مصروفیت کے لیے کافی ہوتے تھے۔ بعض بیگمات فقہ اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ ہی میں اوقات گزاری کرتی تھیں۔ شعر و سخن سے بہر حال ہر ایک کو والہانہ ذوق تھا اور بعض خود بھی شاعرہ تھیں اور صاحبِ دیوان تھیں لیکن نہ تو زنانے مشاعرے ہوتے تھے اور نہ بیگمات کو اپنے دیوان چھپوانے کا کبھی شوق ہوا۔ روسا اپنی بیگمات کے ان کارناموں کو پردۂ خفا میں رکھنا ہی مناسب سمجھتے تھے۔ اُن کی قدر دانیوں کے تمام منازل اسی حد پر ختم ہو جاتے تھے کہ وہ خود کبھی کبھی ان کا کلام سنتے اور دل کھول کر داد دیتے۔ بیگمات کے لیے اتنی ہی عزت افزائی کافی ہوتی تھی۔ نواب اور بیگم کے درمیان شعر و سخن کی یہ محفل دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد شروع ہوتی جس کا سلسلہ نواب کی شام والی ہوا خوری کے وقت ختم ہوتا تھا۔ اسی درمیان کچھ دیر کے لیے دونوں آرام بھی فرما لیتے تھے کیونکہ دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے سو رہنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔

روسا کا دسترخوان مردانہ نشست میں بچھتا تب بھی دسترخوان بڑھ جانے کے بعد وہ محل میں چلے جاتے تھے۔ دن کو قطعی طور سے کوئی اور کسی قسم کی نشست کھانا کھانے

کے بعد باہر نہیں ہوتی تھی اندر جا کر بیگم سے شعر و سخن کی باتیں ہوتی تھیں یا دونوں باہم دگر پچیسی کھیلتے تھے۔ یہ شوق مردوں اور عورتوں کو یکساں طور پر تھا۔ بیگم اپنی بے تکلف عزیز عورتوں سے بھی پچیسی کھیل لیتی تھیں۔ اس مقام پر یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ نواب ہوں یا بیگم دونوں کے ساتھ پچیسی کھیلنے والا یا کھیلنے والی دونوں کا شعار دیدہ و دانستہ ہار جاتا تھا۔ وہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ ان کی دلجوئی کے لیے عمداً شکست قبول کی جاتی ہے اور اس طرح دل خوش کرنے کا معاوضہ بھی حکمتِ عملی سے دیا جاتا تھا۔ شکست خوردہ سے شرط بدلی جاتی تب وہ فتح حاصل کر کے رقم حاصل کر لیتا تھا۔ یہی طریقہ زنانے میں بھی رہا کرتا تھا۔ بیگم اپنے ساتھ کی عورت اور نواب اپنے مقابل کے مرد کو جو شرط ہارتے ادا کرتے تھے۔ شرط بد کر کھیلنے کے بعد اُن دونوں کا ہارنا بھی لازمی ہوتا تھا۔ اس تفریحی مشغلہ کے بعد نواب آرام فرما کے باہر تشریف لے جاتے تھے اور بیگم جمال آرائی میں مشغول ہو جاتی تھیں۔

بیگم صاحبہ کے لیے ہر شام کو ذوق جمال آرائی دل کھول کر پورا کرنا ضروری ہوتا تھا۔ موسم گرما میں دونوں وقت نہانا ہوتا تھا غسل کرنا نہیں کہتے تھے اور اس اصطلاح کو صرف میت کے لیے بولا جاتا تھا۔ اسی طرح نہانے والے کمرہ کے لیے حمام مستعمل تھا، غسل خانہ کہنے سے اجتناب کرتے تھے۔ جسم پاک و صاف ہوتے تھے جن کو گرد و غبار سے کبھی سابقہ نہیں پڑتا تھا اس لیے نہا لینا صرف فرحت حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نہانے کے بعد بال سکھانے میں کچھ وقت گزرتا کیونکہ گیلے بالوں میں تیل لگانا اور کنگھی کرنا ناپسند تھا، ایک کنیز سنگاردانی لا کر سامنے رکھ دیتی تھی۔ اس زمانے میں ڈریسنگ ٹیبل کا رواج نہیں تھا بڑے بڑے آئینے تھے لیکن ان کا مقصد صرف آرائش ہوتا تھا۔ سنگاردانی میں اوپر کے پٹ میں نیچے کی طرف آئینہ جلی جڑا رہتا تھا۔ پٹ کو اٹھا کر اسی میں جڑی ہوئی ٹیک پر روک دیا جاتا تھا اب مشاطہ کے اشتراک سے کنگھی ہوتی تھی۔ آئینہ میں دیکھ کر کافی وقت میں بالوں کی نشست ٹھیک ہوتی اور چوٹی گوندھ کر منقش سے آراستہ کر لی جاتی تھی۔ اس تمام عمل میں ہاتھوں، ماتھے، چہرے اور گلے کے پیچھے والے حصہ میں تیل کی چکنائی لگ جانا ضروری تھا۔ سر میں عموماً بیلے کا جاڑوں میں اور چنبیلی کا تیل گرمیوں میں لگانے کا دستور تھا۔ تیل فرمائشوں سے تیار کرائے جاتے تھے۔ بیگمات میں ہر ایک کی علٰحدہ علٰحدہ نفاستِ طبع ایک ہی طرح کے تیل کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ تیل لگانے کے بعد بیسن سے ہاتھ منہ دھونا ضروری ہوتا تھا اور خدمتگار کنیزیں نرم و نازک کپڑے سے گلے کی

پشت کو صاف کر دیتی تھیں۔ کنگھی چوٹی سے فراغت کرنے کے بعد جسم پر کے سب کپڑے تبدیل کر دیے جاتے تھے یعنی یہ کہ ہر چوبیس گھنٹوں کے بعد لباس ضرور بدل دیا جاتا تھا۔ اس تبدیلیٔ لباس میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ جس رنگ اور وضع کے کپڑے اتارے گئے ہیں ویسے ہی پھر زیب بدن نہ ہوں۔ اُن کی وضع اور رنگ میں نمایاں تبدیلی ضروری تھی۔ آخر میں زیورات کی باری آتی تھی۔ بیگمات گھروں کے اندر بھی ہر وقت قیمتی زیورات پہنے رہتی تھیں۔ سادہ زیور بھی پہنا جاتا تھا لیکن صرف پاؤں میں یا جڑاؤ عدد کے ساتھ ہاتھوں میں سادی چوڑیاں پہنی جاتی تھیں۔ بعض زیورات مثلاً چھپکا، ٹیکا، منھ، گلے کے ہار، یا بہت قیمتی جڑاؤ زیورات گھروں میں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ البتہ قیمتی سے قیمتی ہیرے یا زمرد کا نگینہ جڑی ہوئی ناک کی کیل یا دُر و مرجان اور لعل و یاقوت کے گوشوارے بلا تکلف محل کے اندر بھی مستعمل تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ہاتھ، گلے اور چہرہ کی زیبائش ہمہ وقت اور ہر جگہ ضروری تھی۔ زیورات سے آراستہ ہونے کے بعد سرمہ اور مسّی کی باری آتی تھی۔ یہ چیزیں آخر میں اس لیے استعمال ہوتی تھیں کہ بناؤ سنگار کی تکمیل انھیں رنگینیوں پر منحصر تھی مسّی کا عام رواج تھا۔ مرد اور شرفا و عوام کی مستورات بالعموم مسّی شامل کردہ پان کھا لیا کرتے تھے اس طرح پان کی سُرخی اور مسّی کی دھڑی ان کے ہونٹوں کو رنگین بنا دیتی تھی لیکن بیگمات کی لطافت مزاج کے تقاضے کچھ اور ہی تھے۔ ان کو مسّی آلودہ لبوں پر پان کی سُرخی دوڑا دینے ہی میں حسن و جمال نظر آتی تھی اور یہ صحیح بھی تھا اس لیے کہ

مسّی آلودہ لب پر رنگِ پان ہے ۔۔۔ تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے

ہونٹوں پر مسّی لگانے میں انگلیوں کو صاف رکھنے کی فکر رہتی تھی اس لیے مسّی کپڑے کی ملائم اور نازک پوٹلیوں کے سہارے لگائی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں نہ پوڈر تھا اور نہ پوڈر پف، البتہ اس آخری الذکر چیز کی بدل وہ پوٹلیاں ہوتی تھیں جو سنگار دانی میں محفوظ رہا کرتی تھیں۔ سنگار دانی کا سارا ساز و سامان سینگ کی متعدد کنگھیوں، تیل اور عطر کی شیشیوں، مسّی اور اس کے استعمال کے لیے پوٹلیوں، چوٹی گوندھنے کے لیے متعدد مقیسی اور ریشمی چیزوں اور سلائی و سرمہ دانی پر مستعمل ہوتا تھا۔ سرمہ لگانے کی سلائی ایک مخصوص طرز کی اور چاندی کی ہوتی تھی۔ سلائی سے سرمہ لگانے کے ساتھ ہی دونوں آنکھوں کے نزدیک دونوں جانب سرمہ ہی سے دنبالے نکالے جاتے تھے جن کا مقصد آنکھوں کی

سحر آفرینی کو دوبالا کر دینا ہوتا تھا۔ آخر میں دل کھول کر اتنا عطر لگایا جاتا کہ سر سے پاؤں پاؤں تک سارا جسم معطر ہو جاتا تھا۔ بیگمات جس وقت عطر لگاتی تھیں تو صحن تک سارا محل معطر ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں بہترین عطر تیار ہوتے تھے اور ان کا استعمال بھی ہر جگہ بہتات کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس تمام آرائشِ جمال کے بعد بیگمات اپنے اپنے کمروں سے باہر نکلتی تھیں۔ شام کا جھٹ پٹا وقت ہوتا تھا اور صحنِ محل میں چہل قدمی بہت پسند آتی تھی۔ کنیزیں اور خواصیں دعائیں دیتی ہوئی آگے بڑھتی تھیں اور بیگم صاحبہ اُن سے شفقت و مہربانی سے دو دو باتیں کر لیا کرتی تھیں۔

غروبِ آفتاب کے بعد موسم گرما میں کافی رات تک اور موسم سرما میں بھی کچھ مدت تک صحن میں تختوں کے چوکے پر نشست رہتی تھی۔ بیگم صاحبہ کے قریب عزیز عورتیں جمع ہو جاتی تھیں اور پاک و صاف لباس میں مقرب، منہ چڑھی خواتین، کنیزیں اور دوسری ملازمائیں حاضر ہو جاتی تھیں۔ ان عورتوں میں کسی ایک سے بھی مخاطب ہو کر بیگم صاحبہ کی زبان سے یہ نکل جاتا اور یہ فرما دینا بھی یقینی ہوتا تھا کہ "اری او کم نصیب، زمین پر کیوں بیٹھی ہے کوئی کھٹیا گھسیٹ لے۔" تو آن کی آن میں نثار ہونے والیوں کا پروانہ وار جھرمٹ لگ جاتا تھا۔ بیگم صاحبہ کا دل بہلانے کے لیے بہت دلچسپ باتیں ہوتی تھیں۔ باتوں میں باتیں نکلتی تھیں اور ہر بات پر کوئی نیا قصہ ہر روز گھڑ لیا جاتا تھا۔ خواصوں اور بلند پایہ ملازماؤں کو دن میں بڑی فراغت رہا کرتی تھی۔ وہ خود یا باہم گر مشورہ کر کے کوئی نہ کوئی کہانی تیار کر لیتی تھیں اور رات کو سنا دیتی تھیں۔ ان میں بعض بڑی اچھی داستان گو ہوتی تھیں جن کے افسانوں سے سب ہی محظوظ ہوتے تھے۔ چار عورتیں جہاں جمع ہوں وہاں باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ مثل عہدِ قدیم سے رائج ہے۔ بیگمات کے محل میں خواندہ اور ناخواندہ عورتوں کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ بیگم صاحبہ کی عزیز عورتیں بھی کچھ کم خوش گفتار نہیں ہوتی تھیں۔ افسانے بیان کرتی تھیں اور درمیان میں اچھے اچھے اور مناسب اشعار بھی پڑھ دیا کرتی تھیں۔ یہ تفریحی مشغلہ رات کا دسترخوان بچھنے تک کسی نہ کسی نہج سے چلتا رہتا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پان بھی تقسیم ہو جاتے تھے۔ اس مقام پر یہ بات خاص طرح سے لائقِ ذکر ہے کہ یہ داستان سرائی پریوں، جنوں اور مفروضہ عاشقوں کے قصوں تک محدود رہتی تھی۔ دورانِ گفتگو میں نہ کوئی ایک دوسرے پر لعن طعن کرتی تھی، نہ غیر حاضر کسی شناسا عورت کی غیبت ہوتی تھی، نہ کوئی کلمہ کسی کی زبان سے ایسا نکل سکتا تھا جو تہذیب و متانت کے منافی

ہو۔ سب سے زیادہ دلچسپ یہ طرز کلام تھا کہ اس روزانہ کی نشست میں ہر شام کو ہر ایک کی زبان سے بیگم صاحبہ کی سلامتی اور ترقیٔ درجات کے لیے ہزاروں دعائیں نکل جاتی تھیں۔ چھوٹے بچے بھی اکثر اپنی والدہ محترمہ کے قریب آکر بیٹھ جاتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے اسٹاف کی عورتیں بات بات پر ان پر تصدق ہوتیں اور بار بار اُن کی بلائیں لیتی رہتی تھیں۔ یہی طور طریقے دستور زمانہ تھے اور ہماری پرانی معاشرت کا اہم جزو تھے۔

ان طور طریقوں کو دورِ حاضر کے دنیادار لوگ تصنع اور ظاہر داری پر محمول کریں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو ان تذکروں پر تمسخر بھی فرمائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس زمانہ میں بھی مکر و ریا کا مجسمہ ہوں اور ان کا خوشامدانہ رویہ حصولِ منفعت ہی کے لیے رہا ہو لیکن بکثرت ایسی مثالیں بھی ملتی تھیں جہاں مقربین و متسلکین دامنِ دولت اپنی جانیں نثار کرنے کے لیے پُرخلوص طور پر آمادہ رہتے تھے اور اُن میں سے بعض نے ایسا کر بھی دکھایا تھا۔ لہٰذا چند لوگوں کی بیراہ روی کے معیار پر پورے سماج کو تولا نہیں جا سکتا۔ حقیقتاً امر یہ بھی کہ وہ دور ایک طبقہ میں دولت و ثروت کی فراوانی کا تھا اور اس طبقہ کے لوگ مرد ہوں یا عورتیں انسانوں کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے۔ غریبوں اور مفلوک الحال مردوں اور عورتوں کی کفالت کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔ اسی جذبہ کے تحت مرد اور عورت ملازمین کی محل کے اندر اور باہر بکثرت رہا کرتی تھی۔ مستحقین کی ان کی انفرادی اہلیت اور صلاحیت کے مطابق کفالت ہوتی تھی جس کا طریقہ ملازمت کی شکل میں ہوا کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ دولت کی فراوانی کے پیدا کردہ عیوب تھے مگر محل کے اندر زیورات و جواہرات کی جگمگاہٹ اور باہر سرکاری ماہی مراتب اور دوسرے سامانِ عظمت و جبروت کی نمائش اس پُرانے اصفہانی احتشام کی جھلملاتی ہوئی شمعیں تھیں جن کی روشنی میں فرمانروایانِ اودھ نے اپنے رائج کردہ معاشرہ کی جلا بخشی فرمائی تھی۔ حوادثاتِ روزگار کی آندھیوں میں وہ شمعیں گل ہو گئیں لیکن یہ بات اب بھی کہنے میں آتی ہے کہ ہمارے اسلاف شرافت و انسانیت کے پیکر اور مکارم اخلاق کا مجسمہ تھے۔ وہ لوگ انتہائی سادہ دلی سے پاکیزہ اور معصومانہ زندگی بسر کر گئے، ان کا دامن خیال کبھی کبھی فتنہ و فساد، ظلم و جور اور ناانصافی و انسان دشمنی کی غلاظت سے آلودہ نہیں ہوا تھا۔ مال و دولت کے تباہ و برباد ہو جانے پر اہلِ بصیرت افسوس نہیں کریں گے لیکن بلندیٔ کردار کا پست ہو جانا یقیناً ایک افسوسناک اور عبرتناک حادثہ ہے۔ اب نہ ویسے رئیس ہیں اور نہ ویسی

بیگمات جو آسمان داد و دہش کا گوشوارہ تھیں۔

## (۴) بیگمات کا ذوق و شوق

ذوق و شوق کا معاملہ انفرادی ہے لیکن انسانوں کی فطرت میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہوتی ہے اس لیے ایک ہی ذوق و شوق کے بہت سے افراد مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ہی طرز کے ماحول میں تربیت یافتہ افراد کا ایک ہی مذاق بن جانا بھی قرین فطرت ہے۔ لکھنؤ کی بیگمات دولت و ثروت کے آغوش میں پروان چڑھی تھیں۔ ان میں ذاتی رجحانات کے علاوہ ایسے احساسات بھی تھے جو سرمایہ دارانہ ماحول کے پیدا کردہ اور ان کے طبقہ میں مشترک خصوصیات کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان مشترکہ خصوصیات کو اس لیے اور زیادہ نمایاں اہمیت تھی کیونکہ اُن کے حامل افراد کا تعلق اس طبقہ سے تھا جن کے ایجادات و اختراعات کی بدولت سماج میں بہت سی نئی نئی چیزوں اور روایتوں کی تخلیق ہوئی تھی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر ہم ذیل میں بیگمات کے ذوق و شوق سے متعلق صرف انھیں باتوں کا تذکرہ پیش کرتے ہیں جو قریب قریب تمام عظیم المرتبت مخلوق میں مشترک تھیں اور جن کا ہر محترمہ کو ذوق و شوق تھا۔

اس ذیل میں بہت سے پہلے اُن کے ذوقِ علم و ادب کا خیال ہمارے دماغ میں آ جاتا ہے۔ اُن کا یہ ذوق کسی دوسرے مقصد سے وابستہ نہیں تھا بلکہ علم برائے علم ان کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ بیگمات بڑے انہماک سے کتابیں پڑھتی تھیں، ان سے افادہ حاصل کرتی تھیں جس سے ان کی ذہنیت کو فروغ ہوتا تھا لیکن وہ اپنے علم کو نہ دوسروں پر مسلط کرتی تھیں اور نہ اس کا بلاضرورت مظاہرہ کرتی تھیں۔ زبان و بیان میں صحت اور محاوروں کو بول چال میں ٹھیک موقع اور محل سے استعمال کرنے کی سختی کے ساتھ پابند تھیں۔ شاعری سے بے پناہ ذوق تھا، بہت سی بیگمات شاعرہ تھیں لیکن مشاعروں میں شرکت کرنے کا ان کے لیے سوال ہی نہیں تھا۔ وہ اپنا کلام بالاعلان شائع کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان میں بعض ہستیاں بہترین انشاپرداز تھیں لیکن یہ خطوط صرف والدین، بھائی، شوہر یا اولادِ اکبر کو لکھے جاتے تھے۔ اتفاقات کی بدولت کوئی بیگم خوش نویس نہیں تھیں جس کی وجہ یہ تھی کہ محلوں میں لڑکیوں کو پڑھوایا جاتا تھا لیکن زیادہ تر لکھنا سکھانا ممنوع تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد وہ از خود لکھنا سیکھ لیتی تھیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ باوجود علم و فضل کے ان کو اپنی علمی قابلیت اور زبان دانی

کے جوہر دکھانے کا کوئی مواقع حاصل نہیں تھے۔ ان کا سماج نیم تعلیم یافتہ عزیز عورتوں اور ناخواندہ ملازماؤں تک محدود تھا۔ ایسے ماحول میں اپنی زبان کو کندن بناتے رکھنا یقیناً ان کا کارنامہ تھا کیونکہ انھیں کی زبان مثال میں پیش کی جاتی تھی جس کو صیقل پانے کا کوئی بہانہ نہیں ملا۔ اپنی ہم رتبہ اور اپنی ایسی قابلیت والی مستورات سے ملاقات کے بہت کم مواقع ملتے تھے لیکن جب مل جاتے تو ایک دوسرے سے یقیناً تبادلہ خیالات اور اکتساب کر لیتی ہوں گی۔ شادی بیاہ نیز دوسری تقریبات میں عدیم الفرصتی مانع رہتی تھی۔ البتہ اپنے گھر کی مخصوص ضیافتوں میں نیز مجالسِ عزا کے زمانہ میں علمی موضوعات پر ضرور گفتگو ہو جاتی تھی۔ مجالس میں بیگمات سوز خوانی یا نوحہ خوانی خود نہیں فرماتی تھیں اور نہ ان کو باوجود شعریت سے وابستگی کے نغمہ کا کوئی ذوق تھا لیکن مرثیہ بحیثیت ادبی شاہکار کے ان کو بہت مرغوب تھا۔ بعض جلیل القدر ہستیاں زنانی مجالس میں خود ہی مرثیہ پڑھتی تھیں۔ راقم کی والدہ محترمہ بہت اچھا مرثیہ پڑھتی تھیں لیکن انیس کے علاوہ اور کسی کا کوئی مرثیہ انھوں نے کبھی نہیں پڑھا۔ اس کے علاوہ اُن کو ایک یہ بھی شوق تھا کہ وہ جو مرثیہ پڑھتی تھیں اس کے منتخب بند جو پڑھنا ہوتے خود اپنے ہاتھ سے علیحدہ لکھ لیتی تھیں اور اپنا لکھا ہوا حصہ پڑھ دیا کرتی تھیں۔ علم و ادب، شعر و سخن اور زبان و بیان سے بیگمات کی پُرخلوص وابستگی ثابت کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا کہ اُن کے معمولاتِ زندگی میں اس شوق کو پورا کرنے کے لیے پابندیٔ اوقات زندگی بھر رہتی تھی جو کسی دوسرے ذوق کو کبھی نصیب نہیں ہوتی تھی یعنی یہ کہ صبح کے ناشتہ کے بعد ہمیشہ پڑھنے لکھنے ہی پر وقت صرف کیا جاتا تھا جس میں کبھی کسی دوسری ضرورت پر توجہ مبذول نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے مشاغل کے لیے یہاں تک کہ کھانا کھانے تک کا کوئی وقت معین نہیں تھا۔

آرائش و زیبائش کا شوق صنفِ نازک کی فطرت میں داخل ہے اور آرائش و زیبائش کا وسیلہ زیورات ہوتے ہیں۔ غریب سے غریب عورت کا بھی دل چاہتا ہے کہ سونا نہ سہی چاندی ہی کا زیور مل جائے۔ حوصلہ مندی زیادہ ہو تو زیورات میں بہتات کی خواہش ہوتی ہے۔ اس فطری رجحان کے تحت بیگمات میں ذوقِ آرائش کوئی خاص بات نہ تھی۔ اور وہ دولت و ثروت کی فراوانی سے ہر طرح کا زیور بہتات میں حاصل بھی کر سکتی تھیں۔ رؤسا کے "خزانوں" میں سونے اور چاندی کی اینٹیں فراہم رہتی تھیں۔ عندالضرورت انھیں کو زیورات یا دوسرے اشیا بنوانے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ عوام کی مستورات میں اپنی اپنی حیثیت کے مطابق

سونے کے زیور رائج تھے اور وہ بہ یک وقت جسم کے ہر حصہ پر ایک سے زیادہ طلائی زیور پہن لیتی تھیں۔ سونا اس زمانے میں گراں نہیں تھا اور معمولی انسان بھی تھوڑی زحمت اٹھا کر اپنی اہلیہ کے لیے سونے کی کوئی نہ کوئی زیور بنوا دیتا تھا۔ سونا ہی اصل زیور سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی کا ازدیاد آرائشِ جمال کا عوام میں وسیلہ قرار پا گیا تھا۔ چنانچہ ایک وقت وہ آیا کہ ایک طلائی گوشہ جس میں بجلیاں، بالیاں اور گوشوارے بھی شامل تھے ایجاد ہوا اور اس کے ڈنکے پٹ گئے۔ کیونکہ عورت کو بجائے متعدد زیورات پہننے کے کان میں صرف یہی ایک عدد پہن لینا کافی تھا۔ اس "گوشہ" کے چرچے ہونے لگے اور بڑی بڑی تعریفیں ہوئیں۔ دفعتاً ایک رئیس کے محل سے یہ آواز بلند ہوئی کہ "بھاڑ میں جائے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان" معاً لوگوں کے تصور میں انقلاب آیا اور رفتہ رفتہ وہ زیور ہر حلقہ میں مسترد ہو گیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بیگمات کے نزدیک زر و جواہر سے زیادہ لطافت و نزاکت کو اہمیت تھی۔

زیورات بنوانے میں بھی بڑی بڑی نزاکتوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ بیگم کو جسم کے جس حصّہ کے لیے زیور تیار کرانا ہوتا پہلے اس کا خاکہ اور نمونہ تیار ہوتا تھا۔ کاغذ پر لکیریں بنا کر ڈوروں سے کجی اور جوڑ معین کیے جاتے پھر عورتوں میں جن جن کو صاحبِ فراست سمجھا جاتا اُن سے مشورہ ہوتا۔ بالآخر وہ نمونہ نواب کو حوالہ کیا جاتا جو بذاتِ خود یا کسی مخصوص کارندہ کے ذریعہ سُنار کو زیور بنانے کے لیے سپرد فرما دیتے تھے۔ وہ مرحلہ بہت سخت ہوتا تھا جب سُنار زیور بنا کر حاضر ہوتا اور نواب بیگم صاحبہ کی پسندیدگی کے لیے محل میں بھیج دیتے۔ بیگم کی دقیق نظر ہمیشہ کوئی نہ کوئی عیب نکال دیتی تھی جس کو دور کرنا سنار کا فرض ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ جڑے ہوئے نگینوں کا اتصال اس لیے پسند نہ آتا کہ اُن کے مختلف رنگوں کی ایک دوسرے سے قربت مکروہ نظر آتی تھی۔ ایسی صورت میں صناع کو اپنی ساری محنت رائیگاں سمجھ کر ازسرِ نو کام کرنا پڑتا تھا۔ یہ کارگزاری پھر بھی سہل تھی۔ سادہ کاروں کو کبھی کبھی بے انتہا مصیبت جھیلنا پڑتی تھی جب بیگم صاحبہ اپنی کسی دوسری ہم مرتبت بیگم کا زیور اپنی ترمیم کے ساتھ نمونتاً دوسرا زیور بنانے کی فرمائش کرتی تھیں۔ ہوتا یہ تھا کہ شادی بیاہ کی تقاریب میں کسی عالی مرتبت بیگم کا کوئی زیور کسی رئیس کی بیگم کی نظر پر چڑھ جاتا تھا تو وہ اس عدد کو کسی نہ کسی ترکیب سے عاریتاً منگوا لیتی تھیں اور اس میں اپنی جدت آرائی سے شانِ امتیاز پیدا

کر کے وہی عدد بنواتی تھیں۔ سنار اور سادہ کار کے لیے شانِ امتیاز پیدا کرنے میں زحمت اس لیے ہوتی تھی کہ اس کو بیگم کے حسب منشا شانِ امتیاز پیدا کرنا پڑتی تھی اور بیگم کا براہِ راست منشا حاصل کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ایسے زیورات متعدد بار بنوائے اور کھلوائے جاتے تھے یہاں تک کہ منشا و مرضی کے مطابق چیز تیار ہو جائے۔ بیگمات تقاریب میں ہمیشہ اور گھروں میں بھی زیادہ تر جڑاؤ گہنے پہنتی تھیں لیکن جدت اور لطافت و نزاکت کے ذوق کی آسودگی کے لیے کبھی کبھی سادہ چیزیں بھی بنوائی جاتی تھیں مگر ان کو چند روز تک شوق پورا کرنے کے لیے گھروں میں پہنا جاتا اور بعد میں کسی منظورِ نظر خادمہ کو بخش دیا جاتا تھا۔

بلند پایہ بیگمات میں زیورات پہننے کا بھی ایک اسلوب تھا۔ جتنے بڑے گھرانے میں ان کو جانا ہوتا اسی مناسبت سے وہ قیمتی سے قیمتی زیور استعمال کرتی تھیں اور اس میں بھی یک رنگی ضروری تھی یعنی یہ کہ ہیرے کا زیور پہنا تو سارے جسم پر ہیرے ہی کے جڑاؤ زیور ہوتے تھے یا ایسے زیور پہن لیے جاتے تھے جن کے جڑاؤ نگینوں کو ہیرے سے مناسبت ہو مثلاً موتی یا نیلم' ہیرے کے ساتھ عقیق' فیروزہ بلکہ زمرد بھی پہن لینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مناسبت رنگ اتنی زیادہ مدِنظر تھی کہ سونے کے زیورات کے پہلو میں چاندی کا کوئی دوسرا عدد جو اسی طرح کا جڑاؤ ہو پہن لینا جائز تھا۔ بعض بیگمات چاندی کے زیورات میں ہیرے کے نگینے جڑوانا ہی پسند کرتی تھیں۔ ان کو چاندی پر اور کوئی رنگ مرغوب ہی نہیں تھا۔ چاندی کے ایسے قیمتی اور خوبصورت زیور صرف پیروں میں استعمال ہوتے تھے۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ ایسی بڑے گھرانے والی تقریبات میں بیگمات کو نقصانات بھی اٹھانا پڑتے تھے۔ ان کے جسم سے کسی نہ کسی طرح زیور کھل کر یا علیحدہ ہو کر گر جاتا اور عموماً پھر کبھی نہیں ملتا تھا کیونکہ ایسی محفلوں میں بڑی اور چھوٹی ہر حیثیت کی عورتیں کھچا کھچ بھری رہتی تھیں اور اتنا قیمتی زیور جو پا جاتی وہ اس کو اپنی خوش نصیبی ہی سمجھتی تھی۔ ان پانے والیوں میں نیچے طبقہ کی عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ بلند مرتبہ بیگمات کو اتنی فکر کہاں ہوتی تھی کہ وہ راہ چلتے زمین کا جائزہ لیتی رہیں۔ اسی ذیل میں اپنے خاندان کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ برادر مرحوم جعفر علیخاں اثر کی بڑی صاحبزادی کی شادی میں میری خوش دامن مرحومہ یعنی اثر کی ہمشیرہ پیروں میں ہیرے جڑی ہوئی نقرئی پازیب پہن کر تشریف لے گئی تھیں۔ دوسرے روز شام کو واپسی پر ایک پیر میں پازیب نہیں تھی۔ متعدد کنیزیں اور معتبر ملازمائیں تلاش کے لیے بھیجی گئیں۔ اثر مرحوم کی اہلیہ نے

پنے یہاں کی متعدد عورتیں اس کام پر مامور فرمائیں لیکن کھوئی ہوئی چیز دستیاب نہیں ہوئی اور دوسرے روز یہ سانحہ قصۂ پارینہ کی طرح فراموش ہو گیا البتہ کبھی کبھی اس مجبوری پر ضرور تاسف کیا جاتا تا کہ اتنی تعداد میں ویسے ہیرے ملنا اور اسی طرح کی پازیب کا دوسرا عدد بن کر جوڑ تیار ہو جانا محال تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ بیگمات اپنے جسم کے زیورات پر خود نظر نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی محافظت ان کنیزوں اور مہریوں کا فرض ہوتا تھا جو ہمراہ جاتی تھیں۔ اگر انھیں ملازماؤں سے غفلت سرزد ہو جاتی تو خاموشی کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

بیگمات کو ذوقِ آرائش سے مقابلتاً شوقِ لباس بھی کچھ کم نہ تھا۔ ان کے توشک خانے ملبوسات سے بھرے پڑے رہتے تھے۔ موسم کی آمد بالخصوص گرمیوں کی آمد پر نئے کپڑے بنتے تو کبھی بغیر پہنے ہوئے کپڑے بھی تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ نئے کپڑے سلوانے کے قبل کئی کئی دن تک بزازوں سے نئی نئی طرزوں کے نمونے منگوائے جاتے تھے۔ بزاز تھانوں سے ایک ایک چھوٹا ٹکڑا کاٹ کر بھیج دیتے تھے لیکن اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ ٹکڑا اتنا چھوٹا نہ ہو کہ وضع کا پوری طرح اندازہ نہ ہو سکے۔ وہ دور رنگینی کا تھا۔ سفید اور سادے کپڑے پست طبقہ کے عوام بھی مجبوراً پہنتے تھے۔ بیگمات کپڑا پسند کرتے وقت اپنے اسٹاک کی پوری حالت پیشِ نظر رکھتی تھیں۔ تا کہ ایک ہی وضع کے کپڑے کی دوبارہ خریداری نہ ہو۔ رنگیں اور پھولدار وضع کا کپڑا قریب قریب ہر رئیس کے یہاں پسند کر لیا جاتا تھا البتہ کہیں بڑے اور کہیں چھوٹے پھول قابلِ قبول ہوتے تھے۔ پھولوں کے ساتھ بیلدار وضع کو افضلیت حاصل تھی۔ جاڑوں کے موسم میں اطلس کے پائجامے اور مخمل و کمخواب کے شلوکے بیگمات کا عام لباس تھا۔ اس مقام پر یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ متذکرہ بالا خصوصیات پر پورا اترنے والے کپڑوں کی خریداری میں بھی بڑی لیت و لعل ہوتی تھی اس لیے کہ بیگم کی باریک بیں نظر ایک ایک نوک پلک کا بار بار جائزہ لے کر اپنی رضامندی کا اظہار فرماتی تھیں۔ زیورات کی طرح لباس میں بھی کبھی کسی دوسرے کا کوئی ملبوس پسند آجاتا تو اس میں بھی امتیازی شان تلاش کر کے ویسا ہی کپڑا تلاش کرایا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ سال میں دو مرتبہ کپڑوں کی خریداری کا مرحلہ درپیش ہوتا اور طویل مدت کے بعد قطعی فیصلے ہوا کرتے تھے۔ یہ طوالت اس لیے اور زیادہ ہو جاتی تھی کہ بیگم صاحبہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی کپڑے خریدے جاتے تھے۔

زنانے اور چھوٹے بچوں کے کپڑے محل کے اندر ہی سیئے جاتے تھے۔ اس کام کے لیے مغلانیاں ملازم ہوتی تھیں جو بیگم صاحبہ کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتی تھیں محلوں میں لڑکیوں کو بچپن ہی میں کپڑا سینے اور کھانا پکانے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم صرف ابتدائی اصول سکھانے تک محدود رہتی ہوگی لیکن ذہانت و ذکاوت اور کپڑے سلوانے کے تجربوں کی بدولت بیگم صاحبہ کو ہدایات دینے کا ملکہ ہوتا تھا۔ پھر اپنے ذوق وشوق اور اپنے جمالیاتی مذاق کے سہارے دوسروں سے کام لینے کا سلیقہ پوری طرح آجاتا تھا۔ بیگم صاحبہ کی ہدایات اور نگرانی میں کپڑے سلتے تھے۔ مونڈھے کتنے کسے ہوئے ہوں، کمر کتنی ڈھیلی ہو، گریباں تنگ نہ ہونے پائے، پائجاموں کی کلیوں میں بے تکا جوڑ نہ ہو۔ یہ تمام مشورے بچوں کے لباس سے متعلق ہوتے تھے۔ جہاں تک خود بیگم صاحبہ کے ملبوس کا معاملہ تھا بہت کچھ مغلانی کی سمجھ پر بھروسہ ہوتا تھا اور سینے کے درمیان متعدد بار جانچ بھی ہو جاتی تھی لیکن اس تمام نگہبانی اور دیکھ بھال کے باوصف مغلانی کو کبھی کبھی سلائی کھول کر کپڑوں کو دوبارہ سینا ہی نہیں پڑتا تھا بلکہ از سر نو کتر بیونت بھی ہوتی تھی۔ بالآخر اگر تیار شدہ ملبوس بیگم صاحبہ کی پسندِ خاطر نہ ہوتا تو اس کا مسترد ہونا بھی ضروری تھا۔ جاڑے کے کپڑوں میں ایسے نقص کم ہوتے تھے کیونکہ مخمل و کمخواب میں پھول پتی سے پتی ملانے کا کوئی سوال نہیں ہوتا تھا لیکن گرمی کے کپڑوں میں اگر کتر بیونت کے وقت کوئی خامی رہ جاتی تھی تو اس کو دور کرنا بہت مشکل تھا اور بیگم کی نازک مزاجیاں کسی معمولی سے معمولی نقص کو گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔

غذاؤں کے سلسلے میں بھی انسانوں کا خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں انفرادی ذوق ہوتا ہے۔ ایک خاندان میں بھی سب افراد کا ذائقہ طعام کلیتاً یکساں نہیں ہوتا۔ کسی کو نمک تیز پسند ہوتا ہے تو کوئی پھیکا کھانے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ کوئی مرچ بہت کھاتا ہے تو کوئی کم۔ لیکن ایک خاندان کا کھانا چونکہ ایک ساتھ پکتا ہے اس لیے تمام شرکا خاندان اپنا ذائقہ اسی مشترک خاندان کے طعام سے سازگار بنا لیتے ہیں۔ رؤسا کے دسترخوان پر خواہ وہ باہر کا دسترخوان ہو یا محل میں بیگم صاحبہ کا ہو یہ اہتمام رہتا تھا کہ ہر شخص اپنے ذائقہ کو بھی آسودہ کر سکے اس لیے ایک تشتری میں باریک پسا ہوا نمک، دوسری میں مہین پسی ہوئی گول مرچ اور تیسری جگہ ہری مرچیں موجود رہتی تھیں۔ بیگمات عموماً ہری مرچیں ضرور کھاتی

تھیں اور بہت کھاتی تھیں اس لیے زنانے باورچی خانے میں جو کھانے پکتے تھے ان میں باورچی کی پکائی ہوئی غذاؤں کے مقابلے میں زیادہ مرچ ہوتی تھی۔ جو رئیس زیادہ مرچ کھانا پسند کرتے تھے وہ اپنے محل میں تیار کردہ غذاؤں پر زیادہ توجہ فرماتے تھے جس کو باہر کے لوگ بیگم سے فرطِ نسبت پر محمول کرتے تھے حالانکہ صورتِ حال کچھ اور ہی ہوتی تھی۔ زنانے باورچی خانے میں بچوں کے لیے بے مرچ یا کم مرچ کی غذائیں پکنے میں علیحدہ کر لی جاتی تھیں۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ کے ذوق کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ بیگم صاحبہ پھر بھی خاصہ نوش کرتے وقت تیار شدہ غذاؤں پر نکتہ چینی فرماتی رہتی تھیں جس کی تعمیل کرتے رہنا پکانے والی کا فرض ہوتا تھا۔ اسی طرح کھانا پکانے کے بارے میں ایک سلسلِ درس و تدریس کا سبق جاری رہتا تھا۔ یہ صورتِ حال مردانے دسترخوان پر شاذ و نادر ہی نمودار ہوتی تھی۔

غذاؤں کو خوش ذائقہ ہی نہیں خوش رائحہ بھی ہونا چاہیے تھا اور سب سے پہلے اُن کے آب و رنگ پر نظر پڑتی تھی۔ ان میں سے کسی صفت میں نقص ہوتا تو بیگم صاحبہ کو تکلیف ہو جاتی تھی لیکن اس تکلیف کا اظہار بڑی شائستگی سے ہوتا تھا مگر وہ شائستہ اظہار بھی سارے نظام کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ خود اپنے گھر کا راقم پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہے۔ ایک مرتبہ دفعتاً کھانا پکانے والی کو رخصت لے کر جانا پڑ گیا تھا اور اس کا کام اُسی کے نیچے کام کرنے والی دوسری عورت کے حوالہ ہو گیا۔ دسترخوان پر کھانا لگایا گیا تو والدہ مرحومہ نے ہر پلیٹ کو ہاتھ لگانے سے اجتناب کیا اور یہ فرمایا کہ "دھوئیں کی بو ہے"۔ وہ وقت تو ٹل گیا لیکن دوسرے وقت بھی یہی شکایت ہوئی۔ اب گھر میں تلاطم تھا جس کو فرو کرنے کے لیے سایہ کے قریب جب کھانا پک رہا تھا والدہ مرحومہ اپنے کمرے سے نکل کر ٹہلتی ہوئی باورچی خانہ کے قریب تشریف لے گئیں اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہو کر باورچن کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے بوا! لکھٹیاں باہر جل رہی ہیں، دھواں پتیلیوں میں جا رہا ہے، ان کو اندر کر دو تاکہ دھواں آونلوں میں ہو کر باہر نکل جائے"۔ اس ہدایت پر فوراً عمل ہوا اور غذاؤں میں دھوئیں کی بو آجانے کا عیب دور ہو گیا۔ بیگمات کو کھانا پکانے کے فن کو اچھی طرح سمجھ لینے کا ذوق تھا اور وہ ایک طرف اپنی نازک مزاجی سے عیب نکالتی تھیں تو دوسری جانب متانت و شائستگی سے اس کو دور کرانے کی اس طرح فکر کرتی تھیں کہ کسی کو بُرا معلوم نہ ہو اور مطلب برآری بھی ہو جائے۔ طعام کے سلسلہ میں ہر نقص سے پاک غذاؤں کا ذوق و شوق عادت میں داخل تھا۔

بعض خانوادوں میں بیگمات کو تعمیرات کا بڑا ذوق تھا۔ اس ذوق کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسرے تیسرے چھینے پورے محل کا جائزہ لیتی تھیں۔ کھپریل والے حصہ مکان کے عقب یا پہلوؤں میں بھی اور چار دیواری سے متصل صحن خالی پڑے رہتے تھے۔ یہاں ملازمائیں اور کنیزیں آزادانہ ایام گزاری کرتیں اور راتوں کو گرمیوں کے زمانے میں سوتی تھیں۔ بیگمات اس سمت کبھی توجہ نہیں فرماتی تھیں مگر وہ محذرات جو محل میں کچھ نہ کچھ تغیر و تبدل ہوتے رہنا پسند کرتی تھیں ان علاقوں میں بھی کبھی کبھی قدم رکھتی تھیں۔ چنانچہ گھسیاری منڈی کے نواب شفیع علیخاں المعروف بہ نواب مڈھن صاحب کی بیگم صاحبہ نے ایک ایسے ہی صحن میں محل کی چار دیواری سے متصل ایک دراندہ نما سائبان کھپڑوں کا بنوایا تھا۔ کھپریلوں کے دو بالمقابل تعمیرات بہت پہلے معلوم ہوتے تھے۔ جدید تعمیر کی جوڑائی کم تھی اس لیے ہوا کا گزر بھی خوب ہوتا تھا اور ملازماؤں وغیرہ کو بہت زیادہ لطف و آرام میسر آگیا تھا۔ بیگم صاحبہ کے پیشِ نظر صرف ایک دیدہ زیب تعمیر کرا دینا تھا۔ محل کے اُن بلند پایہ تعمیرات پر جس حصّہ میں وہ خود رہتی تھیں ہمہ وقت توجّہ رہتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی اس کمرہ کا نیا فرش بنتا تو کبھی اس کمرہ کی دیواروں پر نیا پلاسٹر چڑھایا جاتا، کبھی کبھی نیا کمرہ معرضِ وجود میں آتا تو کبھی پرانی عمارت منہدم کرا دی جاتی تھی۔ اس ذوق و شوق کو پورا کرنے میں خود اپنی خوابگاہ بھی کبھی کبھی بدلنا پڑتی تھی۔ کنیزوں اور خادماؤں کے لیے وہ وقت بہت سخت ہوتا تھا جب پورا توشک خانہ ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری میں منتقل کرنا پڑتا تھا۔ بیگم صاحبہ کو خود بھی طرح طرح کی زحمتیں اٹھانا پڑتی تھیں لیکن وہ اُن کو جدید عمارت میں اقامت کا ذوق پورا کرنے کے لیے گوارہ کرتی تھیں۔ یہ سمجھ لینا کہ کوئی کام نہیں ہوتا تھا اس لیے کچھ کرتے رہنے کا جذبہ یہ سب کچھ کراتا تھا صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ رئیسوں کی طرح بیگمات کے طبائع بھی تنوع پسند تھے۔ کمرہ از سرِ نو تعمیر ہوتا یا اس کی از سرِ نو تجدید ہوتی۔ ہر حال میں اس کی آرائش و زیبائش نئے طرز پر کرنا پڑتی تھی۔ کبھی کبھی سامانِ آرائش بھی بدل جاتا تھا، کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا بہر حال ضروری تھا۔ بسا اوقات یہ تبدیلیاں توہم پرستی کا بھی نتیجہ بھی ہوتی تھیں۔ ہر بات میں سعد و نحس کا تصور کارفرما رہتا تھا۔ وہی کمرہ جس میں برسوں سے اقامت ہوتی دفعتًا اتنا ناقص ہو جاتا تھا کہ لمحہ بھر بھی قیام کرنا قابلِ برداشت نہیں ہوتا تھا۔ جدید مقام پر منتقل ہونے میں تاخیر ہوتی تو اس اثنا میں دھونی، صدقوں، دعاؤں اور تعویذوں کی بھرمار ہو جاتی تھی۔ یہ صورت حال اپنی اور بچوں کی اقامت والے کمروں کے سلسلہ میں بہت زیادہ پیش آیا کرتی تھی کبھی

کبھی کسی بھوت یا خراب روح کا ان کے واہمہ میں اتنا اثر نظر آتا تھا کہ کمروں کی زمین کھدوا کر فرش بھی از سر نو بنتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس ذوق و شوقِ تعمیرات کے محرکات بہت ہوتے تھے اور جو محرک جتنا قوی ہوتا ہی اتنا ہی سرعت سے نئی تعمیر مکمل ہو جاتی تھی۔

بیگمات کا وہ ذوق جس سے دوسرے بھی لطف اندوز ہوتے تھے اُن کا طرزِ کلام اور موثر گفتگو ہوتی تھی۔ بیگمات کی زبان اور ان کا لب و لہجہ ضرب المثل تھا جس سے بہرہ مند ہونا صرف انھیں مستورات کے مقدر میں تھا جن کو ان سے قربت رہتی تھی یا پھر ان مردوں کی خوش بختی کا حصہ تھا جو بیگمات کے سامنے ہوتے اور ان سے بات کرنے کے مواقع رکھتے تھے۔ بیگمات کی گفتگو میں قصوں اور کہانیوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا گھر والوں سے موضوعات کلام میں زیادہ تر محاسنِ اخلاق پر تبصرے ہوتے یا کسی گھریلو کار آمد معاملے یا سلسلے پر بحث چھڑ جاتی تھی۔ ایسی بحثوں میں لباس وطعام کے ضروریات پر چند لفظوں سے زیادہ کچھ کہنا بیحد معیوب تھا۔ جو بحثیں ہوتی تھیں اُن میں فلسفیانہ یا منطقی دلائل کے بجائے شاعرانہ طرز رہتا تھا۔ بیگمات کی گفتگو میں تشبیہوں، استعاروں، رموز و کنائے اور حسن تعلیل کی مثالیں بہت گراں قدر اور بہتات کے ساتھ ملتی تھیں۔ راقم کو اپنے خاندان کی بیگمات سے گفتگو کرتے میں ایسے بہت سے الفاظ کے مفہوم و مطالب معلوم ہوتے تھے جن کا کوئی تذکرہ لغتوں میں نہیں تھا۔ ایک مرتبہ برادر مرحوم جعفر علیخاں اثرؔ "نکٹورا" کا صحیح استعمال اور صحیح مفہوم جاننے کے لیے پریشان تھے۔ ہم دونوں نے کافی وقت کتابوں کی ورق گردانی میں صرف کیا لیکن مطلب برآری نہیں ہوئی۔ حُسنِ اتفاق کہ دستر خوان بچھنے کا وقت آ گیا، اثرؔ مرحوم کی اہلیہ نے ایک کنیز کو مخاطب کر کے جو کھانا لگا رہی تھی فرمایا کہ "کمبخت تو اپنے نکٹورے نہ چھوڑے گی"۔ ہم لوگ فوراً اُن کی جانب متوجہ ہو گیے تب انھوں نے کہا کہ اس لفظ کے معنی ہیں غمزۂ بیجا اور اس کا استعمال ایسی ہی موقعہ پر ہوتا ہے جہاں انھوں نے بولا تھا۔

بیگمات کو باتیں کرنے کا عام طور سے بہت کم موقع ملتا تھا لیکن جب مل جاتا تو مسلسل باتیں کرتی تھیں۔ سننے والے بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔ موضوعِ سخن کار آمد ہو یا نہ ہو لیکن زبان و بیان کی شیرینی متوجہ کر لینے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ عزیزوں اور ملاقاتیوں سے شعر و ادب پر زیادہ گفتگو رہتی تھی اور جب رؤسا کی دولت و ثروت پر زوال آنے لگا تھا تو منڈلاتی ہوئی فلاکت پر بھی مایوسانہ باتیں زبان سے نکل جاتی تھیں لیکن ایسی گفتگو کا سلسلہ دیر تک نہیں چلتا تھا۔ آپ یہ سمجھیں کہ دولت کی فراوانی نے انجام بینی کی صلاحیت مفقود کر دی تھی یا یہ کہ ان کی فطری رجائیت

ان کی بصیرت کو مفلوج کردیتی تھی۔ صورتِ حال جو کچھ بھی ہو اُن کو اس کا وہم بھی نہیں تھا کہ رؤسا کی دولتیں اور اُن کا سارا جاہ و اقتدار مائل بہ زوال ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ معاشرہ کا معاشرہ فنا کے گھاٹ اُتر جائے گا۔ یہ بات بہر حال کہنے میں آتی ہے کہ تباہی و بربادی کی آخری منزل تک بیگمات میں ذوقِ علم و ادب اور ذوقِ خیر و خیرات زائل نہیں ہوا۔ دولتیں لٹ جانے کے بعد بھی یہ شوق پوری تابانی کے ساتھ برقرار رہے تھے۔

رؤسا و عمائدین کا یہ کہنا تھا اور ان کا عمل بھی یہی تھا کہ کسی کی دستگیری کی جائے تو اس کارِ خیر میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی خبر نہ ہو۔ وہ لوگ صاحبانِ حاجت کا وقار برقرار رکھنے کے قائل تھے۔ جن لوگوں کی دستگیری کی جاتی تھی ان میں اکثریت شرفائے لکھنؤ کی تھی اس لیے اُس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ سلوک قبول کرنے میں کسی کی سُبکی نہ ہو۔ بیگمات کا بھی یہی نکتۂ نگاہ تھا لیکن ان کی داد و دہش صیغۂ راز میں نہیں رہ سکتی تھی اس لیے کہ ان کے یہاں نقد کی صورت میں احسان کرنے کے بہت کم مواقع آتے تھے۔ جن عورتوں کو روپیہ دینا ضروری قرار پاتا ان کے لیے احکامات رئیس کے توسل سے خزانچی کو بھیج دیے جاتے تھے اور ادائی انھیں کی معرفت ہوتی تھی۔ محل کے اندر برابر جود و کرم کا سلسلہ جاری رہتا لیکن یہ عنایتیں جنس کی شکل میں ہوتی تھیں۔ کپڑے کثرت سے تقسیم ہوتے تھے ان میں کبھی کبھی مسلّم تھان بخش دیے جاتے۔ بہت سی خوش نصیب عورتوں کو طلائی و نقرئی سادہ زیور بھی مرحمت ہو جاتا تھا۔ ان عطایا کی مستحق گھر کی ملازمہ عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان مواقع پر کبھی کبھی آپس میں رشک کے باعث چشمکیں ہوتی تھیں اور کبھی کبھی باہمی رنجشیں شدّت اختیار کرلیتی تھیں۔ بیگم صاحبہ بذاتِ خود حالات کا جائزہ نہیں لیتی تھیں لیکن محل کا نظام کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ ان کو ہر چھوٹی بڑی بات کی اطلاع ضرور ہو جاتی تھی۔ محل میں ہر ایک کو بیگم سے خلوص تھا اور عزیز عورتوں کے علاوہ بھی عملہ کی قریب قریب ہر عورت اتنی رفیق اور وفا شعار تھی کہ باہمی رقابتوں کا حال کسی نہ کسی کی زبانی بیگم صاحبہ کو معلوم ہو جاتا تھا۔ ایسی شکر رنجیوں سے واقفیت حاصل ہوتے ہی وہ خود فضا کو سازگار بنا لیتی تھیں۔ اس طریقِ کار میں ان کی خوش گفتاری اور طرزِ دلجوئی جادو کی طرح کارگر ہو جاتی تھی۔ بیگمات حسنِ اخلاق کا مجسمہ تھیں اور اُن کی تعلیم اور سیرت کا اثر محل کی ہر چھوٹی اور بڑی عورت پر پڑتا تھا۔ آج ہم کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف کتنی کتنی جلیل القدر مخدرات تھیں جو اپنی اولاد کو درسِ اخلاقیات دے دے کر بلند کردار کا مالک بنا دیتی تھیں لیکن

آج انھیں کی اولاد نے ساری سابقہ تعلیم اس طرح بھلادی کہ عظمت کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا۔

## (۴) خانگی ماحول

رئیسوں کے محلوں میں جہاں چہل پہل، روشنی ورنگینی اور آرائش وزیبائش سے سارا ماحول گرم وسرشار رہتا تھا اسی کے ساتھ بیگمات میں ضبط وتحمل کا سکون واطمینان بھی اپنی مثال نہیں رکھتا تھا ہر عورت میں فطری طور سے رشک کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اپنی سوت کو دیکھ کر یا اس کے اوپر اپنے سوہر کی گرویدگی کا حال سُن کر بے قابو ہوجانا انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ لیکن ایسے مواقعات پر بیگمات کے ابرو پر نہ بل آتا تھا اور نہ ان کا مزاج برہم ہوتا تھا۔ تکلیف بھی ہوتی تھی تو اتنی بے پناہ ضبط کی صلاحیت تھی کہ دل کے کسی دکھ درد کا کبھی اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اس طرزِ عمل کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بیگمات شرافت میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اپنے شوہر کی وفاداری میں اپنی زندگی تج دینے پر بھی آمادہ رہتی تھیں۔ قریب قریب تمام رؤسا کسی نہ کسی طوائف سے وابستہ تھے۔ اسی وابستگی میں بعض کے جنسی تعلقات بھی جائز یا ناجائز طور پر پیدا ہوجاتے تھے جو دائمی یا قریب قریب دائمی ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں رئیس زیادہ تر شب باشی مردانہ نشست گاہ ہی میں کرتے تھے۔ بیگم کو اس صورتِ حال کی اطلاع ہوتی اور بسا اوقات طوائف کی تواضع کا سامان محل کے اندر سے تیار ہوکر جاتا لیکن بیگم کا مزاج کبھی برہم نہ ہوتا اور محل کے سکون واطمینان کی فضا بحال ہی رہتی تھی۔

طوائف بازی کے علاوہ تعدادِ ازدواج کا رسم بھی عام تھا۔ متشرع رئیس جس عورت کو آنکھ بھر کے دیکھتے اور وہ ان کو بھاجاتی تو پیام وسلام ہوکر نکاح یا متعہ ہوجاتا تھا۔ ایسی منکوحہ یا ممتوعہ عورتیں داخلِ حرم ہوجاتی تھیں اور بیگم ہونے کی فضیلت حاصل کرلیتی تھیں۔ ان کی سکونت کے لیے علیحدہ ایک جگہ تجویز ہوکر آراستہ وپیراستہ کردی جاتی تھی۔ ایسی مدخولہ عورت کے احکام بھی اندر وباہر کے تمام ملازمین پر واجب التعمیل ہوتے تھے۔ رئیس میں محبت کا جذبہ جب تک گرم رہتا وہ اسی عورت کے کمرہ میں شب باشی کرتے تھے۔ بیگم کی دل جمعی اور تسلّی کے لیے ایک وقت کا کھانا انھیں کے دسترخوان پر نوش کرلیتے تھے۔ بعض خانوادوں میں منکوحہ اور ممتوعہ دونوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کردیا جاتا کہ ہمہ وقت ایک ساتھ رہتی تھیں اور ایک ہی دسترخوان پر دونوں رئیس کے ہمراہ کھانا کھاتی تھیں۔ بیگمات

جو صورتِ حال امتیازی شان رکھتی تھی وہ بیگم اور ممتوعہ کے درمیان عظمت کا فرق تھا۔ ممتوعہ عورت بہرحال زوجۂ ثانیہ کا درجہ رکھتی تھی اور بیگم حقیقی عظمت و وقار کی مالک ہوتی تھی۔ وقتی طور پر رئیس کا رجحان زوجۂ ثانیہ پر کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو لیکن بیگم کے احترام میں کبھی فرق نہیں آتا تھا اور نہ کبھی اُن کے احکام سے کوئی سرتابی کر سکتا تھا۔ رئیس کو بھی بیگم کی خوشنودیٔ مزاج کی برابر فکر رہتی تھی اور وہ یہ کبھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ زوجۂ ثانیہ بیگم کی ہم پلّہ بن جائے۔ اُس کے ساتھ لطف و مدارا، انعام و اکرام اور ظاہرداری و دل جوئی کا برتاؤ تو ضرور ہوتا تھا لیکن بیگم کا وقار برقرار رکھنا رؤسا کا فرضِ عین تھا اور یہی برتاؤ ان کے ظاہری خوشنودیٔ مزاج کے لیے کافی ہوتا تھا۔

تعددِ ازدواج کی ضرورت کبھی کبھی ہوسِ اولاد میں بھی محسوس ہوتی تھی اور رئیس اسی ہوسناکی میں متعدد بیویاں رکھ لیتے تھے۔ ایسے گھرانوں میں بسا اوقات خاندان والوں کو روح فرسا تکالیف پہونچتے تھے، بیگم کے لیے بھی صبر و شکر کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا تھا اور اگر تعددِ ازواج کے بعد بھی اولاد نصیب نہیں ہوئی تو خانہ خرابی عبرتناک حد تک بڑھ جاتی تھی۔ یہ حالات اُن گھرانوں میں زیادہ رونما ہوتے تھے جہاں رئیس میں اعتدال برقرار رکھنے یا انصاف گستری کی صلاحیت نہیں ہوتی تھی، البتہ جہاں رئیس باکمال ہوتا تعددِ ازدواج کی صورت میں بھی خانگی ماحول میں سکون و اطمینان کی فضا برقرار رہتی تھی۔ اس ذیل میں غیروں کے گھروں کی داستانیں سُنانے کے بجائے میں خود اپنے خاندانی واقعات پیش کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ میرے نانا نواب حکیم شفا الدولہ کثیر دولت و ثروت کے مالک تھے۔ تین اضلاع میں جائدادیں تھیں اور شہر میں بڑے بڑے باغات تھے لیکن دولتِ اولاد سے (عالم شباب میں) یک لخت محروم تھے۔ اس ایک ہوس میں انھوں نے تعددِ ازواج کا فیصلہ کیا اور یکے بعد دیگرے نو محل تیار ہو گئے جن میں ایک میری نانی جن کا سلسلۂ نسب ایران کے کسی بادشاہ سے ملتا تھا ان کی پہلی اور منکوحہ بیگم تھیں اور باقی آٹھوں ممتوعہ ازواج تھیں اور ازواج کا مرحلہ برسوں جاری رہتا تھا یہاں تک کہ چالیس برس سے عمر تجاوز ہونے کے بعد تولد کا سلسلہ شروع ہوا اور منجملہ نو کے چھ بیویوں سے اولاد ہوئی۔ انھوں نے سو برس سے زیادہ کی عمر پا کر انتقال فرمایا تھا اور اس وقت بھی اُن کی ایک بیوی کے آغوش میں نومولود تھا۔ لیکن اس تعددِ ازواج اور کثرتِ اولاد کے باوصف ہمارے گھر کے ماحول کا توازن کبھی نہیں بگڑا کیونکہ نانا مرحوم بہت متقی، پرہیزگار اور متشرع تھے۔ وہ بیویوں

میں عدل قائم کیے ہوئے تھے یا قائم کرنے کے برابر کوشاں رہتے تھے۔ اُن کا محل قلعہ کی صورت میں بڑی بڑی دیواروں سے محصور تھا اور ہر طرف ہر بیگم کے گھر ایک دوسرے سے ملحق تعمیر تھے۔ درمیان میں ایک خوشنما بنگلہ تعمیر تھا جس میں وہ شب باشی فرماتے تھے اور باری باری ہر محل کی زوجہ اُن کی خدمت میں ہر روز حاضر رہتی تھی۔ اسی طرح نان ونفقہ اور مالی پیش کش میں بھی مساوات برتی جاتی تھی البتہ میری نانی کو منکوحہ بیگم کی حیثیت سے خصوصیت وعظمت حاصل تھی۔ وہ تمام ضوابط واحکام سے مستثنیٰ تھی اور ناناصاحب نے اپنے وصیت نامہ میں اپنے بعد کے لیے ان کا گزارہ بھی دوسروں کے مقابلہ میں دوچند مقرر فرمایا تھا۔

پھر بھی جنسی تعلق کے سلسلہ میں عورت فطری طور پر رشک وحسد میں مبتلا ہوتی ہیں اور کبھی بخوشی گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کا شوہر دوسری عورت سے اختلاط کرے۔ اسی طرح بظاہر یہ بھی ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ تعدد ازواج کے بعد برگزیدہ سے برگزیدہ شخص بھی دو یا دو سے زاید عورتوں کے ساتھ مہروفا میں مساوات برت سکے۔ دورِ حاضر میں یہ تمام امکانات محال معلوم ہوتے ہیں لیکن گزشتہ لکھنؤ میں یہی ناممکنات ممکنات میں داخل تھے جس کی صرف یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ روٴسا اور شرفا کی لڑکیوں کو ابتدا ہی سے یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ شادی ہونے کے بعد اپنے شوہروں کی مطیع ومنقاد رہیں۔ تعددِ ازواج کے نقشے اپنے اور دوسرے گھروں میں ان کے پیشِ نظر بھی رہتے تھے اس لیے وہ خرابیوں کو دور کرنے کی ترکیبیں پہلے ہی سے سوچ بھی لیتی تھیں۔ مذہبی تعلیم کے اپنے گہرے نقش ان کے دل ودماغ پر پڑ جاتے تھے کہ اسلام کے عطا کردہ جائز حقوق مل جانے کے بعد روٴسا وشرفا سب کی لڑکیاں اپنی سسرال میں خوش وخرم اور مطمئن رہتی تھیں۔ تعددِ ازواج آج یقیناً لعنت ہے لیکن ماضی میں عیب ومعصیت ہونے کے باوجود محلات کے لیے مصیبت نہیں تھی محل کے سکون واطمینان والے ماحول میں اس عیب سے کوئی خلل واقع نہیں ہوتا تھا اور اگر ہوتا بھی تھا تو اس کی شدت قطعاً محسوس نہیں ہوتی تھی۔

## (۵) ملازماؤں کا عملہ

روٴسا وعمائدین کی ذاتِ خاص سے متعلق جتنا عملہ باہر ہوتا تھا اسی کے بالمقابل تعداد میں کم وبیش مگر انھیں درجات کی عورتیں محلوں میں بھی بیگمات کی خدمت کے لیے ملازم رہا کرتی

تھیں ۔نواب باہر تشریف لاتے تو چوبدار اور خدمتگار استقبال کرتے اور دعائیں دیتے تھے۔ انھیں کے بالمقابل محل میں محلدار، خواصین اور مہریاں تھیں ۔محلدار محل کے صدر دروازہ ہی پر زیادہ تر حاضر رہتی تھی ۔اس کو پردہ کے باہر نکلنے کی اجازت تھی ۔اس کے اہم فرائض میں نواب کے برآمد ہونے کی اطلاع چوبداروں کو دینا، نواب کے ہمراہ جو سامان جائے مثلاً حقہ، خاصدان، کیس بکس وغیرہ اس کو دربار میں پہنچانا یا ملازمین کے حوالے کرنا اور سامان یا جو خبریں اندر آئیں انا ہوں بیگم تک پہنچانا داخل تھا ۔محلدار کے فرائض ذمہ دارانہ تھے اور یہ عورت نہ صرف نواب اور بیگم کی معتمد ہوتی تھی بلکہ بذاتِ خود بہت سنجیدہ، فہمیدہ اور مرتبہ شناس ہوتی تھی ۔اس کی حیثیت زنان خانہ میں جمعدار کی ایسی بھی رہتی تھی ۔وہ خود خاص خاص موقعوں پر بیگم کے روبرو حاضر ہوتی تھی، زیادہ تر پیغام رسانی خواصوں کے ذریعہ کرائی جاتی تھیں جن کی حیثیت مقرب خدمت گاروں کی ایسی تھی ۔ہر محل میں دو تین خواصین ملازم ہوتی تھیں ۔کم سے کم ایک کا ہر رئیس کے یہاں ہونا ضروری تھا۔خواص کو بیگم کے مزاج میں بہت دخل ہوتا تھا ۔وہ کبھی کبھی خانگی معاملات میں مشورے دینے کی بھی جسارت کر لیتی تھی اس کی عزت افزائی اسے لیے اور زیادہ ہوتی تھی کیونکہ کبھی کبھی مفلوک الحال شریف گھرانوں کی لاوارث عورتیں اس جگہ پر مامور ہوتی تھیں ۔محلدار کبھی کبھی نیچے درجہ سے ترقی پاکر منصب حاصل کرتی تھی لیکن خواص کا تقرر براہِ راست ہوتا تھا ۔ایسی خواصوں کا مرتبہ شناسی محلدار کو بھی کرنا پڑتی تھی ۔یوں بھی محلدار اور خواصیں ایک دوسرے سے بہت تہذیب و شائستگی سے پیش آتی تھیں اور حفظِ مراتب ملحوظ رکھتی تھیں ۔

انتظامی معاملات میں محلدار کے اختیارات بہت وسیع تھے ۔وہ اندر آنے والی کو روک سکتی تھی اور باہر جانے والی کو ٹوک دینا اس کے فرائض میں داخل تھا ۔اس کے علاوہ ہر خبر یا اطلاع اس کی مرضی کے بغیر اندر نہیں جا سکتی تھی مثلاً یہ کہ کہیں سے غمی کی یا کوئی پریشان کن خبر آتی تو وہ موقع اور محل دریافت کر کے اطلاع بھیجتی تھی ۔اسی طرح اس کا یہ بھی فریضہ تھا کہ اندر سے باہر کوئی سامان لے جائے تو مسروقہ نہ ہو ۔پردہ کا زبردست رکھ رکھاؤ تھا لیکن ملازماؤں کے عزیز و اقارب برابر ملاقاتیں کرنے آتے تھے اور بیرونی ڈیوڑھی میں دیر دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے اور اپنے اپنے گھر کی خبریں سُنا جاتے تھے ۔محلدار کی بھی وردی مقرر تھی جو سرکار سے ملا کرتی تھی لیکن ہر روز اور ہمہ وقت وردی پہنے رہنا ضروری نہیں تھا ۔خاص خاص موقعوں

پر محلدار اس لباس میں نظر آتی تھیں۔ یہ وردی گہرے رنگ کے پھولدار اور لچکا لگے دوپٹے اور اسی رنگ کے ریشمی گھٹنے پر مشتمل ہوتی تھی۔ پیروں میں گہرے بادامی رنگ کی جوتیاں ہوتی تھیں۔ محلداروں کے علاوہ مہریوں کو بھی وردیاں مرحمت ہوتی تھیں۔ اُن کو لچکا لگے ہوئے چمکدار رنگین لہنگے اور انھیں کی مناسبت سے دوپٹے عطا ہوتے تھے۔ ان کے پیروں میں بھی گہری بادامی جوتیاں ہوتی تھیں۔ ننگے پیر رہنے کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم یا ملازمہ کو اجازت نہیں تھی۔ مہریاں مستقل طور پر ملازم رہتی تھیں۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھیں اور نہ اُن کی محل میں ہمہ وقت حاضری ضروری تھا ان کے ذمہ صرف اتنی ملازمت تھی کہ بیگم صاحبہ جب کسی تقریب میں یا کسی عزیز کے یہاں تشریف لے جائیں اور یہ جانا بھی بہت کم ہوتا تھا تو مہریاں اپنی وردیوں میں فینس کے چھلکے پر ہاتھ رکھے کہاروں کے ہمراہ ساتھ ساتھ قدم بڑھاتی ہوئی چلیں۔ سواری کے ہمراہ جانا اور واپس ہونا اُن کے فرض میں داخل تھا۔ جتنی دیر بیگم صاحبہ قیام فرماتی تھیں مہریاں حاضر رہا کرتی تھیں۔
بیگم صاحبہ کی سواری اعلا درجہ کی فینس میں جس پر ریشمی کارچوبی چھتکا پڑا ہوتا نکلتی تھی اور کم سے کم آٹھ کہار اپنی وردیوں میں اس فینس کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کے لے جاتے تھے۔ کہار بھی مستقل طور پر ملازم رہتے تھے۔ اُن کی وردیاں مقرر تھیں اور ان وردیوں پر ہر رئیس کا مخصوص نشانِ کارچوبی اور زردوزی کام میں بنا ہوتا تھا۔

خواصوں کی حیثیت بیک وقت مصاحب اور ملازمہ کی ہوتی تھی۔ خواص اپنی مالکہ کا احترام کرتی اور مودبانہ کلام کرتی تھی لیکن بیگم بھی اس کی دلجوئی اور عزت افزائی میں کوئی کمی نہیں کرتی تھیں۔ پیغام رسانی کے علاوہ اس کو مقابلتاً سب سے زیادہ حضوری کا شرف رہتا تھا۔ تنہائی میں بیگم اسی کو قریب بٹھا کر پہروں باتیں کیا کرتی تھیں۔ دولت و ثروت کی فراوانی اور وقار و اقتدار کے باوصف فطرتِ انسانی کے متقاضی ایسے مواقع بھی آتے تھے جب بیگم کے دل کو کسی نہ کسی سبب سے دکھ پہنچ جاتا تھا۔ وہ ان تکالیف کا اظہار بلا تکلّف خواص سے کرتی تھیں اور خواص مناسب وقت طریقہ پر ان کی تشفی کرتی تھی۔ نواب بھی خواص کا اکرام فرماتے تھے۔ اُن کی موجودگی میں بھی خواص کو حاضر ہو جانے کی آزادانہ اجازت تھی اور وہ اُن کے روبرو بھی اپنی حسبِ عادت بیگم سے باتیں کر لیتی تھیں۔ نواب ہوں یا بیگم دونوں کا کیسا ہی برہم مزاج ہو لیکن خواص پر کبھی کوئی برہم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مرتبہ کا پاس و لحاظ کرنا ایک عام طریقہ تھا۔ محلوں میں خواصوں کی رہائش کے لیے بھی سب سے علیحدہ انتظام رہتا تھا۔

ان کے لیے اُسی حصّۂ تعمیرات کے قرب میں جگہ دی جاتی تھی جو اعزا و اقارب کی رہائش گاہ ہوتا تھا۔ داد و دہش کے موقعوں پر بھی اُن کو فضیلت حاصل رہتی تھی۔ بیگم صاحبہ عام طور سے ان کے کپڑوں پر نظر رکھتی تھیں۔ پھٹے پرانے یا میلے کپڑے دیکھ لینا گوارہ نہیں ہوتا تھا اور فی الفور نئے کپڑوں کا بندوبست کرا دیا جاتا تھا۔ کپڑوں کی سالانہ تقسیم کے وقت بھی بیگم صاحبہ اپنے اچھے کپڑے ہی خواص کو مرحمت فرماتی تھیں۔ خواص کی حیثیت خادمہ کی ضرور تھی لیکن خدمت گزاری کی تمام تر ذمہ داریاں کنیزوں اور ماماؤں کے حوالے رہتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کام خواص کنیزوں کے سپرد کر دیتی تھی اپنے ذمہ بیگم صاحبہ کے مخصوص کام متعلق رکھتی تھی۔

کنیز کا تصور انتزاعِ سلطنتِ اودھ کے بعد رفتہ رفتہ بالکل بدل گیا تھا۔ عہدِ قدیم میں وہ جوان جوان محتاج و لاوارث لڑکیاں جو کسی نہ کسی فائدہ کی غرض سے سلاطین و امرا کے یہاں خدمت گزاری کے لیے پیش کر دی جاتی تھیں کنیزیں کہلاتی تھیں۔ ان کو پیٹ بھر روٹی اور تن پر کپڑا ملتا تھا اور ان کے ذمہ بہت معمولی اور رکیک کام کر دیے جاتے تھے جو قبول صورت ہوتی تھیں اُن کے دن پھر جاتے تھے اور وہ کنیزی کی پستی سے دفعتاً بیگم کی منزلت پر فائز ہو جاتی تھیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں لڑکیاں پیش ہونے کا رواج بالکل معدوم تھا بلکہ اس کے برعکس کنیزیں محل ہی میں حاصل ہو جاتی تھیں۔ اس صنف میں مفلوک الحال ماماؤں کی لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے عزیز و اقارب نہ ہوتے یا نہ ہوتے کے برابر ہوتے تھے۔ اُن لڑکیوں کی بچپن ہی سے پرورش اور خبر گیری محل میں ہوتی تھی اور بیگم کی حسبِ مرضی اُن کو کنیزی میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے قبل ایسی لڑکیوں کو محل میں لونڈیاں یا باندیاں کہا جاتا تھا لیکن بعد میں تہذیب و شائستگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کو کنیز کے لقب سے عزت بخشی گئی تھی۔ کنیزیں جب تک ان کو کہہ کر نہ بھگا دیا جاتا قریب قریب ہر وقت بیگم کی حضوری میں رہتی تھیں اور خدمتگاری کے فرائض بجالاتی تھیں۔ ان کے متعلق سب چھوٹے چھوٹے کام ہوتے تھے مثلاً پانی پلانا، کھانا کھلانا، سنگاردان حاضر کرنا وغیرہ وغیرہ دسترخوان بچھانا اور کھانے کے ظروف سلیقے سے لگانا کنیزوں کا فریضہ تھا البتہ باورچی خانہ سے غذاؤں کے خان لاتا اور جھوٹے برتن لے جانا ماماؤں کا کام ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ ان کے حال پر بہت شفیق رہتی تھیں۔ انھیں کے حسبِ حیثیت برابر سلوک ہوتی رہتی تھیں اور کسی خلافِ مزاج بات پر برہمی ہوتی تب بھی غصہ جلد ہی رفق و مدارا میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

ماماؤں کی تعداد رؤسا کی مقدرت پر منحصر ہوتی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب ادبار آنا شروع ہوگیا اُس وقت بھی ہر رئیس کے گھر میں متعدد ماماتیں ملازم تھیں۔ بہت اونچے خانوادوں میں ماماؤں کی مدد کے لیے اُن سے پست درجہ کی عورتیں بھی متعلق رہتی تھیں۔ ان نیچے درجہ کی ماماؤں کو اصیلین کہا جاتا تھا جس کی غالباً یہ وجہ تھی کہ زیادہ محنت اور کم فائدہ کے کام انھیں کے متعلق ہوتے تھے۔ ماماؤں کے ذمہ تمام کمروں، سائبانوں اور دالانوں کی صفائی کے فرائض بھی تھے۔ بیگم صاحبہ کے اعزا واقارب کی خدمت گزاری بھی انھیں کے حوالے رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ اور بچوں کے کمروں کی صفائی بڑی سمجھ داری کا کام ہوتا تھا کیونکہ دروازوں اور دیواروں پر ذرہ برابر بھی خاک نظر آجاتی یا جھاڑو دینے میں فرش پر کوئی تنکا بھی رہ جاتا تو ایسی کوتاہیاں بیگم صاحبہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی تھیں۔ بیگم صاحبہ بہ نفس نفیس بچوں کے کمرے کا روزانہ اور کبھی کبھی دن میں کئی بار معائنہ فرمالیتی تھیں۔ ملازماؤں کے سائبانوں اور دالانوں میں خود انھیں کے شرکا کڑی نظر رکھتے تھے اور جو ماما صفائی کی ذمہ دار ہوتی اس سے سختی سے باز پرس ہوتی تھی۔ ماماؤں کے درمیان تقسیم کار اور اس تقسیم پر کاربند رہنے کی جانچ عزیزوں میں کسی نہ کسی معظمہ کے حوالہ رہتی تھی۔ اِن عورتوں کے ذمہ کوئی خاص کام یا فریضہ نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کو نگہبانی اور جانچ پرتال کرنے کی ہر وقت آسانی رہتی تھی۔ ماماؤں کے درمیان کبھی کبھی جھگڑے ہوتے اور ایسے ہوتے کہ شور و غل مچ جاتا تھا جو بیگم صاحبہ کے کمرے کے باہر آنے سے فی الفور ختم ہو جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں وہی معظمہ طے کر دیتی تھیں جو ان ماماؤں کے کاموں کی دیکھ بھال فرماتی تھیں۔ انھیں ماماؤں میں بعض اپنی خوش کرداری و خوش گفتاری، تہذیب و شائستگی اور ہنر مندی و سلیقہ شعاری کی بدولت بیگم کی مقرب ہو جاتی تھیں اور ہم منصب نہ سہی تب بھی خواصوں کی ہم پلّہ ہو جاتی تھیں۔

باورچی خانہ کا عملہ بھی امرا کی ضرورت و استطاعت کے بموجب کم و بیش ہوتا تھا لیکن کم سے کم دو کھانا پکانے والیاں، دو اس کی ماتحت مدد کرنے والیاں اور تین چار متفرق کام کرنے کے لیے ہر محل میں ملازم ہوتی تھیں باورچی خانہ کی صفائی، برتنوں کا پاک و پاکیزہ رہنا، مسالہ پیسنے والی کا ستھراپن، ان تمام باتوں پر وہ معظمہ نظر رکھتی تھیں جن کے حوالہ باورچی خانہ رہتا تھا۔ ان ملازماؤں کو بیگم کے حضور صرف طلبی پر جانا پڑتا تھا اور یہ طلبی کسی مخصوص ہدایت دینے کے لیے یا کسی غلط کام پر تہدید کے لیے ہوتی تھی۔ سرزنش

اور تہدید کی منزل تھوڑی سی بہت خفگی و ناراضگی پر ختم ہو جایا کرتی تھی۔ ماماؤں اور ملازماؤں کو نوکر رکھ لینے کے بعد عام طور سے علیحدہ کرنے کا دستور نہیں تھا پے در پے خطائیں کرنے کے بعد جب بیگم کسی ملازمہ سے اتنی ناخوش ہو جاتی تھیں کہ اس کی اصلاح کا کوئی قرینہ بھی باقی نہیں رہتا تھا تب بادلِ ناخواستہ حساب کر دینے کا حکم ہو جاتا تھا۔ یہ تمام ملازمائیں بالکل علحدہ رہتی تھیں۔ اُن کو فرصت کے اوقات میں بھی دوسروں سے ملاقات کرنے کے بہت کم مواقع ملتے تھے۔ ان کی تمام دنیا اپنے شرکا کار تک محدود تھی اور یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ اس عملہ میں کبھی اختلافات اور جھگڑے پیدا نہیں ہوتے تھے جس کی غالباً یہ وجہ تھی کہ ان کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ نہیں تھے اور نہ ان کو ایک دوسرے پر رشک یا حسد پیدا ہونے کا کوئی موقع ملتا تھا۔ کھانا پکانے والی عورتوں کو کبھی کبھی انعام و اکرام مل جایا کرتے تھے لیکن وہ انھیں کی فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت ملتے تھے۔ بیگم صاحبہ تقاریب یا کسی دوسری خوشی کے موقع پر جوڑے یا نقد تقسیم کرتے وقت بہر حال یہ خیال رکھتی تھیں کہ اس عملہ کی ملازماؤں کی بھی دل شکنی نہ ہو۔ ان کے ساتھ کچھ زیادہ مراعات کر دی جاتی تھی۔ جس کو عملہ کی دوسری ماماعیں بھی اس لیے بخوشی انگیز کر لیتی تھیں کہ ان ملازماؤں کو آئے دن فوائد حاصل نہیں تھے۔ کھانا پکانے والے عملہ کا یہی سب سے بڑا فائدہ تھا کہ محل بھر کی آبادی کو کھانا کھلانے کے بعد جو بچ رہتا وہ انھیں کا حق ہوتا تھا اور یہ بچا ہوا کھانا بھی اچھا خاصا ہوتا تھا۔ قریب قریب ہر روز باورچی خانہ کی کسی نہ کسی ماما کے عزیز ڈیوڑھی پر سیر ہو کر کھانا کھا جاتے تھے۔

اونچے درجہ کی ملازماؤں میں مغلانیاں، استانیاں اور کہانی کہنے والیاں شامل تھیں۔ کہانی کہنے والیاں بڑے رؤسا کے محلوں میں ایک علیحدہ صنف متعلقین کی تھی۔ یہ ضرورت بڑی حد تک خواصوں اور بعض پرانی ماماؤں سے بھی پوری ہو جاتی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں کہانی کہنے والیوں کی علیحدہ صنف ختم ہو چکی تھی۔ پھر بھی جہاں جہاں ایسی عورتیں ملازمہ تھیں اُن کے ساتھ وہی مخصوصانہ برتاؤ ہوتا تھا جو مغلانیوں اور استانیوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ اِن بلند پایہ ملازماؤں سے "آپ" کہہ کر بات کرتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مغلانیاں اور استانیاں بہت قدیم ملازمائیں ہوتی تھیں بعض محلوں میں بیگم صاحبہ کے بزرگوں کے وقت سے اُن کا سلسلہ برقرار تھا۔ نواب خود بھی پُرانی مغلانیوں اور استانیوں کا ادب کرتے تھے۔ وہی استانیاں جو خود ان کو بچپن

میں پڑھا چکی تھی بعد میں ان کے بچوں کی استانی ہو جاتی تھی۔ یہی حالت مغلانیوں کی بھی تھی۔ ان ملازماؤں میں اگر کبھی کوئی علیل ہو جاتا تھا تو بیگم صاحبہ علاج و دوا کا خود خیال رکھتی تھیں اور دن میں کم سے کم ایک مرتبہ سائبان یا دالان میں جاکر عیادت فرماتی تھیں۔ مغلانیوں کے ذمہ بیگم صاحبہ اور بچوں کے جب تک ان کی عمر ۶-۷ برس کے اندر رہتی سب کپڑے سینا تھا۔ ان کو زنانے اور مردانے دونوں طرح کے کپڑے سینے کا سلیقہ ہوتا تھا اور ہنر مندی کا یہ حال تھا کہ بیگم صاحبہ کے اشاروں پر نئی نئی وضعیں اور طرحیں نکال لیتی تھیں۔ سب سے زیادہ کمال یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بچوں کا پاجامہ بغیر ناپے بیونت لیتی تھیں۔ اس زمانہ میں جسم پر رکھ کر کپڑا ناپنے یا فیتے سے جسم کا حصہ ناپنا منحوس سمجھا جاتا تھا۔ مغلانیاں اپنے اندازہ سے صحیح جامہ تیار کر دیتی تھیں۔ استانیاں قرآن، اردو اور فارسی پڑھی ہوئی تھیں۔ لڑکیوں کو اتنی ہی اور بچوں کو کم سنی میں اسی قدر تعلیم کی ضرورت ہوتی تھی۔ رئیسوں کے گھر کے انداز بھی عجیب ہوتے تھے۔ لڑکیاں اور لڑکے ایک ساتھ در کنار اگر صرف لڑکے ہوئے تب بھی سب کو ایک ساتھ پڑھانا ناممکن ہوتا تھا۔ بچوں پر تاکید یا زبردستی کی اجازت نہیں ہوتی تھی اس لیے استانی کو بچوں کی علیحدہ علیحدہ پڑھنے پر آمادہ کرنا پڑتا تھا۔ بہت کم ایسے بچے ہوتے تھے جو اپنے شوق سے آجاتے تھے اور استانی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر لیتے۔ استانی کے سر قریب قریب دن بھر کسی نہ کسی بچہ کو بہلا پھسلا کر پڑھانے کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اس لیے لڑکوں کو حقیقی تعلیم باہر کے مولوی یا مدرس دیتا تھا۔ البتہ لڑکیوں میں اکثریت تھوڑے دن کی ریاضت کے بعد تعلیم پر آمادہ ہو جاتی تھیں۔ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ رؤسا و عمائدین کے گھروں میں لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیاں زیادہ علم دوست ہوتی تھیں۔ لڑکوں کو جوان ہونے کے بعد ایسا سماج مل جاتا تھا جو ان کی علمی قابلیت پر جلا کر دیتا تھا لیکن لڑکیاں از خود پڑھا کرتی تھیں اور شادی ہو جانے کے بعد بھی ان کا یہ مشغلہ جاری رہتا تھا۔

رؤسا و عمائدین کے پاس ایک بڑا عملہ مصاحبین کا ہوتا تھا۔ گھر میں رہنے والی بیگمات کو جنھیں ہر وقت بے فکری اور فارغ البالی تھی ایسے ساتھیوں کی زیادہ ضرورت ہونا چاہیے تھی لیکن ان کے یہاں ایسی ملازماؤں کا کوئی علیحدہ علیحدہ طبقہ کبھی قائم نہیں ہوا۔ ان کے ہمراہ جو اعزا و اقارب رہتے تھے ان میں بھی بیگم صاحبہ صرف انھیں سے بے تکلّف ہوتیں اور دل کھول کر باتیں کرتی تھیں جو ان کی ہم مذاق ہوتی تھیں۔ فطری طور پر کم حیثیت کے لوگ اپنے ذی حیثیت عزیزوں کے روبرو احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ عورتوں میں رشک کا جذبہ دونوں سے کچھ

زیادہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ عورتوں کو اپنے خوشحال عزیزوں سے بھی باوجود قربت کے دور ہی رکھتا ہے۔ بیگمات پر اس طرزِ عمل کا اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا کیوں کہ یہ مخدرات بہرحال صاحبِ فہم و فراست اور باشعور تھیں۔ ان حالات کے تحت وہ اپنی خواصوں، مقرب ماماؤں اور کنیزوں سے زیادہ بے تکلف رہتی تھیں۔ اعزا میں صرف چند ایسی ہوتی تھیں جو بیگمات سے حقیقتاً قریب رہتی ہوں۔ ان کے ساتھ تکرمت و مرحمت کا برتاؤ ہوتا تھا اور حتی الامکان بڑی دلجوئی اور مدارات کی جاتی تھی۔ لیکن جہاں تک اپنے ذاتی معاملات کا سوال آجاتا تھا بیگمات کا شیوہ سکوت و اجتناب ہی رہتا تھا۔ لیکن اس کشاکش کے باوصف ان اعزا کے حق میں یہ اعتراف کرنا بھی پڑتا تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کی ہمیشہ بہی خواہ اور ان کے حق میں دعاگو رہتی تھیں اور اس طرزِ عمل میں خلوص تھا۔ اُن کے ظاہری طرزِ عمل کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی وفاشعاری جلبِ منفعت یا کسی خود غرضی کی بنا پر تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جانب احساسِ کمتری اور دوسری جانب احساسِ برتری کی بدولت بیگمات کی عزیز قریب عورتیں بھی ان کی بے تکلف جلیس و مصاحب نہیں ہو سکی تھیں۔ یہ صورتِ حال رئیسوں کی مردانی نشست گاہوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہاں عزیز اور غیر دونوں یکساں طور پر شریکِ بزم رہتے اور مصاحبت کرتے تھے۔

باورچیخانہ کے اسٹاف کے علاوہ ماماؤں، کنیزوں، خواصوں سب کے لیے صاف ستھرا رہنا اور شفاف کپڑے پہننا عادت میں داخل تھا اور حسبِ رواج و دستور دوپہر کے بعد ہی باری باری سب عورتیں کپڑے بدل لیتی تھیں۔ یہ کپڑے رنگینی میں بھی شوخ رنگ کے ہوتے تھے۔ بیگم صاحبہ شام کو سنگار کر کے اور کپڑے بدل کر باہر تشریف لاتی تھیں تو ہر طرف روشنی، رنگینی اور چہل پہل نظر آتی تھی۔ وہ مناظر آج کی دنیا کے لیے بھی جاذبِ نظر تھے اور عورتوں کی تہذیب و ر 'ستگی آج کے مہذب مردوں کے لیے قابلِ مثال تھی۔ لیکن اس سماج میں توہم پرستی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ آج کی دنیا اس کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مثال کے طور پر چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں صبح کو جب مامائیں اٹھ کر منہ دھوتی تھیں اور کوئی کوّا دیوار پر بیٹھ کر زور زور سے کائیں کائیں کرتا تو دن بھر کسی نہ کسی مہمان کا انتظار رہتا تھا اور اس انتظار میں سارا محل شریک رہتا تھا۔ مغلانی صاحبہ کپڑا سینے کے لیے سوئی میں ڈورا پروتی ہوتیں اور کسی کو کسی سائبان میں چھینک آجاتی تو پھر دن کام معطّل ہو جاتا تھا۔ کسی خواص کو کسی کام کا حکم ملتا اور اس کے اٹھتے ہی کوئی تمباکو یا تیل کا نام لے لیتا تو اس کے اوپر ایک ایسا جمود

طاری ہوتا جو دیر تک دور نہیں ہو سکتا تھا۔ بیگم صاحبہ کو کسی آنے والے نقصان سے باخبر کرنے کا ارادہ ہوتا تو "دشمنوں کے کان بہرے" سے کلام شروع ہوتا تھا۔ رات کے وقت کسی منفعت بخش یا کسی دلچسپ کام کا پروگرام مرتب کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایسی کوئی گفتگو چھڑ جاتی تو بیک وقت دو تین موجود عورتیں بولنے والی کو خاموش کر دیتی تھیں۔ رئیس یا بیگم کی عمر کا حساب لگانا بہت زیادہ مناسب، خلافِ تہذیب اور کبھی کبھی منحوس بات سمجھی جاتی تھی۔ بچوں کو غیر عورت کے سامنے کھانا کھلانے کی اجازت نہیں تھی۔ بیگم صاحبہ کمرہ کے باہر نکل کر صحن میں آنے کا ارادہ کرتیں اور راہ سے بلی گزر جاتی تو بیک وقت کئی کنیزیں صدائیں بلند کر دیتی تھیں۔ "سرکار ابھی جی جم" یعنی یہ کہ آنے کی زحمت نہ کیجیے۔ کوئی کھولتا پانی زمین پر بہا دیتی یا کوئی الھڑ نوجوان کنیز دوڑ کر چلتی تو تمام دوسری کنیزیں اس کی جان کو آجاتی تھیں کیونکہ ایسی حرکتیں خدا کی زمین کے لیے شدید ترین اذیت رساں سمجھی جاتی تھیں۔ ایسے واقعات و حالات کی تفصیل پیش کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے مثال کے طور پر چند نمونے پیش کر دیے۔ مختصر یہ کہ توہم پرستی دن و رات جب تک کہ سونے کا وقت نہ آجاتا، ایک مستقل مشغلہ تھا۔ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، جاگنا سونا، نہانا دھونا ہر موقع پر اور ہر کام پر واہمہ کی زبردست کار فرما تھی اور کسی کو کوئی زحمت یا تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کاروبار، عادات و اطوار اور بعض اوقات ضروری امور کے پرے رہتے تھے لیکن توہم پرستی میں نہ فرق آتا تھا نہ کمی ہوتی تھی۔ بچوں کے سلسلہ میں یہ توہم پرستی بعض اوقات بے حد تکلیف دہ ہوتی تھی لیکن ہر تکلیف قبول و منظور کر لی جاتی تھی۔

## (۶) زچہ خانہ ــــ زچہ اور بچہ

ہر انسان کے لیے اولاد سب سے بڑی نعمت ہے، روسا کے یہاں اولادِ نرینہ خصوصیت کے ساتھ سب سے بڑی دولت ہوتی تھی۔ بیگمات کے حق میں دعائیں ہوتی تھیں، منتیں اور مرادیں مانی جاتی تھیں، ملاؤں اور سیانوں کے حضور التجائیں کی جاتی تھیں کہ اُن کے روحانی اثرات کی برکتوں سے خداوندِ عالم لڑکا مرحمت فرمائے۔ آثارِ حمل نمودار ہوتے ہی دعاؤں، منتوں اور مرادوں میں تیزی اور زیادتی ہو جاتی تھی۔ حفظانِ صحت کے تدارک بھی ہونے لگتے اور خاندانی دائی بھی آئے دن حاضر باشی کرنے لگتی تھی۔ حمل کے نتیجہ میں معمولی اور خفیف عوارض

کی دیکھ بھال خاندانی طبیب سے متعلق رہتی اور وہ بلا ناغہ روز مزاج پُرسی کرتے رہتے تھے۔ زمانۂ حمل جتنا جتنا بڑھتا جاتا دیکھ بھال میں شدّت ہوتی جاتی تھی۔ جتنی عزیز عورتیں ساتھ رہتی تھیں سب ہی ہمہ وقت خبر گیری کرتی رہتی تھیں اور ماماؤں کنیزوں نیز محل کے سارے عملہ کی مصروفیت بہت بڑھ جاتی تھی۔ بیگم کو ہدایتیں ہوتی تھیں کہ تیز قدم نہ چلیں، کوئی بوجھ نہ اٹھائیں اور ہر وقت خوش اور بشّاش رہیں۔ مشورے دینا گویا کہ سب کا فریضہ تھا جو ادا کیا جاتا تھا۔ ورنہ کون نہیں جانتا تھا کہ بیگم کبھی تیز تیز نہیں چلتی تھیں۔ بوجھ اٹھانے کا اُن کے لیے کوئی سوال ہی نہیں تھا اور فکر و الم سے اُن کے دلِ مسرور کو علاقہ ہی نہیں تھا۔ یہ نمائشی پابندیاں حمل کے چوتھے اور آٹھویں مہینے عملی صورت اختیار کر لیتی تھیں، جب اُن کو گھر سے باہر نکلنے سے باز رکھا جاتا اور وہ حتیٰ المقدور کمرہ کے باہر بھی تشریف نہیں لاتی تھیں۔ حمل کی مدّت تعین کرنے کا کوئی سائنٹفک طریقہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ سب کام اندازہ سے ہوتا تھا۔ البتہ جب دائی دوسرے یا تیسرے مہینہ کا اعلان کر دیتی تو بیگم صاحبہ کے پیٹ پر روزانہ دعائیں دم دی جاتی تھیں اور اولادِ نرینہ کے لیے دعائیں ہوتی تھیں۔ خاندان میں بزرگ عورتوں کے حوالے یہ فریضہ رہتا تھا۔ ساتواں مہینہ ختم ہونے کے قریب پیدا ہونے والے بچّہ کے واسطے کپڑے تیار ہوتے لیکن یہ کُرتے بیگم صاحبہ یا نواب کے پُرانے کپڑوں کو قطع کر کے سیے جاتے تھے۔ لکڑی کا بکس جس پر روغنی نقش و نگار ہوتے علیحدہ کر دیا جاتا اور اُس میں یہ جامے، گیھبے، پوتڑے وغیرہ تیار کر کے محفوظ کر دیے جاتے تھے۔ وضعِ حمل کا زمانہ قریب سے قریب تر آجاتا تو زچہ خانہ معین ہوتا تھا۔

زچّہ خانہ کے لیے اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ ولادت اُسی کمرہ میں کرائی جائے جو سب سے زیادہ بھاگوان ہو۔ پہلی ولادت کے بعد اور بچہ کے صحیح و سلامت رہنے پر وہی کمرہ آئندہ زچہ خانوں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ کمرہ کا تعین ہونے کے بعد زچّہ کے پلنگ کا مقام طے ہوتا تھا۔ روسا و عمائدین میں بڑی تعداد عقیدتاً شیعہ مسلمانوں کی تھی جن کے یہاں استخارہ کی رسم شدّت کے ساتھ جاری و ساری تھی چنانچہ پلنگ بچھانے کے لیے استخارہ دیکھ کر مقام کا مرحلہ طے ہوتا تھا۔ اسی پلنگ کے قریب دیوار پر کچھ تعویذ چسپاں کرا دیے جاتے اور کچھ تعویذ موم جامہ میں ملفوف کر کے زچّہ کے پلنگ میں پایوں کی طرف سرہانے کے سیدھے میں باندھ دیے جاتے تھے۔ دائی کی آمد و رفت میں زیادتی ہو جاتی اور آٹھویں مہینے کے

اہتمام ہر بچّہ کے لیے ملازمین کی تلاش شروع کرا دی جاتی تھیں۔ یہ عملہ علیحدہ رہتا تھا جس میں ایک انّا، ایک کھلائی یا دَدا اور ایک چھوچھو کا ہونا ضروری تھا۔ ان تینوں کو باصلاحیت ہونا چاہیے تھا، ہر ایک کی صلاحیت کے معیار مقرر تھے اس لیے ایسی عورتوں کی تلاش میں وسائل کی فراوانی کے باوجود زحمت ہوتی اور وقت لگتا تھا۔ ملازمت کی خواستگار عورتیں آتی رہتی تھیں اور محل کی بڑی بوڑھیاں اُن کو اچھی طرح پرکھ کر نوکر رکھنے کا مشورہ دیتی تھیں۔ مشورہ کے بعد استخارہ دیکھا جاتا اور اسی کے مطابق قطعی فیصلہ ہوتا تھا۔ یہ فیصلہ بیگم صاحبہ یا اُن کی خوش دامن یا بڑی نند فرماتی تھیں۔ مجوزہ ملازمائیں اُسی وقت سے نوکر رکھ لی جاتی تھیں لیکن اُن کو محل میں آکر اپنی خدمت کا چارج لینے کی عندالضرورت ہی اجازت ملتی تھی۔ گھر بیٹھے تنخواہ ملتی تھی لیکن عموماً یہ صورتِ حال ایک ماہ سے زیادہ برقرار نہیں رہتی تھی۔ مجوزہ ملازماؤں کے بارے میں حالات کا جائزہ لینے اور استخارہ کرکے فیصلہ کرنے کے کچھ دنوں بعد ہی وقتِ ولادت آجاتا تھا۔

دردِزہ عارض ہوتے ہی بیگم صاحبہ ولادت کے لیے مخصوص پلنگ پر لٹا دی جاتی تھیں۔ اس وقت وہ خود راستہ نہیں چلتی تھیں بلکہ چاروں طرف کنیزیں اور محل کی بزرگ خواتین اُن کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ یہ سب سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیتے تھے۔ دائی فی الفور حاضر ہو جاتی اور نہ صرف ولادت بلکہ تمام ضروری اور معینہ مراسم کی ادائی کے بعد رخصت ہوتی تھی۔ سلیبان کے سب پردے گرا دیے جاتے تھے جس کے سبب سے کمرہ اور سائبان میں اندھیرا ہو جاتا تھا اس لیے چراغ جلائے جاتے تھے جو چھٹی کے نہان کے دن تک برابر روشن رہتے تھے۔ فرّاشی پنکھا بھی روک دیا جاتا تھا۔ گرمی کی شدّت میں سکون حاصل کرنے اور بیگم کو کچھ آرام ملنے کی خاطر ہاتھوں کے چھوٹے چھوٹے پنکھے استعمال ہوتے تھے۔ زچّہ خانہ میں بڑی بوڑھیوں اور چند خاص عزیز عورتوں کے علاوہ ہر ایک کا داخلہ ممنوع ہوتا تھا۔ سائبان کے باہر لکڑی کے بڑے بڑے لٹھے جلا دیے جاتے تھے جو چھٹی کے دن تک برابر جلا کرتے تھے۔ انھیں لٹھوں سے متصل کچھ خوشبو نباتات رکھی رہتی تھیں۔ جو عورتیں زچّہ خانہ میں جاتی آتی تھیں اور اُن کو وہاں قیام کرنا تھا ہر بار داخلہ کے قبل ان جلتے ہوئے لٹھوں پر کچھ خوشبو ڈال دیتی تھیں۔ اور اپنے پائجاموں کے پائنچے دھوئیں پر جھٹکنے کے بعد ہی اندر جاتی تھیں۔ زچّہ خانہ سے متصل صحن میں ایک طرف اینٹوں کے وقتی طور تیار کردہ چولھے پر اک پتیلے میں پانی جوش ہوتا اور ایک

دیگ میں صاف پانی بھرا رکھا ہوتا تھا۔ قریب ایک چوکی پر صاف شفّاف دو چار لوٹے بھی رکھے رہتے تھے۔ یہ سامان نومولود کو نہلانے کے لیے ہوتا تھا۔ ولادت کے سلسلہ میں نیز پیدا ہونے والے بچہ کی ضروریات کا سب سامان قرینہ کے ساتھ زچہ خانہ میں پہلے ہی فراہم کر دیا جاتا تھا۔ پہلی ولادت میں کافی دیر لگتی ہے، اس تمام وقفہ میں محل کا انتظام درہم برہم رہتا تھا۔ کنیزیں، مامائیں، خواصیں سارا عملہ صحن میں یا متصل سائبانوں میں جوش اور ہزارہا توقعات کے ساتھ جمع رہتا تھا اور خوش خبری سننے کا منتظر رہتا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آتا اور اندر سے کوئی معظمہ آواز دیتی کہ "لڑکی ہوئی"۔ باہر کی عورتیں اسی ندا کو سننے کی متوقع رہتی تھیں کیوں کہ لڑکا پیدا ہوتا تب بھی پہلے یہی آواز لگائی جاتی تھی۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ لڑکا پیدا ہونے کی خبر کان میں پہنچی تو بیگم کو مسرت میں اتنا ہیجان پیدا ہو جائے گا کہ آنول اور نال کے نکلنے میں بہت دیر ہو گی۔ دائی یہ عمل بھی انجام دے چکتی تھی تب یہ بتایا جاتا تھا کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ بچہ کو نہلا دھلا کر اور صاف کپڑے پہنا کے تھوڑی دیر کے لیے ماں کے پاس لٹا دیا جاتا اور اس کے بعد چھٹی تک ہر وقت گھر کی کوئی عزیزہ گود میں لیے رہتی تھی۔ خاندانی طبیب گھٹی کا نسخہ تحریر فرماتے اور ان کو معاوضہ میں اشرفیاں ملتی تھیں۔ رئیس کے دواخانہ کا انچارج گھٹی تیار کرتا اور حسبِ دل خواہ انعام پاتا۔ چاندی کی کٹوری میں اور چاندی کے چمچے سے بچہ کو محل کی بڑی بوڑھیاں بالخصوص دادی، پھوپھی وغیرہ گھٹی پلاتی تھیں۔ تین روز تک بچہ کی غذا گھٹی رہتی تھی۔ دائی ہر روز آ کر زچہ بچہ کی خبر گیری لیتی اور مناسب تدارک کر جاتی۔ ولادت کے بعد زچہ خانہ میں کچھ معتمد ملازماؤں کو بھی آنے کی اجازت مل جاتی تھی لیکن سارا نظام برقرار رہتا تھا۔

زچہ کی صحت و عافیت پر بھی بھرپور توجہ رکھی جاتی تھی۔ گھڑی گھڑی کے بعد بزرگ رشتہ دار ماتھا ٹٹولتی اور "پنڈا" یعنی جسم چھوتی تھیں۔ منشا یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ حرارت ہو تو فوراً تدارک کیا جائے۔ حکیم صاحب دونوں وقت تشریف لاتے اور ڈیوڑھی میں تشریف فرما کر تفصیل سے حالات دریافت کرتے کم سے کم ایک بار صبح کو دائی کی حاضری بھی حکیم صاحب کے روبرو ضروری ہوتی تھی۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ زچہ خانہ، ولادت اور زچہ و بچہ کی نگہداشت کے سلسلہ میں ڈاکٹرنی کا نام بھی نہیں آنے پاتا تھا۔ زچہ خانہ تو در کنار محل کے کسی حصہ میں کسی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے آنے والی عورت یا بیرونی نشست گاہ میں کسی مرد نے کسی تذکرہ میں ڈاکٹرنی کا لفظ استعمال کر دیا تو عورتیں اور مرد ملازمین سرکار میں جو موجود

ہوتے "تھو تھو" کرنے لگتے تھے۔ عند الضرورت علاج یونانی ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی بڑے طبیب کو خاندانی حکیم کے ہمراہ مشاورت میں شریک کر لیا جاتا تھا۔ اُس زمانہ کے حالات کا جائزہ لینے پر یہ امر سامنے آجاتا ہے کہ علاج اور دواؤں سے زیادہ پرہیز پر نظر رکھی جاتی تھی۔ زچہ کو موسمِ سرما میں بصد ہزار اہتمام سردی سے بچایا جاتا تھا۔ زچہ خانہ میں بھی انگیٹھی جلا کرتی تھی۔ گرمیوں میں چھٹی کے نہان تک اور کبھی کبھی دوسرے نہان تک فراشی پنکھا نہیں چلتا تھا۔ موجودہ مخدرات تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ کے پنکھے سے زچہ کے منہ پر ہوا چلا دیتی تھی۔ ولادت کے تین دن بعد تک غذا ایک دم بند رہتی تھی۔ پانی بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ غذا اور پانی کے عوض عرق مکو اور عرق بادیان پلایا جاتا تھا۔ تین دن میں بے شمار بوتلیں عرقیات کی آجاتی تھیں۔ جاڑے کے موسم میں عرقیات بھی گن گنے کر کے دیے جاتے تھے۔ بیگم صاحبہ کی طاقت برقرار رکھنے کے لیے حکیم صاحب مقوی ادویات کا استعمال کراتے تھے۔ تیسرے روز دودھ اُترنے کا بخار آنا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ اس بخار کی روک تھام کے لیے پہلے دو روز مسلسل فلتے دیے جاتے اور عین دن کے دن دائی زچہ کو عمل دے کر آنتوں اور معدے کی صفائی کراتی تھی۔ بچہ کو بھی اُسی دن ماں کے پستان سے لگا دیا جاتا تھا تاکہ وہ دودھ کھینچ کر ماں کو دودھ اُترنے کی اذیت سے نجات دلا دے۔ اسی روز دوپہر کو غذا بھی دی جاتی تھی جو صرف دھوئی مونگ کی دال کی کھچڑی تک محدود ہوتی تھی۔ اس کھچڑی کو شُلّا کہتے تھے اور اُس کے پکانے کا طرز بھی مخصوص ہوتا تھا۔ دال اور چاول پانی میں جوش دے کر اتنا گلا لیے جاتے تھے کہ بالکل حلوا ہو جاتے تھے لیکن اُن میں اچھی مقدار میں تری رہتی تھی۔ پھر اس اُبلے ہوئے دال چاول کو باریک کپڑے میں چھان کر تھوڑا پانی اور شامل کر کے پکایا جاتا تھا۔ تلے ہوئے چھوٹے چھوٹے کباب بھی اسی پتلی کھچڑی میں شامل کر دیے جاتے تھے۔ پانی خشک ہونے لگتا تو لونگ الائچی سے گھی میں داغ کر کے بگھار دیا جاتا تھا۔ تھوڑی زعفران کا بھی حل کر کے چھینٹا دیا جاتا تھا۔ تیاری کے بعد کباب علیحدہ کر دیے جاتے تھے اور یہ شُلّا صاف ستھری بڑی گہری پلیٹ میں نفاست کے ساتھ بیگم صاحبہ کے حضور پیش ہوتا تھا۔ یہ غذا عموماً دوپہر یا بعد دوپہر دی جاتی تھی۔ اُس کے بعد اُس شام کو بھی کھانے کے لیے کچھ نہیں ملتا تھا۔ صحت و سلامتی برقرار رہنے پر دوسرے روز صبح سے دونوں وقت کھانا کھانے کا معمول درست ہو جاتا تھا لیکن بڑے نہان تک بہت سخت پرہیز کرایا جاتا تھا۔ موسم کے شدائد سے حفاظت اور ترش و بادی غذاؤں سے ممانعت رہتی تھی۔ یہ غذائیں بیگم صاحبہ یوں بھی نہیں کھاتی تھیں۔ حکیم صاحب کی ہدایت پر

صرف چپاتی، قلیہ، قورمہ اور کباب پر قناعت کرنا پڑتی تھی۔

زچہ خانہ میں زچہ اور بچہ کو تین بار نہلایا جاتا تھا۔ پہلا نہان ولادت کے بعد چھٹے دن، دوسرا بارہویں یا چودھویں دن اور تیسرا جو چلّے کا نہان کہلاتا تھا چالیسویں دن کرایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بارھویں اور چالیسویں دن کا اصول اٹل نہیں تھا۔ تاریخوں اور دنوں کی سعادت ونحوست کو ملحوظ رکھتے ہوئے بارہ کے گیارہ اور چالیس کے چھبیس یا ستائیس دن بھی رہ جاتے تھے۔ ان نہانوں کے لیے تاریخوں اور دنوں دونوں کا سعد ہونا ضروری ہوتا تھا۔ دنوں میں دوشنبہ اور چہارشنبہ سے اور تاریخوں میں قمری مہینوں کی تیسری، تیرھویں اور تئیسویں سے اجتناب تھا البتہ ماہ رجب کی تیرھویں حضرت علی کی تاریخِ ولادت کی برکت سے بہت مبارک سمجھی جاتی تھی۔ ان مخصوص بُری تاریخوں کے علاوہ مہینہ کی تاریخوں میں اور بھی بُری سمجھی جاتی تھیں لیکن اگر جمعرات یا جمعہ پڑ جاتا تو تاریخوں کی برائی نظر انداز کر دی جاتی تھی۔ نہان کے سلسلہ میں اُس وقت بہت زیادہ الجھن پڑ جاتی تھی۔ جب مجوزہ تاریخ میں قمر در عقرب لگا ہوتا تھا۔ علم نجوم کے ماہرین سے مشورے ہوتے۔ مولویوں سے استصواب کیا جاتا۔ بڑے بوڑھوں کی رائیں لی جاتیں اور متعدد صدقوں اور خیرات کے بعد نہان کرایا جاتا پھر بھی بہت پرانی طرز کی عزیز عورتوں کو سال بھر تک کسی نہ کسی پریشانی کے وارد ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ خیریت سے سال گزر جانے پر اطمینان ہوتا تھا۔ یہ نہان زچہ خانہ سے ملحق سائبان میں تختوں کے چوکوں پر کرائے جاتے تھے۔ ہر نہان میں دائی کی موجودگی ضروری ہوتی تھی۔ ماماؤں اور کنیزوں کو دوسرے نہان تک اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ باہر پانی گرم کر کے پردوں کو ہٹا کر پانی پہنچا دینا اُن کے فرائض میں داخل تھا لیکن نہان دائی دیتی اور اعزا مدد کرتے تھے۔ دوسرے نہان کے بعد بہت سی صعوبتیں کم ہو جاتی تھیں۔ سائبان کے پردے تھوڑی دیر کے لیے اٹھا دیئے جاتے تھے اور بیگم صاحبہ کو آفتاب کی روشنی دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ مخصوص ملازمین خواص و کنیزیں قربت کا شرف بھی حاصل کر سکتی تھیں۔ لیکن مکمل آزادی چلّے کے بڑے نہان کے بعد حاصل ہوتی تھی۔ اس بڑے نہان کے بعد زچہ پاک قرار پا جاتی تھی۔ اس کے پہلے تک برتن باسن سب الگ رہتے اور نجس سمجھے جاتے تھے۔ زچہ کے جسم سے جتنی چیزیں متصل رہتی تھیں یا مس ہو جاتی تھیں سب کو ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ بڑے نہان کے بعد زچہ خانہ کی ہر چیز علیحدہ کر کے دوسرا پلنگ اور دوسرا بستر بچھایا جاتا یا بیگم کو خود انھیں کی خواب گاہ میں منتقل کرا دیا جاتا تھا۔

لباس و طعام کے سلسلہ میں بھی زندگی معمول پر آجاتی تھی، شام کی نشست صحن میں ہونے لگتی اور وہ پھر ایک بار گھر کی ملکہ کی حیثیت سے فرمانروا ہو جاتی تھیں۔ بڑے نہان کے بعد "امن چین" سے اُٹھ کھڑے ہونے کی خوشی میں سارے عملے کو اپنے اپنے منصب کے لحاظ سے انعام و اکرام تقسیم ہوتے تھے۔ درمیانی نہان بہر حال کسی خصوصیت کا حامل نہیں ہوتا تھا اور محض ایک رسم پورا کرنے کے برابر ہوتا تھا۔ چلّے کے نہان کے اختتام پر ایک عجیب و غریب رسم بڑے بڑے خانوادوں میں رائج تھی۔ زچّہ نہانے کے بعد جب پاک و طاہر ہو جاتی تو اُس کو برہنگی کے عالم میں تختوں کے چوکے پر کھڑا کر کے اُسی کی اولادِ نرینہ میں سب سے بڑے لڑکے کو طلب کیا جاتا تھا اور اُس لڑکے کا پائجامہ اُسی سے کھلوا کر اُس کا عضوِ تناسل اُس کی ماں کو دیکھنے کی ہدایت ہوتی تھی۔ وہ منظر ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ دیکھنے والوں میں دائی کے علاوہ صرف دو یا تین بڑی بوڑھیاں ہوتی تھیں جن کی زچّہ سے عزیزداری ہوتی تھی۔ زچّہ کا انداز یہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ہاتھ رانوں میں دبائے پورے قد سے کسی قدر خمیدہ ہو کر کھڑی ہو جاتی اور اُس کے دونوں بازو آگے کی طرف بڑھے اور جھکے رہتے تھے۔ اس کی ادائی میں یہ توہم پرستی تھی کہ آئندہ ولادت بھی لڑکے ہی کی ہو گی۔

بچے کی پیدائش پر فی الفور ایک انّا دودھ پلانے کے لیے، ایک چھوچھو منہ ہاتھ دھلانے، نہلانے اور کپڑے بدلنے کے لیے اور ایک کھلائی گود میں لے کر باہر لے جانے اور بزرگوں کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے رکھ لی گئی تھی۔ تقریباً ایک سال کے اندر ایک ددا بھی ملازم رکھ لی جاتی تھی تاکہ وہ بات کرنا سکھائے۔ یہ کام انّا یا کھلائی سے متعلق نہیں رکھا جاتا تھا کیوں کہ وہ عورتیں عموماً دیہاتی ہوتی تھیں جن کا نہ "ش" اور "ق" درست ہوتا اور نہ اچھی گفتگو کر سکتی تھیں۔

بڑے نہان کے دن یا زیادہ سے زیادہ دوسرے روز انّا کو نہلا دھلا کر اور نیا جامہ زیب تن کرا کے باضابطہ طور پر بچہ اُس کے آغوش میں دیا جاتا تھا اور ساری پرورش، حفاظت اور خطانت کی ذمہ داری اسی کو سونپ دی جاتی تھی وہی اپنا دودھ پلاتی اور بچہ کو پالتی تھی۔ اس صنف کو بعض انائیں رفاقت و وفاداری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ یوں تو ہر انّا زندگی بھر جس گھر میں دودھ پلاتی اُسی گھر کی ہو رہتی تھی لیکن بعض ایسی تھیں جو اپنے بچہ سے زیادہ مالکہ کے بچہ سے محبت کرتی تھیں۔ ایسی مثالیں بکثرت ملتی تھیں جہاں انّاؤں کے بچے

ضائع تک ہو گئے تھے مگر انھوں نے صبر کی سل کلیجے پر رکھ کر اپنا دل سرکار کے بچوں ہی سے لگائے رکھا تھا۔ ان بچوں کو بھی اپنی اناؤں سے جوان ہو جانے کے بعد بھی محبت برقرار رہتی تھی اور وہ اُن کو اپنی ماں سے کبھی کم نہیں سمجھتے تھے۔ دودھ پلانے کا رشتہ اتنا مستحکم ہوتا تھا جس کو آنے والے کسی قسم کے بھی حالات متزلزل نہیں کر سکتے تھے۔ میری انا نے میری والدہ مرحومہ کے انتقال کے چوتھے روز ۱۹۱۴ء میں وفات پائی تھی۔ چونسٹھ برس گزر جانے کے بعد بھی جس طرح والدہ مرحومہ کی یاد دل کو تڑپا دیتی ہے اسی طرح انا کا چہرہ یاد کر کے اب بھی سسکیاں بھرنے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے وہ محبت بھری نظریں کبھی نہ بھولیں گی جب میری انا مدرسے جاتے وقت میری دونوں جیبوں میں چلغوزے بھر دیتی تھی یا اسی طرح میری زندگی کا وہ واقعہ بھی میری انا ہی سے متعلق تھا جس نے میری تمام آئندہ زندگی کا دھارا میرے والدین کی مرضی کے خلاف بدل دیا تھا۔ میرے گھر کا ماحول بھی شدت سے مذہبی تھا۔ والدین چاہتے تھے کہ مجھے فارغ التحصیل کرا کے عراق بھیج کر سندِ اجتہاد سے بہرہ یاب کرائیں۔ میں نے اسی سال ملّا کا امتحان دیا تھا لیکن عربی تعلیم میں دل نہیں لگتا تھا۔ طبیعت بغاوت پر آمادہ تھی اور در پردہ انگریزی کے حروف تہجی یاد کر لیے تھے۔ دفعتاً ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ میں مر گیا ہوں۔ قبر میں نکیرین نے آکر مجھے اٹھا کر بٹھایا اور کچھ سوالات کیے جن کے جوابات میں اے بی سی ڈی میں نے پڑھ کر سنا دی۔ یکایک جھٹکے سے آنکھ کھلی۔ پہلو میں انا کا پلنگ تھا وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی اور مجھ سے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ میں اُس سے دل کی ہر بات کہہ دیتا تھا۔ یہ خواب بھی سنا دیا۔ دوسرے روز صبح کو والدہ مرحومہ جب ناشتہ سے فراغت کر کے کتب بینی میں مشغول تھیں۔ انا نے رات کا سب حال سنا دیا۔ والدہ مرحومہ بے قرار ہو کر رو ئیں، والد مرحوم کو اطلاع ہوئی۔ اُن کا چہرہ غصہ کے مارے سرخ ہو گیا۔ کئی دن تک مجھ پر حزن و ملال طاری رہا۔ مجھے یہ ندامت بھی تھی کہ میں نے انا سے اپنا خواب کیوں بیان کر دیا۔ لیکن بیان کر دینے کے بعد چارہ ہی کیا تھا۔ والد مرحوم اپنے مذہبی عقائد میں بہت راسخ تھے اور اُن کے سختی سے پابند تھے۔ لیکن میں اولادِ اکبر تھا اس لیے میری خاطر بھی عزیز تھی۔ والدہ مرحومہ کو مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔ اور انا حقیقتاً مجھ پر عاشق تھی۔ ہفتہ عشرہ تک کشمکش رہی اور گھر کا نظام درہم برہم رہا۔ میں بھی اپنے ارادہ پر جما رہا اور کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اپنے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی گوارا کر سکوں گا۔ میری عمر صرف بارہ برس کی تھی لیکن ملّا کا امتحان پاس کر لینے کے بعد

شمار تعلیم یافتہ طبقہ میں ہونے لگا تھا۔ اس لیے رفتہ رفتہ میری خواہش والدہ مرحومہ کو قبول کرنا پڑی۔ والد مرحوم رضامند تو نہ ہوسکے لیکن اُن کی مخالفت بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔ چند ماہ کی محنت کے بعد میرا داخلہ انگریزی اسکول میں ہوگیا۔ میری اس کامیابی میں میری انا کی پرخلوص ہمدردیاں شامل تھیں۔ انائیں صرف دودھ ہی پلاکر بچوں کی پرورش نہیں کرتی تھیں بلکہ اُن کے بقدرِ صلاحیت بچوں کی زندگیاں بنانے اور بگاڑنے میں بھی اُن کا ہاتھ کارفرما رہتا تھا۔

نومولود اپنی انا کے ہمراہ رات کو بھی سلایا جاتا تھا۔ لیکن بہت جلد اُسی کمرہ میں دو پلنگ اور بچھ جاتے تھے۔ انا اور بچے کے پلنگ سے متصل کھلائی کو جگہ دی جاتی تھی اور قریب ہی چھوچھو کا بھی پلنگ ہوتا تھا۔ چھوچھو کا کام بچے کو صاف ستھرا رکھنا اور کپڑے پہنانا تھا۔ چھوچھو انا کے ماتحت ہوتی تھی۔ کھلائی ماتحت تو نہیں لیکن انا سے کم مرتبت ضرور ہوتی تھی اُس کا کام بچے کو بہلانا یعنی انا کی رفیقِ کار رہنا تھا۔ جب بچے کا سن چھ ماہ سے تجاوز کر جاتا تو کھلائی محل کے باہر ہوا کھلانے کے لیے لے جاتی تھی۔ جتنا جتنا بچے کا سن بڑھتا کھلائی اور چھوچھو کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی تھی۔ لیکن بچے کو جوان ہوجانے کے بھی جو اُنس انا سے ہوتا وہ کھلائی یا چھوچھو سے نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ بچہ گو کہ ماں سے علیحدہ کمرہ میں رکھا جاتا تھا۔ انا کا دودھ پیتا تھا اور انا ہی کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھتا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ اُس کی ماں یعنی بیگم صاحبہ اُس کی طرف سے غافل ہوجاتی تھیں، ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ ہر وقت فکر لگائے رہتی تھیں۔ دن میں متعدد بار انا کو بلاتیں اور بچے کو اپنی گود میں لے کر پیار دلار کرتی تھیں۔ ذرا بھی طبیعت مضمحل ہوجاتی تو اُن کی رات کی نیند حرام ہوجاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب تک مکمل طور پر اطمینان نہ ہوجاتا خود اُٹھ اُٹھ کر بچے کے کمرے میں جاتیں۔ کبھی لالٹین یا شمع منگا کر اُس کا چہرہ بغور دیکھا کرتیں۔ کبھی ماتھا چھو کر بخار کا اندازہ فرماتیں اور کبھی سانسیں گن کر اپنی تشفی کرتی تھیں۔ محبتِ مادری میں کمی نہیں تھی اور چار پانچ برس کا سن ہوجانے پر تربیت کی اصل ذمہ داری بھی انھیں کے اوپر آجاتی تھی۔

روسا و عمائدین کے بچوں کی اتنی سخت دیکھ بھال اور ضرورت سے زیادہ اتنا پرہیز ہوتا تھا کہ اُن کو کسی بڑی بیماری کے ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے گھروں میں بچوں کی اموات کی تعداد بہت کم تھی۔ ان لوگوں کی عمریں بھی بڑی ہوتی تھیں اور ایک

ایک رئیس بہت سی ذکور و اناث اولاد چھوڑ کر دارِ فانی سے انتقال کرتا تھا۔ دودھ پینے کے زمانہ میں معمولی کھانسی نزلہ اور حرارت کے عوارض ہوتے تھے جن کا علاج خاندانی اطبا کر دیا کرتے تھے۔ بچہ کسی وجہ سے نڈھال ہوتا تو بلا اور آسیب کا اثر سمجھا جاتا تھا جس سے محافظت کے بے شمار سامان ہر وقت فراہم رہتے تھے۔ نومولود کو کمرے میں لانے کے قبل ہی کسی بلند مقام پر قرآن مجید رکھ دیا جاتا اور آیاتِ قرآنی نیز متبرک احادیث کے کتبات خوب صورت فریموں میں دیواروں پر آویزاں کر دیے جاتے تھے۔ ابھی بچہ وزن سنبھالنے کے قابل بھی نہ ہوتا تھا کہ اُس کے گلے میں ہیکل پڑ جاتی تھی۔ اس ہیکل میں بارہ اماموں کے نام کندہ کی ہوئی چاندی کی بارہ تختیاں اور نیچے ایک چھوٹی چاندی کی ڈبیا لٹکتی ہوتی تھی۔ اس ڈبیہ میں موم جامہ کے اندر قرآن مجید کی ایک بہت چھوٹی سی جلد ہوتی تھی۔ انتہائی باریک خط میں پورا قرآن چھپا ہوتا تھا۔ اُس زمانہ میں اس جلد کا چند آنوں میں ہدیہ ہو جاتا تھا۔ اِس کے علاوہ بیگم صاحبہ کے اعزا مستورات بھی ہر روز بچہ کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں کیا کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ خود بھی دن میں کئی بار چاروں قل پڑھ کر دم کر دیا کرتی تھیں۔ نواب صاحب بچہ کو بلا کر دیکھتے تو وہ بھی کچھ نہ کچھ تلاوت فرما دیتے تھے۔ مذہبی عقیدے کے تحت ان تمام انتظامات اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ضرورت سے زیادہ احتیاطیں بھی برتی جاتی تھیں جن میں بعض آج کل کے اصولوں کے تحت سر تا سر منافیِ صحت تھیں۔ مثلاً یہ کہ ہوا کی زد ہی نہیں بلکہ ہوا لگ جانے سے بچہ کو سختی کے ساتھ محفوظ رکھا جاتا تھا، پانی پلانا منع تھا، روزانہ نہلانے کا دستور نہیں تھا، گھر بھر میں کسی نے بھی موسم کا بہانہ لے کر نہلانے پر ٹوک دیا تو جمعہ کا دن بھی ٹل جاتا تھا۔ کمرہ میں بہت زیادہ بند رکھا جاتا تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ باہر کی آنے جانے والی عورتوں کی نظر لگ جانے کا خطرہ بُری طرح محسوس کیا جاتا تھا۔ انا کی غذاؤں پر سختی سے نگاہ رکھی جاتی تھی۔ اُس کو بہترین غذائیں کھلائی جاتی تھیں لیکن ثقیل، ترش اور بادی چیزوں کے استعمال پر سخت پابندی عائد رہتی تھی۔

بچہ پیدا ہونے کی خوشی آدمی کی خصلت میں داخل ہے۔ امیر و غریب سب مسرور ہوتے ہیں اور اپنی اپنی حسبِ استطاعت اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ روسا و عمائدین کے یہاں اظہارِ مسرت میں بڑی بڑی دھومیں مچائی جاتی تھیں۔ زچہ خانہ سے یہ خبر مشتہر ہوتے ہی کہ "بچہ ہوا" اور قطعی طور پر یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ "لڑکا ہوا" شادیانے بجنے لگتے تھے

صدر دروازے پر شہنائی والے اپنی فن کاریوں کا مظاہرہ کرتے ملازموں کا عملہ خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا۔ سب کے دلوں کو انعام واکرام پانے کی توقعات گرمانے لگتے تھے۔ اور اُن کی ہوسناکیاں پوری ہونے کا ہنگام آجاتا تھا۔ صبح وشام دعوتیں ہوتی تھیں۔ دوست احباب اور اعزا واقارب مبارک باد دینے کے لیے آتے اور اُن سب کی تواضع وقت اور موقع کے لحاظ سے ضرور ہوتی تھی۔ ان انفرادی یا مخصوص طور پر اجتماعی دعوتوں کے علاوہ بڑے پیمانے پر جشن ہوتے تھے اور نومولود کی عمر کے پہلے ہی سال میں بہت سی خوشی کی تقاریب منعقد ہوتی تھیں۔ اِن سب کا تذکرہ اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ اس مقام پر صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہوگا کہ روسا کے گھر میں بڑی منتوں اور مرادوں سے بچے پالے جاتے تھے اور بڑے ناز و نعم سے اُن کی پرورش ہوتی تھی۔ محل بھر ہمہ وقت اُن پر قربان ہوتا تھا اور بچے ماں باپ کی آنکھ کا تارا بنے رہتے تھے۔ اُن کی عہدِ طفولیت کے ابتدائی دو تین برس اُن کے پرستاروں کی آغوش ہی میں گزر جاتے تھے۔ اس کے بعد تربیت وتعلیم کا دور شروع ہو جاتا تھا۔

## (۷) تربیت و تعلیمِ اطفال

روسا کے بچوں کی تربیت حقیقی معنوں میں اُسی وقت سے شروع ہو جاتی تھی جب وہ انا کے آغوش میں مٹھیاں باندھنے، ٹانگیں اچھالنے اور قلقاریاں مارنے لگتے تھے اور جب وہ کھلائی کی گود میں ہوا خوری کے لیے محل کے باہر لے جاتے جاتے تھے۔ اناؤں اور کھلائیوں کو مامور کرنے کے قبل کئی دن تک اچھی طرح پرکھ لیا جاتا تھا اور یہ معائنہ گھر کی بڑی بوڑھیاں کیا کرتی تھیں۔ سب سے بڑی معلّمہ مادرِ گرامی یعنی بیگم صاحبہ خود ہوتی تھیں۔ جن میں شرافت و انسانیت، مہر و مروّت اور پاک بازی و فرض شناسی کے جوہر پیوست ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے لکھنؤ کے روسا و عمائدین کم سے کم تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کردار و شرافت کے مالک ہوتے تھے۔ دودھ پینے کے زمانے میں ہی اُن کو انگوٹھا بالخصوص پیر کا انگوٹھا چوسنے سے حکمتِ عملی کے ساتھ باز رکھا جاتا تھا۔ انا دودھ پلانے میں اس کا لحاظ رکھتی تھی کہ اتنی شکم پُری نہ ہو کہ معدہ غذا اُگل دے یا ہضم کرنے میں دیر لگائے۔ فطری جسمانی اخراجات میں پابندیٔ اوقات کی کوشش رہتی تھی اور بچے کے جسم پر غلاظت

بھری رہنا قطعاً گوارا نہیں ہوتا تھا۔ کھلائی یا ددا باہر نکلتی تو بچہ کو ہر اُس نظارے سے بصد ہزار اہتمام محفوظ رکھتی جو اخلاق سوز یا جمالیاتی مذاق کے منافی ہوتا۔ بچہ کے رو دینے پر انا اور ددا نیز چھوچھو سب بے قرار ہو جاتے تھے اور اُس کے کمرہ میں بہت زور سے بات کرنا، چیخنا یا کسی کو ڈانٹنا سختی کے ساتھ ممنوع تھا۔ دودھ بڑھائی کے بعد اِن توجہات پر اور زیادہ پابندی ہوتی تھی۔ نمک چشی کے بعد غذاؤں پر آمادہ کرنے کی فکر ہو جاتی اور ایک سال کی عمر تک پہنچ جانے کے بعد ہر ملازم خدمت گزار بات کرنا سکھاتی تھی۔ اس تعلیم میں مادرِ گرامی بھی شریکِ کار رہتی تھیں۔ نگرانی بھی فرماتیں اور خود بھی بات کرنا سکھاتی تھیں۔ سب سے بڑا رکھ رکھاؤ یہ تھا کہ محل کے اندر یا باہر بچہ کے کان میں کوئی فحش کلمہ یا بد تہذیبی کی بات نہ پہنچ سکے۔ پرہیز اور احتیاط: بچوں کی تربیت میں سب سے ز دہ اہم ضرورت تھی اور اسی ضرورت کو پورا کرکے بچہ کو مہذّب اور شائستہ بنا دیا جاتا تھا۔ تربیت کا یہ طریقہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ الفاظ یا عمل سے بچہ کو کسی بات سے بھی ٹوکا یا روکا نہیں جاتا تھا بلکہ یہ فکر رہتی تھی کہ بچہ خود ہی کسی نامناسب یا غلط حرکت کی طرف آمادہ نہ ہو۔ یہی عدم آمادگی بلندیٔ کردار کا سنگِ بنیاد ہوتی تھی۔

بچہ کی عمر دو برس سے تجاوز کر جاتی تو اُس کو کھانا کھانے، اٹھنے بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کے عادات میں تربیت دی جاتی تھی۔ بہت دیر تک چت لیٹنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا، جاگتے یا سوتے میں دونوں ہاتھ سینہ پر آجانا یا ٹانگ پر ٹانگ دھر لینا بہت منحوس تھا۔ ان اطوار سے بچوں کو بچانے کے لیے اُن کو بار بار کروٹیں دلا دی جاتی تھیں۔ یہ عادت اُن کے خمیر میں اتنی راسخ ہو جاتی تھی کہ آخر عمر تک کروٹیں ہی لے کر محوِ خواب ہوتے تھے اٹھنے بیٹھنے میں بھی بزرگوں کے عادات و اطوار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چھوچھو یا ددا سہارا دے کر اٹھاتی اور بٹھاتی، انگلی پکڑ کر کھڑا کرتی اور ٹہلاتی تھی، زور سے دوڑنے کا کوئی موقع ہی فراہم نہیں ہونے پاتا تھا۔ چھوچھو کا یہ فرض عین تھا کہ وہ ہر وقت بچہ کے ہاتھ پاؤں، سر اور چہرہ صاف و شفّاف اور ہمہ وقت اُجلے کپڑوں میں ملبوس رکھے۔ چھوچھو کی اس ریاضت سے بچہ خود صفائی اور پاکیزگی کا خوگر ہو جاتا تھا اور جب بھی جسم کے کسی حصہ پر میل آجاتا یا کپڑے پر غبار آجاتا تو وہ اپنی جبلّی خصلت کے تحت اُس طرف انگلی سے اشارہ کرکے دوسروں کو متوجہ کر دیتا تھا۔ فی زمانہ دودھ پیتے بچوں میں ایسے خصائل کا موجود ہونا لوگوں

کو باور نہ ہوگا لیکن راقم کے خاندان میں دو برس سے کم کی عمر کے شیر خوار بچوں میں ایسی دو مثالیں آج بھی موجود ہیں۔ انھیں دو بچوں میں غذاؤں کے پرانے اطوار بھی ملتے ہیں کھلائی اور چھوچھو تمیز سے گود میں لے کر یا بٹھا کر صاف چینی کے خوش نما برتنوں میں کھانا کھلاتی تھی۔ یہ غذائیں عموماً کھیر یا کھچڑی ہوتی تھیں۔ فیضِ تربیت سے یہ نونہال ایک نوالہ بھی فطری ضرورت سے زیادہ منہ میں رکھنا قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح کھچڑی کی پلیٹ میں اگر اتفاقاً کوئی لونگ، جس سے کھچڑی بگھاری جاتی تھی، نظر آجاتی تو بچہ کھانا کھانے سے فی الفور انکار کر دیتا تھا۔ پھول دار اصلی چینی کی پلیٹوں میں روسا کے کھانا کھاتے کا عام رواج تھا۔ فلاکت منڈلانے کے بعد بھی ایرانی مٹی کے بنے ہوئے مصنوعی ظروف استعمال ہوتے تھے۔ ان میں بھی رنگینی، چمک دمک، رنگ روغن، نفاست ولطافت اور جاذبیت اصلی چینی سے مشابہ ہوتی تھی۔ بچہ کو زیادہ سے زیادہ رنگین، پھول دار اور خوش نما پلیٹ میں کھانا کھلایا جاتا تھا۔ سادہ اور سفید برتن میں کھانا دینا انتہائی بدتہذیبی تھی۔ اس تمام تربیت میں انّا، کھلائی، ددا، اور چھوچھو کا حصّہ تھا اور بیگم کی نگرانی بھی شاملِ حال رہتی تھی۔ وہ ہر مناسب موقع اور محل پر باہر تشریف لا کے وقتاً فوقتاً معائنہ فرما لیا کرتی تھیں اور ضرورت ہوتی تو ہدایات بھی جاری کرتی تھیں جن کی تعمیل ہر ملازمہ بدل وجان کرتی تھی۔

بعض خاندانوں میں تیسرے برس اور کہیں پانچویں برس بچوں کی خواہ لڑکا ہو یا لڑکی رسم بسم اللہ ادا ہوتی تھی۔ اعزا واقارب، دوستوں اور ملازموں کے مجمع میں کوئی عالمِ دین بسم اللہ پڑھا کے قرآن مجید کے سورہ "اقرأ باسم" کی پہلی آیت بچہ کی زبان پر وارد کراتا تھا۔ اس کے بعد لڑکی کو گھر کی استانی اور لڑکے کو باہر کے معلّم کو تعلیم کی خاطر سپرد کر دیا جاتا تھا۔ لیکن لکھنؤ کے پرانے کلچر کی اصلی بنیاد تہذیب وشائستگی، شرافت وانسانیت، رواداری و پاسداری، حُسنِ سلوک اور مراعات اور رئیسوں کے تزک واحتشام پر قایم تھی۔ ان بنیادی محاسن کردار واطوار میں تعلیم سے زیادہ تربیت ضروری تھی اور یہ تربیت سنِ شعور آجانے تک بچہ کی مخصوص ملازماؤں اور اُنھیں سے کہیں زیادہ والدین کے ذمہ رہا کرتی تھی۔ محل کے اندر والدۂ محترمہ ہر معاملہ میں پاکیزہ اور محترم درس دیتی تھیں اور بیرونی نشست گاہ میں یہ فریضہ پدرِ عالی مقدار ادا کرتے تھے۔ بسم اللہ ہوجانے کے بعد کھلائی کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ

لڑکے کو نواب کے حضور کسی نہ کسی وقت ضرور لے جاکر بٹھادے۔ اس شرفِ حضوری کے حاصل کرنے میں طوائف کی موجودگی، رقص و سرود کی بزم یا بے تکلف دوستوں کی بے تکلفانہ گفتگو کوئی امر بارج نہیں ہوتا تھا۔ نئی روشنی کا چراغ جلنے کے بعد اگر کوئی حاضر الوقت نواب کے لڑکے کو ایسی صحبتوں میں بٹھائے رکھنے پر اعتراض کرتا تو فی الفور جواب ملتا تھا کہ "اپنی اولاد کو ہر شعبۂ حیات میں سبق دینے کا اور اُس کو زندگی کی ہر شاہراہ میں صحیح راستہ پر چلنا سکھانے کا فریضہ پروردگارِ عالم نے مجھ پر عائد کیا ہے، اس فرض کی ادائی میں ہر کوتاہی کے لیے میں خدا کے آگے جواب دہ ہوں گا۔" اس طرزِ عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ لڑکے اپنی اپنی جبلّی صلاحیتوں کے تحت زندہ رہنے اور اچھی زندگی گزارنے کا سبق لینے یا خود اپنی فطری کمزوریوں میں گرفتار ہو کر خراب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی تھیں کہ طوائف باز رئیسوں کے بچے بڑے ہو کر ثقہ اور معصوم صفت بن جاتے تھے۔ بعض ایسے بھی نکلتے تھے جو تنعم اور عیش پرستی میں اپنے بزرگوں کا چھوڑا ہوا کثیر سرمایہ قلیل سے قلیل تر مدّت میں تباہ و برباد کر دیتے تھے۔ راقم اس خیال کا حامل ہے کہ یہ بدکرداری بزرگوں کے آزادانہ رکھ رکھاؤ کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتی تھی بلکہ اُن کی تباہی میں اُس زمانہ کے عام ماحول کا اثر شامل تھا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لڑکے مردانی نشست گاہ میں بیٹھ کر تعیش و تنعم کے مظاہروں سے کبھی کوئی خراب اثر قبول ہی نہیں کرتے تھے، وہ یقیناً خراب اثرات بھی قبول کرتے رہے ہوں گے لیکن اُن کی اپنے پدرِ عالی مقدار کی بارگاہ میں موجودگی بمقابلہ خراب اثرات کے اچھے عادات و اطوار سیکھنے میں زیادہ ممد و معاون ہوتی تھی۔

خوش کرداری اور خوش اطواری کی تربیت والدین کس طرح دیتے تھے، یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں راقم وہی واقعات پیش کرنا چاہتا ہے جو عہدِ طفولیت میں خود اُس پر گزرے تھے۔ اور جنھوں نے پتھر کی لکیر کی طرح حافظہ پر اثر ڈالا تھا۔ والدہ مرحومہ کا طرزِ تربیت یہ تھا کہ وہ پاس بٹھا کر کچھ سوالات کرتی تھیں جن کے جوابات سے وہ کوئی نہ کوئی موضوع ٹٹول کر نکال لیتی تھیں۔ پھر اسی موضوع پر ایک طویل گفتگو فرماتیں یعنی ایک لکچر دیتی تھیں۔ اُن کا طرز دل پزیر ہوتا تھا جس میں شفقتِ مادری بھی شامل ہوتی تھی۔ اس لیے اُن کی لمبی سے لمبی تقریر میں بھی دل نہیں گھبراتا تھا۔ دورانِ تقریر وہ متعدد احادیث اور آیاتِ قرآنی پڑھ کر سناتی تھیں، پھر اُن کے ترجمے کر کے مطلب

سمجھاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ موضوعِ سخن سے جن باتوں کو دور کا بھی لگاؤ ہوتا وہ سب اُن کے بیان میں آجاتی تھیں۔ اُن کے اس طرزِ عمل کا یہ فیض تھا کہ میں اپنی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق پہلا کار آمد درس انھیں سے سیکھ لیا تھا۔ اس مقام پر صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ والدِ مرحوم کے ایک دوست پنڈت اننت رام کٹر مذہبی انسان تھے لیکن خلوص و محبت کا مجسّمہ تھے۔ والدِ مرحوم بھی بہت مذہبی تھے اور غیر مسلمین کے ہاتھ کی کوئی تر چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح پنڈت اننت رام ہمارے گھر کا نہ پان کھاتے اور نہ پانی پیتے تھے لیکن ہمارے درمیان اتنی قربت تھی کہ میں اُن کو چچا کہتا تھا اور وہ میرے اوپر حقیقی چچا کی طرح شفیق تھے۔ جاڑے کا موسم تھا میرا سِن چھ یا سات برس کا تھا اور میں نزلہ میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے ناک سے کچھ ریزش ہوئی۔ پنڈت جی نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور میری ناک صاف کر کے اُس کو پھر جیب میں رکھ لیا۔ اُن کی یہ حرکت میرے دل و دماغ کو باوجود صغر سنی کے متاثر کر گئی۔ شام کو جب میں اپنے کمرے میں کھانا کھا رہا تھا مجھے دفعتاً صبح کا واقعہ یاد آگیا۔ نوالہ منہ میں تھا اور میں ہاتھوں نیز چشم و ابرو سے کچھ اشارے کر رہا تھا۔ دفعتاً والدہ محترمہ تشریف لے آئیں۔ دور سے وہ میری اشارہ بازیاں ملاحظہ کر چکی تھیں۔ کچھ وقفہ تک توقف فرما کے اور اِدھر اُدھر دیکھ بھال کر کے انھوں نے میرے خیالات کا جائزہ لیا۔ میری تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ میں اُن سے بلا تکلّف ہر بات صحیح صحیح کہہ دیتا تھا اور طبیعت میں کوئی جھجک نہیں پیدا ہوتی تھی۔ اس موقع پر بھی میں نے سارا واقعہ اُن کو سنا دیا۔ اور یہ سوال کیا کہ ”کیا ہماری ناک پاک ہے؟“ وہ مسکرائیں اور میں نے اُن کے پوچھے بغیر اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ”چچا ہمارے گھر کا پانی نہیں پیتے، پان نہیں کھاتے، ہمارے گھر کی ہر چیز کو نجس سمجھتے ہیں لیکن ہماری ناک کو انھوں نے نجس نہیں سمجھا، اپنا ہاتھ اور اپنا رومال خراب کیا اور اُس رومال کو پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔“ محترمہ کے طویل جواب کا ملخص یہ تھا۔ ”تم بھی تو اُن کے یہاں کی کوئی چیز نہ کھاتے اور نہ پیتے ہو تو کیا اس پرہیز کی وجہ سے وہ تمھارے چچا نہیں رہے۔ باوجود اس طرزِ عمل کے وہ تمھارے چچا ہیں اور تم اُن کے بھتیجے ہو۔ یہ رشتہ انسانیت کی بنیاد پر استوار ہے۔ اس رشتہ کے علاوہ بالکل علیحدہ نوعیت پر ایک دوسرا رشتہ جو انسانیت میں خلل انداز نہیں ہوتا مختلف مذاہب نے خدا اور بندوں کے درمیان قایم کیا ہے۔

مذہب نے زندگی کے علیحدہ علیحدہ طرز ضرور قایم کیے ہیں جن کی پابندی کرتے ہوئے تم اُن کے یہاں اور وہ تمھارے یہاں کچھ نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں لیکن مذہب کی کوئی طرز انسانی برادری میں حدِ فاصل قایم نہیں کرتی۔ وہ اپنے دھرم پر ہیں اور تم اپنے مذہب کے پابند ہو لیکن اس کے باوجود وہ چچا ہیں اور تم بھتیجے ہو اور کوئی مذہبی تفریق تم کو اُن سے یا اُن کو تم سے جدا نہیں کر سکتی۔ یہ عزیز دارانہ تعلق اتنا ہی فطری ہے جتنا مذہب کی تعلیم پر عمل کرنا برحق ہے۔" والدہ محترمہ نے اپنے ان اقوال کی تائید میں متعدد آیات و احادیث کو استدلال میں پیش کیا تھا اور اپنا نکتۂ خیال میرے ذہن میں اتنا راسخ کر دیا تھا کہ وہی درس میری سیاسی زندگی میں میرے لیے مشعلِ راہ بنا رہا۔

والد مرحوم کا طرزِ تربیت بالکل مختلف انداز کا تھا۔ وہ طویل گفتگو یوں بھی نہیں فرماتے تھے۔ دوستوں کے مجمع میں یا مقربین کی صحبت میں بھی خود بہت کم بات کرتے تھے زیادہ تر دوسروں کو مخاطب کر کے باہم دگر سوال و جواب پر آمادہ کر دیتے تھے اور خود مسکرا مسکرا کے دوسروں کی باتیں سنا کرتے تھے۔ وہ کسی قدر مغلوب الغضب بھی تھے لیکن جب غصہ آجاتا تھا تو دو کلمے زور سے کہہ کر یک لخت سکوت اختیار کر لیتے۔ میرے ساتھ زندگی بھر یہ طرزِ عمل رہا کہ کوئی بات خلافِ مزاج ہوتی تو ایک خشن آواز میں "ہوں" کہہ کر گہری سانس لیتے اور خاموش ہو جاتے تھے۔ میرے عہدِ طفولیت میں جب کھلائی اُن کے حضور بٹھا کر ہٹ جاتی تو وہ یہ چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ دیر تک اُن کی آنکھوں کے سامنے بیٹھا رہوں۔ میری تسلّی کے لیے کبھی کوئی تصویر مرحمت فرماتے، کبھی کوئی کھلونا عنایت کرتے اور کبھی تو وہ خود بچوں کی طرح میرے ساتھ کھیلنے لگتے تھے۔ مردانہ نشست گاہ میں میرے دورانِ قیام وہ میرے سر سے پاؤں تک نگاہ رکھتے تھے۔ پوشاک یا اعضا و جوارح کی صفائی میں کوئی نقص ہوتا تو ملازمہ کے بجائے مجھ پر اعتراض وارد کرتے تھے لیکن اس اعتراض میں الفت و رافت جھلکتی تھی۔ مجھے دوسروں سے بات کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہ چاہتے تھے کہ وہ مجھ سے گفتگو کریں۔ اس بات چیت میں کبھی زبان و بیان پر اعتراض ہوتا تو کبھی واقعات پر تبصرہ فرماتے تھے۔ اُن کے اس طرزِ عمل سے مجھ میں بات کرنے کا سلیقہ آیا اور میں نے واقعات کو صحت کے ساتھ پیش کرنے کا طرز سیکھا تھا۔ ان نشستوں میں اُن کے خدمت گار اور مخصوص ملازمین وقتاً فوقتاً حاضر ہوا

کرتے تھے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا حکم دے دیتے تھے کہ ملازم کو مجھ سے یا مجھے ملازم سے بات کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی تھی۔ نوکر کو تخاطب کرنے میں میرے لیے "آپ" کہنا ضروری تھا۔ محل کے اندر بعض کنیزوں سے تم کہہ کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اگر بھولے سے کبھی کسی ملازم کو اُن کے حضور تم کہتا تو وہ خفا ہو جاتے تھے اور مجھے اُس ملازم سے معذرت کرنا پڑتی تھی۔ میری معذرت خواہی پر وہ خوش ہو جاتے اور بڑی شفقت سے یہ فرماتے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ بچوں کو ڈانٹنے اور اُن پر خفا ہونے کو وہ بہت بُرا سمجھتے تھے۔ کسی دوسرے کے بچہ کی باہر سے رونے کی آواز آجاتی تو بے قرار ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی گھبرا کے خود ہی نشست گاہ سے باہر آکر رُلانے والے پر برہم ہوتے تھے۔ بچہ کو مار دینا اُن کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا لیکن تمام عمر میں انھوں نے مجھے میرے عہدِ طفولیت میں صرف ایک بار ایک تھپڑ مار دیا تھا اور یہ واقعہ مجھے تا حیات یاد رہے گا۔

اس واقعہ کو پیش کرنے کے قبل یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ والد مرحوم نے بہت طویل عمر پاکر ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا تھا۔ اُس وقت میری عمر اڑتیس برس کی تھی لیکن اُس ایک واقعہ کے علاوہ میری کسی انتہائی خلافِ مزاج حرکت پر بھی جو بکثرت سرزد ہوتی تھیں انھوں نے کبھی کسی شدید برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ غیر معمولی کٹر قسم کے مذہبی انسان تھے اور میں انگریزی تعلیم حاصل کر کے اُن کے نزدیک لامذہب اور بے دین ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال سے اُن کو میری ذات سے بہت صدمہ رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ انھیں کے کسی مخالف نے اُن کو روحانی ایذا پہنچانے کے لیے یہ خبر سنا دی کہ میں نے مے نوشی اختیار کر لی ہے۔ انھوں نے اُس شخص کو یہ جواب دیا کہ میں بالغ و عاقل تھا لہٰذا اپنے افعال کا خدا کو خود جواب دہ تھا۔ جہاں تک اُن کا تعلق تھا وہ امورِ شرعیہ کی تعلیم دلوا کر بری الذمّہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے اُس شخص کو یہ جواب تو دے دیا تھا لیکن وہ خبر اُن کے دل و دماغ میں کانٹے کی طرح کھٹکا کرتی تھی۔ کچھ مدّت کے بعد انھوں نے یکایک مجھ سے باز پرس کر ڈالی اور خبر کی صحت و عدمِ صحت کے بارے میں براہِ راست سوال کر لیا۔ میں اسی سال وکالت کے پیشہ میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ "قبلہ یہ سوال آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اگر میں شراب پیتا ہوں اور جواب اثبات میں دیتا ہوں تو آپ کو سخت صدمہ ہوگا۔ اور اگر نہیں کہتا ہوں تو جھوٹ بولنے کے گناہ کی سزا کا مستوجب ہوں گا۔" انھوں نے

میرے اس جواب پر "ہوں" کہہ کر بہت گہری سانس لی اور خاموش ہو گئے۔ اُن کے ایک حاضر الوقت دوست نے جن کو میں چچا کہتا تھا خفگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بد تہذیب قرار دیا۔ میں نے مودبانہ جواب دیا کہ جھوٹ بولنے کے مقابلہ میں بدرجہا بد تہذیبی بہتر ہے اور جھوٹ بولنے سے اجتناب جناب محترم کی تعلیم ہی کا اثر ہے۔ اُن کو زیر نظر واقعہ نہیں معلوم تھا لیکن میرے پیشِ نظر وہی تھپڑ تھا جو زندگی میں ایک بار اُن کے ہاتھوں مجھ پر پڑا تھا۔

یہ واقعہ اُس زمانہ سے متعلق تھا جب میں عربی مدرسہ کا طالب علم تھا اور میری عمر آٹھ برس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ والد مرحوم کو بہترین قلم سے لکھنے کا ذوق تھا اور وہ اپنے قلم بڑی محنت و کاوش سے خریدتے تھے۔ اُس زمانہ میں اُن قلموں کو "کلک" کہتے تھے اور بہترین کلک کی چوک میں زیادہ سے زیادہ دو دو کانیں تھیں۔ یہ "کلک" گراں بھی ہوتے تھے یعنی یہ کہ ایک ایک قلم کئی پیسے کا ہوتا تھا۔ کلک بہت مضبوط، خوش رنگ اور خوشبودار ہوتا تھا۔ بنانے والے بڑی محنت سے بناتے تھے۔ والد مرحوم کو یہ قلم اتنے عزیز ہوتے تھے کہ وہ کسی کو چھونے تک نہیں دیتے تھے۔ میں نے کم سنی کی جہالت میں اُن کے قلم دان سے ایک قلم بغیر اُن کی اجازت و اطلاع سے نکال لیا اور برابر اسی سے لکھنے لگا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک روز اُن کی نظر پڑ گئی۔ والدہ مرحومہ کی طرح وہ بھی خبر گیری کے لیے ہمارے کمرے میں کبھی کبھی آجاتے تھے۔ انھوں نے مجھے کلک سے لکھتے ہوئے دیکھا اور بے تابانہ قریب آکر دریافت کیا کہ یہ قلم کہاں سے لائے۔ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ کلک کم یاب تھا۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ اسکول سے واپسی پر خریدا تھا۔ انھوں نے غصّہ ضبط کر کے دوسرا سوال کیا۔ کہ کہاں سے خریدا۔ میں نے ایک فرضی دکاندار کا نام بھی بتا دیا۔ اب انھوں نے تیسرا سوال کیا کہ کتنے کو خریدا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ وہ قلم قیمتی ہوتا تھا اس لیے برجستہ کہہ دیا۔ کہ ایک پیسہ کو۔ اب اُن کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انھوں نے ایک تھپڑ مارا اور فرمایا کہ "چوری کرتا ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے"۔ گھر میں یہ واقعہ ایک سانحہ عظیم کی حیثیت رکھتا تھا۔ والدہ مرحومہ بہت روئیں، میری انا نے کئی وقت کھانا نہیں کھایا، والد مرحوم کے حضور ایک مدت تک نہ میں گیا اور نہ وہ خود میرے کمرے میں آئے۔ جہاں تک میرے تاثرات کا تعلق ہے آج تک میں جھوٹ

بولنے کو سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور وکالت کے پیشہ میں داخل ہونے کے بعد بھی حتی المقدور اس گناہ سے احتراز کرتا رہا تھا۔

اس گراں قدر تربیت کے ساتھ ساتھ دستورِ زمانہ کے مطابق لڑکیوں اور لڑکوں کو پڑھوایا بھی جاتا تھا۔ لڑکیاں محل میں متعین مستقل اُستانی کے سپرد کر دی جاتی تھیں جو اُن کو بڑی محنت و جانفشانی سے پڑھاتی تھیں اور لڑکیاں بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتی تھیں لیکن لڑکوں کی پڑھائی میں بڑی سست رفتاری ہوتی تھی۔ مدرسوں یا مکتبوں میں لڑکوں کو بھیجنا ناپسند تھا۔ محل کا تمام بیرونی ماحول رئیسانہ اور شاہانہ ہوتا تھا۔ پڑھانے والے بھی آرام طلبی میں وقت ضائع کرتے تھے۔ ان حالات میں لڑکوں کی بہت اچھی تعلیم ممکن ہی نہیں تھی حالاں کہ بسم اللہ کی رسم ادا ہونے کے قبل ہی سے ایک مولوی اور ایک مدرس ملازم رکھ لیے جاتے تھے۔ مولوی دو کر ہی دن سے بغدادی قاعدہ پڑھانا شروع کر دیتا تھا۔ بغدادی قاعدہ اس لیے پہلے پڑھایا جاتا تھا کہ بچہ عربی حروف والفاظ سے مانوس ہو کر قرآن مجید پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ اُردو پڑھانے کا سلسلہ بھی اسی وقت شروع ہوتا تھا جس پر مولوی سے زیادہ گھر کی اُستانی توجہ کرتی تھی۔ اُردو پر گھر کے ماحول کی بدولت مہارت ہو جاتی تھی۔ سلیس زبان بولنا اور اُردو کے محاورات پر قابو پانا تربیت ہی کی برکتوں سے آجاتا تھا۔ بیگمات سے بہتر کوئی مولوی یا مدرس اُردو پر قادر نہیں ہوتا تھا اس لیے بچوں کو یہ دولت بغیر کسی زحمت کے مل جاتی تھی۔ مدرس آمد نامہ اور خالق باری پڑھانے پر پہلے توجہ کرتا تھا۔ اُس کے بعد گلزارِ دبستان، اور گلستاں پھر بوستاں پڑھاتا تھا۔ اسی تعلیم میں برسوں صرف ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف مولوی صاحب قرآن مجید کے کچھ پارے اور دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد صرف میر پھر نحو میر پڑھاتے تھے۔ صرف و نحو کی اس ابتدائی تعلیم کے بعد پنج گنج بھی کسی نہ کسی طرح رٹا کے تعلیم کا سلسلہ ختم کرا دیا جاتا تھا۔ یہ بھی مشہور ہو جاتا تھا کہ قرآن ختم کرا دیا گیا اور اس ختمِ قرآن کی خوشی میں دعوتیں ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ لڑکا چودہ پندرہ برس کی عمر تک صرف اتنی ہی تعلیم پا کر فارغ التحصیل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد نوجوان جو کچھ علم حاصل کرتے یا فنون میں کمال دکھلاتے وہ صرف اپنے ہی ذوق و شوق یا والدین کے رغبت دلانے کا نتیجہ ہوتا تھا۔ ایسے طالبانِ علم میں بھی بڑے بڑے ذی وقار موجود تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل

تک صفِ اوّل کے روسا میں نواب آغا ابو صاحب مرحوم کی ذاتِ گرامی فقہ اور اصول میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

درسیات کی اِس نامکمل اور ناقص تعلیم کے باوصف دو علوم ایسے تھے جن کی طرف روسا و عمائدین کو بڑی رغبت تھی جن میں ایک علم طب اور دوسرا علمِ عروض تھا۔ معاشرہ شعر و ادب میں سرشار تھا۔ ہر رئیس اپنے کو باکمال شاعر سمجھتا تھا اور اپنے اس مفروضہ کمال کو ثابت کرنے کی بعض رئیسوں کو ضرورت بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہر رئیس کے دربار سے دو اور بعض کے یہاں زیادہ شعرا متعلق رہتے تھے۔ انھیں شعرا کی بدولت کسی کو کم اور کسی کو زیادہ عروض سے واقفیت حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ کمی اور بیشی اپنے اپنے شوق پر منحصر ہوتی تھی۔ پرنس باقر علی خاں کے ایسے رئیس بھی تھے جو اپنی ہر غزل کی تقطیع کر لینا بہت ضروری سمجھتے تھے اور اُن کو حقیقتاً علمِ عروض پر عبور تھا۔ غیر معروف شعرا میں بھی بہت سے علمِ عروض میں کمال رکھتے تھے۔ اس لیے روسا، کو عروض میں واقفیت حاصل کرنے کے لیے زحمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جب ذاتی ذوق کو آسودگی فراہم کرنے کا سوال آجاتے تو زحمت بھی آسان ہو جاتی تھی۔ اسی طرح علمِ طب سے بھی بڑا ذوق تھا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ علمِ طب کا کسی نہ کسی حد تک حاصل کرنا اُس زمانہ کے فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ بعض اطبا یقیناً اچھے شاعر بھی تھے لیکن ہر شاعر علمِ طب میں بھی کچھ نہ کچھ دخل رکھتا تھا۔ شرفا عام طور سے طبابت کا پیشہ پسند کرتے تھے۔ اور رؤسا طب کو برائے طب حاصل کرتے تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خانوادہ خان علاّمہ کی ہر فرد جو بالغ و فرزانہ تھی علمِ طب سے باخبر تھی اور طبابت نہ کرنے پر بھی اپنے نام کے پہلے لفظ حکیم کا استعمال اپنے لیے باعثِ مفاخرت سمجھتی تھی۔ اس علم کے حصول سے بہر حال اتنا فائدہ ضرور تھا کہ اپنے محل کے معالجات میں روسا کو دل چسپی رہتی تھی۔ اور اپنے خاندانی طبیب سے عند الضرورت تبادلۂ خیالات کر لیتے تھے جس کے نتائج سود مند ہی ہوتے تھے۔

ان علوم کے علاوہ بعض فنون میں بھی روسا کو دل چسپی تھی۔ اُن کو بڑے ذوق و شوق سے سیکھتے اور ماہرین کے آگے زانوے ادب تہ کرتے تھے۔ موسیقی کا ذوق سب کو تھا اور کسی نہ کسی طرح اس فن کی نزاکتوں میں کچھ نہ کچھ درک بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن

عملاً موسیقی میں درس کبھی کسی رئیس نے نہیں لیا۔ راقم کے مورثِ اعلیٰ رات بھر کتب بینی کرتے یا تصنیف و تالیف میں شب بیداری فرماتے تھے۔ بعد نمازِ صبح بھیرویں سن کر آرام فرماتے تھے لیکن باوجود راگ اور راگنیوں پر پوری علمی واقفیت کے خان علامہ نے کبھی خود کوئی مشق نہیں کی۔ خطاطی کے فن میں اُن کے اخلاف نے بڑے بڑے صاحبِ کمال استادوں کے آگے زانوے ادب تہ کیا تھا۔ خان علامہ خود بھی خطِ نسخ و نستعلیق میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سعادت علی خاں نے یہ فن انھیں سے سیکھا تھا۔ خطاطی کا شوق بہت سے روسا کو تھا اور بیسویں صدی کے اوائل تک متعدد بزرگ اس فن کے ماہر تھے۔ مصوّری کا ذوق بھی ہر رئیس کو تھا لیکن عملاً یہ شوق دو چار بزرگوں ہی کو ہوا۔ اِن فنون کے علاوہ بنوٹ کی طرف بھی بعض رئیسوں کو توجہ ہوئی تھی۔ اور انھوں نے باکمال فن کاروں کی شاگردی قبول فرمائی تھی۔ بہرحال یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ علوم و فنون سے ہمارے روسا کو شغف تھا لیکن یہ ذوق انفرادی طور پر سنِ شعور آجانے کے بعد پورا کیا جاتا تھا۔ ان فنون کے سیکھنے میں بزرگوں کی ہدایت یا سرپرستی کو بہت کم دخل ہوتا تھا اور نہ ایسا ہوتا تھا کہ کوئی رئیس اپنے بزرگوں کی ایسے ذوق و شوق میں تقلید یا تاسی کرے۔ اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ پورے وثوق کے ساتھ نکالا جاسکتا ہے کہ مفروضہ طور پر فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہر رئیس کا رجحان اپنے ذاتی ماحول کے تحت کسی نہ کسی علم یا فن کی طرف مبذول ہوجاتا تھا۔ صرف علمِ طب اور علمِ عروض ہی کی مقبولیت میں ہمہ گیری تھی اور فنون میں خطاطی کو بڑے طبقہ میں شرفِ قبول حاصل تھا۔

ظاہر ہے کہ متذکرہ علوم و فنون کو سیکھنے کے لیے کسی مخصوص درسگاہ کی ضرورت نہیں تھی۔ درسیات کی تعلیم کے لیے سلطان المدارس اور جامعہ سلطانیہ کی ایسی بلند پایہ تعلیم گاہیں تھیں لیکن روسا اپنے طور پر اپنے لڑکوں کو وہاں بھی تعلیم حاصل کرلینے کے لیے نہیں بھیجتے تھے جس کے مختلف وجوہ تھے۔ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ طبقاتی نظام میں صاحبانِ دولت و ثروت اپنی عظمت کے بہت حسّاس تھے۔ اُن کے لیے یہ امر خلافِ شان تھا کہ اُن کے لڑکے عوام کے بچوں کے ساتھ ہم درس ہوکر گھل مل جائیں۔ تمول ہی کا نشہ نہیں تھا بلکہ وہ اپنے رہن سہن کو بھی بہت پاکیزہ اور برتر سمجھتے تھے۔ اور اُس میں کسی قسم کی آمیزش گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ روسا کے نزدیک تعلیم کا مقصد صرف تہذیب

شائستگی اور بلند کرداری کا اکتساب تھا۔ اُن کے تصوّر میں بھی علم کے ذریعہ معاش حاصل کرنے کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ اور یہ کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ چوں کہ محل میں تربیت اور مولوی و مدرّس کی نامکمّل تعلیم کے بعد بھی روسا کے مطابق منشا تہذیب و اخلاق کا معیار پورا ہو جاتا تھا لہذا اُن کو اپنی اولاد کو مزید تعلیم دلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح اپنے ذوقِ علم کو خود اپنی ہی جدوجہد سے پورا کر لیتی تھیں۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ دولت و ثروت کے ماحول میں جو تربیت یافتہ لڑکے مدرسے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخل کرائے جاتے تھے اُن کو وہاں کا طرزِ تعلیم نیز وہاں کی سوسائٹی بالکل ناپسند ہوتی تھی۔ قہراً و جبراً اگر کچھ مدارج طے بھی کر لیتے تھے تو بددل ہو کر کسی نہ کسی طرح فرار کی راہ اختیار کر لیتے تھے۔ اس قول کی تائید میں راقم کی مثال کافی ہے۔ اُس کا داخلہ ایک مقصد کے تحت کرایا گیا تھا یعنی یہ کہ شرفِ اجتہاد حاصل کرے۔ مگر وہاں کے ماحول نے مقصد ہی سے دل برداشتہ بنا دیا۔ سب سے زیادہ تکلیف اس بات پر تھی کہ عربی مدرسہ کی تعلیم صرف رٹانے تک محدود تھی۔ اور مجھے سبق رٹ کر یاد کرنے سے فطری طور پر نفرت تھی۔ میرے لیے صرف ایک درجہ پروفیسر معقولات سید محمد رضا مرحوم کا لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ بہت اچھا پڑھاتے اور سمجھاتے تھے لیکن اُن کے یہاں بھی میرے ہم درس بہت سا وقت غارت کر دیا کرتے تھے۔ جس کو وہ "مذاکروں" سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ایسی ہی بے کار بحث کا لطیفہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ منطق کے درجہ میں استدلال پیش کیے جاتے تھے جن کے لیے مرغوب ترین موضوع وحدتِ باری تعالیٰ تھا۔ گھنٹوں بحث ہوتی تھی اور دلائل پیش کیے جاتے تھے کہ دو خدا نہیں ہو سکتے۔ ایک روز مولانا کو آنے میں کچھ دیر ہوئی اور لڑکوں نے مذاکرہ شروع کر دیا۔ میں ہمیشہ سب سے پیچھے کی صف میں ایک کونے پر بیٹھتا تھا۔ لہذا کسی طرح کی دل چسپی لینے کا میرے لیے موقع ہی نہیں آتا تھا۔ اُس روز مولانا نے آتے ہی فرمایا کہ تم لوگ بہت شور کر رہے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی حمید صاحب نے فرمایا۔ "حضور! مذاکرہ کر رہے تھے" اُن کے اس بیان پر مولانا نے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ دریافت کیا کہ "تم کیا کہہ رہے تھے"۔ اور ہر ایک نے کچھ نہ کچھ جواب دیا۔ بالآخر میری باری آئی تو میں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ مؤدبانہ عرض کیا۔ "حضور! ایک ہی سمجھ میں نہیں آتا، دو سو چنے کی

فرصت کہاں ہے۔" مولانا نے مجھے بہت دیر سے دیکھا اور خاموش ہو رہے۔ وہ میرا آخری سال عربی اسکول میں تعلیم کا تھا۔ ملا کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا لیکن یہ سمجھ میں آیا کہ یہاں تعلیم کا مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ فوت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد عربی زبان سے ضرور رغبت باقی رہی لیکن عربی مدرسہ میں تعلیم برقرار رکھنے سے نفرت ہو گئی۔ جس کی اصل وجہ تھی کہ گھر کے اندرونی ماحول اور وہاں کی تربیت نے جو وسیع النظری پیدا کرائی تھی اُس کو مدرسہ کے ماحول اور طرزِ تعلیم سے شدید چوٹ لگتی تھی۔ ہمارے روحانی اور ذہنی ارتقا کے لیے وہی تعلیم و تربیت کافی تھی جو عنفوانِ شباب تک اپنے گھروں میں حاصل کر لیتے تھے۔

## بارھواں باب

# شادی وغمی کی تقاریب

(۱) خوشی کی رسمیں
(۲) شادی کی رسمیں
(۳) غمی کی رسمیں

# (۱) خوشی کی رسمیں

خوشی کی رسمیں اُن تقاریب کو کہتے تھے جو پیدائش کے بعد سے مناکحت تک انجام دی جاتی تھیں اور اُن کی تعداد بھی بہت تھی جن خانوادوں میں اولاد کی کثرت ہوتی تھی وہاں آئے دن ایسی ہی کوئی تقریب منعقد ہوتی اور جشن منایا جاتا تھا۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی چھٹی منانے کی رسم ہوتی تھی جو عموماً ولادت کے چھٹے دن ادا ہوتی تھی زچہ اور بچہ کا یہ پہلا نہان ہوتا تھا اور بچہ اگر نرینہ ہے نیز یہ کہ اولادِ اول ہے تو چھٹی میں اتنی دھوم دھام ہوتی تھی جس کا تذکرہ الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ ولادت کے بعد ہی سے محل کے صدر دروازہ پر شہنائی والے اپنا ڈیرہ جما لیتے اور دن بھر نیز آدھی رات تک تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شہنائی بجاتے تھے جس کو سننے کے لئے محلہ والے جوق در جوق جمع ہو جاتے تھے۔ عوام آتے جاتے رہتے لیکن مجمع ہمہ وقت لگا رہتا تھا۔ تین چار روز قبل سے تمام ملازمین و مقربین انتظامات میں مصروف ہو جاتے تھے رئیس کی مشورت سے مطبخ کے انچارج ضیافتوں کی تیاریوں میں منہمک ہو جاتے تھے مہمانوں کی تعداد کا حال جانے بغیر یہ انتظام بہت دشوار گزار ہوتا تھا اس لئے بزازوں، قصابوں، طیور فروشوں نیز دوسرے ضروریات کی چیزیں فروخت کرنے والوں کو خریداری کے ساتھ یہ ہدایت بھی کر دی جاتی تھی کہ عند الضرورت جتنا اور جو سامان درکار ہوگا اُس کی فراہمی انھیں کے اوپر واجب ہوگی۔ کچھ لوگ خریداریوں کے لئے نکل جاتے تو کچھ آدمی گوداموں سے تانبے کے مٹکے، پتیلے، دیگیں وغیرہ وغیرہ نکلوا کے قلعی گروں کے حوالہ کرتے محل میں ایک جانب قلعی گر اپنا ٹھیا جما لیتے تھے۔ فراشوں کی مصروفیت قابلِ دید ہوتی تھی۔ محل کے اندر نیز باہر فرش کے لئے بڑی بڑی دریاں۔ بڑی بڑی چاندنیاں، بیشمار ریشمی اور اونی قالین، زربفت اور زردوزی کے کامدار غلافوں میں چھپے ہوئے گول اور سڈول گاؤ اور پھر فرشِ زمین پر سایہ کرنے والے مخملی بڑے اور چھوٹے شامیانے، اپنی نقرئی اور گنگا جمنی چوبوں سمیت برسات کا موسم ہوا تو دل بادل نیز آرائش و زیبائش کے جملہ ساز و سامان ان سب کے علاوہ تھے یہ انتظام کی ذمہ داری فراشوں کے اوپر رہتی تھی۔ روشنی کے بندوبست کے لئے ایک علیحدہ صیغہ مقرر ہو جاتا تھا۔ قمقمے، جھاڑ، فانوس، کنول، ڈالے، مردنگ وغیرہ وغیرہ اور یہ سب سادے اور پھولدار، رنگین اور وضعدار غرضکہ طرح طرح کے آلاتِ نور تھے جن سب کے روشن ہو جانے کے بعد محفل تجلی زار ہو جاتی تھی۔ محفل آراستہ کرنے، مہمانوں کے استقبال اور اُن کو آرام سے بٹھانے، وقت پر دسترخوان بچھوانے اور کھانا کھلانے کے فرائض علیحدہ علیحدہ ملازمین و مقربین کو سونپ دیئے جاتے تھے رئیس اپنے مخصوص دوستوں اور مقربینِ خاص کی صلاح و مشورت سے بزمِ طرب کے لیے

طائفوں کی تعداد اور طوائفوں کے نام معین فرماتے تھے۔ انھیں مقربین میں دو تین صاحبان طوائفوں کے گھر جاکر مجرائی ادا کر کے معاہدہ مکمل کراتے۔ مجرائی کا ایک یا دو روپیہ پیشگی دیا جاتا تھا جو ایک علامتی ادائیگی ہوتی تھی۔ اُن کی فیسوں کی رقم بعد میں بھیج دی جاتی تھی۔ بعض اولوالعزم اور دریادل رئیسوں کے یہاں تین شبانہ روز دعوتیں ہوتی تھیں اور دن و رات طوائفوں کے مجرے ہوتے تھے۔ رات کو ۹ بجے سے نمازِ صبح تک اور دن میں ۱۱ بجے سے شام تک رقص و سرود کی محفل گرم رہتی تھی۔ چھٹی کے ایک روز قبل شام تک جملہ انتظامات مکمل ہو جاتے تھے۔ اندر اور باہر فرش بچھ جاتے اور شامیانے نصب ہو جاتے تھے۔ عموماً زمین کا فرش ہوتا تھا۔ جس پر دریاں اور چاندنیاں بہت صاف و شفّاف بچھائی جاتی تھیں۔ چاروں طرف قالین اور صدر مقام پر ایک بڑے رنگین اور خوشنما قالین پر گاؤ اور تکیے لگا دیے جاتے تھے۔ نواب اپنے مخصوص اعزا اور احباب کے ہمراہ اسی مقام پر رونق افروز ہوتے تھے۔

محل کے اندر شام ہی سے جشن شروع ہو جاتا تھا۔ ہر خوشی کی تقریب میں ڈومنیوں کا آنا ضروری تھا اور ہر محل میں ڈومنیاں بڑی بڑی گستاخانہ جسارتیں کرتی تھیں لیکن اُن کے بیافعال فحشیات بکنے تک محدود رہتے تھے۔ بیگمات کے وقار کا بہر حال پورا پورا احترام کرتی تھیں اور کسی حالت میں بھی ادب و تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔ رات بھر ڈومنیاں ناچتی، گاتی، بھاؤ بتاتی اور نقلیں کرتی تھیں۔ مہمانوں کا اژدہام شام ہی سے شروع ہو جاتا تھا۔ صبح ہوتے زچّہ اور بچہ کی صحت و عافیت کی دعائیں ہوتیں اور اسی طرز کے گانے بھی گائے جاتے تھے۔ علی الصباح نہان کے لیے دیگوں میں پانی گرم ہوتا اور دائی کے آتے ہی نہلانے کے سامان شروع ہو جاتے تھے۔ عموماً دس گیارہ بجے تک نہان سے فراغت ہو جاتی تھی۔ اسی وقت محل کے مردانے حصہ میں جہاں بھی انتظام ہوتا طوائف کا پہلا مجرا شروع ہو جاتا تھا۔ درمیان میں مہمانانِ عالی مقام کو متعدد ٹولیوں میں علیحدہ علیحدہ محفل سے اٹھا کر کھانا کھلا دیا جاتا تھا۔ محل کے اندر نہان کے بعد بڑے دھوم دھام سے آنے والوں کی ضیافت ہوتی اور ڈومنیاں مسلسل گایا کرتی تھیں۔ نہان کے بعد اعزا و اقارب میں متعدد بیبیاں زچّہ اور بچہ پر سے تصدق اتارتے تھے۔ یہ رقوم ایک جا جمع ہو جاتی تھیں اور دوسرے روز غریبوں کو تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اس موقع پر سب سے زیادہ دل فریب اور دلچسپ وہ رسم ہوتی تھی جب زچّہ کے میکے والے، جن میں والدہ اگر موجود ہوتیں اور

بہنیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، زچہ اور بچہ کی "چھٹی" لایا کرتی تھیں۔ یہ چھٹی عام طور سے جلوس کی شکل میں آتی تھی۔ آگے آگے باجے والے، اُن کے پیچھے کچھ مزدور سامانِ آرائش ہاتھوں میں لیے ہوتے تھے۔ اس کے بعد وردیوں یا زرق برق لباس میں آدمی چھٹی کا سامان سنبھالے راہ چلتے تھے۔ آخر میں فینسوں پر جو منقش کارچوبی جھٹکوں سے ڈھکی ہوتی تھیں محترم خواتین سوار ہوتی تھیں۔ فینسوں کے دونوں جانب چمکتے دمکتے لہنگوں اور دوپٹوں مہریاں فینسوں کے جھٹکوں کو پکڑے تیز تیز قدم بڑھاتی ساتھ رہتی تھیں۔ محل کے صدر دروازے پر شہنائی والے اپنے باجوں کو زور زور بجاکر اس جلوس کو مسرتوں کا پیغام سناتے تھے۔ اور اندرونی ڈیوڑھی کے اندر ڈومنیاں بہت زور زور سے گاکر اس جلوس کا استقبال کرتی تھیں۔ معزز مہمانوں کو بیگم صاحبہ کے ہمراہ رہنے والے اعزا واقارب نیز دوسرے مقتدر مہمانان بڑے تزک و احتشام سے اُتارتے تھے۔ اور یہ مخدرات فی الفور زچہ خانہ میں داخل ہوکر چھٹی کا سامان پیش کردیتی تھیں۔ اس سامان میں زچہ اور بچہ کے لیے بہت قیمتی زرنگار کپڑے ہوتے تھے۔ بچہ کے لیے بلا استثنا اس امر کے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ طوق، ہنسلی اور کڑے نذر کیے جاتے تھے۔ زچہ کے لیے بھی اُن کے شایانِ شان زیورات کے چند عدد حاضر کیے جاتے تھے۔ کپڑوں اور زیورات کے علاوہ چھوٹے بچوں کے کھیلنے کے لائق کھلونے بھی ہوتے تھے۔ سب سے دل چسپ نظارہ وہ ہوتا تھا، جب چھٹی میں مرغیاں اور بکریاں بھی لائی جاتی تھیں۔ اس رسم کے ادا ہونے میں معقول وقت صرف ہوتا تھا اور بہت سے مہمان اس تقریب میں شرکت کرسکتے تھے کیوں کہ نہان کے بعد آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں رہتی تھی۔ سائبان کے پردے بھی اُٹھ جاتے تھے اور زچہ خانہ کے باہر دائے سلگتے ہوئے لٹھوں میں لکڑیوں کا پھر اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ یہ تقریب تین شبانہ روز کے بعد ختم ہوجاتی۔ محل کے اندرونی اور بیرونی حالات معمول پر آجاتے تھے۔ لیکن زچہ کے لیے زچہ خانہ ہی میں بڑے نہان تک مقید رہنا ضروری تھا۔

چھٹی کے بعد زچہ کے دو نہان اور ہوتے تھے۔ دوسرا نہان ولادت کے بارھویں چودھویں، اٹھارویں یا بیسویں دن ہوتا تھا۔ اصولاً اس نہان کو بیسویں دن ہونا چاہیے تھا لیکن سعد و نحس کی توہم پرستی میں دن اور تاریخیں بدل جاتی تھیں۔ تاہم بارھویں دن سے قبل اور بیسویں دن کے بعد تاریخ معین نہیں ہوتی تھی۔ اس تعین میں دن اور

تاریخ دونوں کا سعد ہونا ضروری تھا۔ دوسرے نہان کی خوشیاں ضرور منائی جاتی تھیں، لیکن کسی بڑے پیمانے پر جشن نہیں ہوتا تھا۔ شہنائی کے شادیانے بے شمار موقعوں پر بجائے جاتے تھے اس لیے یہ باجا کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دعوت صرف ایک ہوتی تھی اور طوائفوں کے مجرے بھی ایک ہی وقت ہوتے تھے جس کے لیے نہان کے قبل یا بعد والی رات معین کی جاتی تھی۔ مہمان بھی کثیر تعداد میں نہیں بلائے جاتے تھے البتہ رئیس اور بیگم کے تمام اعزا کو ضرور مدعو کیا جاتا تھا۔ علی الصباح دائی اگر زچہ کو حسبِ دستور نہلا دیتی اور اس نہان سے فراغت ہو جاتی لیکن ڈومنیوں کے رقص و سرود سے دو دن بڑی گرماگرمی رہتی تھی۔ ڈومنیوں کے لیے ایسے تمام مواقع اُن کی یافت کے لیے بڑے دل خوش کن ہوتے تھے۔ اس نہان کے بعد تیسرا بڑا نہان ولادت کے چالیسویں دن ہوتا تھا۔ حتیٰ المقدور اس چالیسویں دن کی اہمیت کو ضرور ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اگر تاریخ و دن دونوں نحس ہوتے تو نہان کے لیے استخارہ کر کے وقت کا تعین کر دیا جاتا تھا اور اگر دن اور تاریخ میں کوئی ایک سعد اور دوسرا نحس سمجھا جاتا تو زچہ پر سے تصدق اُتار کے حسبِ رواج وقت و تاریخ برقرار رکھے جاتے تھے۔ اس چلّے کے نہان کو بڑی بڑی خصوصیات حاصل تھیں اس لیے اس موقع پر دوسرے نہان کے مقابلے میں زیادہ دھوم دھام رہتی تھی۔ مہمانوں کی کثرت اور ضیافتوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی تھی۔ طوائفوں کے مجرے بھی شبانہ روز ہوتے تھے۔ نہان حسبِ دستور دن کو ہو جاتا لیکن اُس کے فوراً بعد زچہ کو اُس کے مستقل جائے سکونت پر پہنچا دیا جاتا تھا۔ زچہ خانہ کا کمرہ پاک و صاف کیا جاتا اور جتنی چیزیں اُس کمرہ میں ہوتی تھیں جن میں زچہ کا پلنگ بستر اور اُن کے کھانا نوش کرنے کے برتن اور پانی کے کٹورے بھی شامل ہوتے تھے سب کو علیحدہ کر کے مذہبی طرز پر پاک کیا جاتا تھا۔ اس نہان کے قبل تک زچہ اور اس کے متعلقہ تمام اشیا یہاں تک کہ اُس کی مس کردہ ہر چیز نجس و ناپاک سمجھی جاتی تھی۔ چلّے یعنی چالیسویں دن کا یہ نہان طہارت کا باعث بن جاتا تھا۔ اسی روز شام کو ایک بہت دلفریب رسم ادا ہوتی تھی۔ رؤسا کی بیگمات یوں بھی دن بھر اپنے کمروں میں رہا کرتی تھیں، شام کو سنگار کرنے کے بعد غروب آفتاب کے وقت باہر نکلتی تھیں۔ چلّے کا نہان نہانے کے بعد شام کو سنگار کرنے کے بعد غروبِ آفتاب اُن کو دُلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ کرتی تھیں۔ بالوں پر افشاں چھڑکنا اور مانگ میں صندل بھرنا ضروری تھا۔ ہاتھوں اور پیروں میں مہندی

بھی مل دی جاتی تھی۔ بیگم کو عموماً چمپئی جوڑا پنھایا جاتا اور دوپٹہ کا آنچل "حجاب سا" چہرہ پر ڈھلکا دیا جاتا تھا۔ پھر بچہ کو انتہائی خوشنما اور زرتار لباس میں ایک رنگین گبھے پر لٹا کر بیگم کی گود میں دیا جاتا تھا۔ اس تیاری میں چراغ جل جاتے تھے پھر بیگم کو معہ بچہ کے انگنائی میں لاتے تھے۔ آگے اور پیچھے اعزا واقارب کے علاوہ خواصوں اور کنیزوں کا جماؤ رہتا تھا اور دعاؤں کے موتی بیگم پر نچھاور ہوتے رہتے تھے۔ انگنائی میں آکر بچہ کو گود میں لیے ہوئے بیگم آسمان پر ستاروں کا نظارہ کرتی تھیں۔ اس رسم کو "تارے دیکھنا" کہتے تھے۔ اس رسم میں رومانیت ہو کچھ بھی ہو لیکن چالیس اکتالیس دنوں کے بعد یہ پہلا موقع ہوتا تھا جب بیگم کی نظر آسمان پر پڑتی اور وہ کھلے صحن میں سانس لیتی تھیں۔

ان تینوں نہانوں کے مواقع پر خیر وخیرات اور انعام واکرام کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ چھٹی کے موقع پر تمام ملازمین کے لیے خواہ وہ محل کے اندر والی عورتیں ہوں یا باہر کے مردانے جوڑے تیار ہوتے اور اُن کو مرحمت کیے جاتے تھے۔ ان جوڑوں میں ہر طبقہ کے ملازمین کے مراتب ملحوظ رہتے تھے۔ اعلیٰ طبقہ کے منصب داروں کے لباس پر اُس ارزانی کے زمانہ میں بھی چالیس پچاس روپیہ خرچ ہو جاتے تھے۔ جو خدمت گزار مستقل ملازم نہ ہوتے بلکہ دامنِ دولت سے وقتی طور پر منسلک رہتے تھے اُن کو بھی کوئی نہ کوئی ایک مگر اچھا کپڑا ضرور مل جاتا تھا۔ دوسرے اور تیسرے نہان میں عام تقسیم نہیں ہوتی تھی لیکن جو ملازم زیادہ جانفشانی سے کام کرتے تھے اُن کے ساتھ کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیا جاتا تھا۔ بیگم صاحبہ سے ڈومنیاں بہت کچھ لوٹ کھاتی تھیں۔ کوئی ریشمی کار چوبی پائجامہ تو کوئی گرنٹ کا زرتار گھٹنا وصول کر لیتی تھی۔ بعض ہوشیار ڈومنیاں پہلے ہی سے کسی نہ کسی قیمتی لباس یا زیور پر نظر رکھتی تھیں اور بڑے نہان کے بعد اُسی چیز کا مطالبہ کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ کو بہر حال نہیں کرنا آتا ہی نہ تھا اور یوں بھی وہ سادہ زیور مرحمت کر دینے میں پس و پیش نہیں کرتی تھیں۔ منہ چڑھی خواصیں اور کنیزیں قبل از وقت فرمائشیں کر دیتی تھیں کہ ہم کو فلاں فلاں لباس یا زیور نیا بنوا کے دیا جائے۔ ایسی فرمائشیں رد کرنا شانِ ریاست کے منافی تھا۔ اس لیے پوری ہوتی تھیں۔ ملازم پیشگانِ در دولت کے علاوہ بکثرت غربا ومساکین کا بھی بھلا ہو جاتا تھا۔ ضیافتوں کے موقع پر بکثرت مفلوک الحال لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اُن کو علیحدہ دسترخوان بچھا کر کھانا عمداً نہیں کھلایا جاتا تھا بلکہ مٹی کی روغنی طشتریوں میں پلاؤ اور ایسے ہی پیالوں میں سالن، ہانڈیوں میں کھیر اور

انھیں طشتریوں اور پیالوں پر روٹی و کباب اور شیرمال ڈھک کر حصہ کی صورت میں ہر حاضر الوقت کی تواضع کر دی جاتی تھی۔ اس طرزِ عمل کا یہ منشا تھا کہ دعوت کے کھانے میں ان غریبوں کے اہل و عیال بھی قدرے شریک ہو جائیں اور وہ کھانا بھی اتنی مقدار میں ہوتا تھا کہ ایک مختصر خاندان کے قوتِ لایموت کو کافی ہوتا تھا۔ اس لیے تینوں نہانوں کے مواقع پر بیگم صاحبہ پر نقد روپیہ نچھاور کیا جاتا تھا۔ جس کو تصدق کہتے تھے۔ صدقہ کا یہ روپیہ ایک جا کر کے محلہ کی بیواؤں اور یتیم بچوں پر تقسیم ہوتا تھا لیکن اس بات کا سختی سے لحاظ کیا جاتا تھا کہ تصدق کا روپیہ کسی سیدانی یا سید النسل یتیم کو نہ دیا جائے۔ اُن کی امداد رئیس کی جیب خاص سے ہوتی تھی۔ غربا و مساکین کی ان اعانتوں کے علاوہ کچھ طبقوں کے لوگ بھی انعام مانگنے آیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی آمد، اُن کا طرزِ طلب اور اُن سے حاضر الوقت مخصوص ملازمین کا لطف لینا بڑا دلچسپ سماں پیش کر دیتا تھا۔ یہ لوگ تین طبقات سے متعلق تھے۔ ایک طبقہ شہدوں کا تھا دوسرا بھانڈوں کا اور تیسرا سادھو بچوں کا۔ شہدے اس انداز سے مطالبہ کرتے تھے گویا کہ آبرو مٹانے پر آمادہ ہیں۔ اُن کو بڑی سے بڑی بدتمیزی کرنے میں بھی دریغ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ڈر کر اُن کو زیادہ سے زیادہ رقم دے کر رخصت کر دیا جاتا تھا۔ بھانڈوں کا پیشہ ناچنا گانا تھا لیکن انھیں کے قبیلہ کے کچھ لوگ مانگنے کھانے لگے تھے۔ سرکاری ملازمین ان سے دل چسپی لیتے اور ان کو بہت چھیڑتے تھے بالآخر اُن کی مرادیں پوری ہو جاتی تھیں۔ سادھو بچوں کا شعار دعائیں دینا اور چیخنا چلانا تھا۔ اُن کو خوش کر کے رخصت کر دینے میں زیادہ زحمت نہیں ہوتی تھی۔ ان تینوں طبقوں کے مانگنے والے شادی اور غمی ہر رسم میں اپنا حق طلب کرنے آجاتے تھے۔

اس بڑے نہان کے بعد اور سنِ بلوغ تک، جب کہ نوجوانی ہی میں شادی ہو جانا رئیسوں کے یہاں ضروری تھا اور جس کے بغیر والدین کے دل کی حسرتیں نہیں نکلتی تھیں، خوشی کی متعدد رسمیں ادا ہوتی تھیں۔ ان میں بعض مذہبی ہوتی تھیں لیکن شانِ ریاست اُن کو بھی رنگین بنا دیتی تھیں اور کچھ معاشرہ کی پیداوار تھیں جن میں شعریت کی لذت ملتی تھی۔ آخر الذکر رسمیں جلد جلد اور زندگی کے آغاز ہی میں پوری کر لی جاتی تھیں۔ شیر خوار بچہ اپنی عمر کے پانچ چھ ماہ پورے کر لیتا تو کھیر چٹائی کی رسم ادا ہوتی تھی۔ یہ کھیر بڑے اہتمام سے پکائی جاتی تھی جس میں چاول کے دانے بالکل گل کر دودھ میں محلول ہو جاتے تھے۔ بعد میں عرق کیوڑہ سے اُس کو خوشبودار

بنا دیا جاتا اور بڑی بڑی قابوں میں نکال کر چاندی کے ورق لگا دیے جاتے تھے۔ کھیر چٹائی کے دن بچہ کو نئے، رنگین اور خوشنما کپڑے پہنائے جاتے اور اُس دسترخوان کے قریب جس پر قابیں رکھی ہوتی تھیں لاکر کھیر چٹا دی جاتی تھی۔ یہ رسم خاندان کی کسی بزرگ عزیزہ کے ہاتھوں ادائی کرا جاتی تھی۔ اُس وقت اعزا و اقارب معقول تعداد میں موجود رہتے تھے اور بچہ کے ہاتھ میں روپے دیا کرتے تھے۔ کھیر چٹائی کی رسم ادا ہونے میں اس لیے وقت لگ جاتا تھا کہ حاضر الوقت مستورات و مخدرات بہت باتیں کرتی تھیں اور زیادہ تر بچہ کو دعائیں بھی دیا کرتی تھیں۔ قابوں کی کھیر حاضر الوقت اعزا نوش کرتے تھے لیکن دیگوں میں بھری ہوئی کھیر کے بڑے بڑے حصے اعزا و اقربا کے گھروں پر بھیج دیے جاتے تھے۔ یہ تقریب محل کے اندر ہی انجام پاتی تھی اور انعام و اکرام خصوصیت کے ساتھ بچہ کی انا کو دیا جاتا تھا۔ کھلائی، ددا اور چھوچھو بھی بخشش میں شریک رہتی تھیں۔ اس تقریب میں بھی ڈومنیوں کا گانا بجانا ہوتا تھا اور وہ بھی انعام و اکرام سے بہرہ مند ہوتی تھی۔

کھیر چٹائی کے یہ معنی تھے کہ بچہ کے معدہ میں جنس قبول کرنے کی صلاحیت آگئی ہے۔ اس کے بعد قریب قریب ہر روز یا دوسرے تیسرے روز کھیر چٹا دی جاتی تھی لیکن اس میں نمک چکھانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو نمک چٹائی کی ایک مختصر رسم بھی ادا کر دی جاتی تھی۔ لیکن اس میں اتنا اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ جتنا کھیر چٹائی میں کیا جاتا تھا۔ دھوئی مونگ کی دال اور قدرے چاول شامل کر کے بہت گلی ہوئی پتلی کھچڑی تیار کرائی جاتی اور بچہ کو چٹا دی جاتی تھی۔ اس موقع پر گھر ہی کے اعزا و اقارب اور معدودے چند مخصوص عزیز شرکت کرتے تھے۔ بچہ کو چٹانے کے بعد باقی تیار شدہ کھچڑی انا کو کھلا دی جاتی تھی۔ بچہ کی مخصوص ملازم عورتوں کے ساتھ سلوک بھی کیا جاتا تھا جس میں بڑا حصہ انا کا ہوتا تھا۔ اعزا و اقارب اس موقع پر بھی تصدق کے لیے کچھ رقم پیش کیا کرتے تھے جو خیرات کر دی جاتی تھی لیکن نمک چٹائی میں بچہ کے لیے کسی نئی پوشاک یا اُس کے ہاتھ میں کسی رقم کے دینے کی رسم نہیں ہوتی تھی۔ البتہ گھر والوں کی ایک مخصوص دعوت اور مردانہ نشست گاہ میں ایک مختصر ضیافت ہو جاتی تھی۔ ڈومنیوں کی حاضری بہر حال ضروری تھی۔ راقم کے خیال میں یہ بھی ایک موقع نکال لیا جاتا تھا جب بزمِ طرب و نشاط محل کے اندر گرم ہو جاتی تھی۔ ڈومنیاں رات بھر گایا بجایا کرتی تھیں اس دن کے بعد سے بچہ کو کھیر سے زیادہ کھچڑی چٹانے پر نظر رکھی جاتی تھی۔ اب اُس کی عمر ایک

سال کی ہوجاتی تھی اور دو برس کے سن تک دودھ بڑھائی ضروری ہوتی تھی لہٰذا ایک سال قبل سے اُس کی تیاری شروع ہوجاتی تھی اور بچہ کو رفتہ رفتہ نمک کا خوگر بنا دیا جاتا تھا۔

سلسلۂ رضاعت کی آخری کڑی دودھ بڑھائی کی تقریب ہوتی تھی جو پہلی دو تقریبوں کے مقابلہ میں زیادہ اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ ضیافتیں اور طوائفوں کے مجرے روسا کے ذوق وشوق میں داخل تھے۔ صرف بہانہ تلاش کر لینے کی دیر ہوتی تھی۔ بیگمات کو ڈومنیوں کے ناچ گانے سے قلبی لگاؤ تھا۔ چنانچہ دودھ بڑھائی کے موقع پر بھی محل کے اندر اور باہر دعوتوں اور مجروں کے انتظامات ہوجاتے تھے۔ لیکن اس موقع کی مخصوص چیز کھجوریں ہوتی تھیں جو بڑے اہتمام سے اور بہت بڑی مقدار میں مخصوص طور پر پکوائی جاتی تھیں۔ یہ کھجوریں بہت خستہ، لذیذ اور خوشبودار ہوتی تھیں۔ فراخ دلی کے ساتھ اُن کے حصے اعزا واقارب کے یہاں بھیجے جاتے تھے۔ وقت مقررہ پر اعزا واقارب کی موجودگی کوئی بڑی بوڑھی دعائیں دے کر ایک کھجور بچّے کے ہاتھ میں دے کر اُسی کے ہاتھ سے اُس کے منہ تک پہنچا دیتی تھی۔ چوں کہ یہ رسم پیدائش کے دو برسوں کے بعد ہوتی تھی۔ اس لیے بچہ غوں غاں کرنے لگتا اور سب کو پہچاننے لگتا تھا۔ کھجور کو دانتوں سے کچلتے ہوئے دیکھ کر والدہ محترمہ نیز دوسرے اعزا کا کلیجہ ٹھنڈا ہوجاتا تھا۔ اس کے بعد پھر حقیقتاً دودھ بڑھانے کی ترکیبیں اختیار کی جاتی تھیں۔ عام طریقہ یہ تھا کہ ایلوا پانی میں گاڑھا گاڑھا گھلا ہوا انا کے پستان میں لگا دیا جاتا تھا۔ بچہ تلخی کے باعث منہ ہٹا لیتا لیکن اُس کو مستقل طور پر دودھ سے محروم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ رفتہ رفتہ دودھ چھڑوایا جاتا تھا۔ دودھ بڑھائی بچہ کی زندگی میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب ایامِ رضاعت ختم ہوئے اور طفولیت کا زمانہ شروع ہوا۔

اسی مقام پر ایک اور رسم کا تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پیدائش کا ایک سال ختم ہونے کے بعد بڑے اہتمام سے یوم پیدائش منایا جاتا تھا۔ ایک اچھی خاصی جشن کی محفل گرم ہوجاتی تھی۔ اور نشاط وانبساط کے تمام لوازمات فراہم ہوجاتے تھے۔ سال گرہ کی تقریب اسی پہلی رسم سے شروع ہوتی تھی۔ اس کے بعد ہر سال مقررہ تاریخ و وقت میں ایک بہت لمبے ڈورے میں گرہ ڈالی جاتی تھی۔ سال گرہ کے موقع پر جناب سیدہ کے نذر کی سہنک رکھی جاتی تھی۔ سہنک میں دہی اور چاول ہوتے تھے لیکن اُس کو صرف سیدانیاں چکھ سکتی تھیں۔ دوسری عورتوں اور مردوں کے لیے مٹھائیوں سے کونڈے بھر دیے جاتے تھے۔ بہت سے گھرانوں میں

یہ رسم شادی ہو جانے کے بعد ختم کر دی جاتی تھی لیکن چند خانوادہ ایسے تھے جن میں بزرگ عورت مثلاً ماں، بڑی بہن، پھوپھی وغیرہ کی حیات تک سال گرہ ہوا کرتی تھی یعنی یہ کہ پچاس ساٹھ برس کی عمر کے مرد یا عورت کی بھی سال گرہ ہوتی تھی۔ سال گرہ کی باضابطہ رسم ادا ہو یا نہ ہو لیکن تاریخِ پیدائش پر ہر جگہ خوشیاں منائی جاتی تھیں اور دعوتیں ہوتی تھیں۔ اعزا واقارب تحائف پیش کرتے تھے اور سلامتی کی دعائیں دیتے تھے۔ پانچ چھ برس کی عمر تک بچوں کا یوم پیدائش بڑے لطف سے منایا جاتا تھا اور اس تقریب میں طرب وانبساط کے لوازمات برقرار رکھے جاتے تھے لیکن اُس کے بعد انہاک میں کمی ہو جاتی تھی جس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ ازدیادِ اولاد اور تقاریب کی بھرمار میں یوم پیدائش منانے کی تقریب ایک معمولی رسم کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

اسی ذیل میں ایک ایسی رسم بھی آجاتی ہے جو سال میں متعدد بار اور بعض دوسری تقاریب کے ساتھ ادا کی جاتی تھی اور جس میں ایک حد تک مذہبی رنگ بھی شامل تھا۔ اس رسم کو رت جگا کہتے تھے۔ مذہبی مخصوص تقاریب مثلاً ختنہ، عقیقہ اور بسم اللہ کے علاوہ ہر اُس تقریب میں جہاں رات بھر مسلسل بزم نشاط آراستہ نہ رہتی ہو رت جگا منالیا جاتا تھا۔ قمری کلنڈر کے مہینوں کی بعض تاریخوں میں جنھیں متبرک ومسعود سمجھا جاتا رت جگا ہو جاتا تھا۔ رت جگا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ وہ رات جو جاگ کر گزاری جائے یا وہ جاگنا جو رات بھر ختم نہ ہو لیکن یہ جاگنا عبادتِ الٰہی میں نہیں کٹتا تھا۔ بلکہ رات بھر ڈومنیاں گھونگرو باندھ کے ناچتی گاتی اور تھرکتی تھیں البتہ گانے میں ایسی چیزیں گائی جاتی تھیں جن کو سننے والے اللہ کی سلامتی کا نغمہ کہتے تھے۔ جاہل عورتیں تو درکنار محل میں بہت سی بیگمات اس نغمگی کو بھی عبادت سمجھتی تھیں۔ اُن کے نزدیک جو کچھ ہوتا تھا وہ رضائے الٰہی حاصل ہونے کے لیے کیا جاتا تھا۔ گانے بجانے کے علاوہ رات بھر گلگلے پکتے اور رحم جمائے جاتے تھے۔ رحم ایک قسم کی غذا تھی جس میں غالباً شیرینی کو برائے نام دخل ہوتا تھا۔ اور اُس کو رحمتِ الٰہی کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔ رات ختم ہونے کے بعد علی الصباح محل کی مستورات بڑے تزک واحتشام سے قریبی مسجد میں جاکر گلگلوں اور رحم سے مسجد کا طاق جس کو اللہ کا طاق کہتے تھے، بھر دیتی تھیں۔ دعائیں اور مرادیں مانگی جاتی تھیں جن کے برآنے اور پوری ہونے کے بعد پھر شکرانہ میں طاق بھرا جاتا تھا۔ گویا کہ ایک رت جگا دوسرے رت جگے کا پیش خیمہ ہوتا تھا۔ تقاریب کے علاوہ رت جگے

ماہِ شعبان اور رجب میں بہتات کے ساتھ ہوتے تھے۔

مذہبی تقاریب میں سب سے پہلے عقیقہ کی رسم ادا ہوتی تھی جس کی غایت پیدائشی بال سر سے جدا کر دینا تھی لیکن شرعِ اسلام نے اس کے ساتھ بعض رواسم وابستہ کر دیے ہیں اِس لیے اُن کی پابندی بھی ضروری ہے۔ شرعاً پیدائش کے آٹھویں دن عقیقہ کرا دینا باعثِ برکت ہے۔ روسا و عمائدین دن اور تاریخ کی نیکی کے قائل تھے۔ اس لیے آٹھویں دن کی شرط کے پابند نہیں تھے لیکن زیادہ تر بڑے نہان کے قبل عقیقہ کرا دیا جاتا تھا۔ بچہ کو نہلا دھلا کر بہت نفیس اور رنگین کپڑے پہنائے جاتے تھے۔ اعزا و اقارب مدعو ہوتے اور انھیں کی موجودگی میں عقیقہ ہوتا تھا۔ بچہ کے سر پر بالوں کو زعفران حل کردہ پانی سے حجام بھگو دیتا اور عین اُسی وقت جب وہ اُسترا چلانا شروع کرتا لڑکے کے نام پر دو بکروں کی قربانی کر دی جاتی تھی۔ لڑکی کے لیے ایک ہی بکرا کافی تھا۔ سر کے بال صاف ہو جانے کے بعد صندل گھس کر لیپ کر دیا جاتا تھا۔ حاضر الوقت اعزا اپنی اپنی مقدرت کے مطابق رونمائی کے طور پر بچہ کو پیش کرتے تھے۔ قربانی کا گوشت غربا اور اعزا کو تقسیم کر دیا جاتا تھا اور گوشت کے ہمراہ مسالے اور روغن کے لیے نقد رقم بھی بھیج دی جاتی تھی۔ یہ گوشت گھر والے استعمال نہیں کرتے تھے۔ عقیقہ کے وقت ہی بچہ کا نام رکھ دیا جاتا اور اُس کا اعلان بھی کر دیا جاتا تھا۔ واضح رہے کہ روسا و عمائدین میں بہت بڑی تعداد ایسے حضرات کی تھی جن کے نام مشہور نہیں تھے۔ بلکہ اُن کا عرف ہر ایک کی زبان پر رہتا تھا عقیقہ اصل نام پر ہوتا تھا۔ عرف کے تعین کا وقت بچہ کے غوں غاں کرنے کے بعد آتا تھا۔ عقیقہ سے فراغت ہونے کے بعد حسبِ دستور محل کے اندر اور باہر نشاط و انبساط کی محفلیں گرم ہو جاتی تھیں جن کا سلسلہ باہر رئیس کی مرضی اور اندر بیگم کی خوشنودی پر جاری رہتا تھا۔ عام طور سے یہ صحبتیں دو پہر رات ختم ہونے کے بعد یعنی پچھلے پہر ختم ہوتی تھیں۔ اس موقع پر بھی خیر و خیرات اور انعام و اکرام کی نہریں جاری رہتی تھیں۔ جن سے بچہ کی مخصوص ملازماؤں کو زیادہ فیض پہنچتا تھا۔ انا کا بہر حال مرتبہ بلند رہتا تھا۔

عقیقہ کے بعد دوسری اہم مذہبی رسم ختنہ کی ہے جس کا مقصد عضوِ تناسل کے اوپر کی کھال کو کاٹ کر نکال دینا ہے جو صحت مندی کے لیے ایک بہت کار آمد آپریشن ہے۔ اس عملِ جرّاحی کو جتنا جلد کرا دیا جائے، اتنا ہی بچہ کے لیے کم تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چناں چہ بڑے نہان کے بعد اگر موسمِ سرد ہو تو جلد سے جلد ختنہ کرا دیا جاتا تھا۔ عام طور سے اس تقریب کا

اب بھی "مسلمانی" نام ہے۔ عضوِ تناسل کو عوام مسلمانی کہتے ہیں اور چوں کہ یہ عمل اسی عضو پر کیا جاتا ہے لہذا ختنہ مسلمانی کہلایا۔ بعض لوگوں کے نزدیک مسلمانی ہو جانے کے بعد بچہ مسلمان ہوتا ہے اس لیے اس عمل کو مسلمانی کہا گیا۔ لیکن یہ خیال یقیناً غلط اور جہل ہے کیونکہ ختنہ نہ کرانے کے بعد بھی ایک مسلمان دینِ اسلام پر برقرار رہتا اور رہ سکتا ہے۔ بہرحال بڑے گھروں میں ختنہ عموماً پانچویں برس کرایا جاتا تھا۔ بعض خاندانوں میں رسم بسم اللہ کے قبل اور بعض کے یہاں اُس کے تھوڑی ہی مدت کے بعد ختنہ کرا دیا جاتا تھا۔ ختنہ کے دن پہننے کے لیے مخصوص کپڑے بنوائے جاتے تھے جن میں پائجامے کے بجائے رنگین لنگی ہوتی تھی۔ لڑکے کے ہاتھ میں زرتار کنگنا باندھا جاتا اور گلے میں منت کا ناڑا ڈال دیا جاتا تھا۔ اُس روز صبح ہی سے محل میں مہمانوں کا آنا شروع ہو جاتا تھا اور دوپہر سے مرد اعزا و اقارب بھی جمع ہونے لگتے تھے ختنہ عموماً شام کے وقت ہوتا تھا۔ جس صحن میں یہ رسم ادا ہوتی بکثرت اعزا و اقارب جمع ہو جاتے تھے لیکن والد محترم کا دل شرکت پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ختنہ کرنے میں کچھ مخصوص حجاموں کو مہارت تھی اور وہی لمحہ کے لمحہ میں یہ آپریشن کر دیتے تھے۔ ختنہ کے بعد عموماً بڑے بڑے لڈو کاغذی ہانڈیوں میں حاضرین کو تقسیم ہوتے تھے۔ روتا ہوا بچہ گھر میں پہنچایا جاتا تو اُس کو چپ کرنے اور خوش کرنے کے لیے ایک طرف شادیانے بجتے تو دوسری طرف اعزا و اقارب اپنی اپنی استطاعت کے بموجب تحائف اور رقوم پیش کرتے تھے۔ حسبِ دستور اندر اور باہر دعوتیں ہوتیں اور مجرے ہوتے تھے لیکن اُس روز ہنگامۂ عظیم برپا ہو جاتا تھا جب بچہ صحت یاب ہو کر غسلِ صحت کر لیتا تھا۔ اُس دن اُس کو شاہانہ جوڑا پہنا کر دولہا بنایا جاتا اور گھوڑے پر سوار کر کے جلوس کے ہمراہ مذہبی عقیدہ کے تحت مقدس درگاہ میں سلام کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ بڑے تزک و احتشام سے یہ سواری جاتی تھی اور درگاہ میں چڑھاوا چڑھا کے اُسی شان و شوکت سے واپسی ہوتی تھی۔ واپسی پر محل میں چراغاں ہوتا، دھوم سے عیش و شادمانی کی محفلیں گرم ہوتیں اور بڑی پر تکلف دعوتیں ہوتی تھیں۔ چھٹی کی رسم ادا ہونے کے بعد قریب قریب یہ ویسی ہی تقریب ہوتی تھی جو گھوڑا چڑھائی کی شام کو رچائی جاتی تھی۔

تیسری مذہبی تقریب بسم اللہ کہلاتی تھی۔ یہ تقریب مذہبی تھی اور مذہبی رنگ میں منائی جاتی تھی البتہ تمول کا تزک و احتشام شامل رہتا تھا۔ یہ رسم عموماً پانچویں برس شروع ہوتے ہی ادا کر دی جاتی ہے۔ لڑکے یا لڑکی کو نہلا دھلا کے نئے زرتار کارچوبی کپڑے پہنائے جاتے

تھے اور وقت مقررہ پر کسی جلیل القدر عالم دین سے یہ فرض ادا کرایا جاتا تھا۔ وہ خود یا کوئی بزرگ عزیز بچہ کو گود میں لے کر بیٹھتے اور جناب قبلہ وکعبہ پہلے اُس کی زبان سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہلاتے۔ بعدازاں سورہ "اقرا باسم" کی پہلی آیت پڑھاتے تھے۔ رسماً الف بے جیم کے حروف بھی زبان سے ادا کرا دیتے تھے۔ اس رسم کی ادائی کے بعد انتہائی التزام واہتمام سے مٹھائیاں تقسیم ہوتی تھیں۔ اعزا واقارب اپنی حسب مقدرت بچہ کو رقمیں پیش کرتے تھے۔ یہ امر بہرحال قابلِ ذکر ہے کہ اس تقریب کے بعد حسب دستور دعوتیں ہوتی تھیں، انعام واکرام تقسیم کیے جاتے تھے لیکن رسمِ بسم اللہ کی حرمت ملحوظ رکھتے ہوئے اس موقع پر رقص وسرود کا کوئی جشن نہیں منایا جاتا تھا۔ گھر کے اندر ڈومنیاں آجاتیں تب بھی نغمہ آرائیوں کا شور وغوغا برپا نہیں ہوتا تھا۔ بسم اللہ کے دوسرے ہی روز تعلیم کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا اور بچہ مولوی اور مدرس کے آگے زانوئے ادب تہہ کر کے درس لینے لگتا تھا۔ لڑکی کو پڑھانے کے لیے مستقل طور پر استانی گھر ہی میں موجود رہتی تھی۔

سنِ بلوغ کو پہنچنے کے قبل ایک اور مذہبی رسم ادا ہوتی تھی جس کا تعلق ایک اہم دینی فرض سے ہے۔ بسم اللہ کے ذیل میں نماز آجاتی تھی اور روزہ کا تعارف کرانے کے لیے روزہ کشائی کی جاتی تھی۔ لڑکی روزہ کشائی نویں برس اور لڑکے کی بارھویں یا چودھویں برس ہوتی تھی۔ نابالغ اولاد کو روزہ رکھایا جاتا تھا اور افطار کا سامان بڑے وسیع پیمانہ پر ہوتا تھا۔ یہ رسم ماہِ رمضان میں ہوتی تھی تو کثرت سے روزہ دار مرد اور خواتین مدعو کیے جاتے تھے۔ افطاریوں میں فواکہات، میوہ جات اور طرح طرح کے پکوان ہوتے تھے۔ افطار کے بعد ہی انواع واقسام کے لذیذ اور لطیف کھانے کھلائے جاتے تھے۔ ماہِ رمضان میں محفلِ رقص وسرود سے اجتناب کیا جاتا تھا لیکن یہ رسم اگر کسی اور زمانہ میں ادا ہوتی تو اس موقع پر بھی ساز بجنے لگتے تھے اور محل میں اندر اور باہر عیش وانبساط کی محفلیں گرم ہوجاتی تھیں۔ روزہ رکھنے کی خوشی میں غربا ومساکین کو بھی کھانا تقسیم ہوتا تھا اور اتنی سیر چشمی کے ساتھ کہ کوئی آنے والا مایوس ہو کر واپس نہ ہو۔

آخر میں یہ واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ خوشی کی قریب قریب یہ تمام رسمیں خواص و عوام سب کے یہاں ادا ہوتی تھیں۔ جو تفصیلات اوپر بیان ہوتے وہ روسا وعمائدین کے محلوں سے متعلق تھے۔ لیکن جو لوگ کم حیثیت ہوتے تھے اُن کے یہاں تقاریب کے لوازمات

میں بھی اُسی تناسب سے کمی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ غربا بھی بقدر رجثہ خوشی منا لیتے تھے اور کوئی تقریب ایسی نہ تھی جو اُن کے یہاں نہ ہوتی ہو۔ کم حیثیت لوگوں میں بھی حوصلہ تھا اور وہ اپنے دل کی امنگ نکالنے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ یہ تمام تقاریب شہر لکھنؤ کے کلچر کا اہم جزو تھے اور اس کلچر کی تعمیر میں امیر و غریب سب کا حصہ تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک متوسط درجہ کے لوگ بھی اپنے بچوں کی چھٹی، ختنہ، بسم اللہ وغیرہ کی تقاریب اتنی فراغدلی اور حوصلہ مندی سے کرتے تھے جن کی مثال آج کل کے دولت مندوں کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ زمانہ نے حالات کا دھارا کچھ ایسا موڑ دیا ہے کہ تقاریب ہی زینتِ طاقِ نسیاں ہو گئی ہیں۔

## (۲) شادی کی رسمیں

شادی خانہ آبادی مذہبی نکتہ نگاہ سے بہت بڑی اور اہم ترین رسم ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں عقدِ مناکحت پر بہت زور دیا گیا ہے اور رسول اسلام نے نکاح کے ساتھ نسل بڑھانے پر بھی زور دیا ہے اور اس طرح زور دیا ہے کہ گویا نکاح کا مقصد ہی افزائشِ نسل ہے۔ لیکن اس تاکید کے باوجود مناکحت کی رسم ادا کرنے کا ضرورت سے زیادہ سہل اور آسان طریقہ معین کیا ہے جس میں جانبین کا ایجاب و قبول اور تعین مہر سے زیادہ اور کوئی شرط نہیں رکھی گئی۔ لیکن لکھنؤ والوں بالخصوص روسا و عمائدین نے اس سیدھے سادے اقرارِ باہمی میں ریتوں، رسموں اور تکلفات کر کے اس تقریب میں اتنی رومانیت شامل کر دی تھی کہ مناکحت کی تقریب خود اپنی جگہ پر ایک حسین و جمیل دلہن کی صورت میں دنیا کے سامنے آگئی تھی۔ ہر ریت میں دلپذیری اور ہر رسم میں دلفریبی تھی۔ دولہا کی برات اس طرح نکلتی تھی کہ قدم قدم پر شریعت سر جھکا دیتی تھی اور دلہن کی رخصتی یوں ہوتی تھی کہ در و دیوار سے رومانیت آنکھیں بچھا دیتی تھیں۔ یہ تمام ایجادات و اختراعات فرمانروایانِ اودھ کے دور میں ہوئے تھے جنھوں نے ایک طرف شادی سے متعلق ہندوستان کے تمام روایات کو اپنایا تو دوسری طرف اصفہانی احتشام کی نمود اور شیرازی شادی کی گرمیاں اس میں اس طرح شامل و داخل کیں کہ ہمارا ایک نیا معاشرہ معرضِ وجود میں آگیا۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد بھی نہ صرف روسا و عمائدین بلکہ شرفا و عوام بھی اُن تمام رسموں کو،

جو فرمانروایانِ اودھ کے دور میں جاری ہوئی تھیں، کلیجے سے لگائے رہے تھے اور اپنے حتی المقدور سختی سے کاربند رہا کرتے تھے۔ رؤسا و عمائدین نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک وضعداریوں میں کمی نہیں آنے دی تھی اور شرفا و عوام ریتوں اور رسموں کی پاسداری میں مفلوک الحال ہو جاتے تھے لیکن اپنی آن میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ اور یہی ہمارے شہر کے باشندوں کی شانِ امتیاز تھی۔ یہاں تک کہ زمانہ نے اتنا پر باد کر دیا کہ شرفا و عوام تو درکنار روسا و عمائدین کے اخلاف میں وضعداریاں تو درکنار اُن کو ریتوں اور رسموں کے لوازمات کی تفصیل بھی فراموش ہو چکی ہے اور اب جو ریتوں اور رسموں کا منہ چڑھایا جاتا ہے اُن کے بارے میں میرے مرحوم دوست مہابیر پرشاد سریواستو کا ایک جملہ بڑا معنی خیز تھا۔ اُسی محل سرا میں جہاں سے یادش بخیر خود ہی میری شادی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کو تقریباً دس گیارہ برس قبل ایک شادی میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن یہاں سے اب لڑکی رخصت ہو رہی تھی۔ دلہن فینس میں سوار کرائی گئی۔ لہنگے پھٹکارے مہریاں ساتھ چلیں، جہیز کا سامان پہلے ہی نکل چکا تھا۔ لیکن ڈیوڑھی میں رخصتی کے وقت کچھ ایسا ہنگامہ تھا جس کو دیکھ کر اور وہاں سے بلند ہوتی ہوئی آوازیں سن کر مہابیر پرساد نے برجستہ کہا کہ یہ دلہن وداع ہو رہی ہے یا کوئی جنازہ نکل رہا ہے۔ یہ فقرہ کہنے کا خیال اس لیے آیا کہ شادی میں عیش و شادمانی اور نشاط و انبساط کا کوئی عنصر نظر نہیں آتا تھا۔ بہرحال اس مقام پر اُن تمام ریت رسموں کا تذکرہ پیش کیا جاتا ہے جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک رائج تھیں اور جن کی فرحناک اور تھکا دینے والی منزلوں سے خود راقم کو گزرنا پڑتا تھا۔ زمانہ بہت جلد گزر جاتا ہے۔ چنانچہ اِن تمام مدارج کو جھیلتے ہوئے اٹھاون برس گزر چکے ہیں اور اہلیہ مرحومہ انتقال بھی فرما چکی ہیں لیکن وہ "حادثات" جو پیش آئے تھے اپنی پوری تفصیلات سمیت اب تک حافظے میں تازہ ہیں۔

راقم کے بزرگوں کو خاندان سے باہر شادیاں کرنے سے سخت پرہیز تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ اپنے ایرانی خون کو پاک و صاف رکھنا شرافتِ نسب کی طہارت کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے ایامِ رضاعت ہی میں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوڑے طے کر دیے جاتے تھے۔ میری شادی بھی میری چچازاد بہن سے ہوئی تھی۔ ایسے قریبی رشتہ میں شادیاں ہونے کی وجہ سے بڑی پُرلطف رشتہ داریاں قایم ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ میری اہلیہ اپنے والد کے رشتے سے میری

چچازاد بہن اور اپنی والدہ کی جانب سے میری بھانجی اور برادر مرحوم جعفر علی خاں اثر کے سلسلے سے بھتیجی تھیں۔ بہر حال یہ بات عرض کرنا ہے کہ خاندان میں شادی طے ہونے کے سبب سے لڑکے والوں کو لڑکیاں اور لڑکیوں کے والدین کو لڑکے تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی تھی۔ یہ زحمت حقیقتاً ایک محنتِ شاقہ ہوتی تھی جو کئی مدارج طے کر کے آسان ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں باہر نکلنے والی عورتوں کا ایک مخصوص طبقہ تھا جو شادیاں طے کراتی تھیں۔ اُن میں یہ کمال تھا کہ اونچے طبقہ والوں کے تمام محلوں اور محل سراؤں میں شادی کے قابل لڑکوں اور لڑکیوں کے مفصّل حالات اُن کو از بر ہوتے تھے۔ وہ اپنی پسند اور اپنے فیصلے سے جوڑے تجویز کرتی تھیں اور پھر دونوں جانب محلوں میں جا کر تجویزیں پیش کرتی تھیں۔ یہ عورتیں بے حد چرب زبان ہوتی تھیں اور اُن کے بیان میں جادو کا اثر ہوتا تھا۔ لڑکے والوں کے یہاں جاتی تھیں تو لڑکی کو صورت و شکل میں حور اور تربیت میں مجسم ہنر شعاری بناتی تھیں اور لڑکیوں والوں کے روبرو لڑکے کو حضرت سلیمان کی پیغمبرانہ شان کا شاہنشاہِ ہفت اقلیم ثابت کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ دورانِ پیام و سلام میں اُن کو تجویز منظور ہو یا نہ ہو اُن کا خود دونوں جانب سے بھلا ہو جاتا تھا۔ ان عورتوں کو مشاطہ کہتے تھے۔ اور زیادہ تر جانبین کو اطلاعات انھیں عورتوں سے مل جاتی تھیں۔ نیز یہ کہ محل کی بیگمات کا غائبانہ تذکرہ بھی دونوں طرف انھیں کے وسیلے سے ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد اپنے گھر کی عورتیں سلسلہ جنبانی کرتی تھیں۔ روسا و عمائدین اپنے مشیر کاروں سے مشورے کرتے اور اُنھیں کی وساطت سے دوسری جانب پیغام و سلام کہلاتے تھے۔ لیکن یہ ایک طویل المدّت طریقِ کار ہوتا تھا۔ متعلقہ عورتیں اس کام کو مردوں کے مقابلے میں بہت جلد انجام دیتی تھیں۔ ان عورتوں پر بیگم صاحبہ کو اطمینان بھی ہوتا تھا۔ اس لیے وہ انھیں عورتوں سے اطمینان حاصل کر کے نسبت قبول فرما لیتی تھیں اور رئیس کے لیے بجز آمادگی کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا تھا۔ اسی پیام و سلام کے دوران بعض شرفا و امرا کے یہاں لڑکے اور لڑکی کو دیکھنے کا بھی رواج تھا۔ لڑکا بن سنور کر "بر دکھوے" کے لیے بھیجا جاتا تھا اور مجوزہ سسرال میں بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ لڑکیوں کے والدین بظاہر لڑکی کو دکھانے کے قائل کبھی نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے لڑکے والے اپنے گھر کی عورتوں کو حکمت عملی سے لڑکی کو دیکھنے پر مامور کرتے تھے۔ یہ عورتیں کسی نہ کسی بہانے سے لڑکی والوں کے یہاں جاتی تھیں اور کوئی نہ کوئی تدبیر نکال کے لڑکی کو دیکھ لیتی تھیں۔ دونوں جانب لڑکے اور لڑکی

کو دیکھ کر اطمینان کر لینے کے بعد نسبت طے ہو جاتی اور منگنی کی تاریخ مقرر ہو جاتی۔ رواجاً استخارہ بھی کرا لیا جاتا تھا۔ اسی مقام پر یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ بہت اونچے اور بلند پایہ روسا کے یہاں "بر دکھوا" یا لڑکی دیکھنے یا دکھانے کا دستور نہیں تھا۔ وہ اس رسم کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ اُن کے لیے خاندانی حالات، حسب نسب، مجوزہ لڑکے یا لڑکی کا کردار جان لینا اور اطمینان کر لینا کافی ہوتا تھا۔

شادی کے سلسلہ میں سب سے پہلی رسم منگنی کی ادا ہوتی تھی۔ یہ رسم نہ صرف ہر بڑے چھوٹے خاندان میں بلکہ اُن گھرانوں میں بھی بجا لاتے تھے جہاں بہت پہلے سے نسبتیں طے ہوتی تھیں۔ اس رسم کی ادائی میں دولہا کی عزیز عورتیں بھیجی جاتی تھیں۔ اُن کی روانگی جلوس کی شکل میں ہوتی تھی۔ آگے آگے باجا پیچھے پیچھے عصا بردار وغیرہ ہوتے تھے۔ اُن کے پیچھے رنگین اور خوبصورت بڑی بڑی ہانڈیوں میں مٹھائی ہوتی تھی۔ ہر ہانڈی ایک مزدور اٹھائے رکھتا جو صاف اور اُجلے کپڑے پہنے ہوتا تھا۔ اس کے بعد نقرئی کشتیوں میں جن پر زربفتی یا کارچوبی پوششیں پڑی ہوتیں دُلہن کے لیے پھولوں کا گہنا ہوتا تھا۔ اس گھڑی میں جسم کے ہر حصّہ کے لیے جن میں زیور پہنا جاتا، پھولوں کا زرتار کوئی نہ کوئی عدد ہوتا تھا۔ یہ کشتیاں مہریاں لیے رہتی تھیں جو پوری طرح اپنے مروجہ لباس میں زرق برق نظر آتی تھیں۔ اُن کے پیچھے مخدرات کی فینسیں اور دوسری ہمراہ عورتوں کے چو پہلے ہوتے تھے فینسوں کے ہمراہ بھی اپنی وضع قطع میں مہریاں لگی رہتی تھیں۔ بیگمات میں جو دولہا کی سب سے زیادہ قریب اور بزرگ معظمہ ہوتی تھیں اُن کے ہمراہ دُلہن کو پہنانے کے لیے زیور کا کم سے کم ایک عدد یعنی طلائی اور قیمتی جواہرات سے جڑی ہوئی انگوٹھی ضرور بھیجی جاتی تھیں۔ وہ معظمہ یہ انگوٹھی خود اپنے ہاتھ سے دُلہن کو پہناتی تھیں۔ پھولوں کا گہنا دوسری بیگمات پہناتی تھیں۔ دولہا کی مادرِ گرامی بذاتِ خود نہیں تشریف لے جاتی تھیں۔ یہ تمام مراسم اُن کی جانب سے دوسرے اعزا ادا کرتے تھے۔ دُلہن والوں کی جانب سے اِن منگنی لانے والوں کی بڑی سیر چشمی اور فراخ دلی سے تواضع ہوتی تھی۔ رسم ادا کر کے دولہا والیاں رخصت ہو جاتی تھیں لیکن اُسی وقت سے نہ صرف یہ طے ہو جاتا کہ نسبت قایم ہو گئی بلکہ سارے طور طریقے وہی اختیار کر لیے جاتے تھے جو سمدھیانے والوں کا شعار تھا۔ منگنی کی کم سے کم چھ ماہ بعد اصل شادی کی تقریب ہوتی تھی۔ اُس کے لیے فی الفور تاریخ کا بھی تعین نہیں ہوتا تھا، لیکن

عزیزدارانہ تعلقات پوری طرح برتے جاتے تھے۔ دولہا کے یہاں کوئی تقریب ہوتی تو دلہن والوں کو سمدھیانے والا حصہ بھیجا جاتا جس میں دلہن کے ساتھ خصوصیت برتی جاتی تھی۔ یہی طرزِ عمل دلہن والوں کا بھی ہوجاتا تھا۔ تقاریب کے علاوہ عید الفطر، عید الاضحیٰ اور محرم کے مواقع پر بھی عزیزدارانہ تحفے دونوں جانب بھیجے جاتے تھے۔ عید الفطر کے روز دلہن کے لیے زعفرانی سوئیوں اور دوسری لذیذ غذاؤں کا خوان جاتا تھا اور اُس کے عزیزوں کے علیحدہ حصے ہوتے تھے۔ اسی طرح دولہا اور اُس کے عزیزوں کے لیے بھی دلہن والوں کے یہاں سے تحفے جاتے تھے۔ عید الاضحیٰ میں ایک دوسرے کو لذیذ غذاؤں کے خوان بھیجتے تھے۔ جن میں دولہا والے دلہن اور دلہن والے دولہا کے لیے مخصوص خوانوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ محرم میں دونوں جانب سے ایک دوسرے کو سونف اور کھوپرے کا گوٹا، الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور اسی سامان کے ہمراہ بہترین کارچوبی کام بنے ہوتے بٹوے بھی بھیجتے تھے۔ دولہا والے اپنے تحائف میں دلہن کے لیے نقلی موتیوں اور سبز رنگ کے ریشم سے بنی ہوئی ہاتھوں کی تمرنین اور گلے کے لیے طوق اور گلوبند یا اسی قسم کا کوئی اور عدد بھیجتے تھے یعنی یہ کہ سارا رکھ رکھاؤ وہی ہوجاتا تھا جس کا دستور شادی ہوجانے کے بعد ہونا چاہیے۔ منگنی کے کم سے کم چھ ماہ بعد شادی کا کیوں دستور تھا اس کے لیے ایک روایت راقم نے اپنے بزرگوں سے سنی تھی لیکن اُس کی تائید اپنے خاندان کے لیے کسی دوسرے مقام سے حاصل کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا اور اب تو پرانے بڑے بوڑھوں سے لکھنؤ کی دنیا خالی ہے۔

کہا جاتا تھا کہ قدیم ایران میں قبولِ اسلام کے بعد یہ رسم جاری کر دی گئی تھی کہ شادی کا مسئلہ دونوں جانب والدین طے کر کے بہت جلد نکاح کی رسم ادا کر دیتے تھے لیکن باضابطہ رخصتی تقریباً چھ ماہ یا اور زیادہ مدت کے بعد ہوتی تھی۔ اس درمیان زن و شو کو ایک دوسرے سے ملاقات کرنے اور آپس میں بے تکلفانہ گفتگو کی پوری پوری آزادی، حاصل رہتی تھی لیکن جانبین کی طرف سے بقصد ہزار اہتمام یہ کوشش رہتی تھی کہ دونوں کو خلوتِ صحیحہ کا موقع نہ ملے۔ چھ ماہ کی مدت میں دونوں ایک دوسرے کے مزاج داں ہوجاتے تھے۔ دونوں کی طبیعتیں مل جاتیں اور آپس میں کوئی قابلِ لحاظ اختلاف رونما نہ ہوتا تو رخصتی کر کے اُن کا علیحدہ گھر آباد کرا دیا جاتا تھا۔ لیکن اگر اس میل ملت کے بعد ایک دوسرے کے مزاج میں تصادم کی صورت نظر آتی تو دونوں کے حق میں علیحدگی ہی پسند کی جاتی تھی جو طلاق کی صورت میں حاصل ہوجاتی تھی چوں کہ

یہ طلاق جانبین یعنی زن و شو کی رضامندی سے ہوتا تھا اس لیے اس کی شرعی نوعیت خلع کی ہوتی تھی جو لڑکے والوں کو گراں بھی نہیں گزرتی تھی۔ انھیں بزرگوں کے بقول جو اس ایرانی رسم و رواج کے راوی تھے فرمانروانِ اودھ نے جہاں اور بہت سی دوسری روایات اخذ کرلی تھیں اور اُن پر کاربند تھے، اس چھ ماہ کے بعد رخصتی کا دستور بھی اکتساب کرلیا تھا۔ لیکن اودھ میں نکاح کردینے اور زن و شو میں ملاقات کرادینے کا چلن رائج کرنے کا کوئی خیال حکمرانوں کے دل میں پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس منگنی کی رسم میں وہ اخلاقی پابندی پیدا کردی تھی جو نکاح سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی۔ منگنی کے بعد ہندوستانی ریتیں اور رسمیں ادا کرنے کے لیے معقول مدت درکار ہوتی تھی۔ چوں کہ ان مراسم کی ادائی میں وافر سرمایہ صرف ہوتا تھا اور بڑے وسیع انتظامات کرنا پڑتے تھے جو روسا و عمائدین کے یہاں وسیع سے وسیع تر پیمانے پر انجام پاتے تھے۔ اس لیے چھ ماہ کی مدت بات کرنے میں کٹ جاتی تھی۔ اس چھ ماہ کی مدّت میں زن و شو نہ سہی لیکن اُن کے والدین اور اعزا کو ایک دوسرے سے قریب ہونے کا بڑا موقع ملتا تھا اور ایک کے دوسرے پر خانگی حالات، جن میں لڑکی اور لڑکے کی طبیعتیں بھی شامل تھیں، پوری طرح آشکار ہو جاتے تھے۔ ان عزیزدارانہ تعلقات میں بدمزگی پیدا ہوتی یا کسی جانب یہ خدشہ محسوس ہوتا کہ اُن کے لڑکے یا لڑکی کا دوسرے گھر میں نباہ نہیں ہوسکے گا تو مایوسانہ منگنی توڑ دی جاتی تھی اور شادی کرنے سے انکار ہوجاتا تھا۔ چوں کہ منگنی ٹوٹنے کا برا اثر دونوں جانب بالخصوص لڑکی پر بہت زیادہ پڑتا تھا اس لیے حتی الامکان نباہ کی صورتیں تلاش کی جاتی تھیں مگر اخلاقیات کا یہ دباؤ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بالکل ختم ہوگیا اور منگنیاں ذرا ذرا سی بات پر بلا تکلّف توڑ دی جانے لگی تھیں، یہ صورتِ حال ترقی پذیر ہے۔ بہرحال اُس زمانہ میں منگنی کا بڑا احترام ہوتا تھا اور علیحدگی کا خیال انتہائی مایوسی اور مجبوری میں آیا کرتا تھا۔ منگنی کے بعد ہی سے دونوں جانب شادی کے انتظامات شروع ہوجاتے تھے۔ نئے نئے زیور، نئے نئے کپڑے، طلائی و نقرئی سامان نیز بہت سی دوسری اشیا دُلھن والوں کے یہاں فراہم ہوتے۔ دولھا والے بہو کے رہنے کے لیے علیحدہ عمارت تعمیر کراتے یا تعمیر شدہ عمارت ہی کے کسی حصہ میں تغیر و تبدل کرکے قلعی کرادی جاتی۔ غرضکہ دونوں جانب بڑی حد تک ضروری اور مناسب انتظامات مکمل ہونے کے بعد شادی کی تاریخ طے ہوتی تھی۔ نکاح کے قبل اور بعد کی

رسموں کے لیے کم سے کم ایک ماہ کی مدّت ضرور درکار ہوتی تھی۔

یوں تو شادی کے سلسلے میں بے شمار چھوٹی اور بڑی رسمیں ادا کی جاتی تھیں جن کی تعداد کا تعین کر کے بتانا بھی اب ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ اُس دور کو ختم ہوئے تقریباً نصف صدی گزر چکی ہے۔ اور قدیم معاشرے کے پرستار بھی دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں اس لیے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر اُن چند بڑی بڑی رسموں کا تذکرہ جن کے نام اب تک لکھنؤ والوں کو یاد ہیں، پیش کیا جاتا ہے۔ اِن میں پہلی اور اہم رسم "مانجھا" کہلاتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ لڑکی مانجھے بٹھا دی گئی۔ چوں کہ مانجھا بٹھانے کے بعد لڑکی تقریباً مقید اور ایک ہی کمرے میں محبوس رہتی تھی اس لیے مانجھے اور نکاح کے درمیان پندرہ روز کا وقفہ رکھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں پندرہ روز کا وقفہ قلیل ہی سمجھا جاتا تھا۔ فی زماننا لڑکیوں کے لیے خواہ وہ پردہ دار ہی کیوں نہ ہوں پندرہ روز کی مدّت بھی وبالِ جان ہو جائے گی لیکن اُس دور میں ہجومِ عیش و نشاط کی بدولت بڑی مدت بھی مختصر محسوس ہوتی تھی۔ لڑکی کے مانجھا بیٹھنے کے پہلے ہی سے ڈومنیاں چھپتیں اُڑا دیتی تھیں اور نغمگی کا وہ طوفان بلند ہوتا تھا جو پندرہ روز تک ہمہ وقت برپا رہتا تھا۔ لڑکی کی ہم جولی لڑکیاں اور بے تکلف ساتھ کھیلی ہوئی بن بیاہیاں ہر وقت پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ گھر کے اعزا و اقارب بھی وقتاً فوقتاً حجرہ میں جا کر خبر گیری کرتے تھے اس لیے لڑکی کو زیادہ زحمت نہیں ہوتی تھی اور نکاح کے بعد رخصتی تک کے پندرہ دن اسی حجرہ عروسی میں گزار دیتی تھی۔ بعض لڑکیاں مانجھا پہنتے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیتی تھیں۔ کیوں کہ اپنے میکے کی جدائی اور والدین کی مفارقت پیشِ نظر ہوتی تھی لیکن دل بہلانے والوں کی بھی کمی نہیں رہتی تھی۔ مانجھا پہننے اور پہنانے میں بھی ایک دلچسپ رومانیت تھی۔

مانجھا بٹھانے کے قبل حجلۂ عروسی آراستہ ہو جاتا تھا۔ زمین کا فرش رہتا اور اُس پر مسند بچھی رہتی تھی۔ ایک چھوٹی پلنگڑی جس کے پایوں پر چاندی منڈھی ہوتی تھی مسند سے متصل بچھا رہتا تھا تاکہ عند الضرورت لڑکی اُسی پر آرام کرلے۔ دوسری ضرورتوں کی فراہمی کرنے کے لیے بیگم صاحبہ کی کنیزیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ تقریب کے دن دُلہن کو نہلا دھلا کے سارے جسم پر بٹنا ملا جاتا اور مہندی لگائی جاتی۔ ہاتھوں میں کنگنا ناڑہ باندھ کر زرد کپڑے پہنا دیے جاتے تھے اُس کے بعد سے پھر باہر نکلنے کا کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں دو تین بار قلیل سے قلیل وقفہ کے لیے رفعِ حاجت کرنے کو باہر نکلنا ہوتا

تھا۔ اُسی روز مانجھا بٹھانے کے بعد ہی دولہن کے جسم کا بچا ہوا بٹنا اور منہدی جن کو دلہن کا جھوٹا بٹنا اور جھوٹی منہدی کہتے تھے نیز مصری کے کوزے اور ہنڈیوں کے گھڑے دولہا کو ایک شاندار جلوس میں روانہ ہوتے تھے۔ ہنڈیاں فرمایش کر کے اچھی بنوائی جاتی تھیں۔ لیکن پھر بھی دولہا کی مخصوص ہنڈیوں میں میوہ جات اور طلائی و نقرئی ورقوں کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ ان ہنڈیوں میں کشمیری تال مکھانے، بادام اور چھوارے مقدار میں بہت زیادہ ہوتے تھے۔ یہ جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلتا تھا۔ آگے آگے باجوں کے کئی جوڑ ہوتے تھے۔ اُن کے پیچھے زرق برق پوشاک میں جھنڈی بردار نقرئی چھڑوں کی سرخ سرخ جھنڈیاں لیے جن کے پھریروں میں لچکا لگا ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے تھے۔ اُن کے پیچھے رئیس کے مخصوص عصا بردار اپنے یونیفارم میں چاندی کے عصا سنبھالے ہوتے تھے۔ ان عصا برداروں کے عقب میں چاندی منڈھی ہوئی چوکی پر وہ سامان ہوتا تھا جو دولہا کے لیے مخصوص تھا یعنی مانجھے کا زرد بھاری جوڑا اور اسی کے ساتھ ایک نقرئی لوٹا اور کٹورا بھی ہوتا تھا جو ناڑے سے چوکی میں کس کے باندھ دیا جاتا تھا تاکہ راستہ میں گر نہ پڑے۔ چوکی کے پیچھے چند خوانوں میں دولہا کے لیے مخصوص ہنڈیاں کاغذی رکابیوں میں رہتی تھیں۔ اسی سامان میں جھوٹی منہدی اور جھوٹا بٹنا بڑی خصوصیت کے حامل اشیا تھے۔ دولہا کے لیے مخصوص اشیا کے خوانوں کے بعد بے شمار خوانوں میں عام ہنڈیوں کے طباق ہوتے تھے۔ ان بے شمار خوانوں کی تعداد درجنوں سے یقیناً زیادہ ہوتی تھی لیکن ایک بار سو سے بھی تجاوز ہو گئی تھی۔ خوانوں کی قطار کے پیچھے دلہن کی چھوٹی بہنیں فینس یا فینسوں پر اور ڈومنیاں چوپہلوں اور ڈولیوں پر جاتی تھیں۔ یہ جلوس اچھا خاصا بڑا ہو جاتا تھا۔ دولہا کے یہاں بھی نفیس فرش پر مسند بچھ جاتی تھی اور اسی کمرے میں دلہن کی بہنیں دولہا کا مخصوص سامان پیش کرتی تھیں نیز دودھ پلائی کے نام کی رقم بھی حاضر کرتی تھیں ساتھ کی ڈومنیاں جو اپنی فن کاری کے تماشے بلا تکلف ہر جگہ دکھانے کی عادی تھیں، یہاں بھی اپنی شرارتوں سے باز نہیں رہتی تھیں۔ عمداً دولہا کو طرح طرح سے ستاتی تھیں۔ ہنڈی اور مصری کھلانے کے بہانے جو رسم کے مطابق انھیں کا فرض تھا۔ دولہا کا ناطقہ بند کر دیتی تھیں۔ بیگمات کے علاوہ دولہا کے گھر کی مستورات کو گالیاں دینے میں بھی اُن کو باک نہیں ہوتا تھا۔ یہ صحبت دیر تک گرم رہتی تھی۔ اور اس کے بعد آنے والا جلوس تتر بتر ہو کر واپس ہو جاتا تھا۔

اب دولہا بھی مانجھے بیٹھ جاتا تھا لیکن اُس کو کمرہ میں مقید نہیں رہنا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔

مانجھے کے کپڑے پہننے کے بعد کچھ دن مانجھے بیٹھنا ضروری تھا اس لیے آئندہ دس بارہ روز تک کوئی قابلِ ذکر تقریب نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے بعد دُلہن کے یہاں سے آتے ہوئے مانجھے کے جواب میں دولہا کے یہاں سے سانچق جانے کی رسم ادا ہوتی تھی۔ جس تزک و احتشام سے مانجھے کا جلوس آیا تھا اُس سے زیادہ شان و شوکت کا جلوس سانچق کا بھی ہونا ضروری تھا۔ سانچق میں مقابلتاً سامان بھی بہت قیمتی ہوتا تھا۔ دُلہن کے لیے بہت بھاری کارچوبی کام کا چڑھاوے کا جوڑا بھیجا جاتا تھا جس کے ساتھ سنہری مقیش کا سہرا، چاندی کا چھلا، سونے کی جڑاؤ انگوٹھی نیز زیورات کے چند عدد اور ہونا ضروری تھے۔ اسی زیور کو پہنا کر دُلہن رخصت کی جاتی تھی۔ سانچق کے دن پہننے کے لیے پھولوں کا زرنار گہنا بھی اسی سامان میں شامل رہتا تھا۔ مانجھے میں پنڈیاں آتی تھیں اُس کے جواب میں دولہا کے یہاں سے نقل شکر کے قرص اور میوہ جات بھیجے جاتے تھے۔ وہاں سے درجنوں خوان پنڈیوں رکابیوں سے بھر کر آتے تھے تو یہاں سے اُن کے دو چند بلکہ سہ چند گھڑے جانا ضروری تھے۔ سانچق کی ایک تقریب میں نقل، شکر کے قرص اور میوہ جات کے دو سو گھڑے بھیجے گئے تھے۔ ان گھڑوں کی روانگی میں بھی حسن و جمال ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ ایک ایک گھڑا علیحدہ علیحدہ روانہ کرنے کا نظارہ دیکھنے والوں کی نظروں کو تھکا سکتا تھا اس لیے طرح طرح سے آرائش و زیبائش کے طریقے نکالے جاتے تھے اول تو سانچق کے لیے خاص اہتمام سے رنگین اور پھول دار گھڑے بنوائے جاتے تھے۔ اور ان گھڑوں میں نقل و میوہ جات رکھ کر اُن کے مونگھڑوں کو شالباف کے ٹکڑوں سے ڈھک کر باندھ دیا جاتا تھا پھر بانس کے نازک چوکھٹوں کے فریم بنا کر اور اُن پر رنگین کاغذ چڑھا کے رنگین دفتی جڑ دی جاتی تھی۔ اس طرح ایک چوکھٹے میں چار چار گھڑے ایک تختے میں جڑ دیے جاتے تھے۔ اب ان چوگھڑوں کی قطار بہت دیدہ زیب ہو جاتی تھی۔ سانچق کا جلوس بھی دستور کے مطابق نکلتا تھا۔ لیکن اس میں چوگھڑوں کے علاوہ ایک چیز بہت خوشنما ہوتی تھی۔ انھیں چوگھڑوں کے آگے ایک انتہائی خوب صورت نقرئی گنگا جمنی مٹکی رہتی تھی جس میں دہی بھرا ہوتا تھا۔ اُس کا گلا بھی شالباف سے بندھا ہوتا اور ارد گرد سنہری روپہلی مچھلیاں لٹکا دی جاتی تھیں۔ توہم پرستی کے دور میں دہی اور مچھلی کو بڑا فالِ نیک سمجھا جاتا تھا۔ رئیس

جب صبح کو محل کے باہر تشریف لے جانے لگتے تو خواصیں اور محل دار دہی مچھلی کے نعرے لگاتی تھیں۔ شادی کے موقع پر مچھلی ضرور بھیجی جاتی تھی۔ ساچق کے زیادہ سے زیادہ تیسرے روز نکاح اور رخصتی کا وقت آجاتا تھا اس لیے دہی اور مچھلی کا چڑھاوے کے جوڑے کے ساتھ جانا بہت زیادہ باعثِ برکت و فلاح سمجھا جاتا تھا۔ یہ جلوس شام ہی کو نکلتا تھا۔ گنگا جمنی نقرئی مٹکی پر سورج کی کرنیں وہ بہار پیدا کر دیتی تھیں جس سے جلوس کی رونق دوبالا ہو جاتی تھی۔

مانجھا ہو یا ساچق یا اسی طرح کی کوئی چھوٹی موٹی رسم ادا کی جاتی ہر موقع پر دوسری چیزوں کے ہمراہ مٹھائیوں اور عطر کا بھیجنا بہت ضروری اور لازمی تھا۔ بٹنے کے ہمراہ میٹھا عطر بھی بھیجا جاتا تھا۔ کپڑوں کے ساتھ عموماً حنا یا شمامۃ العنبر کی بڑی شیشیاں شامل کر دی جاتی تھیں۔ روسا و امرا کے یہاں عورتوں اور مردوں سب ہی کے لیے عطر لگانا باعثِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ شادی کے موقع پر عطر کی بھرمار ہوتی تھی۔ اسی طرح ہر رسم کے بعد اعزا و اقارب اور دوست احباب کے یہاں حقے بھیجے جاتے تھے۔ پنڈیاں بڑی مقدار میں بھیجی جاتی تھیں۔ لیکن پھر بھی کم پڑنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ ساچق میں نقل جاتے تھے جو مرغوب اور پسندیدہ شیرینی کا درجہ نہیں رکھتے تھے اس لیے اُس اندیشہ کو دور رکھنے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ساچق کے موقع پر بڑی مقدار میں مٹھائیاں بھیجی جاتی تھیں۔ تقاریب کے مواقع پر مخصوص فرمایش سے بہتر سے بہتر لڈو اور امرتیاں بنتی تھیں۔ برفی کی لوزیں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ کم سے کم پانچ قسم کی مٹھائیاں بھیجی جاتی تھیں اور وزن میں منوں کا حساب کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنی زیادہ مٹھائی بہت آسانی سے بڑے پیمانے پر تقسیم ہو جاتی تھی۔

ساچق کے دوسرے ہی دن اور دولہا کی بارات آنے کے تقریباً چوبیس گھنٹہ قبل دولہن کے گھر سے بڑے جلوس اور بھاری روشنی کے ساتھ دولہا کے یہاں منہدی جاتی تھی۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ لڑکی والے لڑکے کے لگانے کے لیے منہدی بھیجتے تھے۔ اُس زمانہ میں منہدی لگانا عورتوں اور مردوں سب کے لیے باعثِ ثواب سمجھا جاتا تھا اور مرد بھی عام طور سے منہدی لگاتے تھے۔ نکاح کے قبل دولہا اور دُلہن دونوں کے منہدی لگی ہونا فرض تھا۔ دُلہن کے ہاتھوں اور پیروں میں منہدی ملی جاتی تھی اور گلکاریاں بھی بنا دی جاتی تھیں۔ دولہا کے دونوں ہاتھوں میں ہتھیلیوں سمیت اور پاؤں کے ناخنوں میں منہدی لگتی تھی۔ منہدی کا جلوس اس لیے اس نام سے موسوم تھا کہ بہت سے طباقوں میں پسی ہوئی

منہدی لگا کے اور جا کے اُسی میں سبز و سرخ تو غیں روشن کر دی جاتی تھیں۔ جلوس میں یہ رنگین شمعیں اپنی ٹھنڈی اور دل نواز روشنی سے رونق دوبالا کر دیتی تھیں۔ انھیں روشن طباقوں کے ہمراہ ساٹھ ستر طباق ملیدے کے بھی ہوتے تھے۔ ملیدہ بڑے ریاض سے تیار ہوتا تھا اور اُس کی تیاری میں کثرت سے میوہ اور بالائی بھی شامل کر دی جاتی تھی۔ اس تمام اجمال آرائی کے علاوہ منہدی بھیجنے کا مقصد صرف دولہا کے ہاتھ پیر سرخ کرنا نہیں تھا۔ جس طرح سانچق میں دُلہن کے لیے زیورات اور چڑھاوے کا جوڑا آتا تھا اُسی طرح دولہا کے لیے وہ لباس اور سامان بھی جاتا تھا جس کو پہن کر اُس کو نکاح کے لیے آنا ہوتا تھا۔

یہ لباس مخصوص طرز کا ہوتا تھا جو نکاح کے دوسرے ہی روز بے کار ہو جاتا تھا۔ شہر لکھنؤ میں ہر دولہا یہی کپڑے پہن کر نکاح پڑھواتا تھا۔ بازار میں سستے قسم کے یہی کپڑے کرایہ پر مل جاتے تھے جن کو بہت سے شرفا وعوام ایک شب استعمال کر کے واپس کر دیتے تھے لیکن پرانے روسا کے یہاں یہ لباس نیا بنوایا جاتا اور نکاح کے بعد دولہا جس طرح مناسب سمجھتا قطع و برید کرا کے خود استعمال کرتا یا کسی کو بخش دیتا تھا۔ اُس مخصوص لباس کی تفصیل تھی۔ خلعت، شملہ، جیغہ، سرپیچ اور مرصع کلغی۔ اس لباس کے ہمراہ ریشمی پائجامہ اور مخملی زرد رنگ کا کارچوب کا کام بنا ہوا جوتا بھی ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ایک ریشمی رومال بھی رکھ دیا جاتا تھا۔ قیمتی سامان میں دولہا کے لیے سونے کے تاروں کا ہار، گلے میں پہننے کے لیے موتیوں کا ہار اور کم سے کم ایک طلائی جڑاؤ انگوٹھی بھی بھیجی جاتی تھی۔ یہ جلوس رات کو روانہ ہوتا اور موسم گرما میں پہنچتے پہنچتے نو دس بج جاتے تھے۔ اصولاً توقع یہی کی جاتی تھی کہ دوسری شب کو تقریباً اُسی وقت بارات اگر دُلہن کے گھر نہ پہنچ سکی تو کم سے کم دولہا کے گھر سے روانگی ضرور ہو جائے گی لیکن راقم کے علم و یقین میں یہ توقع کبھی کسی کی پوری نہیں ہوئی۔ بارات کی روانگی میں اتنے اہتمام ہوتے تھے اور عین وقت تک اتنی باتیں یاد آجایا کرتی تھیں کہ دیر پر دیر ہو جاتی تھی۔ روانگیِ بارات کا انتظام کئی دن پہلے سے شروع ہو جاتا تھا اور ایک روز قبل سے سارا عملہ بند و بست میں متوجہ ہو جاتا تھا لیکن پھر بھی آدھی رات تک بارات دُلہن کے گھر نہیں پہنچ سکتی تھی۔

مانجھے کی شام سے آخری چالے کی صبح تک کم سے کم ایک ماہ کی مدت صرف ہو جاتی تھی اور یہ تمام وقت دولہا اور دولہن والوں کے گھروں میں بے انتہا مصروفیت کا ہوتا

تھا لیکن بارات کے دن سے چوتھی کی رات تک شاید ہی کسی کو دن یا رات تھوڑی دیر کے لیے بھی پلک جھپکانے کی مہلت ملتی ہو۔ دونوں محلوں میں ڈومنیوں کی ہنگامہ آرائی ایک طرف تو ماما، اصیلوں، کنیزوں وغیرہ کا شور وغوغا دوسری طرف۔ اندر سے باہر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ سنجیدگی کا ماحول صرف حجلۂ عروسی میں اور دولہا کے کمرے میں ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں بعض وقائع نگاروں نے بہت سی بے ترتیب حالات درج کیے ہیں جن میں سے بعض سماعی اور قیاسی ہونے کی وجہ سے غلط بھی ہیں اس لیے اس مقام پر میں انھیں حالات و واقعات کو پیش کرنے پر قناعت کرنا چاہتا ہوں جو آپ بیتے تھے اور بلا تکلف یہ بھی عرض کروں گا کہ وہی شعار شہر کے تمام روسا وعمائدین کے خانوادوں کا تھا۔

بارات کے دن بے شمار ایسی ریتیں اور رسمیں دونوں طرف ادا ہوتی تھیں جن کو ٹونے اور ٹوٹکے کہنا زیادہ صحیح ہوگا یا صحت وسلامتی اور خوشی وخرمی کے مقاصد پورا ہونے کے لیے مذہبی طرز پر دعائیں اور منتیں ہوتی تھیں۔ شام کو دونوں محلوں میں دولہا اور دلہن کو اپنے اپنے مقام پر نہلایا گیا تھا جس میں صرف یہی ایک خصوصیت تھی کہ لمحہ لمحہ ڈومنی کو بخشش واکرام دینا پڑتا تھا۔ ایک ایک دو دو روپے کر کے بھی کثیر رقمیں صرف ہوتی تھیں۔ راقم کو ایک چاندی سے منڈھی چوکی پر جس کے اوپر سرخ رنگ کا کپڑا تھا بٹھایا گیا۔ متصل چاندی کا بڑا طشت تھا جس پر پیر دھلائے گئے تھے۔ ہر مرتبہ پانی پیروں پر چھوڑنے کے لیے کچھ رقم طشت میں ڈالی جاتی تھی جو ڈومنی کا حق ہوتا تھا۔ یہ عمل سات بار ہوا۔ اُس کے بعد نہانا صرف رسماً تھا۔ اب مغرب کا وقت آگیا تھا۔ بعد عشا دولہا بنایا گیا۔ تمام قریبی اعزا واقارب جمع تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہر لباس پہلے دوسرے کے متعلقہ حصہ جسم سے مس ہو جاتا تھا تب مجھے پہننا پڑتا تھا یہاں تک کہ پائجامہ میں بھی پہلے کسی اور نے ٹانگ ڈالی تھی۔ پائجامہ، جامہ، خلعت، نیمہ، چغہ وغیرہ پہننے کے بعد سہرا باندھنے کی باری آئی دولہا کے سہرا بہنوئی باندھتا تھا۔ میرے کوئی بہن نہیں تھی اس لیے یہ فریضہ خالہ زاد بہنوئی کے سپرد ہوا۔ انھوں نے پہلے سہرے کو سات حاضر الوقت شادی شدہ جوانوں کے ماتھے سے مس کیا پھر میری پیشانی پر باندھا۔ اس موقع پر رشتہ کی بہنوں اور بہنوئی صاحب نے والد مرحوم سے نیگ کے لیے خوب خوب لڑائیاں لڑی تھیں۔ یہ لڑائیاں ہونا بھی ضروری تھا۔ بغیر ردوقدح کے خاطر خواہ رقم دینے کا دستور نہیں تھا۔ سونے کے سہرے کے اوپر جب بھاری

پھولوں کا گہنا سر، ہاتھوں اور جسم پر پہنا گیا تو وقتی طور پر یہ محسوس ہوا تھا کہ حرکت محال ہو گئی تھی۔ بہر حال حرکت تو ہو گئی لیکن آنکھیں اس طرح ڈھک گئی تھیں کہ بغیر دو آدمیوں کے سہارے کے دو قدم راہ چلنا محال تھا۔ اسی مقام پر یہ بات عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ دولہا ہو یا دُلہن دونوں کو کپڑا پہناتے وقت جن سات مردوں یا عورتوں کے مس کیا جاتا تھا اُن سب کی بیویوں یا شوہروں کا بقیدِ حیات ہونا ضروری تھا۔ نیز یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ ایسے مردوں یا عورتوں کی ازدواجی زندگی پُر مسرت ہو۔ ایسے مردوں اور عورتوں پر پہلے ہی سے نظر رکھی جاتی تھی اور اُن سے موجودگی کی فرمایش بھی کر دی جاتی تھی۔ ایسی عورتوں کے لیے "سہاگن" کی اصطلاح رائج تھی۔

دولہا بننے کے بعد بارات روانہ ہونے کی جلدی ہو جاتی تھی لیکن دولہا کا گھر کے باہر آنا اور بارات روانہ ہونے کی تیاری میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بارات دولہا کے گھر سے روانہ ہوتی تو فی الفور دُلہن کے گھر اطلاع بھیج دی جاتی تھی نیز بارات کے ساتھ والے طوائفوں کے طائفوں کو کھلوا دیا جاتا تھا کہ دُلہن کے گھر پہنچ جائیں۔ بارات اس طرح روانہ ہوتی کہ آگے آگے شہنائی والے پیچھے جھنڈی برداروں کے غول ہاتھوں میں نقرئی چوبیں، جھنڈیوں کے سرخ پھریرے لہراتے ہوئے اور روشنی کی تابانی میں پھریروں کے روپہلے سنہرے لچکے چمکتے ہوئے خراماں خراماں راہ طے کرتے تھے۔ اُن کے پیچھے جھانجھوں اور تاشوں کے بجانے والے بارات خانے کی دھوم مچا دیتے تھے، اُن کے پیچھے جھنڈی برداروں کا دوسرا ویسا ہی غول آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا تھا۔ اس غول کے پیچھے ارگن باجے والے دولہا کی سواری کا پتہ دیتے تھے۔ اُن کے عقب میں پھر جھنڈی والے اور انھیں کے ہمراہ تزک و احتشام کا ساز و سامان ہوتا تھا۔ اب دولہا کی سواری عموماً ہاتھی پر نکلتی تھی جس پر زرتار جھول اور بہترین زرنگار ہودج ہوتا تھا۔ راقم نے ہاتھی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس انکار کی سخت سزا بھگتنی پڑی تھی، ایک بلند و بالا گھوڑا جس کے ساز، کلغی اور تاسان زرنگار تھا، آراستہ پیراستہ کر کے لایا گیا۔ دو آدمیوں نے گود میں لے کر بٹھایا اور متعدد اعزا گھوڑے کے داہنے اور بائیں سہارا دیتے رہے تھے پھر بھی بار بار گر پڑنے کا ڈر سمایا رہتا تھا اس لیے کہ گھوڑے کی باگ سنبھالنا دشوار تھا اور آنکھوں سے کچھ سجھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ موسمِ سرما اپنی شدت پر تھا لیکن میرے کپڑے اور ماتھا پسینے میں تر بتر تھے۔ اس تکلیف دہ تجربے کے بعد میں نے

گھوڑے پر بھی واپسی سے صاف صاف انکار کر دیا تھا اور تب ایک نفیس اور کار چوبی چھتکوں کی فینس سسرال والوں نے یعنی چچا صاحب مرحوم نے فراہم کر دی تھی۔ بہرحال میری سواری کے پیچھے اُن عزیز مخدرات کی فینسیں تھیں جو بارات کے ہمراہ تشریف لے گئی تھیں۔ غالباً کچھ ڈومنیاں بھی ساتھ ساتھ ڈولیوں پر سب سے پیچھے تھیں۔ راقم کے گھوڑے کے دونوں جانب اعزا کا مجمع کثیر تھا جو سب پیادہ پا چل رہے تھے۔ البتہ کچھ بزرگ اپنی گاڑیوں پر ہمراہ تھے۔ باراتیوں کی تعداد کم و بیش کئی سو افراد پر مشتمل تھی۔

دُلہن کے وہاں پہنچ کر بڑے اہتمام سے بارات کا استقبال ہوا۔ ایک عظیم الشان بارگاہ نصب تھی۔ اُسی میں ایک سمت کار چوبی شامیانہ لگا تھا جس کے نیچے پُر تکلف مسند پر گاؤ تکیے لگے تھے۔ براتیوں کو بارگاہ میں عزّت و احترام کے ساتھ بٹھایا گیا۔ مجھے میرے ہمراہیوں نے گھوڑے سے اُتارا اور کچھ گھر کے نیز کچھ سسرال کے نوجوان اعزا نے تھام کے اور سنبھال کر لے جا کے مسند پر بٹھا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں طبلے ٹھنکنے لگے اور مجرا شروع ہو گیا۔ بارات پہنچنے کے بعد نکاح پڑھنے والے مولویوں کو اطلاع گئی لیکن اُن کی تشریف آوری تک دو طائفوں کا مجرا ختم ہو چکا تھا۔ ایک مولوی صاحب محل کے اندر دُلہن سے اجازت لینے گئے۔ یہ اجازت حاصل کرنا ایک ایسا مرحلہ تھا جس کی تشریح ناممکن ہے۔ بہرحال نصف گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد اذن لے کر وہ باہر تشریف لائے اور نکاح ہوا۔ نکاح پڑھنے سے فراغت کر کے وہ دونوں قدسی منش بزرگ بالتعجیل رخصت ہو گئے۔ اور جو طائفے اُن کی موجودگی کے باعث ہٹا دیے گئے تھے پھر بلا لیے گئے۔ اور یہ صحبت نمازِ صبح تک گرم رہی تھی۔ اس مقام پر دو واقعات بہت دلچسپ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُس زمانہ میں یہ رسم تھی کہ نکاح کے قبل باراتیوں کی کوئی تواضع نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اُن کو پیاس کی حالت میں پانی پلانے کی بھی اجازت نہیں تھی، اس لیے ایسا بندوبست دولہا والوں ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ دوسرا مسئلہ مہر کا تھا۔ شرعِ اسلام میں مہر کی ادائی واجب ہے لیکن لکھنؤ میں روسا و عمائدین کے یہاں اتنی بڑی مقدار میں مہر طے ہوتا تھا جس کی کلیتاً ادائی کا کبھی کسی کو شاید ہی موقع ملا ہو۔ مہاجنوں کے قرض سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے کچھ جائدادیں دینِ مہر میں لکھ دی جاتی تھیں اور باقی مہر بیگمات سے معاف کرا لیا جاتا تھا۔ مہر کا تعین مشکل کام نہ تھا۔ دُلہن والے دولہا کے والد یا دوسرے سرپرست کو بتا دیتے اور وہ بالعموم

قبول و منظور کر لیتے تھے اور نکاح کے کچھ وقت قبل دولہا کو مطلع کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے وکیل مولوی کو بلا تاخیر اذن دے سکے۔ میرے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا اور والد مرحوم نے یہ فرمایا تھا کہ "ستر ہزار سکہ مروج رائج الوقت" مہر طے ہو گیا ہے۔ یہ سن کر میرے ہوش اُڑ گئے تھے اور میں نے کمی مہر کی گزارش کی جو نہ صرف میرے عم محترم یعنی خسر صاحب بلکہ والد محترم کو بھی ناگوار گزری۔ کچھ دیر تک میں مقاومت کر سکا اور سسرال والوں نے مجھے انگریزی داں ہونے کے باعث قابلِ عفو بھی قرار دیا۔ لیکن مہر کی تعداد ستر ہزار سے کم ہو کر چالیس ہزار اشرفیوں تک آ سکی۔ میں نے کچھ غصہ اور کچھ مزاح میں والد محترم سے مؤدبانہ گزارش کی کہ اب ایک لاکھ اشرفی پر مہر کا تعین کرا کے فراغت حاصل کیجیے۔ بہر حال چالیس ہزار اشرفی کے مہر پر نکاح ہو گیا۔

رات بھر براتیوں کو اُن کی مرضی سے وقتاً فوقتاً کھانا بھی کھلایا جاتا تھا اور بارگاہ میں رقص و سرود کی بزم بھی گرم رہی تھی۔ محل کے اندر مہمانوں اور گھر والوں کو کھانا کھلانے میں صبح کی نماز کا وقت آ گیا۔ نماز گزاروں نے اول وقت فریضۂ سحری کو ادا کیا اور اُس کے فوراً ہی بعد دولہا کی یعنی میری گھر میں طلب ہو گئی۔ ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ڈومنیوں میں گلے میں لمبا ناڑا ڈال کر اسیر کر لیا۔ نکاح کے بعد سہرا اُلٹ دینے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس لیے رات بھی لطف سے کٹی اور اس اسیری میں مزا بھی ملا۔ اکیس پانوں کا بیڑا چبا کر کھانے کا حکم ہوا۔ ان پانوں میں سات پان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اُس چوکی پر چھا دیا گیا تھا جس پر بٹھا کے دُلہن بننے کے قبل لڑکی کو غسل دیا گیا تھا۔ اسی غسل کا پانی محفوظ کر کے اُس گھوڑے کے آگے ڈالا گیا جس پر سوار ہو کر میں گیا تھا۔ گھوڑے کو آگے بڑھنا اور مجھے اُس پانی کی نمی کے آگے بڑھ کر آنا پڑ گیا تھا۔ اب اکیس پانوں کا بیڑا جلدی جلدی چبا کر کھانا ایک عذاب جان تھا لیکن کھانا پڑا۔ اور اسی درمیان حالتِ گرفتاری میں حجلۂ عروسی تک تیز تیز قدم بڑھانا پڑے تھے۔ اس قلیل وقفہ میں ڈومنیوں اور رشتہ کی بہت سی سالیوں کی پریشان کن حرکات کی بدولت کبھی غصہ آتا تھا تو کبھی ہنسی آتی تھی۔ بہر حال اُس جگہ جہاں عروس تھی لے جا کر بٹھا یا گیا۔ پہلی رسم یہ ادا ہوئی کہ دُلہن کی ہتھیلی پر تل شکری رکھ کر مجھے چاٹنے کا حکم ملا۔ دُلہن خمیدہ اور گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ ایک ڈومنی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر یہ رسم ادا کرائی۔ اس کے بعد ایک

رحل پر قرآن آیا اور ہم دونوں کے سر ایک دوسرے سے متصل کر کے ایک چادر اوپر سے ڈال دی گئی۔ ایک بڑا آئینہ ہم دونوں کے درمیان حائل کر دیا گیا تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی صورت اُسی میں دیکھیں۔ پھر ڈومنی نے کہا کہ کہو" بیوی آنکھیں کھولو، میں تمھارا غلام ہوں" میں نے فی الفور تعمیل کی لیکن نجات نہیں ملی۔ مجھ سے بار بار سوال ہوتا کہ" آنکھیں کھولیں؟" اور مجھے اس دروغ بیانی میں قطعاً تکلف نہ ہوتا کہ" ہاں کھولیں" لیکن ڈومنیاں اور جوان جوان لڑکیاں جو کثرت سے جمع تھیں یہی کہتی رہیں کہ" جھوٹ ہے، آنکھیں نہیں کھولیں"۔ اس رسم کو آرسی مصحف کہتے تھے جو ہر جگہ دُلہن کی رخصت کے وقت ادا کی جاتی تھی۔ اس رسم کی ادائی میں کافی دیر لگتی تھی کیوں کہ گھر بھر دولہا سے دل چسپی لیتا تھا۔ آرسی مصحف کے بعد ایک آخری رسم اور زیادہ پُرلطف تھی۔ دُلہن کا بھاری پائجامہ ہلکے ریشمی ازار سے بدلوایا جاتا تھا اس ازار میں دولہا کو ایک ہاتھ سے کمربند ڈالنا پڑتا تھا۔ گویا کہ غلامی کی یہ ابتدا تھی۔ اس موقع پر بھی ڈومنیاں اور دوسری لڑکیاں دولہا کو بہت عاجز کرتی تھیں۔ اس رسم کے فوراً بعد دولہا کو حکم ہوتا تھا کہ دُلہن کو اٹھاؤ اور گود میں لے کر فینس پر سوار کرو۔ یہی حقیقی معنوں میں رخصتی تھی۔ اِدھر دولہا دُلہن کو اٹھانے پر آمادہ ہوتا اُدھر ڈومنیاں جو تیار کھڑی رہتی تھیں فوراً بابل گانا شروع کر دیتی تھیں اور گھر بھر میں زبردست کہرام مچ جاتا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا کہ دولہا بھی آنسوؤں سے رو دیتا اور دُلہن کی گریہ وزاری اپنی آپ مثال ہوتی تھی۔ دولہا کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے سسرال والے سلام کرائی کے نام سے رقمیں دیتے تھے۔ اِن رقوم میں ساس اور دوسرے قریبی اعزا کے علاوہ بعض دوسرے مہمانوں کی رقم سلام کرائی بھی شامل ہوتی تھی جو مل جل کر ایک بڑی رقم ہو جاتی تھی۔

بارات کی واپسی کا انداز بھی اُس کی آمد ہی کی طرح ہوتا تھا لیکن بہت لمبی چوڑی قطار میں واپسی ہوتی تھی۔ جلوس کے پیچھے جہیز کا سامان ہوتا تھا جس میں سونے، چاندی، پیتل تانبے، لکڑی، شیشہ آلات، دنیا میں ہر قسم کی مستعمل چیز ہوتی تھی۔ دُلہن کی مسہری معہ بستر بھی ساتھ ہوتی تھی۔ جہیز کے سامان کا ہر عدد علیحدہ علیحدہ بھیجا جاتا اور یہ اہتمام ہوتا تھا کہ رخصتی سے قبل ہی فہرست جہیز دولہا کے والد یا قریبی عزیز کو حوالے کر کے سارا سامان مقابلہ کرا دیا جاتا تھا۔ اب اس کے لے جانا اور بار برداری کی تمام ذمہ داریاں دولہا والوں ہی کے ذمے ہوتی تھیں۔ وہ بھی اس کو گوارا نہیں کرتے تھے کہ بار برداری میں کفایت ملحوظ رکھی جائے۔

گراں قدر اور بڑا جہیز ہوتا تو دولہا اور دلہن۔ دونوں گھرانوں کے وقار میں اضافہ ہوتا تھا۔ جہیز کے سامان کا علیحدہ علیحدہ ایک ایک عدد روانہ کرنے کے سبب سے کبھی کبھی کئی فرلانگ لمبا جلوس ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ شاہی دور میں ایسے جلوس میلوں لمبے ہوتے تھے۔ بہر حال جہیز کے پیچھے دلہن کی فینس اور عقب میں دولہا کی سواری ہوتی تھی۔ اُس کے بعد دوسری فینسیں اور ڈولیاں رہتی تھیں۔ دلہن کے ساتھ گھر کا کوئی عزیز اور کوئی مقرب خاص عورت بھی کر دیے جاتے تھے۔ ان کی سواریاں بھی اُن کے منصب و وقار کی مناسبت سے ہوتی تھیں۔ بالکل آخر میں کم سے کم سات ڈولیوں پر دیگوں اور پتیلیوں میں بھوڑے کا کھانا ہوتا تھا جس میں تنجن اور مچھلی کا قورمہ ہونا لازمی ہوتا تھا۔ دولہا کے محل تک پہنچ کر بارات کا سارا جلوس جلد جلد اندر داخل ہو جاتا تھا لیکن دلہن کی فینس کے قریب آتے ہی محل کے دربان پھاٹک بند کر لیتے تھے۔ اُن کو انعام واکرام دے کر رضامند کر لیا جاتا تھا اور تب فینس اندر داخل ہوتی تھی۔ زنانی ڈیوڑھی تک فینس پہنچتے ہی ایک بکرا ذبح کر دیا جاتا تھا۔ قصائی بکرا لیے ہوئے پہلے ہی سے آمادہ رہتا تھا۔ اس بکرے کا خون دلہن کے تلوؤں میں مل کر چاندی کے ورق چسپاں کر دیے جاتے تھے۔ بکرے کا گوشت غریبوں کو تقسیم ہو جاتا جا۔ اس رسم کی ادائی کے بعد دولہا کی ماں اور دیگر اعزا پورے عزت واحترام کے ساتھ فینس میں سے اُتارتے اور حجلہ اُس کے لیے معین ہوتا وہاں پہنچا دیتے تھے۔ اس حجلہ میں پہنچانے کے بعد دلہن کے آنچل پر دولہا کو دو رکعت نماز شکرانہ پڑھنا ضروری تھی۔ نماز سے فراغت کر کے دولہا باہر چلا جاتا تھا جہاں اُس کے دوست احباب منتظر رہتے تھے۔ اس کے بعد گھر کی بیگمات نیز باہر کے عزیز واقارب جن میں عورتوں کے علاوہ ایسے مرد بھی شامل ہوتے تھے اور جن کے سامنے دلہن کو آنا شرعاً اور رسماً ممنوع نہیں تھا یکے بعد دیگرے حجلہ میں آتے، گھونگھٹ ہٹا کر دلہن کا منہ دیکھتے اور رونمائی پیش کرتے تھے۔ شرم وحیا میں ڈوبی ہوئی خاموش دلہن عالمِ بے چارگی میں بیٹھی رہتی اور اُس کے روبرو روپوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ رونمائی کی رسم ختم ہونے کے بعد ساتھ کی کوئی ذمہ دار عورت یا خود اُس کی خوشدامن یہ رقم اٹھا لیتی تھیں اور رونمائی کی مجموعی رقم کا اعلان ہو جاتا تھا۔

بارات کی واپسی سہ پہر کے قریب ہوتی تھی۔ دعوت ولیمہ کا اعلان دوسرے روز شام کے لیے ہوتا تھا لیکن اسی شام سے ضیافتیں شروع ہو جاتی تھیں اور تین شبانہ روز

طوائفوں کے مجرے ہوتے تھے۔ دوسرے روز کی دعوت میں زیادہ سے زیادہ اہتمام اور بڑے پُر تکلف کھانے کھلائے جاتے تھے۔ پہلی شب دولہا زیادہ تر گھر ہی میں رہتا۔ بعض خاندانوں میں اُس کی مردانگی کا امتحان کرنے کے لیے بدتہذیبیاں بھی ہوتی تھیں لیکن کتخدائی کی پہلی رات بہر حال کٹ جاتی تھی اور دوسرے روز صبح کو ناشتہ کے بعد دُلہن کے بھائی آکر اپنی بہن کو میکے لے جاتے تھے۔ اُسی روز شام کو سسرال میں چوتھی کی رسم ادا ہونے کے لیے دولہا بھی سرِشام چلا جاتا تھا۔ چوتھی کی رسم میں دولہا دُلہن ایک دوسرے کو پھولوں کی چھڑیوں سے مارتے تھے لیکن یہ رسم دولہا دُلہن تک محدود نہیں رہتی تھی۔ سالیاں بھی اپنے تازہ بہنوئی کو دل کھول کر ستالیتی تھیں۔ ابتدا تو اس طرح ہوتی تھی کہ ادھر دولہا جاکر فرش پر بیٹھتا تو فی الفور کچھ لڑکیاں اُس کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتیں اور سالیاں دولہا کا جوتا چرالیتی تھیں۔ چوتھی سے فراغت کے بعد کچھ رقم وصول کرکے اور بہت ستاکر جوتا واپس ہوتا تھا۔ سالیاں یہ بھی حرکت کرتی تھیں کہ دولہا پر پھولوں کی چھڑیوں کا وار کرتے تھے ترکاریوں کی بھی بوچھار کر دیتی تھیں لیکن یہ خیال ضرور رکھا جاتا تھا کہ چوٹ نہ آئے۔ چوتھی میں اس کھیل کے علاوہ دولہا دُلہن کو دسترخوان پر ساتھ بٹھا کے کھانا کھلایا جاتا تھا۔ دُلہن کی والدہ خصوصیت کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلانے بیٹھتی تھیں۔ کھانا کھانے کے قبل رسم کے مطابق دولہا فرمائش کرتا اور دُلہن کی ماں کو پوری کرنا پڑتی تھی۔ بعض دولہا بڑی لمبی لمبی اور اونچی اونچی فرمائش کرتے تھے۔ جو بسا اوقات قبول کرنے میں زحمت محسوس ہوتی تھی لیکن مثل مشہور ہے کہ بندھا خوب مار کھاتا ہے۔ نئے نئے دولہا کی دلجوئی اور خاطر جمعی سسرال والوں کا ہوتا تھا۔ چوتھی کے بعد دولہا اپنے گھر واپس آجاتا اور دُلہن دوسرے یا تیسرے روز بلوائی جاتی تھی۔ اسی رات دولہا کے گھر میں دعوتِ ولیمہ ہوتی اور محفل رقص و سرود کی گرمیاں جاری رہتی تھیں۔ دعوتِ ولیمہ میں دُلہن کے اعزا بھی مدعو ہوتے اور شرکت کرتے تھے۔ دولہا بھی حسبِ خواہش شریکِ بزم ہو جاتا تھا۔

دُلہن کی واپسی کے بعد پھر اُسی کے اعزا چار چالے کرتے تھے۔ ہر چالے کی تقریب دُلہن کے کسی عزیز قریب مثلاً پھوپھی، خالہ، ممانی کے یہاں ہوتی تھی۔ دُلہن معہ دولہا کے بلائی جاتی تھی۔ اُن کی شب خوابی کے لیے ایک کمرہ علیحدہ سج کر درست کیا جاتا تھا اور اُن کو کہا تو یہ جاتا تھا کہ ایک دن و رات کے لیے لیکن حقیقتاً ایک رات کے لیے مہمان رکھا جاتا تھا اور

مہمان داری بڑے اہتمام سے ہوتی تھی اور رخصت کرتے وقت اپنے اپنے حسب استطاعت کپڑوں کے جوڑے اور نقد رقوم پیش کی جاتی تھیں۔ چوتھے چالے کے بعد شادی کی رسومات کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔

متذکرہ بالا تمام رسوم شرفا و عوام کے یہاں بھی شادی کے مواقع پر انجام دی جاتی تھیں۔ البتہ اپنی اپنی حیثیت کے تحت یہ فرائض انجام دیے جاتے تھے پھر بھی لکھنؤ والے اتنے دریا دل اور سیر چشم تھے کہ ان رسوم کی ادائی میں قرض بھی لینا پڑتا تھا جو بہت سے گھرانوں میں ادا نہیں ہوتا تھا۔ لکھنؤ پر زوال آنے میں بہت بڑا حصہ ان رسم پرستیوں کا بھی تھا۔

## (۳) غمی کی رسمیں

شادی کی رسموں کی طرح غمی کے سلسلہ میں بھی بہت سے مراسم بڑے تزک و احتشام سے ادا ہوتے تھے لیکن یہ سارا دستور شیعہ مسلمانوں بالخصوص شیعہ روسا و عمائدین کے خانوادوں تک محدود تھا۔ سنّی صاحبان کے یہاں پہلے بھی میت کو گھر میں غسل دیا جاتا، اعزا و اقارب اپنے کاندھے پر جنازہ اٹھاتے اور کسی مسجد میں نماز پڑھوا کے سادہ اسلامی طرز پر میت دفن کر دیتے تھے۔ سوئم اور چہلم ہوتا تھا اگر وہ بھی قرآن خوانی پر ختم ہو جاتا تھا۔ حاضرین کو الائچی دانے تقسیم ہو جاتے تھے۔ الائچی دانے شیرینی کی قسم سے چھوٹے چھوٹے گول دانے ہوتے ہیں جن پر شکر چڑھی ہوتی ہے۔ شیعوں کے یہاں وہ تمام مراسم رائج تھے جن کی ترویج اودھ کے فرمانرواؤں نے اپنے دور اقتدار میں فرمائی تھی۔ انھوں نے مقامی تمام مراسم شادی و غمی کو ایرانی کروفر میں آراستہ و پیراستہ کر کے قبول کر لیا تھا۔ ہم اس معاشرے کو نہ خالص ہندو رواج کہہ سکتے ہیں اور نہ خالص ایرانی تہذیب قرار دے سکتے ہیں۔ شیعہ روسا و عمائدین ان روایات کو کلیجے سے لگائے ہوئے تھے اور شیعہ عوام انھیں کی تاسی کرتے تھے اس لیے دولت مندی کے اثرات سے جو فرق ہوتا تھا وہ ظاہر ہو جاتا تھا۔ لیکن بنیادی طور پر امیر و غریب سب کا معاشرہ ایک ہی تھا۔ اس مقام پر ہم انھیں مراسم موتہ کا تذکرہ پیش کرتے ہیں جو ہمارے روسا و عمائدین ہیں، رائج تھے اور جن پر ان خانوادوں میں سختی کے ساتھ عمل ہوتا تھا۔ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ غمی کی رسموں میں امرا و شرفا اور عوام سب ہی ایک ہی نظریہ کے تابع تھے یعنی یہ کہ میت کو زیادہ سے زیادہ ثواب ہو جانا شرعی نقطۂ

نظر سے ہم کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن وہ لوگ اپنے عقیدہ پر راسخ تھے اور سختی سے کاربند تھے۔

مریض کی حالت خراب ہوتے ہی جب طبیب جواب دے دیتا اور اعزا مایوس ہو جاتے تو اُس شخص کو قبلہ رو کر دیا جاتا اور اُس کے قریب کسی کو بٹھا کر قرآن مجید کا سورۂ یٰسین پڑھوا لیا جاتا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ اس سورۃ کی تلاوت سے سکرات موت میں آسانی ہوگی۔ اسی کے ساتھ جس کمرہ میں ایسا ہوتا وہاں کا تمام غیر مستعمل اور غیر ضروری سامان ملحقین و ملازمین ہٹا دیتے تھے۔ دم نکلنے کے پہلے ہی جب نبضیں ڈوبنے لگتی تھیں اور آثارِ مرگ نمودار ہو جاتے تھے تو مردوں کو مردانی نشست اور خواتین کو کسی علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ یہ خدمت معمر عزیز یا مقرب ملازم بجا لاتے تھے۔ رشتۂ حیات منقطع ہوتے ہی مرد کے لیے معمر مرد اور عورت کے لیے بزرگ عورت ابتدائی رسم ادا کرتے تھے اور یہ ابتدائی رسم میت کے اعضا و جوارج کو حالتِ سکون میں لانا تھا۔ دونوں پاؤں ملا کر دونوں انگوٹھے کپڑے سے ملائمت کے ساتھ باندھ دیے جاتے اور دونوں ہاتھ سنبھال کر سینہ پر رکھ دیے جاتے تھے۔ آنکھیں کھلی ہوتیں تو نرمی کے ساتھ بند کر دی جاتی تھیں، پھر ایک سفید چادر سر سے پاؤں تک اُڑھا دی جاتی تھی۔

میت کے اعزا و اقارب اور دوست و احباب آتے اور منہ پر سے چادر کا کونا ہٹا کر دیدار کر لیتے اور پھر آہستہ سے منہ ڈھک دیتے تھے۔ اور جو کوئی بھی میت کو مس کر لیتا اُس پر غسل مسِ میت واجب ہوتا تھا۔ غسل و کفن کا بندوبست اور دفن کرنے کے انتظامات تیزی سے شروع ہو جاتے تھے۔ انتظامات مکمّل ہونے میں کبھی کبھی آٹھ دس گھنٹے لگ جاتے تھے۔ اُس کے بعد میت اٹھائی جاتی تھی۔ صندوق میں بڑی احتیاط سے میت کو لٹا کر صندوق پر دوشالہ اُڑھا دیا جاتا اور ایک شامیانے کے نیچے یہ صندوق پیشہ ور لوگوں کے کاندھوں پر گھر سے باہر نکلتا تھا۔ اِن پیشہ ور لوگوں کا تعلق لکھنؤ کے شہدوں کی صنف سے تھا جنھوں نے کسبِ معاش کے لیے یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ میت اٹھنے کے وقت گھر میں کہرام مچ جانا فطری بات تھی۔ میت کے پیچھے پیچھے ایک معمر ماما پانی سے بھرا ہوا لوٹا لے کر چلتی اور قطرہ قطرہ گراتی جاتی تھی جس کا سلسلہ ڈیوڑھی کے باہر تک چلتا تھا۔ فی الفور میت کا پلنگ بھی کمرہ سے ہٹا دیا جاتا اور سارے کمرے میں زمین کا فرش کر دیا جاتا تھا۔ گھر کی عزیز مستورات یہاں آکر جمع ہو جاتی تھیں اور مرنے والے کا سوگ اسی مقام پر چالیس دن تک منایا جاتا تھا جو عزیز عورتیں

تعزیت کے لیے آتی تھیں وہ اسی مقام پر بیٹھ کر پرسا دیتی تھیں۔ کمرے کا یہ فرش صفِ ماتم کہلاتا تھا۔

میت اٹھا کے غسل کے لیے لے جاتی جاتی تھی۔ شرفا وعوام کی میتوں کو غسل دینے کے لیے غسل خانہ تھا جہاں اس کام میں باصلاحیت لوگ ملازم رہتے تھے۔ ابتداً یہ غسل خانہ عیش باغ میں تھا جو اب تک برقرار ہے لیکن تقریباً پچہتر برس سے پاٹا نالہ پر غسل خانہ قایم ہوگیا ہے اور وہی کام میں آتا ہے لیکن روسا وعمائدین نیز جلیل القدر علما کی میتوں کو دریا کے کنارے مخصوص اہتمام والتزام سے غسل دیا جاتا ہے۔ میڈیکل کالج کے عقب میں دریا کے کنارے غسل دیا جاتا تھا۔ میت بھی جلوس کے ساتھ اٹھتی تھی اور نمگیرے نصب ہو کر انھیں کے اندر غسل ہوتا تھا۔ متصل میدان میں بڑے بڑے شامیانے کھڑے کر دیے جاتے اور زمین پر فرش ہو جاتا جہاں مشایعت جنازہ کرنے والے غسل کے بعد نمازِ میت کے منتظر رہتے تھے۔ جو لوگ واپس چلے جاتے وہ بھی وقت پر آجاتے تھے۔ نمازِ جنازہ کوئی مجتہد اسی میدان میں آکر پڑھاتا تھا لیکن بہت گراں قدر ہستیوں کے جنازے میں اتنا مجمع ہوتا تھا کہ اس ناہموار میدان میں نماز پڑھانا ممکن ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور میت گول دروازہ کے مقابل وکٹوریہ پارک میں لائی جاتی تھی جہاں نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی تھی۔

اس کے بعد جنازہ تدفین کے لیے روانہ ہوتا تھا۔ ہر رئیس کے یہاں ایک خاندانی کربلا تھی جہاں اُن کے خاندان کے اموات دفن ہوتے تھے۔ کچھ لوگ متبرک مقامات مثلاً کربلائے تال کٹورہ، امام باڑہ غفران مآب وغیرہ پسند کر کے اپنے عزیزوں کی میتیں دفن کرتے تھے۔ قبر میں میت اُتارنے کے بعد تلقین پڑھی جاتی اور اوپر کے بلند حصہ قبر پر لکڑے کے پیڑے رکھ کر مٹی پاٹ دی جاتی تھی۔ مٹھی مٹھی بھر خاک ڈالنا ہر شریکِ جنازہ کا فرض ہوتا تھا۔ پھر گور کن قبر کی شکل بنا دیتا اور اُس پر سفید چادر اور پھولوں کے ہار بچھا دیے جاتے تھے۔ شرکا جنازہ فاتحہ پڑھ کر رخصت ہو جاتے پھر بھی سوگ نشینوں کے ہمراہ اعزا واقارب کا ایک طبقہ اُن کے گھر تک جاتا تھا۔

میت کو دفن کر کے اعزا واقارب کی واپسی کی خبر گھروں کے اندر پہنچتی تو ایک کہرام مچ جاتا تھا۔ بہت دیر تک شیون وزاری کی صدائیں بلند رہتی تھیں۔ گھر کے اندر سوئم تک چولہا نہیں جلتا تھا۔ سوئم عموماً تیسرے روز ہوتا تھا لیکن اگر مناسب دن نہ ہوتا

مثلاً یہ کہ منگل یا بدھ پڑ جاتا تو رسم سویم پانچویں دن ادا ہوتی اور پنجم کہلاتی تھی۔ اس رسم کے ادا ہونے تک دونوں وقت اعزا کے یہاں سے گھر بھر کے لیے کھانا آتا تھا۔ ملازمین ماماؤں اور سارے عملے کے لیے گھر کے باہر انتظام ہو جاتا تھا۔ جو کھانا میت کے عزیزوں کے لیے آتا وہ فرمائش کر کے بازار سے پکوایا جاتا اور کڑوی روٹی کہلاتا تھا۔ صفِ ماتم پر دستر خوان بچھا کر تین یا پانچ دن تک کڑوی روٹی کھائی جاتی تھی۔ محل کے باہر کا باورچی خانہ بہر حال گرم رہتا تھا۔ موتے کے دن بھی تزک و احتشام سے ملازمینِ سرکارِ اعلیٰ غذائیں پکواتے اور مٹی کے نفیس برتنوں میں مہمانوں کو کھلاتے تھے لیکن اس دستر خوان پر کوئی سوگ نشین یا قریبی عزیز شرکت نہیں کرتا تھا۔ قبر پر رات کو روشنی کا انتظام کرایا جاتا تھا اور دوسرے روز صبح کو "خیریت دریافت کرانے" کی رسم تھی۔ اسی نام سے کوئی مقرب آدمی بھیجا جاتا جو قبر پر فاتحہ پڑھ کر چلا آتا تھا۔ سویم یا پنجم کے دن تک میت کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی ہوتی تھی۔ متعدد قرآن خواں کلامِ ربانی تلاوت کرتے تھے۔ سویم کے بعد بھی ایک قرآن خواں مستقل طور پر قبر پر جا کے یا محل میں میت کی روح کو ثواب بخشنے کے لیے قرآن پڑھا کرتا تھا۔ ہر روز رات کو قبر پر چراغ روشن کرانا ضروری ہوتا تھا۔ سویم کے دن قبر پختہ کر دی جاتی تھی اور روشنی کا مستقل انتظام کر دیا جاتا تھا جس کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہتا تھا جب تک غم غلطہ نہ ہو جائے۔ بعض روسا و عمائدین وصیت نامے تحریر کر کے قبر پر روشنی، قرآن خوانی اور مجالسِ عزائے امام حسین کا انتظام اپنی زندگی ہی میں کر جاتے تھے۔ اُن کی قبروں کے لیے ان امور کے لیے مستقل بند و بست ہو جایا کرتے تھے لیکن ناکارہ متولی زیادہ تر تغلب و تصرف کر کے ان اغراض کو پورا نہیں کرتے تھے۔

میت کے لیے سویم، دسویں، بیسویں، مہینے، چہلم، سہ ماہی، چھ ماہی، برسی اور دلیسے کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں، جیسا کہ ناموں ہی سے ظاہر ہے۔ ان رسموں کو معینہ مدت پر ادا ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ دنوں اور تاریخوں کی رعایت سے یہ تقریبات منائی جاتی تھیں۔ چہلم عموماً چالیس دن سے پہلے ہی ہو جاتا تھا۔ اور خاندانی حالات کے تحت سہ ماہی چھ ماہی اور برسی بھی کبھی کبھی بہت جلد کر دی جاتی تھی۔ دستور تھا کہ کسی عزیز قریب کی برسی کے قبل شادی بیاہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اگر کوئی

نسبت قرار پا جاتی اور شادی کرنے میں عجلت ہوتی تو تہ ماہی چھ ماہی اور برسی کی رسمیں ڈیڑھ دو مہینے میں ادا کر کے مدتِ غم نشینی ختم کر دی جاتی تھی۔ دسویں ، بیسویں ، مہینے تہ ماہی ، چھ ماہی اور برسی کی رسمیں عموماً گھروں کے اندر ہی ادا ہوتی تھیں جن میں مردوں سے زیادہ عورتیں شرکت کرتی تھیں۔ شیعوں کے یہاں ہر شادی و غمی کے موقع پر واقعۂ کربلا کو یاد کر کے امام حسین کی مجلسِ عزا منعقد کرنا ضروری تھا۔ ان تمام رسموں کے مواقع پر زنانی مجلسیں بڑے پیمانے پر ہوتی تھیں۔ مردانی مجلسیں بھی مختصر طور پر کر لی جاتی تھیں جن میں شیرینی تقسیم ہوتی اور صرف شرکا کو حصص دیے جاتے تھے۔ مجلسیں صبح کو میت کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے ہوتی تھیں اور شام کو کھانے پر اُسی کی فاتحہ دلائی جاتی تھی۔ یہ پخت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی اور غربا و مساکین کو فاتحہ نیز پخت کا کھانا کھلایا جاتا تھا۔ حاضر الوقت لوگوں میں بعض صاحبان شریکِ طعام ہو جاتے تھے۔ لیکن اس پخت کے کھانے کا کوئی حصّہ کسی عزیز یا دوست کے یہاں نہیں بھیجا جاتا تھا۔ روسا و عمائدین کے باورچی خانوں میں بدستور کھانے پکتے اور وہی دسترخوان پر پیش ہوتے تھے۔ راقم کے علم و یقین میں میت سے متعلق جتنی غذائیں پکتی تھیں وہ صرف غربا و مساکین کے لیے مخصوص ہوتی تھیں۔ البتہ زنانی اور مردانی مجلسوں کے حصّے کبھی کبھی قریبی عزیزوں کے یہاں بھیج دیے جاتے تھے پھر بھی اُن میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ جو شیرینی تقسیم ہوتی وہی ایک بڑے حصّے کے مقدار میں بھیج دی جاتی تھی اور یہ حصّے بھی انھیں عزیزوں کے یہاں بھیجے جاتے تھے جن سے حصہ داری کے تعلقات اس حد تک بڑھے ہوتے تھے کہ شادی اور غمی کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے تھے۔

سویم ، چہلم اور دسیے کی تقاریب اہتمام والتزام سے ہوتی تھیں۔ خصوصاً سویم اور چہلم کو بہت سی خصوصیات حاصل تھیں۔ سویم ہو یا چہلم علی الصباح قرآن خوانی شروع ہو جاتی تھی۔ کئی کئی قرآن اجرت پر پڑھوائے جاتے تھے۔ نیز شرکا مجلس از خود پڑھ کر میت کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے پڑھتے تھے۔ قرآن خوانی میت کی بخشش کے لیے مخصوص درود اور دعاؤں کی تلاوت کر کے گھسے ہوئے صندل اور تیل کی کٹوری میں کچھ پھول ڈال دیے جاتے تھے۔ یہ فریضہ وہی شخص ادا کرتا تھا جو دعائے مغفرت کرتا تھا۔ پھر یہ تیل اور پھول کا کٹورہ زنان خانے میں بھیج دیا جاتا جس کو مس کر کے سوگ نشین

عورتیں سوگ اتارتی تھیں۔ قرآن خوانی اور اس رسم کی ادائی کے بعد مجلسِ عزا منعقد ہوتی تھی۔ یہ مجلس ذاکر دیر تک پڑھتا اور دورانِ تقریر میں مرنے والے کے مکارمِ اخلاق کا تذکرہ کرکے اُس کے لیے سورۂ فاتحہ تمام شرکا مجلس سے پڑھواتا تھا۔ بعد اختتام مجلس بڑے پیمانے پر اور بھاری حصہ یعنی کم سے کم روٹی سالن کی تقسیم ہوتی تھی۔ یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ غربا و مساکین کو وسیع پیمانے پر حصے پہنچ جائیں۔ اس حصے کی پخت بہت بڑی ہوتی تھی اس لیے روٹی سالن یا اور جو چیز ہو وہ فاضل رہتی تھی۔ اس فاضل پخت کے حصے بعد اختتامِ مجلس قریبی رشتہ داروں کے یہاں بھیج دیے جاتے تھے۔ زنان خانہ میں صفِ ماتم پر مخدرات کے سوگ بڑھانے کے بعد گھر کا باورچی خانہ روشن کر دیا جاتا اور کھانے پانی کے جملہ لوازمات معمول پر آجاتے تھے۔ میت اٹھنے کے بعد گھڑوں میں رکھا ہوا پانی پھینک دیا جاتا تھا اور گھڑے توڑ دیے جاتے تھے۔ سویم کے دن یہ سب انتظامات بحال ہو جاتے تھے۔ شام کو بڑے وسیع پیمانے پر میت کی فاتحہ ہوتی تھی۔ بہتر سے بہتر غذائیں، کپڑے اور مختلف سامان فراہم کرکے غربا و مساکین کو تقسیم ہوتا تھا۔ مرنے والے کے ملبوسات اور چند بہت قیمتی چیزوں کے علاوہ بہت کچھ ساز و سامان خیرات کر دیا جاتا تھا۔ ان رسموں کی ادائی کے بعد بھی صفِ ماتم بچھی رہتی تھی اور مرنے والے کو یاد کرکے مستورات میں اُس کے قریبی اعزا علی الصباح اور غروب آفتاب کے وقت چند منٹ کے لیے گریہ کرتے تھے۔ چالیس دن تک یہ ماتم کرنا ضروری تھا۔

سویم کے بعد سے چہلم تک کا زمانہ بڑی مصروفیت کا ہوتا تھا۔ مرنے والے کے ورثا اُس کے لیے زیادہ سے زیادہ امورِ خیر انجام دینے کی کوشش کرتے تھے۔ سب سے پہلے وصیت نامہ اگر موجود ہوتا تو اُس کی حرف بہ حرف تعمیل کی کوشش ہوتی تھی اور تعمیل کی جاتی تھی ورنہ خود اپنی جانب سے راہیں نکالی جاتی تھیں۔ ان میں سب سے پہلی یہ فکر رہتی تھی کہ متوفی کے ذمے نماز اور روزوں کا جو قرض ہو وہ ادا کیا جائے۔ تحقیق کرکے اور حساب لگا کے جتنے روزے قضا ہوتے اور جتنی نمازیں قضا ہو چکی ہوتیں اُن سب کی ادائی کسی مجتہد کی وساطت سے کسی معتبر شخص کے حوالے کرا دی جاتی تھی۔ اُس شخص کو اُجرت دی جاتی اور واجبات کی ادائی اُسی کے ذمے عائد ہو جاتی تھی۔ دوسرا اہم فرض ادائی قرض کا سمجھا جاتا تھا۔ روسا و عمائدین میں قریب قریب ہر ایک کے ذمے کسی نہ کسی نہج کے قرض ضرور رہتے تھے۔ جس امیر کبیر پر مہاجن کا قرض نہ ہوتا اُس کے اوپر بھی دکانداروں وغیرہ کا کچھ نہ کچھ مطالبہ باقی

رہا کرتا تھا۔ ان سب کا حساب جوڑ کر چہلم کے قبل ادائی کر دی جاتی تھی حالاں کہ بہت سے رئیسوں کو تقاریب ہوتیں بالآخر میں کبھی کبھی خود روپیہ قرض لینا پڑتا تھا۔ اسی زمانہ میں روز محل میں یا قبر پر قرآن خوانی کا انتظام رہتا اور قبر پختہ کرا دی جاتی تھی۔ تعویذ قبر پر قطعۂ تاریخ پتھر پر کندہ کرا کے لگا دیا جاتا تھا۔ ذی حیثیت خاندانوں میں بزرگ خاندان کی قبر پر چھوٹی سی قبہ دار عمارت بھی بنوا دی جاتی تھی۔ تقریب چہلم کی تاریخ معین ہو کر مجلس کے رقعے معہ حصوں کے شرفا و روسا اعزا و اقارب اور عمائدین شہر کے یہاں بھیجے جاتے تھے۔ یہ حصے بڑے بڑے ہوتے تھے۔ کسی کے یہاں پلاؤ ہوتا تو کسی کے یہاں روٹی سالن یا کھیر کی بڑی بڑی ہانڈیاں تقسیم ہوتی تھیں۔ چہلم کے قبل کئی دن تک یہ حصے تقسیم ہوا کرتے تھے کیونکہ شہر کے تمام ممتاز شرفا و روسا کے یہاں حصے پہنچ جانا ضروری تھا۔

چہلم کے دن بھی پہلے قرآن خوانی ہوتی تھی۔ اجیر نیز شرکا مجلس متعدد قرآن ختم کرتے تھے۔ اس کے بعد مجلس ہوتی لیکن ذاکری سے قبل متعدد شعرا قطعاتِ تاریخ پڑھا کرتے تھے۔ چہلم کی مجلس عموماً دیر میں شروع ہوتی اور کافی وقت تک پڑھی جاتی تھی۔ ذاکر متوفی کے حالات بھی زیادہ تفصیل سے پڑھتے تھے۔ اختتامِ مجلس کے بعد اُسی چیز کا عام حصہ بھی بٹتا تھا جو قبل مجلس امرا و روسا کے یہاں بھیجی گئی تھی۔ البتہ فرق یہ تھا کہ یہ عام حصے مقابلتاً چھوٹے ہوتے تھے لیکن ان کی تعداد بے شمار ہوتی تھی۔ کثرت سے غربا و مساکین بلا امتیازِ مذہب و ملّت حصے قبول کرتے تھے۔ بڑی فراخ دلی اور فیاضی سے حصے بانٹے جاتے تھے۔ ان کی نوعیت بالکل محرم کے لنگر کی ایسی ہوتی تھی۔ اسی روز شام کو میت کی رسم فاتحہ بڑے اہتمام ادا کی جاتی تھی۔ کثیر مقدار میں کھانے پکتے اور غربا و مساکین کو کھلائے جاتے۔ بہت سے برتنوں میں مختلف غذاؤں پر جن میں وہ سب غذائیں شامل ہوتی تھیں جو متوفی کو پسند تھیں۔ فاتحہ ہوتی اور بے شمار کپڑے اور برتن بھی شامل کر دیے جاتے تھے۔ کسی مقتدر مولوی سے فاتحہ دلائی جاتی اور تمام فاتحہ کا سامان اُسی کے یہاں بھجوا دیا جاتا۔ یہ امر اسی کی مرضی سے متعلق ہوتا تھا کہ فاتحہ کا طعام اور جملہ سامان وہ خود قبول کرلے یا غربا پر تقسیم کر دے۔ بعض خاندانوں میں میت کے نام پر چہلم کے دن بہت کثیر قیمتی سامان خیرات کیا جاتا تھا۔ ریاست محمود آباد میں یہ خیرات عاقبتی جوڑا کہلاتا تھا۔ اور اس جوڑے میں والی ریاست کے استعمال کی ہر چیز یہاں تک کہ ہاتھی اور گھوڑا بھی شامل ہوتا تھا۔ اگر اُس وقت کوئی جانور موجود نہ

ہوتا تو خرید کر "جوڑے" میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ اس جوڑے کی قیمت ارزانی کے دور میں بھی ایک لاکھ روپے سے کم کی نہیں ہوتی تھی۔ شہر کے روسا وعمائدین کے یہاں سے بھی چہلم کے دن ہزاروں روپے کا مال و متاع خیرات ہو جاتا تھا۔ متوفی کے ملبوس ہی بہت قیمتی ہوتے تھے اور اُن کے علاوہ بہت سا نیا سامان خرید کر فاتحہ میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ فاتحہ کے وقت محل میں بڑے زور و شور سے گریہ وزاری ہوتی تھی اور اُس کے بعد صفِ ماتم اُٹھ جاتی تھی۔ چہلم تک بہت سی غذائیں جو شادی سے مخصوص تھیں مثلاً مچھلی وغیرہ نہیں پکتی تھیں اور نہ مستورات زرق برق لباس پہنتی تھیں۔ یہ تمام باتیں ختم ہو جاتی تھیں۔ گھر کے اندر غذا و لباس کی آزادی ہو جاتی تھی لیکن خاندان میں برسی ہو جانے تک نہ کوئی شادی ہوتی تھی اور نہ گھر والے کسی دوسرے کے یہاں شادی میں شریک ہوتے تھے۔ عید الفطر کے موقع پر سوئیاں پکنا فرض کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن روسا وعمائدین کے یہاں برسی تک نہ سوئیاں پکتی تھیں اور نہ کہیں سے سوئیوں کا حصّہ آسکتا تھا اسی قسم کے اور بھی دستور تھے۔ انھیں سختیوں کو دور کرنے کے لیے برسی کی رسم قبل از وقت ادا کر دی جاتی تھی۔

چہلم کے بعد مراسمِ موت کی ادائی میں جتنے اخراجات ہوتے وہ علیحدہ لکھے ہوئے محفوظ ہوتے تھے۔ اُن کو ورثا کے روبرو پیش کر دیا جاتا تھا۔ ان مراسم کے ادا کرنے کی ذمہ داری اولادِ اکبر کے ذمّے ہوتی تھی اور وہ اس کا حقدار ہوتا تھا کہ اخراجات کی مجموعی رقم متروکہ سے وصول کر لے۔ ان رقوم کی ادائی کے بعد نقد و جنس کا تمام متروکہ ورثا کے درمیان بحصّۂ شرعی تقسیم ہو جاتا تھا۔ کتابیں اور استعمالی کپڑے جو خیرات سے بچ رہتے اولادِ اکبر کا مخصوص حق ہوتا تھا۔ جائداد غیر منقولہ عام طور سے مشترک رہتی تھی اور اولادِ اکبر نگراں رہتا تھا۔ سال میں چار مرتبہ دوسروں کو اُن کے حق کا منافع تقسیم کر دیتا تھا۔ لیکن یہ اتحاد و اشتراک کی برکت بیسویں صدی کے اوائل میں ختم ہونے لگی تھی۔ لہٰذا بڑے بڑے رئیسوں نے اپنی املاک کی تقسیم کا بذریعہ وصیت نامہ انتظام کرنا شروع کر دیا تھا۔ شیش محل کے رئیس و تعلقدار نواب جعفر علی خاں مرحوم نے چار علاقے اپنے چاروں صاحب زادوں کے نام لکھ کر ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ تعلقدار بنا دیا تھا لیکن پھر بھی کچھ جائداد مشترک چھوڑی تھی۔ مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں مرحوم کے بعد اُن کا وافر متروکہ اُن کے دونوں صاحب زادوں مرزا بہادر مرزا محمد جعفر علی خاں اور مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کے درمیان تقسیم ہو گیا تھا۔ اور کوئی نزاع پیدا نہیں ہوا تھا۔ روسا وعمائدین جائداد کے سلسلے میں مقدمہ بازی کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ حتی المقدور اختلافات مقتدر افراد کی مداخلت سے طے کر لیے جاتے تھے۔

میت کے سلسلہ میں دو باتیں اور قابلِ ذکر ہیں۔ بعض روسا وصیت کر دیتے تھے کہ اُن کی میت عتباتِ عالیات بھیجی جائے۔ بعض رئیسوں کی اولاد از خود اپنے والد کی میت کربلا یا نجف بھیجنے کا فیصلہ کرتی تھی۔ ایسی صورت میں بعد نمازِ میت اُسی صندوق کو جس میں جنازہ ہوتا ایک چھوٹے سے بند کمرے میں "سپرد" کر دیتے تھے۔ جس کا طریقہ یہ تھا کہ جنازہ کے صندوق ہی میں بہت بڑی مقدار میں کافور اور بیر کی ٹہنیاں رکھ دیتے تھے۔ زمین پر ایک حوض نما دو اونچی اونچی دیواریں بنا کر درمیانی جگہ کو کوئلوں وغیرہ سے بھر دیتے تھے۔ میت کا صندوق انھیں دیواروں پر رکھ کر کمرے کا دروازے کا چوکھٹا اس طرح اینٹوں سے بند کر دیا جاتا کہ ہوا کا اندر گزر نہیں ہو سکتا تھا۔ کمرہ ہر طرف سے ہوا بند ہوتا تھا۔ کم سے کم چھ ماہ ورنہ اس سے بھی زیادہ مدت کے بعد وہ کوٹھری کھولی جاتی تھی۔ اس درمیان جسم کی ساری رطوبت ختم ہو جاتی تھی۔ کفن بھی جگہ جگہ سے داغ آلود ہوتا تھا۔ اسی بوسیدہ کفن پر دوسرا نیا کفن پہنا دیا جاتا تھا۔ دوبارہ نماز ہوتی اور بہت بڑے پیمانے پر مجلس منعقد کر کے کسی معتبر آدمی کے ہمراہ یہ لاش کربلا یا نجف بھیجدی جاتی تھی۔ روسا وعمائدین نیز علما کے یہاں میت کا دیہ کرنے کی بھی رسم تھی جو بہت سے خاندانوں میں اب بھی برقرار ہے، متوفی کے روزِ وفاتِ صبح کو مجلس اور شام کو فاتحہ دلانے تک یہ رسم محدود ہے اور ہر سال ادا کی جاتی ہے۔

تیرھواں باب

# پست طبقے کے عوام

(۱) رہن سہن
(۲) طرزِ زندگی
(۳) مالی حالت

# (۱) رہن سہن

اس ذیل میں قبل اس کے کہ ہم کوئی تذکرہ پیش کریں "پست طبقہ" کی توضیح کر دینا اور یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس طبقہ؛ عوام سے کون کون لوگ مراد ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم ان لوگوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرنا چاہتے جو بدکرداری کا مجسمہ تھے اور بد اخلاقی جن کا شعار تھا۔ معاشرہ کی تعمیر میں کوئی حصہ ہونا درکنار ایسے لوگوں کا کوئی مقام سماج میں نہیں تھا۔ شرفا ان سے خائف اور عوام ان سے کنارہ اور علیحدہ رہتے تھے۔ ان کی ایام گزاری مطلق العنانی اور آوارہ گردی میں ہوتی تھی اور ان کا ذریعۂ معاش جرائم پیشگی تھا۔ ایسے ناپاک شہریوں کو یک لخت نظر انداز کرنے کے بعد ہم کو اپنے شہر میں ایسے لوگ بھی نظر آتے تھے جن کی تعداد بہت تھی اور وہ محنت و مزدوری کر کے یا کوئی کمال و کرتب دکھا کے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے جائز طریقہ پر کسبِ معاش کرتے تھے اور بلوجود پیٹ بھر لینے کے معاشرہ کی دولتوں سے محروم رہ کر ایام گزاری کرتے تھے۔ ان کا نہ روسا و عمائدین کے درباروں میں گزر تھا اور نہ شرفا کی صحبتوں میں باریابی ہوتی تھی۔ اپنی ٹولیوں میں ان کا سماج تھا اور سادگی و بے کیفی میں ان کی زندگیاں بسر ہوتی تھیں، پھر بھی وہ اپنی بساط بھر اسی سادگی و بے کیفی سے اپنے لئے مسرتیں نچوڑ لیتے تھے۔ غم ان کے پاس آنے نہیں پاتا تھا اس لئے کہ وہ نشاط و شادمانی کے خوگر نہیں تھے اور اپنا موٹا چھوٹا اناج کھا کر شکم پُری میں خوش خوراکی کے مزے لوٹتے تھے۔ طبقاتی نظام کے دور میں پست طبقات کے لوگوں کو اپنی پستی ہی میں اطمینان نصیب تھا۔ معاشرہ نے ان کی ذہنیت کو مقدر پر قناعت کر لینے کا پوری طرح خوگر بنا دیا تھا۔

عوام کے پست طبقات نیچے درجہ کے ملازم پیشہ لوگوں چھوٹے دوکانداروں، خوانچے والوں، اجرت پر کام کرنے والوں نیز ان بظاہر بیکار آدمیوں پر مشتمل تھا جو دوسروں سے مانگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ ان آخر الذکر لوگوں میں افیونی، زنانے و ہیجڑے اور فقیر تھے۔ جن کا ذریعۂ معاش دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر منحصر تھا۔ کچھ افیونی دریا پار بھی رہتے تھے لیکن ان کے نام سے پاٹا نالہ مشہور تھا۔ لکھنؤ والوں کے رہن سہن میں یہ ایک خصوصیت تھی کہ یہاں کی ہم رنگ و ہم مشرب آبادی زیادہ تر ایک مقام پر سکونت پذیر تھی۔ پاٹا نالہ کے افیونی بہت اچھے داستان گو تھے۔ انھیں میں ایک شخص مثنوی زہرِ عشق پڑھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے

کہ افیونی ہونا کسی مخصوص طبقہ والوں تک محدود نہیں تھا۔بہت سے دوسرے پیشوں کے لوگ بھی افیونی تھے۔ راقم کا بہترین باورچی اور راقم کے والد کا بہترین خدمت کار افیونی تھے اور حسن اتفاق کہ ان دونوں کے نام محمد حسین تھے۔ افیونیوں کا رہن سہن بالکل سادہ تھا ان کے ضروریاتِ زندگی میں صرف افیون، بالائی اور برفی داخل تھے۔ افیون کھانا یا پینا اور کام کرتے رہنا ان کے عادات میں داخل تھا۔ جب دماغ ماؤف ہوتا اس وقت بھی عادتاً کام کرتے رہتے تھے روزمرہ کے کاموں میں خلل نہیں آتا تھا البتہ کوئی نیا کام حوالہ کر دیا جاتا تو حالتِ خدر میں بھول جاتے تھے۔ ان کے اس کمال کی بہرحال تعریف کرنا پڑتی ہے کہ کسی حالت میں بھی ان سے نقصان نہیں ہوتا یا بہت کم نقصان ہوتا تھا۔ افیون چڑھی ہوتی تب بھی اپنے فرائض کی ادائی میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ بہت خوش گفتار اور معصوم صفت لوگ تھے۔ ان کی گفتگو سن کر دلوں کو لذت ملتی تھی۔

افیونیوں کے علاوہ زیادہ تر فقیر پیشہ نیز ہیجڑے اور زنانے بھی ڈالی گنج پار میں رہتے تھے۔ اس علاقہ میں دورِ شاہی سے اراضیات غریبوں کو رہنے کے لئے ملی ہوئی تھیں یہی لوگ وہاں چھپر ڈال کے سکونت پذیر تھے۔ ہیجڑے اور زنانے کی اصطلاح میں فرق تھا۔ یہ دونوں گروہ جس علاقہ میں رہتے تھے اس کا نام نکارم نگر تھا۔ یہ محلہ اب بھی آباد ہے اور کچھ زنانے رہتے ہیں۔ ہیجڑوں کا طبقہ ختم ہو گیا۔ ہیجڑے اسی طبقہ میں پست لوگ تھے جس کے اونچے دورِ شاہی میں خواجہ سرا تھے اور بلند درجوں پر فائز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ سراؤں کو محل سراؤں کے اندر بیگمات تک جانے کی اجازت تھی اور یہ اجازت اسی حالت میں ملتی تھی وہ عضوِ تناسل قطع کرا کے مردانگی کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں۔ انتزاعِ سلطنت کے بعد اس صلاحیت کو زائل کرا دینے سے کوئی مرتبت نہیں ملتی تھی البتہ زنانوں کی صنف میں ان کو وقار حاصل ہو جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے لوگ زنانوں ہی کی صنف میں پیدا ہوتے تھے۔ زنانے کو ہیجڑا بنانے کی تقریب بڑی دھوم سے ہوتی تھی میاں بھجڑی کی کڑھائی میں تیل جوش کیا جاتا، زنانے کو ہیجڑا کر کے وہی کھولتا ہوا تیل ڈالا جاتا، وہ شخص چیختا چلاتا اور سارے زنانے ناچتے اور گاتے، پوریاں تل تل کے کھاتے اور کھلاتے، رات بھر یہی جشن رہتا تھا یہ لوگ اپنے گھر کا سارا کام خود ہی کرتے تھے اور ناچ گا کے اپنی روٹی چلاتے تھے۔ ساٹھ برس قبل تک ان کا کاروبار خوب چلتا تھا اس لئے کہ غریب سے غریب لوگوں کے گھر میں بھی شادی بیاہ کے موقع پر ناچ گانا ہوتا تھا اور زنانوں کا ناچ بہت کم داموں ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں نے ایک مخصوص طرز اپنے گانے میں ایجاد کر لی تھی جو اب تک برقرار ہے۔ البتہ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس کے موجد شہر کے پرانے زنانے

تھے۔

دورِ حاضر میں فقیر سے مراد وہ شخص ہے جو کوئی کام نہ کرے اور بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرے۔ فی زمانہ بہت سے فقیر ہٹے کٹے اور تنومند بھیک مانگتے نظر آتے ہیں جو سماج کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں۔ کیوں کہ وہ معاشرہ کے لئے کسی طرح بھی کار آمد نہیں ہیں اور چلتی پھرتی، بولتی بات کرتی لاشیں ہیں۔ قدیم لکھنؤ میں یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ جو لوگ حقیقتاً مفلوج و معذور نہیں تھے اور صحت مند ہوتے ہوئے دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے تھے وہ بھی کسی نہ کسی کمال کے حامل تھے اور لوگ ان کو روپیہ پیسہ خوش ہو کر دیا کرتے تھے ایک فقیر کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ویسے ہی متعدد فقیر تھے جو چوک میں یا میلوں میں گھوما کرتے تھے اور صرف اپنی خوش گفتاری اور چرب زبانی کے مظاہرے کر کے خیرات حاصل کرتے تھے۔ کوئی ضلع جگت میں بات کرتا، کوئی راہ گیروں پر مناسب حال جملے کستا، کوئی فارسی کے اشعار انتہائی خوش الحانی سے پڑھتا، کوئی نثر میں نظم کی لذت بھر دیتا تھا۔ یہ لوگ محلے محلے گشت نہیں کرتے تھے۔ جہاں جہاں بڑے بڑے اجتماع ہوتے وہاں پہنچ کر بامراد واپس ہوتے تھے۔ بظاہر بھیک مانگنے والوں میں ان فقیروں کے علاوہ جو علیحدہ علیحدہ گداگری کرتے تھے۔ دو گروہ بھی تھے جو باہم ہو کر کسبِ معاش کرتے تھے۔ ان میں ایک جھلبدار تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور دوسرے "ڈنڈے کڑے والے" کہلاتے تھے۔ یہ لوگ غالباً خود تصنیف کردہ گیت گاتے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں لکڑی کا ڈنڈا رہتا تھا اور بائیں ہاتھ میں متعدد لوہے کے کڑے رہتے تھے۔ اسی ڈنڈے کو کڑوں پر اس طرح مسلسل چلاتے رہتے تھے کہ بڑی دل گداز آواز نکلتی تھی۔ اسی طرح بجاتے رہتے اور گاتے رہتے تھے۔ ان کا ہر گیت انتزاعِ سلطنت کا مرثیہ ہوتا تھا لیکن ہر گیت میں کسی نہ کسی ایسے شخص کو ضرور فحش گالی دی جاتی تھی جس کے بارے میں آخری تاجدارِ اودھ سے غداری کا عام طور پر الزام لگایا جاتا تھا۔ ایسے گیتوں میں زیادہ تعداد علی نقی خاں کی ہجو میں ہوتی تھی۔ یہ لوگ ہر اتوار کو نخاس کی بازار میں ضرور آتے تھے اور جہاں کھڑے ہو کر گاتے اور بجاتے تھے سننے والوں کے ٹھٹھ لگ جایا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو بہت تھوڑی دیر میں معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ راقم نے ان "ڈنڈے والوں" کو نخاس کے علاوہ اور کہیں کبھی نہیں دیکھا۔ جھلبداروں کی طرح ان لوگوں کا غول بھی تخمیناً ستر برس قبل ختم ہو گیا۔ یہ لوگ بھی ڈالی گنج باغ میں رہتے تھے۔ ان سب کے رہنے کی خود اپنی بنائی ہوئی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں۔ زمین کا کرایہ عموماً آٹھ آنہ سہ ماہی یا ششماہی تھا لیکن غالباً ادائی بہت کم ہوتی تھی۔ داروغہ واجد علی مرحوم کے اوقات کے ایک سابق متولی حسن جعفر مرحوم کی زبانی راقم نے ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں یہ سنا تھا۔

ایسے بعض کرایہ داروں کے ذمہ پچیس پچیس اور تیس تیس برس سے کرایہ باقی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے باقی کرایہ داروں سے کرایہ وصول ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

انھیں ظاہر بظاہر بلا مشقت روزی حاصل کرنے والوں میں بعض بھانڈوں، شہدوں اور سادھو بچوں کا بھی شمار تھا۔ راقم کو کبھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ "سادھو بچے" کن لوگوں کو کہتے تھے اور یہ فرقہ کب معرض وجود میں آیا تھا۔ افسانے بہت مشہور تھے اور ان کے بارے میں متعدد روایات بیان کی جاتی تھیں۔ وثوق کے ساتھ صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ نہ ہندو تھے اور نہ مسلمان ان کا رہن سہن مشترک لکھنؤ کلچر کا نمائندہ تھا ہر رئیس اور ہر صاحب حیثیت شریف کے یہاں ہر چھوٹی بڑی تقریب کے موقع پر جاتے تھے اور ان کا سوال رد نہیں ہوتا تھا۔ یہی انعام و اکرام کا ذریعہ معاش تھا۔ غالباً صاحب اہل و عیال نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو ان کے بچوں کا کوئی پتہ کبھی نہیں چل سکا۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی رہتی تھی۔ راقم کی شادی کے موقع پر ۱۹۲۱ء میں صرف تین سادھو بچے نظر آئے تھے۔ جو غالباً آئندہ چار پانچ برس میں ختم ہو گئے اور پھر کسی تقریب میں کوئی سادھو بچہ نہیں دیکھا۔ شہدوں کا فرقہ اپنی آپ مثال تھا۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے ان لوگوں کو بدزبانی میں کوئی عار نہیں تھا اور نہ ہاتھا پائی کرنے میں شرم آتی تھی۔ اپنی اسی تیزی، طراری اور بدتہذیبی کے وسیلے سے کسب معاش کرتے تھے۔ ان لوگوں نے پیشہ بھی اختیار کیا تو مردہ اٹھانے کا جو کوئی دوسرا قبول نہیں کر سکا۔ ان لوگوں میں بعض افراد اپنی ذہانت و ذکاوت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے شاہی دربار میں ملازم تھے اور حاضر جوابی میں ان کا مثل و نظیر نہیں تھا۔ اس مقام پر دو لطیفے ضبط تحریر میں لے آنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو راقم نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنا تھا۔ واجد علی شاہ کے دربار میں "سیان" نامی شہدا ملازم تھا۔ بادشاہ اس سے دلچسپی لیتے تھے تاکہ وہ ان سے غیر مہذب مذاق کرے درباریوں میں کوئی دوسرا اتنی جسارت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ ایک بار جعفری منزل اور قیصر باغ کے درمیان والی مہندی کی روش کے پیچھے قریب دوپہر سیّان سکھا ہوا روٹی کھا رہا تھا اور اس کا سر کھلا ہوا تھا۔ بادشاہ ہوادار پر تشریف لے جا رہے تھے۔ دور سے سیّان کو دیکھ کر اتر پڑے اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے جا کر اس کے سر پر چپت لگا دی۔ سیّان نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑایا "اماں نے سچ کہا تھا، بیٹا! ننگے سر روٹی نہ کھانا شیطان چپت مارے گا۔" ناخوش ہونے کے بجائے بادشاہ نے خوش ہو کر انعام دیا۔ اسی سیّان سے متعلق دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ قیصر باغ میں بالاخانہ سے اتر رہے تھے۔ سیّان پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ تو مجھے جنسا

اگر نہ ہنسا پایا تو نیچے اتر کر تجھے قتل کرا دوں گا۔ میاں نے فقرے کسنا شروع کئے اور [illegible] ہیں مسکرائے یہاں تک کہ دو سیڑھیاں باقی رہ گئیں تو میاں جو بادشاہ سے پیچھے پیچھے تھا جست کر کے نیچے کودا، بادشاہ کے چہرہ کو مڑ کر گھورا اور گالی دے کر کہا " یہ ہنسے گا یا مروائے گا" بادشاہ بے ساختہ ہنس پڑے اور اس کو انعام دیا۔ شہدوں میں طنز و مزاح اور فحش گوئی کا یہ رواج بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک برقرار تھا۔ روسا و شرفا ان سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ لوگ اس خوف کا فائدہ اٹھا کر خوب خوب رقمیں وصول کر لیتے تھے لیکن اس وصولیابی میں دوسرے کی حیثیت و استطاعت کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ اب بھی اس طبقے کے لوگ کچھ باقی ہیں لیکن زیادہ تر پیشہ ور ہو گئے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر خوش حال گھرانوں میں ان کے ساتھ اب بھی داد و دہش ہوتی ہے۔ یہ لوگ شادی اور غمی دونوں موقعوں پر رقم طلب کرتے تھے اس لئے کہ میت بھی انہیں کے کاندھوں پر اٹھتی تھی۔ یہ طریقہ بڑی حد تک اب بھی برقرار ہے۔ بھانڈوں کا تعلق رقص و موسیقی سے تھا اور ان میں بڑے بڑے باکمال پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا ایک قبیلہ تھا جس میں بہت سے افراد اب بھی موجود ہیں اور انھوں نے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ عہدِ قدیم میں بھانڈوں ہی میں بعض خاندان ایسے تھے جو تقاریب کے موقع پر روسا و عمائدین اور شمول شرفا کے یہاں جاتے اور انعام و اکرام طلب کرتے تھے۔ سادھو بچوں اور شہدوں کے ہمراہ یہ لوگ بھی جایا کرتے تھے۔ اب یہ رواج ختم ہو چکا ہے۔ بھانڈ نخاس میں اور شہدے وزیر گنج میں رہتے تھے دونوں طبقوں کے افراد کی شناخت ان کی وضع قطع سے ہو جاتی تھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ رہن سہن میں بھانڈ غریب عوام کے مماثل تھے لیکن شہدوں کا طرز زندگی ان کے انفرادی مزاج و ماحول کے تحت بنتا اور بگڑتا رہتا تھا۔ یہ طبقہ بہر حال آخر میں بہت مہذب اور شائستہ ہو گیا تھا۔

اجرت پر کام کرنے والوں کو دورِ حاضر میں لیبر کلاس کہا جاتا ہے۔ اس طبقہ میں فی زمانہ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کے علاوہ ہر قسم کی اجرت پر مشقت کرنے والے شامل ہیں۔ لکھنؤ والوں میں اتنا احساس برتری تھا کہ انھوں نے بہت سے کاموں کو اپنے لئے مبتذل قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ عمارات کے لئے فنکار معمار لکھنؤ میں مل جاتے تھے لیکن چونا گارا بنانے کے لئے شہر کے باہر سے مزدور فراہم ہوتے تھے۔ بار برداری کا سارا کام بیرونجات کے اجیر کرتے تھے۔ ابھی کل کی بات ہے جب رکشا چلانے کا رواج شروع ہوا تھا تو سب ہی رکشا چلانے والے شہر کے باہر کے آدمی کام کرتے تھے۔ ساٹھ ستر برس قبل یہ احساسات اور زیادہ شدید تھے محلہ کی منڈیوں میں باہر سے غلہ آتا تھا اور جو لوگ لاتے تھے وہی ان کے ساتھی بار برداری کرتے تھے۔ غلہ کے آڑھتی اور ان کے ملازم مقامی تجارت

کا کام ہوتا تھا۔ اس لئے صرف چند شعبے ایسے تھے جن میں کام کرا اجرت پر کام کرنے والے نمایاں حیثیت سے نظر آتے تھے۔ ان میں چاندی سونے کے ورق کوٹنے والے، سونے چاندی کا تار کھینچنے والے، مانجھا سوتنے والے اور ڈور بنانے والے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ دوسرے فنکار مثلاً لوہار، بڑھئی، کمہار، سنار وغیرہ زیادہ تر اپنے اعزا واقارب کو شریک کر لیتا کر ان کو وسیلۂ معاش فراہم کرتے تھے۔ یوں تو ہر فنکار اور دست کار اپنے اعزا واقارب کا خیال مقدم رکھتا تھا لیکن ٹکنکل کام کرنے والے اقربا پروری پر اس لئے اور زیادہ مجبور تھے کیوں کہ باہر کے اجیر اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان کے اچھے شرکا کار نہیں ہو سکتے تھے۔ ورق کوٹنے تار کھینچنے، مانجھا سوتنے اور ڈور بنانے میں اجرت کو حاصل کرنے والے کے لئے کسی فنکارانہ صلاحیت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی البتہ مہارت کی بنیاد پر ان کی قدر دانی کم یا زیادہ ہوتی تھی۔ ورق کوٹنے والے اور تار کھینچنے والے چوک علاقہ کے قرب وجوار میں رہتے تھے۔ دن بھر چھوٹی چھوٹی لنگیاں باندھے اور پرانے طرز کے شلوکے پہنے دو کانوں پر کام کیا کرتے تھے۔ ورق کی دوکانوں سے کھٹ کھٹ کے سنگیت میں آوازیں بلند ہوا کرتی تھیں۔ تار کھینچنے والوں کے یہاں عموماً خاموشی طاری رہتی تھی۔ ان دونوں مقامات پر زیادہ تر نوجوان کام کرتے تھے جو مسلسل ترنم سے اشعار پڑھا کرتے یا آپس میں گالم گلوج کی تفریحیں رہا کرتی تھیں۔ ان کی زندگی اپنے طرز پر دلچسپی سے خالی نہیں تھی اور ان کے دوستوں کی تعداد بھی اتنی مختصر ہوتی تھی کہ ہر فرصت کے وقت سب مل بیٹھ کے بے بضاعتی میں مسرتیں حاصل کرتے تھے۔ مانجھے کے فنکار زیادہ تر محلہ چودھری کی گڑھیا اور اسی کے قرب وجوار میں رہتے تھے۔ ان کے یہاں کام کرنے والے نوجوان بھی انھیں محلوں میں دستیاب ہوتے تھے جو برسات کے موسم کے علاوہ ہر زمانہ میں قریب قریب ہر روز سلطان المدارس کے دونوں جانب سڑکوں کے کنارے اڈے گاڑے مانجھا سوتا کرتے تھے۔ مانجھے کے لئے لُگدی وغیرہ تیار کرنا فنکار کا فریضہ تھا۔ کام کرنے والے صرف ڈور پر لُگدی کو مہارت کے ساتھ چڑھایا کرتے تھے۔ اول تو ان نوجوانوں کی تعداد کم ہوتی تھی دوسرے یہ لوگ دور دور کام کرتے تھے جس کے سبب سے باہمدگر گالم گلوج یا ہنسی مذاق کی آوازیں وقتاً فوقتاً بلند ہوتی تھیں جس سے بالکل مختلف سماں ڈالی گنج میں ڈور والوں کے یہاں نظر آتا تھا۔ بالکل پرانے طرز کے پائجامے اور دوپلی ٹوپیاں ہر وقت سر پر رکھے تیزی کے ساتھ لکڑیوں کے ڈھانچوں پر لوگ کام کرتے تھے۔ آپس میں چہلیں بھی ہوتی تھیں اور فحش مذاق تو شہر کا عام چلن تھا۔ ان لوگوں کے شمائل آہستہ آہستہ کچھ اس طرح بدل جاتے تھے کہ یہ لوگ جب کبھی چوک میں آجاتے تو ان کے ملاقاتی ان کو ڈالی گنج کے لنگور کہا کرتے تھے۔ یہ سب کام کرنے والے اسی محلہ کے رہنے والے تھے۔

چھوٹے دوکانداروں، خوانچہ والوں اور دوسرے سودا بیچنے والوں کا رہن سہن بالکل سادہ اور معصومانہ تھا۔ یہ دوکاندار اپنے اپنے محلوں میں چھوٹی چھوٹی دوکانیں رکھتے تھے، سودا بیچ کر اپنے اہل وعیال کا پیٹ پالتے اور بہت سادہ مگر صاف لباس پہن کر گھر سے نکلتے تھے۔ دوکان پر میلا سا گھٹنا اور قدیم طرز کا شلوکہ پہن کر کاروبار کرتے تھے۔ سرِ شام دوکانیں بند کر کے گھر چلے جاتے اور اگر دم گھبرا آتا تو اپنے میرِ محلہ کے یہاں رات کا کچھ حصہ دلچسپ اور خوشگوار باتوں میں گزار لیتے تھے۔ کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہی طریقہ ہندو دوکانداروں کا بھی تھا۔ خوانچہ والوں کی زندگی تقسیم کار پر مشتمل تھی۔ بعض خوانچہ والے مثلاً شیرمال (گاؤزبان) وبالائی، تمش دتنکی، حلوہ پوری، وغیرہ بیچنے والے علی الصباح گھروں سے نکلتے اور اپنے اپنے مقررہ محلوں میں گھوم کے سودا بیچ کر زیادہ سے زیادہ دوپہر تک گھر واپس چلے جاتے تھے۔ ان کی آمدنی اہل وعیال سمیت بسر اوقات کے لئے کفایت کر جاتی تھی۔ دوسرے قسم کے خوانچہ والے شام کو نکلتے اور اپنے اپنے مقررہ مقامات پر خوانچہ لگا کے بیٹھ جاتے تھے۔ ان کی دوکان داری غروبِ آفتاب کے کچھ دیر کے بعد ختم ہو جاتی تھی یہ لوگ دن بھر ضروریات کی خریداری اور اپنے سامان کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔ خوانچہ والوں کی زندگی میں سیر تفریح کے لئے کوئی خاص وقت نہیں تھا۔ میلوں میں سودا لگانے والے ضمناً تفریح کر لیتے تھے ورنہ اس طبقہ کے لوگوں کو اپنی دلچسپیوں کے لئے وقت نکالنے میں اپنا کاروبار معطل رکھنا پڑتا تھا۔ سودا بیچنا اور تفریح بھی کرتے رہنا پھیری والوں کے مقدر میں تھا۔ ایسے ترکاری والے بھی شعریت میں ڈوبے ہوتے تھے اور جس کا سودا جتنا گراں قدر ہوتا تھا اتنی ہی اس کی آواز ونعرے میں جاذبیت ہوتی تھی۔ ککڑی والا لیلا کی انگلیوں اور مجنوں کی پسلیوں کی یاد دلاتا تو پونڈا بیچنے والا لڑکوں کو کنکوا لوٹنے کی یاد تازہ کرا دیتا تھا۔ پھولوں کے ہار پیش کرنے والا گلستان کا سبق سناتا تو "ساقی" جو چوک میں کھڑے ہو کر پھولوں کے گجرے میں لپٹا ہوا حقّہ پلاتا تھا تو دو آتشہ کو مات کرتا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محلہ چوک اور اس کے قُرب جوار میں ہر سودا بیچنے والا زبان وبیاں میں باکمال تھا اور ہر ایک کا مزاج شعریت میں سمویا ہوا تھا۔ "گھر میں تھوڑا کھانا تنافُسے رہنا" ان کا شعار تھا لیکن باہران سودے والوں کے جسم پر بہت صاف وشفاف کپڑے ہوتے تھے اور اپنے اشیائے فروختنی کی مناسبت سے جسم بھی معطر رہتا تھا۔ پونڈے والا کیوڑہ کا، ترکاری والے حنا کا، حقّہ پلانے والا شمامہ کا اور شربت والے گلاب کا عطر لگاتے تھے۔ لکھنؤ والوں کے رہن سہن میں خوشبو کو اتنا دخل تھا کہ چھوٹے سے چھوٹا دوکان دار بھی اپنی دوکان کھولتے ہی اتنی خوشبو ملا دیتا تھا کہ دوکان معطر ہو جاتی تھی۔

ملازم پیشہ عوام کے پست طبقات میں مہتر، خاکروب، بہشتی، دھوبی، نائی، نوکر چاکر اور خدمت گار وغیرہ شامل تھے۔ پرانے زمانے میں ان طبقات کا کم سے کم ایک آدمی ہر گھر سے وابستہ ہوتا تھا اس زمانہ میں واٹر ورکس تھا، نہ واشنگ کمپنیاں تھیں اور نہ ہیر کٹنگ سیلون تھے۔ ہر رئیس کے یہاں کم سے کم ایک بہشتی، ایک دھوبی اور ایک نائی ملازم رہتا تھا۔ رئیس کے محل اور اس کی املاک میں خالی زمین کا بڑا رقبہ ہوتا تھا چوں کہ ان ملازمین کی کسی وقت بھی حاضری ضروری ہو سکتی تھی اس لئے ان کو مکان بنانے کے لئے زمین بھی دی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں رئیس کے محل سے متصل غریبوں کی جھونپڑیاں سلم ایریا (SLUM AREA) نہیں کہلاتی تھیں اور امیروں کے متصل غریبوں کو بھی زمین کے اوپر اور اسی آسمان کے نیچے زندہ رہنے کا حق تھا صرف اسی سہولت کی بدولت ان پست طبقات کے عوام کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ با فراغت رہنے کی سہولت حاصل رہتی تھی۔ جو بہشتی، دھوبی اور نائی کسی رئیس کے یہاں ملازم نہیں تھے وہ اپنے محلہ ہی میں محلہ والوں کی خدمت کر کے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھر لیتے تھے۔ اس طرح ہر بہشتی، ہر دھوبی اور ہر نائی اپنے محلہ کی ہر فرد سے متعلق ہو جاتا اور اسی سماج کا ایک فرد قرار پایا جاتا تھا۔ کسی چھوٹی یا بڑی تقریب میں کوئی محلہ والا اس دھوبی، بہشتی اور نائی کو فراموش نہیں کرتا تھا۔ ہر نائی تیسرے روز، دھوبی آٹھویں دسویں دن اور بہشتی مقررہ وقت پر دن میں دو بار اپنے فرائض کی ادائی کے لئے حاضر ہو جاتا تھا۔ محلہ کے مہتر اور خاکروب بھی محلہ والوں کے گھروں میں علی الصباح سے وقتِ چاشت تک کم سے کم ایک مرتبہ روزانہ حاضری دیتے تھے۔ عند الضرورت دو یا تین بار حاضری میں بھی انکار نہیں ہوتا تھا۔ مہتر اور خاکروب اپنے فرائض سے فراغت کرنے کے بعد نہا دھو کر، سر میں تیل اور کپڑوں میں عطر لگا کے اس طرح شام کو باہر گھومنے نکلتے تھے کہ ان کو صرف اپنے ساتھیوں کی وجہ سے پست طبقہ میں شامل سمجھا جا سکتا تھا۔ ان کا طرز گفتگو اور راہ چلنے کا انداز ان کی پستی کی طرف اشارہ ہوتا تھا۔ روسا و عمائدین کے محلوں میں متعدد مہتر اور خاکروب ملازم ہوتے تھے اور انھیں کے علاقے میں آباد ہوتے تھے۔ میلوں ٹھیلوں میں ان کے محل کی مہترانیاں اتنا بناؤ سنگار کر کے نکلتی تھی کہ بعض اوقات بہت اونچے اونچے خاندانوں کے جوان اُن پر بلا تکلف فریفتہ ہو جاتے تھے۔ بعض مہترانیوں کو گران قدر بیگمات اور بڑے متقدر لوگوں کی مادرِ گرامی بن جانے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔

نوکر چاکر نیز خدمت گاروں کو اعتبار حاصل کر کے ملازم رکھا جاتا تھا اس لئے کہ گھر کی بہت

سی ذمہ داریاں ان کے حوالے ہوتی تھیں۔ اس لئے محلہ والوں کو غیروں پر اور زیادہ ترجیح دی جاتی تھی روسا و عمائدین کے یہاں متعلقین و مقربین کی سفارشوں پر آدمی رکھے جاتے تھے۔ شرفا کے یہاں عموماً چوبیس گھنٹے کی ملازمت ہوتی تھی لیکن پھر بھی گھر جانے کے وقت آدمی وقت نکال لیتا تھا۔ عندالضرورت رخصت بھی آسانی سے مل جاتی تھی۔ روسا و عمائدین کے یہاں حاضری کے اوقات معین ہوتے تھے۔ مقررہ اوقات کے علاوہ ہر ملازم اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ ان ملازمین کو خواہ روسا کے ہوں یا شرفا کے صاف ستھرا رہنا اور تہذیب سے گفتگو کرنا ضروری تھا۔ بددیانتی بھی معاف ہو جاتی تھی لیکن بدتمیزی نہیں بخشی جاتی تھی۔ اسی ٹریننگ کی بدولت ان کی خانگی زندگی بھی شائستہ ہوتی تھی اور ان کی اولاد بچپن ہی سے تہذیب کی خوگر ہوتی تھی لیکن ملازمت کے سبب سے اطاعت کی خو بو اتنی بس جاتی تھی کہ وہ ہر جگہ حضور سرکار کہے بغیر بات نہیں کرتے تھے اور اگر گھر میں فاقہ ہو اور بیوی تنگ ہو تب بھی باہر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اور سفید کرتا بدن پر پہنے نکلتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دورِ حاضر میں یہ طرزِ معاشرت قابلِ تعریف نہ ہو لیکن پرانے زمانے میں جو آدمی بھی کسی امیر یا شریف کے یہاں ملازم ہوتا تھا اس کی زبان سے اپنے مالک کے خلاف کوئی کلمہ شکایت کسی اجنبی کے روبرو نہیں نکلتا تھا اور وہ ہر تکلیف میں آسودگی و فراخی ہی کا اظہار کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم لکھنؤ کے ملازم پیشہ طبقہ کی وفاداری اور نمک حلالی مثال میں پیش کی جاتی تھی اور اگر کبھی کوئی ایک آدمی بھی ایسا نکل آتا تھا جس کی خصلت اور خو بو اس طرزِ عمل کے منافی ہوتی تو وہ اپنے محلہ میں مطعون ہو جاتا تھا۔ لوگ اس کے رہن سہن سے اتنا متاثر نہیں ہوتے تھے جتنا اس کا کردار قابلِ قدر یا قابلِ نفرت قرار پاتا تھا

## (۲) طرزِ زندگی

پست طبقات کے عوام کا طرزِ زندگی پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے اس عظیم اور نمایاں فرق کا جائزہ لینا چاہیے جو امیروں اور غریبوں کی ذہنیت میں پایا جاتا تھا۔ قدیم لکھنؤ کا تمام کلچر تصنع اور مبالغہ کی بنیادوں پر استوار تھا اور یہ دونوں خصوصیات عیب نہیں تھے بلکہ اس معاشرہ کا زیور تھے۔ امرا اور شرفا کی سیرتوں میں بہت سی بلندیاں انہیں بظاہر عیوب کی بدولت پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی تھیں۔ غربا و مساکین کی خاطر خواہ حاجت برآری بہت کچھ مبالغہ آمیز سرشت کا نتیجہ ہوتی تھی اور امرا کی دماغی الجھنوں کا ان کے تصنع پسند مزاج و مذاق کی بدولت دنیا کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ پست طبقات والے اپنے معاشی اور مالی حالات کا تصنع اور مبالغہ سے بری ہو کر اندازہ کرتے

اور اپنی چادر ہی میں پاؤں پھیلانے کی فکر کرتے تھے۔ اگر ان کے وسائل ناکافی ہوتے اور اپنی جد وجہد میں ناکام ہو جاتے تو وہ اپنی تقدیر پر صبر و شکر کر کے قناعت کر لیتے تھے۔ ان کے اس جذبۂ قناعت میں ایک حد تک روحانی طاقت تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور کے سیاسی کارکن اُن کی محرومیوں سے تنگ آ کر اُن کو آسانی سے مشتعل نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ وہ ہر تکلیف میں زندگی بسر کر لے جانا اپنی حیات کا ماحصل سمجھتے تھے۔

قناعت کوشی کے ساتھ ان میں احساسِ ذمہ داری بھی تھا۔ دھوبی ہو یا بہشتی، حجام ہو یا مہترانی، نوکر چاکر ہوں یا اجیر و خدمت گزار، ان سب طبقات کے افراد اپنے کاروبار پر وقتِ مقررہ سے کچھ پہلے ہی پہنچ جاتے تھے۔ دورِ حاضر کی طرح پابندیٔ وقت کے لئے قوانین و ضوابط نہیں تھے۔ کام لینے والوں میں خود ایسے لوگ بہت کم تھے جو وقت کی اہمیت ملحوظ رکھتے تھے لیکن یہ کارگزار دیر میں پہنچنے کے بجائے کچھ قبل ہی پہنچتے اور اس کا خیال رکھتے کہ مالک کی خوشنودی کے مطابق کام ہو جائے۔ ان کا یہی احساس اس صورتِ حال کا اسباب میں ایک سبب تھا کہ اس زمانہ میں ملازم ہوں یا وقتی خدمت گزار برطرفی کا کوئی طریقہ رائج نہیں تھا بلکہ کام لینے والے اور کام کرنے والے کے درمیان ایک مرتبہ رشتہ قائم ہونے کے بعد مدتوں بلکہ بسا اوقات نسلاً بعد نسل چلا کرتا تھا۔ رئیسوں کے یہاں کئی کئی پشت کے خدمت گار رہتے تھے اور کام بنوانے والوں کے یہاں بھی دادا سے لے کر پوتے تک کاری گر کام کیا کرتے تھے۔ بہر حال یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دائمی ملازمت کا رشتہ بلا استثنا ہر جگہ برقرار تھا۔ لیکن برطرفی کو ہم ضرور مستثنیات میں شامل کرنے پر مجبور ہیں۔ پابندیٔ وقت اور حسنِ خدمت کے معاوضہ میں انعام و اکرام کا چلن عام تھا اور یہی انعام و اکرام غریب طبقوں کے کام کرنے والوں کے لئے بڑی نعمت ہوا کرتا تھا۔ انعام و اکرام میں کام کرنے والوں کے بچوں اور عورتوں کے ضروریات بھی ملحوظ رکھے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ فلاکت کے باوصف پست طبقوں کے عوام بھی میلوں وغیرہ میں سیر و تفریح کے لئے جاتے تو اُن کے بدن پر اچھا لباس نظر آ جاتا تھا۔ ان انعامات سے بہشتی، مہتر، مہترانیاں، حجام اور خدمت گار برابر مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ شرفا لکھنؤ بھی ان خدمت گزاروں کے ساتھ ہر مناسب موقع پر سلوک کر دیا کرتے تھے۔

اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کے اوقات میں وہ لوگ ہمہ تن اپنے مالکوں کی دلجوئی اور خوشنودی کی فکر میں غرق رہتے لیکن اس کے بعد اپنے اہل و عیال کی طرف پوری توجہ مبذول کرتے تھے۔ بچے کھلاتے، کوئی بیمار ہوتا تو دوا علاج کی فکر کرتے اور گھر داری کے امور میں اپنی شریکِ زندگی کا

جتنا ممکن ہوتا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کی عورتیں اپنے شوہروں کی مطیع اور اپنے بچوں کے لئے انّا، کھلائی دوا، چھوچھو سب کچھ ہوتی تھیں۔ امیروں اور رئیسوں کی بیگمات اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلاتی تھیں، اپنے پاس سلاتی بھی نہیں تھیں لیکن ان کی طرف سے بے پرواہ بھی نہیں ہوتی تھیں، غذاؤ صحت کا ہمہ وقت خیال رکھتی تھیں اور اگر کبھی کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کا چہرہ دیکھتیں نبضیں ٹٹولتیں اور سانسیں گنتی تھیں۔ ان غریبوں کی عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہر وقت نظر کے سامنے رکھتی اور کلیجے سے لگائے رہتی تھیں۔ ہندوستانی ماں کی ممتا انھیں غریب عورتوں میں تھی اور ان کے شوہر ہر مشکل وقت میں شریکِ کار رہتے تھے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ساری گھر داری مرد اور عورت دونوں کے تعاون سے چلتی تھی۔ اس زمانہ میں یہ کہاوت بہت مشہور تھی کہ جس طرح ڈھیا بغیر بیلوں کی جوڑی کے نہیں چل سکتی اسی طرح گھر داری بھی جب ہی چل سکتی ہے کہ میاں اور بیوی دو بیلوں کی طرح ایک مقصد کے تحت باہمدگر تعاون واشتراک کریں۔ مالی مشکلات کی بدولت زن وشو زیادہ تر گھروں میں نیم برہنگی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن ایسا وقت نہیں آنے دیتے تھے کہ کوئی بچہ فاقہ سے سورہے۔

لکھنؤ کے معاشرہ نے غریبوں کے لئے بھی سیر و تفریح کے مواقع فراہم کر رکھے تھے۔ روسا و عمائدین کے محلوں میں، اگر ڈیرے دار طوائفین رونقِ محفل ہوا کرتی تھیں تو غریب من چلے نوجوان گڑھے والی سرائے یا چاول والی گلی میں اپنی سستی تفریحات کا سامان مہیا کر لیتے تھے۔ ان دلچسپیوں میں پھر بھی کچھ نہ کچھ رقم خرچ ہوتی تھی۔ بلاخرچ کی تفریحات بھی بے شمار تھیں۔ ماہِ محرم کے علاوہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی محلہ میں میلہ نہ لگتا ہو بعض میلے بہت عالیشان ہوتے تھے جہاں پست طبقہ کے عوام بھی آزادی کے ساتھ گھوم کر چشم و گوش کو آسودہ کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے اپنے گھروں میں بھی کچھ نہ کچھ دل بستگی کا سامان فراہم کر لیتے تھے۔ کسی معمر اور بزرگ طبقہ حجام کے یہاں دوسرے ہم پیشہ جمع ہوجاتے تو شطرنج یا گنجفہ کا کھیل شروع ہوجاتا اور گھنٹوں تک یہ تفریح ہوتی رہتی تھی۔ اس کھیل میں نہ بازی لگتی تھی اور نہ شرط بدی جاتی تھی۔ کچھ تو عصمت بی بی از بیچارگی تھی کیوں کہ روپیہ جیب میں نہ ہوتا اور کچھ ان غریب لوگوں کو پیسہ برباد کرنے سے نفرت تھی ان کے مزاج میں اسراف کا کبھی کوئی شائبہ تک نہیں آتا تھا۔ کفایت شعاری ان کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ حجاموں کے علاوہ دوسرے پست طبقات والے بھی اپنے اپنے مقام پر کچھ نہ کچھ تفریح کا انتظام رکھتے تھے بہشتیوں کو عام طور سے ڈھولک بجانے کا شوق تھا۔ یہ لوگ فرصت کے اوقات میں اپنے اپنے بچوں کو پاس

بٹھا لیتے اور خوب مزے سے ڈھولک بجاتے اور کچھ چھوٹے چھوٹے خاص قسم کے گیت گاتے تھے جن سے بچوں کو بہت دلچسپی ہوتی تھی۔ اس طرح گھر کے مالک کو تفریح کا موقع مل جاتا، بچے بھی بہلتے رہتے اور شریکِ زندگی کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے سکون مل جاتا تھا۔ گانے بجانے کے اس مشغلہ میں مہتروں کا پلہ تمام دوسرے پست طبقات سے مقابلتاً بہت بھاری تھا۔

مہتروں میں بھی دو درجے قائم تھے۔ کچھ لوگ صرف جھاڑو دے، کر زمین صاف کرتے اور کوڑا کرکٹ دور کر دیتے تھے۔ ان کو خاک روب کہا جاتا تھا، جو لوگ فضلا اٹھاتے اور پائخانے دھوتے تھے وہ مہتر کہلاتے تھے۔ روسا کے یہاں بیرونی نشست گاہ میں خاک روب اور مہتر علیحدہ علیحدہ اپنے فرائض انجام دیتے تھے لیکن زنانہ محل میں مہترانیاں ہی دونوں خدمات پر مامور رہتی تھیں۔ خاک روب ہوں یا مہتر اور مہترانیاں، ان سب سے امرا اور شرفا کو جب وہ جھاڑو پنجہ یا ٹوکرا ہاتھ میں لئے ہوتے بہت زیادہ کراہت رہتی تھی اور حتی المقدور ان کا سامنا ہونا تک گوارا نہیں کرتے تھے۔ لیکن تمام ملازموں اور خدمت گاروں میں رحم اور شفقت کے یہی طبقات زیادہ مستحق تھے۔ مہترانی جب اپنے فرائض کے غیر اوقات میں صاف کپڑے پہن کر سامنے آکر آداب بجا لاتی تھی تو بیگم صاحبہ بلا تکلف فرماتی تھیں کہ "بیٹھ جاؤ" اور کنیز کو حکم دیتی تھیں کہ اس کو پان بنا کر کھلا دو۔ اس پیشہ ور کو مہتر کہنا ہی واضح کرتا تھا کہ اس کے اہم جذبات کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنے مالکوں کی اطاعت اور وفاداری میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ ہر خوشی کے موقع پر باجا لے کر حاضر ہوتے اور بامراد واپس جاتے تھے۔

کہا جاتا تھا کہ پرانے طرز کا بینڈ ہمارے شہر کے مہتروں کی ایجاد تھی امرا و شرفا کے یہاں ہر شادی کے موقع پر نیز محرم کے جلوسوں میں مہتروں کا بینڈ ہونا پہلے بھی ضروری تھا اور اب بھی ضروری ہے۔ یہ لوگ نہا دھو کر خوشنما وردیوں میں اپنے اپنے صاف و شفاف باجے لے کر آتے اور خوب خوب بجاتے تھے۔ ان کو پہلے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں فلاں تاریخ و وقت فلاں فلاں مقام پر جانا تھا۔ جتنی بلند ڈیوڑھی پر جانا ہوتا اتنا ہی زیادہ ریاض ریہرسل میں کیا جاتا تھا۔ یہ مصروفیت برابر رہا کرتی تھی اور ریہرسل کے موقع پر نیز جلوسوں میں بینڈ کے ہمراہ برادری کے اور بہت سے مہتر بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ اس طبقہ کے لوگوں کے لئے اس طرح بجانا بہت بڑی تفریح ہوتی تھی۔
اس زمانہ میں مے نوشی شدید ترین گناہ اور بہت بڑا عیب سمجھی جاتی تھی۔ روسا و شرفا میں جو لوگ یہ شوق کرتے تھے وہ بھی اس کو معصیت سمجھ کر مستوریوں ہی میں ارتکاب کے قائل تھے۔

بدکردار، بدقماش اور مردود خلائق افراد کے علاوہ پست طبقات کے عوام بھی دیدہ دلیری کے ساتھ شراب خانے جاکر بالاعلان مے گساری نہیں کرتے تھے اس زمانہ میں نہ بار تھے اور نہ ولایتی طرز کے شراب جاتے تھے بھٹی میں شراب بنتی اور وہیں فروخت ہوتی تھی۔ آٹھ آنے میں بوتل ملتی تھی اور یہ خالص دیسی شراب سونف، سنگترہ، گلاب وغیرہ کی بنتی تھی۔ بوتل کھل جاتی تو سارہ ماحول معطر ہو جاتا تھا۔ ذائقہ شیریں و تلخ ہوتا تھا۔ پست طبقات میں مہتروں ہی کا وہ گروہ تھا جو بالاعلان شراب پیتے تھے۔ اپنے یہاں شادی وغیرہ کے مواقع پر مے خواری کے لئے صلائے عام دیا کرتے تھے اور رہرسل کرنے میں بھی تھوڑی بہت پی لینا ضروری تھا۔ لیکن ایسے رہرسل ان مقامات پر ہوتے تھے جہاں چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں اور جھونپڑیوں میں صرف مہتروں کی آبادی ہوتی تھی۔ یہ لوگ پی پی کر بہت زیادہ مست ہو کر ہلڑ ہنگامہ برپا کرتے اور آپس میں بہت گالم گلوج بھی کرتے تھے لیکن اس طرز عمل کو ہم فتنہ و فساد نہیں کہہ سکتے تھے۔ جو مہتر ملازم پیشہ ہو کر روسا عمائدین کے عطا کردہ اراضیات میں مقیم ہوتے تھے وہ ایسے تمام ہنگاموں سے اپنی قیام گاہوں کو محفوظ رکھتے تھے۔ وہ پیتے بھی تو خاموشی سے گھر میں پڑے رہتے۔ بعض مہترانیاں بھی شراب پیتی تھیں۔

پست طبقات کے عوام میں باہمی منافشات بھی بہت کم نمودار ہوتے تھے۔ زن، زر اور زمین جھگڑے کی جڑ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ زر اور زمین سے بے نیاز تھے البتہ ان کے باہمد گر اختلافات کا بیوی، بہو، کوئی نہ کوئی عورت ہی سبب ہوا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں روسا و شرفا بھی کچہری اور عدالت کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ دھر لیتے تھے غربا تو مجبوراً بھی اُدھر کا رُخ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے پاس خود اپنی قائم کردہ عدالتیں تھیں جن کے احکام اخلاقاً واجب التعمیل ہوا کرتے تھے۔ کوئی شخص یا خاندان سرتابی کرتا تو برادری میں مطعون ہو جانے اور حقہ پانی بند ہو جانے کی سزا ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ ایسی عدالتیں پنچائتوں کے نام سے موسوم تھیں۔ حجاموں، بہشتیوں، مہتروں وغیرہ میں سب کی علیحدہ علیحدہ پنچائتیں تھیں جو اپنی برادری والوں کے منافشات فیصلے کرتی تھیں۔ اس موقع پر پنچوں کے علاوہ برادری کے معتقد اور معمر اشخاص بھی جمع ہو جاتے تھے۔ یہ فریقین معہ اپنے متعلقین اور بہی خواہوں کے حاضر ہو کر اپنا اپنا مقدمہ پیش کرتے تھے۔ پنچ اُن لوگوں سے جرح کرتے، ان کی پیش کردہ شہادتیں سنتے، معمر اور بزرگ لوگوں کے مشورے طلب کرتے اور بالآخر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے تھے۔ یہ پنچائتیں عموماً کسی غیر آباد جگہ پر ہوتی تھیں تاکہ فریقین کی برادری والوں

کے علاوہ کوئی اور جھگڑے کے واقعات سے باخبر نہ ہو سکے۔ کبھی کبھی یہ پنچائتیں طول پکڑ جاتی تھیں اور کئی کئی دن تک نشستیں ہوتی تھیں۔ ان طبقات کے لوگوں میں مختلف مذاہب کے افراد ہوتے تھے لیکن پنچوں کے فیصلے کسی مخصوص مذہبی روایات کے عام طور سے حامل نہیں ہوتے تھے۔ برادری کے مرتب کردہ ضوابط جو صرف سینہ بہ سینہ چلتے آتے اور جن کی تائید میں صرف عمل درآمد کے روایات ہوتے تھے، نافذ کیئے جاتے تھے ان کو قبول کرنے میں بہشتی اور حجام غالباً کبھی تامل نہیں کرتے تھے۔ یہ دونوں طبقے بہت خاموش اور متحمل مزاج کے مالک تھے۔ اپنی حق تلفیوں کو بھی ضبط و سکون سے انگیز کر لیتے تھے لیکن مہتروں کی جماعت پنچائت کی کارروائیوں کے دوران بھی ہنگامہ آرائیوں سے باز نہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھی پنچائت کے فیصلوں سے بھی بعض افراد بغاوت کر دیتے تھے جس کے نتیجہ میں برادری سے اخراج ہوتا اور ان کو طرح طرح کے تکالیف برداشت کرنا پڑتے تھے بالآخر کچھ اعزا و اقارب بیچ میں پڑ کر دوسری پنچائت کرا کے معاملہ رفع دفع کرا دیئے تھے۔

ان پنچائتوں کے علاوہ بعض فنکاروں کے یہاں بھی انہیں ہی مصالحتی اور عدالتی جماعتیں تھیں لیکن نہ ان کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور نہ آئے دن ان کی کارکردگی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ گاہ گاہ ایسے مواقع آتے تو پنچوں کے حضور فریقین معہ متعلقین جمع ہو جاتے اور جو فیصلے ہوتے ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جاتا بخوشی نہ سہی تو دوسروں کے سمجھانے بجھانے پر ناخوشگوار فیصلہ بھی منظور کر لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے پست طبقات کے افراد اپنے اختلافات محلہ والوں کی وساطت سے بھی طے کرا لیتے تھے۔

جس پست طبقہ سے نوکروں چاکروں اور نیچے درجہ کا خدمت گاروں کا تعلق تھا ان میں اختلافات ہی بہت کم رونما ہوتے تھے اور اگر اتفاقاً کوئی قضیہ کھڑا ہو گیا تو محلہ کے امیرِ محلہ اس تنازعہ کو بہت جلد اور آسانی سے فیصلہ کر کے میل ملت بحال کرا دیتے تھے۔ ان لوگوں کی زندگی ملازمت یا امورِ خانہ داری کے انجام دینے تک محدود رہتی تھی۔ سال میں عید بقرعید کے علاوہ دو چار میلوں میں آپس کے دوستوں کے اصرار پر ہو آتے تھے۔ بالکل یہی طرزِ زندگی خوانچہ والوں کا بھی تھا فنکاروں کے یہاں اجرت پر کام کرنے والے نوجوانوں کو سیر و تماشا کا مقابلتاً ذوق تھا۔ یہ لوگ اپنی یومیہ کی اجرت کو خیر باد کہہ کر مشاعروں، محلہ کے رئیسوں کے یہاں محفلِ رقص و سرود اور قریب قریب سب بڑے میلوں میں گھوم آتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے طرزِ زندگی میں دلچسپیوں اور تفریحوں کو کافی دخل تھا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو اپنے معینہ کام سے فراغت بھی جلد مل جاتی تھی اور ان سے کام لینے والے کارخانہ دار آسانی سے رخصت بھی دیدیتے تھے اجرت پر کام لینے کے باعث ان کا نقصان بھی نہیں ہوتا تھا۔ جو

جتنا کام کرتا اس کو اتنا ہی پیسہ بھی ملتا تھا۔ ان نوجوانوں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کے اوپر کسی بڑے خاندان کو سنبھالنے کی ذمہ داری نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال ایک بات خصوصیت کے ساتھ یہ کہنے میں آتی ہے کہ پست درجہ کے ہر طبقہ میں ہندو اور مسلمان شامل تھے اور دونوں فرقوں کے افراد ایک ہی جگہ پر کام کرنے کے عادی تھے۔ لیکن مذہب کی بنیاد پر کبھی کسی دو افراد میں باوجود ہندو اور مسلمان ہونے کے کبھی کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ ہر ایک دوسرے کو اپنا حقیقی بھائی سمجھتا اور ویسا ہی برتاؤ کرتا تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل تک پست طبقات کے عوام کی خود داریوں میں یہ عادت داخل تھی کہ خواہ کتنی ہی سخت سے سخت ضرورت کیوں نہ ہو وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے روپیہ قرض نہیں مانگتے تھے۔ اور نہ کسی کی کوئی چیز روزمرہ کی ضرورت میں عاریتاً لے کر استعمال کرتے تھے۔ ایسے تعلقات گنتی کے دو ایک عزیزوں یا دوستوں سے رہا کرتے تھے۔ البتہ ساہوکاروں سے روپیہ قرض لینے میں تکلف نہیں تھا حالاں کہ اس سودے بازی میں بڑے بڑے روح فرسا تکالیف اٹھانا پڑے تھے۔ راقم کو ایک بہشتی کا واقعہ معلوم ہے جس نے صرف ایک روپیہ سود پر قرض لیا تھا اور اس کے عوض ایک مدت تک اپنے مہاجن کے یہاں بلا اجرت پانی بھرا تھا اور برسوں تک پیسے اور آنے ادا کر کے سود پاتا تھا پھر بھی تقریباً آٹھ دس برس کے بعد نواب صاحب شیش محل نے پچاس روپیہ ادا کر کے اس کی گلو خلاصی کرائی تھی۔ لیکن ایسے موقع ان کم حیثیت لوگوں پر بہت کم آتے تھے کیوں کہ روسا و شرفا برابر ان کی مدد کرتے رہتے تھے اور انعام و اکرام میں کبھی کمی نہیں آنے پاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ادبار آنے کے بعد خوش حال لوگوں کے مقابلہ میں یہی کمتر حیثیت کے لوگ بہتر حالت میں تھے۔ یعنی یہ کہ ان کی حیثیت پر کوئی نمایاں زوال نہیں آیا تھا۔

## (۳) مالی حالات

اس زمانہ کے مالی حالات کا بالخصوص پست درجہ والوں کے مالی حالات کا آمدنی کی تعداد رقم سے اندازہ کرنا صحیح طریقۂ کار نہ ہوگا۔ اس لئے کہ لوگ کم سے کم آمدنی میں ارزانی برکتوں سے فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پست درجہ کے ملازمین کو بہت کم تنخواہ ملتی تھی۔ مہتر کو چار آنے ماہوار اور اعلا درجہ کے خدمت گار کو پانچ روپیہ ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی اور وہ اسی آمدنی میں معہ اہل و عیال کے گزر بسر کر لیتے تھے۔ مہتر کو چار چار آنہ کر کے بہت سے گھروں سے آمدنی تھی اور

پھر اس کے گھر کی عورتیں اور بچے بھی کما لیتے تھے۔ چنانچہ مشہور تھا کہ لکھنؤ کے مہتر بھی انڈے پراٹھے کھاتے تھے۔ اسی طرح حجام کو بھی متعدد ڈیوڑھیوں سے تنخواہیں ملتی تھیں اور یہی صورتِ حال بہشتی کے ساتھ بھی تھی۔ ان سب کی آمدنی گھر کی روٹی چلانے کے لئے کفایت کر جاتی تھی۔ کپڑا بھی بہت سستا تھا اس لیے پہننے کی بھی کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ دو جوڑ کپڑے ہوتے تب بھی کام چل جاتا تھا۔ بیماری دکھی میں دار الشفا سے بہترین دوائیں مل جاتی تھیں۔ البتہ بچوں کی شادیاں کرتے وقت مالی حالت کی خرابی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس وقت وہ روسا و شرفا آڑے آتے تھے جن کے یہاں یہ لوگ کام کرتے تھے۔ نقد اور جنس دونوں طرح بڑی فراخ دلی کے ساتھ امداد مل جاتی تھی۔ یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ اس زمانہ میں کسی شادی کے موقع پر خواہ کسی غریب سے غریب گھر میں کیوں نہ ہو بارات بغیر باجے کے نہیں جاتی تھی۔ اور کوئی لڑکی کسی مفلوک الحال گھر سے بھی بغیر جہیز کے رخصت نہیں ہوتی تھی۔ نیز یہ کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ غریب سے غریب گھر میں بھی کوئی لڑکی ناکتخدا رہ گئی ہو۔ اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس دور کی تنگ دستی آجکل کی تمول سے بہتر تھی کیوں کہ مالی بدحالی کی وجہ سے زندگی کا کوئی کاروبار نہیں رکتا تھا۔

شادی بیاہ کے سلسلہ میں پست طبقات کا تذکرہ کرتے ہوئے دھوبیوں کے یہاں کی شادیاں خاص طرح سے قابلِ ذکر ہیں۔ اول تو ان کی آمدنیاں متذکرہ بالا طبقات کے افراد سے کہیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس زمانہ میں نہ ڈرائی کلیننگ تھی اور نہ واشنگ کمپنیاں تھیں۔ ہر قسم کے کپڑے روسا و شرفا دھوبیوں سے دھلواتے تھے۔ یہ لوگ عام طور سے بھی پہلے خود کپڑے پہنتے پھر دھوتے تھے۔ جو کپڑے دھلنے کے لئے آتے تھے وہ میلے نہیں ہوتے تھے روسا ہر روز لباس بدلتے اور شرفا بھی دوسرے تیسرے روز جامہ بدل دیتے تھے۔ روسا و عمائدین کے یہاں دھوبی ملازم رہتے تھے اور بعض ڈیوڑھیوں میں ان کو رہائش کے لئے ٹھکانا بھی فراہم تھا لیکن میلے کپڑے دھوبی ہی کے گھر میں رہا کرتے تھے۔ دھوبی اپنے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر خوشامد کر کے اور دست بستہ التجا کر کے معززین شہر کو بھی مدعو کرتے تھے روسا و عمائدین اپنے متوسلین کی معرفت کچھ رقم بھیج دیتے تھے لیکن شرفا میں بعض لوگ دھوبی کی عزت افزائی کے لئے کچھ لمحوں کے لئے شرکت کرتے اور نیوتہ دے کر واپس چلے آتے تھے۔ اس طرح بھی دھوبیوں کو وافر رقم مل جاتی تھی اور وہ اپنی حیثیت سے بدرجہا زائد شان سے شادیاں کرتے تھے۔ ایسے موقع پر جب کسی رئیس کی آمد کی توقع ہوتی تمام دھوبی خصوصیت کے ساتھ بہترین لباس پہن کر تقریب میں

شرکت کرتے تھے۔ راقم کو ایک بار ایسی ہی ایک تقریب میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ ململ اور جابدانی کے انگرکھے ہر دھوبی پہنے ہوئے تھا۔ ان میں سے انگرکھا ملمی بوٹی والا مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خان کا تھا اور ایک لڑکے کے جسم پر مہاراج کمار محمد محمود حسن خاں آف محمود آباد اکبر کی شیروانی تھی جو پہلی مرتبہ دھلنے کے لیے گئی تھی۔ اس انگرکھے اور اس شیروانی کو میں پہچانتا تھا اور اس وقت بھی پہچان لیا تھا لیکن دھوبیوں کو ٹوکنا یا کوئی باز پرس کرنا لکھنؤ کی شائستگی کے منافی تھا حالاں کہ کبھی کبھی نئے کپڑے بھی پھٹ کر آتے تھے۔ روسا بلکہ شرفا بھی اس نقصان کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے۔

نوکروں چاکروں اور نیچے درجہ کے خدمت گاروں کی تنخواہیں بھی بدقت گھر کی دال روٹی چلانے کے لئے کافی ہوتی تھیں مگر وہ مراعات کے بل بوتے پر گزر بسر کرتے تھے۔ مخصوص موقعوں پر جن کی تعداد بھی کم نہ تھی، جو انعام و اکرام ملتے تھے وہ اہل و عیال کے کپڑے بنوانے کے لئے کفایت کر جاتے تھے۔ ملازمین کی ضرورتیں اُن اترنوں سے پوری ہو جاتی تھیں جو سرکار سے سال میں دو بار مرحمت ہوا کرتی تھیں۔ طعام و لباس سے اس طرح فراغت رہتی تھی البتہ شادی بیاہ کے موقع پر ہر ملازم پریشان حال ہو جاتا تھا۔ اس وقت رئیس کی خدمت میں وہ درخواست پیش کرتا اور کسی مقرب خاص سے سفارش کراتا۔ رئیس کی جانب سے پوری طرح استفسار حالات کے بعد اعانت ہوتی اور اس مقدار میں ہوتی کہ اس شخص کی حاجت روائی ہو جاتی تھی داد و دہش اور بذل و سخا کے نئے نئے طریقے تھے۔ نواب شفیع علی خاں عرف نواب بڈھن صاحب کے والد مرحوم کے ایک خدمتگار کی لڑکی کی شادی طے ہوئی، بہت مناسب، اور اچھی نسبت تھی۔ اُدھر سے فی الفور نکاح اور رخصتی کا تقاضا تھا۔ اُس آدمی نے اپنے آقا سے سارا حال بیان کر کے دو سو روپیہ کی رقم کے لئے استدعا کی اور انھوں نے فی الفور حکم صادر کر دیا لیکن خزانچی کی تحویل میں اتنی رقم نہیں تھی انھوں نے ترش روئی کے ساتھ اس غریب کو ٹال دیا۔ صاحب حاجت باؤلا ہوتا ہے اُس نے اسی روز شام کو پھر کو سارا ماجرا نواب کو سُنا دیا وہ کچھ سوچ کر محل میں تشریف لے گئے۔ ان کی تین بیگمات ایک منکوحہ اور دو ممتوعہ تھیں۔ تینوں کو یکجا کر کے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے فرمایا کہ ہم ایک چیز بیچتے ہیں تم لوگ بولی بولو لیکن ہر ایک کی رقم فی الفور جمع ہو جائے گی اور کسی کو کوئی رقم واپس نہ ہوگی۔ بولیاں بولی گئیں اور چھ سو روپیہ جمع ہو جانے کے بعد انھوں نے مٹھیاں کھول دیں اور فرمایا کہ تم سب کے ہاتھ ثواب بیچا اور وہ چھ سو روپیہ کی رقم لا کر اس حاجت مند کو پیش کر دی۔

اس کا اپنی حاجت سے زیادہ بھلا ہو گیا۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر بالخصوص لڑکی کی شادی کے وقت احسان کرنا ٔنہیں اپنا فرضِ مذہبی سمجھتے تھے اور ان کے پست درجہ کے ملازمین کو کوئی احساسِ تکلیف نہیں ہونے پاتا تھا۔

وہ لوگ جو روزانہ اجرت پر کام کرتے تھے جیسے ورق کوٹنے والے، تارکش، بانجھا سوتنے والے اور ڈور ساز وغیرہ ان کا طرزِ زندگی ہی ایسا تھا کہ مالی حالات اطمینان بخش نہیں رہ سکتے تھے۔ اُن کے سامنے ہر روز کنواں کھودنا اور پانی پینا تھا۔ ان لوگوں میں جن کے ذمہ کسی خاندان کی پرورش یا اہل وعیال کی ذمہ داریاں نہیں ہوتی تھیں اور زیادہ لااُبالی پن میں زندگی بسر کرتے تھے۔ بازار میں بھی بہت سستی غذائیں ملتی تھیں۔ یہ لوگ دن بھر میں جو کماتے شام کو چوک میں گھوم کر تفریح کرتے اور ساری آمدنی چٹ کر جاتے تھے۔ اگر دوسرے روز کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو جاتے تو یا فاقہ کرتے یا اپنے کارخانہ دار سے پیشگی رقم کے طالب ہوتے تھے۔ کارخانہ دار خود بھی اپنے کاریگروں پر مہربان رہتے تھے اور کبھی کبھی واجب الادا رقم سے زیادہ اچھا کام کرنے والوں کو بخش دیتے تھے اس لئے کسی فرد کو بھی پیشگی رقم جو صرف چند آنوں تک ہوتی تھی، دینے میں پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ البتہ نوجوان کاریگروں کو لاپرواہی تساہلی اور تضیع اوقات سے باز رکھنے کی ہر امکانی کوشش کرتے تھے۔ ان کی خود دلی خواہش رہتی تھی کہ ان سے متعلق لوگوں کو کھانے اور کپڑے کی طرف سے اطمینان رہے اور یہ اطمینان قلیل سے قلیل رقم میں حاصل ہو جاتا تھا ایسے لوگوں کی حالی بدحالی کی ذمہ داری ان کے اس رجحان پر بھی تھی کہ وہ صرف اپنی روز کی روٹی کے لئے مشقت کرتے تھے اور جو وقت بچا سکتے وہ سیر وتفریح یا شعر ونغمہ کی نذر کر دیتے تھے۔ ان لوگوں میں اچھا ذوقِ ادب تھا اور بات کرنے کا شعور تھا۔ آپس میں باتیں کرتے تو ایک دوسرے کی زبان وبیان میں غلطیاں تلاش کرنے کی بیماری رہتی تھی۔ پست طبقات کے افراد میں یہی لوگ لکھنؤ کی ٹکسالی اردو بولنے کی صلاحیت رکھتے تھے حالاں کہ کسی مکتب یا مدرسہ میں زانوے ادب تہہ کرنے کا غالباً کسی کو بھی موقع نہیں ملا تھا۔ زبان میں شستگی وصفائی صرف ماحول نے ان کو سکھائی تھی۔

خوانچہ والوں کے مالی حالات متذکرہ بالا تمام طبقات کے لوگوں سے مقابلتاً بہت بہتر تھے یہ لوگ خواہ صبح کو گھر سے باہر نکلیں یا شام کو سودا فروخت کریں اپنا تمام باقی وقت گھروں کے اندر اپنی چیزیں تیار کرنے میں صرف کرتے تھے۔ گھر سے نکلتے بھی تو ضرورتاً تھوڑی دیر کے لئے

باہر جاتے تھے۔ گھر میں پھٹا پرانا میلا کچیلا کپڑا پہنے رہتے تھے۔ سودا فروخت کرتے وقت اُجلا کرتا اور تنگ مہری کا پائجامہ یا سفید دھوتی پہن کر گھروں سے نکلتے تھے اپنے اہل وعیال کی پرورش کے علاوہ اور کوئی خرچ ان کے ذمہ نہیں تھا۔ سیر و تفریح کے لئے میلوں میں جاتے تو وہاں بھی خوانچہ لگا کے سودا بیچتے تھے۔ اس طرح ان کو سیر و تفریح میں بھی کوئی زیر باری نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ بھی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ لیکن ارزانی کے باعث ان کو بھی آرام سے زندگی بسر کر لینے کے بعد کوئی معقول رقم پس انداز کرنے کا سہارا نہیں تھا۔ اس لئے ان لوگوں کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ طبقہ خود کفیل تھا اور شادی بیاہ کے ایسے مواقع پر بھی ان کو کسی کی امداد طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی حالاں کہ انھیں میں جو رکابدار طبقہ تھا وہ روسا کے درباروں میں حاضری دیا کرتا تھا اور ان لوگوں کو مخصوص مواقع پر انعام واکرام مل جاتے تھے۔ رکابداروں کے علاوہ نیوون کی برتی فروخت کرنے والے بھی بہت اچھا کاروبار کرتے تھے۔ ان دو طبقات کے لوگ خوانچہ والوں کی صنف میں خوش حال کہے جاتے تھے پھر بھی اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ لوگ کسی سرمایۂ محفوظ کے مالک تھے البتہ وہ لوگ دوسروں کے مقابلہ میں بہتر کھاتے اور بہتر پہنتے تھے۔ اور ان کی تفریحات قیمتی بھی تھیں کیوں کہ یہ لوگ زیادہ تر قمار بازی کے دل دادہ تھے۔ ڈالی گنج کا ماحول بہت سے عاداتِ قبیحہ کی ترغیب دیتا تھا جن میں ایک قمار بازی بھی تھی جس کی بدولت رکابدار کبھی خوش حال نہیں ہو سکے۔ اس طبقہ کے سب ہی لوگ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر قمار بازی کی عادت بد میں مبتلا تھے۔ انھیں خوانچہ والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو نمکی و نمش یا گاؤزبان اور بالائی فروخت کرتے تھے۔ ان لوگوں کی سکونت چوک کے علاقہ میں تھی اور وہ اسی جگہ کے ماحول سے متاثر تھے۔ یعنی یہ کہ سودا بیچنا، اہل وعیال کی پرورش کرنا اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کرنا۔ ان لوگوں کو کسی ڈیوڑھی سے کبھی کسی امداد کا سہارا نہیں ملا اس لئے ان کے مالی حالات صرف اپنی ہی مشقت کی کمی کے تابع رہا کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ نہ عیش وآرام سے رہنا اور نہ فاقے کرنا۔ ان کا حصہ سماج میں صرف شیریں کلامی تک محدود تھا۔ اور اسی فنکاری کی بدولت وہ اپنی تجارت میں کامیاب رہا کرتے تھے۔

چھوٹے دوکانداروں کو اس زمرہ میں صرف اس لئے شامل کیا گیا کہ وہ مالی اعتبار سے پست درجہ میں تھے ورنہ ان کے طور طریقے بڑی حد تک شرفا لکھنؤ کے مماثل تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے محلوں میں روزمرہ کی خانگی ضروریات کی اشیا فروخت کرتے تھے اور انھیں دوکانوں کی

وجہ سے محلہ والوں کو گھر بیٹھے چھوٹی چھوٹی چیزیں اور کم مقدار میں اجناس بھی فراہم ہو جاتے تھے۔ اس زمانہ میں دوکانوں سے متعلق کوئی قانون رائج نہیں تھا اس لئے یہ لوگ اپنی مرضی سے دوکانیں کھولتے اور بند کرتے تھے۔ کسی دوکان پر کھانے کے اشیاء ہوتے تو کہیں پان تمباکو مل جاتا تھا۔ بعض پنساری کی دوکانوں پر انڈے اور پرند بھی فروخت ہوتے تھے ان سب دوکانوں کے مالک غریب مسلمان اور غریب ہندو تھے۔ بنیوں کا تسلط منڈیوں پر تھا اس وقت تک ان کے تصرف میں بہت کم چھوٹی دوکانیں تھیں۔ یہ لوگ عموماً علی الصباح دوکانیں کھول دیتے اور چراغ جلنے تک بند کر دیتے تھے۔ بعض دوکاندار دوپہر کو بھی دوکانیں بند کر کے گھر چلے جاتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں سے ظاہر ہے کہ وافر آمدنی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی دوکانداروں کے ضروریاتِ زندگی اور ان کے اہل و عیال کی کفالت کے لئے ان کی آمدنی کافی ہوتی تھی اور یہ لوگ اپنی اسی آمدنی سے کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کر لیتے تھے کیوں کہ مالی حالت میں کمزور لوگ اصراف بالکل نہیں کرتے تھے۔ ان کی وہی پس انداز رقم مخصوص مواقع پر مثلاً شادی بیاہ کے وقت کام آجاتی تھی اور ان لوگوں کو کسی رئیس وغیرہ کی اعانت درکار نہیں ہوتی تھی۔ یہ لوگ صرف اسی معنی میں خوش حال تھے کہ ان کو کسی موقع پر بھی کسی دوسرے کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ یہ لوگ بہر حال شائستہ اور مہذب تھے اور لکھنؤ کی معاشرت میں ایک شریک کی حیثیت رکھتے تھے جو قابلِ لحاظ تھا۔ اسی لیے اُن کو سماج میں ایک مقام حاصل تھا۔ جو انھیں کی طرح کے دوسرے کم حیثیت نہیں پا سکے تھے۔ یہی ایک صورتِ حال واضح کرتی ہے کہ لکھنؤ کی معاشرت میں افلاس و تنگ دستی کسی فرد کی تحقیر یا تذلیل کا باعث نہیں بنتی تھی بلکہ ایسے شخص کے امرا و شرفا خود بڑھ کر دست گیری کرتے تھے۔ نوکروں، چاکروں اور خدمت گاروں کی منزلت بھی ان کے اطوار و کردار کی بنا پر قائم ہوتی تھی اور باتہذیب ملازم تقرب کا درجہ حاصل کر لیتے تھے۔ مالی حالات میں کمزوری کے اثرات فرد کی خانگی زندگی سے باہر تجاوز نہیں کرتے تھے۔

اسی مقام پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ پست طبقات کے عوام کی تفصیل انھیں چند پیشہ وروں پر مکمل نہیں ہوتی جن کا تذکرہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ دورِ حاضر کے معیار پر جائزہ لیا جائے تو ہماری بہت بڑی آبادی مالی بدحالی میں مبتلا تھی لیکن ان کو خود کسی بدحالی کا احساس نہیں تھا، نہ اس بدحالی کی بدولت ان کا کوئی کاروبارِ زندگی تعطل میں پڑتا تھا اور نہ ہم اس دور کے اقدار کے تحت اُن حالات کو مالی بدحالی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کسی مخصوص مقام کے مخصوص معاشی اور

اقتصادی حالات کا ہم کو اُسی زمانہ کے اقدار اور رسم و رواج کے تحت جائزہ لینا چاہیئے۔ اس اصول کے تحت ہم کو یہ پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں لکھنؤ کی آبادی ڈھائی تین لاکھ افراد سے زیادہ کی نہیں تھی یہاں فنکاریاں اور دست کاریاں تھیں، صنعت گروں نے اپنے اپنے مذاق کی چیزوں کے بہتر سے بہتر نمونے پیش کئے تھے لیکن وہ دور ملوں اور فیکٹریوں کا نہیں تھا کہ مِل مالک سرمایہ داری میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور اس مقابلہ میں دولت کی افزائش ہوتی۔ ہمارے شہر میں حسن و جمال تھا، لطافت و نزاکت تھی، گل و نغمہ کا دور دورہ تھا، شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے جسنِ اخلاق اور بلندیِ کردار کے انسان آباد تھے لیکن کسبِ دولت اور جلبِ منفعت کی طرف بڑے بڑوں کو توجہ نہیں تھی، عوام تو صرف تہذیب و شائستگی کے ساتھ زندہ رہنا جانتے تھے۔ ڈھائی لاکھ کی آبادی میں چند روسائے اعظم، ان سے کچھ زیادہ امیر کبیر اور قابلِ لحاظ تعداد میں خوش حال شرفا و عمائدین تھے لیکن جو جتنا زیادہ مستطیع ہوتا تھا اتنے ہی زیادہ تعداد میں فنکار، سلیقہ شعار، ہنرمند نیز نوکر، چاکر اور خدمت گار اُس کے دامنِ دولت سے وابستہ رہتے تھے۔ اس معاشرہ کا یہ نتیجہ تھا کہ شہر بھر میں ایک منظم اور ترقی پذیر کلچر تھا جس کی بنیاد انسانیت، اخوت، خلوص اور مہر و وفا پر قایم تھی۔ آدمی کو آدمی کا درد تھا اس لیے کوئی دردمند تکلیف میں نہیں رہ سکتا تھا اور اگر تکلیف ہوتی بھی تو وہ اس کو ماحول کی پُر کیف فضاؤں میں بآسانی فراموش کر دیتا تھا۔ اور تقدیر کا سہارا لے کر زندگی بہر حال پُرسکون گزار دیتا تھا۔

## چودھواں باب

# انحطاط و زوال اور اُس کے اسباب

(۱) مغربی تہذیب ایشیائی معاشرت پر غالب آگئی
(۲) سود و زیاں کی کش مکش میں جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا
(۳) تعیّشِ بے تحاشا کا یہی انجام ہونا تھا۔

# (ا) مغربی تہذیب ایشیائی معاشرت پر غالب آگئی

مغربی تہذیب اور ایشیائی معاشرت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دونوں میں بنیادی طور پر تباین تھا اور اتنے شدید اختلافات تھے کہ دونوں کے لئے وجود باہمی کے قرائن نکلنا بھی محال تھا۔ ایک نظام دوسرے کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اودھ بالخصوص لکھنؤ میں جو معاشرہ پروان چڑھ کر معراج کمال تک پہونچا تھا وہ حقیقتاً مقامی ہندو روایات اور ایرانی جاہ و جلال کا ایک حسین و جمیل اور دلفریب انضمام کا ماحصل تھا۔ وہ تہذیب نہ خالص ہندوستانی تھی اور نہ کلیتاً ایرانی تھی۔ ہندوستان اور ایران دونوں ایشیائی ممالک تھے اس لئے ہم اپنی پرانی تہذیب کو ایشیائی معاشرت کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ اس کلچر کو فرمانروایانِ اودھ کی سرپرستی حاصل تھی اور انھوں نے یکے بعد دیگرے اس معاشرہ کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ یہ انھیں کی مساعئ جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ انھیں کے دورِ اقتدار میں ایک زبردست احساس برتری لکھنؤ والوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ تہذیب کو نئے آب و رنگ سے جلا دی۔ دولت و ثروت کی فراوانی کی بدولت اُن کی طبیعتیں عیش سامانی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اولوالعزمی نے ان رجحانات پر صیقل کی جس کی وجہ سے طوائف کو بلند مرتبہ حاصل ہوا اور رقص و موسیقی کے فنونِ لطیفہ اُس پایۂ عروج تک پہونچے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ساتھ ہی ساتھ مزاجوں میں نفاست و لطافت اور نزاکت و ملاحت کے جوہر بھی نکھرتے رہے اور کردار میں بھی انسانیت و شرافت اور اخوت و محبت کے گہر ہائے شاہوار غلطاں ہو گئے۔ اس تہذیب کا دامن علم و فضل سے بھی مالا مال تھا۔ اگر ایک طرف شعر و سخن کی گرم بازاری تھی تو دوسری طرف فرنگی محل اور خاندانِ اجتہاد کے روشن چراغ دعوتِ ایمان دے کر خواص و عوام کو پاکبازی و خوش اطواری کی تعلیم دے رہے تھے۔ اِن دونوں مرکزانِ علم و ادب نے مذہب کو تنگ نظری اور عصبیت سے دور رکھ کر امیر و غریب کو پاسداری اور رواداری پر اس طرح آمادہ کر دیا تھا کہ لکھنؤ والوں کا بلا امتیازِ مذہب و ملت قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی ایک طریقۂ کار بن گیا تھا۔ لیکن ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کے باوصف یہ کلچر رؤسا و عمائدین کی سرپرستی میں پروان چڑھا تھا۔ اور یہ امرا و رؤسا دربارِ شاہی پر سہارا لگائے ہوئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے معمار یہاں کے امیر و غریب، رئیس و فقیر، عالم و جاہل، شیعہ سنّی، ہندو مسلمان سب ہی تھے لیکن سماج کا نظام اس طرح تعمیر ہوا تھا کہ دربار سے عمائدین و خواص اور عمائدین و خواص سے عوام وابستہ تھے۔ اس وابستگی کا صرف اتنا فائدہ ہوا، اگر اس کو فائدہ کہا جائے کہ انتزاعِ

سلطنت کے بعد بھی تخمیناً ستر کہتر برس تک اس گلستانِ جانفزا کی بہاریں اپنا وجود بڑی حد تک برقرار رکھ سکی تھیں- رؤسا و عمائدین اپنی تہذیب و ثقافت کو کلیجے سے لگا رہے تھے لیکن جب اس عظیم بالشان عمارت پر داخلی اور خارجی دونوں طرف سے ضربیں پڑنے لگیں تو یہ قلعہ مسمار ہو گیا- سب سے بڑی اور کاری ضرب مغربی یعنی انگریزی اقتدار تھا-

مغربی تہذیب پر سیاسیات غالب تھے- انگریز انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کی تمام دوسری قوموں سے سیاسی سوجھ بوجھ میں بہت آگے تھے- وہ ہندوستان میں تاجرانہ حیثیت سے آئے تھے لیکن ابتدا ہی سے اُن کی نظر ملک گیری پر تھی- اودھ کے نظم و نسق میں انھوں نے آصف الدولہ کے عہد ہی سے نفوذ حاصل کر لیا تھا اور ان کے یہ اثرات برابر بڑھتے ہی گئے تھے یہاں تک کہ فوج پر ان کا مکمّل تسلّط تھا اور انتظامی معاملات میں بھی دخل دینے لگے تھے- فرمانروایانِ اودھ اپنی بے بسی سے متاثر تھے اور اُن میں مقاومت کی بالکل طاقت نہیں تھی- آخری حکمراں واجد علی شاہ اپنی کمزوریوں سے بالکل واقف تھے اور ہمہ وقت اُن کو اُس شدید ڈکیتی کا خدشہ لگا رہتا تھا جو انگریزوں نے بالآخر اُن کی مملکت پر ڈالا- واجد علی شاہ کو لکھنؤ، لکھنؤ والوں اور لکھنؤ کلچر سے گہرا قلبی تعلق تھا- اُن کے پیشِ نظر مملکت چھن جانے کا خوف تو تھا ہی لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بوستانِ لکھنؤ تاخت و تاراج ہو جائے اس لئے وہ عنانِ حکومت سے دست کش ہو کر یہ فرماتے ہوئے رخصت ہوئے کہ

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں      در و دیوار پہ حسرت سے نظر رکھتے ہیں

انگریزوں نے اپنی حکمتِ عملی سے اودھ کی مملکت پر قبضہ کیا اور اُن کے پیشِ نظر اُس وقت صرف یہ ایک مقصد تھا کہ اقتدار برقرار رہے- اس مقصد کے حصول میں وہ کوشاں رہے- سیاسیات کو بالخصوص دوسرے کا ملک چھین لینے کی سیاست کو کوئی لگاؤ صداقت و انسانیت سے نہیں ہوتا- چنانچہ انگریز سلامت روی، نرم کلامی اور خوش اخلاقی سے بے نیاز ہو کر اپنے کاروبار میں لگ گئے- ہمارے رؤسا و عمائدین سیاسیات سے بے بہرہ سیاسی چالوں اور شاطرانہ ترکیبوں سے یک لخت بے بہرہ تھے- اس کے علاوہ وہ دربار کی تباہی دیکھ چکے تھے- اُن کی آنکھوں میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی تھی اور اُن کی ساری آس ٹوٹ چکی تھی اس لئے انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی- عمالِ حکومت اور سرکاری عہدیداروں بلکہ ایک ایک انگریز سے بیحد خائف رہتے تھے- اپنے محلوں اور اپنی محلسراؤں اور ڈیوڑھیوں میں پرانی طرز کو نباہتے ہوئے ایام گزاری کرتے رہتے تھے لیکن انھوں نے اپنی آن بان اور سارا شاہانہ تزک و احتشام ہر حالت میں برقرار رہا تھا- اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ واجد علی شاہ کی یہ ہوشمندی تھی کہ وہ انگریزی تسلط

کے پہلے ہی حکومت سے دست بردار ہو گئے تھے ورنہ قرینہ یہی ہے کہ بادشاہ کے متعلقین اور متوسلین کے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہوتا جس کا مظاہرہ دلّی کے لال قلعہ میں ہوا تھا۔ یہاں انگریزوں کو قبضہ سنبھالتے ہی انتظام کی فکر دامنگیر ہوئی اور انھوں نے اس شہر کے رؤسا و عمائدین کو غالباً ناکارہ سمجھ کر آزاد چھوڑ دیا۔ حقیقتِ امر بھی یہی تھی کہ یہاں کے رؤسا و عمائدین کوئی مدافعت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اُن کے پاس نہ فوج تھی اور نہ کوئی پلٹن۔ اسلحہ ضرور تھے لیکن اُن کو طاقت کے بل بوتے پر ضبط کیا جا سکتا تھا جیسا کہ ہوا۔ مختصر یہ کہ رؤسا و عمائدین اپنی حالت پر برقرار رہے اور اُن کے دم سے لکھنؤ کی تہذیب اُس وقت برقرار رہ گئی۔ انگریزوں نے پرانی ثقافت کو فی الفور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وہ رئیسوں کی اسراف والی خصلت میں اس لئے ہمت افزائی کرتے رہے کہ بدیر وزود سب کی تباہی کا اُن کو یقین تھا۔

انگریزوں نے اودھ میں بھی اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے سب وہی ترکیبیں چلائی تھیں جن کو وہ دوسرے صوبجات میں کامیابی کے ساتھ چلا کر تجربات حاصل کر چکے تھے۔ اُن کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اپنے پیش رو فرماں روا کے متعلقین اور متوسلین کو تباہ و برباد کر دیتے تھے تاکہ بغاوت کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ اس کے علاوہ وہ خواص و عوام میں اپنا نفوذ بڑھاتے تھے۔ لیکن لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر سختی کے ساتھ کاربند رہتے تھے۔ اودھ کی مملکت پر انتہائی جعل سازی سے قبضہ کیا اور اس کے بعد اپنی تمام شاطرانہ چالیں انتہائی ہوشمندی اور تدبّر کے ساتھ چلاتے رہتے تھے۔ سیاسی چال بازیوں کے پردے فاش کرنا سہل نہیں ہوتا کیوں کہ درونِ پردہ وہی عناصر کارفرما ہوتے ہیں جن کو عوام اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ البتّہ جو واقعات رونما ہوتے ہیں انھیں سے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں چنانچہ ہم نے یہ دیکھا تھا کہ انتزاعِ سلطنت کے بعد یہاں کے رؤسا و عمائدین انگریزوں سے اتنا زیادہ خائف تھے کہ کسی عدالت کا کوئی مذکرکسی معمولی کام سے آجاتا تب بھی یہ لوگ دہل جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی فوج یا پلٹن نہیں تھی اس لئے کسی مسلّح بغاوت کا اندیشہ نہ تھا۔ البتہ اسلحہ تھے وہ آہستہ آہستہ ضبط کر لئے گئے اور قانونی پابندیاں عاید کر کے واپس ہوئے۔ البتّہ ان عمائدین کے اقتدار کا واحد ذریعہ اُن کا وہ وقار تھا جس کے وہ خواص و عوام سب کی نظر میں مالک تھے۔ یہ وقار بڑی حد تک اُن کی دولت و ثروت کی بدولت تھا جس کے زوال آمادہ حالات فی الفور آگے آچکے تھے پھر بھی یہ وقار اُس قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا بھی عطیہ تھا جو لکھنؤ کی معاشرت میں طرّۂ امتیاز کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاریخ کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں اس جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کو ٹھیس لگنا شروع ہو گئی تھی۔ یہ پہلی ٹھیس بھی مذہبیت کے نام پر لگی تھی۔ فرمان روایانِ اودھ عقیدتاً شیعہ تھے۔ شہر کے رؤسا و عمائدین میں اکثریت شیعہ مسلمانوں کی تھی اور یہ تمام آبادی صرف ایک

خاندانِ اجتہاد سے مسئلہ تقلید کے تحت منسلک تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس خاندانِ اجتہاد کو آصف الدولہ کے عہد ہی میں فضیلت حاصل ہو چکی تھی اور باوجودیکہ شیعیت درباری مذہب قرار پا چکی تھی لیکن رشد و ہدایت حاصل کرنے کے لئے تمام حکمرانوں کے دورِ اقتدار میں ایکسو چبیس برس تک اسی خاندان کو قیادت کا شرف حاصل رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے مظاہرات کے بعد انگریز اس خاندان سے ناخوش ہوئے۔ راقم کے والد مرحوم نے اس ناخوشی کے تین اسباب بتائے تھے جن میں صرف دو حافظے میں موجود ہیں ایک تو یہ کہ اسی خاندان کے سربراہ نے برجیس قدر کو تاج پہنا دیا تھا تاکہ فوج اپنے کو بغیر بادشاہ کا نہ سمجھے۔ ہر بادشاہ کو تاجپوشی کے موقع پر تاج پہنانے کا شرف اسی خاندان کے بزرگ کو حاصل رہا کرتا تھا۔ دوسری ناخوشی کی وجہ یہ تھی کہ انگریز امام باڑہ آصفی کو اپنا فوجی مرکز بنائے ہوئے تھے۔ مجتہد العصر نے یہ کہہ کر کہ امام باڑہ ہماری مقدس عبادت گاہ ہے تخلیہ کا مطالبہ کیا تھا۔ مختصر یہ کہ اس خانوادہ پر انگریزوں کو قطعاً اعتبار نہیں تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کے دو فرقوں کی باہمد گر خانہ جنگی کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ اس نفاق و شقاق کا بیج ایسا بویا گیا کہ اس کا پودا آج چھتنار درخت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ فتنہ کو ختم کرنے کے بجائے حاکمانِ وقت کی خواہش یہ تھی کہ یہ جھگڑا ابدالآباد تک برقرار رہے۔ مسلمانوں کے دونوں فرقوں کے درمیان جو مسئلہ مابہ النزاع تھا اور ہے اُس کے بارے میں ہم کوئی اظہارِ خیال کرنا پسند نہیں کرتے البتہ اتنا ضرور کہنا ہے کہ اس قضیۂ نامرضیہ کی بدولت ہماری معاشرت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا۔ کہنے کو یہ تنازعہ شیعوں اور سُنیوں کے درمیان تھا لیکن سماج کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ برادرانِ ہنود بھی بددل ہو گئے۔ انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو والی پالیسی کامیاب ہوئی۔ پہلے شیعہ برادری افراتفری میں مبتلا ہوئی پھر شیعہ سُنی تصادم کے باعث قومی یکجہتی مجروح ہوئی۔ ہندو مسلم فساد تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہانتک کہ مادرِ وطن کی تقسیم کے بعد بھی نہیں ہوا کیوں کہ ہمارے شہر کے کلچر کی جڑیں بہت گہری سماج میں اُتر چکی تھیں

سامراجی طاقت کی حکمتِ عملی کا تیسرا پہلو ہماری سوسائٹی میں نفوذ کر کے اپنے رنگ میں ہم کو رنگ لینا تھا۔ اس کاروبار کو انھوں نے نہایت عقلمندی سے چلایا تھا۔ تعلقہ داروں کا طبقہ بڑی حد تک اُن کا مرہونِ منت تھا۔ اعلیٰ حکام سے اُن عمائدین کے تعلقات بھی تھے۔ بعض تعلقہ داروں نے اپنے بچوں کے اتالیق انگریز ملازم رکھے تھے۔ ان انگریزوں نے اپنے اثرات منتقل کئے دل کھول کر خود بھی مستفید ہوئے حالانکہ بعض تعلقہ داروں پر اُن کے اخلاقی اثرات بہت کم پڑے۔ مثال کے طور پر راجہ صاحب اترولہ کے صاحبزادوں کی مثال پیش کی جاتی ہے جن کا اتالیق اُن لڑکوں کے سنِ بلوغ تک پہونچ جانے کے ایک مدت بعد تک ایک انگریز

مقرر رہا تھا لیکن وہ انگریز دونوں صاحبزادوں میں کسی ایک بھی متاثر نہیں کر سکا اور وہ ہماری قدیم تہذیب کے دلدادہ رہے۔ لیکن ایسی مثالیں خال خال تھیں۔ پرنس باقر علی خاں کا ایسا اولوالعزم رئیس اور پرانی معاشرت کا دلدادہ اپنے انگریز استاد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اُن کا دستر خوان اور اُن کے باورچی خانے کے کھانے شہر میں مشہور تھے لیکن انھوں نے کرسی میز پر کھانا کھانا اختیار کر لیا تھا اور صرف غذائیت نوش فرماتے تھے جن کے پکانے کے لئے علیحدہ باورچی نوکر تھا۔ مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کے ایسے قدیم روایات کے علمبردار کے یہاں بھی ۱۹۳۸ء کے بعد دستر خوان بچھنے کا طرز ختم ہو گیا تھا اور انھوں نے بھی کرسی میز اور ٹم ٹم و گھوڑوں کے بجائے موٹر کار کا کلچر اختیار کر لیا تھا۔ اُن کے علاوہ بعض اور رئیسوں کے یہاں بھی تختوں کے چوکوں کے بجائے صوفا سیٹ بچھ گئے تھے۔ لیکن انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم و معاشرت سے عام مسلمانوں میں ایک مدت تک نفرت برقرار تھی۔ خان علامہ نواب تفضل حسین کے خانوادہ میں جو شہر میں تعداد افراد کی بنا پر سب سے بڑا خاندان تھا راقم سے پہلے صرف برادر محترم جعفر علی خاں اثر مرحوم نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی تھی اور بی، اے پاس کیا تھا۔ وہ اپنے والد مرحوم کے بہت محبوب فرزند تھے اور اُن کی خوشی ہمہ وقت مد نظر رہتی تھی اس لئے وہ اپنی اس خواہش میں بہ آسانی کامیاب ہو گئے تھے۔ راقم کو اپنی بد نصیبی سے انگریزی پڑھنے کے لئے والدین کی بغاوت اور والد مرحوم کی خصوصیت کے ساتھ شدید ناراضگی برداشت کرنا پڑتی تھی۔ عام مسلمانوں میں بھی ایک مدت تک انگریزی تعلیم سے نفرت ہی رہی تھی۔ جس کے ثبوت میں اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ مسلمانوں میں پہلے گریجویٹ مرزا محمد عسکری ادیب تھے۔ لکھنؤ کی سوسائٹی میں تفرقہ پڑ چکا تھا اس لئے برادران ہنود بہت جلد اس اصول کے تحت کہ لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں، انگریزی تعلیم اور انگریزوں کی ملازمت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ہندوؤں کا نئی تہذیب کی طرف اقدام اور مسلمانوں کا احتراز ان دونوں فرقوں میں تلخیاں پیدا ہونے کا ایک سبب بن گیا تھا۔ بہر حال انگریزوں کا بول بالا رہا اور قدیم معاشرت کو اندر ہی اندر ایسا گھن لگا کہ اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

ناانصافی ہوگی اگر ہم اسی مقام پر انگریزوں کی اس حکمتِ عملی کے فوائد کو نظر انداز کر دیں اس ذیل میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ اُس معاشرت کا جو مائل بہ زوال و انحطاط تھی لکھنؤ والوں کو ایک بدل مل گیا۔ اُن لوگوں کو مغربی تہذیب میں روحانی سکون اور لذت کی نعمتیں حاصل ہوئیں یا نہیں یہ ایک علیحدہ بحث ہے اور ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن اتنا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے ایک دولت گئی تھی تو دوسرا بدل مل گیا تھا۔ لوگوں کے تفکر و تعقل کو ایک موڑ ملا تھا جہاں کھڑے ہو کر نئے راستوں کی جستجو کی جا سکتی تھی۔ آبادی کا بہت بڑا حصہ اپنے معاش کا وسیلہ ملازمت کو بنائے تھا۔ رؤسا و عمائدین

میں ملازم رکھنے کی استطاعت تیزی سے گر رہی تھی۔ لوگوں کو سرکاری ملازمتوں کا سہارا سلا جو یقیناً نئے طرز کی تھی لیکن جدیدیت میں لذت حاصل ہوتی ہے اس کے علاوہ اسی ملازمت کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مولانا علی نقی صفی مرحوم کو بھی جن کے خاندان کو برس ہا برس سے نواب سلیمان قدر بہادر کی ڈیوڑھی میں تقرب حاصل تھا انگریزوں کی نوکری قبول کرنا پڑی تھی۔ جو نئی نسل اُس وقت پیدا ہو رہی تھی وہ اور تیزی کے ساتھ مغربی تہذیب کی گرویدہ ہو کر اپنے آبا و اجداد کے مسلک کو خیرباد کہنے پر آمادہ ہو گئی تھی کیوں کہ پُرانے نظام میں کوئی مستقبل باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس معاشی اور اقتصادی کشمکش میں جدید مذاق کو شرف قبول حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ تمام پُرانی تہذیب کے رسم و رواج اور طور طریقے ختم ہو گئے۔ لکھنؤ کے معاشرہ نے اپنے تمام حُسن و جمال سمیت دم توڑ دیا اور مغربی تہذیب اُس پر غالب آ گئی لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ اس انقلابِ عظیم میں پُرانی گراں بہا قدروں کی پامالی صرف انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے آئی تھی بلکہ اس تباہی و بربادی میں ہمارے امرا و شرفا کی بھی بہت بڑی ذمہ داری تھی جس کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

## (۲) سُود و زیاں کی کشمکش میں جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا۔

فرمانروایانِ اودھ کی جانب سے عطا کردہ کثیر تعداد میں جاگیریں اور جائدادیں روسا و عمائدین اور شرفائے لکھنؤ کے قبض و تصرف میں تھیں۔ دربار سے منسلک وزرا اور دوسرے مقربین کے خاندان کافی خوش حال تھے۔ لکھنؤ والے کے لیے دن عید اور راتیں شب برات تھیں۔ عشرت و شادمانی میں در و دیوار سرشار تھے۔ ناگہاں انتزاعِ سلطنت نے سارا نظامِ زندگی درہم و برہم کر دیا۔ فوجوں نے مداخلت کی اور انگریزوں کی جارحیت کا مقابلہ کیا لیکن یہ نابرابری کی جنگ زیادہ مدت تک نہیں چل سکی اور انگریزوں کا تسلط ہوا۔ انھوں نے سب سے پہلے انتقام لینے کی کارروائی شروع کی۔ جتنے روسا و عمائدین اور دوسرے منصب دار مقاومت کرنے والی فوج اور بیگم حضرت محل کے طرف دار سمجھے گئے اُن کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط ہوئیں۔ بعض جلیل القدر ہستیاں اتنی تباہ و برباد ہوئیں کہ اُن کے پاس رات بسر کرنے کے لیے ٹھکانا بھی باقی نہیں رہا تھا۔ مکانات مسکونہ تک ضبط کر لیے گئے تھے۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوئی، اُن خاندانوں کو بھی سزا ملی جن کے بزرگ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اعتماد کھو چکے تھے۔ مثال کے طور پر خان علامہ نواب تفضل حسین خاں کے خانوادے کا ذکر کیا

جا سکتا ہے۔ دربارِ شاہی کی جانب سے خان علامہ کو ضلع ہردوئی میں بہت سے مواضعات جاگیر میں ملے تھے۔ خان علامہ کے بعد اُن کی اولاد گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ راقم نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ خان علامہ آخر عمر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کے معتوب ہو گئے تھے۔ اُس کا قصاص ۱۸۵۷ء میں لیا گیا۔ مواضعات ضبط ہوئے اور اُس کے عوض پولیٹیکل پنشن دی گئی۔ ابتداً یہ رقم کثیر تھی لیکن خاندان میں افراد بڑھتے رہے اور پنشن کی رقم تقسیم ہوتی رہی یہاں تک کہ اب صرف چند لوگوں کے پاس اس پنشن کی اقلِ قلیل رقم باقی رہ گئی ہے۔ اس طرح انیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے ختم ہونے تک بہت سے روسا و عمائدین اپنی حیثیت کھو چکے تھے یا کم حیثیت رہ گئے تھے۔ پھر بھی جو باقی رہ گئے تھے وہ لکھنؤ کی آبرو سنبھالے تھے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں جن رئیسوں کے دربار لگتے تھے اُن کا مختصر تذکرہ ابواب ماقبل میں ہو چکا ہے۔ یہی لوگ ہمارے قدیم معاشرے کے ستون تھے۔ لیکن حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ خاندانوں میں افراد کے اضافے ہو رہے تھے اور دولتیں ورثا میں تقسیم ہو رہی تھیں اور ہر رئیس کی ہر اولاد اپنے آباؤ اجداد کی وضعداریاں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ پرانی آن بان اور شان و شوکت برقرار رکھنا بہت دشوار تھا۔ لہٰذا اب مہاجنوں سے قرض لینے کی نوبت آگئی۔ اُس زمانہ میں دس روپیہ سیکڑہ ماہواری سود کا عام نرخ تھا اور اسی شرح سود پر ہمارے روسا بلا تکلف پرونوٹ لکھ کر رقمیں قرض لے رہے تھے بعض درباروں میں روسا کے مختار بھی اتنے نمک فراموش ہو گئے تھے کہ وہ رئیس اور مہاجن دونوں سے منفعت حاصل کرتے تھے۔ قرض لینے والے کچہری اور عدالت کے نام سے بھی ڈرتے تھے۔ کچھ خوف طاری رہتا تو اُس سے زیادہ دعویٰ ہو جانے کو اپنے بزرگوں کی عزّت پر حرف آنے کے برابر سمجھتے تھے۔ اُن کی اس ذہنیت کا اُن کے مختار اور مہاجن دونوں فائدہ اٹھاتے تھے اور جلد جلد اصل و سود شامل کر کے پرانے پرونوٹ کی تجدید ہو جاتی تھی۔ راقم کو اپنے ایک محترم اور مخلص دوست کے معاملات کا جائزہ لینے کا اتفاق ہوا تھا۔ انکم برڈ اسٹینس ایکٹ پاس ہونے کے بعد تمام سابقہ حسابات کی جانچ سے یہ پتہ چلا تھا کہ موصوف نے اصل رقم مجموعی طور پر صرف ستر ہزار روپیہ کی مختلف اوقات میں قرض لی تھی۔ اور وقتاً فوقتاً ایک لاکھ تینتالیس ہزار روپیہ نقد اور جائداد کی شکل میں ادا کر چکے تھے۔

باقی ماندہ رقم پر سود کم کرنے کے بعد بھی عدالت سے تقریباً پینتالیس ہزار کی ڈگری صادر ہوئی تھی۔ یعنی یہ کہ تقریباً پندرہ یا سولہ برس کی مدت میں انھوں نے اصل رقم پر اُس کا قریب قریب ڈیوڑھا سود ادا کیا تھا۔ اس سے بدتر حالت اور بہت سے دوسرے گھرانوں کی تھی جہاں پرونوٹ پر لمبی لمبی رقمیں قرض لی جاتی تھیں اور جائداد غیر منقولہ بھی اس لیے مکفول ہونے لگی تھی کہ پرونوٹ پر حاصل کردہ رقم روزمرہ کی ضروریات کے لیے ناکافی ہو جاتی تھی اور مہاجن جائداد غیر منقولہ مکفول کرنے کا مطالبہ کرتا تھا۔

فلاکت پوری طرح بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں منڈلانے لگی تھی لیکن غالباً کوئی ایک ایسا رئیس بھی نہیں تھا جس کو آنے والے حالات کا احساس ہوا ہو یا یہ کہ تباہی و بربادی سے بچنے کا کوئی راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ لوگ عقل و شعور سے بیگانہ اور فہم و فراست سے بے بہرہ تھے۔ لیکن اپنے رہن سہن، طور طریقوں، وضعداریوں اور دوست داریوں میں اتنی شدت سے والہانہ طور پر گرفتار تھے کہ اپنے کسی مشغلے اور اپنی کسی خواہش اور عادت کو ترک نہیں کر سکتے تھے۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ شہر کے مغربی حلقہ میں رہنے والے ایک جلیل القدر رئیس نے بیسویں صدی کی دوسری دھائی میں اپنے بکرے کا عقد مناکحت اپنے ایک دوست کی بکری سے کیا تھا۔ یہ بارات جلوس کے ساتھ متعدد محلّوں سے گزرتی ہوئی محلہ وزیر گنج گئی تھی۔ نواب موصوف بہ نفس نفیس بکرے کو دولہا بنا کر تشریف لے گئے تھے اور اسی شان و شوکت سے دُلہن کو رخصت کرا کے لائے تھے۔ دُلہن کو جہیز میں چاندی کا زیور اور سانی بھوسی کھانے کے لیے قلعی دار اور منقش تانبے کے برتن دیے گئے تھے۔ اسی طرح کبوتر بازی کے مقابلے، بٹیر بازی کی پالیاں اور تمام دوسرے تفریحی مشاغل برقرار تھے۔ اس دور میں روسا کی صحبتوں میں صرف خدمت گاروں، ملازموں اور مصاحبوں کی تخفیف ضرور نظر آتی تھی جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان متعلقین میں جو مر جاتا اُس کی جگہ پُر نہیں کی جاتی تھی اور نہ نئے تقررات ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کفایت شعاری کسی طرح بھی کارآمد نہیں ہو سکتی تھی۔ روسا و عمائدین کے درباروں کی یہ بد نصیبی بزرگوں کے وقت سے چلی آ رہی تھی کہ اُن سے سب آنے والے مشورے حاصل کرتے تھے لیکن اُن کو خود مشورہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ دولت و ثروت کی یہ لعنت تھی کہ لوگ صاحبانِ مقدرت کو نہ صرف اہل الرائے بلکہ عقلِ مجسم سمجھتے اور اُن کو تملق اور چاپلوسی کر کے یہ باور کرا دیتے تھے کہ اُن کی عقل میں کوئی فتور نہیں ہے اور اُن کا ہر فعل اور ہر ارشاد عینِ حکمت اور مستحسن ہے۔ روسا و عمائدین کے معمولات بھی

ایسے تھے کہ اُن کو کسی معاملہ پر سوچنے اور غور کرنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ اُن کے ملازمین جن کے ذمّے آمدنی اور خرچ کے حسابات رہا کرتے تھے جب تہی دستی کی شکایت کرتے اور رئیس متردد ہو جاتے تو وہی ملازم فی الفور کسی مہاجن اور قرض کی تجویز پیش کر دیتے تھے۔ وقتی ضرورت پورا کرنے کے لیے ہر تجویز منظور ہو جاتی تھی۔ پھر بھی وہ وقت آگیا کہ بڑے گھروں میں بھی آمدنی کے وسائل تلاش کرنے کی ضرورت سامنے آگئی۔

اُمرا و خوش حال شرفا کے طرزِ معاشرت میں حصولِ معاش کے لیے بھی بہت سے دروازے بند تھے۔ انگریزی پڑھنا گناہ تھا، سرکاری ملازمت وسیلۂ جہنم تھی، صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنا شانِ ریاست کے منافی اور آباواجداد کے وقار کو خاک میں ملانے کے برابر تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں یہی مسئلہ متعدد درباروں اور مختلف خاندانوں میں زیرِ بحث رہا کرتا تھا۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ تجارت کرنا چاہیے۔ شیخ علی عباس مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے شیخ محمد عابد مرحوم نے راستہ دکھایا اور جنرل مرچنٹ کی ایک دوکان امین آباد میں کھول لی۔ امین آباد کا بازار کچھ ہی برس قبل معرضِ وجود میں آیا تھا اور جدیدیت کے رجحان نے تیز بڑھتے ہوئے افلاس نے شام کو چوک کی سیر کا ذوق سرد کر دیا تھا۔ شیخ محمد عابد کی دوکان روسا و شرفا کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ وہ دُوکان بہت کامیابی سے چل رہی تھی اور یقیناً روزافزوں ترقی کرتی لیکن عابد مرحوم کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اُن کے بعد اُن کے خاندان میں کاروبار کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، خود اُن کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے اس لیے وہ دُکان بند ہو گئی۔ اسی دُکان کی کامیابی کو دیکھ کر شیش محل کے نواب رضا حسین خاں مرحوم کے صاحب زادے نواب جعفر حسین مرحوم نے شیش محل اسٹورس کے نام سے ایک بڑی دوکان امین آباد میں کھولی تھی۔ اس دُکان میں نہ صرف ہر ضرورت کا سامان تھا بلکہ زیبایش و آرایش کے بھی اشیا تھیں۔ اور اِس کی سجاوٹ بھی دیدہ زیب اور دلفریب تھی۔ شانِ ریاست کو برقرار رکھنے کے لیے ملازمین کی بھی بہتات تھی لیکن مالک دُکان کو بذاتِ خود توجہ کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ وہ صرف سیر و تفریح کرنے کے انداز میں دُکان پر دن میں صبح اور شام کو آجاتے تھے۔ بہت سا مال اُن کے دوست اور احباب قرض کے نام پر لے گئے اور غالباً اُس سے زیادہ ملازمین نے بیچ کھایا۔ ایک قلیل وقفہ میں دُکان کھلی اور لُٹ گئی۔ اس دُکان کے لُٹ جانے سے شیش محل کے نواب کا جو کچھ خسارہ ہونا

تھا وہ تو ہو ہی گیا لیکن بڑا نقصان یہ ہوا کہ روسا و عمائدین کے خاندان میں نوجوانوں کے ارادے پست ہو گئے۔ اس وقت شیش محل کا دربار شہر میں بہت ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اگر نواب جعفر حسین خاں کی دوکان برقرار رہی ہوتی اور انھوں نے تجارت میں کامیابی حاصل کی ہوتی تو اور دوسرے خاندانوں میں بھی اُن کی تاسی کرتے ہوئے کاروبار کا ذوق اُبھرتا لیکن بدقسمتی سے یہ شوق بھی اُبھرا اور ختم ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روسا کی آمدنیاں برابر گھٹتی رہیں اور اخراجات روز افزوں بڑھتے گئے۔ مقابلتاً ارزانی بھی کم ہونے لگی تھی اور پہلی جنگِ عظیم کے گرانی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی ختم ہونے تک ادبار کے بادل منڈلا کر پوری طرح چھا چکے تھے۔ آئندہ دہائی میں پورے سماج کا ڈھانچہ پاش پاش ہو کر آ گرا تھا۔ روسا و عمائدین سودی قرض کی لعنت میں بُری طرح سے مبتلا ہو چکے تھے۔ پرونوٹ کے مطالبوں کے دعوے ہو کر ڈگریاں صادر ہو چکی تھیں اور یہ ڈگریاں بڑی بڑی رقموں کی ہیں۔ عدالت میں پیروی مقدمہ سے آبروریزی ہوتی تھی اور سود کم کرنے کا قانون اس وقت تک کوئی نہیں تھا۔ یہ قوانین تب بنے تھے جب تعلقداریاں ختم ہونے لگی تھیں اور مجلس قانون ساز میں بعض تعلقہ داروں کو اپنے مفادات کی حفاظت کرنے کا موقع ملا تھا۔ جب یہ وقت آیا تو لکھنؤ کے قدیم روسا و عمائدین کے گھرانے تباہ ہو چکے تھے۔ اُن کی تباہی بے حد افسوس ناک اور عبرت ناک تھی۔ ایک قلیل مدت میں سارا بھرم خاک میں مل گیا اور کچھ نہ پتہ چلا کہ اُن کا سارا جاہ و حشم کہاں چلا گیا۔ اس تباہی کی ابتدا پہلے جائداد منقولہ کی علیحدگی سے شروع ہوئی تھی۔ کسی کی بیگم کے گوہر غلطاں کا جوڑ بمبئی جا کر فروخت ہوا تو کسی سرکار کے جواہرات کلکتہ اور دلّی روانہ ہو گئے۔ اُن کے دام کتنے لگے، کتنی رقم درمیانی شخص کی جیب میں گئی اور کتنا روپیہ مالک کو ملا۔ یہ تمام امور جواب طلب ہیں اور ایک ایسا معمّہ ہیں جو کبھی حل نہیں ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ شال دوشالے، پشمینے، جامہ واریں اور مہر مائیں بھی بازار میں آنے لگیں۔ لیکن اِن کی فروخت اُس قلیل رقم پر ہو جاتی تھی جس پر یہ قیمتی ملبوس مہاجنوں کے پاس رہن کیے جاتے تھے۔ قلمی نسخے اور مخطوطات بے رحمی کے ساتھ نخاس کے بازاروں میں پیش ہوتے تھے۔ باہر کے لوگ اور سیّاح معقول دام دے کر خرید لیتے لیکن مالک کو وہی رقم مل پاتی جو دُکاندار پیش کر دیتا تھا۔ قرین قیاس

یہ بھی ہے کہ جائداد منقولہ کا قابلِ لحاظ حصّہ ایسا تھا جس کی قیمت روسا وعمائدین کو صرف وعدوں کی شکل میں ملی تھی۔ اُن کے اخلاق اُن کو اس کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی چیز کے داموں میں مول تول کریں یا باقی رہ جانے پر تقاضا کریں یا نادہند خریدار کی دیدہ و دانستہ بد دیانتی کی مذمت یا شکایت کریں۔ انھیں حالات کا تذکرہ آجانے پر ایک مرتبہ تحسین گنج کے ایک رئیس نے راقم سے یہ فرمایا تھا کہ "ہم پر وقت پڑا ہے، جو ہماری قسمت میں تھا وہ ہو رہا ہے، ہم کو کسی دوسرے سے کوئی شکایت نہیں" اُن بزرگوں کی داستانِ بے کسی اس قول کے حرف حرف میں نظر آتی ہے بشرطیکہ چشمِ بصیرت و عبرت ہو۔

جائداد منقولہ کی علیحدگی انتہائی احتیاط اور صیغۂ راز میں کی جاتی تھی لیکن ایسی سودے بازی جس میں عدیم المثال زر و جواہر کی فروختگی کا مرحلہ در پیش ہو خفیہ نہیں رہ سکتی تھی۔ جس رئیس کا مال بازار میں آتا جوہری بھانپ لیتے اور آپس میں تذکرے کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہر رئیس کا بھرم جاتا رہا اور مہاجنوں نے مکفولی قرضوں کی ادائی کے بھی تقاضے شروع کر دیے۔ دوسری طرف ڈگریاں بھی اجرا ہونے لگیں۔ اِس ہر طرف کی یلغار نے مقروض شرفا کے دماغی توازن کو بھی مجروح کر دیا تھا۔ وہی لوگ جن کا دیانت داری احترام کرتی تھی اب اپنی جائدادوں کو جتنی بھی بچ سکیں بچانے کی فکر کرنے لگے۔ جس کا واحد طریقہ ادائی دینِ مہر کی شکل میں تھا۔ راقم کے ایک محترم دوست، جو خاندانِ شاہی کے ایک فرد تھے، بہت مغلوب الغضب رئیس تھے، وہ کثیر جائداد کے مالک تھے اور اُس وقت بھی اُن کے قبض و تصرف میں بے شمار جواہرات تھے لیکن عمائدین کی عام تباہی کی خبریں سن کر ایک مہاجن نے غالباً صرف چار ہزار روپیہ کی ڈگری اُن کے خلاف اجرا کرائی اور قرقی لے کر اُن کے گھر پہنچ گیا۔ اُن کو پہلے سے خبر مل چکی تھی۔ انھوں نے کچھ ٹوٹا پھوٹا اور پرانا دھرانا مال و اسباب ایک بڑے ہال میں جمع کرا دیا اور اسی کو قرق کر کے عدالت کے مذکوریوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کے لیے درخواست گزری جو عدالتِ ابتدائی سے منظور ہوئی لیکن اپیل میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس دوران انھوں نے اپنی کل جائداد غیر منقولہ و منقولہ کا ہبہ نامہ بالعوض دینِ مہر اپنی اہلیہ کے حق میں لکھ دیا۔ اور اس دستاویز کے خلاف کارروائی کی مدّت ختم ہونے تک لکھنؤ کی

سکونت ترک کردی۔ مختصر یہ کہ اس حکمتِ عملی سے انھوں نے اپنی بہت سی جائداد غیر منقولہ محفوظ کر لی ورنہ زیادہ تر روسا و عمائدین کا یہ حشر ہوا کہ اُن کے محل اور محل سراؤں کے اب نام و نشان تک باقی نہیں رہے اور جو باقی ہیں ان کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ کثرتِ اولاد، خستہ حالی اور گرانی نے وہ حالت کر دی ہے کہ

چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے شروع ہونے تک روسا و عمائدین کے تمام درباروں کی مسندیں اُٹھ چکی تھیں۔ مصاحبین اور ڈیرے دار طوائفوں کے طبقات یک لخت معدوم تھے۔ خواص و عوام میں انگریزی حکومت سے خوف و نفرت کا جذبہ ختم ہو چکا تھا اور اب عوام انگریزی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ قدیم لکھنؤ کی معاشرت لٹے پھٹے روسا کے ٹوٹے پھوٹے محلوں اور بعض شرفا کے گھروں میں محدود تھی۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ بھی مر کھپ گئے اور اب پرانی تہذیب کی صرف اُس وقت یاد آجاتی ہے جب نئے زمانے والے بداخلاقیوں، بدکرداریوں اور بدتہذیبیوں کے مظاہرے کرتے ہیں۔ ماضی کی یاد ہمیشہ اور ہر قوم کے لیے دل خوش کن رہی ہے لیکن لکھنؤ کی قدیم معاشرت کے فنا ہو جانے کا اس لیے ماتم کرنا پڑتا ہے کہ انسانیت شرافت سے محروم نظر آتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ اخوت و محبت اور مہر و وفا کی پرانی قدریں جن کو پرانے لوگ عین شرافت سمجھتے تھے ہم سے چھن گئیں اور صرف اس لیے چھن گئیں کہ قدیم تہذیب کے معماروں اور علم برداروں نے زندگی کا مقصد تعیش اور جذبات پرستی کو قرار دے کر بدلتے ہوئے زمانے سے کوئی سبق نہیں لیا اور اپنے طرزِ قدیم کے جاگیر داری نظام میں کسی اصلاح کے بارے میں تصوّر بھی دماغ میں نہیں آنے دیا اور کثرتِ عیش پسندی میں خود اُس نظام کو بھی فنا کرا دیا۔

## (۳) تعیّشِ بے تحاشا کا یہی انجام ہونا تھا

دولت و ثروت کی فراوانی ہر انسان کو فطری طور پر عیش پسندی اور لذت پرستی کی طرف آمادہ کر دیتی ہے۔ آج بھی صاحبانِ تمول کو ہم آئے دن ساقیانِ سیم ساق اور گل رخانِ چست و چالاک کی بزم آرائیوں میں عیدِ گل اور شامِ نشاط رچاتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن قدیم و جدید میں نمایاں فرق یہ ہے کہ عہدِ حاضر کی تمام کیف و سرمستی اہلِ دول کے لیے ہے اور غربا و مساکین یا

تو نانِ شبینہ کو محتاج ہیں یا اپنی روکھی سوکھی روٹی کے لیے اُن کو ہر روز اپنا خون پانی کرنا پڑتا ہے۔ محتاجوں اور کم مایہ لوگوں کی جو دولت مند مدد کرتے ہیں اُن کی اس خیر و خیرات میں بھی نام و نمو کی خواہش ہوتی ہے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا، قربت الی اللہ کی بجائے اپنے نفس کی آسودگی کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں شعر و ادب ہو یا رقص و موسیقی، سب کے پرستار اپنی فیاضی کی شہرت کے لیے فن کاروں کی سرپرستی کرتے ہیں اور خود لذت چشم و گوش حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ عہدِ قدیم میں خود پرستی کا جذبہ نہیں تھا یا بہت کم تھا۔ اُن کی تفریحات بھی ضروریاتِ زندگی میں داخل تھیں اور اُن کا وطیرہ یہ تھا کہ خود بھی لطف اندوز ہوں، اپنے لطف میں دوسروں کو شریک کریں اور فن کاروں کی خواہش سے زیادہ اُن کی مدد کریں۔ موجودہ دور میں کسی نہ کسی نہج سے اور کسی نہ کسی گوشۂ فکر میں استحصال کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ یہ بات پرانے زمانے میں بالکل نہیں تھی جس کی غالباً ہو وجہ تھی کہ ہمارے اسلاف بڑے بلند حوصلہ، اولوالعزم اور وسیع النظر تھے۔ وہ متمول ضرور تھے لیکن اُن میں سرمایہ دارانہ ذہنیت بالکل نہیں تھی۔ اسی لیے اُن کے دل میں ہر انسان کا درد تھا اور ہر مفلوک الحال کی دست گیری کرنا اپنا انسانی فریضہ سمجھتے تھے۔

ماضی و حال کے صاحبانِ دولت و ثروت کے طور طریقوں کا موازنہ یقیناً ہمارے اسلاف کو اخلاقیات میں بلند مرتبہ ثابت کرتا ہے لیکن انسانی کردار کا ایک اور پہلو اعتدال پسندی اور عاقبت بینی بھی ہے۔ دورِ حاضر میں اعتدال پسندی سمٹ کر اپنی ذات تک آجاتی ہے کیوں کہ دورِ حاضر کے اہل دولت اپنے نفس اور نام و نمود کے خواہش مند رہتے ہیں جب کہ سابق میں صورتِ حال اس کے برعکس تھی لیکن وہ خصوصیت جس سے ہمارے بزرگ بڑی حد تک بری تھے عاقبت بینی کی تھی۔ آج جو لوگ دولت خرچ کرتے ہیں خواہ وہ لذتِ نفس ہی کے لیے کیوں نہ ہو وہ اپنی حیثیت سے زیادہ صرف نہیں کرتے یا کم سے کم اسی قدر حاصل کرنے کی پہلے سے فکر کر لیتے ہیں۔ ماضی میں یہ فکر مفقود تھی جس کے پاس جتنا سرمایہ تھا وہ اسی کو مصرف میں لاتا تھا اور اُس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اُس سرمایہ کے ختم ہو جانے کے بعد کیا ہوگا۔ دولت سے دولت جائز اور پاک طریقوں سے بڑھائی جا سکتی تھی۔ جائداد کے منافع ہی سے جائداد میں اضافے ہو سکتے تھے لیکن یہ سب کچھ ہمارے بزرگوں نے کبھی نہیں سوچا۔ جن لوگوں نے جائدادیں خریدی تھیں انھوں نے بھی ازدیادِ اولاد پر نظر نہیں رکھی اور بڑھتے ہوئے اخراجات کا لحاظ کر کے

آمدنی میں کوئی تناسب قایم نہیں کیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ اُن کے سامنے کوئی معاشی یا اقتصادی پروگرام نہیں تھا۔ بے پناہ دولت تھی جس کو وہ بے تحاشا خرچ کرتے رہے اور جب وہ سرمایہ ختم ہو گیا تو اُن کے کردار کی ساری کائنات بھی فنا ہو گئی۔ اُن کے اس طرزِ عمل کی صفائی میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان اپنے ماحول و وراثت کا اسیر ہوتا ہے۔ اودھ کے دربار نے تعیش و شادمانی کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ اُسی ماحول میں لوگ پیدا ہوتے زندہ رہتے اور اُسی طرز سے زندگی بسر کر کے مرجاتے تھے۔ اُن کو ماحول نے کبھی کوئی ایسا موقع دیا ہی نہیں کہ وہ اپنے تعیش میں کوئی رکاوٹ لگانا ضروری سمجھتے۔

جن لوگوں نے قدیم لکھنؤ والوں کو قریب سے نہیں دیکھا اور ہماری پرانی معاشرت کا غائر مطالعہ نہیں کیا وہ ہمارے قدیم روسا و عمائدین کی تباہی و بربادی کے علیحدہ علیحدہ اسباب بتاتے اور تجویز کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے رئیس طوائف بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی کنکوے بازی وغیرہ وغیرہ میں تباہ ہو گئے۔ یہ الزام کلیتاً صحیح نہیں ہے۔ اُن کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ یہ سب شوق پورے کرتے اور اپنی شان برقرار رکھ سکتے تھے لیکن ہوا یہ کہ اُن میں تعیش دماغی کی خو پیدا ہوئی اور اس خو کی بدولت وہ جس طرف بھی بڑھے آگے بڑھتے ہی گئے۔ ہر ذوق اور ہر شوق میں انھوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور اپنی ہر ایجاد کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ کپڑا بنوانا اور کپڑا پہننا ایک فن بن گیا تھا۔ کھانا پکوانا اور کھانا کھانا ایک زبردست فن تھا۔ بٹیر بازی اور کنکوے بازی ایک دلچسپ شوق سے آگے بڑھ کر فنیت کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ اُن کی طوائف بازی بھی کسی جنسی خواہش کے تحت نہیں ہوتی تھی۔ طوائف بزم آرائی کا بہترین وسیلہ تھی اور بزم آرائی اور دل شادگی ایک فن تھا۔ روسا و عمائدین کے اسی تعیشِ دماغی کا فیض تھا کہ لکھنؤ کے فن کاروں نے صناعی کے بہترین نمونے دھاتوں اور مٹی تک کے پیدا کیے۔ اُن بزرگوں کی سرپرستی صرف فن کاروں اور صناعوں تک محدود نہیں تھی بلکہ آج قدیم علم و فضل کے باقیات الصالحات بھی انھیں رئیسوں کی برکتوں سے قایم ہیں۔ انسان کا ہر رجحان خواہ وہ عیش و طرب کی طرف ہو یا محنت و مشقت کی جانب مقامِ اعتدال ہی میں انجام کار سودمند ہوتا ہے۔ تعیش بھی اپنی جگہ پر قابلِ قبول ہوتا ہے لیکن تعیشِ بے تحاشا کا وہی انجام ہوتا ہے جو زیادہ زور سے دوڑنے والے کا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ وہ لوگ بہت اونچا اُڑے تھے اور اسی تیز رفتاری سے مائل بہ زوال ہو گئے۔

تعیش بے تحاشا کا فطری نتیجہ اسرافِ بے جا تھا، یا اسرافِ بے جا اُن روسا و عمائدین کی تباہی و بربادی کا باعث ہوا اور اُن کی بھی تباہی و بربادی قدیم معاشرت کے زوال و انحطاط کا بہت بڑا سبب تھی لیکن اِن عمائدین نے تباہ ہو کر بھی گراں قدر یادگاریں بھی چھوڑی تھیں۔ اُن عمارات اور خوش نما باغات کے علاوہ جن کا مثل و نظیر نہیں تھا انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ اور ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز میں ایجادات و اختراعات کر کے سماج کو نفاست و نزاکت کی دولتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ جمالیاتی ذوق پیدا کر دیا تھا جس کو یاد کر کے آج بھی بہت سے لوگ سرد آہیں بھرتے ہیں۔ سب سے بڑی نعمت و دولت کردار کی بلندی اور خوش اخلاقی تھی، اخوت و محبت اور مہر و وفا کی خصلتیں تھیں جو پورے معاشرے میں داخل تھیں۔ لکھنؤ والوں کے اخلاق اور یہاں کی مصنوعات زبان زدِ خلائق تھیں۔ دنیا نے ہر خوردنی و استعمالی چیز میں ترقی کر لی ہے۔ یہاں کی مصنوعات زبان زدِ خلائق دوسرے مقامات پر بھی فراہم ہیں لیکن باتوں باتوں میں لکھنؤ ہی کی مقامی چیز مثالاً پیش کی جاتی ہے اور اب تک لکھنؤ کی کوئی مخصوص چیز یہاں سے بہتر کسی دوسری جگہ تیار نہیں ہو سکی۔ میرے ایک محترم دوست نے فرمایا تھا کہ میرٹھ کی ریوڑیاں لاجواب ہوتی ہیں لیکن ایک قلیل مدت کے بعد ہی اُن کے بھائی صاحب لکھنؤ تشریف لائے تو یہاں کی ریوڑیاں سوغات میں لے گئے۔ میں نے مزاحاً استصواب کیا تو انھوں نے فرمایا۔ "ہاں! ہمارے یہاں بھی بہت اچھی ریوڑیاں بنتی ہیں لیکن لکھنؤ کی نفاست کہاں! جس طرح یہاں کی ریوڑی کھٹ سے بولتی ہے وہ بات ابھی تک ہمارے فن کاروں کو نہیں آئی۔" بے شمار مثالوں میں یہ صرف ایک واقعہ پیش کر دینا کافی ہوگا۔ عرض کرنے کا یہ مقصد ہے کہ ہمارے قدیم معاشرہ نے یہاں کے لوگوں کو بے شمار خصوصیات سے سرفراز کر دیا تھا جن کو ہم بدلتے ہوئے زمانے کے اثرات کے تحت برقرار نہیں رکھ سکے۔ ایسا نہ ہوتا اگر پرانے لوگوں کے اخلاف نے نئے رجحانات کے ساتھ پرانی اچھی عادتوں کو بھی ٹھکرایا نہ ہوتا۔ لیکن وہ بھی مجبور تھے۔ معاشی و اقتصادی حالات دفعتاً اور اتنی تیزی سے بدلے کر بیسویں صدی کے اوائل والی نسل حواس باختہ ہو کر رہ گئی تھی۔

اس دارِ فانی میں صرف حکومتوں پر زوال نہیں آتا بلکہ معاشروں کی بھی ہیئت بدلتی ہے۔ یہی نہیں کہ پورا کلچر فنا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یونان، روم، بابل وغیرہ وغیرہ کے معاشرتی نظاموں کی تاریخیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اخلاقی اور مادی قدریں بدل گئیں تو لکھنؤ

کی قدیم تہذیب بھی فنا ہو گئی۔ لیکن تاریخ کا یہ سبق ہے کہ ہم کو ماضی سے افادیت حاصل کرنا چاہیے اور جو طور طریقے، رسم و رواج، رہن سہن ہمارے ملکی جغرافیائی اور وراثتی حالات کے تحت کار آمد ہوں اُن کی طرف پھر رجوع ہونا دانشمندی کا تقاضا ہے۔ ہم قدامت پرستی کی کوئی ہمت افزائی نہیں کرتے البتہ اگر قدیم میں انسانیت و شرافت، تہذیب و اخلاق اور مہر و وفا کی نادر المثال نظیریں ملتی ہیں تو اُن کی تاسی کرنا نہ صرف آج بلکہ ہر دور میں مناسب اور سودمند ہوگا۔ ہمارے آبا و اجداد کی معاشرت کا "پہلے آپ، پہلے آپ" کہہ کر مذاق اڑانے والوں کو اُن کی نرم گفتاری، سبک خرامی اور منکسر المزاجی کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ کلمہ بڑے سے بڑا دولت مند اپنے غریب سے غریب ہم سفر اور رفیق کو بھی مخاطب کر کے کہتا تھا۔ کیا اس طرزِ عمل میں انسانیت اور شرافت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی نہیں تھی۔ بہر حال وہ دور ختم ہو گیا اور غالباً راقم کے علاوہ کوئی اُس معاشرے کا پرستار اور اُس کی کوئی یادگار اب باقی نہیں ہے اور اگر کسی گوشہ میں کوئی مل جائے تو اُس کا عدم اور وجود برابر ہوگا۔ لیکن یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ دورِ حاضر کی معاشرتِ سابقہ تہذیب کے مقابلے میں بہت کمزور بنیادوں پر قایم ہے۔ معاشیات و اقتصادیات بہت سرعت کے ساتھ بنتے اور بگڑتے ہیں۔ لہٰذا ہم کو اخلاقیات و وجدانیات سے بھی منسلک رہنا چاہیے آئندہ جو زمانہ دکھلائے گا وہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔ راقم اپنی یہ ناچیز تالیف صرف اس دعا پر ختم کرتا ہے ؎

السلام اے بعد ما آیندگانِ رفتنی
بر شما خوش باد ناخوش ہائے دنیائے دنی

# کچھ اِس تالیف کے بارے میں

ایک مدت دراز سے قدیم لکھنؤ کی آخری بہار کو معرضِ تحریر میں لانے کے لیے ہر چہار جانب سے مطالبے ہورہے تھے اور جب کبھی کسی میگزین کے کسی شمارے میں اس موضوع سے متعلق میرا کوئی مضمون شائع ہوجاتا تھا تو ان تقاضوں میں بہتات اور شدت ہوجاتی تھی جس کی غالباً واحد وجہ یہ تھی کہ قدیم تہذیب کے علم برداروں میں یہی حقیرِ زندگی کا ناقابل برداشت بوجھ اپنے کاندھوں پر اب تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ میں خود اس خدمت کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا تھا اس لیے کہ لکھنؤ سے متعلق بہت کم حالات یعنی صحیح حالات ضبطِ تحریر میں آئے ہیں۔ خدا مغفرت کرے مولانا عبدالحلیم شررؔ کی جنھوں نے شاہی دور کے حالات لکھ کر بہت سی بہتان طرازیوں کا ازالہ کردیا۔ لیکن انتزاعِ سلطنت کے بعد سے ہماری قدیم معاشرت کے ختم ہونے تک کے حالات درج کرنا میری ہی قسمت میں تھا، جن کو میں اپنے تمام نیک ارادوں کے باوصف اب تک پیش نہیں کرسکا تھا۔ اب بھی میں اپنے دیرینہ کرم فرما حیات اللہ انصاری اور عزیز مکرم شارب ردولوی کا ممنون ہوں جن کی مسلسل اور پُرخلوص ہمت افزائیوں اور جن کے شدید تقاضوں کی بدولت اچھی یا بُری یہ کاوش منظرِ عام پر آگئی ہے۔

اس تالیف کے بارے میں سب سے پہلی خامی یہ نظر آئے گی کہ بہت سے مقامات تشنہ رہ گئے ہیں۔ ہر قاری کو طلبِ مزید کے احساس کی زحمت اٹھانا پڑے گی لیکن میں نے

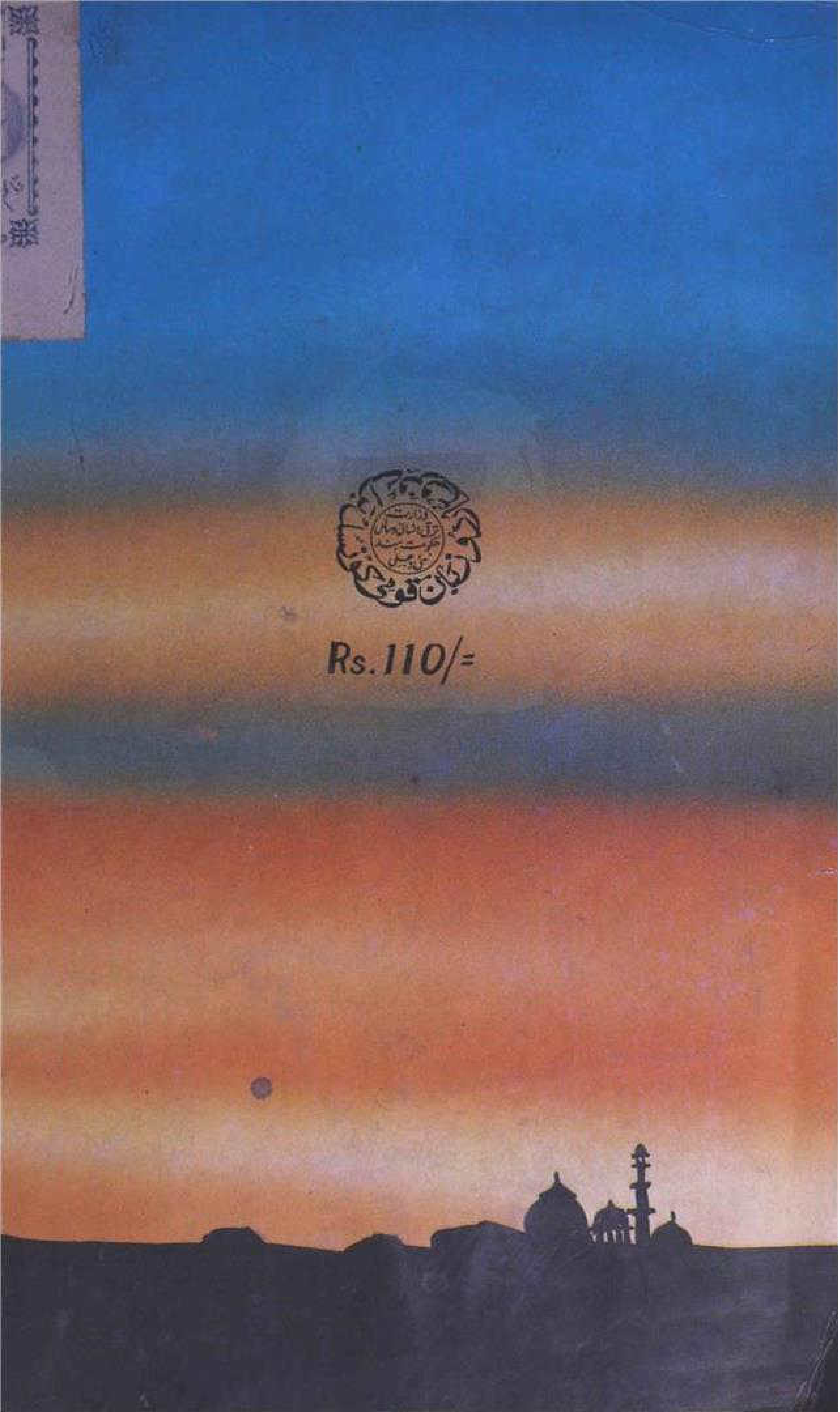
یہ طے کر لیا تھا کہ میں صرف وہی حالات و واقعات قلم بند کروں گا جن کا میں خود شاہد تھا۔ جو میرے اوپر خود گزرے تھے یا پھر انھیں سماعی باتوں کو پیش کروں گا جن کو میں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنا تھا۔ روایات و قیاسات نیز سماعی شہادتوں سے میں نے پوری طرح اجتناب کیا ہے۔ پھر بھی جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اُس زمانہ کی معاشرت کا انداز سمجھ لینے کے لیے کافی ہے اور جو نہیں لکھا ہے اُس کے بارے میں جس طرح قیاس آرائی کرنا ہر قاری کو مجھ سے بہتر اپنی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ روسا و عمائدین کے تذکرے میں بہت سے رئیسوں کے نام بالخصوص ہندو رئیسوں کے نام نظر انداز ہو گئے ہیں۔ اس کوتاہی کی وجہ بھی یہی ہے کہ میں نے صرف انھیں روسا کے حالات پیش کیے ہیں جن کے درباروں میں حاضری کا شرف مجھے خود حاصل ہوا تھا۔ خان علامہ نواب تفضل حسین خاں کے اخلاف میں ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس لیے انھیں بڑے بڑے خانوادوں میں رسائی ہو سکی جن کا تعلق خاندان شاہی سے براہ راست تھا۔ دولت و ثروت کے مالک اور بہت سے گھرانے تھے جہاں مجھے کبھی قربت حاصل نہیں ہو سکی۔ میں نے بہر حال اپنے ذاتی مشاہدات پیش کیے ہیں اور یہی حالات ہمارے موضوعِ تالیف کے لیے اس لیے کافی ہیں کہ ہمارے پیش نظر روسا و عمائدین کے حالات درج کرنے کا مقصد نہیں تھا۔ جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ قدیم معاشرت پر پوری طرح روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی جن بزرگوں کے نام اور حالات، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، معرضِ تحریر میں آنے سے رہ گئے ہیں میں ایسے تمام جلیل القدر حضرات کے اخلاف کی خدمت میں مودبانہ معذرت خواہی کرتا ہوں اور اُن کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی کی منقصت نہ گوارا تھی اور نہ کبھی گوارا ہو گی۔ میری کوتاہیاں صرف میری لاعلمی اور سماعی باتوں سے خواہشِ اجتناب کا نتیجہ ہیں۔

یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ تالیف موضوعِ سخن پر حرفِ آخر نہیں ہے۔ بلکہ غالباً یہ پہلی کاوش ہے جو کسی قدر شرح و بسط سے پیش کی گئی ہے۔ دورِ حاضر میں تحقیق و تدقیق کے اصول مرتب ہو چکے ہیں اور ہمارے نوجوانوں کو ریسرچ کرنے کا ذوق بھی ہے۔ میری صرف یہ تمنا ہے کہ وہ اس تالیف کو وسیلہ بنا کر شہر لکھنؤ کے قدیم کھنڈرات میں جستجو کر کے " نقش و نگارِ درو دیوار شکستہ " میں صنادیدِ عجم کے آثار خود ہی تلاش فرمانے کی

زحمت گوارا فرمائیں۔

قارئین کرام سے اپنی زبان و بیان اور طرزِ تحریر کے بارے میں اپنی خامیوں کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اُردو زبان پڑھنے کے لیے کسی مکتب، کسی مدرسے، کسی اسکول، کسی کالج یا کسی یونی ورسٹی میں زانوے ادب تہہ کرنے کا کبھی کوئی شرف حاصل نہیں ہوا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اُردو پڑھانے کے لیے میرے واسطے کبھی کوئی مولوی یا مدرس بھی مقرر نہیں ہوا۔ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی تک محدود تھی، جو کچھ از خود سیکھا وہ انگریزی اسکول، کالج اور یونی ورسٹی میں پڑھا تھا۔ اسکول میں اُردو ضرور پڑھائی جاتی تھی لیکن امتحان پاس کرنے کے علاوہ پڑھنے سے کبھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے اس زبان سے متعلق جو کچھ حاصل کیا وہ میرے گھر کا ماحول، میرے خاندان والوں اور بالخصوص والدین کا فیضِ تربیت تھا۔ اپنی زبان و بیان کے بارے میں صرف یہی عرض کر سکتا ہوں کہ یہ میرے گھر کا طرز ہے۔

مرزا جعفر حسین عفی عنہ


Rs. 110/=